منازل العرفان

فی تفسیر القرآن الکریم

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث
حضرت مولانا سید عبد الستار شاہ صاحب مد ظلہم العالی

جلد ششم

سورۃ التوبہ تا سورۃ الابراہیم

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ
نیلا گنبد سریاب روڈ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منازل العرفان

فی

تفسیر القرآن الکریم

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ ◉ کوئٹہ

نام کتاب: منازل العرفان في تفسیر القرآن الکریم

تالیف: شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا سید عبد الستار شاہ صاحب مدظلہ

قیمت:

سن اشاعت: ۱۴۴۴ھ 2023ء

تعداد: 1100

ملنے کے پتے

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

جامعہ فرقانیہ، سریاب روڈ، کوئٹہ

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

اور ملک کے تمام بڑے کتب خانے

ضروری گزارش

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن مجید احادیث اور دیگر دینی کتب میں عمداً غلطی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ سہواً جو غلطیاں ہوگئی ہوں ان کی تصحیح کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ تاہم انسان، انسان ہے، اگر اس اہتمام کے باوجود کسی قسم کی بھی غلطی پر آپ مطلع ہوجائیں، تو برائے مہربانی ہمیں مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہوسکے۔ اور آپ ''تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى'' کے مصداق بن جائیں۔ شکریہ

واٹس ایپ نمبر: 03022999778-03128588383

ناشر

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین منازل العرفان جلد ششم

سورۂ توبہ

سورۂ یونس

سورۂ ہود

سورۂ یوسف

سورۂ رعد

سورۂ ابراہیم

سُورَةُ التَّوبَة

مدنيةٌ آياتها ١٢٩ ركوعاتها ١٦

سورۂ توبہ مدنی ہے، اس میں ایک سوانتیس (١٢٩) آیتیں، اور سولہ (١٦) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کے متعدد نام ہیں، مشہور نام بَرَاءۃ ہے۔ پہلی آیت کا پہلا کلمہ سورۃ کا نام ہوا، جس میں کافروں سے بیزاری کا اعلان ہے۔ دوسرا نام سورۃ التوبۃ ہے، اس میں مسلمانوں کے لئے توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے، نیز اس میں بکثرت توبہ کا تذکرہ ہے۔ ایک نام سورۃ الفاضحۃ بھی ہے۔ [رواہ البخاري عن ابن عباس رضی اللہ عنہ] کیونکہ اس سورت نے منافقین کو رسوا کر دیا ہے۔

نزول:

سورۃ البَرَاءۃ بالاتفاق مدنیہ ہے، اس کا نزول سورۃ المائدہ کے بعد ہے، یہ سورۃ ترتیب تلاوت میں نویں سورت ہے، اور ترتیبِ نزول میں ایک سو تیرہویں (١١٣) نمبر پر ہے۔ صحیح بخاری میں ہے: "اٰخِرُ سُوْرَۃٍ نَزَلَتْ بَرَأۃٌ"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سورۂ برأت کا اکثر حصہ آخر میں نازل ہوا ہے، کیونکہ آخری مکمل سورت نزول کے اعتبار سے سورۃ النصر ہے۔ سورۂ توبہ مدنیہ ہے، البتہ آیت (١٢٧) و (١٢٨) مکیہ ہیں۔

آیات کلمات، حروف:

سورۂ توبہ کی آیات (١٢٩)، رکوع (١٦)، کلمات (٢٤٦٧) اور حروف (١١٣٦٠) ہیں۔ بالاتفاق مدنی

ہے، اور اس کا نزولِ فتحِ مکہ کے بعد ہے۔

ربط:

سورۂ انفال اور سورۂ توبہ دونوں میں جہاد کا یکساں تذکرہ ہے، سب سے بڑا ربط یہی ہے۔ اسی کے ساتھ باقی مضامین بھی دونوں سورتوں کے ایک جیسے ہیں۔ اسی طرح سورۃ الانفال کے آخر میں اور سورۃ البراءۃ کے شروع میں کافروں سے قطع تعلقات کا ذکر ہے۔ اور دونوں سورتوں میں مالِ غنیمت کا بھی تذکرہ ہے۔

سورۃ التوبہ کی خصوصیت کہ اس کے شروع میں بسم اللہ نہیں:

اس سورت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے شروع میں دوسری سورتوں کے برعکس بسم اللہ شریف نہیں ہے، اس سلسلے میں سب سے بہتر اور واضح دلیل وہی ہے جسے حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی تمام سورتوں اور آیات کی ترتیب توقیفی ہے۔ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے معلوم ہوا ہے کہ فلاں سورت اور فلاں آیت کو فلاں مقام پر رکھ دیا جائے، تو موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ شانہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ہے، جس میں نہ کسی اجتہاد کی ضرورت ہے، اور نہ دخل ہے۔

صحیح بات یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی خداوندی سے حکم دیا کہ سورۂ انفال کے بعد سورۂ توبہ رکھ دی جائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا تلفظ چھوڑ دیا۔ [تفسیر کبیر: ج ٨]

عام طور پر ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ لکھنے کا حکم ہوتا تھا، جبکہ یہاں ایسا حکم صادر نہیں ہوا۔ امام قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی اس وقت اس کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا نزول نہیں ہوا تھا، اس لئے اس کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں لکھی گئی۔ [قرطبي، منير، تيسير القاري] اس واضح تصریح کے بعد مزید کسی دلیل کی شاید ضرورت ہی نہ ہو۔

البتہ! مزید اطمینان کی خاطر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ خود جامعِ قرآن خلیفۂ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں حبر الامت، مفسر قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک سوال کے جواب میں منقول ہے، اس سوال میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی استفسار کیا تھا کہ قرآن مجید کی سورتوں کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے کہ سب سے پہلے بڑی سورتیں، یعنی سَبعَ طِوَال رکھی گئیں، پھر مئين جو کہ سَبعَ طوال سے کم ہیں، اور جن میں سو (١٠٠) کے قریب آیتیں ہیں، پھر مثاني جو کہ مئين سے کم

ہیں، پھر مفصل جو کہ سورۂ حجرات سے اختتام قرآن تک ہیں، پھر یہ تین حصوں میں تقسیم ہیں: طِوَالِ مُفَصَّل، اَوْسَاطِ مُفَصَّل، اور قِصَارِ مُفَصَّل۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس ترتیب کا بھی تقاضا یہ تھا کہ سورۂ توبہ کو انفال سے پہلے رکھا جاتا، کیونکہ سورۂ توبہ کی آیتیں سو سے زائد ہیں، اور انفال کی آیتیں سو سے کم ہیں، شروع کی سبع طوال کے ساتھ بجائے انفال کے سورۂ توبہ کو ملانا زیادہ مناسب تھا، پس اس کے خلاف کرنے میں اگر کوئی مصلحت ہے تو وہ کیا ہے؟

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ یہ سب باتیں صحیح ہیں، لیکن قرآن کریم کے معاملہ میں احتیاط کا مقتضیٰ وہی ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے، کیونکہ سورۂ توبہ اگر (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) نہ ہونے کی وجہ سے مستقل سورت نہ ہو، بلکہ سورۂ انفال کا جزء وتتمہ ہو، تو یہ ظاہر ہے کہ سورۂ انفال کا نزول مقدم ہے، اور سورۂ توبہ کا مؤخر ہے، اس لئے سورۂ توبہ کو انفال پر مقدم کرنا بغیر وحی کے جائز نہیں، اور وحی میں ہمیں کوئی ایسی ہدایت نہیں ملی، اس لئے ہم نے انفال کو مقدم اور توبہ کو مؤخر رکھا۔

اس تحقیق سے یہ معلوم ہوگیا کہ سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا احتمال ہے کہ سورۂ توبہ علٰحدہ سورت نہ ہو، بلکہ سورۂ انفال کا جزء ہو، اس احتمال پر یہاں بسم اللہ لکھنا ایسا نامناسب ہوگا جیسے کوئی کسی سورت کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ دے۔

اسی بنا پر فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اوپر سے سورۂ انفال کی تلاوت کرتا آیا ہو، اور سورۂ توبہ شروع کررہا ہو، وہ بسم اللہ نہ پڑھے، لیکن جو شخص سورۂ توبہ کے شروع یا درمیان سے اپنی تلاوت شروع کررہا ہے تو اس کو چاہئے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر تلاوت شروع کرے۔

بعض ناواقف سمجھتے ہیں کہ سورۂ توبہ کی تلاوت میں کسی حال بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا جائز نہیں ہے، یہ غلط ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر انفال سے تلاوت کرے، پھر سورۂ توبہ پر پہنچے تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بغیر توبہ شروع کرے، یہ اتفاقی قول ہے، لیکن اگر سورۂ توبہ ہی سے تلاوت شروع کرے تو أعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھے، پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے یا نہ پڑھے اس میں دو قول ہیں۔ راجح قول یہی ہے کہ اس صورت میں بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہ پڑھے۔ حضرت الحجۃ فن تجوید وقرأت کے امام ولی اللہ حضرت امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قصیدہ میں اسی کو اختیار فرمایا۔

وَمَهْمَا تَصِلْهَا أَوْ بَدَأْتَ بَرَاءَةً ★ لِتَنْزِيلِهَا بِالسَّيْفِ لَسْتَ مُبَسْمِلًا

محقق ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ "النشر" میں لکھتے ہیں کہ راجح یہی ہے کہ بسم اللہ نہ پڑھے، اگرچہ جواز کا قول بھی ہے۔ جسے علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمال القراء میں نقل کیا ہے۔ بہر حال جواز کا قول بھی ثابت ہے، مگر مرجوح ہے، اسی پر علامہ شاطبی اور شیخ جعبری رحمۃ اللہ علیہما کا فتویٰ ہے۔

فائدہ:

عام فقہاء اور ائمہ قرأت کے اقوال میں جو فرق ہے اس کا لحاظ رکھنا بہت ہی ضروری ہے، جیسے اس مسئلہ میں واضح ہے، اور یہ اختلاف راجح و مرجوح میں ہے، جواز و عدم جواز میں نہیں۔ محقق ابن الجزری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی اسی طرف رجحان ہے۔ واللہ اعلم

اور یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ قرآن کریم کے بعض نسخوں میں سورۂ براءت کی ابتداء میں حاشیہ پر اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ النَّارِ وَمِنْ غَضَبِ الْجَبَّارِ وَمِنْ شَرِّ الْكُفَّار لکھا ہوا ہے، اور لوگ اس کے پڑھنے کو ضروری اور مستحب سمجھتے ہیں، حدیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں، پس اس کا ترک اولیٰ ہے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی فتویٰ ہے۔

فائدہ:

اگر ابتداء تلاوت کسی سورت کے شروع سے ہو بشرطیکہ وہ سورت براءت نہ ہو، کوئی اور سورت ہو، تو بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے، البتہ اگر درمیان سورۃ سے ہو تو بسم اللہ کے پڑھنے نہ پڑھنے میں اختیار ہے مگر اعوذ باللہ کا پڑھنا ہر حال میں ضروری ہے۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ① فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ
اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللهِ ۙ وَاَنَّ اللهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ② وَاَذَانٌ مِّنَ اللهِ
وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ فَاِنْ
تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ

كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ③ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ④

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے اُن مشرکوں کی طرف براءت ہے جن سے تم نے عہد کیا ① سوتم چلو پھرو زمین میں چار مہینے، اور جان لو کہ بیشک تم اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے ② اور حج اکبر کے دن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کے لئے اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مشرکین سے بری ہیں۔ سو اگر تم توبہ کرلو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے، اور اگر تم اعراض کرو تو یہ جان لو کہ بلاشبہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور کافروں کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو ③ سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا، پھر انہوں نے تمہارے ساتھ ذرا کمی نہ کی، اور نہ تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی، سوتم ان کے معاہدہ کو ان کی مدت مقررہ تک پورا کردو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے ④

معارف ومنازل

یہ سورت مبارکہ تین بنیادی اور اہم تقریروں پر مشتمل ہے۔

پہلی تقریر:

یہ آغازِ سورت سے پانچویں رکوع کے آخر تک چلتی ہے، اس کا زمانہ نزول ذیقعدہ ۹ ؁ھ کے لگ بھگ ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امیرُ الحاج مقرر کرکے مکہ معظمہ روانہ کرچکے تھے کہ یہ پہلی تقریر نازل ہوئی، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے پیچھے روانہ فرمایا، تاکہ حج کے موقع پر تمام عرب کے نمائندوں کو اجتماع میں اسے سنائیں، اور اس کے مطابق جو طرزِ عمل تجویز کیا گیا تھا اس کا اعلان کردیں۔

دوسری تقریر:

یہ رکوع (۶) کی شروع سے رکوع (۹) کے اختتام تک چلتی ہے، اور یہ رجب ۹ ؁ھ یا اس سے کچھ پہلے نازل ہوئی، جبکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی تیاری کررہے تھے، اس میں اہلِ ایمان کو جہاد کی ترغیب دینا اور تیار کرنا شامل تھا، اور ان لوگوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جو نفاق یا ضعفِ ایمان یا سستی وکاہلی کی وجہ سے راہِ خدا

تعالیٰ میں جان ومال کا نقصان برداشت کرنے سے جی چرا رہے تھے۔

تیسری تقریر:

ہپ رکوع ۱۰ سے شروع ہوکر اختتامِ سورت کے ساتھ ختم ہوتی ہے، اور یہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئی۔ اس میں منافقین کی حرکات پر تنبیہ، غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں پر زجر وتوبیخ، اور ان صادق الایمان لوگوں پر ملامت کے ساتھ معافی کا اعلان ہے، جو اپنے ایمان میں سچے تو تھے مگر جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے سے باز رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ مشرکین سے بری ہیں:

جس وقت سورت براءت نازل ہوئی ہے اس وقت کفار کی چار قسمیں تھیں: پہلی قسم میں تو وہ لوگ تھے جن سے مقام حدیبیہ میں ۶ھ میں معاہدہ ہوا تھا، جبکہ سرور عالم ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تھے، اس موقع پر مشرکین نے آپ ﷺ کو مکہ معظمہ میں داخل نہ ہونے دیا، اور بڑی ردّ وکدّ کے بعد دس سال کے لئے صلح کرنے پر آمادہ ہوگئے، اس صلح میں یہ تھا کہ ایک فریق دوسرے فریق پر حملہ نہیں کرے گا، اور نہ کوئی فریق کسی فریق کے حلیف پر حملہ آور ہوگا۔

پھر یہ واقعہ پیش آیا کہ قبیلہ بنی بکر نے (جو قریش کا حلیف تھا) رات کے وقت قبیلہ بنوخزاعہ پر حملہ کردیا، اور قریش مکہ نے بنی بکر کو ہتھیار فراہم کئے، اور اپنے جوان ان کی امداد کے لئے بھیجے، اس طرح سے قریش نے عہد شکنی کی، کیونکہ بنوخزاعہ پر حملہ کرنے والوں کے مددگار بن گئے جو مسلمانوں کے حلیف تھے، جب سرور عالم ﷺ کو قریش کی عہد شکنی کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے جنگ کی تیاری کی، اس درمیان میں قریش نے اپنے نمائندہ ابوسفیان کو تجدید عہد کے لئے مدینہ منورہ بھیجا، مگر وہ ناکام رہے، چنانچہ ۸ھ رمضان میں آپ ﷺ دس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا لشکر لے کر مکہ معظمہ پہنچے، اور مکہ معظمہ فتح ہوگیا پوری تفصیل اپنے مقام پر آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ

کافروں کا دوسرا فریق وہ تھا جن سے صلح کا معاہدہ ایک خاص میعاد کے لئے کیا گیا تھا، وہ لوگ اپنے معاہدہ پر قائم تھے، نقضِ عہد نہیں کیا تھا، جیسے قبیلہ بنی ضمرہ اور قبیلہ بنی مدلج، یہ دونوں قبیلے بنی کنانہ میں سے تھے، ان سے جتنی مدت کے لئے صلح ہوئی تھی سورۂ براءت کے نزول کے وقت اس کے اختتام میں چند ماہ باقی تھے۔ (نو ماہ باقی تھے)

مشرکین کا تیسرا فریق وہ تھا جن سے کسی مدّت کے تعین کے بغیر معاہدہ ہوا تھا۔

مشرکین کا چوتھا فریق وہ تھا جن سے کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہ ہوا تھا۔

پہلا فریق یعنی قریشِ مکہ جنہوں نے معاہدۂ حدیبیہ کو توڑ دیا تھا، وہ تو کسی رعایت اور مہلت کے مستحق نہ تھے، ان کو تو بلا مہلت ہی جزیرۂ عرب سے نکال دینا یا قتل کر دینا درست تھا، لیکن پھر بھی اشہر الحرم میں ان سے تعرض نہ کیا جائے، اور اشہر الحرم گزر جانے کے بعد ان کے قتل کا حکم دیا گیا، اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر یہ کفر سے توبہ کرلیں اور اسلام کے کام کرنے لگیں (جس میں اِقَامَةُ الصَّلٰوۃ اور اِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ سب سے مقدم اور اہم ہیں) تو نہ انہیں قتل کریں، اور نہ قید کریں، کیونکہ وہ اب اپنے بھائی اور مسلمان ہو گئے۔

دوسرا فریق وہ تھا جن سے کسی خاص میعاد کے لئے صلح کا معاہدہ کیا گیا تھا، وہ اس پر قائم رہے، عہد شکنی نہیں کی، ان کے بارے میں یہ حکم دیا:

﴿فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ﴾ کہ ان کے معاہدہ کو اس کی مدّت تک پورا کر، و کیونکہ عہد کی خلاف ورزی اہلِ ایمان کا طریقہ نہیں ہے، جب مقابل فریق اپنا عہد پورا کر رہا ہے تو اہلِ ایمان بطریق اولیٰ عہد پورا کرنے کا اہتمام کریں، یہ حکم قبیلہ بنی ضمرہ اور بنی مدلج کے متعلق تھا، اگر اہل ایمان نقضِ عہد کریں گے تو تقویٰ کے خلاف ہوگا، اور مؤمن کا کام یہ ہے کہ ہر معاملے میں تقویٰ اختیار کریں جیسے فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ شانہ تقویٰ والوں کو پسند فرماتا ہے۔ تیسرا فریق جن سے کسی مدّت کے تعین کے بغیر معاہدہ ہوا تھا۔

اور چوتھا فریق جن سے کسی بھی قسم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا، ان دونوں کے بارے میں سورۂ براءت کے شروع سے لے کر ﴿وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ تک تین آیات میں اعلان فرمایا، اور ان کو چار مہینے کی مہلت دی گئی، اور کافروں سے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے۔

سرزمین عرب مین چار مہینے چلو پھرو، اور چار ماہ کے بعد بھی یہ نہ سمجھنا کہ جزیرۃ العرب سے چلے گئے تو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے آزاد ہو جاؤ گے تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے، اور اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتے، وہ اپنے باغیوں اور کافروں کو ضرور ذلیل کرے گا۔ الفاظ کا رُخ تو ان لوگوں کی طرف ہے جن سے کوئی عہد تھا، اور اس کی میعاد مقرر نہ تھی، لیکن اس میں وہ لوگ بھی داخل ہو گئے جن سے کوئی معاہدہ نہ تھا۔

٩ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زیر امارت حج کی ادائیگی اور مشرکین سے براءت کا اعلان:

براءت کے مفہوم کو دوبارہ ﴿وَاَذَانٌ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖٓ﴾ فرما کر دہرادیا، اور ٩ھ میں جو حج ہوا (یہ فتح مکہ کے بعد پہلا حج تھا) اس میں حضرت ابوبکر صدیق اور متصل بعد حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ذریعہ مواقفِ حج میں اعلان عام کروایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین سے بری ہیں، اس کے علاوہ بھی بعض امور کا اعلان کروایا گیا کہ آئندہ کوئی مشرک حج نہیں کر سکے گا، اور نہ ہی کسی ننگے بے ستر شخص کو طواف کعبہ کی اجازت ہوگی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو اعلان کرنے پر مامور فرمایا تھا۔

صحیح بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا کہ جس حج میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر بھیجا تھا اس میں انہوں نے یوم النحر (دسویں ذوالحجہ کو) جن لوگوں کو اعلان کرنے کے لئے بھیجا تھا ان میں میں (ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) بھی تھا، تاکہ یہ لوگ منیٰ میں اعلان کردیں: "اَلَا لَایَحُجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَایَطُوْفُ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ۔ [بخاري]

خبردار! اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے، اور کوئی شخص ننگے ہونے کی حالت میں بیت اللہ کا طواف نہ کرے۔ صدیوں سے حرم مکہ اور اس کے اطراف وحدود میں کفر کی جو نجاست پھیلی ہوئی تھی، فتح مکہ اور آج کے اعلان کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے سے ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ الحمد للہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی بھیجا گیا تاکہ ان کے ذریعہ اعلان کروایا جائے، اور وجہ اس کی یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں یہ رائے پیش کی گئی تھی کہ اہلِ عرب کا یہ طریقہ ہے کہ عہد اور نقضِ عہد کے بارے میں اسی شخص کے اعلان کو معتبر سمجھتے تھے جو خاص اسی قبیلے کا ہو، جس سے معاہدہ ہوا ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاہدہ قبیلے کی حیثیت سے تو نہ تھا مسلمانوں کی جماعت کے امام ہونے کی حیثیت سے تھا، اور دین اسلام کی طرف سے تھا، لیکن احتمال تھا کہ لوگ اسے بنی ہاشم کا معاہدہ سمجھیں، اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا جانا مناسب سمجھا، جو بنی ہاشم ہی کے ایک فرد تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سورت براءت کے مطابق اعلان کرتے تھے، اور مشرکین کو پوری طرح اعلان سناتے تھے، چونکہ اتنے بڑے اجتماع میں شخص واحد کافی نہ تھا، اس لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور کئی دیگر حضرات کو بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کام پر لگایا تھا۔

معالم التنزیل ج (۲) میں حضرت زید بن تبیع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ کو اس حج میں کیا پیغام دے کر بھیجا گیا تھا جس میں آپ اعلان کرنے پر مامور ہوئے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ مجھے چار چیزوں کا اعلان کرنے کا حکم ہوا تھا:

اول یہ کہ آئندہ بیت اللہ کا طواف کوئی شخص ننگا ہونے کی حالت میں نہ کرے۔

دوم یہ کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جس قبیلے سے کوئی معاہدہ نہیں اس کو چار ماہ کی مہلت دی جا رہی ہے (چار ماہ تک زمین میں چلیں پھریں) مسلمان ان سے کوئی تعرض نہیں کریں گے، یہ مدت ختم ہو جانے کے بعد ان کے خون کی حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔

سوم یہ کہ جنت میں مؤمن کے سوا کوئی شخص داخل نہ ہوگا۔ (سبحان اللہ اعلان بھی ہے اور تبلیغ دین بھی ہے)۔

چہارم یہ کہ اس سال کے بعد مسلمین اور مشرکین (حج میں) جمع نہ ہوں گے، یعنی اس سال کے بعد کسی مشرک کو حج کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ صاحب معالم التنزیل نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ چار ماہ کی مدت جو مقرر کی گئی کہ اس کے بعد امان نہ ہوگی، اس کی ابتداء حج کے دن سے ہے، جس میں براءت کا اعلان کیا گیا تھا، اور یہ مدت دس ذوالحجہ سے لے کے دس ۱۰ ربیع الآخر تک تھی، چونکہ مدت کا شمار اعلان کے بعد ہی سے معتبر ہو سکتا ہے۔

۞ ۞ ۞

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٥ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝٦

ترجمہ: پھر جب اشہر الحرم گزر جائیں سو تم مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی پا لو، اور ان کو پکڑو، اور گھیرو، اور ان کی تاک میں گھات لگا کر ہر موقع پر بیٹھو سو، اگر وہ توبہ کر لیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ۝٥ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دیجئے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن لے، پھر اسے امن کی جگہ پہنچا دیجئے، یہ اس لئے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو علم نہیں

رکھتے ⑥

معارف ومنازل

حضرت مجاہد اور محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ اس آیت میں جن اشہر الحرم کا ذکر ہے، ان سے وہی مہینے مراد ہیں جن کا شروع سورت میں ذکر آیا ہے، جن لوگوں کے ساتھ کوئی معاہدہ بلاتعیینِ مدت کا تھا، یا وہ جن سے کوئی عہد نہ تھا، ان کو چار ماہ کی مہلت دی گئی، اور جنہوں نے نقضِ عہد کیا تھا، یعنی قریشِ مکہ ان کو چارہ ماہ کی مدت میں سے بیس دن ذی الحجہ اور پورے ماہ محرم کے گزرجانے تک کی مہلت دی گئی۔ صاحب معالم التنزیل نے اور صاحب مدارک نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔

صاحب روح المعانی نے بھی ایسا ہی لکھا ہے کہ اشہر الحرم سے وہ مہینے مراد نہیں ہیں جو عرب میں مشہور و معروف تھے (یعنی ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب)۔ اہلِ عرب ان مہینوں میں قتال نہیں کرتے تھے، اور اسلام کے ابتدائی دور میں بھی ان میں قتال کرنا ممنوع تھا، اور یہ اس لئے فرمایا کہ جس وقت سورۂ براءت کے حکم پر براءت کا اعلان ہوا تھا ان میں سے صرف بیس ۲۰ دن ذی الحجہ کے اور ایک ماہ محرم کا باقی رہ گیا تھا، اور رجب تک پہنچنے کے لئے بیچ میں پانچ مہینے کا فصل تھا، اگر ان پانچ مہینوں کو بھی حساب میں لگا دیا جائے تو میعاد لمبی ہوجاتی، حالانکہ چار مہینوں سے زیادہ کسی کو مہلت نہیں دی گئی۔

آیت کریمہ میں یہ فرمایا کہ جب اشہر الحرم نکل جائیں تو مشرکین کو قتل کرو، جہاں بھی پاؤ ان کو پکڑو، اور انہیں روک لو۔ روکنے کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان کو قلعہ بند کردو، باہر نکلنے سے روک لو، اور ان کے لئے ہر گھات کی جگہ میں بیٹھ جاؤ، یعنی مکہ مکرمہ کے راستوں میں بیٹھو، مشرکین کو اس میں داخل نہ ہونے دو۔

﴿فَإِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ یعنی وہ اگر شرک سے توبہ کرلیں، اور اسلام قبول کرلیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، ان پر چلنے پھرنے کی اور مکہ معظمہ میں داخل ہونے پر کوئی پابندی نہ لگاؤ۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے، جب کسی نے اسلام قبول کرلیا تو زمانۂ کفر میں جو کچھ کیا تھا وہ سب معاف ہوجائے گا، پھر گزشتہ برائیوں پر کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔ علامہ ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ

فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص کفر و شرک سے توبہ کرلے تو اسے قتل نہ کیا جائے، البتہ حصر اور حبس کا حکم باقی رہے گا، جو شخص قصداً نماز چھوڑ دے اور اس پر اصرار کرے اور زکوٰۃ نہ دے تو امام المسلمین کے لئے جائز ہے کہ اسے محبوس رکھے، اس کا چھوڑ دینا اس وقت تک واجب نہیں جب تک کہ وہ نماز نہ پڑھے اور زکوٰۃ نہ دے۔ [أحکام القرآن ج ۲]

چند ضروری مسائل اور قیمتی فوائد کا بیان:

(۱) اس اعلانِ عام کے بعد صورت حال یہ ہوگئی کہ پہلی جماعت یعنی مشرکینِ مکہ جنہوں نے عہد شکنی کی ان کو اشہر الحرم کے خاتمہ یعنی محرم ۱۰ھ کے ختم تک، اور دوسری جماعت کو ۱۰ھ رمضان تک یعنی نو ماہ تک (کیونکہ ان کی مدت میں ۹ ماہ باقی تھے)، اور تیسری، چوتھی جماعتوں کو ۱۰ ربیع الثانی تک، کیونکہ دس ذی الحجہ کو جو چار ماہ کا اعلان ہوا تو دس ربیع الثانی کو چار ماہ پورے ہوجائیں گے، اس کے بعد وہ قتال کی زد میں آجائیں گے۔

(۲) مسلمانوں کو چاہئے کہ حتی الامکان عفو و درگزر سے کام لیں، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ [البقرة: ۱۰۹] (معاف کرو، اور درگزر سے کام لو)۔ پھر فرمایا: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴾ [الأعراف: ۱۹۹] (درگزر کا رویہ اپناؤ، اور نیکی کا حکم دو، اور جاہلوں کی طرف دھیان نہ دو) چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تاریخی عفو و کرم کا اعلان فرمایا جسے پوری کائنات نے کبھی مشاہدہ نہیں کیا تھا، اور آئندہ بھی اس قسم کی عام معافی کا مشاہدہ نہیں ہوگا، اور شاید نہیں ہوسکے گا۔

(۳) دشمن پر قابو پانے کے بعد اپنے غصہ کے جذبات پر کنٹرول رکھنا یہ مسلمان قوم کا شعار ہونا چاہئے، کیونکہ مسلمان کی لڑائی اپنے نفس اور اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ محض اللہ تعالیٰ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہے، اور یہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جو اسلامی جہاد اور عام بادشاہوں کی جنگ میں امتیاز اور فرق کرنے والا ہے۔

(۴) سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات اور مشرکین کو چار ماہ کی مدّت دینے سے یہ معلوم ہوا کہ کمزور قوموں کو بلا مہلت کسی جگہ سے نکل جانے کا حکم دینا، یا ان پر یکبارگی حملہ کرنا بے رحمی اور غیر شریفانہ فعل ہے، اگر خواہ مخواہ ایسا کرنا ہو تو پہلے اعلانِ عام کرکے ان کو پوری مہلت دی جائے، تاکہ وہ اپنے لئے انتظام کرسکیں، جیسے بیان ہوا۔

(۵) کسی قوم کے ساتھ معاہدۂ صلح کرنے کے بعد اگر میعاد سے پہلے اس معاہدہ کو ختم کردینے کی ضرورت پیش آجائے تو چند شرائط کے ساتھ اگرچہ اس کی اجازت ہے، مگر بہتر یہی ہے کہ معاہدہ کو اس کی میعاد تک پورا کردیا جائے جیسا کہ سورۂ توبہ کی چوتھی آیت میں قبیلہ بنو ضمرہ اور بنی مدلج کا معاہدہ نو ماہ تک پورا کرنے کا حکم آیا ہے۔

(٦) ان آیات سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ گناہگاروں کی ذات سے براہِ راست نفرت نہ کریں، ہوسکتا ہے کہ یہ گناہگار ہدایت قبول کرلیں، بلکہ نفرت ان کے گناہوں سے ہو، جیسے کہ کفر وشرک اور دوسرے معاصی ہیں، کیونکہ یہی معاصی اور کافرانہ اعمال ہلاکت کے اسباب ہوتے ہیں، اور مسلمانوں کی ان سے مخالفت بھی درحقیقت ان کی ہمدردی اور خیرخواہی پر مبنی ہے، تاکہ وہ ہدایت قبول کرکے ابدی عذاب سے بچ جائیں۔ یہی انبیاء کرام علیہم السلام کا عمل اور ان کی سنت ہے۔

(٧) پانچویں آیت اور سورۂ انفال کی آیت (٦٠) کا مطلب یہ ہے کہ فریضۂ جہاد کی کامیابی جہاں اخلاص وتقویٰ پر مبنی ہے، وہاں عالمِ اسباب میں یہ بھی ضروری ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر طرح کی قوت پورے طور پر مہیا کرنا چاہئے، اس وقت رحم دلی یا نرمی ہرگز جائز نہیں، بلکہ ایسے وقت میں رحم دلی بزدلی شمار ہوگی۔

(٨) پانچویں آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کافر کے مسلمان ہوجانے پر اعتماد و بھروسہ تین چیزوں پر موقوف ہے: ایک خالص توبہ، دوسرے اقامتِ صلوٰۃ، تیسرے اداءِ زکوٰۃ، جب تک ان پر عمل نہ ہو محض کلمہ پڑھنے سے معافی نہیں ملے گی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ سے جہاد کیا تھا، حالانکہ وہ کلمہ پڑھتے تھے، اور اس کے منکر بھی نہ تھے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی آیت سے استدلال کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مطمئن کردیا۔

(٩) ﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ﴾ سے کیا مراد ہے؟ اس میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں: حضرت عبداللہ بن عباس، فاروق اعظم، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اور دیگر نے فرمایا کہ اس سے مراد یومِ عرفہ ہے، کیونکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اَلْحَجُّ عَرَفَةُ"۔ حج عرفات ہی ہے۔ [أبو داود، ترمذي، أحمد، حاكم]

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد یوم النحر، یعنی دسویں ذوالحجہ ہے۔ حضرت سفیان ثوری اور امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا کہ ﴿يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ﴾ سے مراد تمام ایامِ حج، یعنی ایامِ تشریق سب اس میں شامل ہیں، جیسے لوگ کہتے ہیں: یومِ صفین، یومِ جمل، یومِ یرموک اور یوم بعاث، ان سے مراد صرف ایک ایک دن نہیں، بلکہ پورا زمانہ اور تمام اوقات ہیں، کیونکہ ان لڑائیوں کا سلسلہ بہت زیادہ دنوں تک جاری رہا، کوئی ایک دن میں یہ لڑائیاں ختم نہیں ہوئیں، اور چونکہ عمرہ کو حج اصغر کہا جاتا ہے اس لئے حج کے ساتھ اکبر کی صفت ذکر کردی۔ امام زہری، شعبی اور عطاء رحمۃ اللہ علیہم نے بھی یہی کہا ہے۔ [مظھري، معارف وغیرہ]

پس قرآنی اصطلاح کی رُو سے ہر سال کا حج، حج اکبر ہی ہے، خواہ کسی بھی دن ہو۔ عوام الناس میں جو یہ مشہور

ہے کہ جس سال عرفہ بروزِ جمعہ واقع ہو صرف وہی حج اکبر ہے، یہ عوامی اصطلاح ہے، شرعی نہیں۔ شرعی اصطلاح وہی ہے کہ ہر سال حج خواہ ہفتے کے کسی بھی دن میں ہو حج اکبر کے معنی میں ہے، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسے حج کا ثواب ستر (۷۰) حجوں کے ثواب کے برابر ہے۔ بعض روایات سے یہی معلوم ہوا کہ یہ ثواب ثابت ہے۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں "اَلْحَظُّ الْاَوْفَرفِی الْحَجِّ الْاَکْبَر" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، اس میں یہ درج ہے۔

ہاں! اتنی سی بات ہے کہ اتفاقی طور پر جس سال سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع ادا فرمایا تھا اس میں عرفات کا دن جمعۃ المبارک کے دن تھا۔ یہ اپنی جگہ ضرور خصوصی انعام ہے، مگر حج اکبر کو اسی میں منحصر نہیں کیا جاسکتا، اور آیت کریمہ کے مفہوم کو اس کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا۔ امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ ایامِ حج کو حج اکبر فرمانے سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوا کہ ایامِ حج میں عمرہ نہیں ہوسکتا، کیونکہ قرآن کریم نے ان ایام کو حج اکبر کے لئے مخصوص فرمایا، پس ان ایام میں عمرہ ممنوع ہے۔

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ اگر کوئی مشرک آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دیجئے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنے، اور اپنی تشفی کرے۔

علامہ ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب کوئی حربی کافر امان طلب کرے تو اسے امان دینا جائز ہے، وہ امان کے ساتھ مسلمانوں کے پاس آئے اللہ تعالیٰ کا کلام سنے، توحید کو سمجھے، اسلام کی حقانیت معلوم کرے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور نبوت کے انوار و برکات معلوم کرے۔

پھر فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا خاص کر علماء امت کا فرض ہے کہ غیر مسلموں کو حقانیتِ اسلام سمجھائیں، تبلیغ کریں، لوگوں کے اسلام کے بارے میں جو جو شبہات ہیں ان کا ازالہ کریں۔

آج ہمارے زمانے میں الحمد للہ دینی تبلیغ کے متعلق بہت سے ذرائع جاری ہیں، کئی علماء کرام کی تالیفات و تصنیفات اور اشتہارات کے ذریعہ غیر مسلموں یا ہمارے اپنے بے دینوں، ملحدوں کے شکوک و شبہات دور ہو چکے ہیں، پھر علماء دیوبند کی قائم کردہ تبلیغی جماعت کی کوششوں اور مساعی جلیلہ کی بدولت کروڑوں کی تعداد میں لوگ اسلام اور اس کی حقانیت کو سمجھ چکے ہیں۔

﴿ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ﴾ پھر اسے اپنے مقام اور جگہ تک پہنچانے کا اہتمام کرو، تاکہ امان کی خلاف ورزی نہ ہو، اور وہ اپنے گھر تک سلامت پہنچ جائے، کوئی مسلمان اسے قتل نہ کرے، یہی حکم اہل ذمہ کے بارے میں بھی ہے کہ

امام المسلمین پر ان کو تحفظ فراہم کرنا فرض ہے۔ پھر فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ﴾ یہ پناہ دینا اور اسے حقانیتِ اسلام سمجھانا اور اس کا تحفظ کرنا یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں جانتے، اور اندھے ہیں، وہ نہ توحید سے واقف ہیں، نہ حقانیتِ اسلام سے، یہاں تک کہ وہ ہر نفع ونقصان اور خاص کر آخرت سے بے خبر ہیں، ہوسکتا ہے سمجھانے کے بعد سمجھ جائیں، اور اسلام قبول کرلیں، چنانچہ یہ نسخہ بہت ہی کامیاب رہا، اور بہت سے نانجان، منکرین بے خبر لوگ سمجھنے کے بعد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔

......❁......❁......❁......

كَيۡفَ يَكُوۡنُ لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ عَهۡدٌ عِنۡدَ اللّٰهِ وَعِنۡدَ رَسُوۡلِهٖۤ اِلَّا الَّذِيۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ ۚ
فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَـكُمۡ فَاسۡتَقِيۡمُوۡا لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ⑦ كَيۡفَ وَاِنۡ يَّظۡهَرُوۡا عَلَيۡكُمۡ لَا
يَرۡقُبُوۡا فِيۡكُمۡ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرۡضُوۡنَكُمۡ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَتَاۡبٰى قُلُوۡبُهُمۡ ۚ وَاَكۡثَرُهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ⑧ اِشۡتَرَوۡا
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ⑨ لَا يَرۡقُبُوۡنَ فِىۡ مُؤۡمِنٍ اِلًّا
وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡمُعۡتَدُوۡنَ ⑩ فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخۡوَانُكُمۡ فِى
الدِّيۡنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ⑪

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک مشرکین کا عہد کیسے رہے گا؟ مگر جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک عہد لیا، سو جب تک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے⑦ ان کا عہد کیسے رہے گا؟ اور حال ان کا یہ ہے کہ اگر وہ تم پر غلبہ پاجائیں تو تمہارے بارے میں نہ کسی قرابت کی پاسداری کریں، اور نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا خیال کریں، یہ لوگ تمہیں اپنی منہ سے راضی کرتے ہیں، اور ان کے دل انکار کرتے ہیں، اور ان میں اکثر فاسق ہیں⑧ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے تھوڑی قیمت کو خرید لیا، سو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روک دیا، بلاشبہ وہ جو کام کرتے ہیں برے کام ہیں⑨ وہ کسی مؤمن کے بارے میں کسی قرابتداری کا اور کسی ذمہ داری کا پاس نہیں رکھتے، اور یہ وہ لوگ ہیں جو زیادتی کرنے والے ہیں⑩ سو اگر یہ لوگ توبہ کریں، اور نماز قائم کریں، اور زکوۃ دیں، تو یہ تمہارے

دینی بھائی ہوں گے، اور ہم تفصیل کے ساتھ احکام بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو جانتے ہیں ⑪

معارف ومنازل

ان آیات میں اس اعلانِ براءت کی حکمت کا بیان ہے جو سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔ اول تو مشرکین کی بدعہدی کے مزاج کا تذکرہ فرمایا، کہ ان کا عہد حق تعالیٰ شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا، انہوں نے پہلے بھی عہد شکنی کی ہے، اور آئندہ بھی عہد شکنی کرتے رہیں گے، ان کا حال یہ ہے کہ ظاہر میں زبانوں سے عہد ہے، اور دلوں میں بغض کی آگ ہے، اگر مسلمانوں پر غلبہ پا جائیں تو نہ کسی رشتہ داری کا لحاظ کریں، اور نہ کسی معاہدہ کی ذمہ داری کا، یہ مسلمانوں کو اپنی زبانی باتوں سے راضی رکھنا چاہتے ہیں، وفائے عہد اور اطاعت کا زبانی وعدہ کرتے ہیں، اور ان کے دل ان کی باتوں سے راضی نہیں ہیں، اور ان میں اکثر فاسق ہیں، یعنی شرارت سے بھرے ہوئے ہیں کہ کسی بھی عہد کی پاسداری کا دعویٰ کریں، تو ان کی بات چلنے والی نہیں ہوگی:

﴿اشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ یہ لوگ اللہ تعالی کے احکام کو قبول نہیں کرتے، اور دوسروں کو ایمان قبول نہیں کرنے دیتے۔ دنیا اور دنیاوی خواہشات اور عیش وعشرت نے انہیں حق سے دور رکھ کر گونگا بہرا اور اندھا بنایا ہے، وہ آخرت سے بیگانہ اور بے خبر رہتے ہیں، یہ لوگ جن کاموں میں لگے ہوئے ہیں ان کے یہ کام برے ہیں، اور بدنصیبی کے اسباب ہیں۔

﴿لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ﴾ یہ لوگ کسی مؤمن کے بارے میں اتنے برے ہیں کہ ان کے پاس نہ قرابتداری کی رعایت ہے، نہ معاہدہ کی پاسداری ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ''اِلًّا'' کا ترجمہ قرابت اور رشتہ داری بتایا ہے، اور ''ذِمَّةً'' کا مطلب عہد و پیمان بتایا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''اِلًّا'' عبرانی لفظ ہے، اس کا معنی ہے ''اللہ''، پس معنی یہ ہوگا کہ وہ نہ اللہ تعالیٰ کی رعایت کرتے ہیں نہ عہد پیمان کا۔

تو انہی لوگوں سے وہ لوگ مستثنیٰ رہے جنہوں نے مسجد حرام کے نزدیک عہد و پیمان کیا تھا اور وہ اپنے عہد و پیمان پر قائم رہے، اور نقض عہد کا ارتکاب نہیں کیا یعنی بنوضمرہ اور بنو مدلج۔ تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے بارے میں فرمایا کہ جب تک یہ بنی کنانہ والے تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو، یعنی وفائے عہد کرو،

عہد کی کوئی خلاف ورزی نہ کرو، کیونکہ تم لوگ مؤمن متقی ہو، اور یہ عہد کی خلاف ورزی تمہاری شان نہیں، اور یہ خلافِ تقویٰ ہے، جیسے پہلے ارشاد ہوا تھا: ﴿فَأَتِمُّوٓا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ﴾۔ اور اب یہ فرمایا:

﴿فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ﴾ اس سابق حکم کا اعادہ اور اس کی تاکید ہے، پس ۹ ماہ کی مدت جو باقی تھی اس پر عمل ہوگیا کمامَرَّ۔

﴿فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ اگر یہ لوگ کفر سے توبہ کرلیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوۃ ادا کریں تو پھر یہ تمہارے بھائی ہوں گے، پس جھگڑا ہی ختم۔ سابقہ آیت میں فرمایا تھا: ﴿فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ کہ ان کا راستہ چھوڑ دو، اور انہیں کچھ نہ کہو، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی شخص کے مکمل مسلمان ہونے کے لئے بہت سی باتوں کی ضرورت ہے، یہاں روزہ کا ذکر نہیں اور حج کا بھی نہیں، حالانکہ اس آیت کے نزول کے وقت روزہ اور حج دونوں کی فرضیت نازل ہوچکی تھی، تو کیا ان دونوں کا اور دیگر بہت سے امور واحکامِ اسلام کا کیا بنے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں صرف اتنا اسلام کافی ہوگا جس سے قتل وقتال اور سفکِ دم پر پابندی ہو۔ پس اس مقصد کے لئے صرف یہی تین چیزیں موقوف علیہ اور کافی ہیں، اور یہاں مقصد تمام ارکانِ اسلام کا بیان کرنا مراد نہیں ہے، جن کے لئے دوسرے نصوص موجود ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عباداتِ بدنیہ میں سب سے اہم نماز اور عباداتِ مالیہ میں سب سے اہم زکوۃ کے ذکر سے سارے اعمال مراد ہوں، گویا کہ یہاں أهم فالأهم کا بیان مقصود ہے۔ واللہ اعلم

❁ ❁ ❁

وَإِنْ نَّكَثُوْٓا أَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا أَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ إِنَّهُمْ لَآ أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿۱۲﴾ أَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِإِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: اور اگر وہ لوگ اپنے معاہدہ کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں، اور تمہارے دین میں طعن کریں تو تم کفر

کے سرغنوں سے جنگ کرو، بلاشبہ یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے یہاں قسمیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں، تا کہ وہ باز آ جائیں ⑫ کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا، اور رسول کو نکالنے کا پختہ ارادہ کیا؟ اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تم سے پہلے خود چھیڑ چھاڑ کی ابتداء کی، کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ سو اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر تم مؤمن ہو ⑬ ان سے جنگ کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا، اور ان کو ذلیل کرے گا، اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا، اور مسلمانوں کے سینوں کو شفاء دے گا ⑭ اور ان کے دلوں کی جلن کو دور فرمادے گا، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے توبہ نصیب فرمائے، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا حکمت والا ہے ⑮

معارف ومنازل

ان آیات میں قریشِ مکہ کی بدعہدی اور عہد شکنی کا تذکرہ ہے، اور ان سے جنگ کرنے کی ترغیب ہے۔ ان لوگوں سے ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر معاہدہ ہوا تھا، جس کی شرطوں میں سے ایک یہ شرط بھی تھی کہ دس سال تک ایک فریق دوسرے فریق پر حملہ نہیں کرے گا، اور نہ کوئی فریق دوسرے فریق کے حلیف پر حملہ آور ہوگا، اور نہ کسی حملہ آور کی مدد کرے گا، لیکن قریشِ مکہ نے معاہدہ توڑ دیا، اور قبیلہ بنی خزاعہ (جو سرور عالم ﷺ کا حلیف تھا) کے خلاف قریشِ مکہ نے قبیلہ بنی بکر کے ہتھیاروں سے اور جوانوں سے مدد کی، اب جبکہ انہوں نے اپنا عہد توڑ ڈالا، اور نہ صرف یہ کہ عہد توڑا بلکہ تمہارے دین کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا، تو تم ان سے جنگ کرو۔

﴿فَقَاتِلُوْهُمْ﴾ کی بجائے ﴿فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ﴾ فرمایا۔ اس سے تمام مشرکینِ قریش مراد ہیں، جو پورے عرب کے مشرکوں کے سرغنے بنے ہوئے تھے، نہ خود ایمان قبول کرتے تھے، اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے تھے، اور قبائلِ عرب نے مکۃ المکرمہ کے طفیل انہیں اپنا مقتدا بنا رکھا تھا، جو اس انتظار میں تھے کہ جب یہ لوگ مسلمان ہوں گے تو ہم بھی مسلمان ہو جائیں گے۔

یا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ سے قریش کے سردار مراد ہیں۔ جیسے ابو جہل، سہیل بن عمرو، عکرمہ بن ابی جہل، ابوسفیان بن حرب وغیرہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی کو اختیار فرمایا، وہ فرماتے تھے کہ یہ آیت قریشِ مکہ کے سرداروں کے بارے میں نازل ہوئی، جنہوں نے نقضِ عہد بھی کیا، اور سرور عالم ﷺ کو مکہ معظمہ سے جلا وطن کرنے کا مشورہ بھی دیا، جبکہ یہ سارے دار الندوۃ میں ابلیس سمیت جمع ہوئے تھے۔

﴿اِنَّهُمۡ لَاۤ اَیۡمَانَ لَهُمۡ﴾ (ان کی قسمیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں) ﴿لَعَلَّهُمۡ یَنۡتَهُوۡنَ﴾ تم ان سے جنگ کروتا کہ یہ تمہارے دین میں طعن وتشنیع کرنے اور مقابلہ میں جنگ کے لئے کھڑے ہونے سے باز آجائیں۔اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے کفر وگمراہی سے باز آجائیں۔[معالم التنزیل مع زیادۃ]

قریشِ مکہ تو عہد توڑ چکے تھے، پھر حرفِ شرط کے ساتھ ان کے عہد کو توڑنے کو کیوں ذکر فرمایا؟ ﴿وَاِنۡ نَّکَثُوۡۤا﴾ فرمایا۔صاحب روح المعانی فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نقضِ عہد پر قائم رہیں، اور ایمان نہ لائیں، تو ان سے قتال کرو۔

بعض محققین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جملہ شرطیہ لاکر آئندہ آنے والے کافروں کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور مطلب یہ ہوگا کہ قریشِ مکہ تو عہد توڑ ہی چکے ہیں، ان کے علاوہ آئندہ بھی کافروں کی جو جماعت نقض عہد کرے، اور تمہارے دین میں طعن کرے تو ان سے جنگ کرو، اور خاص کر کفر کے سرغنوں کو قتل کرنے کا اہتمام کرو، ان لوگوں کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں، ایسے لوگوں سے قتال کرتے رہو گے تو وہ تمہارے دین میں طعن کرنے اور جنگ کرنے کی ہمت سے باز رہیں گے۔

علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ نے مدارک التنزیل میں لکھا ہے کہ اگر کوئی ذمی دین اسلام پر علانیہ طور پر طعن کرے اس کا قتل جائز ہے، کیونکہ عہد ذمہ میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ اسلام پر طعن نہ کریں گے، جب کوئی طعن کرے گا تو عہد ذمہ سے خارج ہوجائے گا، اور علماء نے یہ لکھا ہے کہ ملحد، زندیق، غیر مسلم یہود ونصاریٰ وغیرہ اگر اسلامی شعائر کی توہین کریں، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کریں، یا قرآن حکیم کی بے احترامی کریں، جیسے آج کل قصداً عمداً یہ سب کچھ ہورہا ہے، تو پھر ایسے لوگ واجب القتل ہیں، جو لوگ ایسے گستاخوں کو قتل کریں گے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول بندے شمار ہوں گے، اور یہ بھی جہاد شمار ہوگا، اگر اس سلسلے میں مجاہد کی موت واقع ہو تو اس کا شمار اعلیٰ شہیدوں میں ہوگا۔

حضرات علماء کرام نے اور خصوصاً علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے غازی علم الدین رحمۃ اللہ علیہ اور غازی عبدالقیوم کے عمل کو سراہا، اور ان کو اعلیٰ مرتبہ کا شہید قرار دیا، جب انہوں نے گستاخانِ نبوت کو قتل کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔

﴿اَلَا تُقَاتِلُوۡنَ قَوۡمًا نَّکَثُوۡۤا اَیۡمَانَهُمۡ وَهَمُّوۡا بِاِخۡرَاجِ الرَّسُوۡلِ﴾ اس آیت میں قتال کا حکم بھی ہے، اور مدد کا وعدہ بھی ہے، فرمایا: تم ان سے جنگ کرو، کیا تم ان لوگوں سے قتال نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ

دیا، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ سے نکالنے کا پختہ ارادہ کیا، اور پھر خود ہی قتال کی ابتداء کی؟ یعنی تمہارے حلیف بنی خزاعہ کے مقابلہ میں بنی بکر کی مدد کی۔

﴿اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ﴾ کیا تم ان سے ڈرتے ہو، اور ترکِ قتال کرتے ہو؟ اور اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو، اور اس کا حکم مانو، اور قتال پر اقدام کرو، اور قتال نہ چھوڑو، اگر تم مؤمن ہو، تو پھر ایمان کے تقاضوں کو پورا کرو، جس میں حکمِ قتال کی تعمیل بھی ہے۔

﴿قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

فرمایا: تم ان سے جنگ کرو، اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں عذاب دے گا، اور تمہارے ہاتھوں انہیں ذلیل کرے گا، اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا۔ اس آیت میں قتال کے حکم سے مدد ونصرت کا وعدہ بھی ہے، اور یہ بھی فرمایا کہ کافروں کی طرف سے جو عہد شکنی ہوئی، اور انہوں نے اسلام کو مٹانے کے لئے جو حرکتیں کیں، اس سے جو مسلمانوں کے دلوں میں رنج وغم ہے۔ اس جنگ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرمائے گا، زائل کرے گا، اہل ایمان کے دلوں کو اللہ تعالیٰ شفا دے گا، ان کے دل ٹھنڈے ہو کر سکون وراحت پائیں گے، کیونکہ جنگ کے نتیجے میں کافر مقتول اور ذلیل وخوار ہوں گے، اور مسلمان اپنی آنکھوں سے کافروں کا بدتر انجام دیکھ لیں گے۔ مزید فرمایا:

﴿وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ﴾ اور اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی جلن کو دور فرمادے گا۔ یہ جملہ اولیٰ پر عطف ہے، اور اس کے مفہوم کی تاکید ہے، اور اس میں اہل ایمان کی خوشی کو دوسرے الفاظ میں بیان فرمایا ہے، جس سے مبالغہ مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان خوب زیادہ خوش ہوں گے۔

صاحب روح المعانی یہ بات لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ: اِذْهَابُ الْغَيْظ شفاءِ صدور سے زیادہ ابلغ ہے، اور یہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ بعض علماء کرام نے یوں بھی فرمایا ہے کہ شفاء الصدور فتح مکہ کے وعدے سے ہوگیا، اور اِذْهَابُ الْغَيْظ فتح مکہ سے ہوگیا۔ لیکن صاحب روح المعانی اس قول سے راضی نہیں ہیں۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے توبہ نصیب فرمادے۔ تمہیں جو حکم ہوا ہے وہ کرو، تمہارا کام قتال ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر میں جو کچھ ہے وہ بھی واقع ہوگا، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اسلام کی توفیق دے گا اور کفر چھوڑنے پر جوان کی توبہ قبول فرمائے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر فضل وکرم ہے، وہ جس پر

چاہے اپنا فضل فرمادے، جسے اسلام کی نعمت سے نوازنا ہوگا وہ تمہارے مقابل صف آرا ہو کر بھی بچ کر نکل جائے گا، اور اسلام قبول کرلے گا، جیسا کہ ابوسفیان اور عکرمہ بن ابی جہل اور سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہم جو مشرکین کے رؤسا تھے، بعد میں مسلمان ہوگئے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، اسے معلوم ہے کہ کون اسلام قبول کرے گا، اور کون کفر پر مرے گا، اور وہ حکیم بھی ہے، وہ اپنی حکمت کے موافق جس کو چاہے نواز دے، کسی کا اس میں دخل نہیں ہے، وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ [هود:۱۰۷] (جو ارادہ کرلے اس پر اچھی طرح عمل کرتا ہے) ہے اور علیم و حکیم بھی ہے۔

فائدہ:

یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ تو ۸ھ کو فتح ہو چکا تھا، اور سورۂ براءت ۹ھ میں نازل ہوئی، پھر ان آیات میں کون سے جہاد کی ترغیب دی گئی ہے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے صاحب روح المعانی ج ۱۰ میں لکھتے ہیں کہ سورۂ براءت کی ابتدائی آیات فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی تھیں، اور یہ آیات اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ [روح المعاني: ج ۱۰]

دوسرا جواب یہ ہے کہ ان آیات میں خطاب کا رخ اگر چہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف ہے، اور نزولِ آیات انہی کے بارے میں ہے، لیکن عمومِ خطاب قیامت تک آنے والے سارے مسلمانوں کو شامل ہے، جیسے پہلے بیان ہوا۔ سو آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت اور مدد کی خوشخبری دی ہے، اور یہ بتایا ہے کہ کفار و مشرکین تمام غیر مسلم اقوام بشمول یہود و نصاریٰ سے تمہیں جو بھی تکلیف پہنچے گی، اور ہر زمانہ میں ان کی ریشہ دوانیوں اور شرارتوں کی وجہ سے جو تمہارے دلوں میں غیظ و غضب ہوگا، اللہ تعالیٰ جہاد کی برکت سے اس کو دور فرمائے گا، اور تمہاری مدد و نصرت فرمائے گا، اور کافروں کو ذلیل و رسوا کرے گا، اور تمہیں کافروں کی ذلت و خواری دکھا کر تمہارے دلوں کو شفاء عطا فرمائے گا۔

جس طرح اہل مکہ میں قتال کے لئے بعض چیزیں جمع ہوگئی تھیں کہ انہوں نے اپنا عہد توڑا، اور تمہارے دین میں طعن کیا، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جلا وطن کرنے کا مشورہ اور پختہ ارادہ کیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ چھوڑنے اور ہجرت کرنے پر مجبور کیا، اور مسلمانوں اور ان کے حلیفوں پر حملہ کرنے کی پہل اور ابتداء کی، اس طرح کی بہت سی باتیں آئندہ بھی کافروں کی طرف سے پیش آسکتی ہیں، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے درمیان تو نہ ہوں گے، کیونکہ وہ دنیا سے

تشریف لے جاچکے ہوں گے، اوران کے بعد کوئی نبی اور رسول بھی نہیں، لیکن ان کے علم وہدایت کے ورثاء علماء حقانی موجود ہوں گے، تو ایسے اوقات میں غیر مسلموں اور دشمنانِ اسلام کی طرف سے طرح طرح کے ناگفتہ بہ حالات و واقعات پیش آسکتے ہیں۔

اگر ایسا معاملہ نمودار ہوا، کفار نے تم پر چڑھائی کی، اور تمہارے دین پر طعن وتشنیع کا بازار گرم کیا، تو اپنے اسلاف یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح اٹھو، کسی دشمن سے نہ ڈرو، اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرو، اور دشمن کے ساتھ جہاد کرو، اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہارے ساتھ ہوگی، دشمن تمہارے ہاتھوں سے شکست کھاجائے گا، ذلیل وخوار ہوکر بھاگ جائے گا، اس پر تمہارے دل خوش ہوں گے، تمہارے غیظ وغضب کی آگ ٹھنڈی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب کو شفاء عطافرمائیں گے، اور دشمن پر تمہارا رعب چھاجائے گا۔

الحمدللہ یہ نصرتِ خداوندی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، اور مشاہدہ کیا، ۱۹۶۵ء میں پاکستان کے غیور مجاہدین ایمان وعملِ صالح سے لیس افواج نے ہندوستان کو وہ شکست دی، جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، اور موجودہ مجاہدین نے امریکہ اور پچاس ممالک کی مشترکہ فوج نیٹو پر خدا کا قہر وعذاب نازل کرکے چیونٹیوں کی طرح مست ہاتھیوں کو تباہ وبرباد کرکے انہیں بھاگنے پر مجبور کردیا۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی نصرت دیکھنے کا شوق ہو تو افغانستان میں جاکر ملاحظہ کرے۔ ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾[آل عمران:۱۳۹] (اور تم ہی سربلند ہوگے اگر تم واقعی مؤمن ہو)۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾

ترجمہ: کیا تم کو یہ گمان ہے کہ چھوڑ دیئے جاؤ گے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ابھی تم میں سے ان لوگوں کو نہیں جانا جنہوں نے جہاد کیا، اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مؤمنین کے علاوہ کسی کو دوست نہیں بنایا، اور اللہ تعالیٰ ان کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو ﴿١٦﴾

معارف ومنازل

اس کے بعد جہاد کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا﴾ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے اور تمہارا امتحان نہ ہوگا؟ ایسا خیال نہ کرو، امتحان ضرور ہوگا، تاکہ سب کو معلوم ہو کہ کون شہسوار ہیں، اور کون ہیں پیادے، اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جان لے گا یعنی سب کے سامنے ان لوگوں کو ظاہر کرے گا جنہوں نے جہاد کیا، تاکہ سب کو معلوم ہو کہ جہاد کرنے والے کون ہیں، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور مؤمنین کے سوا کسی کو راز دار اور دوست نہیں بنایا۔

جہاد کرنے والے اور دل سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور مؤمنین سے سچی محبت رکھنے والے عملی طور پر ان لوگوں سے علٰحدہ ہو کر ممتاز ہو جائیں گے جنہوں نے جہاد سے جان چھڑائی، اور پہلوتہی کی، اور جنہوں نے کافروں کو راز دار بنا کر ان سے دوستی کی۔ یہ امتحان والا مضمون قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مذکور ہے۔

سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ عَلٰى مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ حَتّٰى يَمِيۡزَ الۡخَبِيۡثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ [آل عمران: ۱۷۹] (اللہ ایسا نہیں کرتا کہ مؤمنوں کو اس حالت پر چھوڑ رکھے جس پر تم لوگ اس وقت ہو، جب تک وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کردے)۔ اسی طرح سورۂ عنکبوت میں فرمایا: ﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ﴾ [العنکبوت: ۲] (کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہیں یونہی چھوڑ دیا جائے گا کہ بس وہ یہ کہہ دیں کہ: ہم ایمان لے آئے، اور ان کو آزمایا نہ جائے؟)۔ اسی طرح دوسرے متعدد مقامات پر بھی یہ مضمون مذکور ہے۔

﴿وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے تمہارے ہر قسم کے ظاہر و باطن اور تمام اعمال سے، یہاں تک کہ تمہارے ارادوں اور قلبی احوال سے بھی باخبر ہے۔

مَا كَانَ لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ اَنۡ يَّعۡمُرُوۡا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيۡنَ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ بِالۡكُفۡرِ‌ؕ اُولٰٓـئِكَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ ۖۚ وَفِى النَّارِ هُمۡ خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمۡ يَخۡشَ اِلَّا اللّٰهَ‌ فَعَسٰۤى اُولٰٓـئِكَ اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلۡتُمۡ سِقَايَةَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَةَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ كَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ لَا يَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ‌ۘ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ

مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝۲۱ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۲

ترجمہ: مشرکین اس کے اہل نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو آباد کریں، اس حال میں کہ وہ اپنے بارے میں کافر ہونے کی گواہی دے رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال اکارت ہوگئے، اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ۝۱۷ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، اور جنہوں نے نماز قائم کی، اور زکوٰۃ ادا کی، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرے، سو توقع ہے کہ یہ لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہوں گے ۝۱۸ کیا تم نے حج کرنے والوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد کرنے کو اس شخص کے برابر بنا دیا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آخرت کے دن پر، اور جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا؟ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ لوگ برابر نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا ۝۱۹ جو لوگ ایمان لائے، اور ہجرت کی، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجے کے اعتبار سے بڑے ہیں، اور یہ لوگ کامیاب ہیں ۝۲۰ ان کا ربّ اپنی طرف سے انہیں رحمت کی اور رضامندی اور ایسے باغوں کی بشارت دیتا ہے جن میں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں ۝۲۱ یہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا اجر ہے ۝۲۲

معارف ومنازل

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ جب جنگ بدر میں ان کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ گرفتار ہو کر قیدیوں میں آئے تو مسلمانوں نے انہیں کفر اختیار کرنے اور قرابت منقطع کرنے کی عار دلائی، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو بہت ملامت کیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا بات ہے تم ہماری برائیاں گن گن کر ذکر کر رہے ہو، اور ہماری خوبیاں نظر انداز کر کے انہیں یاد نہیں کرتے ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا تم لوگوں میں کچھ خوبیاں بھی ہیں؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہیں، ہم مسجد حرام کی تعمیر کرتے ہیں، ہم کعبہ شریف کی دربانی کرتے ہیں، ہم حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے کلام کے رد میں یہ آیتیں نازل ہوئیں:

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ

اَعۡمَالُهُمۡ ۚ وَفِي النَّارِ هُمۡ خٰلِدُوۡنَ﴾ مشرکوں کا یہ کام نہیں یعنی وہ اس کے اہل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو آباد کریں، ایسی حالت میں کہ وہ خود اپنے کافر ہونے کا اقرار کررہے ہیں، ان لوگوں کے سارے اعمال اکارت اور برباد ہوئے، اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

﴿مَسٰجِدَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی مسجدیں مسلمانوں کی عبادت گاہیں ہیں، انوار وتجلیات کے مراکز ہیں۔ جب کسی مسجد کو آباد کرنے کا مشرکوں کو حق نہیں تو وہ ناپاک لوگ جب کسی پاکیزہ عام مسجد کے آباد کرنے کے لائق وسزاوار نہیں، کعبہ شریف کا تو ذکر ہی کیا ہے، اس کی تعمیر کے حقدار تو صرف مسلمان ہی ہیں، جن کی فطرت طیب اور پاکیزہ ہے۔

مسجدوں کی تعمیر وآباد کرنے سے کیا مراد ہے؟ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک اس کے تین معنی ہیں:

پہلے معنی یہ ہیں کہ مسجدوں کی تولی اور سرپرستی کرنا جیسے کہ مشرکینِ مکہ بزعمِ خود کعبہ شریف کی دیکھ بال کرتے تھے، اور اسی پر فخر کرتے تھے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تعمیرِ مساجد سے مراد یہی عرفی تعمیر ہے، یعنی مسجدوں کے لئے پلاٹ مہیا کرنا، اوران کی عمارت مع دیگر ضروری لوازمات کے، نیز ان کی مرمت وغیرہ کرنا، عام عرف میں تعمیرِ مساجد کے یہی معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ نماز وعبادات جماعت کے ساتھ نمازوں کا اہتمام، نمازِ جمعہ اور دیگر مذہبی اجتماعات کا انتظام واہتمام کرنا وغیرہ۔

آیت کریمہ کے عموم میں یہ تینوں معنی مراد ہوسکتے ہیں، اور یہ تینوں کام مسلمان ہی انجام دے سکتے ہیں، اہل شرک کفار ایسے پاکیزہ کاموں کی انجام دہی کے ہرگز اہل نہیں ہیں، اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ان کی اہلیت اور استحقاق کی مکمل نفی فرمادی۔

مساجد اللہ تعالیٰ کے دینِ متین کے مراکز ہیں:

مسجد عام مکانوں کی طرح ایک سیدھا سادہ مکان ہوتا ہے، اور ہر قسم کے مکان کا شرف ومرتبہ اس کے مکین کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، یا جو کام اس مکان کے ساتھ متعلق ہوتا ہے تو مکان کی حیثیت اس کام کے ساتھ متعلق ہوتی ہے، اسی ضابطہ کی رُو سے حدیث شریف میں مساجد کو خَيۡرُ الۡبِقَاعِ اور بازاروں کو شَرُّ الۡبِقَاعِ کہا گیا ہے۔[مشکوۃ] پس اعلیٰ سے اعلیٰ قیمتی مکان اپنے حقیر وگھٹیا مکین کی وجہ سے حقیر شمار ہوتا ہے، جبکہ ادنیٰ سے ادنیٰ سادہ مکان اپنے گراں قدر وقابلِ احترام ہردلعزیز مکین کی وجہ سے نہایت قابلِ قدر ومعزز شمار ہوتا ہے۔

مساجد کا اسلام میں بہت بڑا اونچا مقام ہے، وہ اس لئے کہ ان کی نسبت ربّ العزّت عزّ شانہ کے ساتھ

مربوط ہے، پھر مساجد میں شب وروز بے شمار عبادت گزار لوگ نماز، عبادت، ذکر واذکار، تلاوت قرآن، رکوع وسجود وغیرہ طاعات میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں، سو مساجد اس لئے خَیْرُ الْبِقَاعِ اور عَظِیْمُ الْمَرْتَبَۃِ قرار پائے کہ ان کی نسبت واستناد حق تعالیٰ شانہ اور ہزاروں طاعات وعبادات کے ساتھ منسلک ہے، جہاں روزانہ پانچ مرتبہ اذان کی گونج ہوتی ہے، جہاں نماز باجماعت، جمعۃ المبارک کے اجتماع کے علاوہ بے شمار دینی عبادات کی ادائیگی کا انتظام ہوتا ہے۔

خیر القرون میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اور دیگر ائمۂ اسلام، قضاۃ وحکام کے تمام فرامین واحکامات اور فیصلے مساجد ہی سے جاری ہوتے تھے، اور بے شمار جہادی جنگی تنظیموں کی ترتیب وتربیت مساجد ہی سے مرتب ہوتی تھی، تو جس طرح ربّ کائنات عزّ شانہ کی وحدانیت کا سجدوں کے ذریعہ اظہار مقصود ہوتا تھا، اسی مقصد کے لئے مساجد کی تعمیر ہوتی ہے۔ سورۃ الجن میں ارشاد ہے: ﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [الجن:١٨] (اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں، پس تم اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو)۔

قرآن وحدیث نے یہی ثابت کیا کہ تمام علویات وسفلیات اور پوری کائنات کا ذرّہ ذرّہ تکوینی طور پر حق تعالیٰ شانہ کے حضور سجدہ ریز ہے۔ بخاری کی حدیث میں ہے کہ روزانہ سورج عرشِ الٰہی کے نیچے جا کر سجدہ کرتا ہے، پھر اپنا سفر جاری رکھنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ دراصل مساجد انہی سجدوں کی خاطر تعمیر ہوتی ہیں، اور یہی سجدہ قربِ الٰہی کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ اور سبب ہوتا ہے۔

مساجد کے فضائل وبرکات اور ضروری احکام:

(١) جو شخص اللہ تعالیٰ کے واسطے مسجد بنائے گا اللہ تعالیٰ شانہ جنت میں اس کا گھر بنائے گا۔ [بخاري ومسلم عن عثمان رضي الله عنه بن عفان]

(٢) حلال کمائی سے جو مسجد بنائے گا جنت میں موتی اور یاقوت کا گھر پائے گا۔ [مجمع ترغيب عن أبي هريرة رضي الله عنه]

(٣) مسجد صدقہ جاریہ ہے، اس کا ثواب مرنے کے بھی بعد ملتا رہے گا۔ [الترغيب عن أبي هريرة رضي الله عنه]

(۴) مسجد چھوٹی ہو یا بڑی ثواب میں فرق نہیں آئے گا۔ [ابن حبان، بيهقي عن أبي ذر رضي الله عنه]

(۵) مسجد کی نگرانی کرنے والا اللہ تعالیٰ کا دوست ہوگا۔ [كنز العمال عن أبن عباس رضي الله عنه]

(٦) بدبودار چیز کھانے والوں کو مسجد میں آنے کی اجازت نہیں۔ [مسلم عن ابن عمر و جابر بن عبد الله رضی الله عنه]

(٧) سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی مسجد کی صفائی خود کرتے تھے۔ [ابن أبي شيبة عن يعقوب ابن زيد رضی الله عنه]

(٨) آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد میں تھوک بلغم رینٹ دیکھتے تو خود صاف کرتے۔ [بخاري]

(٩) جو شخص مسجد کی خدمت کرے گا وہ اہل اللہ میں شمار ہوگا۔ [مسند بزار و كشف الأستار عن أنس رضی الله عنه]

(١٠) مسجد کی تعمیر اور خدمت پُل صراط پر گزرنے کی ضمانت ہے۔ [أبو داؤد، بزار]

(١١) جس کو مسجد کی خدمت پر دیکھو اس کے ایمان کی گواہی دیدو۔ [ترمذي ابن ماجة دارمي عن أبي سعيد الخدری رضی الله عنه]

(١٢) جو مسجد سے محبت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھتا ہے۔ [كنز العمال عن أبي سعيد الخدري رضی الله عنه]

(١٣) جس کے دل کا دھڑکن مسجد ہو وہ عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا۔ [بخاري و مسلم عن أبی هريره رضی الله عنه]

(١٤) مسجد میں بیٹھنے والا فرشتوں کا ہم نشیں ہوگا۔ [مجمع الزوائد عن أبي هريرة رضی الله عنه]

(١٥) مساجد آخرت کے بازار ہیں۔ [كنز العمال عن جابر بن عبد الله رضی الله عنه]

(١٦) مسجد میں بیٹھنے والا اللہ تعالیٰ کا پڑوسی ہے۔ [كنز العمال عن أبي سعيد الخدري رضی الله عنه]

(١٧) مسجدوں کو خوبصورت بنانا قیامت کی علامت ہے۔ [أبو داؤد عن ابن عباس رضی الله عنه]

(١٨) خوشنما و خوبصورت مسجدوں میں نماز نہ پڑھو۔ [بيهقي، سنن كبرىٰ و مرقات عن انس رضی الله عنه]

(١٩) مسجدوں کو لال پیلے رنگ دینا اور شوخ بنانا منع ہے۔ [كشف الغمة عن عمر بن الخطاب رضی الله عنه]

(٢٠) مسجد کے لئے سب سے بہتر رنگ سفیدی رنگ ہے۔ [أبو داؤد، مجمع، ابن ماجة عن ابن عباس رضی الله عنه]

(٢١) مسجد کو رنگ برنگ منقش کرنا سخت منع ہے، اور مسجدوں کو شوخ و منقش اور خوبصورت بنانے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ [مرقات عن ابن مسعود رضی الله عنه]

(٢٢) مسجد میں جھاڑو دینا جنتی حوروں کا حق مہر ہے۔ [طبرانی، مجمع، الترغيب عن أبي قرصافة]

(٢٣) قیامت میں زمین فنا ہو جائے گی، مسجدیں باقی رہیں گی۔ [مجمع كنز، طبرانی، جامع صغير عن ابن عباس رضی الله عنه]

(٢٤) مسجد قیامت میں نمازی کے لئے گواہی دے گی۔ [اتحاف السادة عن ثور بن يزيد رضی الله عنه]

(۲۵) مسجد آسمان والوں کے نزدیک تاروں کی طرح ہے۔ [مجمع الزوائد عن ابن عباس رضی اللہ عنہ]

(۲۶) ایک عورت مسجد میں جھاڑو دینے کی وجہ سے جنت میں گئی۔ [بخاري, أبو داؤد عن أبي هريرة و ابن عباس رضی اللہ عنہ]

(۲۷) مؤمن کی وفات پر اس کی جائے نماز روتی ہے۔ [اتحاف السادة حضرت علی و ابن عباس رضی اللہ عنہ]

(۲۸) مسجدوں کو وسیع اور کشادہ تعمیر کرو، اس میں خیر ہے۔ [مجمع الزوائد عن كعب بن مالک رضی اللہ عنہ]

(۲۹) مسجد میں ہنسنا قبر کی تاریکی کا سبب ہے۔ [كنز العمال عن أنس رضی اللہ عنہ]

(۳۰) مسجد میں گفتگو نیکیوں کو کھا جاتی ہے۔ [شرح إحياء العلوم اتحاف السادة] [سنن كبرىٰ]

﴿إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ﴾ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں، اور جنہوں نے نماز قائم کی، اور زکوٰۃ ادا کی، اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ اس میں بتادیا کہ مسجدوں کو آباد کرنا اہلِ ایمان کا کام ہے، جو اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ تین چیزوں کا بیان ہے:

(۱) تمام بدنی عبادتوں کا خلاصہ یعنی نماز۔ (۲) تمام مالی عبادتوں کا خلاصہ اداءِ زکوٰۃ۔ (۳) سوئم یہ کہ وہ کسی غیر اللہ سے نہیں ڈرتے، یعنی: ﴿وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ [المائدة: ۵۴] یعنی وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامتی اور عیب جوئی کی پرواہ نہیں کرتے، اور طاعات کی بجا آوری کے سلسلے میں قوم و قبیلے یا کسی بڑے شخص یا عوام الناس کے اعتراض اور ناراضگی کو دیکھتے ہی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کے برا بھلا کہنے کا سرے سے پرواہی نہیں کرتے، اور نہ کسی شخص کی ملامت کرنے سے ڈرتے ہیں۔

یہاں اور کئی دیگر مقامات پر صرف إِيْمَان بِاللهِ وَالْيَومِ الآخِرَةِ کا تذکرہ ہے، جس میں إِيْمَان بِالرَّسُوْل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر نہیں ہے، جس سے فہم و فراست سے عاری لوگوں کو دھوکہ ہوا کہ ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی ضروری نہیں، ایسے لوگ ایک آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایمانیات کا اول و آخر جب بیان ہوتا ہے تو درمیانی سارے افراد اس میں خود بخود شامل ہو جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایمان باللہ کے ضمن میں ایمان بالرسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو خود بخود آ ہی جاتا ہے، کیونکہ صرف لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه پڑھنے اور اقرار کرنے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوتا، جب تک محمد رسول اللہ یعنی

رسالت کا اقرار نہ کرے۔فرمایا:

﴿فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ شانہ ان لوگوں کو جنت تک پہنچنے کا راستہ بتادے گا جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت، اقامتِ صلوٰۃ، اداءِ زکوٰۃ، خشیۃ الٰہی، تعمیر مساجد وآداب، مساجد میں مسلسل لگے رہیں گے، اور پھر ان اعمالِ صالحہ کے ذریعہ جنت تک رسائی حاصل کرنا، یہ سب اللہ تعالیٰ کا فضل وعنایت اور لطف وکرم کا نتیجہ ہوگا۔

﴿ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ اس کے بارے میں دوسببِ نزول بیان کئے گئے ہیں: ایک تو وہی ہے جو پہلے مذکور ہوا، جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے والد کی اسیری کے ضمن میں بیان فرمایا (اسے دوبارہ دیکھا جائے تو بہتر ہوگا)۔

اور دوسرا اسبابِ نزول یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر شریف کے پاس تھا، ایک شخص نے کہا کہ اگر میں حجاج کو پانی پلاؤں، اور اس کے بعد دوسرا کوئی نیک عمل نہ کروں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ دوسرے نے کہا کہ اگر میں مسجد حرام کو آباد کرنے کے علاوہ کوئی عمل نہ کروں تو مجھے دوسرے اعمال کے چھوٹ جانے کی کوئی پرواہ نہیں۔تیسرے شخص نے کہا کہ تم نے جو اپنے اعمال کے بارے میں کہا ان اعمال سے بڑھ کر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ان لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جھنجھوڑ دیا، اور فرمایا کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر کے قریب اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو۔ یہ جمعہ کا دن تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نماز سے فارغ ہو کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معلوم کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر دریافت کیا، اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان تمام اعمال وحسنات سے افضل ہے، بلکہ تمام نیکیوں کے لئے موقوف علیہ ہے، اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ جو کہ حجاج کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی دیکھ بال اور سرپرستی وتولیت سب سے افضل ہے۔ فرمایا:

﴿لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ظالموں سے مشرک مراد ہیں، وہ شرک پر قائم ہوتے ہوئے حق اور صحیح بات کو نہیں مانتے۔

اس کے بعد ایمان اور ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت بیان فرمائی:

﴿ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ ۙ اَعۡظَمُ دَرَجَةً عِنۡدَ
اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴿۲۰﴾ یُبَشِّرُهُمۡ رَبُّهُمۡ بِرَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَرِضۡوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمۡ فِیۡهَا نَعِیۡمٌ مُّقِیۡمٌ
﴿۲۱﴾ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ﴿۲۲﴾﴾ جولوگ ایمان لائے، اور ہجرت کی، اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا، درجہ کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ لوگ بہت بڑے ہیں، اور یہ لوگ پورے کامیاب ہیں، ان کا ربّ انہیں بشارت اور خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت خاصہ کی، اور اپنی رضامندی کی، اور جنتی باغوں کی، جن میں ان کے لئے دائمی نعمتیں ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے پاس بڑا اجر ہے، جس کا کوئی انقطاع نہیں۔

خلاصہ:

مطلب یہ ہے کہ حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی در و دیوار کی دیکھ بال کرنے کو تم نے اس شخص کے عمل کے برابر کر دیا جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت پر ایمان لایا، اور جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے، یعنی ایمان اور جہاد والوں کے مقابلہ میں حجاج کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی دیکھ بال، جبکہ ایمان نہ ہو اس کی کچھ بھی حیثیت نہیں۔

کفر و شرک کے ساتھ کوئی بھی نیک عمل خواہ وہ پہاڑوں جتنا ہو مقبول اور معتبر نہیں۔ کفار کا اگر بالفرض کوئی نیک عمل ہو وہ ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ضائع اور اکارت میں ہے۔ ہاں! یہ بات قابل توجہ ضرور ہے کہ مؤمن کو اس کی نیکیوں کا اجر و ثواب قیامت میں ملے گا، جبکہ کافر کو اس کے اچھے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں مال، عزت، صحت تندرستی وغیرہ کی شکل میں ملے گا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَكُمۡ وَاِخۡوَانَكُمۡ اَوۡلِیَآءَ اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡكُفۡرَ عَلَی الۡاِیۡمَانِ ؕ وَمَنۡ
یَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾ قُلۡ اِنۡ كَانَ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ وَاِخۡوَانُكُمۡ وَاَزۡوَاجُكُمۡ
وَعَشِیۡرَتُكُمۡ وَاَمۡوَالُ ۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَتِجَارَةٌ تَخۡشَوۡنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡكُمۡ مِّنَ
اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَجِهَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے باپوں کو اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ، اگر وہ کفر کو ایمان کے مقابلہ میں پسند کرتے ہوں اور تم میں سے جو شخص ان سے دوستی کرے گا تو یہ لوگ ہی ظلم کرنے والے ہیں ﴿۲۳﴾ آپ فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور کنبہ اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے نہ چلنے سے تم ڈرتے ہو، اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے، اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۲۴﴾

معارف ومنازل

اسلامی زندگی نام ہے پابندیوں اور حقوق اللہ وحقوق العباد کے مجموعہ کا، اور ان تمام تعلقات میں محبت ودوستی کا عنصر غالب رہتا ہے، تو پھر ایک طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت و تعلق کا جوڑ ہے، جس کے ہر پہلو میں سوائے خیر وبرکت کے کچھ نہیں، دوسری طرف بیوی بچے، باپ، بھائی، بہن، رشتے ناطے، کنبہ اور قبیلہ اسی کے ساتھ مال ومنال، سرمایہ ودولت، اقتدار اور عزّت وغیرہ کا تعلق اور محبت ودوستی کا سوال ہے، تو ان محبتوں اور چاہتوں میں خیر وشر دونوں کا عنصر موجود ہے، اگر یہ محبت اعتدال میں ہو، اور اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی محبت کی تابع ہو تو پسندیدہ اور محمود ہے، اور اگر یہ محبت پہلی محبت پر غالب ہو، اور اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی محبت مغلوب اور متروک ہو تو یہ محبت قبیح ناجائز اور حرام ہی ہوگی، اور باعثِ ہلاکت وتباہی بھی۔

ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے اور تمام رشتہ داروں سے تعلق اور صلہ رحمی کو مضبوط ومحکم رکھنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی زرّین ہدایات سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، اسی طرح احادیث بھی کثرت سے وارد ہیں، مگر اس آیت نے فرقِ مراتب واضح فرما کر یہی بتا دیا کہ ہر تعلق کی ایک حد اور ایک مرتبہ ہے، پس تمام تر تعلقات اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تعلق کے مقابلہ میں ہیچ ہیں، اور قابلِ نظر انداز بھی ہیں۔

جس وقت یہ دونوں رشتے ٹکرا جائیں تو تمام تعلقات اور رشتوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے رشتہ پر قربان ہی کرنا ہوگا، ورنہ ایمان خطرے میں ہوگا۔ اصل رشتہ اسلام اور ایمان کا ہے، نسبی رشتے، لسانی اور وطنی رشتے سب اسلامی رشتے پر قربان ہیں، کیونکہ رشتہ داری اور دوستی اور دیگر تمام تعلقات پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا تعلق مقدم ہے، جو بھی تعلق اس سے ٹکرائے وہ توڑنے کا حقدار ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا وہ عمل جس کی وجہ سے وہ ساری امت سے اعلیٰ وافضل قرار پائے یہی چیز تھی کہ انہوں نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی جان ومال، اہل وعیال اور ہر قسم کے رشتوں کو قربان کر کے یہ ثابت کیا کہ تمام رشتے اس اصلی عظیم رشتے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ لوگوں نے دیکھا کہ جہادی معرکوں میں باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو اور حقیقی مسلمان بھائی اپنے کافر بھائی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر تلوار چلا کر قتل کر رہا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ کو قتل کر کے اطمینان وسکون حاصل کرتا ہے۔

سچے پکے اور کچے جھوٹے مسلمان کی اصلی شناخت کا یہی معیار ہے، ایک شخص اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ماں باپ قربان کر رہا ہے، دوسرا بزدل وبے ہمت عید الاضحیٰ کے روز ایک جانور قربان کرنے سے خوفزدہ اور پریشان ہے، پس کیا یہ دونوں مسلمان برابر ہو سکتے ہیں؟ (اس مضمون کی تفصیل پہلے گزر گئی ہے)۔

شانِ نزول:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم فرمایا، اور (یہ وہ وقت تھا جب مدینہ منورہ ہی دار الاسلام تھا، اور مدینہ منورہ کو ہجرت کرنا فرض تھا) تو بعض لوگوں نے ہجرت کرنے کا جب ارادہ کیا تو اہل وعیال، رشتہ دار، مال ومنال نے انہیں ہجرت کرنے سے روکا، بلکہ بیوی بچوں نے انہیں یہاں تک کہا کہ تم ہجرت پر جا کر ہمیں ضائع نہ کرو، پتہ نہیں ہمارا کیا حال ہوگا، وغیرہ۔ ان کی یہ بات سن کر بہت سے لوگوں نے ہجرت کا ارادہ ترک کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔ [معالم التنزیل]

چنانچہ فرمایا کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیں کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور تمہارا وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو، اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو (یہ ساری چیزیں) تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دے، اور اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی اعلان فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کرو، جب یہ دنیاوی چیزیں تمہیں ہجرت سے روک رہی ہیں یہ تمہارے لئے عذاب کا باعث ہیں، یہ عذاب دنیا میں

بھی آسکتا ہے اور آخرت میں تو بہر حال ترکِ ہجرت اور ترکِ جہاد پر عذاب ہے ہی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ترکِ ہجرت کی صورت میں ایمان بھی مقبول نہیں، جیسے سورۂ نساء میں فرمایا: ﴿فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾ [النساء:۹۷] (پس انہی لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے)۔ ہجرت پر قدرت رکھتے ہوئے ہجرت نہ کرنے والوں کے لئے وعید شدید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وعید پر نظر نہ رکھنا، اور رشتہ داریوں، تجارتوں اور گھروں کا خیال رکھنا اور ان کی محبت میں جہاد اور ہجرت کو چھوڑ دینا، یہ ایمان سے بھی دوری ہے، اور عقل سے بھی۔ پس جو شخص ایسا طرزِ عمل اختیار کر لے تو اس کا شمار فاسقوں اور نافرمانوں میں ہوگا، اور ایسے فاسقوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی نعمت سے محروم ہی رکھے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان قبول کرنے کے بعد ایمان کے تقاضے مسلمان کو شرعی احکام پر عمل کرنے کی دعوت دیتے ہیں، شرعی احکام میں بہت سی چیزیں ایسی آجاتی ہیں جو نفس پر گراں گزرتی ہیں، ان میں سے ہجرت بھی ہے، اور جہاد بھی ہے، اور ترکِ حرام وترکِ منکرات بھی ہیں۔

شریعت کے مطابق اپنوں، رشتہ داروں سے بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر قطع تعلق کرنا بھی ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے امور ہیں جو نفس کو ناگوار ہیں جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ۔ جو لوگ یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق ومالک ہے، اور ظاہری وباطنی تمام نعمتوں کا بخشنے والا منعم حقیقی ہے، تو اس کا حق سب سے زیادہ بھی ہے، اور مقدم بھی، اور مال بھی اس نے دیا ہے، اور تمام رشتہ داریاں بھی اسی نے پیدا فرمائی ہیں، تو ایسے لوگوں کو اسلامی احکام پر عمل کرنے میں کچھ بھی دشواری نہیں ہوتی، وہ لوگ بصد خوشی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور اطاعت کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہیں، اور ترجیح دیتے ہیں۔

اگر سارے جہاں کا متفقہ کوئی تقاضا اور مطلب ہو، دوسری طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا تقاضا سارے جہاں کے خلاف ہو تو وہ سارے جہاں سے قطع نظر کر کے صرف شریعت کو ترجیح دیتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ: ''کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں''۔ [بخاري و مسلم وغیرہ]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے اندر تین چیزیں

ہوں گی وہ ایمان کی مٹھاس پالے گا:

(۱) پہلا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔

(۲) دوسرا وہ شخص جو کسی بندہ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے محبت کرے (یعنی کسی اور چیز کی وجہ درمیان میں نہ ہو)۔

(۳) تیسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے کفر سے بچالیا وہ واپس کفر میں جانے کو ایسا ہی برا سمجھے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو برا سمجھتا ہے۔[بخاري]

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی نے کسی سے دوستی کی تو اللہ تعالیٰ کے لئے کی، اور اگر دشمنی کی تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے کی، اور مال خرچ کیا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے کیا، اور کسی جگہ خرچ کرنے سے اجتناب کیا تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے کیا، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔[ترمذي أبو داؤد]

مطلب یہ ہے کہ ایمانِ کامل کی نشانی اور سچے مخلص مسلمان کی یہی پہچان ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت واطاعت ساری خلقت کی محبت پر غالب ہو، اور اس کا ہر عمل اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکموں پر جاری ہو، جہاں خلافِ شرع کسی ادنیٰ عمل کا بھی تصور نہ ہو، لیکن اگر ایسا نہ ہوگا تو فریب وجھوٹ اور خیانت کے سوا کچھ نہ ہوگا، اور وہ شخص عملی منافق ہوگا، اور مستحقِ عذاب رہے گا، پس اسے عذابِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہئے۔

محبت کی اقسام اور تقاضے:

محبت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک محبت طبعی جس میں اختیار نہیں ہوتا، اسے محبتِ فطری بھی کہتے ہیں، یہ انسانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

دوسری محبتِ اختیاری، یہ محبتِ عقلی بھی ہے، اور شرعی بھی۔ اوپر جس محبت کا تذکرہ ہوا اس سے محبتِ اختیاری، عقلی اور شرعی مراد ہے، چونکہ غیر اختیاری امور کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مکلف نہیں بنایا (اور طبعی محبت اختیاری نہیں ہے) اس لئے اوامرِ شرعیہ میں محبتِ عقلی اور اختیاری مراد ہے، اگر کسی شخص کے دل میں طبعی طور پر آل و اولاد اور رشتہ داروں کی اور مال کی محبت ہو تو اس پر مواخذہ نہیں ہے، بشرطیکہ یہ طبعی محبت عقلی اور اختیاری محبت پر غالب نہ آجائے، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ کردے۔

ایمانی تقاضوں کا پورا کرنا بعض مرتبہ آل واولاد، مال اور دکانداری، تجارت کی محبت کی وجہ سے دشوار ہوجاتا

ہے، اور غیر اللہ کی محبت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر لگ جاتے ہیں، یہ سراسر گناہ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی بے احترامی ہے، جو کہ تباہ کن ہے۔ جو لوگ اپنے بال بچوں کی خوشحال زندگی کے لئے حرام مال جمع کرتے ہیں، اور ہر طرح خشک وتر سمیٹنے میں کمی نہیں کرتے، رشوت وصول کرتے ہیں، سودی کاروبار کرتے ہیں، تجارت میں خیانت کرتے ہیں، بدعات کا ارتکاب کرتے ہیں، وی سی آر اور ٹیلی ویژن خریدتے ہیں اور دیکھتے ہیں، غیر شرعی لباس اور غیر اسلامی تعلیم اور یہود و نصاریٰ کے طرز وطریق پر چلتے ہیں، اگرچہ یہ سب عزیزوں، رشتہ داروں، آل واولاد اور احباب کو خوش کرنے اور راضی رکھنے کی خاطر کرتے ہوں، پس انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان سے بڑا ناداں اور بے عقل کوئی نہیں کہ انہوں نے مٹی خریدی، سونا اور ہیرا بیچ دیا، دوسروں کی دنیا تو بنادی اور اپنا قیمتی ایمان اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گرانقدر محبت اور دوستی کھو بیٹھے، اور ضائع کردی، یہ لوگ قبل از موت اس قابل ہیں کہ ان کی تعزیت ہو۔

پس طبعی محبت سے فریفتہ ہو کر ایمانی محبت کو چھوڑ بیٹھنا نہایت خطرناک ہے، اور یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جن کے قلوب خوفِ خدا اور محبتِ الٰہی سے خالی ہیں۔

﴿اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِيْلِهٖ﴾ آیت کریمہ کے عموم میں اس طرح کی سب باتیں آجاتی ہیں، بہت سے نیک لوگوں کو ایمانیات کی محنتیں کرتے ہوئے اور جنت کا یقین رکھتے ہوئے اعمالِ صالحہ انجام دیتے ہوئے یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے کہ طبعی محبت بھی اللہ تعالیٰ شانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ ہو جاتی ہے، یہ مقام بہت ہی مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طبعی محبت بھی ہو، اور شرعی وعقلی بھی، یہ بہت ہی مبارک اور بلند وبلا مقام ہے۔ زہے نصیب! جسے حاصل ہو جائے۔ رأس المحدثین فخر المحققین حضرت الحافظ الحجۃ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی یہی زرین تحقیق ہے۔ [أنوار الباري]

.......❁.......❁.......❁.......

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٧﴾

ترجمہ: یہ واقعی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے بہت سے مواقع میں تمہاری مدد فرمائی، اور حنین کے دن بھی، جب تمہیں اپنی کثرت پر گھمنڈ ہو گیا، پھر اس کثرت نے تمہیں کچھ بھی فائدہ نہ دیا، اور زمین اپنی فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے ﴿۲۵﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مؤمنین پر اطمینانِ قلبی نازل فرمایا، اور ایسے لشکر اُتار دیئے جنہیں تم نہیں دیکھ رہے تھے، اور اللہ تعالیٰ شانہ نے کافروں کو عذاب دیا، اور یہ سزا ہے کافروں کی ﴿۲۶﴾ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ جس کی چاہے توبہ قبول فرمائے، اور اللہ تعالیٰ شانہ بخشنے والا مہربان ہے ﴿۲۷﴾

معارف ومنازل

آیت نمبر ۱۴ میں فرمایا تھا کہ مشرکین سے جہاد کرو، اور کسی قسم کا خوف نہ کرو، اس کے بعد مسلسل جہاد کا تذکرہ ہو رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنی نصرت کا اعلان فرما رہے ہیں، حتّٰی کہ حنین کا تذکرہ اور نزولِ ملائکہ جیسی نصرت کا ذکر فرما کر ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کی تسلی فرما دی، چونکہ حنین کے معرکے میں بہت سے عجیب وغریب واقعات رونما ہوئے، اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا تذکرہ فرمایا۔

غزوہ حنین کا مختصر واقعہ اور روئیداد:

حنین مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے، جو مکہ مکرمہ سے پندرہ میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، رمضان ۸ھ ہجری میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور قریشِ مکہ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مال دار قبیلہ ''ہوازن'' جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے ''بنو ثقیف'' بھی تھے، ان میں ہلچل مچ گئی، انہوں نے جمع ہو کر یہ کچھ کہنا شروع کیا کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوت حاصل ہوگئی ہے، اس سے فارغ ہونے کے بعد لازمی ہے کہ ان کا رخ ہماری طرف ہوگا، اس لئے دانشمندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم خود ان پر حملہ کر دیں۔

اس کام کے لئے قبیلہ ہوازن نے اپنی سب شاخوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کر لیا، اس قبیلے کے سب بڑے چھوٹے بجز معدودے چند افراد کے جن کی تعداد (۱۰۰) سو سے بھی کم تھی سب ہی جمع ہوگئے (اس تحریک کا سربراہ اور بڑا لیڈر مالک بن عوف تھا جو بعد میں مسلمان ہوگئے۔ رضی اللہ عنہ۔ اور اسلام کے بڑے علمبردار ثابت ہوئے، اس وقت مسلمانوں کے خلاف حملہ کا سب سے زیادہ جوش انہی میں تھا)۔

قبیلہ کی عظیم اکثریت نے ان کی رائے سے اتفاق کر کے جنگ کی تیاریاں شروع کردیں، اس قبیلہ کی چھوٹی چھوٹی دوشاخیں بنو کعب اور بنو کلاب اس رائے سے متفق نہیں ہوئیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ بصیرت دی تھی، انہوں نے کہا: اگر مشرق سے مغرب تک ساری دنیا بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جمع ہو جائے تو وہ ان سب پر غالب آجائیں گے، اس کے سر پر ربّ تعالیٰ کا ہاتھ ہے، ہم خدا کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے، اس لئے یہ دونوں قبیلے میدان جنگ میں نہیں آئے، اور ان کے علاوہ دیگر تمام قبائل سب کے سب نے معاہدے کئے، اور مالک بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان سب کو پوری قوت سے جنگ پر قائم رہنے کی ایک تدبیر یہ کی کہ ہر شخص کے تمام اہل وعیال بھی ساتھ چلیں، اور اپنا اپنا پورا مال بھی ساتھ لے کر نکلیں، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میدانِ جنگ سے اگر بھاگنے لگیں گے تو بیوی بچوں اور مال کی محبت ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائے گی، میدان سے گریز کا ان کے لئے کوئی موقع نہ رہے گا۔

کفار کے لشکر کی تعداد کے بارے میں اہلِ تاریخ کے مختلف اقوال ہیں۔ حافظ الحدیث علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے راجح اس کو قرار دیا ہے کہ مکمل لشکر کی تعداد (۲۴) چوبیس یا (۲۸) اٹھائیس ہزار تھی، اور لڑنے والے جوان شاید چار ہزار تھے۔

بہر حال سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں ان کے خطرناک عزائم کی اطلاع دی گئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مقابلہ پر جانے کا عزم فرمالیا، مکہ مکرمہ پر حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا، اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ لوگوں کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لئے چھوڑا، اور قریشِ مکہ سے اسلحہ اور سامانِ جنگ عاریت کے طور پر مانگا۔ صفوان بن امیہ جو قریش کا سردار تھا بول اٹھا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سامانِ جنگ ہم سے غصب کر کے لینا چاہتے ہیں؟ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ عاریت کے طور پر لیتے ہیں، پھر واپس کرتے ہیں۔ یہ سن کر اس نے ایک سو (۱۰۰) زرہیں مستعار دیدیں۔ اور نوفل بن حارث نے تین ہزار نیزے اسی طرح عاریۃً پیش کر دیے۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم چودہ ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کا لشکر لے کر اس جہاد کی طرف مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے، جن میں بارہ ہزار انصارِ مدینہ تھے، جو فتح مکہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے، اور دو ہزار وہ مسلمان تھے جو مکہ اور اطراف مکہ کے لوگوں میں سے بوقتِ فتح مکہ مسلمان ہو گئے تھے، جن کو طلقاء کہا جاتا ہے۔

شوال کی چھٹی تاریخ ہفتہ کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس غزوہ کے لئے نکلے، اور فرمایا کہ کل ان شاء اللہ تعالیٰ ہمارا

قیامِ خیف بنی کنانہ کے اس مقام پر ہوگا، جہاں قریشِ مکہ نے جمع ہو کر مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کے لئے عہد نامہ لکھا تھا، اور اپنے کفر پر جمے رہنے کی قسم کھائی تھی۔

بعض روایات میں ہے کہ مدینہ سے جو لشکر آیا تھا وہ دس ہزار نفوسِ قدسیہ پر مشتمل تھا، اور مکہ سے طلقاء کا لشکر دو ہزار کا تھا، یہ کُل بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ بہر حال مجاہدین کا لشکر مکہ سے جہاد کے لئے روانہ ہوا، ان کے ساتھ مکہ مکرمہ کے بے شمار لوگ مرد و عورت تماشائی بن کر نکلے، جن کے دلوں میں ابھی تک اسلام راسخ اور مستحکم نہ تھا، اور وہ یہ خیال کر کے نکلے تھے کہ اگر اس معرکہ میں مسلمانوں نے شکست کھائی تو ہمیں بھی اپنا انتقام لینے کا موقع ملے گا، اور اگر مسلمان کامیاب ہو گئے تو ہمارا کوئی نقصان بھی نہ ہوگا۔

اسی قسم کے لوگوں میں شیبہ بن عثمان رضی اللہ عنہ بھی تھے، جنہوں نے بعد میں مسلمان ہو کر خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ غزوۂ بدر میں میرا باپ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے، اور میرا چچا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا، جس کا جوشِ انتقام اور انتہائی غیظ و غصہ میرے دل میں تھا، میں اس موقع کو غنیمت جان کر مسلمانوں کے ساتھ چل پڑا کہ اگر کہیں موقع پاؤں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کر دوں، میں ان کے ساتھ ہو کر مسلسل ایسے موقع کی تلاش میں رہا، یہاں تک کہ اس جہاد کے ابتدائی وقت میں جب کچھ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے، مگر دیکھا کہ داہنی طرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ ان کی حفاظت کر رہے ہیں، اور بائیں طرف ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ حفاظت کر رہے ہیں، اس لئے میں پیچھے کی طرف پہنچ کر ارادہ ہی کر رہا تھا کہ یکبارگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تلوار سے حملہ کر دوں کہ یکایک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ رحمت مجھ پر پڑی، لگتا تھا کہ فرشتہ نے انہیں میری طرف دیکھنے کا اشارہ کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی کہ شیبہ! یہاں آجاؤ، اپنے قریب بلا کر دستِ مبارک میرے سینے پر رکھ دیا، جس سے میری تقدیر بدل گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی کہ: یا اللہ! اس سے شیطان کو دور کر دے، اب جو میں نظر اٹھاتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے دل میں اپنی آنکھ، کان اور جان سے بھی زیادہ محبوب نظر آتے ہیں، پھر مجھے حکم دیا کہ جاؤ کفار کا مقابلہ کرو۔ اب تو میرا حال یہ ہوا کہ میں اپنی جان آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کر رہا تھا، اور بڑی بے جگری اور قوت کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا۔

اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد سے واپس آئے تو میں خدمت گرامی میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دل کے تمام خیالات کی نشاندہی فرمائی کہ تم مکہ سے اس نیت پر چلے تھے، اور میرے گرد میرے قتل کے لئے

گھوم رہے تھے، مگر اللہ تعالیٰ جل جلالہ کا ارادہ تم سے نیک کام لینے کا تھا جو ہو کر رہا۔اسی طرح کا واقعہ نضر بن حارث رضی اللہ عنہ کو بھی پیش آیا کہ وہ بھی اسی نیت سے حنین گئے تھے، وہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعقیدت ڈال دی، پھر انہوں نے غازی بن کر کفار کے ساتھ جہاد کیا۔

خود پسندی اور فخر ومباہات اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے:

اس سفر میں مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت تھی، یعنی بارہ ہزار کا جرار لشکر تھا، کچھ لوگوں نے یہ کہا تھا: لَنْ نُغْلَبَ الْيَوْمَ مِنْ قِلَّة ۔آج ہم تعداد کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے، جس میں شائبہ فخر ومباہات (خود پسندی) کا تھا، اور یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ شروع میں مسلمانوں کو شکست ہوئی، اور وہ منتشر ہو گئے، جم کر نہ لڑ سکے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے فتح سے ہمکنار فرمایا۔

مقام حنین پہنچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا، حضرت سہیل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں یہ خبر لے کر آئے کہ گھوڑے سوار شخص ابھی دشمن کی طرف سے آئے، اور اطلاع دی کہ قبیلہ ہوازن پورا کا پورا بیوی ، بچوں اور اموال سمیت مقابلہ کے لئے آئے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تبسم فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ کوئی بات نہیں، یہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے جمع ہوا ہے، یہ مال غنیمت بن کر مسلمانوں کا ہوگا۔

اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن حدادرضی اللہ عنہ کو جاسوس بنا کر دشمن کے پاس بھیجا، وہ وہاں جا کر دو دن رہے، واپس آ کر ہر ہر چیز کا حال اور دشمن کے تمام عزائم اور جنگی تدبیروں سے اور ان کے فخر وغرور کے حالات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع فرمایا۔ جب شروع میں دشمن کے لوگ مختلف گھاٹیوں سے چھپ کر چاروں طرف سے پوری قوت سے حملہ آور ہوئے ، اور یہ لوگ پورے عرب میں تیراندازی کے فن میں مانے ہوئے جنگجو تھے، اور صبح کا وقت تھا، تو مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، کیونکہ ان کا حملہ اچانک بھی تھا، اور چاروں طرف سے بھی تھا، اور پہاڑی گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے، اور نظر بھی نہیں آ رہے تھے۔

مسلمان وادی میں تھے، اور گزرنے کی حالت میں تھے، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ وادی سے عبور کرنے کے بعد کسی میدان میں لڑائی ہوگی، جبکہ خلاف توقع وقت اور مقام سے پہلے ان پر ہر طرف سے حملہ ہوا، مسلمان جب اس ناگہانی حملہ سے منتشر ہو گئے تو دشمن کو خوشی ہوئی، جبکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم دُلدل نامی سفید خچر پر سوار تھے، اور چند جان نثار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر آگے بڑھ رہے تھے۔حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ آپ

زور سے آواز لگاؤ کہ اے اصحابِ شجرہ! اے جہاد پر بیعت کرنے والو! ادھر آؤ، سید عالم ﷺ یہاں ہیں، ان کے گرد جمع ہو جاؤ۔ اس آواز نے بجلی کی طرح پوری وادی میں گونج کر سب کو آگاہ کیا، تو وہ سارے پوری دلیری کے ساتھ واپس لوٹے، اور بڑی بے جگری کے ساتھ دشمن پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے شکاری شہباز پرندوں پر حملہ آور ہوتا ہے۔

پس مختصر وقفہ میں دشمن بھاگ گیا، ستر کے قریب ان کے جنگجو ہلاک ہو گئے، چھ ہزار کے قریب قیدی بنائے گئے، ان کی بیوی بچے اور مال و سامان میدان میں رہ گئے، باقی لشکر والے اپنے قائد مالک بن عوف رضی اللہ عنہ سمیت بھاگ کر طائف کے قلعہ میں محبوس ہو گئے، مال غنیمت کو نہایت سلیقہ و آرام سے جمع کیا گیا، جو یہ ہے: چار ہزار اوقیہ چاندی، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں، مرد، عورت اور ہر عمر کے بچے بچیاں پندرہ ہزار کے قریب قیدی بنائے گئے، اور ان سب کو کچھ فاصلہ پر مقامِ جعرانہ میں ایک بہت بڑے میدان میں سلیقہ کے ساتھ جمع کیا گیا۔

اس جنگ کے مختصر حالات:

غزوۂ حنین اور اس میں پیش آنے والے واقعات کی تفاصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھی جائیں، یہاں اختصار کے ساتھ بطورِ اشارہ ان کا تذکرہ ہوگا۔

(۱) اس جنگ کے شروع میں مسلمانوں کو غیر ارادی طور پر شکست ہوئی۔

(۲) حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اعلان پر مسلمان واپس لوٹے اور کامیابی و فتح حاصل کی۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر سکینہ و جرأت کا نزول فرمایا۔

(۴) آسمانوں سے فرشتوں کا نزول ہوا، جس سے دشمن مرعوب و مغلوب ہوئے۔

(۵) دشمن یہاں سے بھاگ کر دوسرے مقامات پر جمع ہو گئے، مسلمانوں نے ہر مقام پر ان کا تعاقب کیا، اور انہیں شکست دیدی۔

(۶) اس کے بعد طائف کا محاصرہ کیا گیا جو پندرہ یا سترہ روز جاری رہا، جس میں سات آدمیوں سے لے کر بارہ افراد تک شہید اور زخمی ہوئے، اور طائف فتح نہ ہوا، اس کو یوں ہی چھوڑ دیا گیا۔

(۷) شوال کا مہینہ ختم ہوا تھا، ذوالقعدہ کے اوائل میں آپ ﷺ مقامِ جعرانہ تشریف لائے، اور بارہ دن تک انتظار فرمایا کہ اگر قبیلہ ہوازن کے لوگ اسلام قبول کر کے آئے تو ان کے قیدی اور اموال سارے واپس کر دیں

گے، مگر وہ نہیں آئے، تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال غنیمت تقسیم فرمایا۔

(۸) مکہ سے جو لوگ اخلاص کے ساتھ مؤلفۃ القلوب بن کر آئے تھے، یا جو لوگ ایک تذبذب کے ساتھ تماشابین بن کر آئے تھے، فتح ونصرت دیکھ کر پھر اسلام میں داخل ہو گئے، اکثر مال انہی لوگوں پر تقسیم ہوا، اور مہاجرین کو بھی کچھ حصہ عطا ہوا، اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ پر عمل ہوتا رہا۔

(۹) چونکہ انصار کو مالِ غنیمت میں حصہ نہیں ملا کچھ لوگوں کی ناراضگی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مطمئن فرمایا، اور راضی فرمایا، پھر وہ خوش ہو گئے۔

(۱۰) تقسیم اموال کے بعد ہوازن کا وفد تائب ہو کر آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے صرف قیدیوں کے متعلق سفارش فرمائی، جو کہ لوگوں نے بخوشی منظور کی، اور ان کے بیوی بچوں کی واپسی ہو گئی، تقسیم شدہ اموال انہیں نہیں ملے۔

(۱۱) پھر تقسیمِ غنائم کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقامِ جعرانہ سے عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ معظمہ پہنچے، اور عمرہ ادا فرمایا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تیسرا عمرہ تھا۔

(۱۲) عمرہ سے فراغت کے بعد مکہ کے باشندوں کے لئے ہر قسم کے انتظامات کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مدینہ منورہ سے آئے ہوئے لشکر کے ساتھ دارُالہجرۃ مدینہ منورہ روانہ ہو گئے، اور جس چیز نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب سے زیادہ رنجیدہ و پریشان کیا تھا بحمدہٖ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ختم فرمایا، اور مکہ مکرمہ بھی مدینہ منورہ کی طرح دارُ الاسلام بن گیا، اس کے ساتھ تمام قبائلِ عرب نے فوج درفوج دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہوئے جہاد کے لئے نام لکھوایا، بنوثقیف وہوازن وغیرہ اقوام بھی مسلمان ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے گئے، اور پورے جزیرہ پر اسلام کا علم بلند ہوا۔ الحمد للہ

اظہارِ عقیدت:

ربّ العزت سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کھربوں رحمتوں کا نزول ہو، اور کائنات کے تمام ذرات کی طرف سے کھربوں اور بے شمار صلوٰۃ وسلام اور تحیات کا نزول ہو اس ذات عالی صفات افضل واشرف کائنات خاتم النبوۃ حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جن کی بدولت تمام ظلمتیں مٹ گئیں، اور کیڑے مکوڑوں، گھاس وپتھر سے کم قیمت انسانوں کو وہ عظیم وبالا عروج حاصل ہوا جس کی بدولت وہ اس قابل ہو گئے کہ روزِ قیامت انہیں دیدارِ الٰہی حاصل رہے گا، اور اگر کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کوئی خصوصی نسبت یا رشتہ پیدا کیا تو اس کے مقام کا کوئی اندازہ

شاید نہ ہو۔

ہوازن کے انہی قیدیوں میں اکسٹھ سالہ بوڑھی عورت حضرت حلیمہ سعدیہ کی بیٹی اور آپ ﷺ کی دودھ شریک رضاعی بہن حضرت شیماء رضی اللہ عنہا بھی تھیں، انہوں نے کسی صحابی سے کہا کہ میں تمہارے نبی کی بہن ہوں، توانہوں نے رحمت عالم ﷺ سے ذکر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: انہیں جلدی حاضر کرو، جب وہ عمر رسیدہ بہن آپہنچی تو آپ ﷺ نے استقبال فرمایا، اور اپنی گرانقدر عظیم المرتبت چادر بچھا کر اس پر انہیں بٹھا دیا، اور آپ ﷺ آبدیدہ ہو گئے، پھر انہیں کلمہ پڑھایا، اور فرمایا کہ اگر میرے پاس رہو تو آپ کی ہر طرح خدمت کروں گا، اگر اپنے قبیلے کے ساتھ رہنا چاہو تو بھی آپ کی خدمت کروں گا، پھر انہیں اونٹ، چند بکریاں اور ۳ غلام اور ایک باندی عنایت فرما کر رخصت کیا۔

جہاں جہاں گزر ہوا وہاں وہاں سحر ہوئی ☆ جہاں نہیں ہوا گزر وہاں ہے رات آج تک

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۲۸

ترجمہ: اے ایمان والو! مشرکین پلید ہیں، وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آئیں، اور اگر تم فقر سے ڈرتے ہو تو عنقریب اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے فضل سے غنی کردے گا، اگر چاہے، بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا، حکمت والا ہے ۲۸

معارف ومنازل

جب اللہ تعالیٰ نے شرک کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کا مرکزی مقام مکہ معظمہ دار اسلام بنا دیا، اور مہبط وحی سے تین سو ساٹھ ناپاک ونجس بتوں کا راج ختم کر دیا، اور اپنے نبی سید الانبیاء ﷺ کو کفار ومشرکین عرب پر غلبہ عطا فرمایا، پس عرب کے قبائل جوق در جوق دائرۂ اسلام میں فوراً داخل ہونے لگے، اور ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [التوبۃ:۳۳] (تاکہ اللہ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کردے) کا جو وعدہ ہو چکا تھا افق پر اس کے انوار و برکات اور تمام آثار کا ظہور ہونے لگا۔

تو ۹ھ میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ آئندہ کوئی ناپاک مشرک مسجد حرام میں داخل نہ ہو، بلکہ اس کے نزدیک حدودِ حرم میں بھی کوئی کافر نہ آنے پائے، کیونکہ ان کے قلوب شرک وکفر کی نجاست اور گند سے اس قدر پلید وناپاک ہیں کہ سب سے بڑے اور مقدس مقام اور توحید وایمان کے مرکز میں داخل ہونے کے لائق نہیں ہیں، جس کی طرف بُول وبَراز میں ہزاروں میل دور سے استقبال واستدبارِ قبلہ کی اجازت نہ ہو، وہاں مشرک وکافر کے داخلہ کی کیا گنجائش ہے؟ لطف یہ ہے کہ جب کعبۃ اللہ کی حدودِ حرم سے جہاں ناپاک معبودوں کا اخراج وخاتمہ ہو چکا ہے وہاں ضروری ہے کہ ناپاک پجاریوں اور عبادت گزاروں کا بھی اخراج اور خاتمہ ہو۔

صحیح احادیث اس بات پر ناطق اور گواہ ہیں کہ سرورِ عالم ﷺ نے جزیرۃ العرب سے مشرکین اور یہود ونصاریٰ کو نکال دینے کا حکم دیا، چنانچہ آپ ﷺ کی آخری وصیت کے مطابق فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں عملی طور پر اس کو نافذ کیا گیا، جب مشرکین اور کفار کے لئے جزیرۃ العرب میں رہنے کی گنجائش نہ رہی تو حرم کے اندر یا حدودِ حرم میں کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟

جب اس بندش کا حکم سامنے آیا تو مکہ واطراف کے مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ ہماری تجارت اور معیشت کو اس سے نقصان ہوگا، اور جو سامانِ تجارت کفار کے ذریعہ یہاں پہنچتا تھا اب وہ بند ہو جائے گا، اور ہماری معیشت تباہ ہو جائے گی، اس موہومی اندیشہ کو دور فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ﴾ تسلی دیتے ہوئے فرمایا: گھبراؤ مت، اگر تم کو خوشحالی کی چاہت ہے تو وہ تمہارے لئے ہے، وہ دن دور نہیں فتوحات کا دروازہ کھل جائے گا، اور مشرق ومغرب سے جنوب وشمال سے فتوحات کے ذریعہ بے شمار اموالِ غنائم کی تمہاری طرف یلغار ہوگی، نہ قیصر رہے گا نہ کسریٰ، نہ مصر رہے گا نہ شام وعراق، سارے جہاں کے اموال تمہاری قدم بوسی کرتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے، یہاں تک کہ تمہارے ملک میں زکوٰۃ قبول کرنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ یہ ہے مطلب: ﴿فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ﴾ کا۔

چنانچہ مختصر مدت میں یہ وعدۂ ربانی اس طرح پورا ہوا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی، صحرائے عرب کے اونٹوں کے حدی خوان چرواہے پورے عالم پر اس طرح چھا گئے کہ دو تین ہزار سالوں سے قائم شدہ ترقی یافتہ عظیم سلطنتوں سے ٹکرائے، اور انہیں چند لمحوں میں نیست ونابود کر کے رکھ دیا، جو بھی ان کے ساتھ ٹکرایا پاش پاش ہوا، روم وفارس کی عظیم

سلطنتوں کوتہ وبالا کر کے اسلامی بلکہ دنیاوی تاریخ میں جرأت وبہادری کی داستان رقم کی، بغیر کشتی کے دریاؤں میں گھوڑے دوڑائے۔ ؎

دشت تو دشت تھے دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے ☆ بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے
اے موج دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو ☆ اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
(اقبالؒ)

فرمایا: ﴿اِنَّمَا الۡمُشۡرِكُوۡنَ نَجَسٌ﴾ اردو میں نجس ناپاک پلید کو کہتے ہیں، یہ مصدر کا حمل زَیۡدٌ عَدۡلٌ کی طرح مبالغہ کے لئے ہے کہ شرک عینِ غلاظت وناپاکی ہے، یعنی مجسم نجاست ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر سراسر نجاست وگندگی کا ڈھیر ہے۔

اور نجاست کہا جاتا ہے ہر گندگی کو، جس سے انسان کی طبیعت نفرت کرے، بشرطیکہ انسان انسان ہو، بھنگی اور چوڑا نہ ہو۔ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں وہ نجاست بھی داخل ہے جو آنکھ، ناک، یا ہاتھ وغیرہ سے محسوس ہو، اور وہ بھی جو علم وعقل کے ذریعہ معلوم ہو اس لئے لفظِ نَجَس اس غلاظت اور گندگی کو بھی شامل ہے جو ظاہری طور پر سب محسوس کرتے ہیں، اور اس معنوی نجاست کو بھی جس کی بنا پر شرعاً وضو یا غسل واجب ہوتا ہے، جیسے جنابت، حیض ونفاس ختم ہونے کے بعد کی حالت اور وہ باطنی نجاست بھی جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے، جیسے عقائدِ فاسدہ، کفر وشرک، منافقت اور اخلاقِ رذیلہ مذمومہ وغیرہ۔

آیت کریمہ میں اِنَّمَا حصر کے لئے ہے، پس معنی یہ ہوں گے کہ مشرکین نری نجاست ہی ہیں، اور صحیح بات یہ ہے کہ عام طور پر مشرکین کفار یہود ونصاریٰ وغیرہ میں یہ تینوں قسم کی نجاستیں ہوتی ہیں، کیونکہ بہت سی ظاہری ناپاک چیزوں کو وہ ناپاک نہیں سمجھتے، اس لئے ان ظاہری نجاستوں سے وہ کبھی نہیں بچتے ہیں، جیسے شراب (اُمُّ الۡخَبائِث) اور اس سے بنی ہوئی چیزیں، اور معنوی نجاست سے غسلِ جنابت وغیرہ کے تو وہ معتقد ہی نہیں ہیں، اسی طرح عقائدِ فاسدہ باطلہ اور اخلاقِ رزیلہ مذمومہ کو بھی وہ کچھ نہیں سمجھتے ہیں، اسی لئے آیت کریمہ میں مشرکین کو نری نجاست قرار دے کر یہ حکم دیا گیا۔ فرمایا:

﴿فَلَا يَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ بَعۡدَ عَامِهِمۡ هٰذَا﴾ حکم یہ ہے کہ یہ مشرکین اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ جاسکیں۔ مسجد حرام کا لفظ عام طور پر تو اس جگہ کے لئے بولا جاتا ہے جو بیت اللہ شریف کے گرد چار

دیواری سے گھری ہوئی ہے، لیکن قرآن وحدیث میں بعض اوقات یہ لفظ پورے حرمِ مکہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، اور جمہور علماء کے نزدیک یہی معنی مراد ہے، جو کئی میل مربع کا رقبہ اور چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قائم کردہ حدود سے گھرا ہوا ہے، حضرت الشیخ علامہ ابن الملقن رحمۃ اللہ علیہ نے حدودِ حرم مکہ کو نظم کیا ہے، جو یہ ہے:

وَلِلْحَرَمِ التَّحْدِيْدُ مِنْ اَرْضِ طَيْبَةٍ ★ ثَلٰثَةُ اَمْيَالٍ اِذَا رُمْتَ اِتْقَانَهٗ

ترجمہ: حرم شریف کی حد مدینہ طیبہ کی جانب سے تین میل ہے، جبکہ تو اس کا قصد کرے۔

وَسَبْعَةُ اَمْيَالٍ عِرَاقٍ وَّطَائِفٍ ★ وَجِدَّةٍ عَشْرٌ ثُمَّ تِسْعٌ جِعْرَانَةٍ

ترجمہ: عراق اور طائف کی طرف سے سات میل ہے، اور جدہ کی طرف دس میل، اور جعرانہ کی طرف نو میل ہے۔

وَمِنْ يَمَنٍ سَبْعٌ بِتَقْدِيْمِ سِيْنِهَا ★ وَقَدْ كَمُلَتْ فَاشْكُرْ لِرَبِّكَ اِحْسَانَهٗ

ترجمہ: اور یمن کی طرف سے سات میل ہے، اور البتہ حدودِ حرم کی پوری ہوگئیں سو تم اپنے رب کے احسان کا شکر ادا کرو، سبع میں سین پہلے ہے، تاکہ تِسع سے مشتبہ نہ ہو۔ [الدر المختار]

جیسا کہ واقعۂ معراج میں ہے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [الإسراء: ١] (پاک ہے وہ ذات جو رات کے وقت اپنے بندے کو مسجد سے حرام سے لے گیا)۔ یہاں مسجدِ حرام سے مراد بالاتفاق حدودِ حرم ہے، کیونکہ واقعۂ معراج مسجد حرام کی چاردیواری کے اندر سے نہیں، بلکہ مسجد حرام سے باہر حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کے مکان سے ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: فُرِجَ سَقْفُ بَيْتِيْ۔ جس گھر میں استراحت کررہے تھے یکایک اس کی چھت کھل گئی، اور فرشتے اُتر گئے، اسی طرح آیت کریمہ: ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [التوبۃ: ٧] (مگر وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا مسجد حرام کے پاس) یہاں بالاتفاق مسجد حرام سے پورا حرم مراد ہے، کیونکہ جس واقعہ ومعاہدہ صلح کا اس میں ذکر ہے وہ مسجد حرام سے نو میل دور مقامِ حدیبیہ میں ہوا ہے، جو حدودِ حرم سے متصل ہے۔

تو جمہور علماء کی تفسیر کے مطابق مسجد حرام سے اس جگہ پورا حرم مراد ہے، اور یہ ممانعت کسی ظاہری نجاست کی بنیاد پر نہیں، بلکہ کفر وشرک کی نجاست کی بنیاد پر ہے، اسی لئے صرف مسجد حرام میں مشرکین کا داخلہ ممنوع نہیں کیا گیا،

بلکہ پورے حرم محترم میں ممنوع قرار دیا گیا، کیونکہ وہ اسلام کا "حِمٰی" اور قلعہ ہے، اس میں کسی کافر ومشرک کے دخول اور آمد کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ آج موجودہ زمانہ میں بھی مملکت عربیہ سعودیہ نے چاروں طرف حدودِ حرم کی نشاندہی کی ہے، اور دیوار کی شکل میں وہاں باقاعدہ منارے تعمیر کیے ہیں، جس کے ساتھ بڑے سائز کے بورڈ لگے ہوئے ہیں، جن پر بہت جلی کتابت سے لکھا ہوا ہے: "مَمْنُوْعٌ دُخُوْلُ غَیْرِ الْمُسْلِمِیْن"۔ ان حدود کے اندر غیر مسلمین کا داخلہ ممنوع ہے۔

تین غور طلب باتوں کا بیان اور وضاحت:

آیت کریمہ میں جو حکم دیا گیا ہے کہ ۹ھ کے بعد کوئی مشرک مسجد حرام کے پاس نہ جانے پائے، اس کے متعلق تین باتیں غور طلب ہیں:

اول یہ کہ یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہے یا دنیا کی دوسری مساجد بھی اسی حکم میں داخل ہیں؟

دوم یہ کہ اگر مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہے تو کسی مشرک کا داخلہ مسجد حرام میں مطلقاً ممنوع ہے، یا صرف حج وعمرہ کے لئے داخلہ کی ممانعت ہے؟

سوم یہ کہ اس ممانعت میں کفار اہل کتاب یہود ونصاریٰ بھی شامل ہیں یا نہیں؟

ان تفصیلات کے مطابق چونکہ الفاظ قرآن ساکت ہیں، اس لئے اشارات قرآن اور روایات حدیث کو سامنے رکھ کر ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق احکام وضع کیے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ فقہاء مدینہ حضرت امام مالک وغیرہ رحمہم اللہ نے واضح کیا ہے کہ مشرکین وکفار ہر معنی کے اعتبار سے نجس ہیں، ظاہری نجاست سے بھی عموماً اجتناب نہیں کرتے، اور جنابت وغیرہ کے بعد غسل کا اہتمام بھی نہیں کرتے، اور کفر وشرک کی نجاست تو ان میں ہے ہی، اس لئے یہ حکم تمام مشرکین اور تمام مساجد کے لئے عام ہے۔ اور اس کی دلیل میں حضرت امیر المؤمنین خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا قول پیش فرمایا، جس میں انہوں نے امراء بلاد کو اور مملکت کے حکام کو تاکید کے ساتھ ہدایت کی تھی کہ کفار کو مساجد میں داخل نہ ہونے دیں، اور یہ فرمایا تھا کہ: اِنِّیْ لَا اُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَّلَا لِجُنُبٍ۔ یعنی مسجد میں داخل ہونا کسی حائضہ عورت یا جنبی شخص کے لئے حلال نہیں سمجھتا، اور یہ واضح ہے کہ کفار ومشرکین ہمیشہ جنب اور ناپاک ہوتے ہیں، جبکہ عقیدہ کی نجاست تو ان تمام نجاستوں سے بدتر اور زیادہ ہے۔ [قرطبي]

☆☆☆

فائدہ:

سعودیہ عربیہ میں کفار ومشرکین اہل کتاب وغیرہ سب پر پابندی ہے کہ صرف حرم مکہ نہیں، بلکہ حرم مدینہ طیبہ میں بھی ہر قسم کی ممانعت ہے، میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بڑے غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے، اور یہی آیت کریمہ کا مطلب ومراد ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس پر دائم وقائم رکھے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا
يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝

ترجمہ: ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتے، اور اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے، اور دین حق کو قبول نہیں کرتے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں کتاب دی گئی، ان سے یہاں تک جنگ کرو کہ وہ ماتحت ہو کر ذلت کی حالت میں اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں ۝

معارف ومنازل

شروع سورۂ براءت سے لے کر یہاں تک مشرکین کے ساتھ جہاد کا حکم اور بیان ہوا، اب اہلِ کتاب کے ساتھ جہاد جاری رکھنے کا بیان ہے، یا یہ کہا جائے گا کہ اسلام دنیا میں اس لئے آیا کہ پورے عالم سے کفر و بے دینی کا خاتمہ ہو، ﴿وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ﴾ [البقرۃ:۱۹۳] (اور دین اللہ کا ہو جائے)۔ پورے عالم میں توحیدِ الٰہی کا دور دورہ اور غلبہ ہو۔

پہلے نزدیک ترین کفار کے ساتھ جہاد ہوا، اور فتح مکہ کے ساتھ مشرکین کا غلبہ اور شوکت دب گیا، تو اب باقی کفار کے ساتھ جہاد کا حکم ہوا، تاکہ ان کی شوکت بھی دب جائے، اور اسلام کے تابع ہوں۔ پس جاننا چاہئے کہ اسلام عالمگیر دین ہے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت پورے عالم کے لئے ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہرگز نہیں کہ کفر کو پورے عالم سے ختم کیا جائے، اور اس کی بیخ وبنیاد کا خاتمہ ہی کیا جائے۔ ہاں! یہ ضروری ہے کہ کفر کی شوکت اور بالادستی کا خاتمہ ہو۔ پہلے مرحلہ میں جزیرۂ عرب سے اس کے بعد باقی دنیا سے، چونکہ فتح مکہ کے ساتھ ایک حد تک یہ

مطلب پورا ہوا، اب باقی دنیا کی باری ہے۔

اسلام امن پسند دین ہے، وہ انسانوں کا تحفظ کرتا ہے، اسلام نے جانوروں کے حقوق کی نشاندہی کر کے ثابت کیا کہ انسانوں کی بھلائی اور حقوق کا تحفظ اوران کی آبادی اور خوشحالی کا اسلام علمبردار ہے، اسلام کسی قتل وقتال اور خونریزی کا حامی نہیں۔ البتہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق و مالک کی توحید عام ہو، اور کفر و معاصی کی بغاوت کا خاتمہ ہو، اور دنیا سے فتنہ وفساد کا قلع قمع ہو۔ پس اگر یہ مطلب دعوت وتبلیغ سے پورا ہو تو جہاد کی ہرگز ضرورت نہیں رہی۔

پہلے فرمایا: ﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ﴾[التوبة: ۵]۔ اسی طرح فرمایا: ﴿فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾[التوبة: ۱۱]۔ یعنی اگر یہ لوگ کفروشرک سے تائب ہو کر نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو، کیونکہ اب وہ تمہارے دینی بھائی ہو گئے۔

ہاں! اگر یہ مسئلہ تبلیغ سے حل نہ ہوا تو پھر ان کی حوصلہ شکنی فرض ہے، اور وہ پانچ مراحل کے ساتھ متعلق ہے، کیونکہ اہل کتاب کا کفر عناد پر مبنی ہے، اور مشرکین کا کفر جہالت پر مبنی ہے، اسلام پہلے انہیں ایمان قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے، اگر وہ مان گئے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تو قصہ ختم، ورنہ دوسرے مرحلہ پر مشرکین سے یہ کہا جائے گا کہ تمہارے ساتھ جہاد ہوگا، اگر وہ جزیہ دینے پر راضی ہو گئے تو ان سے جزیہ قبول نہ ہوگا صرف اسلام یا جہاد۔

بخلاف اہل کتاب کے، کہ ان کے مراحل تین ہیں: اول اسلام، دوئم جزیہ، سوئم جہاد۔ یہ اس لئے کہ ان کے پاس پیغمبر ہے، آسمانی کتاب نور و معرفت ہے، انہوں نے اگرچہ اپنی کتاب میں تحریف کی ہے مگر ان کا دین برحق ہے، اگر ان میں سے کوئی مسلمان ہوگا تو اسے دوہرا ثواب ملے گا۔ بخلاف مشرکین کے کہ ان کا دین ہی نہیں، وہ محض مشرک عبادالشیطان ہیں، ان کا جزیہ بھی قبول نہیں، اور مسلمان ہونے کی صورت میں دوہرے ثواب کے بھی مستحق نہیں۔ یہ ہے دونوں میں فرق۔

جزیہ سے مقصد حصولِ مال نہیں، بلکہ غلبۂ اسلام ہے:

جزیہ وہ رقم ہے جو ذمیوں سے لی جاتی ہے، جزیہ کے معنی لغت میں جزاء کے ہیں، یہ کافر کے قتل کا بدلہ ہے، اور مقصد اس کا اسلامی قانون کے دائرہ میں آکر ہر قسم کی سرکشی کو چھوڑ کر تابع اور فرمانبردار بنانا ہے، اگر کافر جزیہ نہ دے گا تو ضرور قتل کیا جائے گا، جزیہ دے کر گویا اس نے اپنی جان خریدی اور قتل سے بچائی۔

جزیہ کی دو قسمیں ہیں: جزیۂ صلحی، جزیۂ قہری۔ جو جزیہ بطورِ صلح متعین ہوا ہو وہ جزیۂ صلحی ہے، اس کی کوئی

مقدار مقرر نہیں ہوتی، باہمی رضامندی سے جو طے ہو جائے وہی لیا جاتا ہے، اس میں ہر فرد سے وصول کرنے کی بھی ضرورت نہیں، ان کے جو ذمہ دار ہوں وہ جس طرح چاہیں آپس میں وصولیابی کر کے امیر المؤمنین کو پہنچادیں، سالانہ و ماہانہ جتنے جتنے وقفہ کے بعد لینا دینا طے ہوا اسی کے مطابق عمل کرتے رہیں، جیسے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصاریٰ نجران سے یوں معاملہ فرمایا تھا کہ پوری جماعت سالانہ دو ہزار حلة ادا کیا کرے، حلة دو چادروں کو کہتے ہیں، ایک حلہ بمعنی ایک جوڑہ، پھر ہر حلة کی قیمت کا اندازہ بھی طے کرلیا گیا تھا، کہ ایک اوقیہ چاندی کی قیمت کا ہوگا، ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا تھا، اور ایک درہم کا وزن تین ماشہ ایک رتی، اور ۵/ ۱ رتی ہوتا تھا، اس زمانہ کے حساب سے۔

دوئم جو جزیہ کافروں کے مغلوب ہو جانے کے بعد اوران کو ان کی املاک پر قائم رکھنے کے بعد لیا جائے وہ جزیہ قہری ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر المؤمنین ان کے ملک پر قابض ہو کر ان کو ان کے املاک پر باقی رکھے، اور ان پر فی کس مخصوص رقم جزیہ مقرر کردے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مالدار آدمی پر سالانہ اڑتالیس درہم مقرر کئے تھے، جن میں سے ہر ماہ چار درہم ادا کرنا لازم تھا، اور جو شخص متوسط درجے کا مالدار ہو اس پر چوبیس ۲۴ درہم مقرر کئے تھے، ہر ماہ اس سے دو درہم لئے جاتے تھے، اور جو شخص مالدار نہ ہو مزدور ہو اس پر بارہ درہم مقرر کئے تھے، ہر ماہ ایک درہم وصول کرتے تھے۔ عورتوں، بچوں، معذوروں، بیماروں، راہبوں وغیرہ پر کوئی جزیہ نہیں۔

یہ جزیہ صرف کافر کے غرور اور سرکشی توڑنے کے لئے مقرر ہوتا ہے، تاکہ نظام برابر ہو، اور گڑ بڑ نہ ہو۔ جب مشرکین کا معاملہ درست ہوا، اور ملکی سطح ذرا ہموار ہوئی، تو حکم ہوا کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی قوت و شوکت اور بیجا غرور کو توڑو، مشرکین کے وجود سے تو بالکل عرب کو پاک کر دینا مقصود تھا، لیکن یہود و نصاریٰ کے متعلق اس وقت صرف اسی قدر مطمحِ نظر تھا کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں زور نہ پکڑیں، اور اسلام کی اشاعت و ترقی کے راستہ میں حائل نہ ہوں، اس لئے اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ ماتحت اور رعیت بن کر اسلام کی بالا دستی تسلیم کرلیں، اور جزیہ دینا منظور کرلیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

آپ قبول کرلیں پھر حکومتِ اسلامیہ ان کے جان، مال اور املاک کی محافظ ہوگی، ورنہ ان کا علاج بھی وہی ہے جو مشرکین کا تھا، کیونکہ کفر و معاصی اور فساد و فتنہ بازی میں یہ بھی مشرکین جیسے ہیں، اور یہ بھی اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر کما حقہ ایمان نہیں رکھتے، نہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی کچھ پرواہ کرتے ہیں، نہ حلال و حرام پر ان کا ایمان ہے، اور نہ ہی دینِ الٰہی پر ان کا طرزِ حیات ہے، یہ تمام دینی اقدار سے بیگانہ تو کیا بلکہ دینی اقدار کے سراسر دشمن

ہیں۔آیت کریمہ میں جن چاروں عیوب ونقائص کا ذکر ہے۔ یہ لوگ ان سے بھی کئی قدم آگے ہیں، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو کجا یہ اپنے تسلیم کردہ پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر اور نافرماں ہیں، انہوں نے اپنے پیغمبروں علیہم السلام کی نہ تصدیق کی، اور نہ ہی ان کی صحیح پیروی کی۔ یہ اپنے اہواء ونفسانی خواہشات کے بندے ہیں۔مزید ان کی خباثتوں اور دین دشمنیوں کا تذکرہ عنقریب آنے والا ہے کہ وہ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا روشن کیا ہوا چراغ اپنی پھونکوں سے گل کردیں، ایسے بد باطن خبیث نالائقوں کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو ملک میں فتنہ وفساد اور کفر وتمرد کے شعلے برابر بھڑکتے رہیں گے، اور امن وسکون تاراج ہوجائے گا، اور ابلیسی نظام کا عروج ہوگا، جسے ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے اسلام کا مبارک عادلانہ نظام آیا ہوا ہے۔ [تفسير عثماني]

فائدہ:

قرآن کریم نے اختصار کے ساتھ بطورِ نمونہ اہلِ کتاب کے چار عیوب ونقائص بیان فرمائے:

(۱) پہلا یہ کہ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے۔

(۲) دوسرا یہ کہ یہ لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

(۳) تیسرا یہ لوگ ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام بتلایا ہے۔

(۴) چوتھا یہ کہ یہ لوگ سچے دین کو قبول نہیں کرتے۔

ان چار چیزوں میں حصر مراد نہیں، کیونکہ عیسائی اور یہودی تمام ایمانی، دینی اخلاقی، شرعی، انسانی شرافت کے متعلق تمام احکام، اعمالِ صالحہ اور اقدار کے منکر ہیں۔قرآن مجید میں جزیہ کا حکم دیکھ کر ان کے مستشرقین اور دانشوروں نے ساتوں آسمانوں کو سر پر اٹھایا، کہ اسلام نے جہاد کے نام پر انسانیت کو خاک وخون میں تڑپایا، اور جزیہ جیسے ظالمانہ مالی ٹیکس لگا کر لوگوں کا نانِ شبینہ ان کے منہ سے نکال کر انہیں خوار ومحتاج بنایا، اور کثرت وتعددِ ازواج کا قانون نافذ کرکے صنفِ نازک عورتوں پر ظلمِ عظیم ڈھایا۔

سبحان اللہ! (برعکس نہند نام زنگی کافور) جس قوم میں ایمان، حیاء، حلال، غیرت، شرافت، عدل وانصاف، رحم دلی، سخاوت، نکاح، عفت، پرہیزگاری وتقویٰ، ماں، بہن، بیوی، خالہ، پھوپھی، وغیرہ کا وجود نہ ہو، اور نہ ہی وہ کبھی ان چیزوں سے واقف ہو، اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اسلام اور دینِ الٰہی پر خواہ مخواہ نکتہ چینی کرے، اور عیب لگائے؟

جس قوم میں ایک سو عورتوں کے ساتھ بخوشی و مرضی زنا جائز ہو، اور حلال نکاح پر پابندی ہو، اس سے کیا گلہ ہوگا؟ انہیں معلوم ہو کہ کفر و شرک اور معاصی کا ارتکاب اور دندناتے ہوئے زندقہ والحاد یہ سارے خالق کائنات مالک الملک ذوالجلال والاکرام اور اس کے رسول اکرم سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون اور قانونی دفعات ہیں کہ باغیوں کی سزا سزائے موت ہے، پس سزائے موت سے دومنٹ میں مجرم ہلاک ہو جاتا ہے، اگر وہ معافی مانگے یا حاکم پشیمان ہو کہ اسے کیوں مارا گیا تو کچھ بھی فائدہ نہیں ہوگا، جبکہ خدا کا باغی میدانِ جنگ میں عین مرنے سے پہلے معافی مانگے، اسلام قبول کرے تو بچ سکتا ہے، اور غازی اسے چھوڑ سکتا ہے، پس جہاد نہ خونریزی ہے، نہ تباہ کاری، بلکہ مجرم کو سزا دینے کا نام ہے، اگر مجرم اپنے جرم پر پشیمانی کا اظہار کرے تو اس کی جان بچ جائے گی۔ وَاللهُ أَعلمُ بالصوَابِ

﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ﴾ لغت میں ید گیارہ معنی میں مستعمل ہے۔ یہاں تابع اور ذلت کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہے کہ ذلیل اور ماتحت ہو کر جزیہ ادا کریں، یہاں ان کی برابری اور مساوات کی نفی ہے، اور ذلت کا اثبات ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ
بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۰﴾
اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ
وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

ترجمہ: اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے، یہ ان کی باتیں ہیں جو ان کے منہ سے نکلتی ہیں، یہ ان لوگوں کی طرح باتیں کرتے ہیں جنہوں نے ان سے پہلے کفر اختیار کیا، اللہ تعالیٰ انہیں غارت کرے، کدھر الٹے جا رہے ہیں ﴿۳۰﴾ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے عالموں کو اور درویشوں کو ربّ بنالیا، اور مسیح ابن مریم کو بھی، اور حالانکہ ان کو یہی حکم ہوا تھا کہ صرف ایک معبود کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اس چیز سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۳۱﴾

☆☆☆

معارف ومسائل

ماقبل میں جن چار باتوں کی خبر دی گئی یہاں سے ان کے لئے دلیل اور اثبات ہو رہا ہے، اسی طرح اہل کتاب کے ساتھ جہاد کا حکم ہوا تھا کہ وہ بھی مشرک ہیں، یہاں سے ان کے شرک کا اثبات ہو رہا ہے، گویا یہاں سے جزیہ وصول کرنے کی علّت کا بیان بھی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہاں سے اہل کتاب کے عقائدِ شرکیہ کا بیان ہے، جس سے معلوم ہوا کہ جیسے دوسرے مشرک اپنے شرک میں لگے ہوئے ہیں، اسی طرح یہود ونصاریٰ بھی مشرک ہیں، جن انبیاء کرام علیہم السلام سے اپنے تعلق جوڑتے ہیں انہوں نے انہیں توحید کی دعوت دی تھی، اور اسی توحید کی دعوت کو لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے تھے، بعد میں ان کے ماننے والوں نے (جو ماننے کا جھوٹا دعویٰ کرتے ہیں) توحید کو چھوڑ دیا، اور عقائدِ شرکیہ اختیار کر لئے، اور زبانوں سے بھی شرکیہ باتیں کرنے لگے، احبار ودرویشوں کے نقشِ قدم پر چل کر انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے۔ یہودیوں نے کہا کہ عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح ابن مریم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں، جیسے مشرکینِ عرب نے کہا تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اسی بنیاد پر ان تینوں گمراہوں کے ساتھ جہاد وقتال کا حکم ہوا کہ انہیں ہر محاذ پر قتل کرو، تاکہ اللہ تعالیٰ کی دھرتی ان کی نجاست سے پاک ہو، اور ہر قسم کے فتنہ وفساد کا خاتمہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا قول ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ﴾ یہ ان کی من گھڑت بے بنیاد باتیں ہیں، جن کی سند کوئی نہیں، سب جھوٹ اور افتراء ہے۔

﴿يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ﴾ ان سے مراد مشرکینِ عرب ہیں جنہوں نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا۔ [روح المعاني]

﴿قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ﴾ اخبار کے معنی میں ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، وہ کدھر اُلٹے چل رہے ہیں کہ انہوں نے توحید کی جگہ شرک اختیار کیا۔ اس مضمون کی تفصیل تیسرے پارہ کے دوسرے رکوع اور سورۂ آل عمران میں گزر چکی۔

تحلیل وتحریم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے:

پوری کائنات اور کائنات کا ہر ہر ذرہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کی ملکیت ہے، خالق کائنات عزّ وجل نے کوئی

مخلوق بغیر حکمت کے پیدا نہیں فرمائی، اور ہر چیز میں حکمت کے ساتھ منافع وضرر اور مخصوص خواص ودیعت فرمائے، اسی بنیاد پر مخلوقات میں حلت وحرمت کا فیصلہ فرمایا، کائنات پر سوائے اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط کے کسی مخلوق کا علم حاوی نہیں، نہ کسی فرشتہ کا اور نہ ہی کسی برگزیدہ پیغمبر کا، لہٰذا یہ اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام کردے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی پیغمبر یا مقرب فرشتہ کو اس کا قطعاً اختیار نہیں۔ اگر انبیاء کرام علیہم السلام نے کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دیا تو انہوں نے اپنی طرف سے ایسا ہرگز نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ اس بارے میں انہیں وحی کے ذریعہ مطلع فرمایا۔

یہود قوم کے احبار اور نصاریٰ کے رہبانوں (درویشوں) نے جہاں ایک طرف تورات وانجیل کی روح مسخ کر کے احکام میں ترمیم وتحریف کی وہاں توحیدِ الٰہی کو تبدیل کر کے طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کیا، پس دونوں قوموں کے مذہبی پیشواؤں نے نہ محض یہ کہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا مرتبہ بڑھا کر انہیں ابن اللہ قرار دیا، بلکہ اپنے احبار اور رہبانوں کے کہنے اور مشورے پر خود اپنے آپ کو اور پوری قوم کو بھی ابناء اللہ کہنے لگے، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾[المائدة:۱۸] (اور یہود اور نصاریٰ نے کہا کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)۔

اب یہ ابنیت صرف حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام تک محدود نہیں رہی، بلکہ پوری ملت کے اچھے برے اس شرف میں شامل ہوگئے، اور تحریف شدہ تورات وانجیل کے اوراق کی زینت بنے، اور سارا کارنامہ ان کے احبار اور درویشوں نے انجام دیا، چونکہ تورات وانجیل کے تحفظ وحفاظت کا ذمہ اور اسی طرح ان کے پیغمبروں علیہم السلام کے فرمودات کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے نہیں لیا، تب تو نتیجہ یہی کچھ سامنے آیا، جسے پوری دنیا نے ملاحظہ کیا، اور دیکھا۔

رہا ہمارے قرآن مجید اور فرموداتِ نبوی کا مسئلہ، یہ اس لئے مکمل محفوظ ہیں اور قیامت تک ان شاء اللہ محفوظ ہی رہیں گے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہماری امت میں یہودی رہبان پیدا نہیں ہوئے، بلکہ ہمارے اندر جو رہبان اور احبار پیدا ہوئے وہ یہودیوں کے احبار ورہبانوں سے کئی قدم آگے ہیں، دین موسیٰ ودین عیسیٰ علیہما السلام میں ایک حد تک نہ کوئی جعلی نبی پیدا ہوا، نہ جعلی مجتہد، نہ جعلی مہدی، یہاں تو تین سو (۳۰۰) کے قریب جعلی نبی ومجتہد ومہدی پیدا ہو چکے ہیں، بلکہ جعلی خداؤں کی بھی کوئی کمی نہیں، اس کے باوجود قرآن وحدیث اور پوری شریعت محفوظ ہے، اس کی ایک

وجہ تو یہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا ذمہ لے لیا، پھر کس کی مجال ہے کہ قرآن میں لفظی تحریف کرے یا معنوی تحریف کرے؟

احادیث وباقی احکام شریعت میں ردّ وبدل سے تحفظ کے لئے اللہ تعالیٰ نے رجالِ کا رطائفہ منصورہ پیدا فرمایا ہے، یعنی جس طرح قرآن مجید کے بارے میں حفاظتِ خداوندی نے یہ عظیم کرشمہ دکھلایا کہ امت میں حفاظِ قرآن وحفاظِ حدیث، نیز علمائے قرآن وعلمائے حدیث کو ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں کھڑا کیا، جنہوں نے اس کے الفاظ ومعنی مفہوم کی حفاظت کے لئے افراد کے قیامت تک کھڑے ہوتے رہنے کا اپنے سچے وعدوں سے اطمینان بھی دلایا کہ امت میں ایک طائفہ حقہ برابر قائم رہے گا، جو منصور من اللہ ہوگا، مخالفت کرنے والے اسے ضرر نہ پہنچا سکیں گے، اور رسوا کرنے والے اسے رسوا نہ کرسکیں گے۔

پھر یہ بھی وعدہ دے دیا کہ ہر دور میں سلف صالح کے بعد خلف صالح پیدا ہوتے رہیں گے، جو غالیوں کی تحریفوں، دروغ باف منکروں کی دروغ، باغیوں اور جہلاء کی رکیک تاویلوں کی قلعی کھولتے رہیں گے، نیز یہ بھی اطمینان دلایا کہ اس سب کے باوجود پھر بھی اگر فریبی اور مکار لوگ یا علماءِ سوء درباری لوگ قرآن یا احکام اور فرموداتِ قرآن کے بارے میں اپنی چرب زبانیوں اور جعل سازیوں سے عام قلوب کے لئے کچھ تلبیس یا التباس کا سامان پیدا کر بھی دیں گے، تو ہر صدی پر ایک مجدّد صاحبِ عزیمت آکر دینِ الٰہی کو از سر نو پھر نکھارتا رہے گا، ان شاء اللہ، پھر یہ مجدّد پورے عالم اسلام کے لئے ایک نہیں ہوگا، بلکہ مختلف دور ودراز ملکوں کے لئے متفرق جدا جدا مجدّد تشریف لائیں گے، مشرق وسطیٰ کے لئے الگ، افریقہ، برصغیر اور دوسرے ملکوں کے لئے الگ الگ مجدد ہوں گے۔ واللہ اعلم

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ﴾ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا ربّ بنالیا ہے۔ اَحبار حَبر کی جمع ہے، بمعنی عالم، یہ یہود کے علماء تھے، اور رُہبان راہب کی جمع ہے، بمعنی تارک الدنیا درویش، یہ نصاریٰ کے پادری ہیں۔ ان کو ربّ قرار دینے سے یہ مراد ہے کہ وہ لوگ اپنے علماء وفقراء کی بات تو مانتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی بات نہیں مانتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ﴾ [الفرقان: ۴۳] (بتاؤ جس شخص نے اپنا خدا اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہو) ظاہر ہے کہ خواہشات کی عبادت کوئی نہیں کرتا، مگر بات ماننے کو اِلٰہ اور ربّ سے تعبیر فرمایا۔ گویا کہ وہ علماء اور درویشوں اور خواہشات کو ایسے مانتے ہیں جیسے کوئی خدا کی بات مانتا ہو۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ پہلے عیسائی تھے، عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا، کہتے ہیں: میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عدی! اس بت کو اپنے گلے سے اتار کر پھینک، میں نے اتار کر پھینک دیا، پھر ایک روز خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ﴾ تلاوت فرمارہے تھے، تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم تو احبار اور رُہبان کی پوجا نہیں کرتے تھے، فرمایا: کیا ایسی بات نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو جب علماء و احبار حرام قرار دیتے تھے تو تم اس کو حرام سمجھتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیز کو جب وہ حلال قرار دیتے تھے تو تم اس کو حلال قرار دیتے تھے؟ میں نے عرض کیا: ہاں! ایسا ضرور ہوتا تھا، فرمایا: یہی ان کی عبادت تھی۔ [معالم التنزیل]

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: وَهَلْ اَفْسَدَ الدين وَالدنيا اِلَّا الْمُلُوکُ وَاَحْبَارُ سوءٍ وَرُهْبَانُهَا۔ دین اور دنیا کو بدلنے والے اور خراب کرنے والے یا بادشاہ ہوتے ہیں، اور بُرے یا عالم۔ مطلب یہ ہے کہ برے بادشاہ ملک کے دشمن ہیں، اور علماءِ سوء خاص کر درباری علماء اور بدعتی علماء دین کے دشمن ہوتے ہیں، انہی کے بارے میں فرمایا: ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ [الجمعۃ:۵] (ان کی مثال اس گدھے کی ہے جس پر کتابوں کی گٹھڑی رکھی ہوئی ہو)۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تحلیل وتحریم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، جو ہر چیز کا حقیقی خالق و مالک ہے، تو اس کے سوا جو کوئی شخص اپنی مرضی اور ہٹ دھرمی سے تحلیل وتحریم کا قانون بنائے، اور اپنے پاس سے محرمات کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیدے، گویا وہ اس کام میں اللہ تعالیٰ کا شریک ہوا، یہی تو گمراہی اور کفر ہے، یہ کوئی ضروری نہیں کہ لوگ اس کی عبادت اور سجدہ کریں، پس اگر لوگ ایسے علماء، گدی نشیں، درویشوں کی بات مانتے ہوئے ان کی اطاعت کریں تو سارے کافر ہوجائیں گے، اسی اتباع کو قرآن مجید نے عبادت سے تعبیر فرمایا۔

عام طور پر دنیا کے حکام اپنے مخالفین کو یا ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے لوگوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ ملکی قوانین کو اپنے ہاتھ میں لے لے، یا بے احترامی کرے، بعینہٖ یہی بات ہوگئی کہ کسی شخص کے لئے گنجائش نہیں کہ خدائی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ﴾ [یونس:۵۹] (آپ فرمادیجئے کہ یہ تو بتاؤ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رزق نازل فرمایا، سو اس میں سے تم نے

حرام اور حلال تجویز کرلیا، کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے؟ یا تم اللہ تعالیٰ پر تہمت باندھتے ہو؟) کہ اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام بتاتے ہو، یا برعکس، پس تم مجرم ہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور قوانین میں مداخلت کرتے ہو، جس کا نتیجہ تمہارے حق میں نہایت تباہ کن ہوگا، کیونکہ مداخلت فی الدین ایک قسم کا شرک ہی ہوگا۔

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ اور انہیں یہی حکم ہوا تھا کہ صرف ایک ہی معبودِ برحق کی عبادت کریں۔

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ کوئی معبود نہیں اس کے سوا، وہی معبودِ حقیقی ہے۔ حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام اس کی مخلوق اور بندے ہیں، انہیں بھی کسی چیز کی تحلیل وتحریم کا اختیار حاصل نہیں، چہ جائے کہ تمہارے احبار و رہبان یا کسی اور مخلوق کو حاصل ہو۔

﴿سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے شرک سے پاک ہے۔

فائدہ:

روافض، اثنا عشریہ، اسماعیلیہ، آغا خانیہ، دروزیہ، بہائیہ، اور بوہریہ، برہانیہ، چکڑالویہ، یہ تمام گمراہ فرقے ہیں، ان کے نزدیک قرآن وحدیث کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ ان کے مجتہد اور امام جن کے متعلق وہ یہ عقیدہ مزعومہ رکھتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے وہ بہتر اور بڑے درجے والے ہیں، اور نبی اور ربّ تعالیٰ سے بھی سہو ہوسکتا ہے، مگر امام ہر قسم کے سہو ونسیان سے معصوم اور پاک ہے۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ چیزوں کی تحلیل وتحریم کا مکمل اختیار امام کے پاس ہے، امام خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرسکتا ہے، اور حلال کردہ اشیاء کو حرام کرسکتا ہے، وہ امام کے اندر خدا کو حلول کرنے کے قائل بھی ہیں، خاص کر آغا خانی اسماعیلی، وہ امام کو شریعت کا مکلف اور پابند بھی نہیں سمجھتے ہیں، وَغَيْرَ ذَالِكَ مِنَ الْخُرَافَاتِ الْكُفْرِيَةِ۔ اس سلسلہ میں مشہور کتاب "ہمارا مذہب" کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ کتاب آغا خانی ڈاکٹر کی تصنیف ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نور کو اپنے مونہوں سے بجھا دیں گے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس کے

علاوہ کوئی بات منظور نہیں کہ وہ اپنے نور کو پورا کرے، اگرچہ کافروں کو ناگوار ہو۳۲ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کردے، اگرچہ مشرکوں کو ناگوار ہو۳۳

معارف ومنازل

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ☆ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، اور کائنات کے ہر ذرہ پر اللہ تعالیٰ شانہ کا اقتدار وتسلط ہے، جس کو اللہ تعالیٰ رکھے اسے کون چکھے، اسی کا نمونہ دنیا نے غزوۂ بدر، فتح مکہ اور غزوۂ حنین کے مواقع پر دیکھا کہ اللہ تعالیٰ غالب رہا، اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کا دین غالب رہے۔ جب جرار فوجوں اور لشکروں کے ذریعہ اسلام کو مغلوب نہ کیا جاسکا تو پھونکوں اور زبانی جھوٹ وافتراء سے کوئی کیا کچھ کرسکے گا؟ بلکہ مٹانے والے خود مٹ جائیں گے، اور اسلام دینِ الٰہی ترقی کرتا ہوا غالب ہی رہے گا، اور پورے عالم پر چھا جائے گا۔ ان شاء اللہ

یہ مضمون پیشین گوئی کے انداز میں تین مقامات پر مذکور ہے: ایک یہاں سورۂ توبہ میں، دوسرا سورۂ فتح کے آخر میں، تیسرا سورۃ الصف میں، چنانچہ یہ پیشین گوئی پورے آب وتاب کے ساتھ پوری ہوئی، اور دنیا کے اکناف و اطراف میں اسلام پھیل گیا۔ دینِ الٰہی کے غالب ہونے کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ مسلمان اقتدار کے اعتبار سے دوسری اقوام پر غالب رہیں گے، اور یہ ایک حد تک ہو چکا ہے، جب مسلمان جہاد کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے دین کو لے کر آگے بڑھتے تھے، اور اللہ کی رضا اور اعتماد علی اللہ ان کا سرمایہ ہوتا تھا، وہ دنیا اور مال کی محبت سے آزاد تھے، ان کی یلغار نے بڑی بڑی سلطنتوں کو پاش پاش کردیا، وہ جنگل کے شیر سے بھی زیادہ بہادر تھے، وہ دن کو روزہ دار، رات کو تہجد گزار تھے، ان کے امیر المؤمنین کا لباس ایک جوڑا ہوتا تھا، اور اس پر سترہ کے قریب پیوند لگے ہوتے تھے، انہوں نے ایسے قائد وسالار کی پیشانی اور آنکھوں کا مشاہدہ کیا تھا جس نے اپنی مبارک آنکھوں سے لیلۃ المعراج ربّ ذوالجلال کی زیارت کی تھی، جب وہ اللہ اکبر کہہ کر حملہ آور ہوئے تو قیصر وکسریٰ کے بنگلوں کے منارے اڑ گئے، ان کے مردوں کو غلام بنایا، اور وہ شہزادیاں کبھی جنہوں نے سورج کی تپش نہیں دیکھی تھی باندیاں بنائی گئیں۔

جب امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کسریٰ کی تینوں بیٹیاں حاضر کی گئیں تو فرمایا: انہیں

اپنے شہزادوں کے سپرد کرو، لوگوں نے پوچھا: ہمارے شہزادے کون ہیں؟ حسنین کریمین، حضرت زہرا کے بیٹے، اور عبداللہ بن زبیر، حضرت اسماء کے لڑکے رضی اللہ عنہم۔

ان مشرکین اور مجوس کے علاوہ نصاریٰ پر جزیہ مقرر ہوا، وہ سارے مسلمانوں کے تابع ہوئے، صدیوں تک یورپ، ایشیاء، اور افریقہ کے ممالک پر مسلمانوں کا قبضہ رہا، اور اس وقت یہی تین براعظم دنیا میں مشہور تھے، اس وقت ساٹھ کے قریب مسلمانوں کی سرمایہ دار حکومتیں دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہیں، اگر اب بھی جہاد فی سبیل اللہ کے لئے کھڑے ہو جائیں، اتحاد و اتفاق پیدا کرلیں، ربّ العزّت سبحانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کا طوق اپنے گلوں اور گردنوں میں ڈال کر بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ کا ورد شروع کریں، اور کافروں کو للکارتے ہوئے ملاعمر کی طرح جہاد شروع کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ امت کفر کو شکست نہ دے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو ☆ اتر سکتے ہیں آسمان سے قطار اندر قطار اب بھی

شرط یہ ہے کہ ربّ العزّت پر سہارا اور اعتماد ہو، اور سارے کافروں سے بغض ہو، اور ان پر کوئی اعتماد نہ ہو، اپنے ربّ پر بھروسہ ہو۔

اے بندہ بمن بیا وجہاں رابلہ کن ☆ پس اگر شاہِ جہانت نکنم گلہ کن

نہ زمین بدلی ہے نہ آسمان نہ جبریل بدلا ہے نہ میکائیل علیہما السلام، خداوند تعالیٰ وہی قدیم مہربان و مشکل کشا ہے، نہ اس کی رحمت بدلی ہے، نہ لطف و کرم، پس اے بدلے ہوئے مسلمانو! تم انصاف سے کام لے لو، اگر غلامی اور اتباعِ حق پر چلو تو وہی تمہاری شان واپس آسکتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دلیل اور حجت کے ساتھ غلبہ ہو، اور یہ غلبہ ہمیشہ سے ہے، اور ہمیشہ رہے گا، کوئی بھی شخص خواہ دین آسمانی کا مدعی ہو، خواہ صابی ہو، خواہ بت پرست ہو، خواہ مجوسی آتش پرست ہو، خواہ دہریہ ہو، یعنی حق تعالیٰ سبحانہ کے وجود کا منکر ہو، خواہ ملحد اور زندیق ہو، وہ اپنے دعویٰ اور اپنے دین کو لے کر دلیل کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے نہیں آسکتا، اور نہیں ٹھہر سکتا، اور اپنے دعویٰ کو صحیح ثابت نہیں کرسکتا۔ اسلام کے دلائل سے یہود و نصاریٰ اور مشرکین، زنادقہ اور ملحدین، ہندو آریہ سماج سب پر حجت قائم ہے، اس اعتبار سے دینِ اسلام ہمیشہ غالب ہے۔

برصغیر میں برطانیہ اور اس کے نصاریٰ پادریوں نے محض اپنے مذہب نہیں بلکہ اسلام کے خلاف تمام فِرَقِ باطلہ کی سرپرستی کی، مصنوعی اولیاء، مصنوعی نبوت اور طرح طرح کے دیگر غیر اسلامی غیر شرعی فرقے بنائے، اور انہیں

ہر قسم کی مالی، مادی اور روحانی سہولتیں اور امداد مہیا کی، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور عالمِ اسلام کے علماءِ دیوبند کے باکمال علماء، خاص کر بانی دیوبند حضرت نانوتوی اور حضرت کیرانوی اور دیگر علماء رحمۃ اللہ علیہم نے بہت سے مناظروں میں انگریزی مراعات یافتہ مناظروں کے پرخچے اُڑادیئے، اس سلسلے میں عیسائیوں، روافض، قادیانی، غیر مقلد اور دوسرے فرقوں کے لوگوں نے بھاگ کر جان چھڑائی۔

اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کو جو دلائل کے میدان میں غلبہ عطا فرمایا ہے وہ سب کے سامنے مسلَّم ہے، پھر حق تعالیٰ نے اسے کامل بھی فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدۃ:۳] (آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کردیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی، اور دینِ اسلام کو تمہارے لئے پسند کیا)۔

اسلام دینِ کامل ہے، انسانی زندگی کے تمام اور ہر قسم کے شعبوں پر حاوی ہے، دیگر تمام ادیان کے ماننے والے صرف چند تصورات اور خود تراشیدہ چند معتقدات کو لئے بیٹھے ہیں، عبادات، معاملات، مناکحات، معیشت، معاشرت، سیاست وحکومت اور اخلاق اور آداب کا کوئی مذہبی نظام ان کے پاس نہیں ہے، خود سے قوانین بنالیتے ہیں اور پھر انہیں توڑ دیتے ہیں، اور یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ قوانین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، مگر اسلام دینِ الٰہی ہے، اور اس کے سارے قوانین کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں۔

صرف فقہ حنفی میں آج سے چھ سو سال پہلے مسائل کا جو اعداد وشمار جاری ہوا، وہ بارہ لاکھ چالیس ہزار مسائل تھے، پھر ان مسائل پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ آج سے ایک سو سال پہلے قرآن حکیم کی تفاسیر کی تعداد دو لاکھ تھی، جبکہ موجودہ صدی میں جو حواشی اور تفاسیر مرتب ہوئے وہ کئی ہزار تک ہیں۔ ان تفاسیر میں ایسی تفاسیر بھی ہیں جو ایک ہزار جلد کی ہیں، اور ہر جلد کوئی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ محدث ابن شاہین اور مفسر عبد السلام نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہما نے ایک ایک ہزار جلدوں میں تفسیر لکھی، اور پندرہ سو مجلدات میں حدیث شریف کی مسانید تالیف کی ہیں۔

تیسری صورت اسلام کے غالب ہونے کی یہ ہے کہ دنیا میں آباد اور بسنے والے کفر وشرک چھوڑ کر اسلام قبول کرلیں گے، اور دنیا میں اسلام ہی اسلام ہوگا، اور چاروں اُفق میں اسلام کا راج ہوگا، ایسا قیامت سے پہلے پہلے ضرور ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی علیہ السلام کے زمانے میں کفر وشرک کا خاتمہ ہوگا، اور سارے جہاں میں ملت

واحدہ دینِ الٰہی اسلام کا راج ہوگا، اور پورے عالم میں اسلام پھیل جائے گا، کرۂ ارض اور پوری زمین عدل وانصاف سے بھر جائے گی، جیسا کہ احادیث مبارکہ میں اس کی تصریح ہے۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے صادق المصدوق سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ رات اور دن ختم ہونے سے پہلے ایسا ضرور ہوگا کہ لات اور عزّٰی کی پرستش کی جائے گی (یہ جاہلیت کے بت تھے) میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ نازل فرمائی تو یہ وعدہ پورا ہوکر رہے گا، یعنی دین حق تمام ادیان پر غالب ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا ایسا ہوگا، جو آیت کریمہ میں مذکور ہے، پھر اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا بھیج دے گا جس کی وجہ سے ہر اس شخص کو موت آجائے گی جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہوگا، اس کے بعد صرف وہی لوگ باقی رہ جائیں گے جن کے دلوں میں کوئی بھی خیر نہ ہوگی، لہٰذا وہ اپنے باپ دادوں کے دین کی طرف لوٹ جائیں گے۔ [مسلم]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دنیا میں دوبارہ تشریف آوری کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: وَيَبْطِلَ الْمِلَلَ حَتّٰى يَهْلِكَ اللّٰهُ فِيْ زَمَانِهِ الْمِلَكَ كُلَّهَا غَيْرَ الْاِسْلَامِ۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمام ملتوں کو باطل کردیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں اسلام کے علاوہ ساری ملتوں کو ختم فرمادیں گے۔ [مسند أحمد: ج ٢]

حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ونزول کے ساتھ ہے، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کا تعلق قربِ قیامت کے ساتھ ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جب قرآن حکیم کو اٹھایا جائے گا، اور طلوع شمس مغرب سے ہوگا، موحد مسلمانوں کی ارواح ریحِ طیبہ کے ذریعہ قبض ہوجائیں گی، اور سارے فساق وفجار کفار رہ جائیں گے، پوری زمین پر "اللہ" کہنے والا کوئی نہ ہوگا، تو ایسے شرارُ الخلق پر قیامت قائم ہوجائے گی، یہی وقت شرک وبت پرستی کے عروج کا ہوگا۔ واللہ اعلم

خلاصہ:

اسلام کا پہلا مرحلہ عروج کا آٹھ سو سال تک رہا، جیسا کہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ بن اسود کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زمین پر مٹی سے بنا ہوا کوئی گھر، یا بالوں سے (جانوروں کے پشم) تیار کیا ہوا کوئی خیمہ

ایسا باقی نہ رہے گا جس میں اللہ تعالیٰ اسلام کا کلمہ داخل نہ فرمادے، عزّت والے کی عزّت کے ساتھ، اور ذلت والے کی ذلت کے ساتھ، پس سارا دین اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگا، یعنی جو اسلام قبول کرے گا وہ عزّت والا ہوگا، اور جو انکار کرے گا وہ ذلیل اور خوار ہوگا، پھر امیر المؤمنین اس کے ساتھ جہاد کرے گا یا اس پر جزیہ مقرر کرے گا۔ [مشکوٰۃ مسند أحمد]

دوسرا دور اسلام کی کمزوری کا ہے جو کہ آج سے پہلے اور آج کا زمانہ ہے، تیسرا مرحلہ پھر اس کے غلبہ کا ہوگا، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کا سنہرا دور ہوگا، پھر چوتھا مرحلہ وہی ہوگا جسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا والی روایت نے بیان کیا کہ مؤمن مرجائیں گے، شرار الناس پر قیامت برپا ہوگی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۴﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! بلا شبہ بہت سے علماء اور راہب ایسے ہیں جو لوگوں کے مال باطل طریقہ پر کھاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں، اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں، اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے ﴿۳۴﴾ جس روز ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر ان کی پیشانیوں، کروٹوں، اور پشتوں کو داغ دیا جائے گا، یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنی جانوں کے لئے جمع کیا تھا، سو اب تم اسے چکھ لو جسے تم جمع کرتے تھے ﴿۳۵﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں مال کی محبت اور اسے مقصدِ زندگی بنانے کی سختی سے مذمت ہے، حرام اور باطل طریقہ سے مال جمع کرنا یا زکوٰۃ دینے سے بخل کرنا یہ دونوں عمل اسی چیز کے ثبوت اور قرینہ ہیں کہ مال سے بہت شغف اور محبت

ہے، اور جن لوگوں کے دلوں میں مال کی بیجا محبت نہ ہو وہ نہ زکوٰۃ کو روکتے ہیں، اور نہ ہی باطل طریقوں سے مال جمع کرتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ دین حق سے روکتے ہیں، اور حرام کھاتے ہیں:

قرآن کریم نے متعدد مقامات پر پوری وضاحت کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے علماء اور ان کے درویشوں کی بے ایمانی اور ہٹ دھرمی کا واضح الفاظ میں بیان فرمایا ہے، اولاً یہ کہ انہوں نے کتاب اللہ میں تحریف کی، احکامِ الٰہی میں ردوبدل کیا، اپنی پسند کی باتیں بنا کر اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی، اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا، انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی، یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی، اور ان کے قتل کے در پے ہو گئے، نصاریٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی، پھر دونوں نے اپنے علماء و درویشوں کے کہنے پر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کو جھٹلایا، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات تورات و انجیل سے نکال دیں، چند معدود صفات جو باقی رہیں انہیں اپنی عوام سے چھپالیا۔

اس طرح انہیں اسلام قبول کرنے سے روک دیا، وہ جانتے تھے کہ جب اصلی بات نکھر کر سامنے واضح ہو گئی ہے تو لوگ بکثرت مسلمان ہو جائیں گے، جس سے ہماری سیادت و سرداری خاک میں مل جائے گی۔ اسی طرح انہی باتوں کو چھپا کر وہ اپنی مراعات لوگوں سے وصول کرتے تھے، اس کے علاوہ، وہ عوام کے فیصلوں میں بکثرت رشوت لیتے رہتے تھے۔

آیت کریمہ نے حسبِ سابق ان کا طرز و طریق بتلا کر خوب واضح فرمایا کہ یہ لوگ باطل طریقہ پر لوگوں کا مال کھاتے ہیں، اور حق بات کو چھپا کر اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ كَثِيْرًا کہنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اکثر لوگ ایسا کرتے تھے، سب اس حرام خوری میں ملوث نہ تھے، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا تھا: ﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: ۱۱۳] (وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں، اہل کتاب میں سے ایک جماعت (حق پر) قائم ہے، وہ اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں)۔

آیت کریمہ میں ﴿يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا﴾ اہل ایمان کو خطاب فرما کر اہل کتاب کے علماء اور مشائخ کی حرام خوری کا تذکرہ فرمایا، جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے اہل اسلام کے اندر بھی اس طرح کے علماء و مشائخ ہو سکتے ہیں، ان سے پرہیز کرنا لازم ہے، تمہارے جھوٹے، ڈاڑھی منڈے، صوم و صلوٰۃ سے آزاد پیر، خاندانی گدی

نشیں، فال کھولنے والے، لوگوں کے ستارے بنانے والے ان کا یہی حال ہے، عموماً اصحاب طریقت اندر سے خالی ہیں، تصوف اور صفاء باطن سے عاری ہیں، طالبِ دنیا ہیں، فکرِ آخرت سے محروم اور بیگانہ ہیں، نہ تقویٰ، نہ خوف خدا، نہ اتباعِ سنن وہدیٰ، بلکہ اتباعِ نفس وہویٰ، لوگوں سے مال وصول کرنے کے لئے طرح طرح کے ڈھنگ بنارہے ہیں، سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَتَتبعنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شبرا بشبر الحديث۔ [بخاري]

تم اپنے سے پہلے یہود ونصاریٰ کی چال چلو گے، اور ان کا ایسا طریقہ بالشت در بالشت اختیار کرو گے جیسے دونوں پاؤں کے جوتے کیسے برابر ہوتے ہیں حَذْو النَعْلِ بِالنَعْلِ، چنانچہ ہم مشاہدہ کر رہے اور دیکھ رہے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے گدی نشیں یہود ونصاریٰ کے احبار ورہبان سے کئی درجہ آگے ہیں۔

اہل کتاب کے علماء ومشائخ کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں، انہوں نے دیدہ دانستہ اس جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ انہوں نے خاتم الانبیاء ﷺ کو خوب پہچان لیا، فرمایا: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ [البقرة:١۴٦] (وہ ان کو ایسا پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) اور جان گئے کہ آپ ﷺ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

ان کے علماء وراہبوں نے ملکِ شام کے تجارتی سفر کے موقع پر ابوطالب سے کہا تھا کہ یہ بچہ وہ آخری پیغمبر ہے جو سارے نبیوں کے آخر میں آنے والا ہے، اسے تم یہاں سے واپس کردو، ورنہ ملک شام والے اسے دیکھ کر ضرور پہچان لیں گے، اور اسے مال کے بہانے مارڈالیں گے، اس سلسلے میں وہ سارے انتظار میں ہوتے تھے کہ یہ آخری نبی جو کہ خاتم الانبیاء ہے کب ظہور فرمائیں گے، لیکن انہوں نے آپ ﷺ کی صفات کو بدل دیا، اور اپنے عوام کو باور کرایا کہ یہ وہ نہیں جن کا ہم انتظار کر رہے ہیں۔

یہود ونصاریٰ کے علماء ومشائخ کا جو طریقہ یعنی ضد وعناد وہٹ دھرمی عہدِ اول میں تھا ابھی تک وہی ہے، بلکہ ابھی بہت زیادہ معاندانہ ہے، یہودیت ونصرانیت کی عداوت وعناد تمام اقوامِ عالم سے اسلام کے بارے میں زیادہ بھی ہے، اور خطرناک بھی، حالانکہ یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پوری کائنات میں برحق اور جامع شریعت اور دینِ الٰہی صرف اسلام ہی ہے، مگر وہ نہ اسے خود قبول کرتے ہیں، نہ اپنے ماننے والوں کو قبول کرنے دیتے ہیں۔

اگر کوئی یہودی یا نصرانی ہندو مذہب یا بدھ مت مذہب قبول کرنا چاہے تو اس کے لئے رکاوٹ نہیں بنتے، لیکن اگر ان میں سے کوئی اسلام قبول کرنا چاہے تو ضرور رکاوٹ بنتے ہیں، مگر اس کے باوجود امریکہ، جرمنی، فرانس،

برطانیہ اور دیگر عیسائی ممالک میں بکثرت لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔

ع پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

دوسری طرف دیکھو تو یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے جہلاء، لالچی اور بے سہارا لوگوں کو عیسائی بنانے میں زبر دست مصروف اور مستعد ہیں، اور انہوں نے بہت ساری جماعتیں اور بے شمار تنظیمیں اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لئے این جی اوز کے نام پر تیار کر رکھی ہیں، مختلف طریقوں سے یہ لوگ مسلمان نوجوان مردوں اور نوجوان لڑکیوں کو بڑی بڑی تنخواہوں اور مراعات کی پیش کش کرتے ہیں، اور ان کی عصمتوں کو انہی کے آپس کے لوگوں کے ہاتھوں سے لوٹتے ہیں، انہیں گمراہ کرتے رہتے ہیں، اور اکثر کو عیسائی بنارہے ہیں۔ مال، لباس، کھانے پینے، کمپیوٹر، ٹی وی، گاڑی، مکان، علاج وغیرہ کی لالچ دے کے انہیں تباہ کر رہے ہیں، ایک ایک ناکارہ فاسق افسر کو چھ سات لاکھ روپیہ تنخواہ دے کر عوام الناس بے سہارا لوگوں کا ایک تیر سے دو شکار کرتے ہیں۔

مگر اس کے باوجود شکر ہے کہ ہزاروں نوجوان پکے مسلمان ان سے پیسے لے کر ہضم کرتے ہیں، اور ان کے مکروتزویر میں نہیں آتے، جس کا نتیجہ صفر کے درجہ میں رہتا ہے۔ قادیانیت، شیعیت، غیر مقلدیت یہ کیا ہیں؟ کن کے پروردہ ہیں؟ انہیں کون مال دیتا ہے؟ ان کے کیا کیا عزائم ہیں؟ اگر آپ گہرائی میں مطالعہ کریں گے تو آپ کو یہی معلوم ہوگا کہ یہ سارے یہود و نصاریٰ کے گماشتے ہیں، اور انہی کے لئے کام کر رہے ہیں، ان کا مقصد انتشار پھیلانا، مسلمانوں میں تفریق واختلاف پیدا کرنا ہی ہے۔

آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ ہر ملک میں ان کا طرز وطریق کام کرنے کا الگ ہے، یہ دشمنانِ اسلام عہدِ اول سے آج تک اسی ایک کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ قرآنی تعلیمات اور اسلامی ہدایات کو کس طرح اور کیسے مسلمانوں کے قلوب وباطن سے نکال کر انہیں کافر، عیسائی، شیعہ، غیر مقلد، قادیانی، پرویزی وغیرہ بنایا جائے، مگر اسلام کی حقانیت اور اس کی اصلاحی برکتوں اور عظمتوں میں نہ کوئی کمی آئی ہے، اور نہ دشمنانِ اسلام کو سکون نصیب ہوا ہے۔ خود امریکہ اور عیسائی ممالک میں لوگ مسلمان ہو رہے ہیں، چرچ بک رہے ہیں ان کی جگہ مسجدیں بن رہی ہیں، لوگ دھڑا دھڑ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک ہی مرحلے میں ہزاروں جرمنی عیسائیوں نے اسلام قبول کیا، اب یورپ یہ سوچ رہا ہے کہ مذہبی آزادی کے قوانین پر کیسے اور کس طرح پابندی عائد کی جائے۔

اور خدا کی شان ہے کہ اکثر یورپی عورتیں اپنی عصمت کے تحفظ کی خاطر مسلمان ہو رہی ہیں، کیونکہ عیسائیت

نے ان کی عصمتوں کو بجائے تحفظ کے بازیچہ اطفال بنا کر انسان تو در کنار کتوں کے ذریعہ ان کا ستیاناس کیا، اللہ کی پناہ مانگئے، کیسا برا معاشرہ ہے کہ اشرف المخلوقات کی عصمت وحیاء بازاروں میں کھلم کھلا انسانوں اور کتوں کی نذر ہورہی ہے۔ یہی حال جاپان اور چائنا جیسے ترقی یافتہ ملکوں کا ہے، اس لئے صنفِ نازک نے اب یہی فیصلہ کیا ہوا ہے کہ انسانی حیاء غیرت اور عورتوں کی حیاء وعفت کا تحفظ سوائے اسلام کے کسی اور مذہب کے پاس نہیں۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ وَھُوَ وَلِیُّ الْھِدَایَۃِ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے وعید سنائی جو سونا چاندی جمع کرتے ہیں (درحقیقت بنیادی طور پر یہ خصلت احبار ورُہبان کی ہے، جسے بدقسمتی سے ہمارے مسلمانوں نے ورثہ میں قبول کیا ہوا ہے) اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔

یَکْنِزُوْنَ کو ماقبل پر عطف نہیں فرمایا (یہ ایک توجیہ ہے، دوسری توجیہ آنے والی ہے) بلکہ اسم موصول وَالَّذِیْنَ لاکر مستقل جملہ کے ذریعہ چاندی سونا جمع کرنے والوں کے لئے سخت وعید بیان فرمائی۔ الفاظ کے عموم میں یہود ونصاریٰ کے علماء اور مشائخ بھی داخل ہیں، جو مال جمع کرنے کی وجہ سے تورات کے احکام میں تحریف کرتے تھے، اور اس امت کے وہ افراد بھی مراد ہیں جو اہل کتاب سے سب کچھ سیکھ کر سونا چاندی جمع کرتے ہیں، اور شریعت کے مقرر کردہ حقوقِ مالیہ ادا نہیں کرتے ہیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾
اور جولوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں، اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔ بشارت دراصل خوشخبری والی چیز کی ہوتی ہے، لیکن یہاں اور چند دیگر مقامات پر عذاب کی خبر کو بشارت سے تعبیر فرمانے میں نکتہ یہ ہے کہ وہ مال جمع کرنے یا مثلاً معصیت اور کفر کو اپنے لئے اچھا سمجھتے تھے، ان کے گمان کے برخلاف ارشاد فرمایا کہ تمہیں اس کی وجہ سے عذاب مبارک ہو، جب تم عذاب کو اچھا سمجھتے ہو تو خوش رہو، اور خوش ہو جاؤ۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ ﴿اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ﴾ سے مراد احبار اور رُہبان ہی ہیں، اور اس جملہ کا عطف محذوف پر ہے، جس پر سابق کلام دلالت کررہا ہے، اصل کلام یوں ہے: ﴿اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ﴾۔ اس صورت میں آئندہ ﴿فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾ کا حکم اہل کتاب

کے لئے خصوصیت کے ساتھ ہوگا، پھر یہ حکم دوسرے لوگوں کے لئے علاوہ اہل کتاب کے دَلالۃُ النَّص سے ثابت ہوگا۔

﴿يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ﴾ جس روز ان کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے (سرخ کیا جائے) گا پھر ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائے گا، اور کہا جائے گا کہ یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنی جانوں کے لئے جمع کیا تھا، سو اب تم چکھ لو جسے جمع کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص سونے چاندی کا مالک تھا، جس میں سے اس کا حق ادا نہیں کرتا تھا (یعنی زکوٰۃ نہیں دیتا تھا) تو جب قیامت کا دن ہوگا اس کے لئے آگ کی تختیاں بنائی جائیں گی، پھر ان تختیوں کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا، اور اس کے ذریعہ اس کے پہلو اور اس کی پیشانی اور اس کی کمر کو داغ دیا جائے گا، جب وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی تو ان کو پھر سے گرم کر کے لوٹا دیا جائے گا، یہ اس دن میں مسلسل ہوتا رہے گا جو پچاس ہزار سال کا ہوگا، پھر نتیجہ میں وہ اپنا راستہ جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف دیکھ لے گا، اس کے بعد مال مویشیوں، اونٹ، گائے، بھیڑ بکری وغیرہ کے عذاب کا تذکرہ فرمایا، جن کی زکوٰۃ نہیں دی ہے۔ [مسلم]

یہ کتنا بڑا سخت عذاب ہوگا، جس کا کوئی عقلمند تصور تک کرنے سے عاجز ہوگا، پس اس کا ہر وہ شخص تصور کرے جو مال جمع کرتا ہے، اور چھوڑ کر چلا جاتا ہے، اور ایک مختصر مقدار جو زکوٰۃ کا حصہ ہے کنجوسی کر کے اسے ادا نہیں کرتا ہے۔ پیشانیوں اور پہلوؤں اور پشتوں کو داغ دیتے ہیں، علماء کرام نے یہ حکمت بتائی ہے کہ جب ایسے لوگوں کے پاس کوئی فقیر، سائل زکوٰۃ کا طلبگار سامنے سے آتا ہے تو اسے دیکھ کر پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں، پھر اس سے نظر بچانے کے لئے دائیں یا بائیں طرف مڑتے ہیں، اگر سوال کرنے والا اس طرح سے پیچھا نہ چھوڑے تو اس کی طرف پشت کر لیتے ہیں، اس لئے پیشانی پہلو اور پشت کو عذاب کے لئے مخصوص کیا گیا۔ واللہ اعلم

زکوٰۃ ایک اہم بنیادی مالی عبادت ہے، اس کا وہی حکم ہے جیسے نماز و روزہ، اس کی فرضیت نصِ قطعی سے ثابت ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ کے ساتھ جہاد کیا تھا، اس پر سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ رضی اللہ عنہ کی تائید کی، اور اجماع ہو گیا۔

قرآن مجید میں (۳۲) مقامات پر زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، سورۂ حٰمٓ سجدہ میں فرمایا: ﴿فَوَيْلٌ

لِّلۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ﴿۶﴾ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۷﴾ [حمٓ السجدة] (سوخرابی ہے مشرکین کے لئے جوزکوٰۃ ادانہیں کرتے، اوروہ آخرت کے منکر ہیں)۔اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ زکوٰۃ نہ دینا مشرکوں اوران لوگوں کا کام ہے جوآخرت پر ایمان نہیں رکھتے، زکوٰۃ کے علاوہ قواعدِ شرعیہ کے مطابق دوسرے اخراجات بھی واجب ہیں، یعنی صدقۂ فطر ادا کرنا، اورعید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کرنا، عِند الضرورۃ ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں پر قواعدِ شرعیہ کے مطابق خرچ کرنا، یہ سب مالی حقوق ہیں، جو مال سے متعلق ہیں۔

اور حقوقِ واجبہ کے علاوہ جو کوئی جتنا بھی اللہ تعالیٰ کی رضاء کے لئے خرچ کردے گا اس کا ثواب پائے گا، جس کو نفلی صدقات کہا جاتا ہے، لیکن فرائض اور واجبات میں خرچ کرنے کا خاص خیال رکھے، تاکہ آخرت میں مؤاخذہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی راہ میں خرچ کرنے کا لفظ عام ہے، اس میں فرض زکوٰۃ، نفلی خیرات اور تمام واجب ومستحب صدقات داخل ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ثواب کی نیت سے اپنے بال بچوں پر خرچ کرتا ہے وہ اس کے لئے صدقہ شمار ہوتا ہے۔ [بخاري ومسلم]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایک وہ دینار ہے جس کو تو راہِ خدا (جہاد) میں صرف کرے، ایک وہ دینار ہے جو تو کسی غلام کی آزادی پر خرچ کرے، ایک وہ دینار ہے جو تو کسی مسکین پر خرچ کرے، ایک وہ دینار ہے جو تو اپنے اہل وعیال اور بچوں پر خرچ کرے، ان میں سب سے زیادہ ثواب والا وہ دینار ہے جو بچوں پر صرف ہو۔ [مسلم]

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے **الأوسط** میں، ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے **الكامل** میں، اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کردی گئی وہ کنز نہیں ہے، یعنی جس کنز پر وعید آئی ہے وہ بے زکوٰۃ والا کنز ہے، زکوٰۃ والا مال اس سے مستثنیٰ ہے۔ الحمد للہ۔ پس مال جمع کرنا اور اس کی زکوٰۃ ادا کرنا وعید میں شامل نہیں۔ مزید تفصیلات، نصابِ زکوٰۃ، اور مصارف کا بیان اپنے موقع پر دیکھیں۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوۡرِ عِنۡدَ اللّٰهِ اثۡنَا عَشَرَ شَهۡرًا فِىۡ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوۡمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ

مِنۡهَاۤ اَرۡبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِيۡهِنَّ اَنۡفُسَكُمۡ وَقَاتِلُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ

كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝٣٦ اِنَّمَا النَّسِيْٓءُ زِيَادَةٌ
فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِــُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ
اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٣٧

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی کتاب میں جس دن اس نے آسمان اور زمین کو پیدا فرمایا مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہے، ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، یہ دین مستقیم ہے، سو ان مہینوں میں تم اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو، اور تمام مشرکین سے قتال کرو، جیسا کہ وہ تم سب سے قتال کرتے ہیں، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے ۝٣٦ مہینوں کی حرمت کو آگے بڑھا دینا کفر میں ترقی کرنا ہے، جس سے کافر لوگ گمراہ کئے جاتے ہیں کہ وہ اس مہینے کو کسی سال حلال کر لیتے ہیں، اور کسی سال حرام قرار دیتے ہیں تا کہ ان مہینوں کی گنتی پوری کر لیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کے حرام کئے ہوئے مہینوں کو حلال کر لیتے ہیں، ان کے برے اعمال ان کے لئے مزین کر دیے گئے، اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا ۝٣٧

معارف ومنازل

پہلی آیت کریمہ میں یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس دن آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا تھا اسی دن سے اس نے قمری مہینوں کی تعداد ایک سال کے لئے بارہ مہینے مقرر فرمائے، اور ان میں سے چار مہینوں کو حرام قرار دیدیا، جن میں ہر قسم کے قتال کرنے اور اسلحہ اٹھانے کی ممانعت کر دی، یہ چار مہینے ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب ہیں۔ جمہور علماء کرام فرماتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں یہ حکم رہا، پھر اس کا حکم منسوخ ہو گیا، اب قیامت تک یہی حکم ہے کہ ان مہینوں میں بھی کفار کے ساتھ جہاد جائز ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں تفصیل گزر چکی۔

اس کے ساتھ فرمایا کہ یہ دین مستقیم ہے، یعنی سال کے مہینوں کا بارہ ہونا، اور چار مہینوں کا اشہر الحرم ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر چیز ہے، اور یہی دین صحیح اور ملتِ قیمہ ہے۔ جاہلیت کے دور میں بھی لوگ اس عقیدہ کی پیروی کرتے تھے، اگر کوئی اپنے باپ کے قاتل کو دیکھتا تو تعرض نہ کرتا، البتہ جاہلیت والوں نے یہ غلط رسم کی ابتدا کی کہ کبھی سال کے مہینوں کا عدد بڑھا دیتے، اور مہینوں میں فرضی ردّوبدل بھی کرتے تھے، کبھی اشہر الحرم کی جگہ دوسرے مہینوں کو، اور کبھی اپنے مقصد کی خاطر دوسرے مہینوں کو اشہر الحرم قرار دیتے تھے، گویا کہ مہینوں کی حلت و

حرمت اپنے مزاج پر چلاتے تھے۔ فرمایا:

﴿فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ﴾ سوتم ان سب مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم وزیادتی نہ کرو، یعنی گناہ نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری پر قائم رہو، کیونکہ جو گناہ کرتا ہے گویا وہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے، جس کی سزا اسے روزِ قیامت بھگتنا پڑے گی۔ بعض حضرات نے یوں ترجمہ کیا ہے کہ حلال وحرام میں تمیز کرو، حرام مہینوں کو حلال نہ بناؤ، اور حلال مہینوں کو حرام قرار نہ دو، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا ظلم ہے، جیسے یہود ونصاریٰ اور مشرکین کرتے ہیں۔

﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً﴾ اور تمام کافروں سے جنگ کرو، جیسے وہ تم سے جنگ کرتے ہیں، اور تقویٰ اختیار کرو، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے۔

دوسری آیت میں دورِ جاہلیت والوں کے ایک غلط طریقہ کار کا تذکرہ فرمایا، اور وہ یہ کہ حرام مہینوں کو مؤخر کرنا یہ کفر میں ایک زیادتی ہے۔ مشرکینِ عرب مشرک تو تھے ہی، اپنے اس طریقہ کار سے بھی مزید کفر میں ترقی کر گئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تحریم کو بدل کر اشہر الحرم کو آگے پیچھے کر کے حلال کر لیتے تھے۔

آگے بڑھنے سے پہلے "اَلنَّسِیْءُ" یعنی حرام مہینوں کو مؤخر کرنے کا مطلب سمجھنا چاہئے، اللہ تعالیٰ شانہ نے حرام مہینوں کو حرام قرار دیا تھا، یعنی ان میں قتل وقتال کی اجازت نہ تھی، قریشِ مکہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بھی تھے، اور کعبہ شریف کے متولی بھی تھے، جو ان کے جدامجد حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر کیا تھا، ان لوگوں میں حضرت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں سے جو باتیں باقی رہ گئی تھیں ان میں حج کرنا بھی تھا، اور چار مہینوں کو محترم بھی سمجھتے تھے، اور ان میں قتل وقتال کو حرام مانتے تھے۔ لیکن ان میں اور عرب کے دیگر قبائل میں جہالت کی وجہ سے شر وفساد اور قتل وقتال ایک پیشہ بن کر رہ گیا تھا، اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر حملہ کر کے لوٹ مار کے ذریعے مال ومویشی حاصل کر کے اپنی معیشت بناتا تھا، کبھی لڑائی ٹھن جاتی تھی، اور لوٹ مار اور جنگ کرنے کی ضرورت ان چار مہینوں میں سے کسی مہینے میں محسوس کرتے، تو یوں کر لیتے کہ کسی مہینے کو مؤخر کر لیتے، مثلاً ماہ محرم میں انہیں جنگ کرنی ہوتی تو یوں کہتے تھے کہ یہ ماہ محرم نہیں ہے بلکہ ماہ صفر ہے، محرم اس سے آئندہ مہینہ ہوگا، اس طرح محرم کو صفر قرار دے کر جنگ کر لیتے تھے، اور ماہ صفر کو محرم کی جگہ شہر حرام کہتے تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مہینہ حرمت والا تھا اس کو اپنی طرف سے حلال، اور جو مہینہ حلال تھا اسے حرام قرار دے دیتے تھے، تو اس طرح اللہ تعالیٰ کی تحلیل وتحریم بدل دیتے تھے۔

اوپر ماہ محرم اور صفر کے آگے پیچھے کرنے کی ایک مثال پیش کی گئی ہے، اس طرح وہ سال کے بارہ مہینوں کو اپنی اپنی جگہ سے ہٹا چکے تھے، اور یہ جانتے ہوئے کہ حج کا مہینہ ماہ ذوالحجہ ہی ہے آگے بڑھاتے، یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ حج بھی ذوالحجہ کے علاوہ دوسرے مہینوں میں ہونے لگا تھا۔

۱۰ھ میں جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج ادا فرمایا جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں تو وہ ٹھیک ۹ ذوالحجہ کو واقع ہوا تھا، اور یہ اللہ کے حکم سے ایسا ہونا ہی تھا اور قیامت تک جاہلیت اور کفر کے رواج و رسم کو چونکہ ختم کرنا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کا صحیح انتظام فرمایا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر یعنی دسویں ذوالحجہ کو منیٰ شریف میں جو تاریخی خطبہ دیا اس میں فرمایا: اِنَّ الزَّمَانَ قَدِاسْتَدَارَ کَھَیْئَتِہٖ یَوْمَ خَلَقَ اللہُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضَ۔ بلاشبہ زمانہ گھوم کر اپنی اسی جگہ پر آ گیا ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تھا، یعنی مشرکین کے آگے بڑھانے اور پیچھے ہٹانے کی تغییر (ہیر پھیر) اور تبدیلی جو تھی اس کا کوئی دخل اور اثر مہینوں کی ترتیب میں نہیں رہا، اگر یہ لوگ تغیر اور تبدیل نہ کرتے تب بھی یہ مہینہ اپنی اصل کے اعتبار سے ذوالحجہ ہی ہوتا، لہٰذا بارہ مہینے اب اپنی اپنی جگہ پر آ گئے ہیں، اور آئندہ قیامت تک اپنے اصلی حال پر چلتے رہیں گے، اور کوئی شخص ان کو آگے اور پیچھے نہیں کر سکے گا۔ ان شاء اللہ۔

﴿یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ اس کے ذریعہ گمراہ کئے جاتے ہیں۔

﴿یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّیُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا﴾ کسی مہینے کو ایک سال حلال قرار دیتے تھے، اور ایک سال حرام قرار دے لیتے تھے۔

﴿لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ﴾ تاکہ وہ ان مہینوں کی گنتی پوری کر لیں جو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیئے تھے، یعنی سال میں گنتی کے اعتبار سے چار مہینوں کی حرمت اپنے خیال میں اس طرح برقرار رکھتے تھے کہ کوئی سے چار مہینے اپنی اغراض کے مطابق حرام مان لیتے تھے، چاہے وہ وہی مہینے ہوں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام یا ان کے علاوہ ہوں۔

کبھی تو مہینوں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے تحریم اور تحلیل کی رسم کا طریقہ اختیار کر لیتے تھے، اور کبھی یوں کہتے تھے کہ اس سال محرم کا مہینہ حرام نہیں ہے، اس کی جگہ صفر کا مہینہ حرام ہوگا، پھر اپنی اغراضِ نفسانیہ کے لئے ضرورت محسوس کرتے تو صفر کا مہینہ آنے پر کہہ دیتے تھے کہ یہ مہینہ حرام نہیں ہے، آئندہ مہینہ ربیع الاول حرام ہوگا۔ شیطان نے انہیں اس قسم کا سبق پڑھایا تھا، اور ان کے برے اعمال کو خوبصورت اور اچھا کر کے ان کے سامنے پیش کیا تھا، جیسے

ابلیس کا ہمیشہ اسی طرح کا کردار ہوا کرتا ہے۔ اسی کو فرمایا:

﴿زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ﴾ ان کے لئے ان کے برے عمل مزین کر دیئے گئے جنہیں وہ اچھا سمجھتے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا، کیونکہ وہ ہدایت پر نہیں آنا چاہتے، اور ہدایت کو اچھا بھی نہیں سمجھتے۔

فائدہ:

عالمِ اسلام بجائے اس کے کہ اہل کتاب اور کفار پر حکمرانی کرے، اور ان کی شوکت کو ختم کر کے ان سے جزیہ وصول کرے، بدقسمتی سے معاملہ الٹا ہی چل پڑا ہے، آج کفر دندناتے ہوئے نالائق مسلمان حکمرانوں سے ٹیکس کے نام سے جزیہ وصول کر رہا ہے، مسلمان نے ترکِ جہاد کر کے اپنی حیثیت کو خود ختم کیا، اور تو اور اسلامی مہینوں کی اہمیت بھی کھو بیٹھے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

آنے والی آیتوں میں اسی پر تنبیہ اور نزول کی نشاندہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں سستی اور غفلت کا نتیجہ غلامی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں، تو فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ڏ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـــًٔا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۰﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکل کھڑے ہو، تو زمین پر بوجھل بن جاتے ہو، کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا والی زندگی پر راضی ہو گئے؟ سو دنیا والی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بہت تھوڑی سی ہے ﴿۳۸﴾ اگر تم نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب دے گا، اور تمہاری جگہ کوئی

دوسری قوم پیدا فرمادے گا، اور تم اس کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے ہو، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۳۹﴾ اگر تم اس کے رسول کی مدد نہ کرو تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی ہے، جبکہ ان کو کافروں نے مکہ سے نکال دیا تھا، جبکہ وہ دو آدمیوں میں سے ایک تھے، جبکہ وہ دونوں غار میں تھے، جبکہ وہ اپنے ساتھی سے فرما رہے تھے کہ غم نہ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنا سکینہ نازل فرمایا، اور ایسے لشکروں کے ذریعہ آپ کی مدد فرمائی جنہیں تم نے نہیں دیکھا، اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بات نیچی کردی جو کفر اختیار کئے ہوئے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی بات اونچی ہی ہے، اور اللہ تعالیٰ عزّت والا ہے، حکمت والا ہے ﴿۴۰﴾

معارف ومنازل

آیات مذکورہ کا شان نزول یہ ہے کہ جب سرور عالم ﷺ عرب کے مشرکین پر غالب آگئے، تو اہل کتاب کے ساتھ جہاد کے متعلق آپ ﷺ کو یہ خیال پیدا ہوا جس کا بیان کچھ پہلے گزر گیا تھا۔

گویا آیات مذکورہ بالا میں اب سرور عالم ﷺ کے غزوات میں سے ایک اہم غزوہ کا بیان ہے، اور اس کے ضمن میں بہت سے احکام اور ہدایات ہیں، یہ غزوہ غزوۂ تبوک کے نام سے موسوم ومشہور ہے، اور سرور عالم ﷺ کا تقریباً آخری غزوہ ہے۔

تبوک مدینہ منورہ کے شمال میں شام کی سرحد پر ایک شہر کا نام ہے، آج کل سعودیہ کا ایک صوبائی دارالحکومت ہے، شمالی صوبہ کا امیر وہاں تبوک کے شہر میں ہوتا ہے، اس زمانہ میں شام رومی حکومت کا ایک صوبہ ہوتا تھا۔

سرور عالم ﷺ ۸ھ میں جب فتح مکہ سے فارغ ہوئے، پھر غزوۂ حنین کے بعد طائف کا محاصرہ ہوا، ماہ ذوالقعدہ میں وہاں سے جعرانہ، اور پھر مکہ مکرمہ، آخر میں مدینہ منورہ پہنچے، تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اب اہل کتاب رومیوں سے جہاد کرنے کے لئے چلو، اس موقع پر خبر ملی کہ رومی لوگ مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے بڑی تعداد میں شام کی سرحد پر جمع ہو چکے ہیں۔ صوبہ شام آس پاس کے عرب قبائل اور غسانی عرب رومیوں کے زیر نگین تھا، وہاں ہرقل کی حکومت تھی، جو رومیوں کا بادشاہ تھا، یہ وہی ہرقل ہے جس نے ابوسفیان کے ساتھ بات کی، اور سرور عالم ﷺ کے متعلق سوال وجواب کئے، بالآخر متأثر ہو کر اضطراری طور پر آپ ﷺ کی نبوت کی تصدیق کی، اور کہا: وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهٗ لَغَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ۔ اگر میں ان کے پاس ہوتا تو آپ ﷺ کے قدموں کو دھو لیتا، مگر

بادشاہت کی حرص ولالچ نے اسے ایمان وانقیاد سے محروم رکھا، یہاں تک کہ نصرانیت پر مر گیا۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کے دو قریبی ساتھی ابن ناطور اور ضغاطر مسلمان ہو گئے، اس موقع پر ہرقل نے ایک لاکھ یا پچاس ہزار، یا چالیس ہزار کا لشکر شام کی سرحد پر پہنچایا تھا، اور ان کا مقدمۃ الجیش بلقاء تک پہنچ گیا تھا، اور ہرقل نے اپنی فوج کو سال بھر کی تنخواہیں اور مراعات بھی تقسیم کر دیئے تھے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی فیصلہ فرمایا کہ ان سے وہیں چل کر مقابلہ کرلیا جائے، اور دفاع کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بروز جمعرات ماہ رجب ۹ھ کو تیس ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لشکر کے ساتھ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، اور محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کو اپنا قائم مقام اور مدینہ کا والی مقرر فرمایا، اور شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اہل و عیال کی حفاظت اور خبر گیری کے لئے مدینہ میں چھوڑا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ مجھ کو عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہو، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تجھ کو مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ طریقہ تھا کہ جب جہاد کے لئے جانا ہوتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم توریہ سے کام لیتے تھے، (یعنی نام لے کر واضح طور پر نہیں بتاتے تھے کہ فلاں مقام پر جانا ہے، اور فلاں قوم سے جنگ کرنی ہے)۔ غزوۂ تبوک کا موقع ایسا تھا کہ پھل پک رہے تھے، کھیتیاں تیار تھیں، ان کے کاٹنے کا زمانہ تھا، اور تنگدستی عام تھی، گرمی بہت سخت تھی، اور سفر بہت دور تھا، دشمن کی تعداد بھی زیادہ تھی، اور درمیان میں خوفناک میدان تھے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافِ عادت واضح طور پر فرمایا کہ ہمیں شام کی سرحد "تبوک" جانا ہے، تاکہ لوگ ہر اعتبار سے اپنی تیاری کرلیں۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جہاد کے لئے حکم فرمانا لوگوں کو بہت بھاری اور سخت معلوم ہوا، اور اس اعلانِ عام سے فداکار اور جان نثار امتحان میں ہی پڑ گئے، نتیجہ کے طور پر لوگوں کے مختلف حالات ہو گئے، قرآن کریم نے ان میں سے ہر ایک کی حالت کے متعلق جدا جدا ارشادات فرمائے ہیں۔

ایک حالت ان کامل ومکمل جان نثاروں کی تھی جو بغیر کسی تردد کے تیار ہو گئے، میدان میں اترے، اور تیار ہو گئے۔ دوسرے وہ جو ابتداء میں تردد کے ساتھ رہے، مگر تردد ختم کر کے بیک لخت میدان میں اترے، جن کے بارے میں فرمان ہے: ﴿الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ﴾ [التوبۃ: ۱۱۷] (یعنی وہ لوگ قابلِ مدح ہیں جنہوں نے سخت تنگی کے وقت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کیا، بعد اس کے کہ

ان میں سے ایک فریق کے قلوب لغزش کرنے لگے تھے)۔

تیسری حالت ان لوگوں کی تھی جو کسی صحیح عذر کی بناء پر اس جہاد میں نہ جا سکے، یعنی معذور لوگ، جن کے بارے میں فرمایا: ﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى﴾[التوبۃ:۹۱] (یعنی ضعیفوں، بیماروں اور معذوروں پر کوئی گناہ نہیں ہے) ان کے عذر کی قبولیت کا اظہار فرمایا۔

چوتھی قسم ان لوگوں کی تھی جو باوجود کوئی عذر نہ ہونے کے کاہلی اور سستی کے سبب جہاد میں شریک نہ ہو سکے، یہ صرف تین لوگ تھے، ان کے متعلق ارشاد ہے: ﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ﴾[التوبۃ:۱۰۲] (اور اوروں نے اپنے گناہ کا اقرار کرلیا)۔ پھر فرمایا: ﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا﴾[التوبۃ:۱۱۸] (اور ان تین پر جنہیں پیچھے چھوڑ دیا گیا) اور فرمایا: ﴿وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ﴾[التوبۃ:۱۰۶] (اور اوروں کو ملتوی کر دیا گیا) یہ تینوں آیتیں ایسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئیں جن کی توبہ پچاس دنوں بعد قبول ہوئی، جس کا بیان آگے آنے والا ہے۔

پانچواں طبقہ منافقین کا تھا، جنہوں نے اپنے نفاق کو بصد کوشش چھپانے کے کئی جتن کیے، مگر ان کے نفاق کی قلعی کھل گئی، اور خوب رسوا و ذلیل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سورۃ البراءۃ کا نام سورۃ الفاضحۃ رکھا۔ اس سورت کی کئی آیتوں میں مختلف انداز سے ان کے نفاق کو واضح کیا گیا۔

چھٹا طبقہ وہ بھی منافقین کا تھا جو شرارت اور جاسوسی کے لئے مسلمانوں کے ساتھ شریک رہے، ان کا مقصد جہاد نہ تھا، بلکہ فساد و فتنہ انگیزی تھا، جیسے فرمایا: ﴿وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ﴾[التوبۃ:۴۷] (اور تمہارے اندر کفار کے جاسوس ہیں) وغیرہ۔

بہر حال! ان ساری سختیوں اور تکالیف کے باوجود پیچھے رہنے والے لوگ نہایت محدود اور قلیل تھے، اس تیس ہزار فرشتہ صفت لشکر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان ناگفتہ بہ حالات کے باوجود کہ جس میں چھ چھ آدمیوں کا ایک اونٹ ہوتا تھا، کھانے پینے کے سارے اسباب محدود تو درکنار مفقود رہے، مگر ان مبارک لوگوں نے ثابت قدمی اور بے مثال قربانیوں کے نقوش رقم کئے۔ مؤرخ امام واقدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ لشکر ستر ہزار نفوسِ قدسیہ پر مشتمل تھا۔ اس تباہ کن گرمی میں بے سروسامانی کے عالم میں لق ودق آگ برسنے والے ریگستانی اور سنگلاخ صحراؤں اور پیچ در پیچ میدانوں میں آنحضرت سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری شجاعت اور بے مثال جرأت وصداقت کے ساتھ لشکر کی قیادت فرماتے رہے۔

کچھ لوگوں نے واضح طور پر کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیادت، رفاقت اور موجودگی نے ہر قسم کے رنج وتکلیف اور نا قابلِ برداشت صعوبتوں کو آسان اور سہل بنا دیا، نتیجہ اس جہاد کا یہ ہوا کہ رومی بادشاہ ہرقل کو مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت اور مدینہ سے شام کی سرحد تک آنے اور دلیری کا پتہ چلا تو اس پر رعب طاری ہوا، اور پھر مقابلہ پر نہیں آیا۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے فرشتہ خصلت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ چند روز میدانِ جنگ پر قیام کرنے کے بعد واپس مدینہ منورہ روانہ ہوئے، اور بخیر وعافیت دارالہجرۃ پہنچ گئے۔

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ﴾ دراصل یہ خطاب چوتھی جماعت کو ہے، جو بغیر کسی عذر و بیماری کے محض سستی اور کاہلی کی وجہ سے جہاد پر نہ جاسکے۔ آیت کریمہ میں ان کو تنبیہ بھی ہے، اور ترکِ جہاد کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب غفلت اور تن آسانی اور حب دنیا اس کی نشاندہی بھی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو تمام بیماریوں کا اصل سبب حبِ دنیا ہی ہے، کیونکہ حبِ آخرت کے ساتھ سخت سے سخت اور تمام مشکل کام آسان ہو جاتے ہیں، جبکہ حبِ دنیا تمام دینی مذہبی منصوبوں پر پانی پھیر دیتا ہے، اور غفلت پیدا کرتا ہے، بدنی جسمانی مرض اتنا خطرناک نہیں ہوتا جتنا کہ روحانی مرض جو کہ تباہ کن ہوتا ہے، اسی کو فرمایا کہ جب تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلنے کا حکم ہوتا ہے تو زمین اور گھروں کے ساتھ چمٹ جاتے ہو، اور بوجھل ہو جاتے ہو۔

اب یہ حکم اپنے عموم کے ساتھ قیامت تک آنے والے سارے مسلمانوں کو شامل ہے کہ صرف جہاد نہیں، بلکہ ہر دینی کام اور اخروی عمل کے انجام دینے میں شوق ورغبت کے ساتھ اقدام اور دلچسپی ہو، اور ہر طرح کی سستی اور کاہلی اور حبِ دنیا سے اجتناب ہو۔ پھر استغناء کا اظہار فرما کر دو حکم دیئے: پہلا یہ کہ اگر کلمہ پڑھنے اور ایمان لانے کے بعد معاہدہ شکنی کرو گے، اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کرو گے تو دردناک عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ دوسرا یہ کہ تم جو کچھ نیک کام جہاد اور دیگر اعمال انجام دو گے اس کا فائدہ اور پھل تمہیں ملے گا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے اعمال کے ہرگز محتاج نہیں، اللہ تعالیٰ براہ راست مَافَوقَ الأَسبَابِ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کرسکتا ہے، اور کر کے رہا ہے، جس کا مشاہدہ تم نے بھی کیا، اور تمہارے دشمنوں نے بھی کیا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے نرغہ اور گرفت سے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بخیر وعافیت نکال کر عالمِ اسباب کے تحت غارِ ثور پہنچایا، پھر غار کے دروازہ

پر کبوتروں نے انڈے دیئے، اور مکڑیوں نے جال بانی کا منظر دکھایا، دشمن فوج درفوج آئے اور اندھے ہوکر ناکام واپس لوٹے، تو اللہ تعالیٰ نے جس طرح دشمن کے مقابلہ میں اپنے پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی غار میں مدد کی، وہ اب بھی اس پر قادر وتوانا ہے کہ تمہارے بغیر اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدد کرے، اور اس کے دشمنوں کے منصوبے ناکام بنائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معیت جس طرح غار میں ان کو حاصل رہی اب بھی وہ معیت بدستور انہیں حاصل ہے۔

ہاں! اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا حکم مانو گے تو وہ معیت تمہیں بھی حاصل رہے گی، اور تمہارا رعب دشمن پر حاوی رہے گا، جو تمہارے مقابلہ سے خوفزدہ ہوگا۔

عقائدِ اسلام کے بنیادی اصول تین ہیں:

(۱) توحید (۲) رسالت (۳) اور آخرت۔ یہی عقائدِ ثلاثہ تمام اصلاحی اور نیک اعمال کی چابیاں ہیں، اور تمام معاصی اور گناہوں کے آگے آہنی دیوار ہیں، اگر تم ان بنیادی اصولوں کو اپناؤ گے تو اللہ تعالیٰ کی نصرت اور امداد کو آسمانوں سے اترتے ہوئے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرو گے، جیسے غزوۂ بدر میں اور فتح مکہ اور اس کے بعد حنین کے محاذ پر تم نے دیکھا اور مشاہدہ کیا۔ تمہاری روحانیت جب عروج پر ہوتی ہے تو ہزاروں لاکھوں مادی طاقتیں تمہارے سامنے ڈھیر ہوکر برف کی طرح پگھل جاتی ہیں۔

آج کے دور میں بھی اگر تمہیں اس کا مشاہدہ کرنا ہو تو افغانستان تمہارے سامنے ہے، اس پر خوب غور کرو، دیکھو اور نصرتِ الٰہی کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کرو، اور اس آیت پر غور کرو: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَمَوْلٰـكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ [الحج:۷۸] (اور اللہ کو مضبوطی سے تھامے رکھو، وہ تمہارا رکھوالا ہے، اچھا رکھوالا ہے، اچھا مددگار ہے)۔

فرمایا: ﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ یعنی اگر تم رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدد نہیں کرو گے، تو اس سے اللہ تعالیٰ کو اور اس کے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو، اور اللہ تعالیٰ کے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس وقت اپنے رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدد فرمائی جب ان کو مکہ کے کافروں نے مکہ مکرمہ سے نکال دیا، اور وہ اپنے ساتھی کے ساتھ جبلِ ثور کے غار میں پہنچ گئے۔

پہلے تو دشمنوں کے درمیان سے صحیح سالم نکال دینا، پھر غار ثور تک عافیت اور سلامتی کے ساتھ پہنچا دینا، پھر جب دشمن غار کے منہ پر پہنچ گئے اس وقت بھی ان کی حفاظت فرمانا، اور جو لوگ تلاش میں نکلے تھے انہیں اندھا بنا کر

ناکام واپس کر دینا، پھر غارِ ثور سے نکل کر پیچھا کرنے والے دشمنوں سے محفوظ فرما کر عافیت کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا دینا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوا۔

یہ بات کہنے کو تو دو لفظ ہیں، جن کا بولنا کچھ مشکل نہیں، مگر سننے والے حالت کا پورا نقشہ سامنے رکھ کر دل پر ہاتھ رکھ کر غور کر کے دیکھیں کہ یہ غار کیسا غار ہے جس کی نہ کوئی بلندی ہے، نہ خاص گہرائی ہے، نہ کوئی فوجی قلعہ ہے، نہ اس پر دروازہ، پھر اس کی بناوٹ کچھ ایسی ہے کہ شاید دستِ ازل نے اسے صرف اسی مقصد کے لئے بنایا ہو، اوپر سے پتھر اور چٹان، جس پر نہ کوئی چل سکتا ہو، اور نہ جھانک کر دیکھ سکتا ہو، وہاں سے چھ انچ کا سوراخ ہو، جس سے غار میں روشنی پہنچتی ہو، غار کی لمبائی چھ سات فٹ ہو، اور چوڑائی پانچ فٹ، اگر لیٹنے والا سونا چاہے تو یہ بھی ممکن ہو، اگر آرام سے بیٹھ کر نماز پڑھنا چاہے تو یہ بھی ممکن، اور اس کا منہ بعینہ اسی طرز کا ہو جیسے انسان کا منہ ہے، یعنی انسان اگر منہ کھول دے اور دانتوں کو بند رکھے تو اس کی زبان نظر نہ آئے گی، اور اگر منہ کھولنے کے ساتھ دانتوں کو بند نہ کرے تو سب کچھ نظر آئے گا، اور غار کے اندر چلے جانے کا واحد طریقہ یہ ہو کہ پیٹ کے بل زمین سے چمٹ کر جائے۔

پھر لطف یہ کہ کھلے پتھروں کا بنا ہوا نہ ہو، بلکہ ایک ہی چٹان ہو، اکثر حجاج وہاں پر جا کر غار پہچاننے میں غلطی کرتے ہیں، مرورِ زمانہ کے ساتھ لوگوں نے کمائی کی خاطر چھ سات مصنوعی غار بنا رکھے ہیں، جبکہ اصلی غار پہاڑ کی چوٹی سے مشرق کی طرف اترائی میں ساٹھ ستر فٹ نیچے ہے، جس کا صحیح نقشہ اور نشاندہی کتبِ مطلوبہ سے کی جاسکتی ہے، خاص کر "شفاء الغرام بأخبار البلد الحرام"۔

یہ ہے سفرِ ہجرت کی ایک مختصر جھلک، پورے سفر میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جن کے والد صحابی، خود صحابی، بیٹا صحابی، پوتا صحابی، اور بیٹی کا کیا کہنا وہ تو اپنے باپ دادے اور پوری امت کی ماں ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ستر خصوصیات، جن میں پورے جہاں کی کوئی عورت ان کی شریک نہیں (سورۂ نور میں بیان کریں گے۔ إن شاء اللہ)۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر کا ارادہ فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹا دیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں تسلی دی کہ تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفرِ ہجرت کا یوں آغاز فرمایا کہ ایک مُٹھی میں مٹی بھر کر دشمنوں کی طرف پھینک دی، جو ایک سو کے قریب مسلح ہو کر انتظار میں کھڑے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے، یہ مٹی بحکمِ الٰہی ان کے آنکھوں میں پڑ گئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ﴿ إِنَّا جَعَلْنَا فِيْ

اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ﴾ [یس:۸] (ہم نے ان کے گلوں میں طوق ڈال رکھے ہیں، جوٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں، اور اس جہ سے ان کے سراوپر کو اٹھے رہ گئے ہیں) پڑھتے ہوئے روانہ ہوگئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صدیق رضی اللہ عنہ دونوں حضرات راتوں رات غارِ ثور پہنچ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر چھوڑنے کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیال میں جو آئے تھے وہ تسلی کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں ہیں، دوسرا مقصد یہ تھا کہ لوگوں نے بہت سی امانتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو رکھی تھیں صبح حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں کی امانتیں ان کے سپرد کردیں گے۔

ایک طرف سے اہل مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دشمنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، دوسری طرف سب لوگ اپنے مال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بطور امانت رکھ کر اطمینان کر لیتے تھے، چنانچہ لوگ مخمصہ میں رہے، مٹی نے ان پر اثر کیا، اور وہ غنودگی میں رہے۔ پھر صبح جب حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر سے اٹھے تو لوگ حیرانی میں پوچھنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہاں ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ یہاں نہیں ہیں، وہ اپنا سامنہ لے کر ششدر رہ گئے۔ پھر قدموں کے نشانوں پر چلتے رہے، اس میں بھی حکمت تھی کہ کسی فرشتے کو یہ حکم نہیں ملا کہ قدموں کے نشان مٹائے، یہاں تک کہ غارِ ثور کے پاس پہنچ گئے، وہاں مکڑی کا جالا تہ بہ تہ دیکھ کر امیہ بن خلف نے کہا کہ یہ جالا اتنا پرانا ہے کہ "محمد" کی پیدائش سے بھی پہلے کا معلوم ہوتا ہے، کہنے لگے کہ اگر اس کے اندر گئے ہوتے تو یہ جالا اور کبوتروں کے یہ انڈے کیسے سلامت رہتے؟

اسی وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پریشانی لاحق ہوئی، اور کہنے لگے: یارسول اللہ! اگر ان میں سے کوئی شخص اپنے قدموں کی طرف نیچے نظر کرلے تو ہمیں دیکھ لے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: گھبراؤ مت، ہم محفوظ رہیں گے، ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ پریشان نہ ہوں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ مَاتَقُوْلُ فِيْ اثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا؟ ان دو افراد کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جن کا تیسرا اللہ ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین رات غارِ ثور میں قیام فرمایا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام عامر بن فہیرۃ رضی اللہ عنہ روزانہ رات کو دودھ لے جاکر پیش کردیتے تھے، دونوں حضرات اس کو پی لیتے تھے۔ تین دن گزارنے کے بعد مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوگئے، اور دسویں دن قباء پہنچ گئے۔ ربّ العزّت عزّ شانہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے رفیق محترم پر سکینہ نازل فرما کر انہیں مطمئن فرمایا۔ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ یہ ضمیر مجرور دونوں حضرات پر راجع کرسکتے ہیں۔ [مظهري]

﴿وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا﴾ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایسے لشکروں کے ذریعہ مدد فرمائی جنہیں تم نے نہیں دیکھا۔ ان لشکروں سے کیا مراد ہے؟ صاحب معالم التنزیل نے اس بارے میں تین قول نقل کئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلا یہ کہ اس سے فرشتے مراد ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لئے بھیجے گئے تھے کہ کافروں کی آنکھوں کو پھیر دیں، اور ان کی نظریں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہ پڑیں، یہ بہتر توجیہہ ہے۔

دوسرا یہ کہ فرشتوں نے کافروں کے دلوں پر رعب ڈال دیا، جس کی وجہ سے وہ فوراً واپس ہو گئے۔

تیسرا یہ کہ خاص اسی موقع پر فرشتے نازل ہونا مراد نہیں ہے، بلکہ بدر میں جو فرشتے مدد کے لئے آئے تھے وہ مراد ہیں۔ واللہ اعلم

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى﴾ اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کے کلمہ کو نیچا کر دیا، اس سے کلمہ شرک مراد ہے، جو قیامت تک کے لئے نیچا ہو گیا۔ شرک اور اس کے حواری ہمیشہ کے لئے پست ہو گئے۔

﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا﴾ اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کلمہ اللہ سے لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰه مراد ہے، یہ ہمیشہ کے لئے بلند ہے، اور بلند رہے گا۔ بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ کافروں کے کلمہ سے ان کا وہ مشورہ مراد ہے جس میں انہوں نے شیخ نجدی ابلیس کے کہنے پر طے کیا تھا کہ صبح ہونے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کیا جائے گا، اور کلمۃ اللہ سے اللہ تعالیٰ کی نصرت مراد ہے۔ ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ [آل عمران: ۵۴] (اور انہوں نے تدبیر کی، اور اللہ نے بھی تدبیر کی، اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے)۔

تدبیر کند بندہ ☆ تقدیر زند خندہ

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ غلبہ والا ہے، ہر چیز پر غالب ہے، وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے وہ حکیم بھی ہے، اپنی حکمت کاملہ کے تحت دنیا کو دار الاسباب بنایا، وہ اگر چاہے تو اسباب کے بغیر سب کچھ ظاہر کرے، اگر نہ چاہے تو سارے اسباب ناکارہ بنادے، وہ اگر چاہتا تو اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لمحوں میں مدینہ پہنچا دیتا، مگر دار الاسباب جہاں عام لوگوں کے لئے دار الامتحان اور دار البلاء ہے وہاں خواص بلکہ اَخص الخواص کو بھی امتحان و آزمائش کی بھٹی سے گزرنا پڑتا ہے۔ اَشَدُّ الْبَلَاءِ الْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ۔ کبھی گھمبیر مشکلات اور طرح طرح کے مصائب سے برگزیدہ ہستیوں کی آزمائش، اور کبھی ادنیٰ لوگوں کے لئے نہایت تعجب خیز آسائش، یہ سب اس کی سمجھ میں نہ آنے والی

حکمتوں کے تقاضے اور پیمائش ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر کافر ہے:

اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ سفر ہجرت میں اور غار ثور میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم خاص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی تھے، اور ﴿اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ جو فرمایا اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی مراد ہیں، چونکہ قرآن مجید میں ان کے صاحب ہونے کی تصریح ہے، اس لئے علماء امت کا فیصلہ ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی صحابیت کا منکر کافر ہے۔

شیعہ (جن کے چہرے سیاہ ہوں) جنہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شدید بغض وعناد ہے، وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ غار ثور میں آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی تھے، اور ﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ کا خطاب ان ہی کو تھا، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ساتھ لیا، اور "یار غار" بنایا، انہوں نے پورے سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی تکلیفیں اٹھائیں، سواری کا انتظام کیا، اپنے غلام کو روزانہ کھانا پینا پہنچانے پر مامور فرمایا، ان کے بیٹے عبد الرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ روزانہ رات کو حاضر ہوتے تھے، اور مشرکین کے شوروں سے انہیں مطلع کرتے تھے۔

اس کے علاوہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر اپنا سارا سرمایہ اسلام اور مسلمانوں پر صرف کیا، بہت سے غلام اور باندیاں جو اسلام قبول کر چکے تھے، ان کے مالک قریش کے کفار انہیں تختۂ مشق بنا کر شب وروز طرح طرح کے عذاب دیتے رہتے تھے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ انہیں من مانی قیمتوں پر خرید کر کے فی سبیل اللہ رضاءِ مولیٰ شانہ میں آزاد کرتے تھے، اور نو مسلم فقراء و مساکین پر اور ان کی ضروریات پر دراہم ودنانیر خرچ کرتے تھے۔ یہ ساری محنت اور بے مثال قربانیاں عقل کے اندھے ایمان کے دشمن روافض کو عیب نظر آئیں، کیونکہ دشمن کو خوبیاں عیب نظر آتی ہیں۔

ان کے نزدیک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ العیاذ باللہ کافر تھے، اور باقر مجلسی ملعون نے یہاں تک لکھا کہ اس امت کے فرعون تھے۔ دراصل بنیادی بات یہ ہے کہ شیعہ فرقہ صرف ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر اتنا غضبناک نہیں جتنا کہ وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر غضبناک ہے، کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر چھوڑ کر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کیوں ساتھ لیا؟ چاہئے تھا کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر چلتے، اس لئے (نقل کفر، کفر نباشد) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصاف نہیں

کیا۔ العیاذ باللہ ۔

روافض گر زند طعنہ بیار غار پیغمبر ☆ مکن عیبش کہ او لعنت ز میراث پدر دارد

صرف ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تکفیر نہیں، یہ فرقہ ضالہ یہود یہ سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مرتد و کافر کہتا ہے، روئے زمین پر اسلام کے دشمنوں میں یہ فرقہ سرفہرست ہے، اس کے کفر میں وہی شخص شک کرتا ہے جو اسلام کے ابجد تک سے بے علم ہو۔

اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ وَاَنۡفُسِكُمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ خَيۡرٌ لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۱﴾ لَوۡ كَانَ عَرَضًا قَرِيۡبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوۡكَ وَلٰـكِنۡۢ بَعُدَتۡ عَلَيۡهِمُ الشُّقَّةُ‌ ؕ وَسَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسۡتَطَعۡنَا لَخَرَجۡنَا مَعَكُمۡ‌ ۚ يُهۡلِكُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ‌ ۚ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ اِنَّهُمۡ لَـكٰذِبُوۡنَ ﴿۴۲﴾

ترجمہ: نکل کھڑے ہو جاؤ، ہلکے ہونے کی حالت میں اور بھاری ہونے کی حالت میں، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو﴿۴۱﴾ اگر قریب ہی میں سامان ملنے والا ہوتا اور سفر معمولی ہوتا تو وہ (منافق) آپ کے ساتھ ہو لیتے، لیکن ان کو مسافت دور نظر آئی، اور وہ عنقریب اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور آپ کے ساتھ نکلتے، وہ اپنی جانوں کو ہلاک کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ بے شک وہ جھوٹے ہیں﴿۴۲﴾

معارف ومنازل

منافقین کی دورخی اور جھوٹ کا بیان:

جب تبوک کے لئے عام چلنے کا اعلان ہوا تو مسلمانوں کا طبقۂ اول و دوم بغیر کسی عذر و بہانہ کے تیار ہو گیا، طبقہ سوم ویسے بھی بسبب معذوری رہ گیا، چوتھا طبقہ وہ راسخ العقیدہ لوگوں کا تھا جو سستی اور کاہلی کا شکار ہو گئے، پانچواں طبقہ خالص منافقین کا تھا، جن کا بیان آیت بالا میں ہو رہا ہے، اور چھٹا طبقہ بھی منافقین کا تھا۔

منافقین کا ایک فریق تو وہ تھا جس نے جھوٹے عذر و بہانے پیش کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بات کی اجازت لے لی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ جائیں، یہ لوگ پچاسی کے قریب تھے، اور اس وقت ان کا نفاق بالکل کھل

کر سامنے آ گیا، اور منافقین کا دوسرا فریق وہ تھا جو جاسوسی کے لئے اور شرارت کرنے کے لئے ساتھ ہو لیا تھا، ان کی باتوں کا تذکرہ اسی سورت میں آئندہ آ رہا ہے۔

﴿انْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا﴾ یہ مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے عمومِ احوال کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلو، ہر صورت میں، یعنی ہلکے ہو، بھاری ہو، مالدار ہو، تنگدست ہو، دبلے ہو، موٹے ہو، بوڑھے ہو، جوان ہو، اور تندرست ہو، یا مریض ہو، ہر حال میں نکلو، مال وجان کی بازی لگا کر جہاد کرو، اسی میں تمہارا فائدہ اور سعادت ہے۔ نیز ہر قسم کے شر وفتنوں سے تمہاری نجات اور بقاء ہے، یہ حکم سب کے لئے ہے۔ البتہ اس آیت کے حکم سے دوسری آیت: ﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى﴾ نے معذوروں اور بیماروں کو مستثنیٰ قرار دے دیا، گویا کہ عموم سے استثناء آ گیا، تو مطلب یہ ہے کہ بیماروں کے علاوہ سب پر نکلنا فرض ہوا۔

﴿لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ یہاں سے منافقین کا حال بیان فرما رہے ہیں، جنہوں نے مجاہدین کے ساتھ جانا منظور نہیں کیا تھا، ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ طالبِ دنیا ہیں، اگر ان کو یہ معلوم ہوتا کہ جلدی سے کوئی دنیاوی سامان مل جائے گا، یا سفر ایسا ہوتا کہ اسے مشقت کے بغیر برداشت کر لیتے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ روانہ ہو جاتے، کیونکہ یہ مفاد پرست اور سہولت کے خواہاں بھی ہیں، اس کے ساتھ چلنے میں ان کے اسلام کے ظاہری دعویٰ کا بھرم رہ جاتا، اور انہیں مالی منافع بھی حاصل ہونے کی امید ہو جاتی، لیکن سفر کے بارے میں انہوں نے جو غور کیا تو انہیں معلوم ہوا، لہٰذا ان کا نفاق کھل کر سامنے آ گیا، اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ جانے کو اپنے لئے پسند کیا، اور گھروں میں چمٹے رہے، اور بہانے شہانے کر کے جان خلاصی کی۔

دراصل ایمان اور نفاق کا معیار بھی یہی ہوتا ہے کہ ایماندار اسلام کی خاطر ہر قسم کی تکالیف برداشت کرتا ہے، جبکہ منافق تھوڑی مشقت تو شاید برداشت کرے، لیکن زیادہ مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، پھر جھوٹ کا سہارا لیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فِدَاهُ اَرْوَاحُنَا) تبوک سے واپس تشریف لے آئے تو ان منافقین نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ ہم میں جانے کی قوت اور طاقت نہ تھی، اگر ہم میں سکت ہوتی اور ہمارے بس میں ہوتا تو ہم ضرور آپ کے ساتھ چلتے، ان کے بارے میں پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے خبر دے دی تھی: ﴿وَسَيَحْلِفُوْنَ

بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ﴾۔اس کی تفصیل آئندہ آنے والی ہے۔

﴿يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ﴾ یہ لوگ اپنے نفسوں کو ہلاک وتباہ کرر ہے ہیں، ایک تو نفاق کی وجہ سے، دوسرے جہاد پر نہ جانے کی وجہ سے، پھر جھوٹ بول کر دھوکہ دہی کی وجہ سے، دوزخ میں جا کر ابدی سزا کی وجہ سے۔فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، کیونکہ ان کے پاس قوت بھی تھی، اور وسائل بھی، اور وہ جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس قوت وطاقت کی کمی تھی یہ سراسر جھوٹ اور غلط بیانی ہے۔

❁ ❁ ❁

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ۝٤٣
لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ۝٤٤ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ
فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ۝٤٥ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ
فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ۝٤٦ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا۟اَوْضَعُوْا
خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۝٤٧ لَقَدِ ابْتَغَوُا
الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَاۗءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ۝٤٨

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف فرمادیا، آپ نے ان کو کیوں اجازت دی؟ جب تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہوجاتے، اور جب تک آپ جھوٹوں کو معلوم نہ کر لیتے۝٤٣ آپ سے وہ لوگ اجازت نہیں مانگتے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کریں، اور اللہ تعالیٰ متقیوں کو جانتا ہے۝٤٤ آپ سے وہی لوگ اجازت مانگتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں، سو وہ اپنے شک میں حیران ہیں۝٤٥ اور اگر وہ لوگ نکلنے کا ارادہ کرتے تو اس کے لئے ضرور تیاری کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں فرمایا، سو ان کو روک دیا، اور کہا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۝٤٦ اگر وہ تم میں شامل ہو کر نکل جاتے تو زیادہ فساد کرنے کے سوا کچھ کام نہ کرتے، اور تمہارے درمیان فتنہ پردازی کی فکر میں تیزی کے ساتھ دوڑے پھرتے، اور تمہارے اندر وہ لوگ ہیں جو ان کے لئے جاسوسی

کرنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو جانتا ہے ﴿۴۷﴾ وہ پہلے سے فتنہ پردازی کی فکر میں لگے رہے ہیں، اور آپ کے لئے کارروائیوں کا اُلٹ پھیر کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ حق آ گیا، اور اللہ تعالیٰ کا حکم غالب ہوا، حالانکہ ان کو ناگوار ہو رہا تھا ﴿۴۸﴾

معارف ومنازل

منافقین نے تبوک نہ جانے کا فیصلہ تو کر ہی لیا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر جھوٹ بول کر بہانے تراش کر عذر پیش کر کے شریک نہ ہونے کی اجازت لیتے رہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اجازت دیتے رہے، اس اجازت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لطافت کے ساتھ عتاب ہوا، اور کمالِ عنایت ولطافت سے قصور بیان کرنے سے پہلے معافی کا اعلان فرمایا۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ آپ منافقین کو اجازت نہ دیں، اور جس بات پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی نہیں کی گئی ہو اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ترک اور فعل دونوں کے مختار ہیں، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی خطا کا ظہور وصدور نہیں ہوا۔ البتہ! ایک خلافِ اولیٰ امر کا ظہور ہو گیا، جس پر تلطف وعنایت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متنبہ کیا گیا۔ مقصود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت شان کا اظہار ہے۔

صاحب روح المعانی بھی فرماتے ہیں کہ یہ لطیفانہ عتاب ترکِ اولیٰ پر ہے، مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اجازت دینے میں توقف فرماتے تو اچھا ہوتا۔

فرمایا: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف فرمادیا۔ اس کے بعد اصل سبب کا ذکر ہے کہ آپ نے منافقین کو اجازت کیوں دی؟ یہ موقع سچے اور جھوٹوں کے جاننے کا تھا، اگر آپ اجازت دینے میں جلدی نہ فرماتے تو آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ سچا عذر پیش کرنے والا کون ہے، اور جھوٹا کون ہے، یا یہ کہ جانے والے سچے ثابت ہوتے اور بغیر عذر پیچھے رہنے والے جھوٹے اور منافق ثابت ہوتے۔ آگے اسی کی وضاحت ہے کہ اجازت نہ لینے والے سچے مؤمن ہیں، اور اجازت کا سہارا لے کر پیچھے رہنے والے منافق اور جھوٹے ہیں۔ تو فرمایا:

﴿لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپ سے اس بات کی اجازت نہیں

لیتے کہ اپنے مالوں اور جانوں کو جہاد میں لگائیں، کیونکہ وہ تو حکم سنتے ہی تیار ہو جاتے ہیں، وہ متقی لوگ ہیں، اور اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں کو خوب جانتا ہے۔ ہاں! ان کے برعکس منافقین ہیں، ان کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ﴾ جہاد میں نہ جانے کی وہی لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے، اور ان کے دلوں میں شک ہے، سو وہ اپنے شک میں حیران ہو رہے ہیں، کبھی انہیں خیال آتا ہے کہ جانا بہتر ہے، تاکہ نفاق چھپا رہے، اور کبھی سوچتے ہیں کہ سفر لمبا ہے، اور موسم گرم ہے، اگر نہ جائیں تو اچھا ہے، پس جھوٹ بول کر خلاصی بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئی، جنہوں نے آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت لے لی تھی کہ ہم جہاد میں نہ جائیں، اور ان کو کوئی عذر نہ تھا، یہ بہت سے لوگ تھے۔ [روح المعاني]

پھر فرمایا کہ جو منافقین تمہارے ساتھ نہیں گئے ان کے جانے کا ارادہ ہی نہیں تھا، اگر جانے کا ارادہ ہوتا تو کچھ تیاری کر کے سامان فراہم کرتے، بلکہ انہوں نے سوائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت لینے کے اور کوئی انتظام نہیں کیا، اگر انہیں اجازت نہ دی جاتی تب بھی یہ نہ جاتے، بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کا جانا پسند نہ تھا، تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے روک دیا، جیسے: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [البقرة:۷] (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دیا ہے) یا ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [المطففين:۱۴] (ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے) کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں، وہاں دیکھا جائے۔

پھر مسلمانوں کو تسلی دی گئی کہ اے ایماندارو! منافقین کے نہ جانے سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوا، بلکہ فائدہ ہی ہوا، کیونکہ اگر یہ تمہارے ساتھ ہوتے تو قدم قدم پر فتنہ وفساد برپا کرتے، طرح طرح کی سازشیں کرتے، تمہیں بزدل بنانے پر اپنی پوری قوت صرف کرتے، سازشیں کرتے، لڑائیاں لڑتے، چہ میگوئیاں کرتے، وغیرہ۔ اور ایک بات یہ بھی ہے:

﴿وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ﴾ اور تمہارے اندر ایسے لوگ ہیں جو ان کے لئے جاسوسی کرتے ہیں، گو وہ ساتھ چل کر آ گئے ہیں، لیکن ان کی نیت جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے، تمہاری خبریں لینا، اور دشمنوں کو پہنچانا، اور بے بنیاد جھوٹی

خبریں تشہیر کرنا، اور تمہارے اندر تفرقہ پیدا کرنا، وغیرہ۔

چنانچہ ان کی پرانی شرارتوں کا تذکرہ فرمایا، تا کہ یہ پختہ ہو جائے، تو فرمایا:

﴿لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ﴾ اس غزوہ سے پہلے بھی (جیسے کہ غزوۂ احد میں) وہ فتنہ کی راہ تلاش کر چکے ہیں، جب غزوۂ احد کے موقع پر راستے سے واپس ہو چکے، اور ابوسفیان سے ساز باز کر گئے، اور آپ ﷺ کو رنجیدہ و پریشان کرنے کی تدبیروں میں پیش پیش ہی رہے، کبھی یہود مدینہ کے ساتھ مل کر، کبھی مشرکین کے ساتھ مل کر آپ ﷺ کے خلاف منصوبے تیار کرتے رہے۔

﴿حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ﴾ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا سچا وعدہ آ پہنچا، اور حق غالب ہوا، آپ ﷺ غالب آ گئے، فتح پا گئے، اس پر وہ ناراض ہو کر زندہ درگور ہو گئے، نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے، بلکہ ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ﴾[الحج:۱۱] (دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا) ہو کر ذلیل و خوار ہوئے، لہٰذا آپ انہیں نظر انداز فرما کر اپنے ربّ عزّ شانہ کی ہدایات پر عمل پیرا رہیں، جو آپ کی شان ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۴۹ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ۝۵۰ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۵۱ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝۵۲

ترجمہ: اور ان میں ایسا شخص بھی ہے جو کہتا ہے کہ آپ مجھے اجازت دیجئے، اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیے، خبردار! وہ فتنے میں پڑ چکے ہیں، اور بلاشبہ جہنم کافروں کو گھیرنے والا ہے ۝۴۹ اگر آپ کو اچھی حالت پیش آ جائے تو انہیں بری لگتی ہے، اور اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچ جائے تو وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم نے تو پہلے ہی اپنا کام سنبھال لیا تھا، اور پشت پھیر کر خوش ہوتے ہوئے چل دیتے ہیں ۝۵۰ آپ فرما دیجئے کہ اس کے علاوہ ہمیں تکلیف نہ پہنچے گی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے، وہ ہمارا کارساز ہے، اور ایمان والے اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کریں ۝۵۱ آپ فرما دیجئے کہ تم

ہمارے بارے میں یہی انتظار کرتے ہو کہ ہمیں دو (۲) بھلائیوں میں سے ایک بھلائی مل جائے، اور ہم تمہارے بارے میں یہ انتظار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنے پاس سے کوئی عذاب بھیج دے، یا ہمارے ہاتھوں سے عذاب دیدے، سوتم انتظار کرو، بلاشبہ ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار میں ہیں ﴿۵۲﴾

معارف ومنازل

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جد بن قیس ایک منافق تھا سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے غزوۂ تبوک میں شریک ہونے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا: کیا تمہیں رومیوں سے جنگ کرنے کی رغبت ہے؟ اس نے کہا: یارسول اللہ! میں نوجوان آدمی ہوں، مجھے عورتوں سے عشق ہے، رومیوں کی عورتیں حسین اور خوبصورت ہیں، میں انہیں دیکھ کر بے قابو ہوجاتا ہوں، آپ مجھے فتنہ میں مبتلا ہونے پر مجبور نہ کریں، اور مجھے یہاں رہنے دیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس نے یہ بہانہ تلاش کیا تھا، اور منافقت کے سوا اس کو کوئی معذوری نہ تھی۔ [معالم التنزیل] اس پر یہ آیت نازل ہوئی، فرمایا:

﴿اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا﴾ خبردار! وہ فتنہ میں پڑ چکے ہیں، کیونکہ منافقت سب سے بڑا فتنہ ہے، جس میں وہ مبتلا ہیں، اس کی سزا یہ ہے:

﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ اور بلاشبہ جہنم کافروں کو گھیرنے والا ہے، وہ ابدی جہنم میں رہیں گے، یہ ان کے کفر ونفاق کی سزا ہے، جس میں وہ پڑ چکے ہیں۔

دشمن کی علامت اور اس کی شناخت:

یہ کم ظرف منافقین جو کہ ظاہراً مسلمان کہلاتے ہیں، اور تمہاری دوستی اور خیر خواہی کا دم بھرتے ہیں، مگر باطن میں وہ کافر اور تمہارے دشمن ہیں، اس کا واضح ثبوت اور نشانی یہ ہے کہ تمہاری خوشی اور کامیابی انہیں بری لگتی ہے، اور وہ پریشان ہوتے ہیں، اور اگر خدانخواستہ تمہیں کوئی رنج وتکلیف کا سامنا ہو تو ان کی عید ہو جاتی ہے، اور یہ لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے ہیں، اور دوست ودشمن کی شناخت اسی بات سے ہوتی ہے کہ دوست تمہاری خوشی پر خوشی، اور غم پر غم کرتا ہے، جبکہ دشمن ایسا نہیں ہوتا، اس کا معاملہ برعکس الٹا ہوتا ہے، یہ لوگ بھی ایسا کرتے ہیں کہ اگر آپ کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو وہ اپنی سمجھداری اور ہوشیاری کی تعریف کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ دیکھو! ہم کیسے

اچھے رہے، ہم نے پہلے ہی احتیاط کا پہلو اختیار کرلیا تھا، اگر ہم ان کے ساتھ چلتے تو ہم بھی مصیبت میں پڑتے، یہ باتیں کرتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس ہوتے اور خوش ہوتے ہوئے پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۔اس کے برعکس جو سچے مؤمن ہوتے ہیں وہ خوشی اور غمی دونوں صورتوں میں آپ کے ساتھی اور جان نثار ہوتے ہیں۔

روح المعانی میں بحوالہ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جو منافقین غزوۂ تبوک کے موقع پر آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے وہ لوگوں سے کہتے رہے کہ بس جی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھی تو بڑی مصیبت میں پڑ گئے، بڑی مشقت کا سفر اختیار کیا، اب یہ ہلاک ہو کر رہیں گے، پھر جب انہیں یہ خبر ملی کہ دشمن مرعوب ہو گیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحیح سالم بعافیت اپنے جان نثاروں کے ساتھ واپس تشریف لا رہے ہیں تو یہ انہیں برا لگا، اور شرمندہ ہو گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ﴾۔اس کے بعد فرمایا:

﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا﴾ آپ ان سے فرما دیجئے کہ ہمیں وہی کچھ پیش آئے گا جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقرر فرما دیا ہے، خوشحالی، بہتری، خوبی، فائدہ ہو، یا کسی قسم کا کوئی نقصان، یا حادثہ ہو جائے، یا دکھ و تکلیف سے دوچار ہو جائیں، یہ سب کچھ خالق کائنات کی طرف سے مقرر اور مقدر ہے، کیونکہ:

﴿هُوَ مَوْلٰنَا﴾ وہی ذات پاک ہمارا مددگار ہے، ہمارا ولی ہے، کارساز ہے، ہم اس کی قضاء وقدر پر راضی ہیں، ہماری ہر حالت میں اس نے خیر و بھلائی رکھی ہے، اگر فتح وہ کامیابی ہو اور مال غنیمت مل جائے تو یہ بھی خیر ہے، اگر تکلیف و رنج ہو تو یہ بھی اجر و ثواب کے اعتبار سے خیر ہی ہے، اور ہم میں سے جو جامِ شہادت نوش کرتے ہیں یہ بھی خیر ہے۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اور مؤمن ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کریں، اپنے سارے امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں، اور اسی سے فتح و نصرت اور کامیابی کی امید رکھیں، مؤمنین کا بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے، وہ اگر اسباب اختیار کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مگر ان کا اعتماد اسباب پر کبھی نہیں ہوتا، وہ مسببُ الاسباب پر اعتماد کرتے ہیں، کیونکہ اسباب کو اختیار کرنا تقدیر اور توکّل کے خلاف نہیں، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توکّل بھی سکھایا، اور اسباب بھی اختیار فرمائے، اور اسباب اختیار کرنے کا حکم بھی دیا۔

گفت پیغمبر بآواز بلند ☆ بر توکّل زانوئے اشتر بہ بند

[رومی مثنوی]

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعرابی سے فرمایا کہ توکل کر کے اسباب ترک نہ کرو، توکل کے ساتھ اونٹنی کے پاؤں باندھ کر چھوڑ دو، تو اہل ایمان اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان پر توکل اور اسباب سب کے اختیار کرنے پر مکلف ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اعتماد و بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہو، اسباب پر نہ ہو، پھر فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ﴾ اے منافقو! دنیا میں دو حالتیں ہیں جو انسانوں کو پیش آتی رہتی ہیں: ایک اچھی صورت حال، دوسری مصیبت اور تکلیف دہ صورت حال۔ ہمارے لئے تو دونوں ہی حالتیں فائدے کی ہیں، فتح وظفر نصیب ہو جائے، مال غنیمت مل جائے، اعلاء کلمۃ اللہ ہو، کفر کی شوکت تباہ ہو جائے، یا اور کوئی فائدہ اللہ تعالیٰ ہمیں عطا فرمائے، تو یہ سب ہمارے لئے بہتر اور نفع بخش ہے۔ اور اگر کوئی تکلیف دہ صورت پیش آجائے تو ہمارے لئے وہ بھی خیر ہے، ہمارے افراد شہید ہوتے ہیں، یہ بڑی سعادت ہے۔

الغرض ہمیں ہر حال میں ہر چھوٹی بڑی مصیبت پر اجر ملتا ہے، ہمارے لئے ہر صورتِ حال پسندیدہ اور منفعت بخش ہے، اور یہ بھی جان لو کہ جیسے تم ہمارے بارے میں حالات کے سازگار یا ناساز ہونے کے منتظر رہتے ہو، ہم بھی تمہارے بارے میں منتظر رہتے ہیں، لیکن ہمارے اور تمہارے انتظار میں فرق ہے، تم تو ہمارے بارے میں دو بہتر صورتوں میں سے کسی ایک بہتری کے منتظر رہتے ہو (جیسا کہ اوپر ذکر ہوا) لیکن ہم تمہارے بارے میں اسی بات کے منتظر رہتے ہیں کہ ہمیں استعمال کئے بغیر اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے کوئی عذاب بھیج دے، یا ہمارے ہاتھوں تم کو عذاب دیدے، اب تم بھی انتظار کرو، اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں، اور خوب سمجھ لو کہ انجام کے اعتبار سے تم گھاٹے میں رہو گے، اور ہم فائدے میں رہیں گے تم ابدی شقاوت میں جکڑے جاؤ گے اور ہم ابدی سعادت میں پہنچ جائیں گے۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿٥٣﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿٥٤﴾ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ۭ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿٥٦﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿٥٧﴾

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوش ہو کر، ہرگز تم سے قبول نہ کیا جائے گا، بلاشبہ تم نافرماں لوگ ہو۵۳ اور ان کے صدقات قبول کئے جانے سے کوئی چیز اس کے سوا مانع نہیں ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا، اور یہ لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر سستی کے ساتھ، اور خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ۵۴ سو آپ کو ان کے مال اور ان کی اولاد تعجب میں نہ ڈالیں، اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ انہیں دنیا والی زندگی میں ان چیزوں کے ذریعہ عذاب دے، اور یہ کہ ان کی جانیں اس حال میں نکل جائیں کہ وہ کفر کی حالت میں ہوں۵۵ وہ لوگ قسم کھاتے ہیں کہ بلاشبہ وہ تم میں سے ہیں، حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں، لیکن وہ ایسے لوگ ہیں جو ڈرتے ہیں۵۶ اگر انہیں کوئی پناہ کی جگہ یا کوئی غار مل جائے یا گھس بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ حاصل ہو جائے تو وہ پیٹھ پھیر کر جلدی سے اسی کی طرف دوڑے چلے جائیں۵۷

معارف ومنازل

ایمان کے بغیر کوئی عمل قابلِ قبول نہیں ہے:

جد بن قیس منافق نے کہا تھا کہ میں رومی عورتوں کو دیکھ کر فتنہ میں مبتلا ہو جاؤں گا، میں مال دینے پر قادر ہوں، آپ مجھ سے مال لے لیں، اور غزوہ میں شریک ہونے پر مجبور نہ کریں، اس آیت کریمہ کا نزول اسی بارہ میں ہے، فرمایا: تم اپنا مال اپنے پاس رکھو، اور یہ سنو کہ تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ [روح المعانی]

قبول نہ ہونے کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ مال لے کر آؤ گے تو اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبول نہ فرمائیں گے، اور واپس کر دیں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ثواب واجر سے محروم رکھیں گے۔ کذا قال صاحب روح المعاني۔

عدمِ قبولیت کی وجہ یہ ہے: ﴿اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ﴾ بیشک تم نافرماں لوگ ہو، یہاں فاسق سے کافر مراد ہے۔ آیت کا سببِ نزول خواہ جد بن قیس کا واقعہ ہی ہو، لیکن آیت کے الفاظ عام ہیں، جو تمام منافقین کو شامل ہیں، اور یہ بات واضح ہے کہ کفر ونفاق کے ساتھ کوئی بدنی یا مالی عبادت قابلِ قبول نہیں، کیونکہ قبولیتِ اعمال کے لئے ایمان شرط ہے، اور پھر اخلاص بھی ضروری ہے، جو کہ کافر میں مفقود ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر مسلمان شخص بغیر

اخلاص کے کوئی عمل انجام دیدے تو اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی قبول نہیں، حالانکہ اس میں ایمان تو موجود ہے، معلوم ہوا قبولیتِ اعمال کے لئے دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد عدمِ قبولیت کے دوسرے اسباب کا تذکرہ فرمایا:

﴿وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ﴾ ان کے صدقات کو قبول ہونے سے منع کرنے والی کوئی چیز اس کے علاوہ نہیں ہے (یعنی عدمِ قبولیت کا سبب صرف ان کا کفر ہے) کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر کیا، اور کفر کے ساتھ کوئی عمل مقبول نہیں، پھر نماز جو کہ دین کا ستون ہے۔

بقول حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ اسلام کے بڑے شعائر چار ہیں:

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۲) کتاب اللہ (۳) کعبۃ اللہ (۴) نماز، یعنی صلوات خمسہ، تو منافقین میں تقریباً چاروں مفقود ہیں، اگر یہ دکھاوے کی خاطر اور اپنے کفر چھپانے کی خاطر نماز پڑھتے ہیں تو وہ بھی بد دلی، بے رغبتی اور سستی وکاہلی کے ساتھ، وہ اہل ایمان کی طرح شوق واہتمام کے ساتھ نماز ادا نہیں کرتے، بلکہ وہ مجبوری کی بناء پر نماز پڑھتے ہیں، پس جب ان کے مالی اعمال یعنی صدقات غیر مقبول ہیں تو نماز بطریق اولیٰ مقبول نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ منافق کی نماز ہے جو بیٹھا ہوا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب اس میں زردی آجاتی ہے (غروب کے وقت) اور شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان ہوتا ہے تو کھڑے ہو کر (مرغی کی طرح) چار ٹھونگیں مار لیتا ہے، یعنی جلدی جلدی سجدہ کر لیتا ہے، ان میں بس ذرا اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔ [مسلم]

مطلب یہ ہے کہ بے اعتنائی اور بے رغبتی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، اس کی نماز خشوع وخضوع اور صحتِ ارکان وشرائط اور رعایتِ آداب سب سے خالی ہوتی ہے، اگر عبادت میں خوش دلی اور رغبت نہ ہو تو وہ عبادت ہرگز قابلِ قبول نہیں، چاہے ادا کرنے والا اچھا مسلمان کیوں نہ ہو، منافقین کی نماز کا حال بیان ہوا، رہا انفاق فی سبیل اللہ، اس سلسلے میں وہ نہایت کمزور، پست ہمت، محض دکھانے کے لئے بد دلی کے ساتھ کچھ اگر خرچ کرتے تو ہیں، تو احسان جتلا کر اسے بھی ضائع کر لیتے ہیں، جب ایمان سے وہ محروم ہیں تو ثواب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ﴾ ان کے مال اور اولاد آپ کو

تعجب میں نہ ڈالیں، کیونکہ یہ چیزیں مقبولیت عند اللہ کی دلیل نہیں ہیں، کیونکہ کثرتِ مال استدراج کے طور پر انہیں حاصل ہے، اور اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ دنیا میں ان چیزوں کے ذریعہ انہیں عذاب دے۔

پہلا عذاب تو یہ ہے کہ مال جمع کرنے میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں، مصیبت جھیلتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا ہر گز دھیان نہیں رکھتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کوئی تکلیف اٹھائے وہ ہلکی اور آسان ہو جاتی ہے، اور مؤمن اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ خرچ کرتا ہے تو ثواب کی خاطر اسے خوشی اور اطمینان وسکون حاصل ہو جاتا ہے۔ بخلاف منافقین کے کہ وہ دکھاوے کے طور پر اگر کچھ خرچ کرتے ہیں تو صدمہ اور دکھ پہنچتا ہے، یہ بھی ایک عذاب ہے۔

اولاد کے ذریعہ دنیا میں عذاب دیئے جانے کا یہ مطلب ہے کہ اولاد کی پرورش اور دیکھ بال میں بہت تکلیف اٹھاتے ہیں، اس تکلیف پر کسی ثواب کی امید نہیں۔ پھر بعض مرتبہ ان کے بیٹے جہاد میں قتل ہوتے ہیں، اور اس قتل پر بھی رنجیدہ اور پریشان ہو جاتے ہیں، کیونکہ ایمان سے محرومی کی وجہ سے شہادت کے ثواب سے بھی محروم رہتے ہیں، بخلاف مؤمنین کے کہ وہ اپنی اولاد اور عزیزوں کی شہادت پر بڑے خوش ہوتے ہیں، اور ثواب پاتے ہیں۔

﴿وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان کی جانیں اس حال میں نکل جائیں کہ وہ کافر ہوں، تاکہ آخرت کے عذاب میں بھی گرفتار ہوں، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے ہیں، صبح شام ان سے قرآن سنتے ہیں، معجزات کا مشاہدہ کرتے ہیں، پھر بھی ایمان نہیں لاتے، تو اللہ تعالیٰ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ان کی موت کفر پر ہو۔

﴿وَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمۡ لَمِنۡكُمۡ﴾ اور ان کا یہ طریقہ اور ہمیشہ کی عادت ہے کہ ہر ہر بات پر لمبی چوڑی قسمیں کھا کھا کر اپنا مطلب حاصل کرتے ہیں، مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر پوری شدت کے ساتھ دعویٰ کرتے اور قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم تم ہی میں سے ہیں، انہیں یہ معلوم ہے اور اندازہ بھی کہ مسلمان ہمیں ایماندار نہیں جانتے، اور اپنا بھائی نہیں سمجھتے، اسی وجہ سے وہ بکثرت قسم کھا کر اپنا مطلب بناتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سختی سے خبر دار فرما رہے ہیں کہ یہ تم میں سے نہیں ہیں:

﴿وَمَا هُمۡ مِّنۡكُمۡ وَلٰكِنَّهُمۡ قَوۡمٌ يَّفۡرَقُوۡنَ﴾ لیکن بات یہ ہے کہ یہ ڈرنے والے لوگ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اگر قسم کھا کر اپنے ایمان کا اظہار نہیں کریں گے تو ہمارے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوگا جو مشرکین اور یہودیوں کے ساتھ ہوا، اب جبکہ مدینہ منورہ دار الاسلام بن گیا، اور کافر ہو کر جینے کا موقع نہ رہا، تو جھوٹا موٹا ایمان کا دعویٰ کر دیا، تاکہ

جان و مال محفوظ رہے، اور منافع و فوائد مسلمانوں سے حاصل کرتے رہیں، بزدل ڈرپوک آدمی کھل کر سامنے نہیں آسکتا، اس لئے انہوں نے ایمان کا نہ چاہتے ہوئے بمجبوری دعویٰ کر دیا، اور قسموں کے ذریعہ اپنے تحفظ کرنے کی تدبیر اختیار کی۔

پھر منافقین کی قلبی بے تعلقی کا تذکرہ فرمایا کہ انہیں دوسرا ٹھکانہ یعنی پناہ گاہ میسر نہیں، اس لئے تمہارے ساتھ جڑے رہتے ہیں، اور تمہارے بھائی بننے کی کوشش کرتے ہیں، اگر انہیں کوئی ٹھکانہ مل جائے جس میں وہ پناہ لے سکیں، یا انہیں کوئی غار مل جائے جس میں وہ چھپ سکیں، یا داخل ہونے کے لئے کوئی دوسری جگہ یا قلعہ مل جائے تو تیزی کے ساتھ اس میں چلے جائیں گے، اور تم سے نظریں پھیر لیں گے، اور پوری طرح طوطا چشمی اختیار کر لیں گے، تم سے انہیں بالکل بھی کسی طرح قلبی تعلق نہیں ہے، جھوٹے دعووں سے تمہیں مطمئن رکھنا چاہتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ
يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿٥٨﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ
وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿٥٩﴾

ترجمہ: اور ان سے بعض وہ لوگ ہیں جو صدقات کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں، سو اگر ان میں سے ان کو دے دیا جائے تو راضی ہو جاتے ہیں، اور اگر ان کو اس میں سے نہ دیا جائے تو اسی وقت وہ ناراض ہو جاتے ہیں ﴿٥٨﴾ اور ان کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ اس پر راضی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے انہیں دیا، اور وہ یوں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے، عنقریب اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے عطا فرمائے گا اور اس کا رسول، بیشک ہم اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں ﴿٥٩﴾

معارف ومنازل

صحیح بخاری میں ہے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین کے موقع پر غنیمت کے اموال تقسیم فرما رہے تھے تو میں نے ایک شخص کو یہ کہتے سنا کہ یہ تو ایسی تقسیم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا گیا (العیاذ باللہ)، پھر میں آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس

بات کا تذکرہ کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: رَحِمَ اللهُ مُوسَىٰ قَدْ اُوْذِیَ اَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے انہیں اس سے بھی زیادہ تکلیف دی گئی، پھر انہوں نے صبر کیا، اور یہ آیت نازل ہوئی۔ [در منثور] [بخاري]

دراصل دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں: طالب دنیا، طالبِ عقبیٰ۔ طالبِ دنیا کے دلوں اور دماغوں میں دنیا کی محبت رچی ہوئی ہوتی ہے، وہ محض دنیا ہی کو دیکھتے اور سوچتے ہیں، وہ آخرت سے اندھے اور غافل رہتے ہیں، اور وہ مال ہی سے خوش ہوتے ہیں، دین وایمان، اعمالِ صالحہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے خوش نہیں ہوتے، وہ نعمتِ اسلام اور نعمتِ قرآن اور اعمالِ صالحہ سے خوش نہیں ہوتے، اور شکر بھی نہیں کرتے، وہ بیچارے بیداری میں بھی دنیا کو دیکھتے ہیں، اور خواب میں انہیں دنیا ہی نظر آتی ہے، انہیں اگر دنیا مل گئی تو خوش ہوئے اگر نہیں ملی تو ناراض۔

منافقوں کے دل چونکہ ایمان سے خالی تھے محض حصولِ دنیا کی خاطر وہ ایمان کے دعویدار تھے، اس لیے اگر انہیں مال نہ ملتا تو وہ بڑے پریشان اور تنگدل ہو جاتے، اسی کو فرمایا:

﴿فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ﴾ اگر ان کو صدقات میں سے کچھ دے دیا گیا تو راضی ہو گئے، اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں، کیونکہ طالبِ دنیا کا ایمان صرف مال ہی ہوتا ہے، اور بس۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہلاک ہو دنیا کا غلام اور درہم کا غلام اور چادر (کمبل، لباس) کا غلام، اگر کچھ دیدیا جائے تو خوش ہو جائے، اور نہ دیا جائے تو ناراض ہو جائے، یہ شخص ہلاک ہو، اور اوندھے منہ گرے، اور جب اسے کانٹا لگ جائے تو اللہ تعالیٰ کرے کہ اس کا کانٹا نہ نکلے۔ [بخاري]

یہ بددعا ہے، اور طالبِ مال کی خست پر تنبیہ ہے کہ ایسے آدمی کو اگر کانٹا لگ جائے تو اس کو مت نکالو، اور اس کی مدد و ہمدردی سے دور رہو، کہ وہ برا ہے، اور قابلِ رحم نہیں۔ خود اندازہ کریں کہ رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں کیسی بددعا دی، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، یہ منافقانہ خصلت اور دیگر منافقانہ علامات مثلاً دروغ گوئی، بدعہدی، خیانت، لعن طعن اچھے خاصے دیندار اور پابند صوم وصلوٰۃ مسلمانوں میں بھی بکثرت موجود ہیں، اور جب تک ان خصلتوں کو نکال باہر نہیں پھینکیں گے اور ترک نہیں کریں گے، ایمان اور صوم وصلوٰۃ ذکر وتسبیحات کے فوائد اور لذتوں سے محروم ہی رہیں گے۔

آج اہلِ حق جو مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم نظر آتے ہیں، حتیٰ کہ علماء، مجاہدینِ اسلام بھی ٹولیوں اور

گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں، یہ سب حبِّ مال اور حبِّ اقتدار اور ہوسِ دنیا ہی کی وجہ سے ہے، پس جب تک وہ اپنے دلوں سے اس دنیوی بت کو نہیں نکالیں گے اس وقت تک وہ کسی بھی محاذ پر کامیاب نہیں ہوں گے، اور یہ دنیاوی بت انہیں لذتِ ایمان، لذّتِ علم، لذّتِ جہاد سے مسلسل محروم ہی رکھے گا، اور دشمن کے دل سے ان کا رعب اور عظمت ہمیشہ کے لئے نکال دے گا، اور ایسے نام نہاد علماء و مبلغین اور اصحابِ جہاد کے قلوب پر شیطان کا اور نفسانی خواہشات کا تسلط ہو جائے گا۔

یہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں ☆ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ☆ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

نہ ایران میں رہے باقی نہ توران میں رہے باقی ☆ وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے ☆ گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ﴾ اور ان کے لئے بہتر تھا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیا اس پر راضی ہوتے، اور یوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے، اس کا فضل و کرم بڑا وسیع ہے، وہ کسی اور طریقہ سے ہماری حاجتوں کو پورا فرمائے گا، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ ہمیں عطا کرے گا وہی ہمیں کافی ہوگا۔

پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اسی طرح راضی رہنا ضروری ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے حکم پر، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اور تقسیم پر جس منافق شخص نے عیب لگایا اس کا نام ذوالخویصرہ تمیمی ہے، حضرت عمر اور حضرت خالد رضی اللہ عنہما نے اس کو قتل کرنا چاہا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی، یوں وہ شخص بچ گیا۔ پھر خلافت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں مارا گیا، جبکہ اس خبیث نے فرقہ ملعونہ خوارج کی قیادت کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ جنگ نہروان میں مارا گیا، اور خوارج کے ان تمام مقتولین کی لاشوں کو آگ میں جلایا گیا جنہوں نے بغاوت اور خروج کیا تھا، پھر یہ فرقہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا، فی الوقت سلطنت مسقط و عمان میں یہ لوگ بکثرت موجود ہیں، اور وہ اپنے آپ کو "إباضية" کہتے ہیں۔ واللہ اعلم

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ

وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۰﴾

ترجمہ:۔صدقات صرف فقراء کے لئے اور مساکین کے لئے اور ان کارکنوں کے لئے ہیں جو صدقات پر متعین ہیں، اور ان لوگوں کے لئے ہیں جن کی دلجوئی کرنا منظور ہو، اور گردنوں کے چھڑانے میں، اور قرض داروں کے قرضہ میں، اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں، اور مسافروں کے لئے ہیں، یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ علیم ہے اور حکیم ہے ﴿۶۰﴾

معارف ومنازل

زکوٰۃ کے مصارف کا بیان:

صدقات سے یہاں زکوٰۃ مراد ہے، اور اس کو جمع کے صیغہ کے ساتھ اس لئے ذکر فرمایا کہ زکوٰۃ متعدد اموال پر واجب ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک کا نصاب الگ ہے، سونا، چاندی مال تجارت، اونٹ، گائے، بکریاں ان سب پر زکوٰۃ فرض ہے، بشرطیکہ نصاب پورا ہونے کے بعد سال گزر جائے۔

آیت کریمہ میں زکوٰۃ کے مستحقین کے آٹھ مصارف بیان فرمائے ہیں۔ اور لفظ اِنَّمَا سے آیت کو شروع فرمایا ہے جو کہ حصر پر دلالت کرتا ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ مستحقِ زکوٰۃ ان لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جن کا ذکر اس آیت میں فرمایا۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مالِ زکوٰۃ میں سے عطا فرمانے کا سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے اموال کے بارے میں نبی یا غیر نبی کسی کا فیصلہ بھی منظور نہیں فرمایا، بلکہ خود ہی فیصلہ فرمایا، اور آٹھ مصارف مقرر فرما دیئے، اگر تو ان آٹھ مصارف میں سے ہے تو میں دے سکتا ہوں۔ [مشکوۃ: ص ۱۶۱]

پہلے تو فقراء کو زکوٰۃ کا مستحق بتایا، اور اس کے بعد مساکین کا مستحق ہونا بیان فرمایا۔ فقراء فقیر کی جمع ہے، اور مساکین مسکین کی جمع ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ موجود ہو، مگر نصابِ زکوٰۃ سے کم ہو، اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ مال زکوٰۃ کا مستحق ہونے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، فقراء اور مساکین دونوں ہی مالِ زکوٰۃ کے مستحق ہیں۔

البتہ بعض دیگر مسائل میں فرق کا اعتبار کیا گیا ہے، مثلاً کسی نے وصیت کی کہ میرا اتنا مال مسکینوں کو دیا جائے، تو یہ مال مساکین کو ملے گا، فقراء کو نہیں ملے گا۔ اور ایک فرق اور بھی ہے، وہ یہ کہ فقیر کو لوگوں سے سوال کرنے کی

اجازت نہیں ہے، جبکہ اس کے پاس کھانے کو ایک دن کی خوراک موجود ہو، اور تن چھپانے کو لباس بھی ہو، اور مسکین کو سوال کرنے کی اجازت ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ مال کی وہ کتنی مقدار ہے جس کے ہوتے ہوئے سوال کرنا جائز نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس ایک دن کے صبح وشام کے کھانے کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کچھ موجود ہو تو اس کے لئے سوال کرنا درست نہیں۔ [أبو داود: ج ۱، ص ۲۳۰]

اور مسکین بھی ضرورت پوری کرنے کے لئے وقتی طور پر سوال کرے، مگر اس کو عادت اور پیشہ نہ بنائے، جب مانگنے کی عادت پڑ جاتی ہے تو مسکین مسکین نہیں رہتا، وہ بہت سے مالداروں سے بھی مال میں آگے بڑھ جاتا ہے، اور فقر ومسکنت کی حدود سے نکل کر بھی زکوٰۃ اور دیگر صدقات لیتا رہتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ پیشے والے کے لئے، اور قوت والے تندرست آدمی کے لئے حلال نہیں ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صدقات میں مالدار کا اور تندرست کا جو کمائی کر سکتا ہو کوئی حصہ نہیں ہے۔ [مشکوٰۃ: ۱٦۱]

جو لوگ زکوٰۃ کے مستحق ہیں ان میں تیسرے نمبر پر ﴿وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا﴾ کا ذکر فرمایا۔ عامِلین سے وہ لوگ مراد ہیں جنہیں امیر المؤمنین صدقات اور عشر وصول کرنے پر مقرر کر دے، ان لوگوں کو ان کی مشغولیت کی وجہ سے صدقات میں سے اتنا مال دیدے جو ان کی محنت اور عمل کی حیثیت کے مطابق ہو۔ نیز جو لوگ ان کے ماتحت کام کرنے والے ہوں ان کی تنخواہیں بھی ان کی محنت کے بقدر دیدی جائیں۔ البتہ فقہاء نے یہ فرمایا ہے کہ جو مال وصول ہو ان کے نصف تک عاملین اور ان کے معاونین کی تنخواہیں دی جا سکتی ہیں، نصف سے زائد مال نہ دیا جائے۔

مصارفِ زکوٰۃ بتاتے ہوئے چوتھے نمبر پر ﴿مُؤَلَّفَةُ الْقُلُوْب﴾ کو ذکر فرمایا، ان کا بیان آئندہ ہوگا۔

مصارفِ زکوٰۃ بتاتے ہوئے پانچویں نمبر پر ﴿وَفِي الرِّقَابِ﴾ فرمایا۔ رِقاب رقبہ کی جمع ہے، یہ لفظ مملوک کے لئے بولا جاتا ہے، جب کوئی شخص اپنے غلام یا باندی کو مکاتب بنادے، یعنی یوں کہہ دے کہ تم مجھے اتنا مال دیدے دو تو تم آزاد ہو، اسے مکاتب کہتے ہیں۔ جب کسی آقا نے اپنے غلام اور باندی کو مکاتب بنا دیا، اور اب اسے اپنی آزادی کے لئے مال کی ضرورت ہے، تاکہ وہ اپنے آقا کو مال دے کر آزاد ہو جائے، تو اس مکاتب کو یہ مال زکوٰۃ سے دینا جائز ہے۔

چھٹے نمبر ﴿وَالْغَارِمِيْنَ﴾ فرمایا، یہ غارم کی جمع ہے، اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے ذمہ لوگوں کا قرض ہو، اور ادائیگی کی استطاعت نہ ہو۔ اگر چہ خود لوگوں پر اس کے قرضے ہوں، لیکن وہ ان کے وصول کرنے سے عاجز ہوں، تو ایسے لوگوں کو زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری [ج ا ص ۱۸۸] میں لکھا ہے کہ قرضدار کو زکوٰۃ دینا تا کہ اس کا قرضہ ادا ہو جائے عام فقراء کو دینے سے اولیٰ ہے۔ البحر الرائق میں لکھا ہے کہ جس آدمی پر قرضہ ہو اس کی ملکیت میں اتنا مال نہ ہو جس سے قرضہ ادا کرنے کے بعد بقدرِ نصاب مال بچ جائے، اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

بہت سے لوگوں پر قرضے ہوتے ہیں لیکن مال بھی پاس ہوتا ہے، اس مال سے قرضے ادا ہو کر بھی بقدر نصاب، بلکہ اس سے بھی زیادہ مال بچ سکتا ہے، تو ایسے لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے، لوگوں کو یہ بتا کر کہ ہم مقروض ہیں، زکوٰۃ بھی لیتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے زکوٰۃ کا مال لینا حلال نہیں ہے، اور نہ ہی ان کو دینا جائز ہے۔

مستحقینِ زکوٰۃ کو بیان فرماتے ہوئے ساتویں نمبر پر ﴿وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ فرمایا۔ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس سے وہ حضرات مراد ہیں جو جہاد کرنے کے لئے نکلتے ہیں، اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے، اور ان کے پاس کھانے پینے دیگر ضروریات کا خرچہ نہیں ہے، اور وطن بھی پہنچنا ہے، تو ان کو زکوٰۃ کا مال دے دیا جائے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ فی سبیل اللہ سے حجاج مراد ہیں، جو قافلہ سے بچھڑ گئے، اور ان کے پاس مال نہیں ہے، اور انہیں خرچ کرنے کے لئے اور گھر کے لئے مال کی ضرورت ہے۔ اور بعض فقہاء نے فرمایا ہے کہ اس سے طالب علم مراد ہیں، جو دینی علوم کے حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور صاحب بدائع نے فرمایا ہے کہ اس سے وہ سب لوگ مراد ہیں جو کسی بھی صورت میں اللہ تعالیٰ شانہ کی اطاعت اور نیک کاموں میں لگے ہوئے ہیں، بشرطیکہ وہ محتاج ہوں۔ [البحر الرائق: ج ۲ ص ۲٦۰]

مستحقینِ زکوٰۃ کو بتاتے ہوئے آٹھویں نمبر پر ﴿وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ فرمایا۔ ابن سبیل عربی زبان میں مسافر کو کہتے ہیں، جو مسافر ضرورت مند ہے، اس کے پاس سفر میں مال موجود نہیں ہے، اسے زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے، اگر چہ اس کے گھر میں کتنا ہی مال ہو۔ جو لوگ غازیوں کی جماعت سے بچھڑ گئے، یا حجاج کے قافلے سے علیحدہ ہو گئے، حاجت مندی کی وجہ سے ان کو بھی زکوٰۃ دینا جائز ہے، جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ ان کی محتاجی کو دیکھا جائے گا، ان کے گھروں میں اگر چہ خوب مال زیادہ ہو۔ البتہ یہ لوگ وقتی ضرورت سے زیادہ مال زکوٰۃ نہ لیں۔

مؤلفۃ القلوب کا بیان:

مولفۃ القلوب وہ لوگ تھے جنہیں سرورعالم ﷺ تالیفِ قلب (دلجوئی) کے لئے اموالِ زکوٰۃ میں سے کچھ عطا فرمایا کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنے قبائل کے سردار اور ذمہ دار تھے، ان کے اسلام قبول کرنے سے ان کے قبیلوں کے اسلام قبول کرنے کی امید تھی، اور ان میں سے ایک قسم وہ تھی جنہیں دفعِ شر کے لئے مال عطا فرماتے تھے، اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن ان میں پختگی نہیں تھی، آنحضرت سرور عالم ﷺ انہیں اموالِ صدقات میں سے عنایت فرمادیتے تھے، تاکہ وہ دینِ اسلام پر جمے رہیں، اور پختہ ہوجائیں، اور ان کے قبائل بھی ان کے اتباع میں حلقہ بگوش اسلام ہوں۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں مولفۃ القلوب کی یہ تین قسمیں لکھی ہیں، اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ کسی غیر مسلم کو آنحضرت ﷺ نے تالیف قلب کے لئے مالِ زکوٰۃ میں سے کچھ نہ دیا۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مولفۃ القلوب کی تینوں قسموں کو اب اموال زکوٰۃ میں سے کچھ نہ دیا جائے، ان کا حصہ ختم ہوگیا۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں: "وَقَدْ سَقَطَ مِنهَا الْمُؤَلَفَۃِ قُلُوبُهُمْ لِاَنَّ اللهَ تَعَالیٰ اَعَزَّ الْاِسْلَامَ وَاَغْنیٰ عَنْهُمْ"۔ مولفۃ القلوب کا حصہ ساقط ہوگیا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے اسلام کو غلبہ دیدیا، اور ان کی طرف سے بے نیاز فرمادیا، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ یہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ بعض ائمہ کے نزدیک بعض شرائط سے اب بھی مولفۃ القلوب کو مالِ زکوٰۃ سے دیا جاسکتا ہے۔ امیر المؤمنین مناسب جانے تو اب بھی ان کو اموالِ زکوٰۃ میں سے دے سکتا ہے۔

مسئلہ:

جو شخص غنی ہو، یعنی اس کی ملکیت میں اموالِ زکوٰۃ میں سے کسی بھی قسم کا کوئی نصاب ہو، جس کا وہ مالک ہو، یا ضرورت سے زیادہ اتنا سامان اس کی ملکیت میں ہو جو اگر فروخت کردے تو بقدرِ نصاب قیمت مل جائے، تو ایسے شخص کو بھی زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔

سادات کو زکوٰۃ دینے کا مسئلہ:

بنی ہاشم کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اگرچہ وہ فقراء اور مساکین ہوں۔ بنی ہاشم سے حضرت علی، حضرت عباس،

حضرت جعفر، حضرت عقیل اور حضرت حارث بن عبد المطلب رضی اللہ عنہم کی اولاد اور اولادوں کی اولاد مراد ہے۔

اگر بنی ہاشم تنگدست حاجتمند ہوں تو زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے علاوہ دیگر اموال سے ان کی مدد کر دی جائے، بہت سے لوگوں کو سادات کی غریبی دیکھ کر رحم تو آتا ہے، لیکن زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے مال سے دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ مال میں زکوٰۃ تو ۱/۴۰ ہی فرض ہے، باقی ۳۹/۴۰ میں سے خرچ کرنا بھی تو ثواب ہے، لیکن اس کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالنے کو تیار نہیں ہوتے، اور سادات کو اپنے اموال کا میل یعنی زکوٰۃ دینا چاہتے ہیں، اس میں ان کی بے ادبی بھی ہے، اور اس سے زکوٰۃ بھی ادا نہ ہوگی۔

بعض سادات بھی اس مسئلہ کو سن کر دل میں کچھ تکدر لے آتے ہیں، اور بنی ہاشم کے لئے مالِ زکوٰۃ ناجائز ہونے کے قانونِ شرعی کو اچھا نہیں سمجھتے، انہیں سمجھنا چاہئے کہ ہمارے جدِ اعظم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے اکرام و احترام کے لئے یہ قانون بنایا ہے کہ بنی ہاشم کو اموال کا میل کچیل نہ دیا جائے، جدِ امجد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ان کی توقیر کی، اور وہ رنجیدہ ہو رہے ہیں کہ ہمیں لوگوں کے اموال کا میل کچیل کیوں نہیں دیا جاتا؟ جدّ امجد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ان کی توقیر کی اور وہ رنجیدہ ہو رہے ہیں کہ ہمیں لوگوں کے اموال کا میل کیوں نہ ملا؟

دنیا حقیر ہے، فانی ہے، تھوڑی سی تکلیف اٹھالیں اپنے شرف کو باقی رکھیں، اور میل کچیل سے گریز کریں، اور یوں تکلیفیں تو سبھی کو آتی ہیں، صبر و شکر کے ساتھ زندگی گزاریں، اپنے نام کے ساتھ **سید** کا لفظ بڑھانے کو اور اپنے نسب کو اچھالنے کو تو تیار ہیں، لیکن نسب کی وجہ سے جو شرف دیا گیا ہے اسے اپنانے کو تیار نہیں۔

مسئلہ:

اپنے رشتہ داروں کو زکوٰۃ دینے میں دوہرا ثواب ہے، ایک زکوٰۃ ادا کرنے کا، اور دوسرا صلہ رحمی کا، جب انہیں زکوٰۃ دے تو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مالِ زکوٰۃ ہے، بلکہ ہدیہ کہہ کر پیش کر دے، اور اپنے دل میں زکوٰۃ کی نیت کر لے، اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، بشرطیکہ وہ لوگ زکوٰۃ کے مستحق ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ جن رشتہ داروں سے رشتۂ ولادت ہے ان کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، یعنی والدین کو، دادا دادی کو، نانا نانی کو، اور پردادا پردادی کو، اور پرنانا پرنانی کو، اور اپنی اولاد کو، اور اولاد کی اولاد کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی، ان کو دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ بھائی بہن، چچائیں، پھوپھیاں، ماموؤں اور خالاؤں اور ان کی اولادوں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

مسئلہ:

شوہر بیوی کو، اور بیوی شوہر کو زکوٰۃ دے دے تو اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

مسئلہ:

جو شخص اموالِ زکوٰۃ میں سے کسی نصاب کا مالک ہو اس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اور یہ شخص شریعت کی اصطلاح میں مالدار ہے، اور یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ جس مالدار کو زکوٰۃ کا مال لینا اور دینا جائز نہیں ضروری نہیں کہ اموالِ زکوٰۃ ہی میں سے کوئی چیز بقدرِ نصاب اس کی ملکیت میں ہو، بلکہ اگر کسی کے پاس چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدرِ ضروری حاجات سے زائد سامان پڑا ہوا ہے اس شخص کو بھی زکوٰۃ دینا جائز نہیں، اور ایسے شخص پر اگرچہ زکوٰۃ فرض نہیں لیکن صدقۂ فطر اور قربانی لازم ہے۔ بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جس پر زکوٰۃ فرض نہیں اسے زکوٰۃ دینا جائز ہے، یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے، بعض مرتبہ زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی لیکن زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہوتا، جس کی مثال اوپر گزر گئی۔

نصابِ زکوٰۃ:

سونے چاندی پر اور ان کی قیمت پر اور مالِ تجارت پر اور مویشیوں پر زکوٰۃ فرض ہے، جب کسی شخص کی ملکیت میں ٦١٢ گرام ٣٥ ملی گرام چاندی ہو، یا ٨٧ گرام ٤٧٩ ملی گرام سونا ہو، یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی قیمت ہو، تو جب سے مالک ہوا ہے اس وقت سے لے کر چاند کے حساب سے ایک سال گزر جائے تو اس میں سے ١/٤٠ مستحقین کو دینا فرض ہے۔ پھر اگر کچھ مالِ تجارت ہو، اور کچھ سونا یا چاندی ہو، یا کچھ سونا اور ساتھ ہی کچھ چاندی ہو تو ان سب صورتوں میں زکوٰۃ فرض ہے، بشرطیکہ مجموعے کی قیمت ٥٩٥ گرام چاندی کو پہنچ جائے۔ اس صورت میں بھی چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

واضح رہے کہ نوٹ بھی چاندی کے حکم میں ہے، کسی بھی ملک کے نوٹ اگر کسی کی ملکیت میں ہوں جن کے عوض ٦١٢ گرام ٣٥ ملی گرام چاندی خریدی جاسکتی ہو، تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ اگر کسی کی ملکیت میں نہ چاندی ہو اور نہ نقد رقم ہو (ایک دو روپیہ بھی ملکیت میں نہ ہوں) تو ٨٧ گرام ٤٧٩ ملی گرام سونا ملکیت میں ہونے سے زکوٰۃ فرض ہوگی، احادیثِ شریفہ میں دوسو درہم چاندی اور بیس ٢٠ مثقال سونے کو نصابِ زکوٰۃ بتایا ہے۔ علمائے ہند نے ڈیڑھ سو سال پہلے اپنے ملک کے سکہ کے اعتبار سے حساب کیا تھا، تو دوسو درہم چاندی کے ساڑھے باون تولہ، اور بیس مثقال سونے کے ساڑھے سات تولے بنتے تھے، اب نئے اوزان سے حساب کیا تو چاندی کا نصاب ٦١٢ گرام ٣٥ ملی گرام، اور سونے کا نصاب ٨٧ گرام ٤٧٩ ملی گرام ہوا۔

تنبیہ:

یہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ساڑھے سات تولہ سونے سے زیادہ سونا ہو تو اس زائد پر زکوٰۃ فرض ہوگی، یہ غلط ہے، جب نصاب پورا ہو جائے یا اس سے زیادہ ہو جائے تو پورے مال پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے (چاندی ہو یا سونا ہو یا مال تجارت ہو یا ان کا مجموعہ ہو)۔

زکوٰۃ کے ضروری مسائل:

مسئلہ:

سونے چاندی کی ہر چیز پر زکوٰۃ ہے، خواہ سکہ کی صورت میں ہو، خواہ ان کی اینٹیں رکھی ہوں، خواہ زیور ہو، استعمال میں ہو یا غیر استعمال ہو، خواہ برتن ہوں، بہر صورت ان پر زکوٰۃ فرض ہے۔

مسئلہ:

زمین کی پیداوار، باغ کی پیداوار اور مویشیوں میں بھی زکوٰۃ ہے، جس کی تفصیلات کتبِ فقہ میں لکھی ہیں، اور پیداوار کی زکوٰۃ کے بارے میں ضروری مسائل سورۂ بقرہ کی آیت: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ [البقرة:٢٦٧] (اے ایمان والو! خرچ کرو پاکیزہ چیزوں میں سے جو تم نے کمایا ہے، اور جو پیداوار ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہے) کی تفسیر میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

مسئلہ:

زکوٰۃ کی رقم کسی کافر کو نہیں دی جا سکتی۔

مسئلہ:

مدرسوں میں اگر زکوٰۃ دی جائے، اور اس میں سے مستحقین طلباء کو وظیفہ دے دیا جائے، یا ان کو کھانا دے کر مالک بنا دیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اباحت کے طور پر کھانا کھلا دیا جائے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ اسی طرح مالِ زکوٰۃ سے مدارس کے کتب خانوں میں مالِ زکوٰۃ سے کتابیں جمع کر دینا، یا طلباء کے لئے لحاف بسترے اور چار پائیاں جمع کر دینا، اور ان کو عاریۃً دینا، اور جاتے وقت واپس لے لینا، اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، کیونکہ تملیک نہیں ہوئی، ان چیزوں کے لئے زکوٰۃ اور صدقاتِ واجبہ کے علاوہ اصحابِ اموال سے مستقل چندہ کر لیا جائے۔

مسئلہ:

کسی مریض کے علاج کی فیس یا ایکسرے وغیرہ کی اُجرت مالِ زکوٰۃ سے ادائیگی کر دی جائے، اور مریض کو

قبضہ نہ کرایا جائے، تو اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، کیونکہ تملیک نہیں ہوئی۔

مسئلہ:

اگر مالِ زکوٰۃ سے دوائیں خرید کر ہسپتال میں رکھ دی جائیں، اور مستحقینِ زکوٰۃ کو دے دی جائیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دوائیں صاحبِ نصاب کو اور بنی ہاشم کو اور کافر کو نہ دی جائیں۔

مسئلہ:

اگر کوئی شخص مقروض ہے اور صاحبِ نصاب نہیں ہے، اور اس کے کہنے سے کہ مجھ پر جو قرض ہے، وہ ادا کر دو، کوئی شخص اس کی طرف سے قرض خواہ کو مالِ زکوٰۃ دے دے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، اور اگر قرضدار کے کہے بغیر اس کی طرف سے مالِ زکوٰۃ سے قرضے کی ادائیگی کے طور پر دیدیا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، کیونکہ اس صورت میں صاحبِ مال متبرع (ہدیہ کرنے والا) ہو گیا۔

مسئلہ:

اگر دکاندار کا یا کسی بھی شخص کا کوئی شخص مقروض ہو، اور اس کے پاس ادائیگی کے لئے مال نہ ہو، تو جس کا قرضہ ہے وہ اپنے قرضہ کو زکوٰۃ میں منہا نہیں کرسکتا۔ ہاں! یہ کرسکتا ہے کہ قرض دار کو بلا کرزکوٰۃ کی رقم اس کے ہاتھ میں دیدے، پھر اس سے اسی وقت اپنے قرضہ میں وصول کرلے، جب اس کی ملکیت میں مال پہنچ گیا، تو اب زبردستی بھی وصول کرسکتے ہیں، کیونکہ قرض خواہ کو اپنا قرضہ وصول کرنے کا حق ہے۔

مسئلہ:

اگر کسی کو ثواب کے طور پر مال دے دیا، اور ادائیگی زکوٰۃ کی نیت نہ کی، تو اس سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے شرط ہے کہ مستحق کو دیتے وقت زکوٰۃ کی ادائیگی کی نیت کرے۔ اور ایک طریقہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مال ادائیگی زکوٰۃ کی نیت سے دوسرے مال سے الگ کر کے کسی بکس وغیرہ میں رکھ لے، اور یہ نیت کرے کہ فقراء آتے رہیں گے تو اس میں سے دیتا رہوں گا، اس صورت میں فقراء کو دیتے وقت نیت کا استحضار نہ ہوا، تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، مال علحدہ کرتے وقت جو نیت کی تھی وہی کافی ہوگی۔

مسئلہ:

جس شخص کو زکوٰۃ دی جائے کسی عمل کے عوض میں نہ ہو، لہٰذا امام، مؤذن اور مدرس اور کسی بھی ملازم کی تنخواہ

میں زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔ البتہ اَلْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا اس سے مستثنیٰ ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں اسکی تصریح موجود ہے۔

مسئلہ:

جنہیں امیر المؤمنین نے زکوٰۃ کے اموال وصول کرنے پر مامور کردیا ان کے علاوہ جتنے بھی مصارف ہیں ان سب میں اس شخص کا غیر صاحب نصاب ہونا ضروری ہے، جس کو زکوٰۃ دی جائے۔ **في البحر الرائق: ج ٢. ص ٢٥٩ وإنما حلت للغني (العامل) مع حرمة الصدقة عليه لأنه فرّغ نفسه لهذا العمل فيحتاج إلى الكفاية، وفيه أيضاً بعد صفحة: ولا يخفى أن قيد الفقير لا بد منه على الوجوه كلها۔**

لفظ ﴿وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ لغوی ترجمہ کے اعتبار سے تو بہت عام ہے، لیکن حضرات ائمہ تفسیر اور فقہاء کرام نے اس کو عام نہیں لیا۔ اسی لئے بعض حضرات اس سے وہ مجاہدین مراد لیتے ہیں جو اپنے ساتھیوں سے رہ جائیں، اور پیسہ پاس نہ ہو۔ اور بعض حضرات نے وہ لوگ مراد لئے ہیں جو سفرِ حج میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جائیں۔

بعض اہل علم نے یہ اشکال کیا ہے کہ اگر ان کی ملکیت میں مال نہ ہو تو فقراء میں شمار ہوں گے، اور اگر وطن میں مال ہو، اور یہاں موجود نہ ہو، تو ابن السبیل میں داخل ہوگئے، لہٰذا کل اقسام سات بنتی ہیں، (اور ان کو یعنی منقطع الغزاۃ اور منقطع الحاج کو مختلف قسم بنا کر بیان کرنے کی ضرورت نہیں رہتی)۔ پھر اس کا جواب یوں دیا ہے کہ واقعی یہ لوگ فقیر کی تعریف میں داخل ہیں، لیکن علٰحدہ ان کو اس لئے بیان فرمایا کہ مطلق فقیر کی بنسبت ان کی اہمیت زیادہ ہے، کیونکہ مجاہد اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت کے لئے نکلا ہوا ہے، اور حاج بیت اللہ کے زائرین میں سے ہے، ان کی طرف زیادہ دھیان دینا چاہئے۔

آج کل ایسے لوگ پیدا ہورہے ہیں جو تفسیر قرآن اور احکام ومسائل کے بارے میں سلف کا دامن چھوڑ کر جو چاہتے ہیں اپنے پاس سے کہہ دیتے ہیں، یہ لوگ کہتے ہیں کہ فی سبیل اللہ کے عموم میں مسجدیں، مدرسے، شفاخانے، مسافر خانے، کنوئیں، سڑکیں اور پل بنانا اور رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں دینا، دفتروں کے مصارف میں خرچ کرنا، میت کو قبرستان پہنچانے کے لئے ایمبولینس کا انتظام کرنا، اور غریب میت کے کفن دفن میں خرچ کرنا، یہ سب جائز ہیں۔

یہ ان لوگوں کی جہالت کی باتیں ہیں۔ مفسرین اور محدثین اور فقہاء نے جو کچھ قرآن مجید کو سامنے رکھ کر مسائل اخذ کئے ہیں ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کی باتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ جو عربی زبان کا ایک صیغہ بھی نہیں بتا سکتے،

اور جو قرآن مجید کی ایک سورت صحیح نہیں پڑھ سکتے، یہ لوگ اپنی جہالت سے کہتے ہیں: زکوٰۃ کا مال جہاں چاہو خرچ کردو، تملیکِ فقیر کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بات چاروں مذاہب کے خلاف ہے، اگر ہر کام میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنے کی اجازت ہوتی تو قرآن مجید میں آٹھ قسمیں بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو ان سے فرمایا تھا: اِنَّ اللّٰہَ قَدْ فَرَضَ عَلَیْھِمْ صَدَقَۃً تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَائِھِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِھِمْ۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لے کر ان کے فقیروں کو دے دی جائے۔ [رواہ البخاري ومسلم کما في المشکوٰۃ: ص ۱۵۵]

اس سے صاف ظاہر ہوا کہ زکوٰۃ اس صورت میں ادا ہوگی جب فقراء کو دے دی جائے، جو لوگ تملیک کی شرط کو مولویانہ اُپج قرار دیتے ہیں اُن کے سامنے احادیث نہیں ہیں، وہ آراء اور اہواء کا کھلونا بنے ہوئے ہیں۔

مسئلہ:

چاندی، سونا، نقدی اور مالِ تجارت میں جو زکوٰۃ فرض ہے، اس کی ادائیگی کا یہ طریقہ ہے کہ ہر سال چاند کے حساب سے جب سال گزر جائے پورے مال سے چالیسواں حصہ دے دے۔ اگر اصل مال نہ دے اور اس کی قیمت دیدے تو اس سے بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ ۱/۴۰ سے کم نہ ہو، سو روپے میں ۲½ روپے، اور ایک ہزار میں ۲۵ روپے، ایک لاکھ میں ۲½ ہزار روپے کے موافق حساب لگالیا جائے۔

مسئلہ:

جس شہر میں رہتے ہوئے زکوٰۃ فرض ہوئی ہے وہاں کی زکوٰۃ وہیں کے فقراء پر خرچ کی جائے۔ ہاں! اگر دوسری جگہ کے لوگ زیادہ محتاج ہوں، یا اعزہ واقرباء ہوں تو ان کے لئے بھیج دینا مناسب ہے۔

مسئلہ:

بعض لوگ حج کرنے کے لئے چندہ مانگتے پھرتے ہیں، اور بعض صاحبِ حیثیت لوگ انہیں زکوٰۃ کی رقم سے دیدیتے ہیں، جب ایک دو آدمی کے دیدینے سے سوال کرنے والا صاحبِ نصاب ہوگیا تو اب اس لیے زکوٰۃ لینا یا اسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ لوگ اس بات کا بالکل خیال نہیں کرتے، جس پر اللہ تعالیٰ نے حج فرض نہیں کیا وہ حج کے نام پر سوال کرتا پھرے، اولاً تو یہ طریقہ ہی غلط ہے، دوسرا جب مانگنے والا صاحبِ نصاب ہوگیا تو اب اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز نہیں رہا۔

مسئلہ:

بہت سے لوگ لڑکیوں کی شادیوں کے لئے زکوٰۃ کی رقم دے دیتے ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ لڑکیوں کی شادی سادگی سے کیوں نہیں کی جاتی؟ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ اختیار کریں، اور اسی پر دونوں فریق راضی رہیں۔ اصل نکاح تو ایجاب وقبول کا نام ہے، جو دو گواہوں کے سامنے ہو، اس میں ذرا سا خرچہ بھی نہیں ہوتا، پھر ایجاب وقبول کے بعد جو بیٹی والے کو میسّر ہو وہ بطورِ جہیز لڑکی کے لیے دیدے، اس میں خیر ہی خیر ہے، ریاکاری کی گناہگاری میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر لڑکی کا باپ صاحب نصاب ہو تو اسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے، اور اگر لڑکی صاحبِ نصاب ہو تو اُسے بھی زکوٰۃ دینا جائز نہیں، پھر اگر صاحبِ نصاب نہ ہونے اور غیر بنی ہاشم ہونے کی بنیاد پر زکوٰۃ دی جائے تو عموماً ایک دو آدمی کے دینے سے بقدرِ نصاب ملکیت میں مال آجاتا ہے، جب تک وہ مال ملکیت میں رہے گا اس وقت تک زکوٰۃ لینا دینا جائز نہیں ہوگا، جیسا کہ ابھی بیان ہوا۔

مسئلہ:

بعض قوموں میں رواج ہے کہ اپنی قوم کی زکوٰتیں وصول کر کے بینک میں جمع کرتے رہتے ہیں، اور اس مسئلہ کا بالکل دھیان نہیں رکھتے کہ جب تک یہ مال فقراء اور مساکین کی ملکیت میں نہیں جائے گا اس وقت تک ان سب لوگوں کی زکوٰتیں ادا نہ ہوں گی، جنہوں نے یہ رقمیں دی ہیں، لہٰذا جلد از جلد مصارفِ زکوٰۃ میں ان کو خرچ کر دینا لازم ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بینک دیوالیہ ہو گیا، یا بینک پر کسی حکومت نے قبضہ کر لیا، یا ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا، تو ان سب صورتوں میں ان سب لوگوں کی زکوٰتوں کی ادائیگی رہ جاتی ہے، جن کے اموال لے کر بینک میں جمع کر دیئے گئے تھے۔

مسئلہ:

جو لوگ سوال کرنے کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں عموماً صاحبِ نصاب ہوتے ہیں، چھوٹے موٹے دکانداروں سے زیادہ ان کی ملکیت میں پیسہ ہوتا ہے، لہٰذا سوال کرنے والوں کو زکوٰۃ دینے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر کسی سائل کو زکوٰۃ دیں تو پہلے یقین کر لیں کہ یہ مستحقِ زکوٰۃ ہے۔ صحیح بخاری: ج ۱ ص ۲۰۰ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے پاس گھومتا پھرتا ہے، اسے ایک لقمہ یا دو لقمے یا ایک کھجور یا دو

کھجوریں واپس کرتی ہیں، لیکن مسکین وہ ہے جو اتنا مال نہیں پاتا جن سے اس کی ضرورت پوری ہو، اور اس کے حاجت مند ہونے کا پتہ نہیں چلتا، تا کہ اس کو صدقہ دے دیا جائے، وہ کھڑے ہو کر لوگوں سے سوال بھی نہیں کرتا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ واقعی حاجتمند کو تلاش کر کے زکوٰۃ کا مال دیا جائے، بہت سے لوگ بہت زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں حیاء کی وجہ سے سوال نہیں کرتے، اور ننگے بھوکے گھروں میں اپنی زندگیاں گزارتے ہیں، ایسے لوگوں کا خاص خیال کیا جائے۔

یہ واضح رہے کہ زکوٰۃ بھی نماز کی طرح فرض ہے، جس طرح نماز کے احکام ومسائل کا جاننا اور نماز کو شرعی قواعد کے مطابق پڑھنا، طہارت کے لئے پاک پانی کا دیکھنا، استنجا ٹھیک کرنا، کپڑوں کا پاک رکھنا، قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا، اور جو چیزیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں صحیح طریقے پر ان کو یاد کرنا لازم ہے، اسی طرح سے زکوٰۃ کے مسائل اور احکام کا جاننا بھی ضروری ہے۔ زکوٰۃ کا مال جس کو چاہا دے دیا، جس مصرف میں چاہا خرچ کر دیا، جس انجمن میں چاہا جمع کر دیا، زکوٰۃ ادا ہو یا نہ ہو یہ فرض کی ادائیگی کا طریقہ نہیں، مال حلال کماؤ، حلال مواقع میں خرچ کرو، زکوٰۃ فرض ہو جائے تو ٹھیک حساب سے ادا کرو، اور جس کو دو اس کے بارے میں پہلے یقین کر لو کہ یہ مستحقِ زکوٰۃ ہے۔

......✿......✿......✿......

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦١﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٣﴾

ترجمہ: اور ان میں بعض وہ لوگ ہیں جو نبی کو تکلیف دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بس وہ تو کان ہے، آپ فرما دیجئے کہ وہ تمہارے لئے خیر کے کان ہیں، وہ ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر، اور یقین کرتے ہیں مؤمنین کی بات کا، اور وہ ان لوگوں کیلئے رحمت ہیں جو تم میں سے مؤمن ہیں، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول کو ایذا دیتے ہیں ان کیلئے دردناک عذاب ہے ﴿٦١﴾ یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں، تا کہ تمہیں راضی کر لیں، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ انہیں راضی کریں اگر یہ لوگ مؤمن ہیں ﴿٦٢﴾ کیا ان لوگوں نے اس

بات کونہیں جانا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرے اس کیلئے دوزخ کا عذاب ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، یہ بڑی رسوائی ہے۶۳

معارف ومنازل

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بیان کیا ہے کہ نبتل بن حارث منافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں بیٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں سنتا اور جا کر منافقوں سے نقل کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نبتل کالا، اور لمبا پراگندہ بال سرخ چشم چپکے گالوں والا، بدصورت آدمی تھا، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: جو شیطان کو دیکھنا چاہتا ہو وہ نبتل کو دیکھے۔ یہ شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں کو جا کر منافقین سے چپکے چپکے کہتا تھا، اس سے لوگوں نے کہا: ایسا نہ کرو، کہنے لگا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سراسر کان ہے، جو کوئی ان سے جا کر کچھ کہتا ہے اس کو سنتے اور مان لیتے ہیں، ہم جو کچھ چاہیں گے کہیں گے، پھر جا کر جھوٹی قسمیں کھائیں گے، اور اپنی باتوں سے منکر ہو جائیں گے، تو وہ یقین کریں گے، ہم کو سچا جانیں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ﴾ ان منافقین میں کچھ ایسے ہیں کہ نبی کو ایذائیں پہنچاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ سراسر کان ہیں، سب کچھ سنتے ہیں اور باور کر لیتے ہیں۔ [مظهري]

﴿قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ﴾ آپ کہہ دیجئے کہ وہ خیر کی بات سنتے ہیں، اور جس چیز کے سننے میں اور قبول کرنے میں خیر ہے وہ اسی پر کان دھرتے ہیں۔ یا یہ کہہ دیں کہ وہ تمہاری بہتری اور بھلائی کی بات کان لگا کر سنتے ہیں، شر اور بگاڑ کی بات نہیں سنتے، غیبت اور چغلی کی بات نہیں سنتے ہیں۔

دراصل اللہ تعالیٰ نے منافقین کی حماقت کو واضح فرما دیا کہ وہ جو منافقین اور مخالفین کی غلط جھوٹی قسموں کو سن کر اپنے مکارمِ اخلاق اور خلقِ عظیم کی بناء پر خاموش رہتے ہیں، اس سے تم یہ خیال نہ کرو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حقیقت حال کا علم نہیں حاشا وَ کَلّا، وہ تمہارے ہر قسم کے فریب اور جھوٹ کی تہہ میں پہنچ کر سب کچھ جانتے ہوئے کریمانہ طرز و طریق پر خاموش رہتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز مت سمجھو کہ وہ تمہاری جھوٹی باتوں کو حق سمجھتے ہیں، یہ ان کی شرافتِ نفس اور کرم نوازی ہے، جیسا کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: "اَلْمُؤْمِنُ غِرٌّ كَرِيْمٌ وَالْفَاجِرُ خَبٌّ لَئِيْمٌ"۔ مؤمن بھولا (سادہ بے ضرر) شریف ہوتا ہے، اور کافر خبیث بدباطن کمینہ ہوتا ہے۔ [رواه أبو داؤد، ترمذي، حاكم عن أبي هريرة

رضي الله عنه]

﴿يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں، اور ایمان والوں کی بات کا یقین کرتے ہیں۔ یعنی وہ صرف مؤمنین کی باتوں پر یقین کرتے ہیں، بخلاف منافقین کے، کہ وہ ان کی باتوں اور قسموں پر ہرگز یقین نہیں کرتے ہیں، یہ منافقین کا غلط خیال ہے کہ وہ ہماری قسموں پر یقین کرتے ہیں، چونکہ ایمان باللہ سے مراد ہے کفر کی ضد، اس لئے پہلے یُؤْمِنُ کے ساتھ "با" کا لفظ مذکور ہے۔ دوسرے سے یُؤْمِنُ مراد ہے تصدیق جو تکذیب کی ضِد ہے، اس لئے لِلْمُؤْمِنِيْنَ "لام" کے ساتھ فرمایا، پہلے کے معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہیں، دوسرے کے معنی ہوئے کہ مؤمنین کو سچا جانتے ہیں۔

﴿وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ﴾ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ان لوگوں کیلئے رحمت ہے جو تم میں سے ایمان کا اظہار کرتے ہیں، یعنی منافقین کیلئے رحمت ہے، پس مخلص مؤمنین کیلئے بطریق اولیٰ۔ منافقین کیلئے رحمت اس طرح ہیں کہ ان کی ہر بات سنتے ہیں، ان کی معذرت قبول فرماتے ہیں، ان کے مال وجان سے تعرض نہیں کرتے ہیں، ان کا اندرونی راز فاش نہیں کرتے ہیں، ان کے منافق ہونے کا اعلان نہیں کرتے، وغیرہ۔ یہ سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت، کرم اور ذرّہ نوازی اور رحمت کا ثبوت ہے، یعنی لاعلمی اور تمہارے حال نہ جاننے کی وجہ سے وہ تمہاری جھوٹی قسموں کو اور ہر عذر کو قبول نہیں کرتے، بلکہ یہ رحمت وشفقت اور ان کی مہربانی ہی ہے کہ تمہارے خلاف انتقامی کاروائی نہیں کرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾﴾ جولوگ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا دیتے ہیں ان کیلئے دردناک عذاب ہے، اس میں عذاب دنیاوی اور اخروی دونوں مراد ہو سکتے ہیں، چنانچہ منافقین پر یہ عذاب دنیا میں بھی آیا، اور آخرت کا عذاب تو مشرکین کے عذاب سے بھی بدتر ہے، ﴿الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (آگ کا سب سے نچلا طبقہ) ہی ہوگا۔

﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ﴾ وہ تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں، تاکہ تمہیں راضی کریں۔ منافقین مدینہ میں رہتے ہوئے بغیر مسلمانوں کی حمایت اور رضامندی کے کسی صورت زندگی نہیں گزار سکتے تھے، اس لئے وہ مجبور تھے کہ مسلمانوں کو راضی رکھیں، تو اس سلسلے میں قسموں کا سہارا لے کر ہر وقت یہی طرز عمل اختیار کرتے رہتے تھے، تاکہ مسلمان انہیں اپنے سے جدا نہ کریں، پھر فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ﴾ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ ان کو راضی کیا جائے، انہیں چاہئے کہ نفاق چھوڑ کر ایمان لائیں، تاکہ انہیں دنیاوی و اخروی، ظاہری و باطنی ہر قسم کی سلامتی اور امن حاصل ہو جائے۔ اگر یہ ظاہری طور پر چند دن کے لئے جھوٹ بول کر مسلمانوں کو راضی کریں گے تو یہ کچھ بھی فائدہ مند نہیں ہوگا، بلکہ یہ عارضی رضامندی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ لمحوں میں ختم ہو سکتی ہے۔

اگر آج اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حکم دیں کہ منافقین کے خلاف جہاد کرو تو یہ عارضی رضامندی کہاں رہ سکتی ہے؟ اس لئے بہتر یہ ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان قبول کر لیں تو ہمیشہ کیلئے امن و سلامتی پائیں۔

﴿اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ یہ زجر و توبیخ ہے، کیا انہیں معلوم نہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا اس کیلئے جہنم کی آگ ہے؟ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور یہ بڑی رسوائی ہے۔ فرمایا: یہ کتنے ناداں بیوقوف ہیں، دنیاوی رسوائی سے بچنے کی خاطر ایمان کا تو دعویٰ کرتے ہیں، مسلمانوں کو راضی رکھنے اور شرمندگی سے بچنے کی خاطر بڑی بڑی قسمیں کھاتے ہیں، مگر ابدی رسوائی سے بچنے کا جو برحق اور کامیاب راستہ ایمان ہے اس سے محروم رہتے ہیں، حالانکہ یہ سب کچھ اچھی طرح جانتے ہیں، مسلمانوں کے اعمال اور پاکیزہ اخلاق کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ کاش یہ بدبخت سوچتے اور کہتے کہ اے ہمارے معبود! تو برحق ہے، تیرے سوا کوئی عبادت کا حقدار نہیں، حضرت محمد ﷺ تیرا بندہ اور برحق رسول ہیں۔

گلیم بخت کسے را کہ بافتند وسیاہ ☆ بآب زمزم وکوثر سفید نتوان کرد

یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ
اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ
قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ
اِیْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۶۶﴾

ترجمہ: منافقین اس بات سے ڈرتے ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ان

باتوں کو بتادے جوان کے دلوں میں ہیں، آپ فرما دیجئے کہ تم مذاق بنالو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈرتے ہو ﴿۶۴﴾ اور اگر آپ ان سے سوال کریں گے تو وہ کہہ دیں گے کہ ہم تو بس یونہی باتوں میں مشغول تھے، اور دل لگی کررہے تھے، آپ فرما دیجئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی کرتے تھے؟ ﴿۶۵﴾ عذر بیان نہ کرو، تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہوگئے، اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو معاف کردیں گے تو دوسری جماعت کو ہم عذاب دیں گے، اس وجہ سے کہ وہ مجرم تھے ﴿۶۶﴾

معارف ومنازل

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ منافق آپس میں خفیہ باتیں کرتے تھے، اور ڈرتے تھے کہ کوئی آیت یا سورت نازل ہو کر ان کو رسوا نہ کردے، اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ان کو تردد تھا، یعنی کامل یقین بھی نہ تھا، اور انکار بھی نہ تھا، شک میں پڑے ہوئے تھے، اسی لئے ان کو اندیشہ رہتا تھا کہ اگر یہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سچے برحق ہیں تو کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رسوائی نہ ہوجائے۔

بعض علماء کے نزدیک یَحۡذَرُ اگرچہ جملہ خبریہ کی صورت میں ہے، مگر امر کے معنی میں ہے، یعنی منافقین کو ڈرتے رہنا چاہئے۔ اور بعض اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ منافق یہ باتیں آپس میں بطور استہزاء کہتے تھے، جیسا کہ آئندہ جملہ سے اس قول کی تائید ہوتی ہے: ﴿قُلِ اسۡتَہۡزِءُوۡا﴾ [مظهري]

غزوۂ تبوک کے سفر میں چودہ پندرہ منافقین نے سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف منصوبہ بنایا کہ کسی تنگ و تاریک گھاٹی میں رات کو چلتے ہوئے کسی تدبیر سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اونٹنی سے گرادیں اور شہید کرلیں، اس پر حضرت جبریل امین علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلع کیا، اور ان لوگوں کے نام مع ولدیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتادیئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بلا کر ان کی ایک ایک بات اور ارادے ان کے سامنے بیان فرمادیے، پھر وہ اقراری ہو کر کہنے لگے یہ ہمارا پکا قلبی ارادہ ہرگز نہ تھا، صرف مذاق اور دل لگی کی باتیں تھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو ان کے نام بتائے، اس پر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہمیں حکم دیں تاکہ ہم ان منافقین کی گردنیں اڑائیں، انہیں قتل کردیں، فرمایا: نہیں، لوگ باتیں بنائیں گے اور کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرنا

شروع کر دیا۔ انہی لوگوں کے بارے میں صحیح مسلم کی روایت ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: میرے ساتھیوں میں (سفرِ تبوک کے) بارہ آدمی منافق ہیں، یہ اس وقت تک جنت میں نہیں جائیں گے جب تک اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل نہ ہو جائے، اور سوئی کے سوراخ میں اونٹ کا داخل ہونا محال ہے، لہٰذا ان کا جنت میں داخل ہونا اسی طرح محال ہے۔ آٹھ کا کام تو دبل تمام کر دے گا، یعنی آگ کا ایک چراغ جوان کے شانوں کے درمیان پیدا ہوگا اور ان کے سینوں سے پار ہوگا، الخ۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ نے ان کیلئے بددعا فرمائی کہ الٰہی! ان کو دبل میں مبتلا کر، یعنی آگ کی ایک چنگاری میں، جو ان کے دلوں کی رگ پر لگے، اور وہ ہلاک ہو جائیں۔ [مظھري باختصار]

ایک روز سفرِ تبوک کے دوران آپس میں یوں کہہ رہے تھے کہ یہ شخص یعنی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اس بات کی امید رکھتا ہے کہ ملک شام کے قلعے اور محلات ان کیلئے فتح ہو جائیں گے، یہ تو ہرگز نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ان کی ان باتوں کی خبر سرورِ عالم ﷺ کو دیدی، آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ان لوگوں کو روک لو، جب آپ ﷺ ان کے پاس پہنچ گئے تو ان سے فرمایا: تم نے ایسا ایسا کہا ہے؟ اس پر انہوں نے اقرار تو کر لیا، لیکن بات بناتے ہوئے اور معذرت پیش کرتے ہوئے کہنے لگے کہ یہ تو یوں ہی زبانی باتیں تھیں، جو آپس میں دل لگی کے طور پر ہو رہی تھیں۔ سفر کی دشواری، مسافت طے کرنے کیلئے خوش طبعی کی باتیں ہوتی رہتی ہیں، تاکہ وقت گزاری کے طور پر کچھ نشاط پیدا ہو جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اَبِاللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ﴾ تم اتنے دلیر ہو چکے کہ حد سے تجاوز کرتے ہو، کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی آیتوں پر اور اس کے رسول ﷺ پر ہنسی مذاق کرتے ہو، یہی چیز عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے۔ دل لگی اور وقت گزارنے کے لیے اور باتوں کی کوئی کمی تھی، جنہیں چھوڑ کر تم نے شعائر اللہ کو اپنے استہزاء کا نشانہ بنایا۔ فرمایا:

﴿لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ تم بے مقصد عذر پیش مت کرو، کیونکہ جو عذر پیش کر رہے ہو وہ عذر نہیں ہے، بلکہ کھلم کھلا اظہارِ کفر اور اظہارِ بغاوت ہے، تم ظاہری طور پر کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں، اول تو یہ بھی سرتاپا جھوٹ تھا، لیکن اب تو اپنے اقرار سے ظاہری طور پر بھی کافر ہو گئے، اور اپنے کفر کی قلعی کھول دی، اندر کے کفر کو خوب ظاہر کیا ﴿قَدْ كَفَرْتُمْ﴾ پھر فرمایا:

﴿اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً﴾ اگر ہم تم میں سے بعض کو چھوڑ بھی دیں تا ہم بعض کو توضرور سزادیں گے، اس وجہ سے کہ وہ ازل سے مجرم تھے، یعنی اگر توبہ کرنے اور خلوص نیت رکھنے کی وجہ سے ہم تم میں سے بعض کو معاف کر بھی دیں گے تب بھی دوسرے منافقوں کو جنہوں نے سچے دل سے توبہ نہ کی ہوگی سزادیں گے، کیونکہ نفاق پر جمے رہنے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا دینے اور قرآن ورسول پر استہزاء کرنے کے وہ مجرم ہیں، اور یہ جرائم ایسے نہیں کہ خلوص توبہ کے بغیر معاف ہوسکیں۔

محمد ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ منافقین میں سے جن لوگوں نے توبہ کی اور پکے مسلمان ہوئے، ان میں مخشی بن عمیر اشجعی کا نام لیا جاتا ہے۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے طائفہ میں سے صرف اسی ایک شخص کا نام لیا کہ جس کا قصور توبہ کے بعد معاف ہوگیا، باقی کا معلوم نہیں۔ مخشی نے صدق دل سے توبہ کی، اور کہا: یارسول اللہ! مجھے کفر کے نام سے نفرت ہے، میرا نام تبدیل فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا نام عبدالرحمن رکھا، پھر اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے شہادت نصیب ہو کہ میرے قتل کا کسی کو پتہ بھی نہ چلے، چنانچہ عہد صدیقی میں غزوۂ یمامہ میں شہید ہوئے، نہ قاتل کا پتہ چلا، نہ مقتول کا، اور ان کی کوئی خیر وخبر نہ ملی۔ [درمنثور، مظهري]

فائدہ:

غزوۂ تبوک کے موقع پر واپسی کے مرحلے میں جن بارہ تیرہ منافقین نے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جو سازش تیار کی تھی اس کا واقعہ ایک رکوع کے بعد تفصیلاً ﴿وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا﴾ آیت کریمہ کی تفسیر میں آنے والا ہے۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ
اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝٦٧ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ
وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝٦٨ كَالَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ
بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ

اَعۡمَالُهُمۡ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ‌ ۚ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمۡ يَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ ۙ وَقَوۡمِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاَصۡحٰبِ مَدۡيَنَ وَالۡمُؤۡتَفِكٰتِ‌ؕ اَتَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ‌ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظۡلِمَهُمۡ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۷۰﴾

ترجمہ: منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں سب ایک ہی طرح کے ہیں، بُری باتوں کا حکم کرتے ہیں، اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں، اور اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کو بھول گئے، سو اللہ تعالیٰ انہیں بھول گیا، بیشک منافقین نافرماں ہی ہیں ﴿۶۷﴾ اللہ تعالیٰ نے منافق مَردوں سے اور منافق عورتوں سے اور تمام کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ فرمایا ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، ان کیلئے دوزخ کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ملعون قرار دیدیا، اور ان کیلئے دائمی عذاب ہے ﴿۶۸﴾ تمہاری حالت انہی لوگوں کی طرح ہے جوتم سے پہلے تھے، وہ لوگ قوت میں تم سے زیادہ سخت اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ تھے، سو انہوں نے اپنے حصہ سے فائدہ حاصل کیا جوتم سے پہلے تھے، اور تم بھی ایسے گھستے چلے گئے جیسا کہ وہ لوگ گھسے تھے، ان کے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت ہو گئے، اور وہ لوگ نقصان میں پڑنے والے ہیں ﴿۶۹﴾ کیا ان کے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے تھے؟ یعنی قومِ نوح، عاد اور ثمود اور قومِ ابراہیم اور مدین والے لوگ اور الٹی ہوئی بستیاں، ان کے پاس ان کے رسول کھلی دلیلیں لے کر آئے، سو اللہ تعالیٰ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ﴿۷۰﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں تذکیراتِ ثلاثہ کے بیان کے ساتھ توحید ورسالت اور معاد کا ایک وضاحتی بیان ہے۔ منافق مردوں اور منافق عورتوں کی گمراہی اور خبثِ باطن کی وضاحت کے ضمن میں کہ دیگر بُرے کفریہ اعمال کے باوجود وہ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کے خلاف چل رہے ہیں، اور نہایت کنجوس اور بخیل بھی ہیں، اور اللہ تعالیٰ شانہ کو بھول گئے ہیں، ارشاد فرمایا:

﴿اَلۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ بَعۡضُهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ﴾ کہ منافق مرد اور منافق عورتیں سب آپس میں ایک ہی طرح کے ہیں، یعنی شرک، نفاق، ایمان سے دور ہونے اور تکذیب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور استهزاء باللہ و بالرسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) و بآیات اللہ، ان چیزوں میں سب ایک جیسے ہیں۔

﴿يَأْمُرُونَ بِالْمُنكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ﴾ منکرات جیسے شرک ونفاق اور بخل وحسد و بدخواہی ان چیزوں کا حکم کرتے ہیں، اور نیکی جیسے ایمان اور تصدیق رسالت وکتاب اللہ اور جہاد ان چیزوں سے لوگوں کو منع کرتے ہیں۔

﴿وَ يَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے اپنے ہاتھوں کو بند کرتے ہیں، کنجوسی اور بخل کرتے ہیں۔

﴿نَسُوا اللهَ فَنَسِيَهُمْ﴾ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو بھول گئے، اور اس کی نافرمانی اور اسلام دشمنی میں لگے رہے، سو اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں فراموش کر دیا، دنیا میں انہیں ایمان سے محروم کر دیا، اور آخرت میں اپنی رحمت سے محروم فرما کر ابدی دوزخ میں ڈال دے گا، بلاشبہ یہ لوگ فاسق اور کافر ہیں، دائرہ اسلام سے خارج ہیں، اسی لئے ملعون و ابدی جہنمی ہیں۔

منافقوں کو دنیا سے بڑی محبت ہے، اور وہ جہنمی ہیں:

ان لوگوں نے دنیا کی محبت کو آخرت پر ترجیح دی ہے، اور محبت دنیا میں ان کا انہماک کافروں اور مشرکوں سے بھی زیادہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ آخرت کے طلبگاروں کو جنت اور ابدی سعادت ملے گی، جبکہ دنیا کے طلبگاروں کیلئے جہنم کا فیصلہ ہوگا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور علانیہ کفر وشرک کرنے والوں سے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور جہنم کی آگ ان کیلئے کافی ہے، یعنی ان کے کفر و نفاق کی سزا کیلئے دوزخ کافی ہے۔ یہ کلمہ توبیخ کیلئے ہے کہ دنیا میں اگر وہ عذاب سے بچ بھی جائیں تو فرق نہیں پڑے گا، جہنم کی سزا اُسے پورا کرے گی۔

﴿وَلَعَنَهُمُ اللهُ﴾ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی طرح انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ﴾ وہ ابلیس کے ساتھ دائمی عذاب میں رہیں گے۔

﴿كَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ فرماتے ہیں تمہیں ابدی عذاب دینا کوئی مشکل نہیں، تم اپنے پیشرو قوموں سے طاقت میں کم ہو، اور مال واولاد، دنیاوی ساز وسامان میں بھی ان سے کمزور ہو، وہ تم سے ہر پہلو میں قوی اور طاقتور تھے، ذرا ان کا نظارہ کر کے دیکھو! آج ان کا نام ونشان نظر نہیں آتا، وہ کیسے مٹ گئے، اور ابدی جہنم میں پہنچ گئے، تمہارا حشر بھی انہی کی طرح ہوگا، تو فرمایا:

اے منافقو! تم لوگ ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے، وہ لوگ تم سے بڑھ کر قوت اور طاقت والے تھے، اور تم سے زیادہ اموال اور اولاد والے تھے، وہ لوگ اپنے دنیاوی حصہ سے مستفید ہوئے (خوب کھایا اور عیش پرستی کی) اور تم بھی اپنے دنیاوی حصہ سے مستفید ہوئے، جیسا کہ تم سے پہلے لوگ اپنے حصہ سے مستفید ہوئے، وہ لوگ بھی دنیا ہی میں لگے، اور دنیا ہی کو سب کچھ سمجھا، تم لوگ بھی انہی کی راہ پر چل رہے ہو، تم لوگ بھی باطل میں اور برائیوں میں اسی طرح گھس گئے جس طرح تم سے پہلے لوگ گھسے ہوئے تھے، ان کا جو انجام ہوا تمہارا بھی وہی انجام ہوگا، پھر ان کا انجام بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ یہ وہ لوگ تھے جن کے اعمال دنیا و آخرت میں بیکار چلے گئے، دنیا تھوڑی چندروزہ فانی تھی جو ختم ہوگئی، اور جو کچھ نعمتیں عطا ہوئی تھیں وہ استدارج کے طریقہ پر تھیں، اکرام و اعزاز کے طور پر نہ تھیں، اور آخرت تو ویسے بھی نافرمانوں کیلئے نہیں۔

﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ یہ ہے دنیا و آخرت کا ابدی خسارہ جو تمہارے لئے لکھا گیا۔ العیاذ باللہ

اقوامِ عالم کی تباہی سے عبرت حاصل کرو:

فرمایا: ﴿أَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَأُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ﴾ بطور نمونہ کچھ سرکش و مجرم قوموں کا تذکرہ فرمایا گیا، ان منافقین کے پاس ان (چھ سرکش) قوموں کی خبریں نہیں آئیں جو ان سے پہلے تھیں؟ کیا نوح علیہ السلام کی قوم کی بربادی کا حال، اور ذات العماد دیوہیکل لوگ عاد و ثمود کی ہلاکت کے واقعات، اور قومِ ابراہیم علیہ السلام بابل والے نمرود بن کنعان آشوری اقوام کی ہلاکت کے قصے، اور اصحابِ مدین قومِ شعیب علیہ السلام کی تباہی، اور الٹی بستیوں یعنی قومِ لوط علیہ السلام کی ہلاکت کے واقعات، کیا ان لوگوں کو یہ واقعات معلوم نہیں ہیں؟

ہاں! ان لوگوں کو حرف بحرف یہ واقعات معلوم ہیں کہ انہوں نے اپنے ربّ جل شانہ اور اس کے رسولوں علیہم السلام سے کھلم کھلا بغاوت کی، اور دندناتے ہوئے ان سے عذاب کا مطالبہ کیا، کہتے رہے: ﴿فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ﴾ [الشعراء:١٨٧] (ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرادو)۔ کتنی بڑی جرأت اور بے باکی کا عالم ہے کہ ربّ کائنات کے ساتھ ٹکر لی جارہی ہے؟ نتیجہ سب کے سامنے ہے:

﴿وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کررہے تھے۔

خوشتران باشد کہ سرِ دلبران ☆ گفتہ آید در حدیث دیگران

قرآن کریم اگر ایک طرف ظالم وجابر گمراہ لوگوں کا اور ان کے نتائج کا بیان کرتا ہے، تو تفریحِ خاطر اور تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنے ماننے والے اور لبیک کہنے والوں کا بھی تذکرہ کرتا ہے، کب سے مجرموں کے واقعات کا سلسلہ چلتا رہا، اب اصلی اور حقیقی بندگانِ عشق ومحبت اور پیروکارانِ اسلام اور وارثانِ جنت کا ذکر فرمایا۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ
يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا
وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

ترجمہ: اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں بعض بعض کے مددگار ہیں، بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں، اور برائیوں سے روکتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں، اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ شانہ کی اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی فرمانبرداری کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن پر عنقریب اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا، بے شک اللہ تعالیٰ عزّت والا ہے، حکمت والا ہے﴿۷۱﴾ اللہ تعالیٰ نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ فرمایا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور ایسے عمدہ مکانوں کا وعدہ فرمایا جو ہیشگی والے باغوں میں ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے، یہ بڑی کامیابی ہے﴿۷۲﴾

معارف ومنازل

اللہ رب العزت اپنے دشمنوں اور باغیوں کے بیان کے بعد اپنے پسندیدہ بندوں اور اپنے گرانقدر دوستوں کا بڑے پیار ومحبت سے بیان فرما رہے ہیں، اور اپنے انعام واکرام اور بلند وبالا نعمتوں کا تذکرہ فرما رہے ہیں، اسی کے ساتھ سب سے بڑی اور افضل نعمت جو اس ذات پاک کی رضا ہے خصوصیت کے ساتھ اس کا تذکرہ فرما رہے ہیں، اور اپنے فرمانبرداروں کیلئے انعامات کا اعلان فرما رہے ہیں، ارشاد فرمایا:

﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں اولیاء ہیں،

یعنی ایک دوسرے کے مددگار اور دوست ہیں، دینی امور میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔

دوسری صفت یہ کہ وہ خود پاکیزہ ہیں، اس لئے پاکیزہ امور کا اور ہر قسم کی نیکی کا امر کرتے ہیں، جب وہ خباثت وناپاکی اور برائیوں سے پاک ہیں تو لوگوں کو بُرائی سے منع کرتے، اور روکتے ہیں۔

تیسری صفت یہ کہ وہ نمازوں کو پابندی کے ساتھ ارکان، واجبات، سنن، مستحبات اور دیگر شرائط کی پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ کا یہی معنی مستند ومشہور ہے۔

چوتھی صفت خالص مالی عبادت ہے، یعنی پابندی کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، نماز اپنے اوقات کے ساتھ مخصوص ہے، زکوٰۃ بھی سال میں ایک مرتبہ ادا کی جاتی ہے، اور بندگی کا تقاضا تو یہ ہے کہ چوبیس گھنٹہ مسلسل ربّ العزّت سبحانہ کے ساتھ تعلق قائم ہو۔

پانچویں صفت جو کہ تمام عبادتوں کی جامع بھی ہے اور مغز بھی، فرمایا کہ: زندگی کے تمام لمحات میں اپنے پروردگار عزّ وجل اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اور اطاعت کرتے ہیں۔ زہے سعادت! کاش یہ صفت مسلمانوں کے قلوب وجوارح پر حاکم ہو۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا وَ جَمِیْعَ عِبَادِکَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلْمُؤْمِنَاتِ ، آمین۔

﴿اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ﴾ یہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ضرور رحم فرمائے گا۔ ﴿سَيَرْحَمُهُمْ﴾ سین تاکید کیلئے ہے۔ [مظهري] جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رحم فرما کر انہیں ایمان اور دیگر نعمتیں مثلاً اقامتِ صلوٰۃ، اداءِ زکوٰۃ جیسی اطاعت وغیرہ نصیب فرمائے تو قیامت میں ضرور اُن پر رحم فرمائے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ بیشک اللہ عزّت وغلبہ والا ہے، قادر وتوانا ہے، حکمت والا ہے، ہر فیصلہ حکمت کے تحت کرتا ہے۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ اللہ تعالیٰ شانہ نے ایماندار مردوں اور ایماندار عورتوں سے ایسی جنتیں دینے کا وعدہ فرمایا ہے جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان جنتوں میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

﴿وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ﴾ اور عدن کے باغوں میں صاف ستھرے عمدہ مکان دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ مکان کے طیب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ ان کے اندر زندگی پر لطف اور نہایت پاکیزہ ہوگی، یا یہ کہ نفس مؤمن ان کو پسند کرے گا اور پاکیزہ سمجھے گا، یا یہ کہ وہ ہر قسم کے حوادث وآفات اور طبیعت پر گراں گزرنے والی چیزوں

سے پاک ہوں گے۔

ع بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

وہاں کسی قسم کا نہ کوئی رنج ہوگا، نہ تکلیف، نہ تھکاوٹ، نہ اور نامساعد حالات، **كمافي الحديث**۔

عَدْن کے معنی ہیں: قیام اور دَوام، عَدَنَ بَالمَكَانِ کے معنی ہیں کہ مکان میں قیام کیا، مطلب یہ ہے کہ جنتی حضرات ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہوں گے، ان باغوں کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور عمدہ مکانات ہوں گے، اور لفظ عَدْن سے مراد ہمیشہ کا قیام اور خلود مراد ہے، جہاں سے نہ کبھی منتقل ہونا چاہیں گے اور نہ انہیں وہاں سے منتقل کیا جائے گا، سورۂ صَف میں فرمایا: ﴿وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ﴾ [الصف: ١٢] (پاکیزہ گھر ہمیشہ رہنے کے گھر میں)۔ اس سے یہ ظاہر ہورہا ہے کہ عَدْن سے کوئی مخصوص جنت یا جنت کا کوئی مخصوص مقام مراد نہیں ہے، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر جنتی کا جنت میں مستقل قیام ہوگا۔

حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں صاحب مدارک نے لکھا ہے کہ عَدْن ایک جنت کا نام ہے، کیونکہ سورۂ مریم میں جو ارشاد ہے: ﴿جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ﴾ [مريم: ٦١] (ہمیشہ رہنے کے باغات جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے)۔ یہاں اَلَّتِيْ اسم موصول موصوف ہے، اور وَعَدَ الرَّحْمٰن پورا جملہ اس کی صفت ہے، اور ﴿اَلَّتِيْ وَالَّذِيْ﴾ کی صفت جب جملہ معرفہ ہو تو اَلَّتِيْ کا موصوف یعنی عَدْن بھی معرفہ ہونا چاہئے، لہٰذا عدن معرفہ ہی ہوگا، اور جنت کے اندر خاص شہر کا یا مخصوص مقام کا نام ہوگا، اس سے مصدری معنی یعنی دائمی قیام کے معنی مراد نہیں ہوں گے۔ میں (صاحب مظہری) کہتا ہوں اس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ [مظهري]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عدن وسط جنت کا نام ہے، یعنی جنت کے درمیانی حصہ کو عدن کہتے ہیں۔ اھ

اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ عدن کے معنی اقامت کے ہیں، اور یہ لفظ کسی خاص مقام کیلئے نہیں، بلکہ جنت کی (تمام جنتوں کی) صفت ہے، اور کُل جنّات عدن ہیں، یعنی ہمیشہ رہنے کی جگہ ہیں۔ [روح المعاني: ج ١٠] تفصیل کیلئے دیکھیں: البدور السافرہ، التذكرة للقرطبي اور جنت کے حسین مناظر۔

﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی تمام نعمتوں سے بڑی ہے، یعنی مؤمنین صادقین

جن نعمتوں میں ہوں گے وہ اپنی جگہ بڑی بڑی بے مثال نعمتیں ہوں گی، لیکن ان سب نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا۔

صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائیں گے: اے جنت والو! وہ عرض کریں گے: اے ہمارے ربّ عزّ شانہ! ہم حاضر ہیں، اور تعمیلِ ارشاد کیلئے موجود ہیں، اور ساری خیر آپ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: کیا تم راضی ہو گئے؟ وہ عرض کریں گے: ہم کیوں راضی نہ ہوں گے حالانکہ آپ نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو آپ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھی نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا: کیا میں تمہیں اس سے افضل چیز عطا نہ کر دوں؟ وہ عرض کریں گے کہ اے ربّ تعالیٰ! اس سے افضل اور کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہوگا کہ میں تم پر اپنی رضامندی نازل کرتا ہوں، اس کے بعد کبھی بھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ [متفق علیه]

فائدہ:

اللہ تعالیٰ جل شانہ کی خوشنودی اور رضا وہ سب سے آخری عظیم الشان نعمتِ کبریٰ ہے کہ اس کے مقابلے میں تمام جنتی نعمتوں کی حیثیت دنیا کے تمام پہاڑوں کے مقابلے میں ایک رائی کی ہے، اور یہ عظیم نعمت اہل جنت کو دخولِ جنت کے بعد نصیب ہوگی، جیسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوا مگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کتنے عظیم خوش قسمت ہیں کہ انہیں یہ نعمت تمغہ و انعام کے طور پر دنیا ہی میں نصیب ہوگئی، ارشاد ہوا: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ [الفتح:١٨] (بلاشبہ یقیناً راضی ہوا اللہ تعالیٰ مؤمنین سے جب وہ کیکر کے درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ مبارک پر بیعت کر رہے تھے) اگر یہ عظیم منقبت دشمنانِ اسلام اور بدخواہانِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نظر نہ آئے تو ان سے کوئی شکوہ وگلہ نہیں، کیونکہ انہیں جب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تیس پاروں کا قرآن نظر نہیں آیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی منقبت وعظمت بعد کی بات ہے۔

گر نہ بیند بروز شپر چشم ☆ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ یہ بہت بڑی مادی اور بے مثال روحانی کامیابی ہے کہ مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو ان صفاتِ خمسہ عالیہ کی بدولت جنت اور جنت کی ساری عظیم الشان نعمتیں مل گئیں، اور سرچشمہ انوار و برکات اور تمام نعمتوں کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور دیدارِ الٰہی بھی نصیب ہوگیا۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَ

لَکَ مَعْرِفَتَکَ وَحُبَّکَ وَرِجَاکَ فَاکْرِمْنَا بِزِیَارَتِکَ۔ آمین

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ﴿۷۳﴾
یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَ لَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ یَنَالُوْا ۚ
وَ مَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ خَیْرًا لَّهُمْ ۚ وَ اِنْ یَّتَوَلَّوْا
یُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِیْمًا ۙ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ مَا لَهُمْ فِی الْاَرْضِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ﴿۷۴﴾

ترجمہ: اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے، اور ان پر سختی کیجئے، اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے﴿۷۳﴾ وہ لوگ قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے نہیں کہا، حالانکہ انہوں نے کفر کا کلمہ کہا ہے، اور مسلمان ہونے کے بعد کافر ہو گئے، اور انہوں نے اس چیز کا ارادہ کیا جو انہیں نہ ملی، اور صرف انہوں نے اس بات کا بدلہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے انہیں مالا مال کر دیا، سو اگر وہ توبہ کر لیں تو یہ ان کیلئے بہتر ہوگا، اور اگر روگردانی کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا و آخرت میں دردناک عذاب دے گا، اور ان کے لئے روئے زمین پر نہ کوئی یار ہوگا اور نہ کوئی مددگار﴿۷۴﴾

معارف ومنازل

جو آیت کریمہ یہاں موجود ہے بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ سورۂ تحریم میں بھی ہے۔ ابتداء اسلام میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو عفو و درگزر کا فرمان جاری فرمایا، پھر انہیں مشرکین و منافقین اور اسی طرح یہود و نصاریٰ کے ساتھ بھی جہاد کا حکم جاری فرمایا، جیسے فرمایا: ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا﴾ [الحج: ۳۹] (جن لوگوں کو قتل کیا جاتا ہے ان کو اجازت دی گئی، کہ ان پر ظلم ہوا)۔ عفو و درگزر کا حکم منسوخ فرما کر جہاد کا حکم ہوا، کفار کے ساتھ جہاد بالسیف کا، جیسے: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ﴾ [التوبۃ: ۵] (مشرکوں کو قتل کرو) یا ﴿فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ﴾ [الأنفال: ۱۲] (گردنوں پر مارو) وغیرہ۔

مگر منافقین کے ساتھ جہاد باللسان کا حکم ہوا، کیونکہ بظاہر انہوں نے اسلام کا دعویٰ کر کے اپنے آپ کو تلوار سے محفوظ رکھا ہوا ہے، اس لئے ان کے ساتھ جہاد بالسیف جائز نہیں، تو فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ﴾ اے نبی! کافروں سے جہاد کرو تلوار سے ﴿وَالْمُنٰفِقِيْنَ﴾ اور منافقین سے بھی جہاد کرو، مگر زبان سے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے یہی فرمایا کہ منافقین کے ساتھ جہاد بالسیف نہ کرو، یعنی منافقین کے ساتھ درشتی سے بات کرو، نرمی نہ کرو، انہیں سخت غضبناک ہو کر سناؤ، حسن وقتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان پر شرعی حدود قائم کرو۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ منافقین کے ساتھ رحمدلی، اور حُسنِ اخلاق کا مظاہرہ نہ کرو، ان کے ساتھ ترشروئی اختیار کرو، اور انہیں ہر بات پر ملامت کرو، اور دباؤ، تاکہ سدھر جائیں، اور اپنے نفاق سے تائب ہوں، یا مایوس ہو کر کافروں کے اتحادی اور ہمنوا بن جائیں، تاکہ ان کے ساتھ جہاد بالسیف کا راستہ ہموار ہو جائے، کیونکہ کافر جو بھی ہو حوصلہ افزائی اور پذیرائی کا مستحق نہیں، سوائے ان کفار کے جو اہل ذمہ ہیں، کیونکہ وہ معاہد اور تابع ہیں، ان کے حقوق ہیں۔

﴿وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ﴾ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا میں سخت، درشتی اور عتاب کے حقدار ہیں، اور آخرت میں کفر کی وجہ سے دوزخ کے مستحق ہیں، اور یہ دوزخ نہایت بُرا ٹھکانہ ہے، اور بُرے لوگوں کا ٹھکانہ ہے۔

﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا﴾ وہ لوگ قسم کھانے کے عادی ہیں، بات بات پر قسم کھانا منافق کی پہچان اور خصلت ہے، وہ سارا دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور اسلام ودینِ الٰہی کی مذمت اور ان کی توہین کرتے رہتے ہیں، جب وہ پکڑے جاتے ہیں تو قسموں کا سہارا لے کر جان خلاصی کرتے ہیں کہ ہم نے یہ بات نہیں کہی، حالانکہ وہ سب کچھ کہہ چکے ہوتے ہیں۔

علامہ بغوی، ابن سعد اور محمد ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روز تبوک میں خطبہ دیا تھا، جس میں منافقین کا ذکر فرمایا تھا، اور انہیں ناپاک اور گندا قرار دیا تھا، ﴿اِنَّهُمْ رِجْسٌ﴾ [التوبة:٩٥] (وہ ناپاک ہیں) فرمایا تھا، اس پر جلاس بن سوید منافق نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر سچے ہیں تو ہم گدھوں سے بدتر ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو حضرت عامر بن قیس رضی اللہ عنہ نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر جلاس کے قول کی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیدی، جلاس نے کہا: یارسول اللہ! یہ عامر بن قیس جھوٹا ہے، میں نے ہرگز ایسی بات نہیں کہی۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں کو منبر نبوی کے پاس کھڑا کر کے قسم کھانے کا حکم دیدیا، جلاس نے کلمہ پڑھ کر قسم کھائی کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی، یہ عامر جھوٹا ہے، اس کے بعد حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ

میں سچا ہوں، اور جلاس نے میرے سامنے یہ بات کہی ہے۔ پھر حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے دونوں ہاتھوں کو اوپر دعاء کیلئے اٹھایا اور یہ کہا: اے اللہ تعالیٰ! اپنے سچے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر سچی بات نازل فرما دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مؤمن امین ہوتا ہے، اس کے بعد وہ دونوں مجلس سے ابھی برخاست نہیں ہوئے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام یہ آیت:

﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ سے ﴿فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ تک لے کر حاضر ہوئے۔ جلاس آیت کریمہ سن کر فوراً کھڑا ہو گیا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں سن رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کی پیشکش فرمائی ہے، یہ عامر بن قیس رضی اللہ عنہ اپنے قول میں سچے ہیں، میں نے یہ بات کہی تھی، اب میں اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتا ہوں، اور توبہ کرتا ہوں۔ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جلاس کی توبہ قبول فرمالی، جلاس نے توبہ کرلی، اور اس کی توبہ صحیح ثابت ہوئی۔ [ابن سعد، معالم، مظھری]۔

اس کے علاوہ اور بہت سے واقعات اسی طرح کے کتبِ تفاسیر میں موجود ہیں، مگر خلاصہ سب کا تقریباً یہی ہے کہ منافقین نے بہت کچھ غلط سلط پروپیگنڈے کئے، اور طرح طرح کی زہرافشانی کی، پھر جب دربارِ نبوی میں حاضر ہوئے تو انکار کر بیٹھے اور قسمیں کھا کر جان چھڑا لی، وغیرہ۔

﴿وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ﴾ حالانکہ بلاشبہ منافقین نے کفر کی بات کہی تھی، جیسے ابھی واضح ہو گیا۔ بعضوں نے کہا کہ کلمہ کفر سے مراد سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر استہزاء کرنا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالیاں دینا۔ ان باتوں کی قدرے تفصیل سورۃ المنافقون میں بھی آنے والی ہے، اِن شاء اللہ تعالیٰ

﴿وَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ﴾ پہلے انہوں نے اسلام کا اظہار کیا تھا، پھر انہوں نے استہزاء کر کے اپنے چھپے ہوئے کفر کی قلعی کھول دی، اور ظاہراً بھی کافر ہو گئے۔

﴿وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا﴾ اور انہوں نے ایسی شرارت کی منصوبہ بندی کی تھی جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو ہاتھ نہ لگی، اور وہ ناکام ہوئے۔ روایات میں آیا ہے کہ تبوک کے راستہ میں بارہ منافق آ کر ایک گھاٹی میں کھڑے ہو گئے، تاکہ اچانک سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر رات کی تاریکی میں حملہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرلیں، حضرت جبریل علیہ السلام نے آ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ارادوں سے خبردار کیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا کہ ایک آدمی کو بھیج دو کہ ان کی اونٹنیوں کے مُنہ پر مار کر ان کے رخ پلٹ دے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا، وہ جا کر انہیں گھاٹی میں دیکھا، انہوں نے راستہ بند کیا ہوا تھا، پھر وہ وہاں سے بھاگ گئے، اور نیچے

اترے۔ پھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر بددعا فرمائی، اور وہ سارے دبل کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گئے۔ لَعَنَهُمُ الله

جیسے پہلے بیان ہوا اس واقعہ کو مفسرین اور اصحاب سیر نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے، سب کا خلاصہ یہی ہے۔ (دبل مشہور موذی مرض ہے گلے پر بڑا دانہ نکلتا ہے، جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا)۔

﴿وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ ان لوگوں نے جو غلط حرکتیں کی ہیں، ان کا اور کوئی سبب نہیں ہے، ان کو کسی نے تکلیف نہیں دی، اور نہ ان کے خلاف کسی نے منصوبہ بنایا، اگر کوئی بات ہے تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فضلِ خداوندی سے انہیں مالا مال کر دیا، پہلے فقیر و تنگدست تھے، اسلام آیا تو اس کی برکتیں بھی ساتھ آئیں، اور وہ برکتیں ان کے شامل حال ہو گئیں، اللہ تعالیٰ شانہ کے اس فضل و کرم کا انہوں نے یہ بدلہ دیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف انہوں نے منصوبہ تیار کیا، احسان کے بدلے بُرائی اور شکر کے بدلے ناشکری اختیار کی۔

عام طور سے تو اسلام کی برکات سب کو شامل تھیں، لیکن بعض ایسی صورتیں بھی پیش آئیں کہ خاص جلاس نامی شخص کو اس کے ایک غلام کے مقتول ہو جانے پر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارہ ہزار درہم کی دیت دلائی تھی، اور جلاس کے ذمہ کچھ قرض تھا، آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف سے ادا فرما دیا تھا۔ [روح المعاني، معالم، تنزيل]

﴿فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ﴾ جلاس کی توبہ کا ذکر ابھی ہوا۔ رضي الله عنه

﴿وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ اگر وہ لوگ توبہ سے اعراض کریں، اور اپنے نفاق پر جمے رہیں، جیسے آئندہ آیتوں میں ایک مالدار منافق کا بیان آنے والا ہے، تو اللہ تعالیٰ انہیں دردناک عذاب دے گا، اور پوری دنیا میں کوئی ایسا شخص نہ ہو گا جو اسے عذاب سے بچائے یا اس کی حمایت و مدد کرے۔ آخرت کا عذاب تو سارے کفار و منافقین کیلئے ہے ہی، لیکن دنیوی عذاب نے بھی انہیں ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے کہ بار بار رُسوا ہو رہے ہیں؛ اہل ایمان اُن سے نفرت کر رہے ہیں، سب کی نظروں سے ان کی عزّت اور وقعت گر رہی ہے، اور موت کے وقت بھی شدید عذاب میں مبتلا ہوں گے، ان کی بات اور قسموں پر کسی کو اعتماد نہیں رہا، وغیرہ۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝٧٥

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝٧٦ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝٧٧ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۝٧٨

ترجمہ: اور ان میں بعض ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں مال عطا فرمایا، تو ہم ضرور ضرور خیرات کریں گے، اور ضرور ضرور ہم نیک آدمیوں میں شمار ہو جائیں گے۝٧٥ سو جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے عطا فرمایا تو اس میں کنجوسی کرنے لگے، اور وہ اعراض کرتے ہوئے روگردانی کر گئے۝٧٦ سو اللہ تعالیٰ نے اس دن تک جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا دن ہوگا ان کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق قائم کر دیا، اس وجہ سے کہ انہوں نے جو اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا اس کی خلاف ورزی کی، اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۝٧٧ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے راز کو اور ان کے خفیہ مشوروں کو جانتا ہے؟ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ غیب کی باتوں کو خوب جاننے والا ہے؟۝٧٨

معارف ومنازل

آیت بالا کے سبب نزول کے متعلق حافظ بغوی صاحب معالم التنزیل، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، امام طبرانی اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ثعلبہ ابن حاطب انصاری نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مال (کثیر) عطا فرما دے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا اللہ تعالیٰ کے رسول کا طریقہ (فقر) تجھے پسند نہیں؟ یا کافی نہیں؟ اور لائق پیروی نہیں؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں چاہتا کہ سونے کے پہاڑ میرے ساتھ چلیں جہاں میں جاؤں میرے ساتھ ہو جائیں تو وہ ضرور چلتے۔

ثعلبہ خاموش ہو گئے، پھر کچھ مدت کے بعد پھر خدمت گرامی میں حاضر ہو کر وہی مطالبہ پیش کیا کہ یارسول اللہ! آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے مال (کثیر) عطا فرما دے، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر بھیجا ہے اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے مال نصیب کر دیا تو میں ہر حقدار کا حق ضرور ادا کروں گا، اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں سے ہو جاؤں گا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تھوڑا مال جس کا تو شکر ادا کر سکے زیادہ مال سے بہتر ہے، جس کی تجھے برداشت نہ ہو، اس نے پھر اسی دعا کی درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ مجھے زیادہ مال عطا فرما دے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اے اللہ! ثعلبہ کو مال عطا فرما دے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس دعا کے بعد ثعلبہ نے کچھ بکریاں پالیں، اور ان میں اتنی زیادہ ترقی ہوئی کہ مدینہ شہر میں ان کے رہنے کی گنجائش نہیں رہی، مجبوراً ثعلبہ نے بکریاں لے کر مدینہ سے باہر کسی وادی میں سکونت اختیار کی، اور بکریوں میں کیڑوں کی طرح بے پناہ اضافہ ہوتا رہا، اب یہ نوبت آئی کہ ثعلبہ ظہر اور عصر کی نمازیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھتا تھا، باقی نمازیں وہیں پڑھتا رہتا تھا۔

اس کے بعد بکریوں میں مزید بے پناہ اضافہ ہو گیا، اور اس نے مجبوراً کسی اور وادی کو جو مدینہ سے فاصلہ پر تھی اپنا مسکن بنا دیا، اب صرف نماز جمعہ کیلئے مدینہ آتا رہا، باقی نمازیں وہیں پڑھتا رہا۔ پھر مزید مالداری میں ترقی کی وجہ سے جمعہ اور تمام جماعتوں میں غیر حاضر رہنے لگے۔ جمعہ کے دن صرف اتنا کرتا تھا کہ راستہ میں جا کر کھڑا ہوتا تھا، اور گزرنے والوں سے حالات معلوم کرتا تھا۔

ایک روز سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ثعلبہ کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے اس کی پوری کیفیت اور صورتِ حال اور جمعہ سے غیر حاضری کا سارا حال بیان کیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: ثعلبہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد جب زکوٰۃ کی وصولی کا حکم نازل ہوا (بلکہ ہو چکا تھا) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وصولی زکوٰۃ کیلئے دو آدمی مقرر فرمائے: ایک قبیلہ بنی سلیم کا، ایک قبیلہ جہینہ کا، اور دونوں کو ایک تحریر عطا فرمائی جس میں زکوٰۃ اور نصابِ زکوٰۃ کے ضروری مسائل درج تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبانی حکم دیدیا کہ ثعلبہ بن حاطب اور بنی سلیم کے فلاں مالدار شخص کے پاس جاؤ، اور ان سے زکوٰۃ کے جانور وصول کرنا۔ حسبُ الحکم دونوں قاصد پہلے ثعلبہ کے پاس گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر پڑھ کر سنائی، اور زکوٰۃ کے جانور دینے کا مطالبہ پیش کیا۔ ثعلبہ نے کہا کہ یہ کیسا جزیہ اور ٹیکس ہے، یہ تو کافروں پر لگایا جاتا ہے، اب تم کو جدھر جانا ہے جاؤ، جب وہاں سے فارغ ہو جاؤ تو لوٹ کر میرے پاس آ جاؤ۔ دونوں حضرات بنی سلیم کے شخص سلمہ کے پاس گئے، جب اس شخص نے اِن دونوں حضرات کی آمد کا سنا تو اپنے جانوروں میں بہترین عمر والے جانور چھانٹ کر زکوٰۃ میں پیش کئے۔ ان محصلوں نے کہا کہ ایسے بہترین جانور دینا تو تم پر لازم نہیں، سلمہ نے کہا: آپ یہی لے لیں، میں اپنی مرضی سے تمہیں یہ عمدہ مال دے رہا ہوں۔ انہوں نے قبول

کیا۔ پھر دوسرے مالداروں کے پاس گئے، اور زکوٰۃ وصول کی، آخر میں دوبارہ ثعلبہ بن حاطب کے پاس آگئے، ثعلبہ نے کہا: ذرا مجھے اپنی وہ تحریر تو دکھاؤ، تحریر پڑھنے کے بعد وہ بولے: یہ کیا ٹیکس لگائے ہیں؟ یہ تو غیر مسلموں کے ٹیکسوں جیسا ہے، تم دونوں اب چلے جاؤ میں سوچ لوں گا، اور کوئی رائے قائم کرلوں گا۔

یہ دونوں حضرات چلے گئے، سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، تو کچھ کہنے نہ پائے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا: آہ ثعلبہ ہلاک ہوگیا۔ پھر سلمہ شخص کیلئے دعا فرمائی۔

ثعلبہ نے جو جواب دیا تھا ان حضرات نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وہ بعد میں بتایا، اس پر یہ آیت ثعلبہ بن حاطب کے بارے میں نازل ہوئی۔ نزول آیت کے وقت خدمت گرامی میں ثعلبہ کے رشتہ دار بھی موجود تھے، انہوں نے جا کر ثعلبہ کو خبر دیدی کہ تمہارے بارے میں آیت نازل ہوئی ہے، اس پر وہ گھبرایا، اور مال صدقہ لے کر خدمت گرامی میں حاضر ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (جن کا رحم وکرم عفو ودرگزر آسمانوں کی اور پورے جہاں کی وسعتوں سے بھی زیادہ ہے) فرمایا: اے ثعلبہ! مجھے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے کہ میں تیرا صدقہ قبول کروں، اس پر اس نے اپنے سر پر مٹی ڈالنا شروع کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تھوڑا مال شکر کے ساتھ زیادہ مال سے بہتر ہے جس کی برداشت نہ ہو، تو نے میرے مشورہ پر عمل نہ کیا، آج تیرا یہ حال ہوگیا ہے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا صدقہ قبول کرنے سے انکار کردیا تو وہ اپنا مال لے کر چلا گیا، پھر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوگیا، پھر وہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس، اور ان کے بعد حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس، اور ان کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس مسلسل صدقہ لے کر آتا رہا، تو ان حضرات میں سے بھی کسی نے قبول نہ کیا۔ اور خلافت عثمانی میں ثعلبہ کی موت ہوگئی۔ ثعلبہ کا تعلق انصار کے قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے ساتھ تھا۔

مال کی کثرت، پھر اداءِ زکوٰۃ سے انکار، حقوق اللہ وحقوق العباد کی پامالی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشورہ کی خلاف ورزی، نمازوں اور پھر نماز جمعہ کی غیر حاضری، زکوٰۃ کو ٹیکس قرار دینا، عہد شکنی اور بے وفائی، یہ سارے گناہ ثعلبہ جیسے صحابی کیلئے پیامِ نفاق ثابت ہوئے۔

ایک ضروری وضاحت:

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ مال طلب کرنے، اور پھر صدقہ نہ دینے کا واقعہ اکثر وبیشتر مفسرین کرام نے ثعلبہ

بن حاطب کے بارے میں لکھا ہے۔ مذکورہ روایت تین مختلف سندوں سے روایت کی گئی ہے، اور کوئی سند ضعف سے خالی نہیں، اس لیے اول تو مذکورہ روایت سے استدلال درست نہیں، اور اگر یہ روایت تعدّدِ طرق کی وجہ سے کسی درجہ میں قابل استدلال ہو بھی تو اس میں ثعلبہ سے مراد ثعلبہ بن حاطب انصاری بدری رضی اللہ عنہ نہیں ہیں، بلکہ اس نام کا کوئی اور شخص مراد ہے، کیونکہ ثعلبہ بن حاطب کو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اصحاب سیرت نے شرکاءِ بدر میں شمار کیا ہے، اگر آپ سیرت کی وہ کتب دیکھنا چاہیں جن میں شرکاء بدر کی فہرست ہے تو ثعلبہ بن حاطب اور اس کے بھائی حارث بن حاطب دونوں کا شمار اصحاب بدر میں ہوگا۔ اور مسند احمد میں یہ حدیث علی شرط مسلم موجود ہے، راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہیں: لَنْ يَّدْخُلَ النَّارَ اَحَدٌ شَهِدَ بَدْراً۔ جو شخص بدر میں حاضر ہوا وہ ہرگز جہنم میں نہ جائے گا۔ یہ حدیث مرفوع ہے۔

اسی طرح صحیح بخاری میں حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں حدیث مرفوع موجود ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: " لَعَلَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ اِلٰى اَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اعْمَلُوْا مَاشِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةُ"۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف نظر فرمائی، اور یہ کہہ دیا جو چاہے کرو جنت تمہارے لئے واجب ہو چکی ہے۔ اس حدیث پر اور اصحاب بدر کے مناقب پر علامہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الفوائد" میں بہترین مفصل کلام کیا ہے، وہاں دیکھا جائے۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن الکلبی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب جو کہ بدری ہیں وہ غزوۂ احد میں بھی شریک ہوئے تھے، اس کے بعد ثعلبہ بن حاطب اور ابن ابی حاطب کے نام سے ایک شخص کا ذکر کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ صدقہ نہ دینے کا جو واقعہ منقول ہے وہ ثعلبہ بن حاطب مدنی انصاری کا نہیں ہو سکتا، کیونکہ شرکاء بدر کیلئے جنت اور مغفرت کی خوشخبری ہے، لہٰذا صاحب واقعہ دوسرا کوئی شخص ہوگا، خواہ ثعلبہ نامی ہو، یا اور کسی نام کا کوئی شخص۔ واللہ اعلم

واقعہ جس کسی کا بھی ہو بہر حال یہ واقعہ ضرور پیش آیا ہے، کیونکہ آیت کریمہ (نص قطعی) سے ثابت ہوا کہ کسی نے مال ملنے پر صدقہ دینے کا وعدہ کیا تھا، پھر جب مال مل گیا تو منحرف ہوا، جیسے حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ باہلی کی روایت اس پر گواہ ہے، اور قرآن مجید نے اسے منافقوں میں شامل فرمایا ہے۔

فائدہ:

اللہ تعالیٰ سبحانہ جس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے، وہ ذات پاک نے ہزار سالہ بت پرستوں کی

مغفرت فرمائی، ایک سو آدمیوں کا قاتل بھی اس کی مغفرت سے محروم نہیں رہا، کائنات کے ذرات سے زیادہ اس کی مغفرت ورحمت کے کرشمے جگمگارہے ہیں، پھر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سراپا رحمۃ للعلمین ہیں، جنہوں نے بڑے سے بڑے خونی دشمنوں پر رحم فرما کرانہیں معاف کردیا، یہ بات سمجھ سے شاید بالاتر ہے کہ ایک منکرِ صدقات پر تمام عنایات اور رحمت کے دروازے کیوں بند کئے؟ اور اس کی توبہ کی پذیرائی نہیں ہوئی، یہ کیوں؟

واللہ اعلم غالباً یہی ایک وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ منافق صدق دل سے تائب ہوکرنہیں آیا، محض دکھاوے اور اپنے عیب چھپانے اور بدنامی دور کرنے کی غرض سے آیا ہو، اور ربّ العزّت علیم بذات الصدور کا فیصلہ اس کے باطن کی وجہ سے ہو کہ توبہ جب اخلاص سے خالی ہو تو قبولیت ہرگز نہیں ہوسکتی۔ ھٰذا ھو الصواب، واللہ اعلم۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَىِٕنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ منافقین میں سے بعض لوگ وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ اگر اپنے فضل سے ہمیں مال دیدے تو ہم ضرور ضرور صدقہ کریں گے، اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہوجائیں گے۔ بنی آدم بڑا ہوشیار اور سنجیدہ ہے، وہ جب بھی مجبور ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے حضور الحاح وزاری شروع کرتا ہے، اور پوری فضاء کو لمبے چوڑے وعدوں سے بھر دیتا ہے، کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں یہ کروں گا وہ کروں گا، وعدہ بھی کرتا ہے، نذر بھی مانتا ہے، مگر ایسا نہیں ہوتا، جب امتحان کے طور پر اللہ تعالیٰ اسے نوازتا اور سب کچھ دے دیتا ہے تو پھر تنگدل ہوتا ہے، اور کنجوسی اختیار کر لیتا ہے، اور کیا ہوا وعدہ سراسر بھول جاتا ہے، جس کے نتیجے میں دونوں جہانوں میں مار کھاتا ہے۔

﴿فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ پھر جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے مال (یا اور کچھ) عطا فرمادیا تو تنگدلی اور کنجوسی اختیار کرلی، اور اعراض کرتے ہوئے روگردانی کرگیا، بھول گیا، غرور میں آگیا۔ مال ایک بلا ہے، وہ بہت کم ہی عثمان غنی اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما جیسی شخصیات کے پاس آتا ہے، وہ اکثر ان لوگوں کے دروازے پر دستک دیتا ہے جہاں اس کی مہمان نوازی اور پذیرائی ہو، اور احترام ہو، وہ قارون یا اس کے ہمنوا ساتھیوں کا رخ کرتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ وہی لوگ جو لمبے چوڑے وعدہ کر گئے تھے، مال آنے کے بعد پہلوتہی کر کے کنجوس ہوگئے، پس نتیجہ یہ ہوا:

﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ﴾

انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھوٹ بولا، اور جو عہد و پیمان کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی، تو نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے

اپنی ملاقات (قیامت) کے دن تک ان کے دلوں میں نفاق ڈال دیا، اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا اس کی خلاف ورزی کی، اور اس وجہ سے بھی کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

رہا یہ کہ انہوں نے جھوٹ کیوں بولا؟ اور عہد شکنی کیوں کی؟ شاید اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دینے پر تو پورا یقین ہی رکھتے تھے، اور اس کی گرفت پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اسی کو فرمایا:

﴿اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ﴾ کیا انہیں علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کے راز کو اور خفیہ مشوروں کو جانتا ہے؟ اور بیشک اللہ تعالیٰ غیبوں یعنی پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا ہے، اللہ تعالیٰ علیم بذات الصدور ہے، جو چیزیں مخلوق اور موجود ہیں ان کو جانتا ہی ہے، اور جو چیزیں آئندہ ہزاروں سال بعد پیدا ہونے والی ہیں ان کو بھی جانتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾

ترجمہ: یہ ایسے لوگ ہیں جو ان مؤمنین پر صدقات کے بارے میں طعن وطنز کرتے ہیں جو اپنی خوشی سے صدقات دیتے ہیں، اور ان لوگوں پر جن کو اپنی محنت کے علاوہ کچھ میسر نہیں آتا سو یہ ان سے تمسخر و مذاق کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے تمسخر کا بدلہ دے گا، اور ان کیلئے عذابِ الیم ہے ﴿۷۹﴾ آپ ان کیلئے استغفار کریں یا نہ کریں، اگر آپ ان کیلئے ستر (۷۰) مرتبہ استغفار کریں تب بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہ بخشے گا، یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے رسول کے ساتھ کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۸۰﴾

معارف ومنازل

دنیا میں دیکھا گیا ہے اور آئندہ بھی ہر وقت اس کا مظاہرہ ہوتا ہی رہے گا کہ ظلم وزیادتی اور کفر ونفاق اور

فسق وفجور کے سایہ میں پلنے والے لوگ انسانی شرافت اور اچھے اخلاق سے سراسر محروم رہتے ہیں، جبکہ ایمان وحیاء، تقویٰ وطہارت اور اسلامی معاشرہ میں پلنے والے لوگ ہر قسم کے زیورِ اخلاق اور انسانی شرافت سے سرشار ہوتے ہیں۔ مدینہ منورہ دارالاسلام تھا، جہاں اکثر آبادی مسلمانوں پر مشتمل رہتی تھی، منافقین معدودے چند افراد تھے۔ مفسرین کرام اور اصحاب سیرت نے ان منافق مردوں کی تعداد تین سو، اور منافق عورتوں کی تعداد دو سو ستر تک بتائی ہے۔

جب کوئی قوم اقلیت میں ہو، اور اقتدار کے طبقہ سے بھی نہ ہو، تو اپنے تحفظ وبقاء کی خاطر محتاط رہتی ہے، اور وہاں کے قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کرتی، اور اکثریت کے خلاف کوئی کام کرنے سے بھی پرہیز کرتی ہے، مگر کفر ونفاق ایک ایسا غیر فطری مرض ہے کہ اس کے پاس اس طرح کی ہدایات اور اقدار سے نابلد رہتے ہیں، بلکہ جان بوجھ کر بھی، ان سب سے دور رہتے ہیں، چنانچہ منافقوں کے دلوں میں جس طرح ایمان کی کمی تھی اسی طرح انسانی شرافت اور انسانی اخلاق سے بھی وہ محروم تھے۔ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے اعمال وکردار پر مذاق کرنا، تمسخر کرنا ان کا روزمرہ کا مشغلہ ہوتا تھا، وہ لوگ اس قلّت وکمزوری کے باوجود اتنے پست، ذلیل اور گھٹیا قسم کے لوگ تھے کہ اہل ایمان پر مسلسل لعن وطعن، طنز ومذاق ان کی عادت ہوتی تھی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو مسعود انصاری اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا بیان نقل کیا ہے کہ جب ہمیں صدقہ کرنے کا حکم ہوتا تھا تو ہم محنت ومزدوری کر کے اپنی کمروں پر بوجھ اٹھا کر کچھ مال حاصل کرتے تھے، اس کو صدقہ میں پیش کرتے تھے۔ اور تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ ایک موقع پر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین کو صدقہ کی ترغیب دے دی تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار درہم پیش کر دیئے، اور حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ نے سو وسق کھجوریں حاضر کر دیں، اس پر منافقین نے طنز کیا، کہنے لگے: یہ سب کچھ ریاکاری اور نام ونمود ہے۔

ایک اور صحابی ابو عقیل رضی اللہ عنہ ایک صاع کھجور لے کر آئے، اور صدقہ کے مال میں ڈال دیا، اس پر منافقین آپس میں ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے ایک صاع کی کیا ضرورت تھی؟ چونکہ یہ صدقہ تھوڑا سا تھا اس لئے انہوں نے طنز کیا، وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کے خبث باطن اور طنز ومذاق کا ذکر فرما کر انہیں تنبیہ کی کہ جو کوئی شخص صدقہ کرنے والوں پر طنز کرتا ہو وہ منافق ہے، اور اللہ تعالیٰ ایسے منافقین کے طنز ومذاق کا انہیں سزا دے گا، اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔ [ابن کثیر]

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار درہم لاکر پیش کیے، اور عرض کیا: یارسول اللہ! میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے، جن کے نصف چار ہزار درہم خدمت گرامی میں لاکر پیش کر چکا ہوں، اور چار ہزار اپنے اہل وعیال کیلئے چھوڑ آیا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو کچھ تم نے اللہ کی راہ میں دیدیا اور جو کچھ گھر میں رکھ لیا اللہ تعالیٰ تمہیں سب میں برکت دے، اس دعاء کا اثر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مال میں اتنی برکت دی کہ وفات کے وقت آپ رضی اللہ عنہ کی دو بیویاں تھیں، جن کی میراث کا آٹھواں حصہ (کل ترکہ کا) ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم ہوا تھا، یعنی مجموعی ترکہ بارہ لاکھ اسی ہزار درہم کا تھا، جس کا ثمن یعنی آٹھواں حصہ صرف دونوں بیویوں کا ایک لاکھ ساٹھ ہزار درہم بنتا ہے، اس زمانہ کے اعتبار سے یہ بہت ہی بڑا مال ہے۔ نیز دیگر اموال جیسے جائیداد اور مویشی وغیرہ جو چھوڑے تھے وہ درہم کے علاوہ تھے۔

﴿اَلْمُطَّوِّعِيْنَ﴾ بمعنی خوشی سے دینے والے، اس سے مراد حضرت عبد الرحمن بن عوف اور عاصم بن عدی رضی اللہ عنہما ہیں، اور ﴿لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ﴾ سے مراد ابو عقیل رضی اللہ عنہ ہیں، جن کا نام صحاب تھا۔ سورۂ بقرہ میں ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ [البقرۃ: ۱۵] (اللہ بھی ان کا مزاق اڑاتا ہے) اور یہاں ﴿سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ﴾ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ منافقین کو ان کے استہزاء اور تمسخر کی سخت سزا دے گا۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے لکھا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لوگوں سے استہزاء کرنے والوں کیلئے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا، اور ان سے کہا جائے گا: آجاؤ، وہ اپنی بے چینی اور غم کے ساتھ دوڑیں گے، اور داخل ہونے والے ہی ہوں گے کہ دروازہ بند کیا جائے گا، یہ ہے ان کے استہزاء کی سزا، ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوریٰ: ۴۰] (اور برائی کی سزا اس کی مثل برائی ہے) کی تفسیر ومطلب۔ اسی طرح سامنے آئے گا۔

﴿اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً﴾ رئیس المنافقین بدترین خنزیر عبد اللہ بن اُبی ابن سلول کا جب انتقال ہوگیا تو اس کے بیٹے جن کا نام بھی عبد اللہ رضی اللہ عنہ ہے، یہ مخلص مؤمنین فضلاء صحابہ میں سے تھے، ایک موقع پر یہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوکر کہنے لگے: یارسول اللہ! میرے باپ نے آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کے ایذا دینے میں حد کردی، جو میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے، اگر آپ اجازت دیں گے تو میں تلوار سے اس منحوس کا سر قلم کردوں۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اجازت نہیں دی، فرمایا:

جیسا بھی ہے تمہارا والد ہے، جو سزا اس کیلئے اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہے وہی کافی ہے اس کو۔

جب اس خبیث کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے نے اس کیلئے استغفار کا مطالبہ کیا (پوری تفصیل عنقریب آنے والی ہے) اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ یہی مضمون سورۃ المنافقون میں بھی ہے: ﴿سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ﴾ [المنافقون:٦] ان منافقین کیلئے آپ مغفرت طلب کریں یا نہ کریں دونوں برابر ہیں اگر آپ ﷺ ان کیلئے ستر بار طلب مغفرت کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا، ان کا معاملہ مغفرت کے مراحل سے پیچھے رہ گیا ہے (اور یہ بات آئندہ متعدد مقامات پر آنے والی ہے)۔

﴿اِسۡتَغۡفِرۡ﴾ اگرچہ امر کا صیغہ ہے، لیکن مراد اخبار ہے کہ اس کیلئے مغفرت کا مطالبہ بے سود اور بے فائدہ ہے۔ یہاں سَبۡعِيۡنَ سے مراد ستر کا عدد نہیں، بلکہ کثرت کے معنی میں مستعمل ہے، جیسے کوئی کسی سے کہے کہ تم لاکھ مرتبہ مجھ سے مطالبہ کرو میں تمہارا کام نہیں کروں گا، اعتبار عرف کا ہوتا ہے، اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہو کہ ستر سے زیادہ مغفرت کی صورت میں اس کی بخشش ہو سکتی ہے تو میں ستر سے زیادہ استغفار کیلئے تیار ہوں، مگر جب فائدہ نہیں تو ضرورت ہی نہیں۔ اب اصل وجہ کا بیان:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ﴾ مغفرت سے محرومی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ کفر کیا، یعنی یہ فیصلہ کسی اور وجہ سے نہیں، اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا دروازہ کھلا رکھا ہے، بند نہیں کیا، بد سے بد گناہگار کی مغفرت ہو سکتی ہے، مگر کفر و شرک کی نہیں، جب تک کافر و مشرک توبہ نہیں کرے گا اس وقت تک مغفرت سے محروم رہے گا، جیسے ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ ۚ﴾ [النساء:٤٨] (اللہ معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، اور اس کے علاوہ کو معاف کرتا ہے جس کے لیے چاہے)۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا ہے کہ توبہ کے بغیر شرک کی کوئی مغفرت نہیں فرمائے گا۔ اور شرک کے علاوہ اگر چاہے تو ہر گناہ کی مغفرت فرمائے، یعنی شرک کی مغفرت مشیت سے باہر ہے، باقی سب کچھ مشیت کے اندر ہے۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا، جب تک وہ خود ہدایت کی طلب نہ کریں۔ ﴿فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ﴾ [الکهف:٢٩] (جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر اختیار کرے)، اور فرمایا: ﴿لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ﴾ [البقرة:٢٥٦] (دین میں کوئی زور زبردستی نہیں) جو کفر و

فسق چھوڑنے کیلئے تیار نہیں اللہ تعالیٰ کو اس کی تسلیم وانقیاد کی بھی ضرورت نہیں، خوب یاد رکھیں۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا
يَفْقَهُوْنَ ﴿٨١﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَاِنْ
رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَاۗىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ
تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ۭ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿٨٣﴾

ترجمہ: جو لوگ رسول اللہ کے بعد پیچھے ڈالے گئے وہ اپنے بیٹھے رہ جانے پر خوش ہوئے، اور انہیں یہ ناگوار ہوا کہ اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں، اور کہنے لگے کہ گرمی میں مت نکلو، آپ فرما دیجئے کہ دوزخ کی آگ بہت زیادہ گرم ہے، کیا اچھا ہوتا کہ یہ لوگ سمجھتے ﴿٨١﴾ سو یہ لوگ تھوڑا سا ہنس لیں اور زیادہ روئیں ان اعمال کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿٨٢﴾ سو اگر اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی کسی جماعت کی طرف واپس لے جائے، پھر وہ آپ سے نکلنے کی اجازت مانگیں تو آپ فرما دیجئے کہ تم ہرگز کبھی میرے ساتھ نہ نکلو گے، اور ہرگز میرے ساتھ کسی دشمن سے جنگ نہ کرو گے، بیشک تم پہلی مرتبہ بیٹھنے پر راضی ہو گئے، سو تم پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو ﴿٨٣﴾

معارف ومنازل

منافقین کے جرائم اور ان کی خباثتوں کا بیان چل رہا ہے۔ پہلا جرم یہ بیان ہوا کہ کفر کی باتیں کرتے ہیں، پھر قسم کھا کر جان خلاصی کرتے ہیں۔ دوسرا جرم یہ بیان ہوا کہ احسان فراموشی کرتے ہیں۔ تیسرا جرم یہ ہے کہ بدعہدی کرتے ہیں، مال جمع کرنے کے بعد زکوٰۃ سے انکار کرتے ہیں۔ چوتھا جرم یہ کہ مؤمنینِ مخلصین کے صدقات وخیرات پر طنز و مذاق کرتے ہیں۔ اب پانچواں جرم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کو ناگوار سمجھتے ہیں، اسی کے ساتھ جھوٹ بول کر غزوۂ تبوک میں شرکت کرنے سے گریز کر کے پیچھے رہ گئے، اور بہانہ یہ بنایا کہ ہم معذور ہیں، ہمارے پاس استطاعت کی کمی ہے، سفر بڑا لمبا ہے، موسم گرم ہے، یا یہ کہ رومی عورتوں پر فریفتہ ہونے کا خطرہ ہے، اور بہت سے

بہانے ہیں جو گزشتہ رکوع سے سلسلہ وار چل رہے ہیں۔

اہل ایمان کی خاصیت یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے جہاد پر نہ جا سکے تو انہیں ترکِ جہاد کا غم وصدمہ لاحق ہوتا ہے، پریشانی ہوجاتی ہے، توبہ کرلیتے ہیں، روتے رہتے ہیں، مگر یہاں منافقین کا یہ حال ہے کہ نہ جانے اور پیچھے رہنے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں، اور:

﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ﴾ پیچھے رہنے پر خوب خوشی مناتے ہیں، اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں: ﴿لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ﴾ اس تباہ کن گرمی میں مت نکلو، گھروں میں بیٹھے رہو، خوب ہنسی خوشی مذاق کرو، جب قافلہ کی واپسی ہو تو خوب قسمیں کھاؤ، سننے والا بڑا ہی رحیم وکریم ہے، سب کچھ سنتا اور باور کرتا ہے، چونکہ اس سفر تبوک میں کسی طرح مال غنیمت کے ملنے کی امید نہ تھی، اچھا ہوا کہ ہم لوگ نہ گئے، آئندہ اگر ہمارے قرب وجوار میں کسی جہاد کی نوبت آئی اور مالِ غنیمت ملنے کا موقع بھی ہاتھ آیا تو شرکت کریں گے، گزشتہ بدنامی بھی دُھل جائے گی، اور مال غنیمت بھی ہاتھ آئے گا، وغیرہ۔

اب جوابات: ﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ غزوۂ تبوک سے آنحضرت ﷺ سے پیچھے بیٹھے رہنے والے منافقین اپنے اس بیٹھے رہنے پر خوش ہوگئے۔ یہاں خلف کے معنی ہیں: پیچھے رہنا، جیسے دوسری آیت میں: ﴿وَاِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ [الاسراء:٧٦] (اس وقت وہ آپ کے پیچھے نہیں ٹھہر سکیں گے مگر تھوڑا سا)۔ بعض علماء نے کہا کہ خلف مخالفت کے معنی میں ہے، اس صورت میں یہ خوش ہونے کی علّت کا اظہار ہوگا، یعنی جو لوگ غزوہ میں شریک نہیں ہوئے وہ اس لئے خوش ہوئے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے مخالف اور بدخواہ تھے، دونوں معنی مراد لئے جاسکتے ہیں، مگر اول معنی راجح ہے۔

﴿وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ انہوں نے ناپسند کیا اللہ کی راہ میں مال وجان سے جہاد کو، اور انہیں ناگوار رہا۔ اس جملہ میں درپردہ مسلمانوں کی تعریف ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال وجان سے جہاد کو پسند کرتے ہیں۔

﴿وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ﴾ اور انہوں نے اپنے لوگوں کو بھی کہا، اور مسلمانوں سے بھی کہتے رہے کہ گرمی میں جہاد کیلئے نہ نکلو۔ حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے براویت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہ سرورِ عالم ﷺ نے لوگوں کو اپنے ہمراہ اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا (یہ زمانہ گرمی کا تھا) اس پر ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ!

سخت گرمی ہے، آپ کیلئے باہر نکلنا نا قابلِ برداشت ہے، اس گرمی میں جہاد کیلئے نہ نکلئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [مظهري]

﴿قُلۡ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا﴾ آپ کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ بہت زیادہ گرم ہے، انہوں نے دنیا کی گرمی وہ بھی موسمی گرمی کا تو خیال کیا، اور دوزخ کی آگ کی گرمی سے بچنے کا خیال نہ کیا، حالانکہ وہ دنیا والی گرمی سے بہت زیادہ گرم ہے، اور اس سے بچنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمانبرداری کی جائے۔ دنیا کی گرمی کچھ بھی ہو مگر قابلِ برداشت ہے۔ جو لوگ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوۂ تبوک کیلئے نکلے تھے کوئی پگھل تو نہیں گئے، تکلیف تو ہوئی، مگر پھر بھی خیریت کے ساتھ واپس آگئے۔

دوزخ کی آگ کی کس کو قوتِ برداشت ہے؟ جس کے بارے میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تمہاری یہ آگ (جو دنیا کی آگ ہے) دوزخ کی آگ کا سترواں (۷۰) حصہ ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ جلانے کو یہی تو بہت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (اس کے باوجود) دنیا کی آگ کی بنسبت دوزخ کی آگ میں ۶۹ درجہ زیادہ گرمی وحرارت بڑھادی گئی ہے، ہر درجہ کی گرمی اسی قدر ہے جتنی دنیا کی آگ کی گرمی ہے۔ [بخاري]

دنیا کی گرمی سے گھبرا کر فرائض اور واجبات چھوڑنے اور تارکینِ جہاد والے اس پر خوب غور کرلیں، ان لوگوں کے خیالات برے تھے، اور جانے کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا، اور تکوینی طور پر بھی ان کے بارے میں یہی فیصلہ ہوا تھا کہ یہ لوگ نہ جائیں جیسے پہلے بیان ہوا کہ: ﴿وَّلٰكِنۡ كَرِهَ اللّٰهُ انۡۢبِعَاثَهُمۡ فَثَبَّطَهُمۡ﴾ [التوبة: ٤٦] (لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں فرمایا، سو ان کو وہاں جانے سے روک دیا) اس لئے اسم مفعول کے صیغہ کے ساتھ انہیں الۡمُخَلَّفُوۡنَ فرمایا کہ یہ لوگ پیچھے ڈال دیئے گئے ہوئے ہیں، اَیۡ خَلَّفَهُمُ اللّٰهُ، کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیچھے ڈالا ہوا ہے (روکا ہوا ہے)۔

﴿فَلۡيَضۡحَكُوۡا قَلِيۡلًا وَّلۡيَبۡكُوۡا كَثِيۡرًا﴾ یہ دنیا میں تھوڑا سا ہنس لیں، اور آخرت میں زیادہ روئیں گے، یہاں چار روزہ زندگی میں تھوڑی سی خوشی ہے، جس میں ہنسی بھی ہے، اور دوسروں پر طنز و مذاق کرنا بھی ہے، جس کو عام طور پر لوگ خوش طبعی کہتے ہیں، لیکن آخرت میں کفار ومنافقین کی جو بدحالی ہوگی اس پر جو وہ روئیں گے اس رونے کا تصور کریں تو یہاں کی ذرا سی ہنسی وخوشحالی کو بھول جائیں، وہاں تو ان کو رونا ہی رونا ہے۔

﴿فَلۡيَضۡحَكُوۡا ، وَلۡيَبۡكُوۡا﴾ امر کے صیغے ہیں، بمعنی اخبار کے ہیں کہ يَضۡحَكُوۡنَ ، يَبۡكُوۡنَ کے معنی

میں، یا اول اپنے معنی میں انشاء کیلئے ہے، دوئم اخبار کے معنی میں ہوگا، کیونکہ اس کا تعلق قیامت کے ساتھ ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ دوزخی اتنا روئیں گے کہ ان کے آنسوؤں میں اگر کشتیاں چلائی جائیں تو جاری ہوجائیں، اور ان کے آنسو عام آنسو نہ ہوں گے، بلکہ وہ آنسوؤں کی جگہ خون سے روئیں گے۔ [رواه الحاكم فأقره الذهبي رحمهما الله تعالى]

جو لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے روتے ہیں ان کا یہ رونا رحمت اور بڑی نعمت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دو آنکھیں ایسی ہیں جنہیں دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئی، اور ایک وہ آنکھ جس نے فی سبیل اللہ جہاد میں چوکیداری کرتے ہوئے رات گزاری۔ [رواه الترمذي قال حديث حسن غريب] جو لوگ آخرت کی فکر میں نہیں ہیں وہ یہاں نہیں روتے، وہ ہمیشہ ہنستے ہیں، انہیں وہاں مسلسل رونا ہوگا۔

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ ان کاموں کے بدلے جو یہ کیا کرتے تھے، یعنی ان کا وہاں بہت زیادہ رونا کفر و نفاق اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکموں کی خلاف ورزی کی وجہ سے ہوگا۔

امام احمد اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہما کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو ہنستے کم، روتے زیادہ، اور بستروں پر عورتوں سے تم لذّت اندوز نہ ہوتے، اور میدانوں میں نکل کر اللہ تعالیٰ سے زاری و نیاز کرتے۔ اور حاکم کی روایت میں اتنا یہ بھی ہے کہ تم کو کھانا گوارا ہوتا، نہ پینا۔ یعنی کسی بھی مرغوب چیز سے لطف اندوز نہ ہوتے۔

﴿فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ اگر آپ کو غزوۂ تبوک کے سفر سے ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لے جائے تو آپ کے واپس پہنچنے تک وہ مدینہ میں موجود ہوں، اور پھر آپ کو کسی دوسرے موقع پر جہاد کیلئے جانا ہو، اور یہ لوگ آپ کے ساتھ چلنے کی اجازت مانگیں، تو آپ ان سے فرمادیں کہ تم کبھی بھی میرے ساتھ جہاد میں نہ چلو گے، اور نہ میرے ہمراہ کسی دشمن سے لڑو گے۔ یعنی میں ہرگز اپنے ساتھ تمہیں نہیں چھوڑوں گا، چونکہ تم نے پہلے بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا، لہٰذا اب بھی ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو، جو پیچھے رہنے کے خواہشمند ہیں، یا وہ جو جہاد کے مکلف نہیں جیسے بچے، عورتیں اور بیمار وہ معذوری کی وجہ سے پیچھے رہ گئے تم سرکشی کی وجہ سے ان میں شامل رہو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیچھے رہنے والے لوگ اس قابل نہیں کہ آئندہ اس مبارک عمل

جہاد میں شریک ہو جائیں۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا
يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

ترجمہ: اور ان میں سے جو کوئی شخص مرجائے آپ اس پر کبھی نماز نہ پڑھیں، اور اس کی قبر پر کھڑے نہ ہوں، بے شک ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا، اور وہ اس حال میں مر گئے کہ نافرمان تھے﴿۸۴﴾ اور آپ کو ان کے اموال اور اولاد تعجب میں نہ ڈالیں، اللہ تعالیٰ یہی چاہتا ہے کہ ان کو ان چیزوں کے ذریعہ دنیا میں عذاب دے، اور ان کی جانیں اس حالت میں نکل جائیں کہ وہ کافر ہوں﴿۸۵﴾

معارف ومنازل

منافقوں کی نماز جنازہ پڑھنے پر پابندی:

صحیح بخاری میں ہے کہ جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول مر گیا تو اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے (یہ خالص مسلمان تھے) اور انہوں نے کہا کہ میرے باپ کی موت ہو گئی ہے، آپ اپنا کرتہ مبارک عنایت فرمائیں جو اسے بطور کفن پہنا دوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ مبارک عنایت فرما دیا، پھر انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ اس پر نماز جنازہ بھی پڑھائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کیلئے کھڑے ہو گئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز پڑھاتے ہیں؟ حالانکہ وہ منافق ہے، اور منافق کی نماز پڑھانے سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منع فرمایا ہے، اور اس شخص نے فلاں وقت یہ کہا، فلاں وقت یہ کیا، اس طرح اس کے تمام گندے اعمال اور دیگر خطاؤں کی فہرست بیان کر دی، مگر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کے باوجود اس کی نماز پڑھا دی، اس پر آیت بالا کا نزول ہوا: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ﴾۔

فتح الباری میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی۔ باقی رہی یہ بات

کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روزِ روشن کی طرح معلوم تھا کہ یہ شخص محض منافق نہیں، بلکہ منافقوں کا سردار بھی تھا، اور خدا اور رسول کا سب سے بڑا دشمن بھی تھا، آخر اس کی نماز پڑھانے میں کوئی اہم مصلحت ہوگی، تو وہ کیا ہے؟

اس کے بارے میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس کے بیٹے عبداللہ کی حوصلہ افزائی اور خوشی کیلئے، اور قبیلہ خزرج کی قوم کی تالیفِ قلب کیلئے ایسا فرمایا۔ نیز یہ بھی لکھا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا کرتہ اسے کیا فائدہ دے گا؟ میں نے تو یہ عمل اس لئے کیا ہے کہ اس کی قوم کے ہزار آدمی مسلمان ہوجائیں۔ اور روح المعانی میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں امید کرتا ہوں کہ میرے اس عمل سے قبیلہ خزرج کے ایک ہزار سے زیادہ افراد مسلمان ہوجائیں گے، پھر لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امید پوری کی، اور ان لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔

عبداللہ بن ابی کو جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا کرتہ عطا فرمایا تھا اس کی وجہ تفسیر وحدیث کی کتابوں میں یہ بھی لکھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو جب بدر کے قیدیوں میں لایا گیا تھا اس وقت ان کے بدن پر کپڑا نہ تھا، قد آور اور بھاری ہونے کی وجہ سے کسی کا کرتہ ان کے جسم پر برابر نہیں آتا تھا، اس وقت عبداللہ بن ابی نے انہیں اپنا کرتہ پہنا دیا تھا، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی مکافات کیلئے اپنا کرتہ کفن میں شامل کرنے کیلئے عنایت فرمادیا۔ [روح المعانی]

ایک شبہ اور اس کا جواب:

شبہ یہ ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافق کی نمازِ جنازہ سے منع فرمایا ہے، یہ کس بناء پر کہا؟ کیونکہ اس سے پہلے کسی آیت میں صراحۃً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منافق کی نمازِ جنازہ سے منع نہیں فرمایا گیا، اس سے ظاہر یہی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ممانعت کا مضمون اسی سورۂ توبہ کی سابقہ آیت: ﴿ اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ﴾ سے سمجھا ہوگا۔ تو اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت ممانعتِ نمازِ جنازہ پر دلالت کرتی ہے تو آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے ممانعت کیوں اخذ نہ فرمائی، بلکہ یہ فرمایا کہ اس آیت میں مجھے اختیار دیا گیا ہے؟

جوابِ شبہ:

یہ ہے کہ درحقیقت آیات کا ظاہری مفہوم اختیار ہی دینا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ستر مرتبہ کا ذکر بھی اس جگہ تحدید کیلئے نہیں، بلکہ کثرت بیان کرنے کیلئے ہے، تو اس آیت کا حاصل اس کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے یہ ہوگیا

کہ منافق کی مغفرت تو نہ ہوگی، خواہ آپ کتنی ہی مرتبہ مغفرت طلب کرلیں، لیکن اس میں صراحۃً آپ ﷺ کو استغفار کرنے سے روکا بھی نہیں گیا ہے، اور قرآن کریم کی ایک دوسری آیت سورۂ یٰسٓ والی اس کی نظیر ہے، جس میں فرمایا گیا: ﴿وَسَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ۝۱۰﴾ [یٰس] (ان پر برابر ہے، خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لاتے) جیسے اس آیت نے آپ ﷺ کو انذار اور تبلیغ سے منع نہیں کیا، بلکہ دوسری آیات سے تبلیغ ودعوت کا سلسلہ ان کیلئے بھی جاری رکھنا ثابت ہے، جیسے: ﴿بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ﴾ [المائدۃ: ٦٧] (پہنچادیں جو کچھ آپ کو اپنے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے)، اور یہ: ﴿اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ﴾ [الرعد: ٧] (یقیناً آپ ڈرانے والے ہیں)، اور ﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ﴾ [الحجر: ٩٤] (لہٰذا جس بات کو تمہیں حکم دیا جارہا ہے اسے علی الاعلان لوگوں کو سنادو)، اور ﴿اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ يَّخۡشٰهَا﴾ [النازعات: ٤٥] (جو شخص اس سے ڈرتا ہو، تم تو صرف اس کو خبردار کرنے والے ہو) وغیرہ دیگر بہت سی آیات ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ آیت ﴿ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ﴾ سے آپ کو اختیار دینا ہی ثابت ہوگیا تھا، ممانعت نہیں ہوئی کہ جب فائدہ نہیں تو آپ انذار نہ کریں، بلکہ یہ حکم ہے کہ فائدہ نہ ہونے کے باوجود آپ انذار کو جاری رکھیں، ایک اس لئے کہ اتمامِ حجت ہو کفار پر۔ دوم اس لئے کہ آپ کو دعوت وتبلیغ کا اجر وثواب حاصل ہو۔ سوم اس لئے کہ انذار وتبلیغ آپ کی نبوت کا فریضہ لازمہ ہے، جس سے سبکدوشی ضروری اور لازم ہے۔

پس سرورِ عالم ﷺ کو انذار جاری رکھنا مستقل دلائل سے ثابت ہوگیا، اور آپ ﷺ نے آیت مذکورہ سے بھی یہ تو سمجھ لیا تھا کہ منافق کی مغفرت تو نہیں ہوگی، مگر کسی دوسری آیت سے صراحۃً استغفار کی ممانعت ثابت نہیں ہوئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ استغفار والی آیت استغفار کی ممانعت پر دلالت اسی طرح نہیں کرتی جس طرح انذار والی آیت ممانعت انذار پر دلالت نہیں کرتی، پس دونوں میں یعنی اثبات انذار اور ممانعت استغفار کیلئے دوسرے دلائل کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم

خلاصہ یہ ہے کہ آیت سابقہ سے خود سرورِ عالم ﷺ کو بھی یہ یقین ہوگیا تھا کہ ہمارے کسی عمل سے اس منافق کی مغفرت نہیں ہوگی، مگر چونکہ ظاہر الفاظ آیت میں اختیار دیا گیا تھا اور کسی دوسری آیت سے بھی ممانعت اب تک نہیں آئی تھی۔ دوسری طرف ایک کافر کے احسان (حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو کرتہ دینے) سے دنیا میں نجات حاصل کرنے کا فائدہ بھی تھا، اور اس معاملہ پر منافق کے مسلمان مخلص بیٹے کی دلجوئی بھی تھی، اور اس کی قوم کے ایک ہزار

کافروں کے مسلمان ہونے کی توقع تھی، جو کہ الحمد للہ پوری ہوئی۔

سرور کائنات ﷺ ایک ایک کافر کے ایمان پر حریص اور بے تاب رہتے تھے، یہاں تو ہزاروں کی امید تھی، اس لئے آپ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھانے کو ترجیح دی۔ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی اپنے موقف میں صحیح اور حق بجانب تھے، مگر جہاں نبوت کی وسعتِ نظر کام کرتی ہے وہاں تک کسی امتی کی رسائی ممکن ہی نہیں، چنانچہ قومِ خزرج کے لوگوں کے اسلام کے بعد خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف سے دستبردار ہو کر فرمایا: "اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ"۔ یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ جو کچھ جانتے اور فیصلہ کرتے ہیں اس کی حکمتوں اور مصلحتوں تک کسی کی رسائی نہیں، بلکہ ہرگز نہیں ہوسکتی۔ غزوۂ حدیبیہ کی صلح اور شرائط طے کرتے ہوئے بھی ایسا واقعہ پیش آیا، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے موقف سے دستبردار ہو کر معافی مانگی، آپ ﷺ کا مقام ومنصب اتنا اونچا اور بلند ہے جہاں کوئی امتی تو درکنار وہاں تک اولوالعزم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کی بھی رسائی ممکن نہیں۔ آپ ﷺ نے صدق وصداقت کے ساتھ ارشاد فرمایا: "لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِيْ"، اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام میرا زمانہ پاتے تو انہیں بھی میرے اتباع کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہوتا، وہ ضرور میرا اتباع کرتے۔

﴿وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ﴾ آپ کسی منافق یا کافر کی قبر پر کھڑے نہ ہوں، یعنی دفن میں بھی شرکت نہ کریں، یہ حکم ساری امت کیلئے ہے کہ کسی مسلمان کو اجازت نہیں کہ کسی کافر پر نماز جنازہ پڑھیں، یا کسی تدفین وتجہیز کی رسومات میں شرکت کریں۔

……❁……❁……❁……

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا
ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٨٦﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨٧﴾

ترجمہ: اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ، اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو، تو ان میں سے مقدور والے لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجئے، ہم بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ ہو جائیں ﴿٨٦﴾ لوگ اس بات پر راضی ہوگئے کہ گھروں میں پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں، اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ سو وہ نہیں سمجھتے ﴿٨٧﴾

معارف ومنازل

منافقین کے احوال اور نفاق کا سلسلہ جاری ہے کہ جب قرآن حکیم کی کوئی سورت یا آیت نازل ہوجاتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مل کر جہاد کرنے کا حکم ہوتا ہے، تو ان پر زمین تنگ ہوجاتی ہے، اور اتنے حواس باختہ اور پریشان ہوجاتے ہیں کہ ان کے عوام غریب وفقراء تو درکنار بڑے بڑے مالدار اور صاحبِ استطاعت بھی راستہ بھول جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں جہاد پر لے جاکر موت کے منہ میں مت دیدیں، ہمیں پیچھے رہنے کی اجازت دیدیں، اور عورتوں کی نگہداشت کی خاطر ہمیں انہیں کی جماعت میں رہنے دیں، اور انہیں میں ہمیں شمار فرمالیجیے۔

دیکھو اے مخاطب! یہ ان کی بے غیرتی کا ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ بہادر مردوں میں شمار ہونے پر راضی نہیں، عورتوں میں شمار ہونے پر راضی ہیں، بات یہ ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ اپنے نفع ونقصان اور خیر وشر سے ناواقف ہیں۔

❁ ❁ ❁

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ؗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾

ترجمہ: لیکن رسول اور وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ایمان لائے انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے خوبیاں ہیں، اور یہ وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں ﴿۸۸﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے ایسے باغ تیار فرمائے ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے ﴿۸۹﴾

معارف ومنازل

منافقین اور جہنمیوں کے احوالِ بد وانجامِ شر کے بعد اب ایماندار جنتیوں کی خوبیوں اور انجامِ خیر کا بیان ہورہا ہے، اور انہیں ابدی سعادتوں کی بشارت دیجارہی ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں رہے ان کیلئے خوبیاں ہیں، کیونکہ انہوں نے سعادتوں کا انتخاب کیا،

یعنی ایمان لائے، معیت میں رہے، اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، تو نتیجہ میں یقیناً خیرات اور خوبیاں انہیں حاصل رہیں گی، اور اس دنیا میں ان کیلئے فلاح ونصرت ہے، اور آخرت میں جنت ہے، اور جنت کی بے پناہ نعمتیں ہیں۔ بعض مفسرین نے خیرات سے جنت کی حوریں مراد لی ہیں، جیسے سورۂ رحمٰن میں فرمایا: ﴿فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ﴾ [الرحمن: ۷۰] (ان باغوں میں خوبصورت حوریں ہوں گی) یہاں خیرات سے جنتی حوریں مراد ہیں۔

یک جان بستاند وصد جان دہد ☆ ہر چہ در وہمت نیاید آن دہد

پس کامیاب یہی لوگ ہیں، اور جو لوگ ایمان وجہاد سے محروم رہے وہ خسارے میں رہے۔ یہاں سے منافقین پر تعریض ہے کہ وہ ہر خیر سے محروم رہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلصین بندوں کیلئے وہ عظیم نعمتیں تیار کی ہیں جنہیں نہ آنکھوں نے دیکھا ہے، نہ کانوں نے سنا ہے، اور نہ وہ عقل وگمان کے دائرے میں آسکتی ہیں۔ مسلمان جنہیں دیکھ کر بہت سرور وخوشحالی محسوس کریں گے اور ان کی آنکھیں ان بیش قیمت نعمتوں کے دیکھنے اور نظارہ کرنے کے ساتھ ٹھنڈی ہوجائیں گی۔ اللھم ارزقنا۔ آمین

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

ترجمہ: اور دیہاتیوں میں سے کچھ لوگ بہانہ کرنے والے آئے، تاکہ ان کو اجازت دے دی جائے، اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا تھا وہ بیٹھے رہ گئے، جو لوگ ان میں سے کفر ہی پر رہیں گے انہیں دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۹۰﴾ ضعیفوں اور مریضوں اور ان لوگوں پر کوئی گناہ نہیں جو خرچ کرنے کیلئے کچھ نہیں پاتے، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کیلئے خلوصِ دل سے حاضر ہوں، محسنین پر کوئی الزام نہیں، اور اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم

ہے﴿۹۱﴾ اوران لوگوں پر بھی کوئی گناہ نہیں جو آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوئے کہ آپ ان کو سواری دیدیں، آپ نے فرمایا کہ میں ایسی کوئی چیز نہیں پاتا جس پر تمہیں سوار کردوں، وہ اس حال میں واپس ہوگئے کہ اس رنج میں ان کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے، کہ وہ خرچ کرنے کیلئے نہیں پاتے﴿۹۲﴾ الزام تو انہی لوگوں پر ہے جو مالدار ہوتے ہوئے آپ سے اجازت چاہتے ہیں، وہ اس بات پر راضی ہوگئے کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں، اوراللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی سو وہ نہیں جانتے﴿۹۳﴾

معارف ومنازل

غزوۂ تبوک عام غزوات کی طرح نہیں تھا، ستائیس غزوات میں اس کی بڑی خصوصی شان ہے، بلکہ چھبیس غزوات ایک طرف، تنہا یہ غزوہ ایک طرف، صرف مدینہ منورہ نہیں بلکہ فتح مکہ مکرمہ کے بعد آس پاس کے قبائل جتنے بھی اسلام قبول کرچکے تھے، ان تمام قبائل میں اعلان عام ہوچکا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس غزوہ کیلئے تیاری کرکے مدینہ منورہ پہنچیں۔

دراصل جزیرۂ عرب سے اسلام کو باہر قدم رکھنے اور دینِ الٰہی کو عام کرنے اور پورے عالم میں پھیلانے کے لیے یہ غزوہ بمنزلۂ دیباچہ تھا، اس لئے تقریباً مکمل سورۂ توبہ اسی غزوہ کے بیان میں ہے۔ پھر جس مارِ آستین اور بدترین ناسور سے اسلام کو خطرہ لاحق تھا، یعنی مدینہ کے منافقوں کا نفاق اور دورخی اور اسلام دشمنی ان سب کی نشاندہی اس سورت میں واضح ہوگئی ہے۔ اگر ہرقل روم میدان پرآکر مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوح نہ ہوا تو کوئی حرج نہیں، اس غزوہ نے اندر کے منافقین کے نشاندہی کرکے بڑا کارنامہ انجام دیا، کہ مخلصین مؤمنین نے نفاق پر فتح حاصل کی، اور سارے منافق جو پردۂ خفاء میں تھے سب کے سب معلوم ہوگئے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ہرایک منافق کا نام مع ولدیت سرور عالم ﷺ کو بتلادیا، پھر آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو پوری فہرست بتلادی، جس سے نفاق اور منافقین کی قلعی کھل گئی، اوران کی کمرٹوٹ گئی، اس کے بعد نفاق کو سراٹھانے کا کوئی موقع نہ ملا۔

☆☆☆

خلاصہ:

سرور عالم ﷺ نے جب غزوۂ تبوک میں شرکت کرنے کیلئے اپنے ہمراہ چلنے کی لوگوں کو دعوت دی تو یہ

دعوت اہلِ مدینہ کو اور آس پاس کے دیہات کے رہنے والے جو لوگ تھے ان سب کو عام تھی، بہت سے منافقین ایسے تھے جنہوں نے کوئی عذر بھی پیش نہ کیا، اور دیدہ دلیری وہٹ دھرمی کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھے رہے، اور بہت سے دیہات کے رہنے والے عذر پیش کرنے کیلئے آئے، اور عذر پیش کر کے پیچھے رہ گئے (یہ لوگ منافق نہیں تھے) یہ لوگ قبیلہ بنی اسد، قبیلہ غطفان اور قبیلہ غفار کے لوگ تھے، ان میں حضرت خفاف بن ایماء غفاری رضی اللہ عنہ بھی تھے، جنہوں نے خلافت فاروقی میں عراق کے "تستر" کو محاصرہ کے بعد فتح کیا، جن کا مختصر تذکرہ صحیح بخاری جلد دوم میں موجود ہے۔

پہلی آیت کریمہ میں انہی دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، اور آیت کے ختم پر: ﴿سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ یعنی ان میں سے جو لوگ کفر ہی پر رہیں گے ان کو دردناک عذاب ہوگا، منافقین کیلئے ﴿كَذَبُوا اللهَ وَرَسُولَهُ﴾ فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دعوائے ایمان میں اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جھوٹ بولا تھا۔

اس کے بعد مخلصین مؤمنین کا ذکر ہے، اور یہ دو طبقے ہیں: پہلا معذورین یعنی ضعیف بیمار وغیرہ کا، دوسرا مجبورین کا، جن کے پاس استطاعت نہ تھی، فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى﴾ یہ قسمِ اول کا بیان ہے، اور:

﴿وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنْفِقُونَ﴾ یہ قسمِ دوم کے لوگ ہیں، کہ تندرستی کے باوجود کچھ خرچ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ حَرَجٌ یہ خبر لَيْسَ کے ساتھ متعلق ہے، ترکیب میں لَيْسَ کا اسم خبر ہے، یعنی ایسی دونوں قسم کے لوگوں پر گناہ نہیں، بشرطیکہ:

﴿إِذَا نَصَحُوا لِلّٰهِ وَرَسُولِهِ﴾ جب کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخلص اور سچے ہوں، تقریباً ایسے لوگ وفادار اور نیک کار ہوتے ہیں، تو فرمایا:

﴿مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ﴾ نیکوکاروں پر کوئی الزام اور ملامتی نہیں، اور گرفت بھی نہیں۔

﴿وَاللهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں مخلصین اور محسنین پر رحم کرنے والا، مغفرت کرنے والا ہے۔

اب ایک تیسرے فریق کا ذکر ہے، اور ان کی مدح بھی ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جانے پر تیار بھی ہیں، اور جہاد کیلئے تڑپ اور شوق وجذبہ بھی رکھتے ہیں، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لئے

سواری کا انتظام کریں، ہم کسی سواری پر قدرت نہیں رکھتے، آپ ﷺ نے انہیں سواری دینے سے اس لئے معذرت فرمائی کہ آپ ﷺ کے پاس سواری کے اونٹوں کی کمی تھی، وہ رنجیدہ اور پریشان ہوکر زارزار روتے رہے، اور آنسو بہاتے رہے، اوران کے چہروں پر آنسوؤں کی لڑی تھی۔

کہتے ہیں کہ یہ لوگ سات سے لے کر دس آدمی تک تھے، بعد میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کا مسئلہ تقریباً حل ہوگیا، اور وہ لشکر کے ساتھ روانہ ہوگئے۔اس موقع پر قبیلہ اَشعَرِی کے چندلوگ بھی آئے، اور آپ ﷺ سے سواری طلب کی، آپ ﷺ نے انہیں بھی یہی جواب دیا کہ میرے پاس سواریوں کی کمی ہے، وہ مایوسی کے عالم میں رنجیدہ ہوکر چلے گئے، پھر آپ ﷺ کے پاس کچھ اونٹ جب آئے تو آپ ﷺ نے انہیں بلا کران کیلئے پانچ یا چھ اونٹوں کا انتظام فردیا۔ [بخاري] اس کے بعد فرمایا:

﴿إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۚ رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ﴾ الزام انہی لوگوں پر ہے جو مالدار ہوتے ہوئے آپ ﷺ سے اجازت لیتے ہیں، یہ لوگ اس پر راضی ہوگئے کہ وہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں، مالی استطاعت اور تندرستی کے باوجود یہ کم ہمت بزدل بن کر عورتوں میں شامل ہونا تو پسند کرتے ہیں، اور بہادر مردوں میں شامل ہونے سے خوفزدہ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے:

﴿وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے، وہ نہیں جانتے ہیں کہ دنیاوی تکالیف کا نتیجہ ابدی راحت ہے، اگر وہ جانتے ہوتے تو ضرور نیکیوں اور جہاد پر اقدام کرتے، یہ لوگ کتنے بدقسمت ہیں۔

اَلْجُزْءُ الْحَادِیْ عَشَرَ

یَعْتَذِرُوْنَ اِلَیْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَیْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ
اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَیَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۹۴ سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَیْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا
عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ؗ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ۝۹۵ یَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا
عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ۝۹۶

ترجمہ: وہ لوگ آپ کے پاس عذر پیش کریں گے جب آپ ان کی طرف واپس ہوں گے، آپ فرما دیجئے: عذر پیش نہ کرو، ہم ہرگز تمہاری بات کو سچی نہ مانیں گے، اللہ تعالیٰ نے تمہاری خبریں ہمیں بتادی ہیں، اور عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو دیکھ لے گا، اور اس کا رسول بھی، پھر تم اس ذات کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو چھپی ہوئی اور ظاہری باتوں کا جاننے والا ہے۝۹۴ سو وہ تمہیں ان کاموں سے باخبر فرمادے گا جو تم کیا کرتے تھے، وہ عنقریب تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھائیں گے، تاکہ تم ان سے درگزر کرو، سو آپ ان سے اعراض کریں، بے شک وہ ناپاک ہیں، اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، ان کو ان کاموں کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۝۹۵ وہ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم ان سے راضی بھی رہو مگر اللہ تعالیٰ شانہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا۝۹۶

معارف ومسائل

پہلی آیات میں ان منافقوں کا ذکر تھا جنہوں نے غزوۂ تبوک میں نکلنے سے پہلے جھوٹے حیلے بہانے کرکے جہاد میں جانے سے عذر کیا تھا، اب مذکورۃ الصدر آیات میں ان منافقین کا تذکرہ ہے جنہوں نے جہاد سے واپسی کے بعد شرمندگی چھپانے کے طور پر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اپنی جہاد سے غیر حاضری کے جھوٹے عذر پیش کئے۔

جب واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد نبوی میں شکرانہ کی نماز ادا کرکے بیٹھ گئے تو ان منافقین کی قطاریں لگ گئیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ اسی ۸۰ سے کچھ زائد لوگ تھے، کئی دنوں سے انہوں نے جھوٹ بولنے

کی مشق کی ہوئی تھی کہ یہ کہیں گے، فلاں فلاں بہانہ کر کے جان چھڑائیں گے۔ [بخاري] حالانکہ یہ آیات مدینہ طیبہ واپس پہنچنے سے پہلے دورانِ سفر نازل ہو چکی تھیں، جن میں منافقین کے آئندہ پیش آنے والے واقعات کی پوری خبر دی جا چکی تھی، کہ وہ لوگ اس طرح آئیں گے، اور قسمیں کھا کر اس طرح معذرت پیش کریں گے، چنانچہ ایسا ہی واقع ہوا۔

ان آیات میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منافقین کے متعلق تین حکم دیئے گئے: پہلا یہ کہ جب یہ عذر کرنے آئیں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ فضول جھوٹے عذر بیان نہ کرو، ہم تمہاری بات کی تصدیق نہ کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی تمہارے تمام حالات اور خیالات اور تمہاری شرارت تمہارے دلوں میں چھپے ہوئے خفیہ ارادوں سے مکمل ہمیں آگاہ فرمایا ہے، جن سے تمہارا سارا جھوٹ آشکارا ہو چکا ہے، اور تمہارے نفاق کی قلعی کھل گئی ہے، البتہ:

﴿وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ﴾ اس فرماں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر آئندہ تم اپنی اصلاح کرو، اور منافقت سے تائب ہو کر ایمان لاؤ، اور صدق دل سے مسلمانوں میں شامل ہو جاؤ تو اس کی گنجائش ہے، پس گزشتہ خطاؤں کی معافی ہو سکتی ہے، اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں دیکھیں گے کہ آئندہ تمہارا ردِ عمل اور کردار کیا ہوگا۔

دوسرا حکم دوسری آیت میں بیان ہوا ہے کہ یہ لوگ آپ کی واپسی کے بعد جھوٹی قسمیں کھا کر آپ کو مطمئن کرنا چاہیں گے کہ:

﴿لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ﴾ آپ ان کی جہاد سے غیر حاضری کو نظر انداز کریں، اور انہیں ملامت نہ کریں، اور چھوڑ دیں، اور ان کی یہ خواہش پوری کر دیں، اس پر انہیں سرزنش ہوئی، کہ آپ یہ سمجھو کہ یہ ناپاک جہنمی اور گندے لوگ ہیں، ان کی معافی کا امکان ہی نہیں، اسی کو آئندہ واضح فرمایا جو یہ ہے:

تیسرا حکم تیسری آیت میں ہے کہ جب یہ ناپاک و نافرماں لوگ قسمیں کھا کر آپ کو اور دوسرے مسلمانوں کو راضی کرنا چاہیں گے تو آپ ان کی یہ خواہش مسترد فرمائیں، اور آپ ان سے راضی نہ ہوں۔ اگر بالفرض آپ ان سے راضی ہو جائیں گے بھی، تو ان کو کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی نہیں ہے، اور وہ راضی قطعاً نہ ہوگا، کیونکہ یہ اپنے کفر و نفاق اور فسق پر قائم ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی رضا مشروط بالایمان ہے، اور غیر مؤمن اس کے حقدار نہیں ہوتے۔

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ
حَكِيۡمٌ ﴿٩٧﴾ وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مَا يُنۡفِقُ مَغۡرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيۡهِمۡ دَآئِرَةُ السَّوۡءِ ؕ
وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿٩٨﴾ وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰهِ
وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرۡبَةٌ لَّهُمۡ ؕ سَيُدۡخِلُهُمُ اللّٰهُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿٩٩﴾

ترجمہ: دیہاتی لوگ کفر اور نفاق میں بہت سخت ہیں، اور اس لائق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو احکام نازل فرمائے ہیں ان سے واقف نہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے حکمت والا ہے﴿٩٧﴾ اور دیہاتیوں میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ اپنے خرچ کرنے کو تاوان سمجھتے ہیں، اور تمہارے لئے مصیبتوں کے آنے کے منتظر رہتے ہیں، ان پر بُری گردش ہے، اور اللہ تعالیٰ سننے والا ہے، جاننے والا ہے﴿٩٨﴾ اور دیہاتیوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہیں، اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ تعالیٰ کی نزدیکی کا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دعائیں لینے کا ذریعہ بناتے ہیں، خبردار یہ ان کیلئے نزدیکی کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے﴿٩٩﴾

معارف ومنازل

تجربہ اور مشاہدہ اس پر گواہ ہے کہ شہری زندگی اور دیہاتی زندگی گزارنے والے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے، کئی چیزوں میں شہری لوگ بہتر ہوتے ہیں، اور کئی چیزوں میں دیہاتی لوگ بھی۔ البتہ علم وادب، علوم ومعارف میں شہری لوگوں کی دسترس زیادہ ہوتی ہے، اور دیہاتی لوگ کمزور ہوتے ہیں، اسی کو فرمایا کہ دیہاتی صحرائی لوگ کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں، اور وہ اسی لائق ہیں کہ ان کو ان احکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمائے ہیں۔

یعنی وہ اکثر بے علم ہی ہوتے ہیں، چونکہ ان خانہ بدوشوں، صحرانشینوں کا اہل علم کے ساتھ اختلاط، اٹھنا بیٹھنا کم ہے، اور قرآن وحدیث سننے کا موقع ان کو کم ہی ملتا ہے، اور ان میں جمعہ اور عیدین وغیرہ اجتماعات کا بھی فقدان ہے، اس لئے ان کے مزاجوں اور طبیعتوں میں سختی ودرشتی اور بے رحمی زیادہ ہے، جبکہ شہر میں رہنے والے اکثر وبیشتر ایسے نہیں ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قواعد وضوابط واحکام سے ناواقف رہنے کے دیہاتی لوگ زیادہ مستحق

ہیں۔

﴿مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ﴾ سے مراد ہیں: فرائض، واجبات، سنن، مستحبات، ممنوعات، معاملات وغیرہ۔حدیث شریف میں فرمایا: ''جو شخص دیہات میں رہا وہ سخت مزاج ہوا، اور جو شخص شکار کے پیچھے لگا رہا وہ غافل ہوا، اور جو شخص صاحب اقتدار کے پاس آتا جاتا رہا وہ فتنوں میں پڑ گیا''۔[أبو داؤد]

﴿وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مَا يُنۡفِقُ مَغۡرَمًا﴾ درحقیقت دیہاتی مزاج کی سختی اور وحشت کا یہ عالم ہے کہ بعض صحرانشین بدوی لوگ ایسے ہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ظاہراً خرچ کرتے ہیں تو بے علمی کی وجہ سے اسے تاوان سمجھتے ہیں، یعنی دکھاوے اور خوف کی بنا پر وہ مال خرچ کرتے ہیں، انہیں ثواب کی امید نہیں ہوتی، اس لئے یہ خرچ انہیں شاق معلوم ہوتا ہے، اور وہ بخل وحسد کی وجہ سے مسلمانوں کیلئے گردشوں اور مصیبتوں کے منتظر رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿عَلَيۡهِمۡ دَآئِرَةُ السَّوۡءِ﴾ انہی لوگوں پر بُری گردش پڑنے والی ہے، یہ جملہ بددعائیہ خبریہ ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اسلام آئے دن ترقی کرتا رہا، اور کفر اپنے ساتھی نفاق کے ساتھ مٹتا چلا گیا۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ﴾ اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے، وہ بندوں کے ارادوں، پوشیدہ نیتوں پر باخبر ہے، کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔

﴿وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرۡبَةٌ لَّهُمۡ ؕ سَيُدۡخِلُهُمُ اللّٰهُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ﴾ اعراب اور صحرانشینوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت قبیلہ مزینہ کے مقرن کی اولاد کے حق میں نازل ہوئی، اور انہی کے متعلق آیت کریمہ: ﴿وَّلَا عَلَى الَّذِيۡنَ اِذَا مَاۤ اَتَوۡكَ لِتَحۡمِلَهُمۡ﴾[التوبة: ٩٢] (اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ ہے جو آپ کے پاس آئے تاکہ آپ ان کو سواری دیں) بھی نازل ہوئی تھی۔

حضرت عبدالرحمن بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ کا خود بیان ہے کہ ہم مقرن کے دس بیٹے تھے۔کلبی نے کہا: قبائل تمیم، اسد بن خزیمہ، ہوازن اور غطفان میں سے بنی اسلم، بنی غفار اور بنی جہینہ کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔

بخاری ومسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت سے آیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قبیلہ غفار کو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، اور قبیلہ اسلم کو اللہ تعالیٰ نے سلامت رکھا، یا محفوظ رکھے، اور عصیہ نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی۔

﴿وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ﴾ اور جو کچھ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کو اللہ تعالیٰ کے قرب ورضا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس کو اللہ تعالیٰ کے قرب ورضا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کے حصول کا سبب سمجھتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ﴿صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ﴾ سے مراد ہے کہ کسی کیلئے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دعائے مغفرت کرنا، فرمایا: بلاشبہ یہ راہِ الٰہی میں خرچ کرنا قربتِ الٰہی کا سبب ہے۔

﴿اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ﴾ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ نے شہادت دی کہ ایسا کرنا موجبِ قربت ورضاءِ الٰہی ہی ہے، اور ایسے لوگوں کا ارادہ درست اور عمل صحیح ہے، پس یہ حکم دیدیا:

﴿سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت یعنی جنت میں داخل فرمائے گا، اور کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گناہوں کو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝١٠٠

ترجمہ: اور مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ سبقت لے جانے والے ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے اخلاص کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے ایسے باغ تیار کئے ہیں جن کے درختوں کی نیچے نہریں جاری ہیں، ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بڑی کامیابی ہے۝١٠٠

معارف ومنازل

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ﴾ یہ خوش قسمت لوگ ہیں کون؟ سابقین اولین کی

تفسیر میں علماء تابعین کے مختلف اقوال ہیں:

حضرت سعید بن مُسَیَّب، محمد بن سیرین، قتادہ رحمۃ اللہ علیہم اور ایک جماعت تابعین کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے۔ عطاء بن ابی رباح، عطاء بن یسار، محمد بن کعب قرظی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اہل بدر کے مجاہدین مراد ہیں، امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بیعۃ الرضوان حدیبیہ کے لوگ ہیں۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس جگہ سابقین اولین سے وہ حضرات مراد ہیں جو ہجرت اور نُصرت میں سابق اور اول رہے ہیں، کیونکہ سابقین اولین کا لفظ مجمل ہے، جس میں یہ نہیں فرمایا کہ کس چیز میں سابق اور اول ہیں۔ پھر ان کو مہاجرین اور انصار کے ساتھ موصوف فرمایا، معلوم ہوا کہ صفتِ ہجرت اور صفتِ نصرت میں سبقت واوّلیت مراد ہے۔ [تفسیر کبیر]

تفسیر مظہری میں ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ حرف من کو بیانیہ قرار دیا جائے گا، تو مفہوم اس جملہ کا یہ ہوگا کہ تمام صحابہ کرام بنسبت باقی اُمّت کے سابقین اولین ہیں اور ﴿مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ﴾ اس کا بیان ہے اب یہ ضروری نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دو طبقوں کا اعتبار ہو: پہلے وہ جو سابقین اولین ہیں، دوسرا وہ جو تحویلِ قبلہ یا غزوۂ بدر یا بیعۃ الرضوان کے بعد مسلمان ہوئے، بلکہ راجح یہی ہو کہ بنسبت باقی اُمت کے وہ سب کے سب سابقین اولین ہوں، کیونکہ ان کا ایمان باقی امت سے سابق اور اول ہے۔ [خلاصۃ بیان القران]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے متبعین سب جنتی ہیں:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ﴾ اس عظیم المرتبت اور خیر امت کے عظیم الشان سرخیل اور پاکیزہ جماعت کے لوگ ہیں، جن کا پوری امت میں وہی مقام ہے، جیسے کہ ان کے پیغمبر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام میں ہے، اور سورۃ الفاتحہ کا مقام پورے قرآن میں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سابقین اولین کے مقام کا اندازہ یہاں سے لگائیں کہ ان کے متبعین کے لئے بھی اللہ تعالیٰ شانہ اپنے رضوان "رضوان اکبر" اور ابدی راحتوں اور دائمی سعادتوں کا دنیا ہی میں اعلان فرما رہے ہیں۔ سبحان اللہ ؎

جمالِ ہمنشین در من اثر کرد ☆ وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

﴿اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾ کا تعلق اور انحصار خیر القرون کے ساتھ مقید نہیں، بلکہ اس عمومی صفت "اتباع" کا تعلق قیامت تک آنے والے ان سارے مسلمانوں کے ساتھ ہے جن کے عقائد و اعمال میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے

عقائد واعمال کا رنگ اور جھلک نمایاں ہو، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ سعادت ان لوگوں کو میسر آئے گی جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنا مقتداء سمجھتے ہیں، اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں، اور ان کے مقرر کردہ اعمال کے قفس میں بندھے رہتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: "مَاأنَاعَلَيهِ وَاَصحَابِی"۔ [ترمذي] فرمایا: میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوجائے گی، یہ سارے یعنی بہتر فرقے صراط مستقیم اور جادۂ حق ویقین سے ہٹے ہوئے جہنم کے کتے جہنمی شمار ہوں گے، سوائے ایک نجات یافتہ جماعت کے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ وہ واحد نجات یافتہ جنتی جماعت کونسی ہوگی؟ ارشاد فرمایا: وہ جماعت وہ ہوگی جس کی نشانی (ٹریڈ مارک) وہ ہوگی جو میرے اور میرے جان نثار صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی یعنی جماعت اہل السنت والجماعة حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ ہے، جس کی نشاندہی اس آیت کریمہ نے کی ہے۔ فرمایا:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہنم کی آگ اس مسلمان کو نہیں چھوسکتی جس نے مجھے دیکھا ہے، یا میرے دیکھنے والوں کو دیکھا ہے۔ [ترمذي]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو برا نہ کہو، قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر سونا راہِ خدا میں خرچ کرے گا تو وہ ثواب وقبولیت میں صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے ایک سیر یا آدھ سیر غلہ یا کھجور کے برابر نہ ہوگا۔ [متفق عليه من حديث أبي سعيد الخدري] کہاں سونے کا پہاڑ اور کہاں ایک سیر جو یا کھجور، کوئی مناسبت بھی ہے؟

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) میں سے جب کوئی شخص کسی سرزمین میں مرجائے گا تو قیامت کے دن وہ اس سرزمین کے رہنے والوں کیلئے پیشوا اور چمکدار نور بنا کر اٹھایا جائے گا۔ [ترمذي] اور فرمایا: اَصحَابِی کَالنُّجُومِ فَبِاَیِّهِم اِقتَدَیتُم اِهتَدَیتُم۔ میرے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) ستاروں کی مانند ہیں، جس کی پیروی کروگے ہدایت پاؤ گے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ فرمایا: عَلَیکُم بِسُنَّتِی وَسُنَّةِ الخُلَفَاءِ الرَّاشِدِینَ الْمَهدِیِّینَ تَمَسَّکُوا بِهَا وَعَضُّوا عَلَیهَا بِالنَّوَاجِذِ [رواه الائمة واصحاب السنن ورزين، مشكوٰة]

روافض کی گمراہی اور کفر وضلالت:

روافض کا یہ کہنا کہ ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بلکہ سوائے چار حضرات کے سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مرتد اور کافر تھے، پھر اس پر بھی بس نہیں کرتے، بلکہ قیامت تک آنے والے سُنّی اہلسنت والجماعت کے اربوں مسلمان کافر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زمانہ رسالت سے لے کر قیامت تک آنے والے کھربوں حلال زادے سنی مسلمان سارے کے سارے غیر مسلم اور کافر ہیں، سوائے ان چند محدود متعہ سے پیدا ہونے والے لوگوں کے کہ جن پر قرآن کی پھٹکار ہے۔ جبکہ ڈیڑھ ہزار سال کے بڑے عرصے میں جن کا کوئی ایک شخص بھی حافظ قرآن نہ بن سکا، صرف یہی لوگ مسلمان ہیں۔ سبحان اللہ

یہ امت خیر الامم ہے، حلال زادوں کی بہترین مقبول امت ہے، اس میں کسی حرام زادے مشکوک النسب کی گنجائش نہیں، اور قرآن حکیم اپنی جگہ روشنی کا مینار اور ہدایت کا سرچشمہ اور انوار و برکات کا بے مثال چراغ ہے، جس کی ایک آیت کا انکار بھی صریح کفر و گمراہی ہے، چہ جائیکہ کوئی گمراہ اس کا مکمل انکار کرکے، اسے تحریف شدہ یا مصنوعی و خود ساختہ قرار دیدے۔ جب شیعوں سے کہا جاتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے متبعین کے بارے میں قرآنی اعلان ہوگیا کہ وہ رضي الله عنهم اور جنتی ہیں، تو جواب سنئے، وہ کیا کہتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں: یہ اعلان قرآن کا نہیں، شرابی خلفاء نے اس کو قرآن میں درج کیا ہے۔ یا یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے "بداء" ہوگیا تھا، اللہ تعالیٰ کو یہ اس وقت معلوم نہ تھا، اس نے عُجلت میں غلطی سے اعلان فرمادیا۔ (العیاذ باللہ)۔

پس ایسے لوگوں کے کفر میں کسی کو شک نہیں ہوسکتا، اور جو ملحد و زندیق انہیں مسلمان کہے گا وہ بھی کافر ہوجائے گا۔ آج تک کسی ہندو پنڈت نے بھی قرآن کریم اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی جسارت اور بے ادبی نہیں کی ہے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشیر و وزیر کون تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں سارے غزوات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم رکاب کون تھے؟ کعبۃ اللہ کو تین سو ساٹھ بتوں سے کس نے پاک کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جان و مال ملک وطن کس نے قربان کیا؟ نصف عالم پر اسلام کا پرچم کس نے بلند کیا، لہرایا؟ تین ہزار سالوں سے قائم بڑی بڑی کفریہ سلطنتوں روم و فارس کو کس نے فتح کیا؟ قرآن مجید کو جمع کرکے کس نے اپنے سینوں کا زیور اور زینت بنادیا؟ امیر و غریب کا فرق مٹا کر کس نے دنیا میں عدل و انصاف کا قانون جاری فرمایا؟ دنیا کے بتکدوں میں توحید کا علم کس نے متعارف کرایا؟ سمندروں اور دریاؤں کی کس نے تسخیر کی؟

ان سارے سوالات کا جواب فرشتوں اور جنات سے، پھر جنگلی حیوانات سے، پھر دریائی مچھلیوں سے اسی طرح فضاء میں تیرنے والے پرندوں سے، پھر کوہ وجبال سے، آخر میں منصف مزاج کافروں سے بھی پوچھو، تو بلاشبہ جواب متفقہ یہی ایک ہوگا کہ قُدسی صفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں نے۔

پھر تم کون ہوتے ہو جو اُن پر تنقید کرتے ہو؟ تمہارا تو اسلام میں ذرہ بھر کا کارنامہ نہیں سوائے کفر وگمراہی کے، اگر تم ان مقدس ہستیوں کی نفی کروگے تو نہ خدا کی توحید رہے گی نہ نبی کی رسالت، نہ قرآن کی صداقت، اور نہ ہی اسلام رہے گا، بلکہ پورے اقدار سے ہاتھ دھونا پڑے گا، اور کچھ نہ بچے گا، اور پھر یہود کا اور پورے عالم پر تمہارا ہی کفریہ وفاسقانہ راج قائم ہوگا، پس دینِ الٰہی کا خدا حافظ۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

زمانہ رسالت سے لے کر آج تک تمام ادیانِ باطلہ متفقہ طور پر اسلام کے مٹانے پر کمر بستہ اور تلے ہوئے ہیں، مگر ان شاء اللہ اندرونِ خانہ اور بیرونِ خانہ دشمنانِ اسلام کا خواب ہرگز شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ تیسری صدی ہجری میں عیاش عباسی بادشاہوں کے زمانہ میں شیعوں نے کعبۃ اللہ کی دیوار کو شہید کر کے حجر اسود کو نکالا، اور اونٹ پر رکھ کر اپنے آبائی شہر بحرین میں لے آئے، ۲۳ سال تک حجر اسود ان کے پاس رہا، وہ مسلسل بدامنی اور بیماریوں میں مبتلا رہے، آخر کار اونٹ پر رکھ کر اس کو واپس کر دیا۔

اسلام یقیناً قُربِ قیامت میں نہایت کمزور ہوگا، مگر اللہ کے دین کو کوئی طاقت صفحہ ہستی سے نہیں مٹا سکے گی۔ ارشاد گرامی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸ۭ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ [الفتح: ۲۹] (وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے، تاکہ اسے ہر دوسرے دین پر غالب کر دے۔ اور گواہی دینے کے لیے اللہ کافی ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں، اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحم دل ہیں، تم انہیں دیکھو گے کہ کبھی رکوع میں ہیں، کبھی سجدے میں، اللہ کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں)۔ پورا رکوع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح میں ہے، اس کی تفسیر ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گی۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ☆ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اندکے با تو بگفتم درد دل اندیشم ☆ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار ست

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝۱۰۱

ترجمہ: اور تمہارے گردو پیش جو دیہاتی ہیں ان میں منافق ہیں، اور اہل مدینہ میں بھی ایسے لوگ ہیں جو منافقت پر اڑ گئے ہیں، آپ انہیں نہیں جانتے، ہم انہیں جانتے ہیں، ہم انہیں دو مرتبہ عذاب دیں گے، پھر وہ عذاب عظیم کی طرف لوٹائے جائیں گے ۝۱۰۱

معارف ومنازل

مدینہ منورہ کے آس پاس گردو پیش اطراف میں چند قبائل رہتے تھے، مثلاً مُزینہ، جہینہ، اشجع، اسلم، غفار وغیرہ، جیسے پہلے بیان ہوا کہ یہ بدوی دیہاتی لوگ کفر ونفاق میں بڑے سخت تھے، ان میں کچھ صادق العقیدہ سچے مسلمان ہوتے تھے، اور کچھ منافق اور فریب ومکر والے۔ البتہ اتنا معلوم ہو چکا کہ ان قبائل کے منافق قلت میں تھے،

فرمایا: مدینہ والوں میں سے بھی کچھ منافق تھے، یعنی مدینہ کے مستقل باشندے اوس اور خزرج کے لوگوں میں بھی منافق ہوتے تھے، جو کہ نفاق کے حد کمال تک پہنچے ہوئے تھے۔

﴿مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ﴾ جو کہ نفاق پر مضبوطی سے ڈٹے ہوئے تھے، جمے ہوئے تھے، اور ایمانِ صادق سے خالی تھے، اور:

﴿لَا تَعْلَمُهُمْ﴾ آپ انہیں نہیں جانتے، وہ اتنے زیرک چاپلوس اور مکار ہیں کہ آپ سے اپنے نفاق کو سنجیدگی سے چھپائے ہوئے ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ انہیں خوب جانتا ہے، کیا اللہ تعالیٰ سے کوئی چھپ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، وہ علیم بذات الصدور ہے۔

﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ﴾ ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے، عذاب آخرت کا ذکر آئندہ مستقل آنے والا ہے، وہ یہاں مراد نہیں۔ یہ مَرَّتَيْنِ والے عذاب میں دس کے قریب اقوال ہیں، سب سے راجح قول وہی ہے جو پہلے گزر گیا کہ اللہ تعالیٰ جب ان کے نفاق کی قلعی کھول دے گا تو معاشرہ میں سر اٹھانے کے قابل نہیں رہیں گے، بدنام ہو کر گھروں میں چھپ جائیں گے، اور کسی محفل میں آنے سے شرمندہ ہو جائیں گے۔ دوسرا عذاب یہ ہوگا کہ وہ ہمیشہ مال واولاد کے فتنہ میں مبتلا رہیں گے، جیسا کہ پہلے دو مرتبہ اس کا تذکرہ ہو چکا۔

﴿ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ پھران کو بڑے عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا، جس کی ابتدا عذاب قبر سے ہوگی، دخول جہنم تک۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ
صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٣﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ
يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَ
الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٥﴾

ترجمہ: اور کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کرلیا انہوں نے ملے جلے عمل کئے، جن میں نیک عمل بھی ہیں، اور برے اعمال بھی، عنقریب اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ غفور ہے رحیم ہے﴿١٠٢﴾ آپ ان کے اموال سے صدقہ لے لیجئے جو انہیں پاک کرے گا، اور ان کو دعا دیجئے، بیشک آپ کی دعا ان کیلئے باعثِ تسکین ہے، کیا ان لوگوں نے نہیں جانا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے؟ اور صدقات قبول فرماتا ہے؟ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب زیادہ توبہ قبول کرنے والا ہے مہربان ہے﴿١٠٤﴾ اور آپ فرمادیجئے کہ عمل کرتے رہو، سو عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ لے گا، اور اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی، اور اہل ایمان بھی، اور عنقریب تم اس ذات پاک کی طرف لوٹائے جاؤ گے جسے چھپی ہوئی چیزوں کا اور کھلی ہوئی چیزوں کا علم ہے، پھر وہ تمہیں جتادے گا جو عمل تم کیا کرتے تھے﴿١٠٥﴾

معارف ومنازل

چند رکوع پہلے آیت نمبر ۳۸ کے تحت لوگوں کے مختلف حالات بیان ہوئے تھے، چوتھی قسم ان لوگوں کی تھی کہ باوجود کوئی عذر نہ ہونے کے کاہلی اور سستی کے سبب جہاد (غزوۂ تبوک) میں شرکت نہ کرسکے، اور صحیح روایت کے مطابق یہ دس آدمی تھے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لانے پر جھوٹے منافق جھوٹے عذر پیش کرتے رہے، مگر چند مؤمنین مخلصین جو اپنے ایمان میں سچے ہوتے ہوئے سستی اور کاہلی کی وجہ سے غزوۂ تبوک

میں شریک نہیں ہوئے تھے، اس وقت تو رہ گئے، ساتھ نہ جاسکے، لیکن بعد میں پشیماں ہوئے کہ ہم عورتوں کے ساتھ سایوں میں ان کے ساتھ کیوں رہ گئے؟ اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دھوپ کی گرمی اور سفر کی مشقت وتکلیف میں ہیں۔

جب انہیں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی واپس تشریف آوری کا علم ہو گیا تو ان میں سے سات لوگوں نے اپنی جانوں کو مسجد میں جا کر ستونوں سے باندھ دیا (باقی تین کا واقعہ آگے آنے والا ہے) اور کہنے لگے کہ ہم اپنی جانوں کو اس وقت تک نہیں کھولیں گے جب تک ہماری توبہ قبول نہ ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہاتھ مبارک سے ہمیں کھول کر آزاد نہ فرمائے۔

ادھر سے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہاں گزر ہوا تو دریافت فرمایا: یہ کون ہیں، اور کیا ماجرا ہے؟ جب لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صورت حال بتادی، تو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم! میں بھی انہیں نہیں کھولوں گا جب تک کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو کھولنے کا حکم نہ ہوگا، اب مجھے اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار ہے، جیسا حکم ہوگا ویسا عمل کروں گا، اس پر یہ آیت:

﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا﴾ نازل ہوئی، اور ان کی توبہ قبول ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو کھول دیا، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اچھے اعمال کئے اور ترکِ جہاد کے گناہ کا بھی ارتکاب کیا، اور اخلاص کے ساتھ توبہ کی، اور اپنے گناہ اور غلطیوں کا اعتراف واقرار بھی کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معافی دینے کا حکم جاری فرمایا۔

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ﴾ عنقریب ان کی توبہ قبول فرمائے گا، چنانچہ ان کی توبہ قبول ہوگئی۔

جب ان لوگوں کی توبہ قبول ہوگئی تو وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوگئے اور عرض کیا کہ ہمارے پاس جو یہ اموال ہیں انہی اموال نے ہمیں پیچھے ڈالا، اور جہاد کی شرکت سے روکا، لہٰذا ہم ان اموال کا صدقہ کردیتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے اموال میں سے کچھ لینے کا حکم نہیں ہوا (یہ ہے نبوت کی شانِ عالی) اس پر یہ آیت: ﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾ نازل ہوئی، کہ آپ ان کے اموال میں سے صدقہ لے لیجئے، جس کے ذریعہ آپ ان کو پاک اور صاف کردیں۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توبہ کی قبولیت سے تطہیر اگرچہ ہوگئی، لیکن گاہے گناہ کی ظلمت وکدورت کا اثر باقی رہ جاتا ہے، اور اگرچہ اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن اس سے آئندہ اور گناہوں کے پیدا

ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، پس صدقہ جو تطفي غضب الرب ہے، اور دیگر اعمالِ صالحہ سے عموماً یہ ظلمت اور کدورت رفع ہو جاتی ہے۔[بیان القرآن]

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ اور آپ ان کیلئے دعاء کیجئے، بلاشبہ آپ کی دعاء ان کیلئے اطمینانِ قلب کا ذریعہ ہے۔ سرورِ عالم ﷺ کی دعاء امت کے جن جن طبقات یا افراد کیلئے ہو اس کے فیوض و برکات سے وہ طبقے اور وہ افراد قیامت تک محظوظ و مستفید رہیں گے، آپ ﷺ نے اپنی امت کے بہت سے طبقات کیلئے دعا فرمائی، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں شامل فرمائے۔ آمین

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ شانہ سننے والا جاننے والا ہے انہیں اچھے، اور بُرے سب کا علم ہے۔

﴿وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا﴾ یہ آیت کریمہ اگرچہ چند خاص افراد کے بارے میں نازل ہوئی، لیکن اس کا حکم قیامت تک آنے والے تمام گناہگاروں کیلئے عام ہے، جو گناہوں میں بھی ملوث رہتے ہیں، اور نیک اعمال بھی کرتے ہیں، کوئی گناہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم میں حائل نہیں ہوتا، جبکہ گناہوں کے ساتھ حسنات بھی ہوں، اور سلسلۂ توبہ بھی جاری ہوں، ایک طرف حسنات اور نیکیاں گناہوں کیلئے کفارہ بنتی رہتی ہیں، اور توبہ بھی توفیق کا ذریعہ بنتی ہیں، اور توبہ تمام کبائر و صغائر کی مغفرت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

پس مؤمن کی شان یہ ہونی چاہئے کہ گناہوں سے حتی المقدور پرہیز کریں، کیونکہ بعض گناہ اتنے خطرناک ہوتے ہیں جو حبطِ اعمال کا سبب بنتے ہیں، اگر کبھی غفلت اور لاپرواہی سے کسی گناہ کا صدور ہو تو فوراً توبہ کرنا ضروری ہے، اگرچہ توبہ بار بار ہو، مگر ضرور ہو کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، اس کو فرمایا:

﴿اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ﴾ اس کا شانِ نزول بتاتے ہوئے تفسیر درمنثور میں لکھا ہے کہ جب ان حضرات کی توبہ قبول ہوگئی جنہوں نے اپنی جانوں کو ستونوں سے باندھا تھا، پھر وہ بے تکلف بغیر کسی شرمندگی کے مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے لگے، اس پر منافقین نے کہا کہ کل تک تو یہ لوگ اسی حال میں تھے جس میں ہم لوگ ہیں، نہ ان سے کوئی بات کرتا تھا، اور نہ ان کے پاس کوئی شخص بیٹھتا تھا، آج کیا ہوا کہ سب مسلمان ان سے خوش ہیں اور ہم سے بدستور ناراض ہیں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:

﴿اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ﴾ نازل فرمائی کیا انہیں معلوم نہیں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے؟ اور صدقات قبول فرماتا ہے؟ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے، رحم کرنے والا

ہے۔اس میں منافقوں کو جواب دیدیا کہ تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ کل تک یہ لوگ ہماری طرح تھے، اور آج ان کی شان ہی کچھ اور ہے، اور ہم سے مختلف ہیں، اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے، یہ پہلے سے مخلص اور مؤمن تھے، اور اپنی بغیر عذر غیر حاضری پر پریشان تھے، پھر انہوں نے توبہ بھی کی، اور صدقہ بھی دیدیا، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کے طالب ہوئے۔

اور تم وہی اپنے نفاق پر جمے ہوئے برقرار اور نافرمان ہو، تمہارے دلوں میں ایمان نہیں، اور اپنے کئے پر کوئی پشیمانی نہیں، پس تم ان جیسے کیسے ہو سکتے ہو؟ یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ فجار متقین کے ساتھ برابر ہوں۔

﴿وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ﴾ اور عنقریب ایسی ذات پاک کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ظاہر اور باطن اور پوشیدہ تمام اعمال، اور اقوال اور نیتوں کو جاننے والا ہے، وہ بتادے گا جو تم نے کیا، اور سوچا اور ارادہ کیا، اسے ہر مؤمن اور ہر کافر اسی طرح دوست و دشمن سب کا پتہ ہے۔

❁ ❁ ❁

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿١٠٦﴾

ترجمہ: اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حکم آنے تک مؤخر کیا ہوا ہے، وہ انہیں عذاب دے یا ان کی توبہ قبول فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ علیم ہے، حکیم ہے ﴿١٠٦﴾

معارف ومنازل

اس آیت میں ان تین حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بیان ہے جو بلا عذر غزوۂ تبوک میں جانے سے رہ گئے تھے، انہیں اس پر ندامت بھی تھی اور سچائی کے ساتھ انہوں نے عرض کردیا تھا کہ ہم واقعۃً بلا عذر رہ گئے، لیکن ان لوگوں کی طرح سے توبہ کیلئے پیش بھی نہ ہوئے جنہوں نے اپنی جانوں کو ستونوں سے باندھ دیا تھا، یہ کُل تین آدمی تھے، یعنی ان مجموعی دس میں سے: (۱) کعب بن مالک رضی اللہ عنہ (۲) مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہ (۳) ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ تھے۔

سرور عالم ﷺ نے انہیں فرمایا: اب جاؤ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائیں گے اسی پر عمل ہوگا، پھر تمام لوگوں سے یہی کہا گیا کہ ان تینوں میں سے کسی کے ساتھ کسی قسم کا دعا و سلام نہ کریں، اور ان سے مکمل سوشل بائیکاٹ کرلیں، چنانچہ یہ سلسلہ پچاس دن تک متواتر جاری رہنے کے بعد ان کو معافی مل گئی، آئندہ رکوع میں

آنے والا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: اور جن لوگوں نے اس لئے مسجد بنائی کہ ضرر پہنچائیں، اور کفر اختیار کئے رہیں، اور مؤمنین کے درمیان پھوٹ ڈالیں، اور اس شخص کے قیام کا انتظام کریں جس نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جنگ کی، اور البتہ وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو صرف بھلائی ہی کا ارادہ کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بیشک وہ جھوٹے ہیں ﴿۱۰۷﴾ آپ اس مسجد میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، البتہ جس مسجد کی بنیاد پہلے ہی دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہو وہ اس لائق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں، اس میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو دوست رکھتا ہے ﴿۱۰۸﴾ کیا پھر ایسا شخص بہتر ہے جس نے اس (مسجد) کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے تقویٰ اور اس کی خوشنودی پر رکھی، یا وہ بہتر ہے جس نے اس کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارہ پر رکھی ہو، جو گرنے والی ہو؟ پھر وہ اسے لے کر دوزخ کی آگ میں گر پڑے، اور اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۰۹﴾ انہوں نے جو عمارت بنائی وہ ہمیشہ ان کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی، اِلَّا یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں، اور اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، حکمت والا ہے ﴿۱۱۰﴾

معارف ومنازل

منافقین کی بڑی مکاری اور مسجد ضرار کی تعمیر و بناء:

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ان آیات کا شان نزول بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے قبیلہ بنوخزرج میں سے ایک شخص (جسے ابو عامر کہا جاتا تھا) زمانہ جاہلیت میں نصرانی بن گیا تھا، وہ راہب تھا، اور عبادت گزار تھا، اس نے اہل کتاب سے علم بھی حاصل کیا تھا، قبیلہ خزرج میں اس کی بڑی اہمیت تھی، جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے اور اسلام کا کلمہ بلند ہو گیا، تو اس ملعون کو بہت ہی ناگوار ہوا، اور جیسے منافقین نے اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا اسی طرح ابو عامر ملعون بھی اسلام دشمنی میں مبتلا ہوا، اور مدینہ سے بھاگ کر مکہ مکرمہ پہنچ گیا، وہاں اس نے مشرکین مکہ کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت پر ابھارا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرنے پر آمادہ کیا، جس کی وجہ سے وہ لوگ دیگر قبائل کے ساتھ مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کے لیے آگئے، اور اس کے نتیجے میں اُحد کا معرکہ پیش آیا۔

کہتے ہیں کہ اسی لعین نے وہاں چند گڑھے کھود دیئے تھے جن میں سے ایک میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گر پڑے تھے، اور زخمی ہو گئے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی ہوا، اور دندان مبارک شہید ہو گیا۔ اس کی تفصیل سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔

جب غزوۂ اُحد میں مؤمنین اور کافرین کا مقابلہ شروع ہوا تو ابو عامر اپنی قوم یعنی انصار کی طرف آگے بڑھا، اور ان کو اپنی مدد کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی، ان حضرات نے اسے بہت بُرا کہا، اور اس سے کہا کہ تو اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے، اور اس کی بات ماننے سے انصار نے صاف انکار کر دیا، اور اس کا ساتھ نہیں دیا۔

تفسیر ابن کثیر اور معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ ملعون ابو عامر (جو حضرت حنظلہ غسیل الملائکۃ کا باپ تھا) زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا، اور اس نے رہبانیت اختیار کر لی تھی، ٹاٹ کے کپڑے پہنا کرتا تھا، جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے تو ابو عامر نے دریافت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کونسا دین لے کر آئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ملّت حنیفیہ، یعنی حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی ملّت لے کر آیا ہوں۔ ابو عامر نے کہا: ہم دونوں میں سے جو بھی جھوٹا ہو اللہ تعالیٰ اسے ایسی جگہ موت دے جہاں وہ تنہا ہو، پردیس ہو، دور پھینکا گیا ہو، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آمین فرمایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شخص اپنی بددعا کے مطابق شام میں جا کر مردار ہوا، جہاں کوئی اس کی خبر لینے والا نہ تھا۔

معالم التنزیل میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ابو عامر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ جو لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کریں گے میں ان کے ساتھ مل کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑوں گا، اس کے بعد وہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے دشمنوں سے مل کر برابر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں آتا رہا، اور غزوۂ حُنین تک اس نے اس پر عمل کیا، جب غزوۂ حُنین میں قبیلہ ہوازن کو شکست ہوگئی تو یہ ملعون ناامید ہوگیا، اور ملک شام کی طرف فرار ہوکر بھاگ نکلا، وہاں سے اس نے مدینہ کے منافقین کو پیغام بھیجا کہ جہاں تک ممکن ہو قوت اور سلاح وہتھیار جمع کرلو، اور میرے لئے اپنے پڑوس میں ایک مسجد بنالو، میں قیصر روم کے پاس جارہا ہوں، جو بڑا بادشاہ ہے، میں رومیوں کا لشکر لے کر آؤں گا، اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کو مدینہ سے نکال دوں گا، اس کا پیغام آنے پر مسجد قباء کے قریب ہی مسجد ضرار بنائی گئی۔ [معالم وابن کثیر]

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا:

چونکہ اس وقت یعنی غزوۂ تبوک تک مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا غلبہ ہوچکا تھا، جس کی وجہ سے منافقین ظاہر میں اسلام قبول کرچکے تھے، اور وہ کھلم کھلا اسلام کی مخالفت نہیں کرسکتے تھے، ہاں! مخفی طور پر ابوعامر ملعون کے کہنے پر اندرونی سازشوں میں لگے ہوئے تھے، چنانچہ اسی کے کہنے پر انہوں نے مسجد ضرار بنائی، جب وہ ہر طرح مطمئن ہوگئے تو تبوک جانے سے پہلے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوکر اس ابلیسی مسجد میں تبرک کے بہانہ عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک وقت اس میں نماز ادا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس وقت میں بہت مصروف ہوں واپسی پر سوچوں گا، چنانچہ یہ مسئلہ التواء کی نذر ہوگیا۔

تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ منافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں اس لئے حاضر ہوئے اور مسجد کی بات کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ اس میں نماز ادا فرمالیں، اور مقصد ان کا یہ تھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں نماز پڑھ لیں گے تو مسلمانوں کو اس کے مسجد ہونے کا یقین ہوجائے گا، اور وہ کسی طرح کا شک وشبہ نہیں کریں گے۔ یہ مسجد نہیں بلکہ اور کوئی چیز ہے، اور ان لوگوں نے حلفیہ طور پر کہا کہ یہ مسجد ہم نے ضعیف اور بیمار لوگوں کیلئے بنائی ہے، تاکہ سردی اور بارشوں میں یہ لوگ بجائے مسجد قباء کے قریب ہی نماز پڑھ سکیں، انہیں دور مسجد قباء تک نہ جانا پڑے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صورت حال کا صحیح علم چونکہ نہ تھا، اس لئے ارشاد فرمایا کہ اس وقت تو ہم سفر پر جارہے ہیں، جب واپس آجائیں گے تو ان شاء اللہ تمہاری فرمائش پوری کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک کے سفر پر تشریف لے گئے، جب وہاں سے واپس ہوئے تو مدینہ منورہ پہنچنے میں ابھی ایک دن یا اس سے کم مسافت باقی تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے، اور انہوں نے خبر دے دی کہ یہ مسجد، مسجدِ ضرار ہے، جس کا مقصد اسلام اور مسلمان کو نقصان

دینااور کفر ونفاق کو مضبوط کرنا ہے، اور مؤمنین کی جماعت میں تفریق وانتشار پیدا کرنا ہے، کہ جولوگ مسجد قباء میں نماز پڑھتے ہیں ان کی جماعت کے کچھ لوگ اس مسجد ضرار میں آنے لگیں، اور انہیں یہ منافق رفتہ رفتہ شکار کرکے اپنے ڈھنگ میں ڈالتے رہیں۔

آنحضرت سرورعالم ﷺ ابھی مدینہ منورہ پہنچے بھی نہ تھے کہ راستہ ہی سے آپ ﷺ نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو روانہ فرمایا کہ اس مسجد ضرار کی جا کر خبر لو، وہ پہنچے اور مسجد ضرار کو آگ لگادی، اور تباہ کیا۔ جن حضرات نے یہ کام انجام دیا وہ حضرت مالک بن دخشم اور حضرت معن بن عدی رضی اللہ عنہما تھے۔ بعض حضرات نے معن کے بھائی حضرت عامر بن عدی رضی اللہ عنہ کا بھی نام لیا ہے۔

معالم التنزیل میں ہے کہ سرورعالم ﷺ نے مسجد ضرار کو جلانے کا حکم دے کر یہ بھی حکم دیا تھا کہ اسے کوڑا (کچرہ دان) ڈالنے کی جگہ بنالیا جائے، جس میں مردہ جانور اور بدبودار چیزیں ڈالی جایا کریں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسجد ضرار کے بنانے والے بارہ آدمی تھے، اور ان منافقین کے نام بھی انہوں نے لکھے ہیں۔

جب ان لوگوں کا راز کھل گیا تو اپنی مسترہ عادت کے مطابق جھوٹی قسمیں کھانے لگے، اور کہا:

﴿اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی﴾ کہ ہم نے صرف خیر ہی کا ارادہ کیا تھا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی، ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ اور کائنات کا ربّ علیم بذات الصدور عزّ سبحانہ گواہی دیتا ہے کہ بلا شبہ وہ جھوٹے ہیں، اسلام اور مسلمانوں اور مسجد قباء کو ضرر دینا اور کفر پر جمے رہنا، اور اہل ایمان میں تفریق ڈالنا، ان کے اتحاد میں رخنہ ڈالنا، اور اس منحوس شخص ابو عامر کیلئے سامان فراہم کرنا، جس نے مختلف محاذوں پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کی ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا:

﴿لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا﴾ آپ اس میں کبھی کھڑے نہ ہوں۔ یہ خطاب آپ ﷺ کو اصالۃً ہے، اور تبعاً ساری امت کو شامل ہے، قیامت تک جہاں کہیں اس قسم کی مسجد بنے گی جس کا مقصد مسلمانوں میں انتشار وتفریق ہو اس میں نماز جائز نہیں ہوگی، تو حکم عام رہے گا۔ ارشاد فرمایا:

﴿لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ﴾ البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے تقویٰ پر ڈالی گئی وہ اس کی زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس سے مسجد قباء مراد ہے، جسے سرور

عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچ کر بنوائی تھی۔ سفر ہجرت کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند دن قباء میں قیام فرمایا انہی دنوں میں یہ مسجد تعمیر فرمائی، اسلام کی تاریخ میں یہ سب سے پہلی مسجد ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوار ہو کر اور کبھی پیدل چل کر شہر مدینہ سے اس مسجد میں تشریف لایا کرتے تھے۔ [بخاري ومسلم]

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ مسجد بنائی تو حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کا قبلہ متعین کر کے بتادیا تھا۔ اس مسجد کی یہ فضیلت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس میں نماز پڑھنا عمرہ کرنے کے برابر ہے، یہ مسجد نبوی سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ [ترمذي]

﴿فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾ اس میں ایسے لوگ ہیں جو یہ پسند کرتے ہیں کہ خوب پاکی حاصل کریں، اور اللہ تعالیٰ خوب پاکی حاصل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ حضرت ابوایوب، حضرت جابر اور حضرت انس رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے انصار کی جماعت! بیشک اللہ تعالیٰ نے پاکی اختیار کرنے کے بارے میں تمہاری تعریف فرمائی ہے، تو بتاؤ تمہاری پاکیزگی کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ہم نماز کیلئے وضو کرتے ہیں، اور جنابت ہو جائے تو غسل کرتے ہیں، اور پانی سے استنجاء کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہی بات ہے، لہٰذا تم اس کے پابند رہو۔ [أبو داؤد، ابن ماجة، كذافي المشكوٰة]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ روایت مسند بزار میں بھی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ ہم پہلے پتھروں سے استنجاء کرتے ہیں، پھر پانی سے دھوتے ہیں۔

﴿وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾ جب ظاہری پاکی حاصل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے تو باطنی پاکی حاصل کرنے والے بطریق اولیٰ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوں گے۔ دراصل طہارت خواہ ظاہری ہو یا باطنی یعنی گناہوں سے بچنا ہو، صرف اور صرف مسلمان کی خصوصیت اور اس کی شان ہے، اسی لئے طہارت ایمان کا ایک حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہمیشہ باوضوء اور پاکیزگی کے ساتھ رہتے ہیں، اس طرح انہیں فرشتوں کے ساتھ مناسبت پیدا ہو جاتی ہے، جو بہت بہتر ہے۔

﴿أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ﴾ پھر کیا ایسا شخص بہتر ہے جس نے اپنی مسجد کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے خوف وتقویٰ اور اس

کی خوشنودی پر رکھی، یا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی یعنی غار کے کنارے پر جو کہ گرنے ہی کو ہو، پھر وہ عمارت اپنے بنانے والے کو لے کر دوزخ کی آگ میں گر پڑی۔ شَفَا کے معنی ہیں: شفیر بمعنی کنارہ کے۔ ﴿وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا﴾ [آل عمران: ۱۰۳] (تم جہنم کے گڑھے کے کنارے پر تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں وہاں سے نکالا)۔

جُرُف کھائی، جُرف دریا یا ندی کے اس کنارے کو کہتے ہیں جو پانی کی وجہ سے نیچے سے کاٹا گیا ہو، اور اوپر مٹی کھڑی ہو، اور نیچے سے خالی ہو۔ یہ کنارہ اتنا کمزور ہے کہ معمولی دباؤ سے گر پڑتا ہے، تو ظاہر ہے کہ جو عمارت اس قدر کمزور جگہ پر بنائی جائے وہ فوراً گر جائے گی۔ تو مطلب یہ ہے کہ مسجد ضرار کی مثال ایسی عمارت کی ہے جو کمزور ترین کنارے پر بنائی گئی ہو، جو گرنے والی ہو، اور جس کے مُنہدم ہونے کا ہر وقت خطرہ ہو۔

﴿فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ﴾ پھر وہ اپنے بنانے والے کو بھی جہنم کی آگ میں لے گرے گی، تو فرمایا: یہ مسجد اچھی ہے جس کی بنیاد تقویٰ اور رضائے الٰہی پر ہے، یا وہ اچھی ہے جو گرنے کے قریب ہے اور وہ اپنے بنانے والے کو بھی لے ڈوبے گی، اور جہنم پہنچائے گی۔ پس یہ ظاہر ہے کہ مسجد وہی بہتر ہے کہ جس کی تعمیر میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی شامل ہو، پس اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا، کیونکہ عمداً ظلم کرنے والا ہدایت سے محروم رہے گا۔

﴿لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً﴾ ان کی تعمیر کردہ عمارت ہمیشہ ان کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی، انہیں اس بات کا کھٹکا اور غم لگا رہے گا کہ ہم نے تو کچھ اور سکیم بنائی تھی، مگر ہوا کچھ اور، ہمارے منصوبے خاک میں مل گئے، وہ ہمیشہ اسی سوچ میں گھلتے رہیں گے۔

﴿اِلَّا اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ﴾ مگر یہ کہ ان کے دل پارہ پارہ ہو جائیں، یعنی وہ مر جائیں، گویا مرتے دم تک ان کے دل میں کھٹکا موجود رہے گا، حتی کہ جہنم پہنچ جائیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے، وہ مالک الملک اخلاص و تقویٰ کو بھی جانتا ہے، اور نفاق و سازش کو بھی۔

فائدہ:

اس مسجد ضرار کی جگہ ایک صحابی حضرت ثابت بن اقرم رضی اللہ عنہ نے مکان بنایا، مگر ہوا یہ کہ جب سے ثابت رضی اللہ عنہ اس مکان میں مقیم ہوئے ان کا کوئی بچہ نہیں ہوا، یا زندہ نہیں رہا، اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ انسان تو کیا اس جگہ میں کوئی

مرغی بھی بچے اور انڈے دینے کے قابل نہ رہی، کوئی کبوتر اور جانور بھی اس میں پھلا پھولا نہیں، چنانچہ اس کے بعد سے یہ جگہ آج ہمارے زمانہ تک مسجد قباء کے قریب ویران پڑی ہوئی ہے۔

.......❁.......❁.......❁.......

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ
وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے مؤمنین سے اس بات کے عوض ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا کہ ان کیلئے جنت ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتے ہیں، جس میں قتل کرتے ہیں، اور قتل کردیئے جاتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، جو تورات، انجیل اور قرآن میں ہے، اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟ سو تم لوگ اپنی اس بیع پر خوش ہو جاؤ جس کا تم نے معاملہ کیا ہے، اور یہ بڑی کامیابی ہے ﴿۱۱۱﴾ یہ لوگ توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، حمد کرنے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، رکوع کرنے والے ہیں، سجدہ کرنے والے ہیں، اچھی باتوں کا حکم دینے والے ہیں، اور بری باتوں سے منع کرنے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور آپ مؤمنین کو خوشخبری سنا دیجئے ﴿۱۱۲﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں جہاد سے بلا عذر رُکنے کی مذمت، اور مسجد ضرار جو کہ منافقین کی شرارت کا ایک عنصر تھا اس کا بیان ہوا، اب ان آیات میں مجاہدین کی فضیلت اور ان کی صفات کا تذکرہ ہے جو کہ دس صفات ہیں۔

تفسیر ابن کثیر، معالم اور مظہری وغیرہ میں ہے کہ یہ آیات بیعتِ عقبہ کے شرکاء کے متعلق نازل ہوئی ہیں، جو ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں انصارِ مدینہ سے لی گئی تھی۔ عقبہ پہاڑ کے حصہ اور وادی کا نام ہے، جہاں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبل از ہجرت تین اوقات میں انصارِ مدینہ سے بیعت لی تھی۔

پہلی بیعت بعثتِ نبوی کے گیارہویں سال ایّامِ حج میں ہوئی، جس میں چھ حضرات مسلمان ہوکر بیعت کر کے مدینہ منورہ واپس ہوئے، تو مدینہ کے گھر گھر میں حضور ﷺ اور اسلام کا چرچا ہونے لگا، اگلے سال پھر موسمِ حج میں اسی مقام پر مدینہ کے بارہ حضرات جمع ہوئے، اور بیعت کی، یہ عقبہ ثانیہ کے نام سے، اور پہلی بیعت عقبہ اُولیٰ کے نام سے مشہور ہوئی۔

ان بارہ افراد میں پانچ عقبہ اولیٰ کے تھے، اور سات افراد نئے تھے، اس کے ساتھ اب مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہوگئی، جو تقریباً چالیس سے زائد تھی، پھر انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں قرآن پڑھانے کیلئے کوئی قاری بھیج دیا جائے، سید الانبیاء ﷺ نے حضرت مُصعب بن عمیر اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہما کو ان کے پاس روانہ فرمایا، انہوں نے لوگوں کو قرآن بھی پڑھایا، اور وہاں اسلام کی تبلیغ بھی جاری رکھی، جس سے بہت لوگ مسلمان ہوئے۔

اس کے بعد بعثتِ نبوی کے تیرہویں سال موسمِ حج میں اسی مقام عقبہ میں ستر ۷۰ افراد مرد اور دو عورتیں خوش نصیب جمع ہوگئے، یہ تیسری بیعتِ عقبہ ہے، جو آخری ہے، اور عموماً مطلق بیعتِ عقبہ سے یہی آخری مراد ہوتی ہے، یہ بیعت اسلام کے اصولی عقائد اور اعمال کے ساتھ خصوصی طور پر کفار و مشرکین کے ساتھ جہاد کے متعلق ہے، اور جب سرورِ عالم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئیں گے تو انصار جان و مال کی قربانی پیش کریں گے، اور آپ ﷺ کی حفاظت پر کمر بستہ رہیں گے، اور آپ ﷺ کی سرپرستی میں دشمنانِ اسلام سے جہاد کریں گے، نیز ہر کام اور معاملہ میں جان نثاری کے ساتھ آپ ﷺ کے حکم پر لبیک کہیں گے، اور آپ ﷺ کا ساتھ دیں گے۔

اس موقع پر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس وقت معاہدہ ہو رہا ہے، آپ جو شرائط اپنے ربّ کے متعلق اور اپنے بارے میں اور دینِ اسلام کے بارے میں چاہیں گے وہ سب واضح فرمائیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنے ربّ کے متعلق یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم اس کو واحد اور لاشریک مان کر اس کی عبادت کروگے، اور کسی کی بھی عبادت نہیں کروگے، اور اپنے لئے یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم میری حمایت و حفاظت اس طرح کروگے جیسے تم اپنی جانوں اور اولاد اور اموال کی حفاظت کرتے ہو۔

ان حضرات نے دریافت کیا کہ اگر ہم لوگ یہ شرطیں پوری کردیں تو ہمیں ان کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہیں جنت ملے گی، ان سب حضرات نے خوش ہوکر کہا کہ ہم اس سودے پر راضی ہیں، اور

یہ بہت نفع کا سودا ہے، ہم اس معاملہ کو فسخ نہیں کریں گے، اور فسخ نہیں ہونے دیں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی (پوری سورت مدنی ہے، یہ دونوں آیتیں مکی ہیں)۔

چونکہ آیت کریمہ میں ظاہری الفاظ بیع وشراء کے مذکور ہوئے تو ایک اعتبار سے اس پر لین دین کا اطلاق ہوا، جس کے متعلق انہوں نے کہا کہ قابلِ فسخ واقالہ نہیں ہے، یہ آیت سن کر سب سے پہلے حضرت براء بن معرور، ابوالہیثم اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہم حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اپنے ہاتھ رکھ کر بڑے جذباتی انداز میں محبت وشوق کے ساتھ کہنے لگے کہ ہم ہر معاملہ پر تیار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت اپنی جانوں اور بچوں اور مالوں سے زیادہ کریں گے، بلکہ یہ سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کریں گے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر دنیا کے کالے گورے جمع ہو جائیں تو ہم سب کے ساتھ لڑیں گے، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے وہ قربانی دیں گے جس کی نہ نظیر ہو اور نہ مثال۔ رضي الله عنهم أجمعين

فائدہ:

یہ وہ لوگ تھے جو باپ دادوں سے بت پرست کفار تھے، ابھی ابھی تازہ مسلمان ہوئے، پھر جو پیشکش کی اسے پوری کر کے دنیا کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا (رضي الله عنهم) صد افسوس ہمارے موروثی مسلمان حضرات کے لیے! ہر شخص اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے کہ اس کے باطن میں کیا کچھ ہے۔ واللہ اعلم

فرضیتِ جہاد کی سب سے پہلی آیت کریمہ یہی ہے:

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کی قلت اور اسباب ووسائل کے فقدان کی وجہ سے جہاد وقتال کے احکام نہیں تھے، یہ آیت پورے قرآن کریم میں سب سے پہلی آیت ہے جو مکہ مکرمہ ہی میں قتال کے متعلق نازل ہوئی، اور اس پر عمل ہجرت کے بعد شروع ہوا، اور اس کے بعد سورۂ حج کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا۟﴾ [الحج: ٣٩] (جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے انہیں اجازت دی جاتی ہے)۔

جب یہ بیعتِ عقبہ کفار قریش سے خفیہ مکمل ہوگئی، تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیدیا، اور یہ سلسلہ تدریجی طور پر جاری رہا، وقتاً فوقتاً ہجرت کرتے رہے، تاکہ کفارِ مکہ کو صورت حال کا علم نہ ہو سکے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملنے کے منتظر رہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی رفاقت کیلئے روک لیا،

اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو تقریباً بیس ساتھیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے نکلنے کی اجازت دیدی گئی، اس کے بعد قریش کا دارالندوۃ میں اجتماع ہوا، جس میں شیخ نجدی کی صورت میں ابلیس بھی آیا، اور شامل ہوا، تفصیل گزر چکی ہے۔ اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کی اجازت مرحمت فرمائی۔

﴿اِنَّ اللهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا کرم اور انعام ہے کہ جان اور مال سب اسی کا دیا ہوا ہے، پھر بھی اس نے اس کا نام خریداری رکھ دیا۔ ماں کے پیٹ سے خالی ہاتھ پیدا ہونے والا انسان کسی چیز کا مالک نہیں، یہاں تک وہ اپنی جان تک کا مالک نہیں، اگر اللہ تعالیٰ جان و مال خرچ کرنے کا حکم دیدے، اور اس کی راہ میں یہ مال بھی چلا جائے، اور جان بھی مقتول ہو جائے، تو وہ مالک ہے، یہ اسی کا حق ہے، مگر کرم یہ فرمایا کہ اپنی مملوک وملکیت کے بدلے میں جنت کا وعدہ فرمایا، اس کا یہ وعدہ اٹل اور پختہ ہے۔

اور پھر یہ چیز بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس بے مثال عالیشان جنت کے مقابلہ میں یہ معمولی بے قیمت جان کی کوئی حیثیت نہیں، جیسے پہاڑوں کے برابر موتی اور جواہرات کے مقابلہ میں مٹھی بھر مٹی کی حیثیت، کیونکہ اگر کوئی انسان دوسرے انسان کو قتل کر کے اس کی جان تلف کرتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اس جان کی قیمت یعنی دیت اور خون بہا دس ہزار درہم مقرر ہوتا ہے، جس کی مالیت ہمارے زمانے میں بمشکل چار لاکھ روپیہ ہوتی ہے (۲۰۲۰ء میں یہ مالیت تقریباً بیس لاکھ تک پہنچ چکی ہے)، تو یہ ہے انسانی جان کی قیمت جسے ربّ العزّت نے بڑھا چڑھا کر جنت کی قیمت بنا دیا، اور اپنی دی ہوئی کم قیمت جان کے عوض میں ابدی جنت عطا فرمائی۔ ؎

جان بھی دی ہوئی اسی کی ہے☆حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس لئے فرمایا کہ اس بیع وشرا پر تم جتنی خوشی مناؤ پھر بھی کم ہے، اس لئے مبیع اور ثمن میں نہ کوئی مناسبت ہے، اور نہ کوئی برابری۔ شاعر نے کہا: ؎

یک جان بستاند وصد جان دہد☆ ہر چہ در وہمت نیاید آن دہد

ایک جان لے لیتا ہے اس کے عوض سو جان دیدیتا ہے، تمہارے وہم وگمان میں جو نہ آئے وہی دیتا ہے۔ جنت کی ایک بالشت زمین پورے جہاں پر بھاری ہے، پھر جنت کے محلات، مساکن طیبہ، جنت کی حوریں اور بکھرے موتیوں کی طرح غلمان وخدام، اور مزید لطف وکرم کے نظارے ربّ العزّت کی زیارت۔ اللہ اکبر

﴿فَيَقۡتُلُوۡنَ وَيُقۡتَلُوۡنَ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال وجان سے جہاد کرنے والے قتال کرتے ہیں، پھر کبھی کافروں کو قتل کرتے ہیں، اور کبھی خود دائمی ابدی زندگی کی تحصیل میں جامِ شہادت نوش کرتے ہیں۔ مؤمن کیلئے یہ دونوں حالتیں خیر وسعادت کا پیغام ہیں۔ اور بعض مجاہدین کو دونوں باتیں نصیب ہوتی ہیں، اولاً کافروں کو قتل کرتے ہیں، ثانیاً پھر خود مقتول ہوجاتے ہیں، پھر فرمایا:

﴿وَعۡدًا عَلَيۡهِ حَقًّا فِي التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ﴾ یہ اتنا پکا وعدہ ہے کہ کبھی بھی اس کا خلاف نہیں ہوگا، یہ وعدہ تمام آسمانی کتابوں میں بڑی پختگی کے ساتھ درج ہے، یہ توریت میں، انجیل میں اور قرآن کریم میں بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ اگر تورات وانجیل کے احبار ورُہبان نے تحریف کر کے ایسی چیز کو غائب کردیا ہو تو کوئی بات نہیں، قرآن حکیم نے صحیح نشاندہی فرمائی، اور قرآن پاک رہتی دنیا تک نا قابلِ تنسیخ ابدی کتاب ہے، جس کی ہدایات سے قیامِ قیامت تک راہنمائی حاصل ہوتی رہے گی، اور مجاہدین اس سے ہدایات حاصل کرتے رہیں گے، وہ ہر طرح کے مٹنے اور مٹانے سے منزہ و پاک رہے گا۔ اِن شاء اللہ

﴿وَمَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ شانہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ کو پورا کرنے ولا اور کون ہے؟ یہ استفہامِ انکاری ہے، یعنی کوئی نہیں، وعدہ خلافی عیب ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے، منزہ ہے، اور وعدہ کا پورا کرنا کرم ہے، اور یہ ربّ العزّت کی مخصوص ذاتی صفت ہے۔

﴿فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَيۡعِكُمُ الَّذِيۡ بَايَعۡتُمۡ بِهٖ﴾ پس تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ طے کیا ہوا ہے خوشی مناؤ، کیونکہ تم نے زوال پذیر ادنیٰ چیز کو دے کر قیمتی اور ابدی جنت خریدی ہے، جیسے کوئی مٹی کے عوض پہاڑوں کے برابر جواہرات خرید لے، اس سے بڑھ کر شاید خوشی کا اور سودا شاید ممکن نہ ہو۔

اس کے بعد مؤمنین کی صفات بتائیں، یہ صفات کُل دس ہیں، مگر ان میں پہلی صفت جو کہ جہاد ہے اس کا بیان ہوگیا، باقی نو صفات یہ ہیں:

﴿اَلتَّآئِبُوۡنَ﴾ یعنی وہ لوگ جو شرک سے تائب اور نفاق سے پاک ہوگئے، یہ سارے معطوفات مبتداء ہوں گے، اور خبر محذوف ہوگا، یعنی اَلتَّائِبُوۡنَ وَمَنۡ ذَكَرَ مَعَهُمۡ هُمۡ اَهۡلُ الۡجَنَّةِ اَيۡضًا، یعنی جس طرح مجاہدین کیلئے جنت کا وعدہ ہے اسی طرح دوسرے اہل ایمان کیلئے بھی جنت کا وعدہ ہے، جو کہ مذکورہ صفات سے مُتّصف ہوں، یا اس طرح ترکیب ہو کہ مؤمنون مبتداء محذوف ہو، اور یہ معطوفات اس کی خبر ہوں، اور الف لام جو ان پر داخل ہے بمعنی

اَلَّذِيْنَ کے ہوں جیسے سورۂ بقرہ میں اَلْمُتَّقِيْنَ کی تفسیر وبیان اَلَّذِيْنَ کے ساتھ ذکر فرمائی گئی: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ [البقرة:٢] (ہدایت کا ذریعہ پرہیزگاروں کے لئے، وہ لوگ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں)۔تو یہاں عبارت اس طرح ہوگی: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ هُمُ الَّذِيْنَ تَابُوْا وَهُمُ التَّائِبُوْنَ وَهُمُ الْعَابِدُوْنَ۔یعنی مؤمنین وہ ہیں جن کی یہ صفات ہیں کہ وہ توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے ہیں، وغیرہ۔

﴿الْعٰبِدُوْنَ﴾ عبادت کرنے والے، ﴿الْحٰمِدُوْنَ﴾ حمد کرنے والے، ﴿السَّآئِحُوْنَ﴾ روزہ رکھنے والے۔ یہ معنی حضرت ابن مسعود حضرت، ابن عباس رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں۔حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس سے مراد مجاہدین ہیں۔حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس سے مراد طالب علم ہیں، جو علم حاصل کرنے کیلئے سفر کرتے ہیں۔اگر یہ سارے معانی مراد ہوں تو کوئی اشکال نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدّ وجہد کرنے والے سارے ﴿السَّائِحُون﴾ کہلائیں گے۔واللہ اعلم

﴿الرّٰكِعُوْنَ﴾ رکوع کرنے والے، ﴿السّٰجِدُوْنَ﴾ سجدہ کرنے والے، ﴿الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ بھلائیوں کا حکم دینے والے، ﴿وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور برائیوں سے روکنے والے، ﴿وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ قوانین وضوابط اور احکامِ شرعیہ جو بندہ اور پروردگار کے درمیان شرع نے قائم کیے ہیں، ان کی نگہداشت کرنے والے۔بعض علماء نے لکھا ہے کہ اَلْحٰفِظُوْنَ کو مستقل طور پر حرف عطف (واوٌ) کے ساتھ ذکر کرنے سے اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ پہلے جن اعلیٰ خصائل کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے ان کا اجمالی مجموعہ حفظ حدود اللہ ہے، وہ تفصیل تھی، یہ اجمال ہے، اس اجمال میں پورے حدود اللہ کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ آپ ایمان والوں کو بشارت دیجئے، یعنی ایمان والے وہ لوگ جن کے اندر مذکورہ صفات ہوں۔یہاں بشارت کا مفعول مذکور نہیں کہ کس چیز کی بشارت دیدو، اس سے اشارہ ہے کہ وہ بہت بڑی اور عظیم نعمت ہے، جو نہ بیان کی جاسکتی ہے، نہ کسی دماغ میں اس کا تصور آسکتا ہے، نہ کسی نے کما حقہ اسے سنا ہے۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا
تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ
وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿١١٤﴾

ترجمہ: نبی کو اور دوسرے مسلمانوں کو یہ جائز نہیں کہ مشرکین کیلئے مغفرت کی دعا کریں، اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں، اس بات کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں ﴿۱۱۳﴾ اور نہیں تھا ابراہیم کا استغفار اپنے باپ کیلئے مگر وعدے کی وجہ سے جو اس کے ساتھ کرلیا تھا، پھر جب ابراہیم پر یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے، تو اس سے بیزار ہوگئے، بیشک ابراہیم بڑے رحم دل، برداشت کرنے والے تھے ﴿۱۱۴﴾

معارف ومنازل

مشرکین کیلئے استغفار کی ممانعت اور تنبیہ:

صحیحین میں لکھا ہے کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدنصیب چچا ابوطالب کی موت کا وقت آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے، وہاں پہلے سے ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ موجود تھے، آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [فداه أرواحنا] نے فرمایا: اے چچا! لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا اقرار کرو اور پڑھو، میں اس کو تمہاری سفارش کیلئے اللہ تعالیٰ سبحانہ کے حضور میں پیش کردوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برابر یہ بات فرماتے رہے، لیکن وہ دونوں شخص جو موجود تھے یعنی ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ، ابوطالب سے کہتے رہے: کیا تم اپنے باپ عبدالمطلب کے دین سے ہٹ رہے ہو؟ بالآخر ابوطالب نے (سب کچھ جاننے کے باوجود) یہ کہہ دیا کہ میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں، اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہنے سے انکار کردیا۔ (پھر اسی پر ابوطالب کو موت آگئی)۔ اور سرور کائنات رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہاری بخشش کیلئے مسلسل اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہوں گا، جب تک مجھے اس سے منع نہ کیا جائے، اس پر اللہ تعالیٰ سبحانہ نے آیت: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ﴾ آخر تک نازل فرمائی۔

سنن الترمذی ابواب التفسیر سورۂ قصص کی آیت کریمہ: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ﴾ [القصص: ٥٦] (آپ ہدایت نہیں دے سکتے جسے آپ پسند کریں) کے تحت لکھا ہے کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب سے فرمایا کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہہ دو، میں قیامت کے دن تمہارے لئے گواہی دوں گا، تو اس پر ابوطالب نے کہا کہ اگر قریش مجھے یہ عار نہ دلاتے کہ گھبراہٹ میں اس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا اقرار کرلیا تو میں اسے پڑھ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کردیتا، (بالآخر انہوں نے کلمہ نہ پڑھا، اور شرک پر ہی ان کی موت ہوگئی)۔

چونکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک میں ان کے ایمان لانے کا بہت بڑا داعیہ اور جذبہ تھا، مگر یہ پورا نہ

ہوا، ﴿وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ [الانسان: ۳۰] (اور تم چاہو گے نہیں جب تک اللہ نہ چاہے)۔

جو لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مختار کل، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ برابر یا اس کا ہمسر و شریک سمجھتے ہیں، ان کا کفر ابو جہل کے کفر سے بھی بدتر ہے، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے چاہنے پر نظامِ عالم قائم ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کے چاہنے سے اگر کچھ ہوتا تو ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے باپ، نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیوی اور بیٹے، لوط علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بیوی، آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیٹے قابیل اور سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام چچے اور پھوپیاں سب جنت میں ہوتے۔

ابو طالب کی قربانیاں اور ان کی خدمات کسی بیان کی محتاج نہیں، بالفرض اگر وہ اسلام قبول کر لیتے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر سبقت لے جاتے، مگر ہوا وہی جو نوشتہ تقدیر میں لکھا تھا۔ حضرت باری تعالیٰ کو کوئی نہ مجبور کر سکتا ہے، نہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی اسے منوا سکتا ہے، ساری مخلوقات اس کے دست نگر اور محتاج ہے، اور وہ سب سے مستغنی ہے۔ پیغمبروں علیہم السلام کی بیویوں کو جہنم میں ڈالنے، اور فرعون کی بیوی کو جنت الفردوس کے حوالہ کرنا یہ اس کے لیے بڑا آسان ہے۔

آنزا بری از صومعہ در دار گبران افگنی ☆ این راکشی از بتکدہ سر حلقہ رندان کنی
چوں و چرا با کار تو عقل زبون را کے رسد ☆ اے قادر مطلق توئی ہر آنچہ خواہی آن کنی

پھر ربّ العزّت سبحانہ کا فرمانِ گرامی اور حکم یہ ہے کہ تمہیں کسی کافر کے لیے استغفار کرنے کی اجازت نہیں، آئندہ کسی مردہ کافر کے لیے نہ استغفار کیا جائے، اور نہ کسی کافر یا منافق کی نماز جنازہ میں شرکت ہو، حتیٰ کہ اس کی قبر پر کھڑے ہونے کی بھی اجازت نہیں۔

علماء سیرت نے ابو طالب کی خدمات اور بے مثال قربانیوں کو جس بسط اور تفصیل سے لکھا ہے، اور انہوں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں جو اشعار کہے ہیں، اگر انہیں غور سے دیکھا جائے، اور مطالعہ کیا جائے تو مجبوراً کہنا پڑے گا کہ وہ مسلمان تھے، مگر محققین علماء کرام نے قرآنی نصوص اور احادیث مبارکہ، خاص کر وہ احادیث جنہیں شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے، کو اگر دیکھا جائے تو فیصلہ یہی کیا ہے کہ یہ سب وقتی تصدیق کے درجہ میں تھے، تسلیم و انقیاد کا بدستور فقدان رہا، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیہ بن صلت کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ اس کے اشعار میں ایمان ہے، مگر قلب اس کا کافر ہے۔

اس آیت کریمہ کے تحت بعض مفسرین نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کریمین رضی اللہ عنہما کے ایمان کا جو مسئلہ چھیڑا، اور بیان کیا ہے، اور چند حدیثی روایات بھی درج کی ہیں اس کا یہ موقع نہیں۔ میرا ذاتی عقیدہ اس بارے میں وہی ہے جسے خاتمۃ الحفاظ والمحدثین حضرت علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے منفرد بے نظیر رسائل "السبل الجلية في الاباء العلية" "نشر العلمين المنيفين فى إحياء الأبوين الشريفين" "التعظيم و المنة في أن الأبوين الكريمين في الجنة" "المقامة السندسية في النسبة المصطفوية" "الدرج المنيفة في الآباء الشريفة" "مسالک الحنفاء في والدي المصطفى صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم"۔ یہ رسائل نافعہ منیفہ نافعہ سب اسی موضوع پر بڑے بلند واعلیٰ محدثانہ علمی معیار پر لکھے گئے ہیں، ہم انہی رسائل کی روشنی میں کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کریمین کا شمار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنے والد کے لیے استغفار کرنا، پھر اس سے بیزار ہونا:

مشرکین کیلئے استغفار کرنے کی ممانعت بیان فرمانے کے بعد فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ﴾ اور ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنے باپ کے لیے استغفار کرنا صرف اس لئے تھا کہ انہوں نے اپنے باپ سے ایک وعدہ کیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے والد کو ایمان کی دعوت دی، توحید کی طرف بلایا، بت پرستی چھوڑنے کیلئے کہا، تو ان کے باپ نے نہ مانا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دھمکی دیدی، کہ اگر تو اپنی بات سے باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کردوں گا، آپؑ نے فرمایا: ﴿سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا﴾ [مریم: ۴۷] (اب میں تمہارے لئے اپنے ربّ سے مغفرت کی درخواست کروں گا، بیشک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے)۔ اس وعدے کے مطابق وہ اپنے باپ کے لیے استغفار کرتے رہے، تا کہ اسے ہدایت نصیب ہوجائے، جیسے سورۂ شعراء میں ہے: ﴿وَاغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾﴾ [الشعراء] (اور میرے باپ کی مغفرت فرما، بیشک وہ گمراہوں میں سے تھا۔ اور مجھے رسوا نہ فرما جس دن لوگوں کو اٹھایا جائے گا)۔ اسی طرح قرآن کریم میں مختلف مقامات پر استغفار کا تذکرہ ہے، یہ جتنے استغفارات تھے یہ سب اس بناء پر تھے کہ شاید اسے ہدایت نصیب ہو۔

﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ﴾ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرا باپ خدا کا دشمن ہے، اور اس کی موت کفر پر ہوئی ہے، تو اس سے بیزار ہو گئے، اور استغفار کرنا چھوڑ دیا۔

صاحب روح المعانی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر واضح ہوگیا کہ ان کے باپ کی موت کفر پر ہو چکی ہے، لہٰذا استغفار کرنا چھوڑ دیا، اور یہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مشرک کی کبھی بھی مغفرت نہیں ہوسکتی، وہ جو بار بار دعائے مغفرت کرتے رہتے تھے، اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس کو ایمان کی توفیق نصیب ہو، کیونکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بیوی کے ساتھ جب بابل عراق سے ہجرت فرمائی تو ان کا باپ ﴿اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾ میں سے تھا، پھر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس کی حالت معلوم نہیں ہوئی، اور وہ ہدایت کیلئے دعا کرتے رہے، جب انہیں وحی کے ذریعہ اس کی موت علی الکفر کا علم ہوگیا تو بیزار ہوگئے، اور استغفار چھوڑ دیا۔

قیامت کے روز جب ان کے والد کو جہنم میں ڈالنے کا حکم ہوگا تو ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام عرض کریں گے: ربّ العزّت ارشاد فرمائیں گے کہ تیرے والد کو ایک ایسی کیفیت کے ساتھ جہنم کے حوالہ کیا جائے گا کہ میدانِ محشر میں کسی کو معلوم نہ ہوگا کہ یہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا باپ ہے، اس طرح آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسوائی بھی کبھی نہ ہوگی، تو ربّ العزّت سبحانہ فرمائیں گے: ابراہیم! ذرا نیچے دیکھو، جب وہ نیچے سے اپنے والد کو دیکھیں گے تو وہ مردار جانور ریچھ کی صورت میں ہے، تو وہ وہاں بھی بیزار ہو جائیں گے، یہاں تک کہ وہ جہنم کے سپرد ہوگا، اور کوئی اس کی شناخت نہیں کر سکے گا۔ [بخاري، مسلم، ترمذي] پس اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی پورا ہوگا کہ اس نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بے عزّتی اور تذلیل و رسوائی نہیں فرمائی۔

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ﴾ بیشک ابراہیم علیہ السلام بڑے مہربان رحمدل تھے، ان کی بردباری یہ ہے کہ ان کے باپ نے سنگسار کرنے تک کی دھمکی دی، اور وہ حلم و بردباری کا مظاہرہ کر کے اس کی ہدایت کے لیے استغفار کرتے رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کافر و مشرک کے لیے ہرگز استغفار کی اجازت نہیں، خواہ وہ کتنا قریبی رشتہ دار ہو، اور ابوطالب کی طرح ہمدرد و مہربان اور محسن کیوں نہ ہو، اس لئے کہ کفر کے ہوتے ہوئے استغفار بے مقصد اور بے فائدہ ہے، اور ربّ العزّت سبحانہ کا فیصلہ ہے کہ مشرک کی کسی صورت مغفرت نہیں ہوسکتی۔

فائدہ:

قرآن کریم کے صریح نصوص و احکام کا قصداً انکار اور مخالفت، اور انہیں سرسری احکام سمجھ کر ان کی مخالفت

کرنا قریب قریب کفر اور فسق ہے، مگر آج کل ہمارے ملک میں سیاسی لیڈروں اور بڑے بڑے لوگوں کی عادت ہے کہ غیر مسلموں کے اور اسی طرح ایسے لوگوں کے جن کے عقائد کفریہ ہیں ان کی تجہیز و تکفین اور جنازہ اور آخری رسومات میں شرکت کرتے ہیں، اور اسے "رواداری" کے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ بالکل خلاف شریعت اور حرام ہے، ایسے لوگوں کو چاہئے کہ اپنے ایمان کی خیر منائیں۔

......❁......❁......❁......

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾
اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ کردے جب تک ان چیزوں کو واضح طور پر بیان نہ فرمادے جن سے وہ بچتے رہیں، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے ﴿۱۱۵﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا، وہ زندہ کرتا ہے، اور ماردیتا ہے، اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یار اور مددگار نہیں ﴿۱۱۶﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کے لیے تسلّی کا سامان ہے، جن لوگوں نے ممانعت نازل ہونے سے پہلے مشرکین کے لیے استغفار کیا تھا۔ فرمایا:

اللہ تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ مہربان ہے، جو ابھی بیان ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بڑے مہربان تھے، ایک پیغمبر جتنا ہی بڑا مہربان ہو پھر اس کی مہربانی بھی محدود ہوگی، ربّ العرش العظیم سبحانہ کی مہربانی کی نہ حد ہے، نہ اندازہ، کائنات کا چپہ چپہ، خشکی اور دریاؤں کی گہرائیوں میں اتنی بے شمار مخلوقات ہیں کہ جن کو سوائے واحد الجبار سبحانہ کے کوئی نہیں جانتا، وہ ذات پاک ان تمام مخلوقات پر اتنی مہربان ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ وہ اگر تمہیں کسی کافر کیلئے استغفار سے منع کرتا ہے تو وہ اس لئے نہیں کہ وہ مہربان نہیں، بلکہ آپ اگر اُس کافر پر اس کی نعمتوں اور نوازشات کا شمار کریں گے تو عاجز اور بے بس ہوجائیں گے۔

مگر اس ناشکر کافر انسان نے اپنے ربّ کی جان بوجھ کر اتنی مخالفت اور بغاوت کی کہ جس کی حد نہ ہو، لہٰذا

اس کو راندۂ درگاہ قرار دے کر اس پر عنایات کا دروازہ بند ہو گیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ان کے باپ نے اتنے قرب سے دیکھا، پھر اس تاریخی آگ میں انہیں ڈالنے والوں میں وہ بھی بدستور شامل رہا، پھر اس بڑی آگ کے بَرْدٌ و سلام ہونے کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ بھی کیا، اسے چاہئے تھا کہ بلا توقف یہ اعلان کرتا کہ میں اپنے بیٹے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ربّ پر ایمان لاتا ہوں، نتیجہ کچھ بھی ہو میں اس ہستی پر کلمہ پڑھتا ہوں، اور یہی حال ابو طالب کا بھی رہا، مگر دونوں بدقسمت نکلے، اور کفر پر مرے۔

سلمان ز فارس ست، بلال از حبش، صہیب از روم ☆ ز خاک مکہ ابو جہل کا ین چہ بوالعجبی ست

ابو جہل پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رہا، مگر ابو طالب کے گھر اور اس کی گود میں رحمت للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش ہوئی، وہ سب کچھ دیکھے اور سمجھے، مگر:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا﴾ یعنی ہدایت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک گمراہ قرار نہیں دیتا جب تک وہ چیزیں ان کو نہ بتا دے جن سے ان کو پرہیز کرنا لازمی ہے، یعنی اسلام کی ہدایت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کسی قوم کو گمراہ قرار نہیں دیتا، اور مؤاخذہ بھی نہیں کرتا، تاوقتیکہ ان کے سامنے کھول کر وہ امور نہ بیان کر دے جن سے ان کو بچنا لازم ہے، اور جن کو آئندہ اختیار کرنے کے بعد وہ گمراہ قرار پانے کے مستحق ہو جاتے ہیں، لہٰذا مشرکین کیلئے استغفار کرنے پر کسی طرح کا مؤاخذہ اس لئے نہیں ہوگا کہ یہ استغفار کرنا ممانعت کے نزول سے پہلے تھا، اور جن لوگوں نے استغفار کیا ہے اللہ تعالیٰ ان کے اس عمل کو گمراہی اور قابلِ مؤاخذہ قرار نہیں دے گا۔

ہاں! ابھی جب یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی تو آئندہ اس کی خلاف ورزی باعثِ مذمت اور سببِ مؤاخذہ ضرور ہوگی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ بلا شبہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے، اسے پتہ ہے کہ آئندہ کون خلاف ورزی کرے گا، اور کون نہیں کرے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے ملک آسمانوں کا، اور زمین کا، اور موت وحیات کا مالک بھی وہی ہے، مسلمانوں کے سارے اعمال اسی پاک ذات کے حکم سے اسی کی رضاء کیلئے ہوتے ہیں، وہ کتنے خوش قسمت ہیں کہ صبح وشام ان کا مشغلہ اسی کی یاد میں اور احکام کی پیروی میں ہوتا ہے، کبھی اس کے فرمان پر جانوں کی قربانی، اور کبھی مال واولاد اور اوقات ولحات کی قربانی پیش کرتے ہیں، اور اس کے دین کی سربلندی کیلئے

ہر چیز کی قربانی دینے پر فخر محسوس کرتے ہیں، اسی بارے میں فرمایا:

﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ وہی تمہارا ولی، دوست اور مددگار ہے، اس کے سوا تمہارا کوئی یار ومددگار نہیں۔ اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْنَا وَاَكْرِمْنَا۔ آمین

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے نبی پر اور مہاجرین پر اور انصار پر مہربانی فرمائی، جنہوں نے اس کے بعد تنگی کے وقت نبی کا ساتھ دیا، جبکہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں تزلزل ہوا چلا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر توجہ فرمائی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان پر مہربان ہے، رحم فرمانے والا ہے﴿۱۱۷﴾ اور اللہ تعالیٰ نے ان تین شخصوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب زمین اپنی فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے، اور انہوں نے یقین کرلیا کہ اللہ تعالیٰ سے بچ کر کہیں پناہ نہیں مل سکتی سوائے اس کے کہ اس کی طرف رجوع کیا جائے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے حال پر توجہ فرمائی، تاکہ وہ رجوع کریں، بیشک اللہ تعالیٰ خوب توبہ قبول فرمانے والا ہے، اور رحم کرنے والا ہے﴿۱۱۸﴾

معارف ومنازل

مہاجرین وانصار پر اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم:

جب نافرمانوں یعنی کفار ومشرکین کیلئے استغفار کی ممانعت کا نزول ہوا تو لوگوں کے دلوں میں ایک قسم کی ناامیدی اور خوف پیدا ہوا، اسے دور فرما کر ارشاد فرمایا کہ سارے لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے، کچھ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن پر صبح وشام اللہ تعالیٰ کی نوازشوں اور رحمتوں کی بارش برستی ہے۔

تَابَ يَتُوْبُ کا اصل معنی: ''رجوع کرنا'' ہے، بندہ گناہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اس لئے اسے تائب اور توّاب یعنی رجوع کرنے والا کہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربانی کے ساتھ متوجہ ہوتا

ہے، مہربانی فرماتا ہے، نگاہِ کرم فرماتا ہے، اسی لئے لفظ تواب اللہ تعالیٰ کی صفات میں بھی آتا ہے۔ البتہ لفظ تائب اللہ تعالیٰ کے لئے مستعمل نہیں، یہ صرف بندہ کی صفت ہے، جیسے ابھی گزرا: ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ﴾۔ اللہ تعالیٰ کا کرم فرمانا، فضل فرمانا، متوجہ ہونا، توبہ کی توفیق دینا، توبہ قبول فرمانا، معاملہ میں آسانی فرمانا، یہ لفظِ تَابَ اللّٰہُ عَلَیْهِ کے معانی ہیں۔ لفظِ تاب کا ہم نے جو ترجمہ کیا، یعنی متوجہ ہوا، مہربانی فرمائی، اس میں اس مفہوم کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔

لہٰذا اب یہ اشکال نہ رہا کہ آنحضرت سرور عالم ﷺ سے اور ان مہاجرین وانصار سے کونسا گناہ ہوا تھا جنہوں نے غزوۂ تبوک میں شرکت کی، اور گناہ کی وجہ سے توبہ کی، اور اللہ تعالیٰ نے وہ توبہ قبول فرمائی۔ تابَ کا مفہوم ہم نے اور اہل لغت نے عام رکھا، یعنی فضل فرمانا، کرم کرنا، متوجہ ہونا، معاملہ میں آسانی فرمانا، یہ سب کچھ آ گیا، اس لئے ترجمہ میں عموم کا لحاظ رکھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین وانصار کی جو تعریف فرمائی کہ ان لوگوں نے سختی کی گھڑی میں آنحضرت ﷺ کا اتباع کیا، اور آپ ﷺ کے حکم پر بغیر چون وچرا لبیک کہا۔ یہ کونسی سختی اور کیا مصیبت تھی؟ اس کے بارے میں تفسیر و حدیث اور سیرت کی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اس میں سے ایک بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے جو انہوں نے بیان کی کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کسی نے دریافت کیا کہ سختی کی وہ کیا گھڑی تھی جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے؟ اس پر انہوں نے فرمایا کہ ہم سرور عالم ﷺ کے ساتھ تبوک کی طرف روانہ ہوئے، سخت گرمی کا زمانہ تھا، ایک منزل پر اترے تو ہمیں سخت پیاس لگی، پیاس کی شدّت کا یہ عالم تھا کہ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہماری گردنیں ابھی کٹ کر گر پڑیں گی، اگر کوئی شخص قضائے حاجت کے لئے بھی جاتا تھا تو واپس آنے میں پیاس کی شدّت کی وجہ سے یہ سمجھتا تھا کہ پیاس کی شدت کی وجہ سے میری گردن کٹ کر گر جانے والی ہے، پیاس کی شدّت کی وجہ سے بعض اشخاص نے یہاں تک کیا کہ اونٹ کو ذبح کر کے اس کی اوجھڑی کو نچوڑ کر پیا، اور تری حاصل کرنے کے لئے اسے اپنے پیٹ پر رکھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ربّ العزّت سبحانہ نے آپ کو دعا کرنے کا عمل عطا فرمایا ہے، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے، آپ ﷺ نے مبارک ہاتھ اٹھائے اور دعا کی، ابھی آپ ﷺ نے ہاتھ نیچے نہیں کئے تھے کہ بارش شروع ہو گئی، اور خوب بارش ہوئی، جس سے گرمی کی شدت بھی کم ہو گئی، اور لوگوں نے اپنے اپنے سارے برتن بھر لئے، اور ان کے اونٹ بھی سیراب ہو گئے، پھر ہم نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ بارش

کہاں تک ہے، تو معلوم ہوا کہ وہ لشکر کی حدود سے آگے نہیں بڑھی۔ [مجمع الزوائد بزار، طبراني، الأوسط]

معالم التنزیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ غزوۂ تبوک میں جو حضرات شریک تھے ان کے پاس سواریاں بھی بہت کم تھیں، ایک اونٹ پر باری باری دس افراد سوار ہوتے تھے، اور راستہ نہایت ناہموار تھا، اور ان کے پاس کھانے کے اسباب نہایت ناگفتہ بہ تھے، صرف ایسی کھجوریں ہوتی تھیں جن میں چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے، اور بہت پرانی تھیں، وہ کھجوروں کو گٹھلیوں کے ساتھ منہ میں رکھ کر چوس رہے تھے، ادھر سات سو کلومیٹر کا یک طرفہ سفر، سخت گرمی، پیدل کا سفر، بھوک اور پیاس وغیرہ کے سخت سے سخت کٹھن حالات میں حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے غزوۂ تبوک میں شرکت کی۔ تمام مخلصین صحابہ رضی اللہ عنہم حکم سنتے ہی تیار ہو گئے۔

البتہ بعض لوگوں کو جو تھوڑا سا کچھ تردد ہوا تھا بعد میں وہ بھی ساتھ ہو گئے، تیسرا طبقہ وہ دس افراد کا تھا جن میں سے سات وہی تھے جنہوں نے اپنی جانوں کو ستونوں کے ساتھ باندھ لیا تھا، باقی تین کا قصہ متصل آنے والا ہے۔ یہ تینوں طبقے مؤمنین کے تھے، باقی اور دو طبقے منافقین کے تھے۔ یہ پوری تفصیل پہلے گزر چکی، وہاں دیکھی جائے۔

فائدہ:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اس امت کے محسنین مخلصین افضل ترین لوگ تھے، جنہوں نے حضرت رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا، اور جان نثاری کا پورا پورا حق ادا کیا، جن کی نظیر اقوامِ عالم کے نہ اولین میں ہے، اور نہ آخرین کے اندر، انہوں نے انہی بے مثال قربانیوں کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق بیان سے جنتوں کا سرٹیفکیٹ اور پروانہ حاصل کیا، اور اسی کے ساتھ ربّ العزت سبحانہ سے ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ﴾ [المائدة: ١١٩] (اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے) کا بلند ترین لقب و انعام پایا، اب جو لوگ ان کے ایمان پر شک کرتے ہیں اور ان پر لعن وطعن کرتے ہیں ان کا شمار دنیا کے بدترین کافروں میں ہوگا۔

﴿مِنۡۢ بَعۡدِ مَا كَادَ يَزِيۡغُ قُلُوۡبُ فَرِيۡقٍ مِّنۡهُمۡ﴾ یہاں زیغ سے مراد نفاق نہیں، کیونکہ یہ لوگ (دوسرا طبقہ) خالص متقی مؤمن تھے، البتہ اس گرمی کے لمبے سفر کی صعوبتیں اور سختیوں سے گھبرا کر تذبذب میں پڑ گئے، پھر فوراً تیار ہو کر لشکر میں شامل ہوئے۔

﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيۡنَ خُلِّفُوۡا﴾ اور ان تین شخصوں کے حال پر توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا۔ خُلِّفُوۡا کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود غزوۂ تبوک سے رہ گئے، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں گئے، پھر ستونوں

میں باندھے ہوئے لوگوں کی توبہ قبول ہوگئی، جس کی تفصیل آنے والی ہے۔ یہ تینوں حضرات یہ ہیں: حضرت کعب بن مالک، شرکاء عقبہ میں سے ہیں، دوسرے مرارہ بن ربیع، تیسرے ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم، یہ دونوں بدری ہیں۔ البتہ تینوں حضرات انصار میں سے تھے۔

غزوۂ تبوک سے پیچھے رہنے والے تینوں حضرات کا مفصّل واقعہ:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے زمانہ میں مَیں بڑا طاقتور اور مالدار تھا، اس سے پہلے کبھی میں اتنا خوشحال نہیں رہا جتنا تبوک کے موقع پر تھا، اس وقت سواری کے لئے میرے پاس دو اونٹنیاں تھیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی جہاد کا ارادہ فرماتے تو بطورِ توریہ کسی دوسرے جہاد کا نام لیتے، جہاں جانا ہوتا صاف واضح اس کو ذکر نہ فرماتے، اور فرماتے کہ لڑائی خفیہ تدبیر کا نام ہے، جب تبوک کے جہاد کا موقع آیا تو گرمی سخت تھی، سفر طویل تھا، راستہ ناہموار تھا، دشمنوں کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر نام لے کر واضح کیا، تاکہ لوگ اچھی طرح تیاری کرلیں، اور اپنے لئے حتی المقدور سامان کا انتظام کریں، اور لوگ اتنے کثیر وزیادہ تھے کہ کسی کتاب یعنی رجسٹر میں ان کے نام لکھنا اور ان کی حاضری لینا ممکن نہ تھا، اور وہ مسلسل حسبِ استطاعت تیاری میں لگ گئے، ہر چیز کی کمی تو کیا بلکہ ہر چیز نایاب تھی، یہ بہت بڑی آزمائش کا سفر تھا، چاروں طرف غربت کا دور دورہ تھا، گرمی بے انتہاء سخت تھی۔ بہر حال جان نثاروں کا لشکر تیار ہوا، اور حسبِ معمول جمعرات کے روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام لشکر مدینہ طیبہ سے روانہ ہوگیا۔

اس اثنا میں مَیں روزانہ اپنی تیاری میں لگا رہا، اور سامان جمع کرنے میں خوب مستعد رہا، مگر ان کے ساتھ نہ جاسکا، پھر سوچا کہ ابھی تیاری کرکے ان کے پیچھے روانہ ہوجاؤں گا، شام واپس خالی ہاتھ گھر لوٹ کر آتا تھا، حتّٰی کہ چند روز اسی چکر میں رہا، اور رہ گیا، افسردہ ہوکر گھر بیٹھ گیا، نہ جاسکا۔

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس پوری مدت میں سخت پریشان رہا، نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا، مدینہ میں سوائے عورتوں اور بچوں اور بیماروں ومعذوروں اور منافقوں کے کوئی نہ تھا، ان کو دیکھ کر مجھ پر سخت پریشانی کی کیفیت کا غلبہ ہوتا، اور مجھ پر زمین تنگ ہوتی رہتی۔

جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوے سے فارغ ہوکر واپس آنے لگے تو مجھے بہت زیادہ فکر لاحق ہوگئی، میں سوچتا رہا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے کیسے بچ سکتا ہوں، اس بارے میں یہ بھی خیال آتا تھا کہ جھوٹے عذر پیش

کردوں گا، اور اپنے گھر والوں سے بھی اس بارے میں مشورہ کرتا تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالکل ہی مدینہ منورہ کے قریب پہنچ گئے تو جھوٹ بولنے کا جو خیال آتا تھا وہ بالکل ختم ہوگیا، اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ سچ ہی بولوں گا، اور سچ ہی کے ذریعہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نارضگی سے نکل سکتا ہوں۔

یہاں تک کہ رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب سفر سے تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں جاتے تھے، وہاں دو رکعتیں پڑھ کر تشریف فرما ہو جاتے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اس عمل سے فارغ ہو گئے تو وہ لوگ آ گئے جو غزوۂ تبوک میں شریک ہونے سے پیچھے رہ گئے تھے، یہ لوگ حاضر خدمت ہوئے، اور اپنے اپنے عذر پیش کرتے رہے، اور قسمیں کھاتے رہے، یہ لوگ تعداد میں اسی ۸۰ سے کچھ اوپر تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری طور پر ان کے عذر قبول فرماتے رہے، اور بیعت بھی فرماتے رہے، اور ان کے لئے استغفار بھی کرتے رہے، اور ان کے باطن کو اللہ تعالیٰ جل شانہ کے سپرد فرمایا (بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ سارے منافق تھے)۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی حاضرِ خدمت ہوا، میں نے سلام عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے، جیسے کوئی غصہ والا شخص مسکراتا ہو، پھر فرمایا: آجا! میں خدمت گرامی میں حاضر ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے کس چیز نے پیچھے ڈالا، غزوۂ تبوک میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ کیا تم نے سواری نہیں خریدی تھی؟ میں نے عرض کیا: واقعی میں نے سواری خریدی تھی، اللہ کی قسم اگر اصحاب دنیا میں سے کسی کے پاس بیٹھتا تو میں عذر پیش کر کے اس کی ناراضگی سے نکل سکتا تھا، میں بات چیت کرنے کا ڈھنگ جانتا ہوں، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں اور اس پر قسم کھاتا ہوں کہ اگر آج میں آپ کے سامنے جھوٹی بات پیش کر کے آپ کو راضی کرلوں تو عنقریب ہی اللہ تعالیٰ صحیح حقیقت بیان فرما کر آپ کو مجھ سے ناراض کر دے گا۔

اور اگر میں سچی بات بیان کروں تو آپ غصہ تو ہوں گے لیکن میں اس میں اللہ تعالیٰ سے معافی کی امید رکھتا ہوں، اللہ تعالیٰ کی قسم مجھے کوئی عذر نہ تھا، اور جتنا قوی اور غنی میں اس موقع پر تھا جب کہ آپ سے پیچھے رہ گیا ایسی قوت والا اور مال والا میں کبھی بھی نہ ہوا۔

میری بات سن کر آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس شخص نے سچ کہا، پھر فرمایا: اٹھو کھڑے ہو جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ شانہ تمہارے بارے میں فیصلہ فرما دے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں وہاں سے اٹھا، اور قبیلہ بنی سلمہ کے لوگ میرے ساتھ ہو لئے، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم جہاں تک ہمارا علم ہے اس

سے پہلے تم نے کوئی گناہ نہیں کیا، کیا تم یہ نہ کر سکے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اسی طرح عذر پیش کر دیتے جیسے دوسرے لوگوں نے اپنے عذر پیش کئے؟ اور پھر آنحضرت سرور عالم کا استغفار فرمانا تمہارے لئے کافی ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی قسم ان لوگوں نے مجھے اتنی کثرت سے ملامت کی کہ میں نے یہ ارادہ کرلیا کہ واپس جا کر میں اپنے بیان کو جھٹلا دوں، اور کوئی عذر پیش کر دوں۔

پھر میں نے ان لوگوں سے کہا: یہ تو بتاؤ میرا شریک حال اور کوئی شخص بھی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں دو آدمی ہیں، انہوں نے بھی اسی طرح اپنا بیان دیا ہے جیسا تم نے بیان دیا، اور ان کو بھی وہی جواب دیا گیا جو تم کو دیا گیا، میں نے پوچھا: وہ دونوں کون ہیں؟ انہوں نے بتایا: مرارہ بن ربیع، اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہما ہیں، ان لوگوں نے میرے سامنے ایسے دو شخصوں کا ذکر کیا جو صالحین اہلِ بدر میں سے تھے، میں نے کہا کہ میں ان دونوں کی اقتداء کرتا ہوں، جو ان کا حال ہوگا وہی میرا حال ہو جائے گا۔ ﴿حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾[آل عمران:۱۷۳] (اللہ ہی ہمارے لیے کافی ہے، اور وہ بہترین کارساز ہے)۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ہم تینوں سے بات چیت کرنے سے منع فرما دیا، لہٰذا لوگ ہم سے بچ کر رہنے لگے، اور یکسر بدل گئے، میرا تو یہ حال ہوا کہ زمین بھی مجھے دوسری زمین معلوم ہونے لگی، گویا کہ اس زمین کو جانتا ہی نہیں ہوں، میں نمازوں میں مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں حاضر ہوتا تھا، اور بازاروں میں گھومتا تھا، لیکن مجھ سے کوئی بات نہیں کرتا تھا، نہ سلام نہ کلام۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں میری حاضری ہوتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے بعد مسجد میں تشریف فرما ہوتے، اور میں سلام عرض کرتا، اور اپنے دل میں یہ خیال کرتا تھا کہ سلام کے جواب کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہونٹ ہلائے ہیں یا نہیں؟ پھر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب نماز پڑھتا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری طرف توجہ فرماتے تھے، اور جب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعراض فرما لیتے تھے۔

یہ تو میرا حال تھا، لیکن میرے جو دو ساتھی تھے وہ تو بالکل ہی عاجز ہو کر اپنے گھروں میں بیٹھے رہے، اور برابر روتے رہے۔ اس مقاطعہ کے زمانہ میں ایک یہ واقعہ پیش آیا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم تینوں کو حکم بھیجا کہ اپنی بیویوں سے علیحدہ رہیں، ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی بیوی نے حاضر خدمت ہو کر یہ عذر پیش کر کے اجازت لے لی کہ وہ بہت زیادہ بوڑھے ہیں، ان کا کوئی خادم نہیں ہے، ان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدمت کی اجازت دے دی، اور ساتھ ہی یہ

فرمادیا کہ انہیں شب باشی کی اجازت نہ دی جائے۔

میرے خاندان والوں نے مجھے بھی مشورہ دیا کہ تم بھی اجازت طلب کرلو کہ تمہاری بیوی تمہاری خدمت کرلیا کرے، میں نے کہا کہ میں جوان صحت مند آدمی ہوں، میں ایسا نہیں کرسکتا۔

ایک دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ میں مدینہ منورہ کے بازار میں جارہا تھا کہ شام کے کاشتکاروں میں سے ایک شخص جو غلہ فروخت کرنے کے لئے مدینہ منورہ آیا ہوا تھا، لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ کعب بن مالک (رضی اللہ عنہ) کون شخص ہیں؟ لوگ میری طرف اشارہ کرنے لگے، وہ میرے پاس آیا، اور غسان کے بادشاہ کا ایک خط مجھے دیا، جس میں لکھا تھا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تمہارے آقاء (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہارے ساتھ سختی کا معاملہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں گراپڑا آدمی نہیں بنایا، لہٰذا تم ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمہاری دلداری اور حوصلہ افزائی کریں گے۔ یہ خط پڑھ کر میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ ایک اور آزمائش سامنے آگئی، میں نے اس خط کو لے کر تنور میں ڈالا اور جلادیا۔

اور تیسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ میں اپنے چچازاد بھائی ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے باغ کی دیوار پر چڑھا، جس سے بنسبت اور لوگوں کے مجھے سب سے زیادہ محبت تھی، اس وقت وہ اپنے باغ میں تھے، میں نے سلام کیا، تو انہوں نے جواب نہیں دیا، میں نے کہا: اے ابوقتادہ! میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں، یہ سن کر وہ خاموش ہوگئے، میں نے پھر اپنی بات دہرائی، اور ان کو قسم دلائی، وہ پھر خاموش ہوگئے، میں نے پھر تیسری مرتبہ اپنی بات دہرائی اور انہیں قسم دلائی تو انہوں نے صرف اتنا کہہ دیا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی زیادہ جاننے والے ہیں۔ یہ بات سن کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اور میں دیوار پھاند کر واپس چلا آیا۔

جب اس مقاطعہ پر پچاس راتیں گزر گئیں، تو نماز فجر کے بعد جبکہ میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا، اور میرا حال یہ ہوچکا تھا جس کا قرآن حکیم میں ذکر ہے کہ ان پر زمین تنگ ہوگئی، اور اپنی جانوں سے بھی بیزار ہوگئے بسبب تنگی، اس وقت میں نے ایک بلند آواز سنی، جبل سلع پر چڑھ کر ایک شخص بلند آواز سے پکار رہا تھا کہ اے کعب بن مالک! خوش ہوجاؤ، یہ آواز سن کر میں سجدے میں گر پڑا، اور میں نے یہ سمجھ لیا کہ مصیبت دور ہونے کی کوئی صورت سامنے آئی ہے۔ سرورِ کونین رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمادیا کہ تمہاری توبہ قبول ہوگئی۔

یہ اعلان فجر کے بعد فرمایا تھا، اعلان سن کر لوگ ہمیں خوشخبری دینے کے لئے روانہ ہوگئے، میرے ساتھیوں

کی طرف بھی خوشخبری دینے والے چلے، اور ایک صاحب اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر میری طرف چلے، لیکن قبیلہ بنی اسلم کے ایک شخص دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے توبہ کی خوشخبری سنا دی، اس شخص کی آواز گھوڑے سوار سے پہلے پہنچ گئی، جب وہ شخص میرے پاس پہنچا جس کی آواز میں نے سنی تھی تو میں نے اپنے دونوں کپڑے اتار کر دے دیئے، اس وقت میرے پاس یہی دو کپڑے تھے، اگرچہ مال بہت تھا، میں نے دونوں کپڑے دیدیئے، اور خود دو کپڑے مانگ کر پہن لئے۔

اب میں حضرت رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی قدمبوسی کے لئے روانہ ہو گیا (زہے عزّت وشرف) اسی اثناء میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فوج درفوج مجھ سے ملاقات کرتے رہے، اور مجھے مبارک باد دیتے رہے، میں مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف حاضرین موجود ہیں، میری طرف طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے آئے، یہاں تک کہ مجھ سے مصافحہ کیا، اور مبارک باد دی، میں اس کے اس عمل کو کبھی نہیں بھولوں گا، ان کے علاوہ مہاجرین میں سے کوئی بھی شخص میرے پاس دوڑ کر نہیں آیا (وجہ اس کی یہ تھی کہ اگر یہ سارے اٹھتے تو مجلسِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو سکون واطمینان کے ساتھ جمی ہوئی تھی وہ ٹوٹ جاتی، سب کی طرف سے ایک شخص کا کھڑا ہونا کافی ہو گیا)۔

میں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک خوشی سے چاند کی طرح چمک رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم خوشخبری قبول کرو، جب سے تمہاری پیدائش ہوئی ہے تم پر آج سے بہتر کوئی دن نہیں گزرا (اس سے اسلام لانے کا دن مستثنیٰ ہے) [كما في قسطلاني شرح البخاري]

سرور عالم صاحب خَدِ الْأَنْوَرِ وَالْجَبِينَ الْأَزْهَرِ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی امر سے خوش ہوتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور ایسا روشن ہو جاتا تھا جیسے چاند کا ٹکڑا ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ تھا، کبھی تاریک گھر میں رات کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہوتے تو عورتوں کی گمشدہ پڑی ہوئی سوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کی روشنی سے نظر آجاتی۔ صلی اللہ علیہ وسلم

فرمایا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کو اسی سے پہچان لیتے تھے، یعنی چہرہ مبارک کی روشنی سے۔ جب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے اپنی توبہ میں اس بات کو بھی شامل کر لیا کہ میں اپنا سارا مال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کے لئے صدقہ کر دوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کچھ مال

اپنے پاس رکھ لو، تمہارے لئے بہتر ہوگا، میں نے کہا: اچھا، تو میں اپنا وہ حصہ روک لیتا ہوں جو خیبر کے مال غنیمت سے ملا تھا۔

پھر میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے سچ ہی کے ذریعہ نجات دی ہے، اور میں نے اپنی توبہ میں اس بات کو بھی شامل کرلیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا سچ ہی بولوں گا، کہنے کو تو میں نے کہہ دیا، لیکن میرے علم میں مسلمانوں میں کوئی ایسا نہیں جو سچ بولنے کے بارے میں مجھ سے زیادہ مبتلا کیا گیا ہو، میں آج تک اس پر قائم ہوں۔ جب سے میں نے آنحضرت ﷺ سے سچ بولنے کا عہد کیا اس وقت سے لے کر آج تک کبھی میں نے جان کر جھوٹ نہیں بولا، اور اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں باقی زندگی میں بھی میری حفاظت فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمانے کی بشارت دیتے ہوئے آیت کریمہ:

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ﴾ سے لے کر ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ تک آیات نازل فرمائیں۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ نعمتِ اسلام کے بعد اس سے بڑی کوئی نعمت مجھے حاصل نہیں ہوئی کہ میں نے رحمۃ للعلمین ﷺ کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر سچ بات کہہ دی تھی، اگر میں جھوٹ کہہ دیتا تو میں بھی ہلاک ہو جاتا، جیسے دوسرے لوگ جھوٹے عذر پیش کر کے ہلاک ہو گئے۔

چند ضروری فوائد:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے دونوں ساتھیوں کے واقعہ سے بہت سے دینی فوائد مستنبط ہوتے ہیں، جو کہ ہمارے لئے مشعل راہ ہیں:

(۱)۔مؤمن بندوں پر لازم ہے کہ ہمیشہ سچ بولیں، سچی بات کہیں، سچ ہی میں نجات ہے، اور جھوٹ سے اجتناب کریں، جھوٹ میں ہلاکت ہے، جھوٹ کا انجام بُرا ہے۔

(۲)۔امیر المؤمنین اگر چاہے تو بعض افراد کے بارے میں مقاطعہ کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

(۳)۔بعض مرتبہ ابتلاء پر ابتلاء ہو جاتا ہے، کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ابتلاء میں تو تھے ہی، مگر اوپر سے شاہ غسان کا خط آیا، لیکن ایمانی استقامت نے انہیں سہارا دیدیا، پس ہر مؤمن پر استقامت لازم ہے، اور ہر مسلمان کو چاہئے کہ ہمیشہ اس کی دعا کیا کرے۔

(۴)- حضرت کعب رضی اللہ عنہ مقاطعہ کے باوجود نمازوں کے لئے آتے رہے، اور سلام کرتے رہے، یہ سچے مسلمانوں کا شعار ہے، جس سے ابلیس ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاتا ہے۔

(۵)- جب ان حضرات کی بیویوں کو بھی مقاطعہ کا حکم ملا تو انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں کوئی کمی نہیں کی، یہی ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ تمام باتوں پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکموں کو مقدم سمجھے، اور اس پر ایسا عمل کرے جس طرح ان کا حق ہے۔

(٦)- جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم آجائے تو تمام رشتے اور عزیز واقارب کے حقوق نظر انداز ہوتے ہیں، جیسے ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے واضح فرمایا۔

(۷)- جب ان تینوں حضرات کی توبہ قبول ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بشارت دینے میں کوئی تاخیر نہیں فرمائی، آئندہ بھی یہی مسلمانوں کا رویہ ہونا چاہئے۔

(۸)- جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جوق در جوق انہیں مبارکباد پیش کی تو چاہئے کہ آئندہ مسلمان دینی امور میں کامیابی پر بھی ایک دوسرے کو مبارک باد دیا کریں۔

(۹)- آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا عہد کرنا، اور جو گناہ کیا ہو اس پر ندامت ہی توبہ قبول ہونے کا ذریعہ ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ہو۔

(۱۰)- توبہ قبول ہونے کے شکرانہ میں صدقہ کرنا اَقْرَبُ اِلَى الْاِجَابَة ہے۔

(۱۱)- صدقہ میں پورا مال پیش کرنا بہتر نہیں، کچھ اپنی ضروریات کے لئے رکھنا ضروری ہے، اس کے علاوہ اس واقعہ میں اگر باریکی سے غور کریں تو مزید فوائد بھی معلوم ہوں گے، ہم نے اختصار کے پیش نظر چند ضروری فوائد کے بیان پر اکتفاء کیا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ ﴿۱۱۹﴾

معارف و منازل

اوپر کی آیات میں حضرت کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع، ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم، تینوں کی توبہ قبول ہونے کا

بیان تھا، مذکورہ آیت کریمہ کا نزول بھی انہی دو آیات کے ساتھ ہے۔ یہاں اس آیت میں پوری امتِ مسلمہ کو یہی حکم دیا جارہا ہے کہ تم سچے مسلمانوں کے ساتھ ہو جاؤ، بادی النظر قرب کی وجہ سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ان ہی تینوں صاحبوں کا طرزِ عمل اختیار کر کے جھوٹ اور نفاق سے پرہیز کرو، سچائی اختیار کرو، کہ ان تینوں حضرات نے اپنے آپ کو عتاب میں ڈالتے ہوئے سچائی اختیار کی، اور عتاب سے بچنے کی خاطر جھوٹ نہیں بولا۔

مگر یہاں صادقین سے صرف یہ تینوں حضرات مراد نہیں، بلکہ پوری جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہے، یعنی سارے مہاجرین اور انصار مراد ہیں، جنہوں نے اس پورے معرکہ غزوۂ عسرہ میں پوری صداقت اور فرمانبرداری کا وہ تاریخی اور ولولہ انگیز ثبوت پیش کیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ لَقَدْ تَابَ کا اعلان پوری جماعت کے لئے بشمولِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو رہا ہے۔ پھر ان ثلاثہ کا تذکرہ ان پر عطف ہو رہا ہے، اور معطوف علیہ کا حکم اصلی ہوتا ہے، جبکہ معطوف اس کا تابع شمار ہوتا ہے، کیونکہ اول تو پوری جماعت سے خطا سرے سے ہوئی نہیں، جبکہ دوسری جماعت نے خطا کا ارتکاب کر کے سچائی اختیار کی، تب ان کی توبہ قبول ہوگئی پھر "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ" کا استحقاق انہیں حاصل ہوا۔ خوب فرق سمجھیں۔

پہلا طبقہ خطا سے محفوظ رہا، جبکہ دوسرا طبقہ خطا کے بعد ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہاں صادقین سے پوری جماعت مراد ہے، جن کے اتباع اور نقشِ قدم پر چلنے کا پوری امت کو حکم دیا جارہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل صادقین وہ ہیں جنہوں نے بغیر چون وچرا عملاً صداقت کا ثبوت پیش کیا، اور غزوے میں شریک ہوئے، ثانیاً وہ بھی صادقین ہیں جو عملاً اگرچہ شریک نہیں ہوئے مگر زبانی صداقت کا بڑا بہتر ثبوت پیش کیا۔ رضی اللہ عنہم

عملی صداقت کا حیرت انگیز نمونہ:

محمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں غزوۂ تبوک میں اپنے کمزور اونٹ کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا۔ ساتھ نہ جاسکا تھا، میرا اونٹ دبلا اور بہت کمزور تھا، تو میں نے خیال کیا کہ میں چند روز خوب چارہ اور خوراک اس کو دیدوں تا کہ وہ طاقتور ہو، اور اس کی کمزوری ختم ہو جائے، پھر اس پر سوار ہو کر پیچھے سے چلوں، اور لشکر تک پہنچ جاؤں، اور ان سے جاملوں۔

چنانچہ چند روز تک اس کو چارہ خوراک خوب دیتا رہا، پھر اکیلا روانہ ہوا، اور مقام ذی المودہ پہنچا تھا کہ اونٹ

گر گیا، اور چلنے سے عاجز ہو گیا، میں نے دن بھر اس پر محنت کی اور تدبیریں کیں، مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا، آخر میں اپنا سامان اپنے کندھوں پر اٹھا کر روانہ ہوا، اور اونٹ کو وہیں چھوڑ دیا، اور روانہ ہوا، دوپہر کو ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں سے سرور عالم ﷺ اور لشکر پر نظر پڑ رہی تھی، مسلمانوں میں سے کسی نے مجھے آتے ہوئے دیکھ لیا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! ایک شخص تنہا پیدل چل کر ہماری طرف آ رہا ہے، سرور عالم ﷺ نے فرمایا: "اگر یہ ابوذر ہو تو اچھا ہے"۔ لوگوں نے میری طرف غور سے دیکھا، اور عرض کیا: یارسول اللہ! خدا کی قسم یہ شخص واقعی ابوذر رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ابوذر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، تنہا آ رہا ہے، اکیلا مرے گا، اور اکیلا اٹھایا جائے گا۔

چنانچہ حضرت محمد بن یوسف صلحی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ایسا ہی ہوا، جب سرور عالم ﷺ کی خدمت گرامی میں پہنچے، اور اپنی پوری سرگزشت اور تنہائی اور اونٹ کا قصہ سنا دیا، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! مجھ تک آتے ہوئے جتنے قدم چل کر چلے ہر قدم پر اللہ تعالیٰ نے تیرا ایک گناہ معاف فرمایا۔ [مظهري]

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ۔ حضرت ابوخیثمہ صحابی رضی اللہ عنہ کا بھی ہے، ان واقعات سے صدق و دیانت کی فضیلت و برتری اور کذب وخیانت کی مذمت وقباحت اچھی طرح معلوم ہوئی۔ دراصل جیسا درخت ہوتا ہے ویسا پھل ہوتا ہے، اور برائیاں سب کی سب کفر ونفاق اور بے ایمانی کے ثمرات ہیں، اگر کسی مسلمان میں نیکیاں نہ ہوں، یا کم ہوں، اور برائیوں کی اس میں کثرت ہو تو چاہئے کہ وہ اپنے ایمان کی خبر گیری اور خیالداری کرے، صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا نجات کے لئے کافی نہیں، یہ چیز منافقوں میں بھی ہے، پھر کیا منافق بھی مسلمان شمار ہوں گے؟

ہمیں تو حکم ہو رہا ہے کہ تم صادقین کے ساتھ اعمال میں ان کی طرح ہو جاؤ، ایمان میں بھی، اعمال میں بھی، کردار و گفتار اور اخلاق میں بھی، بلکہ پوری زندگی میں بھی ان کی طرح بنو۔ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی جانوں کی طرف سے مجھے چھ چیزوں کی ضمانت دے دو میں تمہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں:

(۱) جب بولو تو سچ بولو (۲) وعدوں کو پورا کرو (۳) امانت کی حفاظت کرو (۴) شرمگاہوں کی حفاظت کرو (۵) اپنی نظروں کو نیچی رکھو (٦) اپنے ہاتھوں کو ظلم وزیادتی سے بچائے رکھو۔ [مشكوة عن عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ]

اگر ان چھ باتوں پر پابندی سے عمل ہو تو معاشرہ جنت نظیر بن جائے، اور نجات یقینی ہو جائے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ایک چیز کی زیادتی ہے کہ رزق وروزی وحلال لقمہ کھاؤ، دراصل ان تمام طاعات و

حسنات کا یہی مغز اور چابی ہے کہ رزق حلال ہو، مشکوک اور حرام روزی سے مکمل اجتناب ہو۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اگر کوئی شخص ایک لقمہ حرام کا کھائے تو چالیس روز تک اس کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی۔ [مشکوٰۃ]

جب ایک لقمہ چالیس روز کی فرض نمازوں بشمولِ نماز وتر وسنن اور نوافل کو ضائع کرنے کا سبب بنا، پس اگر کسی کا سارا رزق وروزی مشکوک یا حرام ہوگا تو اس کے دیگر سارے اعمال صوم وصلوٰۃ، حج وزکوٰۃ، عبادت وزہد ریاضت اور تلاوت قرآن، اذکار وتسبیحات اور علم وتبلیغ کا کیا حال ہوگا؟ کیا یہ قبول ہو جائیں گے؟ اور قربِ الٰہی کا ذریعہ بن جائیں گے؟ اللہ تعالیٰ پاکیزہ عمل کے سوا کسی بھی عمل کو قبول نہیں کرتے ہیں، روزِ قیامت یہ ساری تھکا دٹیں ناکارہ ہو جائیں گی۔ فرمایا: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ۝تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ۝﴾ [الغاشیہ] (مصیبت جھیلتے ہوئے، تھکن سے چور۔ وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ انہیں کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلا یا جائے گا)۔

بہت سارے ناداں، ناعاقبت اندیش شب وروز عبادتوں میں مصروف رہتے ہیں، اور رزق کے معاملہ میں تساہل اور غفلت ولاپرواہی کرتے ہیں، جب پیشہ اور مال کا معاملہ درپیش ہو تو بڑے قدآور تہجد گزار پھسل جاتے ہیں، اور مال وپیسہ کے دلدل میں ڈگمگاتے ہوئے پھنس جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ روزِ قیامت پہاڑوں کے برابر نیکیوں کو لے کر آئیں گے، اور ذرّہ برابر قبولیت نہیں پائیں گے، اور سارے اعمال دوسروں کے حقوق کی نذر ہو جائیں گے، یا بلا فائدہ ضائع ہو جاتے ہیں۔

سوچو، اور حلال کماؤ، آخرت کا خسارہ تباہ کن ہے، اس سے بچنے کی پوری کوشش کرو، نیک بنو، نیکوں کی صحبت اختیار کرو، نہ اپنے اعمال کو ضائع کرواؤ، نہ دوسروں کے حقوق میں دے کر خود فقیر بنو، اور نہ ان کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر رکھ کر جہنم کی سیر کرو۔ العیاذ باللہ

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھا: امام صاحب! روزہ بہت رکھتا ہوں، کئی دفعہ حج وعمرہ کر چکا ہوں، پابندی کے ساتھ روزانہ سو رکعت نماز پڑھتا ہوں، ہر شب جمعہ ختم قرآن کا اہتمام ہے، مگر مجھے سکون حاصل نہیں، اور عبادت میں مزہ نہیں آتا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تمہارا رزق حلال نہیں، جاؤ رزق حلال کا اہتمام کرو، پھر سو رکعت کی بجائے صرف بارہ رکعت سنتوں کا اہتمام رکھو، اور مہینے میں ایک ختم قرآن کیا کرو، خود کو پاکیزہ رکھو، حرام سے بچو۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ آدمی نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے، اور پرہیزگار لوگوں کے ساتھ دوستی

کرے، اور برے لوگوں کی رفاقت اور دوستی سے مکمل پرہیز کرے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے، سوتم میں سے ہر شخص غور کرے کہ اس کی دوستی کس سے ہے۔ [ترمذي]

پسرِ نوح بابدان بہ نشست ☆ خاندان نبوتش گم شد

سگ اصحاب کہف روزے چند ☆ پئے نیکان گرفت مردم شد

سورۂ فرقان میں فرمایا: ﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ۝٢٧ يَا وَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ۝٢٨﴾ [الفرقان] (اور جس دن ظالم انسان اپنے ہاتھوں کو کاٹ کھائے گا، اور کہے گا: کاش میں نے پیغمبر کی ہمراہی اختیار کرلی ہوتی۔ ہائے میرے بربادی! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا)۔

قیامت کے دن مارے حسرت اور ندامت کے دانتوں سے ہاتھ اپنا کاٹے گا، اور افسوس کرے گا کہ میں نے کیوں دنیا میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ اختیار نہ کیا، اور کیوں شیاطین الجن وشیاطین الانس اور برے لوگوں کی صحبت میں رہا، اور ان کے بہکانے میں آگیا، جو آج یہ روزِ بد دیکھنا پڑا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَا لَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِينُ﴾ [الزخرف:۳۸] (یہاں تک کہ جب ایسا شخص ہمارے پاس آئے گا تو (اپنے شیطان ساتھی سے) کہے گا کہ: کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق ومغرب کا فاصلہ ہوتا، کیونکہ تو بہت برا ساتھی تھا)۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں جب پہنچے گا تو اچھے اور برے ساتھیوں کا راز کھلے گا، تب وہ برے دوستوں سے بیزاری کا اظہار کرلے گا، مگر اب وقت نہیں رہا فائدہ نہ ہوگا۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ وَ
لَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم

بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝۱۲۰ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ نَفَقَةً صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً وَّلَا يَقۡطَعُوۡنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمۡ لِيَجۡزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحۡسَنَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝۱۲۱

ترجمہ: مدینے والے اور ان کے آس پاس رہنے والے دیہات کے لوگوں کے لئے یہ زیبا نہیں تھا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ جانے سے پیچھے رہ جائیں، اور نہ یہ بات کہ وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو چھوڑ کر اپنی جانوں کو لے کر بیٹھ جائیں، یہ اس وجہ سے کہ انہیں جو بھی کوئی پیاس یا تھکن یا بھوک اللہ تعالیٰ کی راہ میں پہنچتی ہے، اور وہ کسی جگہ جو قدم رکھتے ہیں جس سے کافروں کو جلن ہوتی ہے، اور دشمن سے جو بھی کوئی چیز لے لیتے ہیں، تو ان سب کی وجہ سے ان کے لئے نیک عمل لکھا جاتا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا ۝۱۲۰ اور وہ لوگ جو بھی کوئی چھوٹا بڑا خرچہ کرتے ہیں، اور جس کسی میدان کو قطع کرتے ہیں، تو یہ ان کے لئے لکھ لیا جاتا ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ عطا فرمائے ۝۱۲۱

معارف ومنازل

آپ نے دیکھا ہوگا اور سنا ہوگا کہ دنیا کے امراء وسلاطین اور فوجی جرنیل جو اپنی فوجوں اور سپاہیوں کی قیادت کرتے ہیں، وہ انہیں سخت سے سخت اور بڑے کٹھن محاذوں پر روانہ کرتے ہیں، اور انہیں تباہ کن معرکوں میں جھونک دیتے ہیں، جہاں سوائے لڑائی اور گھمسان جنگوں کے کچھ نہیں ہوتا، ایسے وقت میں بڑے قائدین عیش وآرام اور سہولتوں میں پیچھے بیٹھے نظارہ کرتے ہیں، یا اپنا کوئی نائب فوج کے ساتھ بھیج دیتے ہیں، یہ دنیا کے حکام وسربراہوں کا مزاج ہوتا ہے، جو خود مرنے اور تباہ کن مراحل سے کلیۃً دور رہتے ہیں۔

جبکہ اسلامی جہاد میں فوج کا سربراہ اسی طرح اجر وثواب کا طالب ہوتا ہے جس طرح کوئی سپاہی ہوتا ہے، اس کے پیش نظر سب سے بڑا قائد تمام لشکر سے آگے پہلی صفِ قتال میں اس بے جگری سے لڑتا ہے جس طرح ادنیٰ سپاہی لڑتا ہو۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حبیب کبریا ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے نام پر لڑنے والوں کے قائد ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محنت والے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جفاکش ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی فوج کی پہلی صف میں کھڑے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھانے پینے، عیش وعشرت سے کنارہ کش ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راتوں کو جاگنے والے اور دن کو اپنے لشکر کے ساتھ میدان میں کھڑے ہو کر لڑ رہے ہیں، اور ان کو

مورچوں میں تعینات کررہے ہیں۔قرآن کریم نے فرمایا: ﴿تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِیْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ [آل عمران:۱۲۱] (تم صبح کے وقت اپنے گھر سے نکل کر مسلمانوں کو جنگ کے ٹھکانوں پر جمارہے تھے)۔

اسی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوات میں خود تشریف لے جاتے تھے، تمام تکلیفوں میں بنفس نفیس شریک ہوتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لئے کوئی آرام واستراحت کی کوئی صورت نکالی ہو، اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تکلیف میں جھونک دیا ہو، ایسا ہرگز نہیں ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر تکلیف میں ان ہی کے ساتھ شریک رہے، مسجد کی تعمیر میں اینٹ اٹھانے میں، گارے بنانے میں، کسی پڑاؤ میں لکڑیاں جمع کرنے میں، الغرض جہاد کے علاوہ دیگر محاذوں میں بھی ہر موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسروں کے ساتھ مل کر خدمت کرتے، اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ عیش وعشرت والوں کو پسند نہیں فرماتے، جولوگ خدمت اور محنت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو پسند فرماتے ہیں۔

﴿مَا کَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ﴾ فرمایا: کوئی شخص خواہ اہل مدینہ میں سے ہو، خواہ آس پاس کے رہنے والے دیہاتیوں میں سے ہو، کسی کے لئے یہ کہاں جائز ہوسکتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو غزوے میں چلے جائیں اور وہ اپنی جان کو عیش وآرام اور حفاظت کے ساتھ اپنے گھر میں لئے ہوئے بیٹھا رہے، ایمانی محبت کا تقاضا یہی تھا کہ سب لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکل کھڑے ہوں۔

البتہ جو معذور تھے وہ مستثنیٰ تھے۔ البتہ باقی سارے لوگوں کو یعنی اہل مدینہ اور دیہاتیوں سب کو بیدار فرمایا، اور سختی سے تنبیہ فرمادی کہ اللہ تعالیٰ کے نبی کو چھوڑ کر گھروں میں بیٹھے رہ جانا ایمانی تقاضوں کے سراسر خلاف ہے، اور یہ کتنی بڑی بے انصافی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا پاکیزہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگ برستی ہوئی گرمی میں سب سے آگے جارہے ہوں اور تم لوگ سستی، کاہلی یا اور کسی بہانے پر گھروں اور سایوں میں بیٹھے رہو، یہ تمہارے لئے ہرگز جائز نہیں۔

ان ایمانی تقاضوں کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اجر وثواب کا بھی وعدہ فرمایا، پہلے یہ:

﴿وَلَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ﴾ یعنی جس مشقت سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے نفس شریف کو الگ نہیں رکھا، لہٰذا تم لوگ بھی اپنے نفسوں کو اس جہاد سے الگ نہ رکھو، کیونکہ:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا یُصِیْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا یَّغِیْظُ الْكُفَّارَ وَلَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ﴾

یہ ساتھ جانے کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو پیاس لگی، جو ماندگی (تھکاوٹ) پہنچی، اور جو بھوک لگی، اور جو چلنا چلے جو کفار کے لئے موجبِ غیظ ہو، اور دشمنوں کی جو کچھ خبر لی اس وجہ سے ان کے نام ایک ایک نیک کام کا اجر وثواب لکھا جائے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا جب تک جہاد سے واپس نہیں آتا اس کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے (ہر روز) روزہ رکھنے والا، ساری رات نماز پڑھنے والا، اللہ تعالیٰ کی آیات کو تلاوت کرنے والا، جو روزہ نماز سے سست نہ پڑتا ہو، چستی کے ساتھ برابر مشغول رہتا ہو (جہاد والا مجاہد اس کے ثواب کے ساتھ برابر ہے)۔ [مظهري بحواله بغوي]

﴿وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً﴾ وہ جو بھی خرچ کریں، چھوٹا یا بڑا، اور جس میدان کو بھی قطع کریں، تو یہ سب لکھا جاتا ہے، ایک ایک قدم پر نیکیاں اسی طرح گناہوں کی مغفرت اور رفع درجات وبرکات یہ سب ان کے اچھے اعمال کا بدلہ ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو ثواب مقرر ہے وہ ایک کے عوض دس سے لے کر ستر پھر سات سو پھر بیس لاکھ تک ہے۔ بیس لاکھ کی روایتِ مرفوعہ کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ كذا في الدر المنثور۔ سات سو کے راوی حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ ہیں۔ كذا في صحيح مسلم۔

فائدہ:

کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ثواب قتال کرنے والوں کے لئے ہوا، پھر یہ بھی نہ کہو کہ یہ ثواب صرف جانے والوں کے لئے خاص ہے، ہرگز نہیں، جو لوگ جانے پر تیار تھے مگر عذر کی وجہ سے نہ جاسکے، یا سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں اذان، نمازوں، عورتوں، بچوں کی حفاظت کے لئے انہیں مقرر فرمایا، وہ سب اس ثواب میں شریک ہوئے۔ حدیث اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ۔ بہت بڑی جامع حدیث ہے، اس پر خوب غور کرو، اور بے شمار اجر وثواب کماؤ۔ الحمد لله رب العلمين

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿١٢٢﴾

ترجمہ: اور مؤمنین کو یہ نہ چاہئے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں، کیوں نہ نکلی چھوٹی جماعت ہر بڑی جماعت میں سے تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کرے، اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو ڈرائیں، جبکہ وہ ان کے پاس واپس

آجائیں۱۲۲

معارف ومنازل

اسلام پوری کائنات پر حاوی مذہب ہے، کیونکہ وہ دینِ الٰہی ہے، جہاں جہاں بادشاہ کا اقتدار ہوتا ہے وہاں وہاں تک اس کا قانون اور نظامِ حکومت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مٰلِکُ المُلک ہے، سارے جہاں کا خالق و مالک ہے، اس بنیاد پر سارے جہاں پر اس کی حکمرانی اور قانون لاگو ہے، جس کا نام اسلام ہے۔

دوسرے سارے مذاہب ایک تو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ دوئم یہ کہ وہ سارے ناقص ہیں۔ سوئم یہ کہ وہ سارے باطل اور باغی ہیں۔ چہارم یہ کہ وہ نجات دہندہ نہیں۔ پنجم یہ کہ وہ سارے تضادات پر مبنی ہیں۔ ششم یہ کہ ان میں انصاف پر مبنی حقوق کا تحفظ نہیں۔ ہفتم یہ کہ ان کے اندر سارے انسان ایک جیسے نہیں، اونچ نیچ کی بھر مار ہے۔ ہشتم یہ کہ ان کے قوانین ہر معاشرہ پر منطبق نہیں۔ نہم یہ کہ زمانہ کی تبدیلی سے تبدیل ہوجاتے ہیں۔ دہم یہ کہ ان میں انسانی شرافت کا نام تک نہیں، حیا، اخلاقِ فاضلہ، عورتوں، ماں باپ کے حقوق اور ان کی خدمت کا نام ونشان نہیں، شراب، زنا یہاں تک کہ ماں بہن کے ساتھ زنا عیب نہیں، حلال وحرام کی تمیز نہیں، اور سب سے بڑا گناہ بھی ان کے نزدیک گناہ متصور نہیں، وَغیر ذٰلِکَ مِنَ الخرافَات۔

جبکہ اسلام دینِ الٰہی ہے، کامل ومکمل ہے، تمام شرافتوں کا گہوارہ ہے، جامع ہے، انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، حقوق اللہ، حقوق العباد، بلکہ حقوق الحیوانات پر بھی اس کی تعلیمات وہدایات ہیں، اس میں اعتقادات بھی ہیں، اور عبادات بھی، اخلاقیات بھی اور آداب بھی ہیں، معاشرت کے طریقے بھی ہیں اور معاملات کے احکام بھی، بیاہ شادی بھی ہے، طلاق وتفریقات بھی، غلاموں، کنیزوں، ضعیف کمزوروں، مزدوروں، رشتہ داروں، پڑوسیوں، حکمرانوں، ماں باپ، بیوی، بچوں، غرض یہ کہ تمام انسانی طبقوں کے حقوق کی پاسداری اور پاسبانی کے طرز وطریقے عدل وانصاف اور مساوات کے لئے ہدایات، ہر قسم کے ظلم وزیادتی کی حرمت اور حرام وحلال فرائض واجبات، مکروہات ومباحات کے سارے طریقے اسلام نے سکھائے۔

صرف فقہ حنفی کے جزئی احکام ومسائل آج سے تقریباً چھ سو سال پہلے شارح بخاری محدث کبیر علامہ بدر الدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق بارہ لاکھ چالیس ہزار مسائل بتائے گئے ہیں، یہ چاروں فقہوں میں سے

صرف ایک فقہ کے مسائل ہیں، جنہیں ائمہ کرام اور فقہاء اسلام نے کتاب اللہ وسنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اجماع امت کے فرمودات سے استنباط کیا ہے۔ اب موجودہ زمانہ میں یہ مسائل تیرہ لاکھ سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔

موجودہ زمانہ میں صرف قرآن حکیم کے حواشی وتفاسیر کی تعداد ڈھائی لاکھ سے زائد ہے، دس لاکھ احادیث کا ذخیرہ اس کے علاوہ ہے۔ کفر کو مٹانے اور اہلِ کفر کی شوکت ختم کرنے اور انہیں نیچا دکھانے، اور خالق ومالک کائنات سبحانہ وتعالیٰ کا بول بالا کرنے کے لئے جہاد وقتال کا نظام جاری ہے، اور ہر محاذ پر مشروع ہے، اور یہ بھی دینِ اسلام کا ایک ضروری اور بہت اہم کام ہے، جیسے حدیث نے ذُرْوَةُ سَنَامِهِ الجِهَاد۔ یعنی چوٹی کا عمل بتلایا ہے۔

لیکن اگر سارے ہی افراد جہاد میں لگ جائیں تو سب سے بڑا اور تمام احکامِ الٰہی کا سرچشمہ تعلیم وتعلم کا کام کون کرے، جس کے ذریعہ علوم واعمال اور دینی اقدار زندہ رہتے ہیں، اور مسائل وفضائل کا پتہ چلتا ہے، اور زندگی کے احکام معلوم ہوتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا [مشكوة]

جہاد کی اقسام:

جہاد اگرچہ فرائضِ اسلام میں سے ہے، مگر عام حالات میں جہاد نماز کی طرح فرض عین نہیں ہے، فرضِ عین اس وقت ہوتا ہے جب دشمن کسی علاقہ پر حملہ آور ہو، عام حالات میں جہاد فرضِ کفایہ ہے۔ جب جہاد فرض کفایہ ہو جس میں سارے مسلمانوں کی شرکت ضروری نہ ہو، اور دین کی دوسری ضروریات کا معاملہ بھی درپیش ہو، یعنی ان کی انجام دہی بھی ضروری ہو، خصوصاً جب علومِ اسلامیہ کا سیکھنا اور جاننا اور دوسروں تک پہنچانا اور اشاعت کرنا پھیلانا بھی ضروری ہو۔

تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہر آدمی ہر وقت جہاد کے لئے نکل کھڑا ہو، دنیاوی امور ہوں یا دینی معاملات ان کی انجام دہی کے لئے ضروری ہے کہ تقسیم کار کے ضوابط اور قوانین پر عمل درآمد ہو، تب سرے سے معاملات خوش اسلوبی سے تکمیل پائیں گے، اور کوئی متروک نہیں رہے گا، اسی لئے ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً﴾ مؤمنین کے لئے یہ نہیں ہونا چاہئے کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں۔ ہاں! ایسا ہونا ضروری ہے کہ ہر بڑی جماعت میں سے کچھ جہاد کے لئے جایا کریں، اور باقی لوگ علوم سیکھنے اور سکھانے میں مشغول ہوں، پس ایسا کرنے میں جہاد اور علوم دونوں احسن طریقہ پر انجام پائیں گے، اور کام پورا ہوگا۔

شیخ الاسلام نے فرمایا: مطلب یہ ہے کہ جہاد کے سفر میں ہر قوم اور قبیلہ میں سے ایک جماعت نکلے، باقی لوگ دوسری ضروریات میں مشغول ہوں۔ اب اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنفس نفیس جہاد کے لئے تشریف لے جا رہے ہوں، تو ہر قوم میں سے جو جماعت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ نکلے گی وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں رہ کر اور سینکڑوں حوادث وواقعات میں سے گزر کر دین اور احکامِ دینیہ کی سمجھ حاصل کرے گی، اور واپس آ کر اپنی باقی ماندہ قوم کو مزید علم وتجربہ کی بناء پر اچھے طریقے سے آگاہ کرے گی۔

اور فرض کیجیے: اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود مدینہ میں رونق افروز رہے، تو باقی ماندہ لوگ جو جہاد میں نہیں گئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت سے مستفید ہو کر دین کی باتیں سیکھیں گے، اور مجاہدین کی غیبت میں جو وحی ومعرفت کی باتیں سنیں گے مجاہدین کی واپسی پر ان کو انہی باتوں سے خبردار کریں گے۔ آیت کے الفاظ میں عربی ترکیب کے اعتبار سے دونوں احتمال ہیں، **کمافي روح المعاني وغیرہ۔**

امام ابوحیان رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ آیت جہاد کے لئے نہیں، طلبِ علم کے بارے میں ہے، جہاد اور طلبِ علم کی آیات میں مناسبت یہ ہے کہ دونوں میں خروج فی سبیل اللہ ہے، اور دونوں کی غرض احیاء واعلاء دین ہے، ایک میں تلوار سے، دوسرے میں زبان سے، وغیرہ۔ [تفسیر عثمانی]

علم کی قسمیں:

جہاد کی طرح علم کی بھی دو قسمیں ہیں: فرض عین، اور فرض کفایہ۔ فرض عین کا مطلب یہ ہے کہ ہر مرد عورت بالغ پر ضروریاتِ دین کا سیکھنا اور جاننا فرض عین ہے، جس کا ترک ناجائز ہے، مثلاً ہر شخص پر فرض درجہ کے عقائدِ اسلامیہ اور ایمانیات کا جاننا اور ان کا عقیدہ رکھنا، نماز کے احکام ومسائل جاننا اور نماز کو سیکھنا اور یاد رکھنا، طہارت و نجاست کے مسائل معلوم کرنا، اور حلال وحرام، جائز وناجائز اور تمام احکام کا جاننا جن سے ہر شخص کو روزانہ واسطہ پڑتا ہے، یہ فرض عین ہے۔

جو لوگ تجارت کرتے ہیں ان کے لیے تجارت کے مسائل جاننا فرض عین ہے، اسی طرح جو لوگ زراعت، ملازمت، صنعت وحرفت، اُجرت اور کسی بھی کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، اپنے اپنے مشاغل اور مکاسب کے بارے میں احکام ومسائل سیکھیں، جو کہ ان پر فرض عین ہیں، تا کہ خلاف شرع طریقوں سے مال نہ کمائیں، ورنہ گناہ گار ہوں گے، اور دوسرے نیک اعمال پر بھی برا اثر پڑے گا۔

اسی طرح روزہ دار پر روزے کے مسائل، مالدار پر زکوۃ کے مسائل، اسی طرح حج وعمرہ اور جہاد کے مسائل، حقوق اللہ وحقوق العباد کے مسائل واحکام جاننا سیکھنا یہ سارے فرض عین ہیں، ورنہ گناہ کے علاوہ یہ تمام اعمال ضائع و برباد ہو جائیں گے، اور غیر شرعی ہو کر ثواب بھی نہیں ملے گا۔ لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ غیر مسلموں کی طرح اپنے کو آزاد سمجھتے ہیں، اور جیسے چاہتے ہیں مسلمان ہوتے ہوئے کافروں کی طرح زندگی گزارتے ہیں، نہ ماں باپ کے حقوق کا پتہ، نہ میاں بیوی کے حقوق کا پتہ، نہ اولاد کی تعلیم وتربیت کا خیال، اور نہ عزیز واقرباء کے حقوق کی ادائیگی کی فکر، نہ حلال وحرام کی تمیز، نہ آخرت کی پرواہ، ان سب کو چھوڑیئے حق تعالیٰ کی عظمت و مالکیت اور اس کے حقوق سے سراسر غفلت ولاپرواہی۔ یہ طریقہ اہل ایمان کا نہیں کہ صرف زبانی اقرار ہو کہ میں مسلمان ہوں، اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا، مرتے وقت سلامتی ایمان بہت ضروری ہے، اور سلامتی ایمان کے اسباب یہی اعمالِ صالحہ ہی ہیں، اور کچھ نہیں۔

فضائلِ علم وعلماءِ ربانی:

(۱) ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ [البقرة: ۳۱] (اور آدم (علیہ السلام) کو سارے نام بتادیئے)۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو براہِ راست علم الاسماء کی تعلیم اللہ تعالیٰ شانہ نے دی تھی، اللہ تعالیٰ معلّمِ اول ہیں، اس سے بڑھ کر علم کی فضیلت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح سارے انبیاء کرام علیہم السلام کا معلّم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام محض واسطہ اور پیغام رساں ہیں۔ سارے انبیاء کرام علیہم السلام کا علم آسمانی ہے، زمینی نہیں، پھر حضرت آدم علیہ السلام کو مسجودِ ملائکہ اسی علم کی برتری کی وجہ سے بنایا گیا۔ البتہ نرا علم مدارِ فضیلت نہیں، بلکہ علم وعمل اور عبادت کا مجموعہ مدارِ کمال وشرف ہے۔

(۲) ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [الزمر: ۹] (کیا اہل علم اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟) ہرگز نہیں۔

(۳) ﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ [المجادلة: ۱۱] (اللہ ان لوگوں کے درجات بلند فرماتا ہے جنہوں نے تم میں سے ایمان لایا، اور جنہیں علم دیا گیا)۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو بلندی اور اہل علم کو بڑے درجات عطا کرتے ہیں۔

(۴) ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [فاطر: ۲۸] (اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں صرف اہل علم ڈرتے ہیں)۔

(۵) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص طلبِ علم کے لئے نکلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا راستہ جنت کی طرف کر دیتے ہیں، اور یہ کہ فرشتے طالبِ علم کے پاؤں کے نیچے اپنے پر بچھا دیتے ہیں، اور یہ کہ آسمان وزمین کی مخلوقات اور سمندر کی مچھلیاں اہل علم کے لئے دعا واستغفار کرتی رہتی ہیں، اور یہ کہ عالم کی فضیلت نفلی عبادت کرنے والے کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے چودھویں کے چاند کی فضیلت عام ستاروں پر، اور ایک روایت میں ہے کہ جیسی میری فضیلت ایک ادنیٰ امتی کے مقابلہ میں، اور یہ کہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، انبیاء علیہم السلام کا ترکہ سونا چاندی نہیں، ان کا ترکہ تو علم ہے، جس نے یہ وراثت حاصل کر لی اس نے بڑی دولت کمالی۔ [بخاري، مسلم، ترمذي وغيره كتب حديث]

(٦) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے بھاری ہے۔ [ترمذي]

(۷) ایک صحابی نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ بنی اسرائیل میں دو شخص تھے: ایک عالم تھا جو فرائض کو ادا کر کے تعلیم میں مشغول ہو جاتا، اور دوسرا دن کو نفل روزہ رکھتا اور رات بھر نمازیں پڑھتا، ان میں افضل کون تھا؟ فرمایا: عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ پر۔ [مشكوة]

(۸) سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، البتہ تین اعمال کا ثواب بدستور جاری رہتا ہے: ایک صدقہ جاریہ، دوسرا علمِ نافع، تیسرا اولادِ صالح۔ [بيهقي، شعب الإيمان]

اس کے علاوہ اگر مزید فضائل علم کی تلاش ہو تو جامع بیان العلم وفضلہ کا مطالعہ کریں۔

ایک ضروری ہدایت، اور امت کا فرض:

جس طرح بطور فرض کفایہ نظامِ جہاد کو زندہ رکھنا ضروری ہے، تا کہ کفار کا مسلمانوں پر غلبہ نہ ہو، اور مسلمانوں کی بقاوحیات متزلزل نہ ہو، اور وہ اپنے ملکوں میں خوشحالی اور آرام سے زندگی گزار سکیں، اسی طرح تمام عالمِ اسلام پر ضروری ہے، اور بطور فرض کفایہ امت مسلمہ کے فرائض میں شامل ہے کہ علومِ شرعیہ کی خدمت کریں، اور علومِ نبوت کا پورے اہتمام کے ساتھ تحفظ واشاعت کریں، اور علومِ نبوت کو پڑھتے پڑھاتے رہیں، اور علماء وطلباء، مبلغین، مصنفین، مؤلفین، ائمہ مساجد وخطباء اور ہر طرح کے حفاظ وقراء کی سرپرستی، حوصلہ افزائی اور دلجوئی کریں، تا کہ امت

مسلمہ کا یہ گرانقدر قیمتی سرمایہ محفوظ رہے، جس کی بقاء کے ساتھ پوری امت کی بقاءاور سرفرازی وخوشحالی وابستہ ہے۔

قرآنی علوم کی سرپرستی پوری امت پر فرض ہے، قرآن مجید کے علوم کومحفوظ رکھنا، احادیث مبارکہ اور دیگر تمام اسلامی علوم کومحفوظ رکھنا، یہ سب پر بطور فرض کفایہ لازم ہے۔

یادرکھیں! یہ سارے علوم ہدایت کے روشن مینار اور چشمے ہیں، یہ ہمارے محتاج ہرگز نہیں، ان کا محافظ و نگہبان اللہ تعالیٰ سبحانہ کی ذات ہے، بلکہ ہم اپنی بقاء اور صلاح وفلاح میں ان کے محتاج ہیں، اگر یہ خدانخواستہ پس منظر میں چلے گئے تو ذلت وخواری ہماری مقدر ہوگی۔ اگر ہم دنیا میں ذلیل ہوئے تو شاید موت کے ساتھ ذلت ختم ہو، مگر آخرت کی رسوائی اور ذلت سے کبھی نجات ممکن نہیں۔ بڑے قابل قدر واحترام ہیں، بلکہ صاحب شرف ومنزلت ہیں، مزید عرض کروں کہ ربّ العزّت کے محبوب وپسندیدہ ہیں وہ علماء وفضلاء اور طلباء جو دنیاوی عیش وعشرتوں سے اور زمانہ کی لذتوں سے مستغنی وبے نیاز ہوکر چٹائیوں پر، اور درختوں کے سائے کے نیچے بیٹھ کر اس فسق وفجور کے دور میں اپنے ربّ کے کلام اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وعلوم کی خدمت میں شب وروز مصروف ومشغول ہیں، جو دنیا سے مستغنی ہوکر، سرمایہ داروں کے دروازوں سے دور رہ کر اپنے ربّ کے ساتھ امیدیں وابستہ کر کے ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ [آل عمران:۱۷۳] (ہمارے لیے اللہ ہی کافی ہے، اور وہ بہترین کارساز ہے) کی گونج میں لاکھوں مساجد اور ہزاروں دینی عربی مدارس آباد کئے ہوئے ہیں، قَالَ اللّٰهُ وَقَالَ الرَّسُوْل کا درس دے رہے ہیں۔

جن کی ٹھوکر پر نچاور سروری وافسری ☆ سر سے پا تک اتباع سنت پیغمبری

جو ہیں مستغنی عنایات وزیروشاہ سے ☆ جن کی امیدیں ہیں وابستہ فقط اللہ سے

وہ اصحابِ علم اور فرزندانِ توحید قرآن وحدیث کے وارث کتنے خوش قسمت ہیں کہ تکوینی طور پر ربّ العٰلمین مالکُ الملک نے انہیں سارے جہاں کے لوگوں سے چھانٹی کر کے منتخب کیا ہے، جس پر اگر ہمارے علماء زندگی بھر سر بسجود رہیں، پھر بھی اس کا حق ادا نہ ہو، جیسے شاعر نے کہا:

منت منہ بہ سلطان کہ خدمت ہمی کنی ☆ منت ازو شناس کہ بخدمت گزاشتت

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنْبَغِيْ لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَعَظِيْمِ سُلْطَانِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔

﴿لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ﴾ تاکہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔ فقہ دینی سمجھ کا نام ہے، خیر القرون میں اس کا

مفہوم عام تھا، حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی یہ تعریف کی ہے: مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالَهَا وَمَا عَلَيْهَا۔ کہ ہر شخص کا یہ پہچان لینا کہ میری ذمہ داری کیا ہے، میں دنیا اور آخرت میں کن کن چیزوں کا مسئول (جوابدہ) ہوں، اور وہ کیا کیا چیزیں ہیں جن کا انجام دینا میرے ذمے لازم ہے۔ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد ان سب کو جاننے پہچاننے، اور اسی کے مطابق عمل کرے، اس میں پورے دین کا سمجھنا، اور اپنی جان پر نافذ کرنا آ گیا۔ درحقیقت یہ فقہ کی جامع تعریف ہے، اور ﴿لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ کے مفہوم میں یہ سب احکام ومسائل آجاتے ہیں۔

احکام ومسائل کا جو علم ہے اور جو امور روح، قلب اور تزکیۂ نفس سے متعلق ہیں، فقہ ان سب کو شامل ہے۔ اسی کو حدیث میں فرمایا: مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ۔ [بخاري]

کہ اللہ تعالیٰ جس بندہ کو خیر سے نوازتے ہیں، اور اس کے متعلق خیر کا ارادہ فرماتے ہیں، تو اسے فقہ فی الدین کی دولت سے نوازتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو دعاء دیتے ہوئے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض کیا تھا: اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ۔ اے اللہ تعالیٰ! اسے فقہ فی الدین عطا فرما۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تَفَقَّهُوا قَبْلَ اَنْ تُسَوَّدُوا۔ [بخاري]

یعنی اس سے پہلے فقیہ بن جاؤ کہ تم کو سرداری سپرد کی جائے، یعنی نوعمری اور جوانی کی عمر میں بڑے ہونے سے پہلے فقیہ بننے کی کوشش کرو۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو نقل کرنے کے بعد فرمایا: وَبَعْدَ اَنْ تُسَوَّدُوا، سرداری حاصل ہونے کے بعد بھی فقیہ بننے کی کوشش جاری رکھو۔ [بخاري]

فقہ فی الدین بہت بڑی دولت ہے:

فقہ فی الدین اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور نہایت بلند اعزاز ہے، یہ جس کو بھی حاصل ہو جائے وہ بڑا سعادت مند ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کچھ دریافت کیا، انہوں نے کچھ جواب دیدیا، سائل نے کہا کہ دوسرے فقہاء تو آپ کی مخالفت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا: تم نے کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟

اس کے بعد فقیہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا، جس کا ترجمہ یہ ہے: فقیہ وہ ہے جو (۱) دنیا سے بے رغبت ہو (۲) آخرت کی طرف متوجہ اور راغب ہو (۳) اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہو (۴) اپنے رب کی عبادت میں لگا رہتا ہو (۵) پرہیزگار متقی ہو (۶) مسلمانوں کی بے آبروئی کے درپے نہ رہتا ہو، یعنی ان کی غیبتیں نہ کرتا ہو، ان پر تہمت نہ دھرتا ہو (۷) لوگوں کے مال سے دور رہتا ہو (۸) اور مسلمانوں کی جماعت کا خیر خواہ ہو۔ [روح المعاني]

اگر کسی میں یہ آٹھ صفات موجود ہوں وہ فقیہ کہلائے گا، ورنہ خدا حافظ۔ جو حضرات آیات قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے غیر منصوص مسائل کا استنباط کرتے ہیں جیسے ائمہ اربعہ رحمہم اللہ نے کی ہے، یہ بھی فقہ فی الدین ہے، اور جو صوفیائے کرام اصلاحِ قلوب اور تزکیہ نفوس، طہارتِ باطن کے شغل میں لگے ہوئے ہیں، اور امت کی اصلاح کی اجتماعی اور انفرادی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں، وہ بھی فقہ فی الدین میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ ایک بات واضح ہے کہ فقہ اور علمِ فقہ دو جدا جدا چیزیں ہیں، پہلا عام ہے دوسرا خاص، اور دونوں محمود و مطلوب اور پسندیدہ ہیں، دونوں کا سرچشمہ اور بنیاد کتاب وسنت اور وحی الٰہی ہے، پس جو لوگ (ظاہر بین تزکیہ نفوس کے دشمن) فقہ کا نام سنتے ہی آگ بگولہ ہو جاتے ہیں، خود کو سلفی کہتے ہیں، اور درحقیقت سلف کے دشمن اور بدخواہ ہیں، اور یہ لوگ فقہ کو بدعت اور اہلِ فقہ کو بدعتی کہتے ہیں، ان کی بدقسمتی دیکھو کہ سب وشتم سلف ان کا شیوہ ہے، اور یہ لوگ کہتے ہیں فقہ کی کیا ضرورت؟ حدیث دیکھ کر عمل کرلیں گے، جیسے منکرینِ حدیث کہتے ہیں کہ حدیث کی کیا ضرورت؟ قرآن حکیم کو دیکھ کر عمل کرتے ہیں۔

لگتا ہے کہ یہ دونوں اور ان کا تیسرا گروہ یعنی روافض ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں، کیونکہ انکار وسبِّ سلف کے گناہ میں سب برابر کے شریک ہیں، فرق اتنا ہے کہ روافض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کافر ومرتد کہتے ہیں، اور یہ لوگ بیس رکعات تراویح مع الجماعۃ کی وجہ سے بدعتی اور دشمنِ سنت کہتے ہیں۔ میرے ساتھ مناظرہ میں سارے مجمع کی موجودگی میں غیر مقلد عالم نے صاف کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ بدعتی تھے، انہوں نے دین میں تحریف کی ہے، اور حدیث: عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ یہ موضوع حدیث ہے، بس اسی پر مناظرہ اختتام کو پہنچا۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

آپ نے دیکھا ہوگا یہ لوگ سارے فِرَقِ باطلہ کے خلاف کچھ کہنے سے محتاط رہتے ہیں، اور انہیں ایک آدھ کلمہ کے علاوہ کچھ نہیں کہتے، ان کی پوری قوت اور اربوں روپیہ کا سرمایہ صرف "حنفیت" کے خلاف صرف ہو رہا ہے۔

﴿وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْٓا﴾ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ۔ [بخاری] حدیث شریف نے خیر کے دو حصے اور دو اجزاء بتائے ہیں: ایک یہ کہ قرآن کو سیکھو، دوم یہ کہ دوسروں کو سکھاؤ۔ آیت کریمہ نے بھی یہی بتایا کہ تم علم وفقہ سیکھو، پھر جب واپس اپنے گھروں کو پہنچو تو اپنی قوم کو تبلیغ کرو، اور ان کو گناہوں سے بچانے کی کوشش کرو، اور انہیں کفر ونفاق اور معاصی کے انجامِ بد سے ڈراؤ،

اِنْذَار و تَبْشِیْر کے قواعد پر عمل کرو، یہ اِنْذَار و تَبْشِیْر انبیاء کرام علیہم السلام کی محنت اور پسندیدہ فرائض ہیں۔

جب علماء کرام انبیاء کرام علیہم السلام کے ورثاء مقرر ہوئے تو انہیں وہی کام کرنا چاہئے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے کیا، اور انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنے علم پر مکمل عمل بھی کیا، اور خلق خدا کو تبلیغ بھی کی، یہاں تک کہ اپنے علم کا ایک ذرہ بھی نہیں چھپایا، پس ہر عالم انبیاء کرام علیہم السلام کا وارث شمار نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام والا کام نہ کرے، اور ان کے نقشِ قدم پر نہ چلے۔

علم کی مثال اس درخت کی ہے جس کا سایہ بھی ہو، اور پھل بھی، اگر درخت ان دونوں سے خالی ہو تو کاٹنے کا مستحق ہوگا، اسی طرح علم کا حال ہے کہ عمل اس کا پھل ہے، اور تبلیغ و انذار اس کا سایہ ہے، اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو حدیث کی رو سے بے عمل عالم کو دوزخ میں تمام دوزخیوں سے زیادہ بدترین عذاب ہوگا۔ [ترمذي] صرف نرا علم بغیر عمل کے نہ سببِ نجات ہے، نہ موجبِ فضیلت۔ آج ہمارے زمانے میں بہت سے یہودی، نصرانی کافروں نے ضخیم ضخیم دس، پندرہ اور بیس جلدوں میں قرآن کریم کی تفاسیر اور حدیث کی شروحات و حواشی اور سیرت النبی و تاریخِ اسلام اور لغت پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کی ہیں، جنہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ کسی غیر مسلم کی لکھی ہوئی تالیفات ہیں، اور بہت سے غیر مسلم پروفیسر یونیورسٹی اور کالجوں میں اسلامیات کے مضامین پڑھا رہے ہیں، کیا ان کا یہ علم نافع اور سببِ نجات ہے؟

ہرگز نہیں، سببِ نجات اور باعثِ سعادت صرف وہ علم ہے جس پر پورا پورا عمل ہو، ورنہ وہ علم بجائے سعادت کے موجبِ حسرت اور باعثِ تباہی ہوگا۔ وَیْلٌ لِلْجَاهِلِ مَرَّةً وَلِلْعَالِمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن بے عمل جاہل سے بے عمل عالم کا عذاب ستر ٧٠ مرتبہ زیادہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ آمین

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَ

لَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۝۱۲۶ وَإِذَا مَآ أُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ إِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ أَحَدٍ ثُمَّ
انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۝۱۲۷

ترجمہ: اے ایمان والو! ان کافروں سے قتال کرو جو تمہارے آس پاس ہیں، اور وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں، اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ شانہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے ۱۲۳ اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس نے تم میں سے کس کے ایمان کو بڑھایا؟ سو جو لوگ اہل ایمان ہیں اس سورت نے ان کے ایمان کو بڑھا دیا، اور وہ خوش ہوتے ہیں ۱۲۴ اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے سو اس سورت نے ان کی گندگی پر گندگی بڑھا دی، اور وہ اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر ہیں ۱۲۵ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو بار کسی نہ کسی مصیبت میں ڈالے جاتے ہیں، پھر وہ رجوع نہیں کرتے، اور نہ نصیحت حاصل کرتے ہیں ۱۲۶ اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ تمہیں کوئی شخص دیکھ تو نہیں رہا، پھر چل دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا، اس وجہ سے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں ۱۲۷

معارف ومنازل

تبلیغ ہو یا جہاد اس کے اصول بتاتے ہوئے فرمایا کہ اَلْاَقْرَب فَالْاَقْرَب کے اصول پر عمل ہونا چاہئے، جیسے تبلیغ کے سلسلے میں فرمایا: ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ [الشعراء: ۲۱۴] (اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈرائیں)۔ یعنی ہدایت و تبلیغ اول اپنے گھر کے افراد سے ہو، پھر رفتہ رفتہ پڑوس میں، پھر بستی اور شہروں میں، پھر پورے ملک میں، پھر باہر کی دنیا میں یہ حکمت عملی کامیاب بھی ہے، اور مؤثر بھی۔

اسی طرح جہاد کے سلسلے میں پہلے قریش سے معرکے ہوئے، پھر قرب و جوار کے بنوقینقاع، بنونضیر، بنوقریظہ اور خیبر، پھر ملک شام غزوۂ تبوک جو کہ قیصر روم کا علاقہ تھا، جب آپ ﷺ ملا اعلیٰ کی طرف روانہ ہوئے، تو یہی سبق اور طرزِ جہاد اپنے جانشینوں کے سپرد فرمایا، چنانچہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے انہی خطوط پر جہاد کا سلسلہ جاری رکھا، اور بے مثال فتوحات ہوئیں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک ہزار شہر فتح ہوئے، اور قیصر و کسریٰ کے تین ہزار سال سے قائم عظیم سلطنتیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں، فرمایا:

﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ﴾ اے ایمان والو! پہلے ان کافروں سے جہاد کرو جو تمہارے

قرب وجوار میں ہیں، کیونکہ جب قریب والے ڈرتے رہیں گے، تو اس کا دور والے کافروں پر بھی اثر پڑے گا، اور تمہارا رعب ان کے دلوں میں پیوست ہو جائے گا۔

﴿وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ تا کہ کافر تمہارے اندر شدت وحمیت اور بہادری محسوس کریں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے غِلْظَة کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: صَبْرًا عَلىٰ جِهَادِهِمْ۔ یعنی کافروں سے مقاتلہ و مقابلہ ہونے لگے تو جم کر صبر کے ساتھ مقابلہ کرو، وہ تمہارے اندر نرمی و کمزوری محسوس نہ کریں، بلکہ انہیں یہ محسوس ہو کہ تم لوگ شوکت اور قوت والے ہو، دبنے والے اور بھاگنے والے نہیں ہو۔ [معالم التنزیل]

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ اس بات کو جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے، تم تقویٰ اختیار کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی نصرت تمہیں حاصل رہے گی۔ مطلب یہ ہے شریعت کے خلاف کام نہ کرو، اطاعت شعار، عبادت گزار بنو، اور حکم مانو۔

منافقوں کی کافرانہ باتیں:

سورۂ انفال اور سورۂ توبہ مضمون کے اعتبار سے ایک جیسی ہیں، انفال کے شروع میں ایمان کی زیادتی کا بیان تھا کہ مؤمن قرآن کی آیات سن کر ان کو ایمان میں نورانیت اور زیادتی پیدا ہو جاتی ہے، اب سورۂ براءت کے آخر میں پھر اس زیادتی ایمان کا تذکرہ ہے، جبکہ ان کے مقابل منافقین کے کفر میں زیادتی کا بیان ہے، وہ یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی کوئی سورت نازل ہو جاتی ہے تو منافقین آپس میں دل لگی کے طور پر پوچھتے ہیں کہ بتاؤ اس سورت یا آیت کے ذریعہ تمہارے ایمان میں کیا ترقی ہوئی، اور کیا اضافہ ہوا؟

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرمایا: جو اہل ایمان ہیں ان کے دلوں میں قرآن کریم کی سورتوں کے نزول سے ترقی ہوتی ہے، اور وہ خوش ہوتے ہیں، اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے یعنی نفاق ہے ان کی دلوں کی ناپاکی میں اس سے اور اضافہ ہوتا ہے۔ ان سے پہلے جو سورتیں نازل ہو چکی تھیں اب تک وہ انہی کے منکر تھے، اب جو نئی سورت نازل ہو گئی اس کے بھی منکر ہو گئے، اور ساتھ ہی اس کا مذاق بھی اڑایا، لہٰذا یہ کفر بالائے کفر ہو کر ان کے کفر میں اضافہ ہو گیا، اور یہ کفر پر جمنا اور کفر میں ترقی کرتے جانا ان کے کفر پر مرنے کا سبب بن گیا، قیامت کی رسوائی اور ابدی عذاب کے مستحق ہو گئے، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ

پھر فرمایا: کیا یہ منافق لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ہر سال میں ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، ان

کے نفاق کا راز کھل جاتا ہے، امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جہاد سے پیچھے رہ جاتے ہیں، ان کے نفاق کا راز کھل جاتا ہے، بار بار سرزنش اور عتاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ذلیل وخوار اور شرمندہ ہو جاتے ہیں، مگر پھر بھی توبہ نہیں کرتے ہیں، اور نفاق سے باز نہیں آتے ہیں، اور نصیحت بھی حاصل نہیں کرتے، اور عبرت نہیں پکڑتے ہیں، ڈھیٹ بن کر پھرتے رہتے ہیں۔

پھر ان کی ایک اور شرارت کا ذکر فرمایا، وہ یہ کہ جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو چپکے سے فرار ہونے کے لئے ایک دوسرے کی طرف آنکھوں کے اشارے سے دیکھتے ہیں، اور اس تاک میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے کوئی شخص کھسکتے ہوئے دیکھ نہ لے، آپس میں کہتے ہیں کہ دیکھو کہ ہمیں تو کوئی دیکھ نہیں رہا، اگر کوئی مسلمان دیکھ رہا ہوتا تو وہیں مجلس میں بیٹھے رہتے، اور جب دیکھا کہ کسی کی بھی نظر نہیں پڑ رہی ہے تو چپکے سے بھاگ جاتے تھے۔ اپنے خیال میں انہوں نے بڑی ہوشیاری کی، لیکن اس کی بری سزا انہیں یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اسلام سے پھیر دیا، اور انہیں جہنم کے سپرد فرمایا۔

صاحب معالم التنزیل نے لکھا ہے کہ یہ اکثر ایسے موقع میں ہوتا تھا جب کوئی ایسی آیت نازل ہوتی جس میں منافقین کے بارے میں زجر و توبیخ کا مضمون نازل ہوتا تھا، اور منافقین کے عیوب و نقائص منکشف ہوتے تھے۔

﴿بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ﴾ ان لوگوں کی یہ حرکتیں اور حرکتوں کے انجام بد سے یہ ناواقف رہتے ہیں قصداً، پھر اگر یہ لوگ صرف مسلمانوں کے رویہ پر غور کرتے تو شاید ایسا نہ کرتے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢٨﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿١٢٩﴾

ترجمہ: بلاشبہ تمہارے پاس رسول آیا ہے، جو تم میں سے ہے، تمہیں جو تکلیف پہنچے وہ اس کے لئے نہایت گراں ہے، وہ تمہارے نفع کے لئے حریص ہے، مؤمنین کے ساتھ بڑی شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرنے والا ہے ﴿١٢٨﴾ سو اگر لوگ روگردانی کریں تو آپ فرما دیجئے کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا، اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے ﴿١٢٩﴾

معارف ومنازل

سید کائنات رحمۃ للعلمین ﷺ کی صفات عالیہ:

یہ دو آیتیں ہیں جن پر سورۂ توبہ ختم ہو رہی ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ دونوں آیتیں قرآن کریم کی آخری آیات ہیں، ان کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ پہلی آیت میں سید کائنات خاتم النبیین رحمۃ للعلمین ﷺ (فِدَاهُ أَزْوَاحِنَا) کی بعض صفاتِ عالیہ کا بیان ہے۔ اول تو یہ فرمایا کہ تمہارے پاس ایک رسول آئے جو بہت بڑے مرتبہ والے رسول ہیں، ساری کائنات سے بزرگ تر و برتر ہیں، سچ پوچھو تو عرشِ الٰہی سے بھی افضل ہیں (رَسُوْلٌ کی تنوین تعظیم کے لئے ہے)۔ اور یہ رسول ﷺ تم ہی میں سے ہیں۔

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ تمہاری طرح عرب ہیں، مخاطبین اولین عرب ہی تو تھے، یہ نسب کے اعتبار سے تم میں سے ہیں، جن کا سلسلہ نسب آباء و اجداد سب تمہیں معلوم ہیں، بلکہ نسب کے لحاظ سے بھی تمہارے اندر عالی نسب والے ہیں۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے شاہ حبشہ نجاشی کے سامنے، اور مغیرہ رضی اللہ عنہ ابن شعبہ نے کسریٰ اور رستم کے سامنے اس بات کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا: اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ فِيْنَا رَسُوْلًا مِّنَّا نَعْرِفُ نَسَبَهٗ وَصِفَتَهٗ وَمَدْخَلَهٗ وَمَخْرَجَهٗ وَصِدْقَهٗ وَاَمَانَتَهٗ۔ [ابن کثیر]

آپ ﷺ جن لوگوں میں پیدا ہوئے نبوت سے چالیس سال پہلے تک امانتدار، صادق اور امین کے لقب سے یاد ہوتے رہے، اور نبوت کے بعد بھی انہی میں رہے، آپ ﷺ انہی کی زبان میں بات کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان لوگوں کے لئے آپ ﷺ سے استفادہ کرنے اور آپ ﷺ کی بات سننے اور سمجھنے کا خوب اچھا موقع تھا۔ اگر ان کے نبی ان کی جنس سے بشر نہ ہوتے، بلکہ فرشتہ ہوتے، یا ان کے ہم زبان نہ ہوتے، یا اپنے رہنے سہنے میں کسی ایسی جگہ رہتے جہاں آنا جانا، ملنا جلنا دشوار ہوتا، تو استفادہ کرنے میں، اور بات سمجھنے میں دشواری ہوتی، پس نہ اتمام حجت کا مسئلہ حل ہوتا، اور نہ فرائضِ نبوت کا حق ادا ہوتا، ایک طرح اجنبیت پیدا ہوتی، جو کہ ظاہر ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ شانہ نے یہ سارے مسائل حل فرما دیئے، اور اپنے لطف و کرم سے انہی میں سے رسول بھیج دیئے، جیسے سورۂ آل عمران میں ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ [آل عمران: ١٦٤] (اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر احسان فرمایا جب ان میں سے ایک رسول ان میں بھیج دیا)۔

اس ذات گرامی کی بعض صفاتِ عالیہ کا بیان یوں فرمایا:

﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ کہ امت کو جس چیز سے تکلیف ہو وہ آپ ﷺ کو گراں گزرتی ہے، اور آپ ﷺ کو اس سے تکلیف ہوتی ہے، اور آپ ﷺ امت کے نفع اور ہر آبادی وخوشی کے لئے حریص ہیں، آپ ﷺ کو یہ بھی حرص ہے کہ سارے لوگ مسلمان ہو جائیں، اور یہ بھی حرص ہے کہ مؤمنین کے تمام تر حالات درست ہو جائیں۔ آپ ﷺ کے حریص ہونے کا یہی شیوہ ہے کہ امت کو تمام بھلائیاں دنیا وآخرت کی خوشحالیاں میسر اور دستیاب ہوں۔ اسی طرح تمام برائیاں مصائب وناکامیاں دور رہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ظاہراً وباطناً تمام احوال میں اپنی امت کے ہمدرد وبہی خواہ ہیں، حتّٰی کہ روزِ قیامت جہاں نفسي نفسي کا انبیاء علیہم السلام میں بھی رجحان ہوگا، وہاں آپ ﷺ أمتي أمتي ہی پکاریں گے۔ سارے انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی خصوصی دعا دنیا میں طلب کی اور فارغ ہو گئے، مگر آپ ﷺ نے اپنی دعاء امت کے لئے ذخیرہ کر رکھی ہے، اور ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ [الضحی:۵] (عنقریب تمہارا پروردگار تمہیں اتنا اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے) کے نزول پر فرمایا: جب تک میری امت کا ایک فرد جہنم میں ہوگا میں ہرگز راضی نہیں رہوں گا، جب تک اس کو جہنم سے آزادی نہیں دلاؤں گا۔

آپ ﷺ مسلسل کئی راتوں میں ربّ العزّت سبحانہ سے التجاء کرتے رہے کہ دوسری قوموں کی طرح میری امت پر کسی آسمانی عذاب کا نزول نہ ہو، چنانچہ آپ ﷺ کو منظوری مل گئی، امتِ اجابت کے ساتھ امّتِ دعوت کو بھی تحفظ مل گیا، کہ آج سارے بد سے بدتر کفار آسمانی عذابوں سے محفوظ ہیں۔ ایک یوم السبت کی خلاف ورزی نے بنی اسرائیل کے ستر ہزار انسانوں کا بیڑا غرق کر دیا، آج گناہوں کا وہ دور ہے کہ ہر کافر ملک ربّ العزّت سبحانہ کے مقابلہ پر میدان میں کھڑا ہے، مگر پھر بھی وہ محفوظ ہے۔ ایک باغ والوں کی بدنیتی نے راتوں رات پورے باغ کو جلا کر خاکستر کر دیا، مگر آج ان لوگوں جیسے اربوں بدنیت باغ والے بڑے آرام سے جی رہے ہیں، علیٰ ہٰذا القیاس۔ یہ سب آپ ﷺ کے طفیل اور آپ ﷺ کی دعاؤں، التجاؤں، مناجاتوں، شفقتوں اور مہربانیوں کی برکت وثمرہ ہے۔

ایک اپنی امت کا کیا، آپ ﷺ سارے جہاں کے لئے رحمت ہیں، آپ ﷺ کا پورے عالم انس و

جن وحیوانات سب پر احسان ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی، اور کشتی نوح علیہ السلام جبل جودی پر لنگر انداز ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اتنی زیادہ اور عظیم ہے جسے کوئی زبان بیان نہیں کرسکتی، اور کوئی قلم لکھ نہیں سکتا۔

غالب ثناء خواجہ بیزدان گذاشتیم ☆ کان ذات پاک مرتبہ دان محمد ست

پھر قریب سے اگر دیکھا جائے تو بہت ہی آسانی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقتوں کا یہ خزانہ رحمت جو کہ امت کے پاس ہے یعنی کلام اللہ المجید، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ واحادیثِ مقدسہ جو کہ لوح محفوظ اور عرشِ رحمٰن جل شانہ کے نیچے کے خزانوں سے اتر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک میں محفوظ ہوا، قیامت تک کوئی ایسی بھلائی اور خیر کا عمل نہیں ہے کہ جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی نصیحت اور رہنمائی نہ کی ہو، اور کوئی ایسی شر و برائی نہیں کہ جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو خبردار و بیدار نہ کیا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ساری کائنات اور تمام موجودات کی طرف سے کھربوں صلوٰۃ وسلام ہوں۔

﴿فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ اگر لوگ روگردانی کریں، حق کو قبول نہ کریں، مہربان ومشفق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق نہ کریں، اور لڑنے کے لئے تیار ہو جائیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے، وہ میری مدد فرمائے گا، میرے دشمنوں کو ناکام ومغلوب فرمائے گا، وہ قادر وتوانا ہے، اس کے سوا پورے عالم میں کوئی معبود نہیں، اور اس کے کاموں میں کوئی رکاوٹ پیدا کرنے والا نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہوا ہے، میں اس کے سوا کسی پر نظر ہی نہیں ڈالتا، وہ بڑی عظمت والے عرش کا مالک ہے، جس طرح اس کا عرش ساری مخلوقات پر حاوی ہے۔

فائدہ:

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو شخص صبح وشام سات مرتبہ ان آیات کی تلاوت کرے اس کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ ہر فرض نماز کے بعد ایک مرتبہ آیۃ الکرسی اور ان آیات کا ورد جاری رکھیں۔

سُورَۃ یونس

مکیۃ آیاتہا ۱۰۹ رکوعاتہا ۱۱

سورۂ یونس مکی ہے، اس میں ایک سونو (۱۰۹) آیتیں، اور گیارہ (۱۱) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۂ یونس ہے، اسی سورت کی آیت ۹۸ میں یہ لفظ موجود ہے، اسی سے یہ نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی دور میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی، اور ترتیبِ نزول کے اعتبار سے ۵۱ نمبر پر ہے، اور ترتیبِ تلاوت میں یہ دسویں سورت ہے۔ البتہ اس سورت کی تین آیتیں مدنی ہیں، یعنی آیت نمبر ۹۴ سے ۹۶ تک۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی منقول ہے۔ اس سورت کی ایک سونو آیات، اور گیارہ رکوع ہیں۔ یہ سورت ۱۰۸۲ کلمات، اور ۶۵۶۷ حروف پر مشتمل ہے۔ اس کا نزول سورۂ بنی اسرائیل کے بعد ہے۔

ربط:

سورۂ توبہ کے آخر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات وفرائض کا ذکر تھا، اس سورت کی ابتداء میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض کا ذکر ہے۔

(۱) سورۂ توبہ میں جہاد بالسیف کا تذکرہ تھا، اس سورت میں جہاد باللسان کا ذکر ہے۔ (۲) توحید، رسالت اور مَعاد کا بیان دونوں سورتوں میں قدرِ مشترک ہے۔ (۳) سورۂ توبہ میں براءت کا ذکر ہے، اس سورت میں براءت کے اسباب کا بیان ہے۔ (۴) سورۂ توبہ میں کفر، نفاق، یہودیت اور نصرانیت کی تردید ہے، اس سورت میں بھی ان کی

تردید ہے۔

خلاصہ ومختصر موضوع:

دعوت الی القرآن، منکرین کے شبہات اور ان کے جوابات دلائلِ عقلیہ سے، توحیدِ خداوندی کا اثبات، تذکیراتِ ثلاثہ، فرائضِ خاتم الانبیاء، تسلّیات خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مشرکین کے ساتھ طریقِ مناظرہ، حضرت نوح علیہ السلام کا استقلال، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعونیوں کا باہمی مکالمہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ساحرین کا مکالمہ، حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی داستان۔ آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ عقیدہ اور یہ مسلک ہے جس پر چلنے کی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کی ہے، اس میں قطعاً کوئی ترمیم نہیں کی جاسکتی، جو اسے قبول کرے گا وہ اپنا بھلا کرے گا، نجات پائے گا، اور جو اس کو چھوڑ کر غلط راہوں میں بھٹکے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، اور ابدی سعادتوں سے محروم ہی رہے گا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡحَكِيۡمِ ① اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى رَجُلٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَهُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ قَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيۡنٌ ②

ترجمہ: الٓرٰ یہ آیات ہیں کتابِ حکیم کی ① کیا لوگوں کو اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے ان ہی میں سے ایک شخص کے پاس وحی بھیجی کہ لوگوں کو ڈرائے، اور ان لوگوں کو بشارت دیجئے جو ایمان لائے، یہ کہ ان کے لئے ان کے ربّ کے پاس بڑا مرتبہ ہے، کافروں نے کہا کہ بیشک یہ کھلا جادوگر ہے ②

معارف ومنازل

ابتدائی کلمہ الٓرٰ حروفِ مُقطّعات میں سے ہے، سورۂ بقرہ کے شروع میں اس پر مفصل کلام ہو چکا ہے، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔ پھر فرمایا کہ یہ کتابِ حکیم کی آیات ہیں۔ مفسرین حضرات نے حکیم کے دو معنی لکھے ہیں: پہلا ذو حکمت، یعنی حکمت والی کتاب، جو حکمتوں کے سمندو الی رنا پیدا کنار کتاب ہے۔ دوسرا بمعنی محکم۔ پھر محکم کے دو معنی ہیں: اوّل بمعنی مضبوط ومحفوظ کہ اس کے الفاظ اور کلمات اور طریقہ بیان اور اسلوب عبارت نہایت ہی درجہ کا پختہ

ہے، اور دوسرا معنی یہ ہے کہ غیر منسوخ ہے۔

جن مفسرین نے یہ معنی لئے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ سورۂ یونس میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے، لیکن چونکہ صفت مضاف الیہ یعنی اَلْکِتَاب کی ہے، اور کتاب سے پورا قرآن مجید مراد ہے، جو ان سورتوں پر بھی مشتمل ہے جن میں آیاتِ منسوخۃالحکم بھی موجود ہیں، اس لئے یہاں یہ معنی "غیر منسوخ" لینا مناسب نہیں، بلکہ حکیم کے معنی حکمت والا، یا وہ معنی جو کہ متشابہ کی ضد ہے، اور ظاہر ہے قرآن حکیم میں آیات متشابہات نہایت قلت میں ہیں، اور پورا قرآن آیات محکمات پر مشتمل ہے، جن کے معانی ومطالب اور غرض وحقیقت سب واضح اور معلوم ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حکیم حاکم کے معنی میں ہے، اور ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی آیات حاکم ہیں، اور پورے جہاں پر فیصلہ کنندہ ہیں۔ بدنصیب انسان کی خصلت اور سرشت یہی ہوتی ہے کہ ہر چیز میں اعتراض، کبھی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر، کبھی نبی کے بشر ہونے پر، کبھی اس کے فقر پر، کبھی قرآنی آیات پر، کبھی دار آخرت کی نعمتوں اور راحتوں پر، کبھی اس پر کہ جہنم کے داروغے انیس ۱۹ کیوں ہیں، الغرض جس کی قسمت میں ہدایت نہ ہو وہ ہر ہر بات پر معترض رہتا ہے۔ یہاں:

﴿أَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا أَنْ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ رَجُلٍ مِّنْهُمْ﴾ میں جہلاء عرب مشرکین مکہ کے دو اعتراضوں کا بیان ہے: ایک اعتراض رَجُل پر اور دوسرا اس کی ذاتی صفت فقر پر ہے۔ پہلے شقِّ اول کا بیان فرمایا کہ کُفار کا تعجب اور حیرانی اس بات پر ہے کہ ان آیات کا حامل اور اشاعت کرنے والا انسان کیوں بنایا گیا؟ بلکہ بجائے انسان کے کوئی فرشتہ ہونا چاہئے تھا، لہٰذا یہ آیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہیں، اور یہ جادو ہیں، جبکہ ان کا حامل جادوگر ہے، جادو ہونے کی یہ نشانی ہے کہ یہ آیات بہت زود اثر ہیں کہ لوگ سنتے ہی اسے قبول کرتے ہیں، اور غیر اختیاری طور پر فرمانبرداری قبول کرتے ہیں، آیات نمبر تین (۳) میں اس بے سروپا شبہے کا جواب یہ دیا کہ نہ یہ کلام جادو ہے، اور نہ پہنچانے والا جادوگر ہے، بلکہ آسمان وزمین کے خالق ومالک اور تمہارے پالنے والے ربّ کی طرف سے یہ کلام نازل ہوا ہے۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر ہم کسی فرشتے کو بھیج دیتے تو رسالت کا مقصد پورا نہ ہوتا، کیونکہ فرشتوں اور انسانوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے، جیسے سورۂ انعام میں اس کی پوری تفصیل گزر چکی۔

دوسرا اعتراض اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ ہزاروں صداقتوں کو چالیس سال سے دیکھنے کے باوجود

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات خاص کر شق القمر اور واقعہ معراج کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر تھے، کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہتے، کبھی ساحر، کبھی مجنون، کبھی مفتری (نعوذ باللہ)۔ مشرکین کا نظریہ، یہ بھی تھا اور بہانہ بھی کہ اگر نبوت ملنی لازمی تھی تو مکے کے کسی بڑے سردار کو ملتی، جیسے ابوجہل یا ولید بن مغیرہ جو بڑے سرمایہ دار تھے، یا طائف کے سردار مسعد، حبیب، عبد یالیل کو جو بڑے تاجر اور باغوں کے مالک تھے، وہ کہتے: ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿٣١﴾﴾ [الزخرف] (یہ قرآن کیوں نازل نہ ہوا دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر؟)

قَرْيَتَيْنِ تثنیہ کا صیغہ ہے، یعنی مکہ اور طائف کے بڑے سردار ہی اس قابل اور لائق تھے کہ ان پر قرآن کا نزول ہوتا، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول اور نمائندہ یتیم بے سہارا شخص ہو، جس کے پاس بھاری مال اور سرداری وغیرہ کچھ بھی نہ ہو، نبوت تو ایسے لوگوں کو ملنی چاہئے تھی جن کا کوئی مقام ہے، مالداری اور کوئی سرداری سے، بھلا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے غریب آدمی کو یہ شرف کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟

تو اس اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف انداز سے دیا ہے، سورت زخرف میں ارشاد ہے: ﴿اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ﴾ [الزخرف:٣٢] (کیا تیرے ربّ کی رحمت کے تقسیم کنندہ یہ مشرک ہیں؟) کیا یہ اتنے بڑے لوگ ہیں کہ نبوت دینے کا انہی نادانوں سے مشورہ ہوگا؟ کسی کے پاس کسی کے درد سر کا علاج نہ ہو وہ بھی سوچتا ہے کہ نبوت جیسا پاکیزہ بلند و بالا منصب اسی کے ہاتھ میں ہو، یہ اتنے ناداں اور بیوقوف ہیں کہ مال و دولت، جاہ و اقتدار کو معیارِ رسالت قرار دے رہے ہیں، حالانکہ کائنات کا خالق و مالک بہتر جانتا ہے کہ اس منصبِ جلیلہ کا مستحق کون ہے؟ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الأنعام:١٢٤] (اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی پیغمبری کس کے سپرد کرے)۔

یہ اسی واحد وصمد جل شانہ کے علم میں ہے کہ اس نے فرائضِ نبوت سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اعلیٰ صلاحیت و استعداد کس شخصیت میں ودیعت کر رکھی ہے، اخلاق کی بلندی، سینہ کی فراخی، علم کا کمال، اطاعت شعاری، گفتار و کردار کی صلاحیت، باطنی کیفیات کا عروج جو نبی کی ذات میں ہوتا ہے وہ کسی دوسری شخصیت میں نہیں ہوتا۔ اور ہر ناپاک مشرک کنجوس و بے ضمیر اور ناعاقبت اندیش اس منصب کا استحقاق نہیں رکھتا۔ پس نبوت کے انتخاب کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوگا، نہ اور کسی احمق و ناداں کے حکم سے۔

سو یہی ابوطالب کے یتیم جن کے اشاروں کی بلندی ملاء اعلیٰ سے اوپر ہے، جن کی نبوت و رسالت پر یہ بے

چارے جاہل، چار اونٹوں کے مالک، نکمے ناداں جنہیں عام محفلوں میں تو کیا بازاروں میں بھی بولنے اور مافی الضمیر اداء کرنے کا سلیقہ اور استعداد نہیں، یہ بھی خدا کے فرستادہ نبی پر اعتراض کر رہے ہیں، تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس یتیم کے سر پر عرش عظیم کے مالک کا ہاتھ رکھا ہوا ہے، یہ مقدس فرشتوں کے بھی مخدوم ہیں، اور پوری کائنات کے سردار و پیشوا بھی ہیں۔ اس یتیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پورے عالم میں پھیلی، اس کی امت کے قبضے میں بڑے بڑے ممالک آئے، عرب اور عجم نے ان کا دین قبول کیا، دنیا کی عظیم سلطنتیں قیصر و کسریٰ کی حکومتیں اور ہیرے جواہرات کے خزانے سارے مسلمانوں کے قدموں کے نیچے آ گئے۔ ان پیغمبر کے آسمانی صحیفہ رحمت قرآن حکیم نے سابقہ تمام آسمانی کتابوں کو منسوخ کر دیا، اور تمام ادیان منسوخ ہو گئے۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست ☆ کتب خانہ چند ملت بہ شست

﴿اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ کہ وہ لوگوں کو ان کے انجام سے ڈرائیں۔ انذار اور بشارت ساتھ ساتھ چلتے ہیں، جہاں ڈرانے کی بات ہے وہاں بشارت کی بات بھی ہے، اس مقام پر بشارت کو پیچھے اور انذار کو مقدم رکھا، کیونکہ انذار جب کارآمد ہوگا تو کفر و نفاق اور معاصی ختم ہو جائیں گے، اور بشارت کے لیے راہ ہموار ہوگی، یہی وجہ ہے کہ سورۂ یٰسین اور سورۂ مدثر اور دیگر چند مقامات میں صرف اِنذار مذکور ہے، تبشیر مذکور نہیں۔

فرمایا کہ ایمان والوں کو بشارت سنایئے کہ حقیقی کامیابی انہی کو حاصل ہوگی، چنانچہ اس سورت میں فلاح کے بڑے بڑے اصول بیان کئے گئے ہیں، پس انہیں بتادیں کہ ان کے لئے ان کے ربّ کے پاس "قدمِ صدق" بڑے بڑے مراتب ہیں، یہ وہ مراتب ہیں جنہیں متقین اور مخلصین حاصل کرتے ہیں، جیسے سورۂ قمر میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝﴾ (بلاشبہ متقی لوگ باغیچوں اور نہروں میں ہوں گے، سچائی کے مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس ہوں گے)۔ یہ قدمِ صدق اور مقعدِ صدق دونوں ایک چیز ہیں، جن کا مفہوم ہے: قربِ الٰہی عزّ سبحانہ وتعالیٰ جو کہ تمام کامیابیوں کا سرچشمہ ہے، اور بلندیوں کا سرخیل ہے۔

﴿قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ﴾ وہ انذار و تبشیر کے داعی پیغمبر کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ کھلا جادوگر ہے (معاذ اللہ)۔ یہ بات ان لوگوں نے قرآن مجید کے اعجاز سے متاثر ہو کر، اور اس کی مثال لانے سے عاجز

ہو کر سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں کہی، اس لئے قرآن کو جادو کہا، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر۔

یہ کافروں کا ہمیشہ وطیرہ رہا ہے، جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر کہا، اور مقابلہ کیلئے ہزاروں جادوگروں کا لشکر میدان میں لے آیا، قرآن کریم نے اسی کافرانہ سلوک کا یوں تذکرہ فرمایا: ﴿كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ﴾[الذاریات:۵۲] (اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو رسول آئے ان کو یہی کہا کہ جادوگر ہیں، یا پاگل ہیں)۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

ترجمہ: بلاشبہ تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہے، جس نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوا، اور وہ ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں، وہ اللہ تعالیٰ تمہارا رب ہے، سو تم اس کی عبادت کرو، کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟۳ اسی کی طرف تم سب کو لوٹ جانا ہے، اس نے سچا وعدہ کر رکھا ہے، بلاشبہ وہی مخلوق کو ابتداء پیدا فرماتا ہے، پھر وہ اسے دوبارہ لوٹا دے گا، تاکہ وہ ان لوگوں کو انصاف کے ساتھ بدلہ دے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے، اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کیلئے پینے کو کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے۴

معارف و منازل

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ﴾ جوابِ شبہ بھی ہے، اور توحید پر عقلی دلیل بھی ہے۔ ربوبیت کی صفت کا بیان ہے، جس سے اس کی وحدانیت اور خالقیت اور تصرف کا اظہار مقصد ہے۔ ربوبیت کا مقصد کسی چیز کو بتدریج صفتِ کمال تک پہنچانا ہوتا ہے، اور یہ صفت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ذات میں نہیں پائی جاتی، اسی لئے فرمایا کہ تمہارا ربّ وہ

اللہ تعالیٰ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں کے وقفے میں پیدا فرمایا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں پر چھ دن سے مراد اس دنیا کے چھ دن نہیں، بلکہ دن سے مراد وہ دن ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں شمار ہوتا ہے، اور اس دن کے متعلق سورۂ حج میں ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ [الحج:٤٧] (تمہارے پروردگار کے ہاں ایک دن ہزار سال کے برابر ہے، جس کو تم شمار کرتے ہو)۔تو اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے تمام علویات وسفلیات کو چھ ہزار سال میں پیدا فرمایا، وہ اگر چاہتا تو ایک لحظہ میں یہ سب کچھ پیدا فرما سکتا تھا، مگر اپنے بندوں کو تدریجی کام کرنے کی حکمت ومصلحت سمجھانے کی خاطر ایسا فرمایا۔

یہاں: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ فرمایا، اور سورۂ فرقان رکوع (۴) میں، اور سورت الٓمّٓ سجدۃ رکوع (۱) میں، اور سورۂ ق رکوع (۳) میں لفظِ ﴿وَمَا بَيْنَهُمَا﴾ کا اضافہ بھی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو، اور زمین کو، اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے چھ دنوں میں پیدا فرمایا۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ پھر عرش پر مستوی ہوا۔

استواء علی العرش کی تفصیل سورۂ اعراف رکوع (۷) میں گزر چکی ہے، وہاں دیکھ لیں۔

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ اللہ تعالیٰ تمام امور کی تدبیر فرماتا ہے۔سورۂ الٓمّٓ سجدۃ میں فرمایا: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ﴾ [السجدة:٥] (وہ آسمان سے لے کر زمین تک ہر امر کی تدبیر کرتا ہے) یعنی تمام امور اس کی تدبیر کے مطابق اور حکمت کے موافق، اور اسی کی قضاء وقدر کے مطابق وجود میں آتے ہیں، اور پرورش پاتے ہیں، کائنات کا پورا نظام اسی کے حکم وفرمان کے تحت چلتا اور جاری رہتا ہے۔

﴿مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ﴾ اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں ہے۔مطلب یہ ہے کہ اس کے حکم کے بغیر سفارش جب نہیں ہو سکتی تو مستقل کسی کام کے انجام دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مشرکین کی خوب تردید ہے جو کہتے تھے: ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس:۱۸] (یہ بت ہماری سفارش کرنے والے ہیں اللہ کے یہاں)۔اپنے معبودوں کو سفارشی مانتے تھے۔ ہمارے زمانے کے پیر پرستوں اور قبر پرستوں اور عرس منانے والوں کی طرح، اور یہ سفارش اس کی اجازت پر اہل ایمان کیلئے ہوگی۔

سورۂ مؤمن میں فرمایا: ﴿مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ؁۱۸﴾ [المؤمنون] (مشرکین

کیلئے نہ کوئی دوست ہوگا، اور نہ کوئی سفارش کرنے والا ہوگا کہ جس کی بات مانی جائے)۔

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ﴾ وہ اللہ تعالیٰ تمہارا پروردگار ہے، سوتم صرف اس کی عبادت کرو۔

﴿اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ہو؟

﴿اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا﴾ اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا ہے اس کا وعدہ حق ہے، قیامت کا جو وقت اس کے علم میں مقرر ہے وہ وقت آجانے پر قیامت قائم ہوجائے گی، پھر اس کے حضور تمہاری پیشیاں ہوں گی، ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا، کچھ بھی نہیں چھپے گا۔ قرآنی نصوص اور احادیثِ متواترہ بکثرت اس پر گواہ ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی وحدانیت مسلَّم ومحکم اور پختہ ہے، اسی طرح وقوعِ قیامت بھی مسلم ہے۔

﴿اِنَّهٗ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ﴾ بلاشبہ وہ ابتداءً مخلوق کو پیدا فرماتا ہے، پھر موت دے کر دوسری مرتبہ انہیں پھر زندہ فرمائے گا، تم ہزار دفعہ کہتے رہو کہ مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہوکر کیسے پیدا ہوں گے؟ تمہارے ان بے بنیاد شبہات کا ایک ہی جواب ہے: ﴿وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ﴾[الروم:۲۷] (یہ اس کے لیے آسان ہے)۔ وہی ذات پاک خالق کائنات ہے جو ابتداءً پیدا کرنے والا ہے، پھر موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر اسی طرح قادر ہے جس طرح پہلے پیدا کرنے پر قادر تھا، بلکہ دوسری مرتبہ پیدا کرنا اس کیلئے اور زیادہ آسان ہے۔

یہ اعتراض کرنے والوں کی سمجھ کے مطابق فرمایا کہ دوبارہ کسی چیز کا بنانا جب تمہارے لئے آسان ہے تو اس کیلئے کیوں مشکل ہو؟

﴿لِیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ قانونِ مجازات کا اثبات ہو رہا ہے کہ قیامت کا آنا اس لئے ضروری ہے کہ اچھے لوگوں کو ان کے ایمان واعمالِ صالحہ کا بہتر صلہ اور بدلہ دیا جائے، عقل کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ مزدور کو کام انجام دینے پر مزدوری مل جائے، اور بُرے لوگوں کو ضرور سزا ملنی چاہئے، یہی عقل کا بھی فیصلہ ہے۔ کافر ملکوں میں بھی یہی رائج ہے کہ وہ مجرموں کو سخت سے سخت سزا دیتے ہیں۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا انہیں کھولتا ہوا گرم پانی پینے کیلئے ملے گا، اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ کفر کرتے تھے، قانون شکنی کرتے تھے، انہوں نے نظامِ عالم میں فتنہ اور فساد برپا کیا، قانون سے بغاوت کی، تو لازمی ہے کہ انہیں سخت

ترین قسم کی سزا دی جائے۔

آج دنیا والوں نے بھی اسی طرح اپنے ملکی نظام کے نافرمانوں کیلئے ایسی سزائیں تجویز کی ہیں، اور یہی عقل ونقل دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے، اسی کا نام قیامت ہے کہ جس کا آنا بہت ضروری ہے، تا کہ عدل وانصاف کا قانون متحرک ہو۔ وَبِاللهِ التَّوْفِيق

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ
وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٥﴾ إِنَّ فِي
اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَّقُونَ ﴿٦﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے سورج کو روشن بنایا، اور چاند کو نور بنایا، اور اس کیلئے منزلیں مقرر فرمادیں، تا کہ تم برسوں کی گنتی جان لو، اور حساب کو معلوم کرلو، یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے حق ہی کے ساتھ پیدا فرمائی ہیں، وہ جاننے والوں کیلئے تفصیل کے ساتھ نشانیاں پیدا فرماتا ہے ⑤ بیشک رات اور دن کے ایک دوسرے کے بعد آنے جانے میں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا فرمایا ہے ان میں ان لوگوں کیلئے دلائل ہیں جو ڈرتے ہیں ⑥

معارف ومنازل

مظاہر قدرت کا سلسلہ جاری ہے اس کی وحدانیت پر واضح دلیل ہے، بشرطیکہ انسان اپنے جوہر عقل سے صحیح کام لے۔ پہلے سورج کی روشنی کا، اور پھر چاند کی روشنی کا تذکرہ فرمایا، اور اشارہ کیا کہ ان روشنیوں سے وہی لوگ استفادہ کر سکتے ہیں جن کی آنکھیں سلامت ہوں، کیونکہ اندھے اور نابینا انسان کیلئے رات دن برابر ہیں، وہ سورج کی روشنی سے محروم ہے، یہی حال ان لوگوں کا بھی ہے جنہیں باطنی نور اور عقل سلیم سے محروم رکھا گیا ہے، یہاں تک کہ انہیں قرآن اور نبوت کا نور بھی نظر نہیں آتا، وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہیں۔

آفتاب کیلئے لفظ ضِیاء اور چاند کیلئے لفظ نُور استعمال فرمایا، علماء کرام فرماتے ہیں کہ ضیا بڑی اور قوی روشنی کو کہتے ہیں، اور نور عام ہے قوی اور ضعیف سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [النور: ۳۵] (اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے)۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ ضیاء صرف ظاہری روشنی کو کہتے ہیں، جبکہ نور کا اطلاق ظاہری اور باطنی دونوں کیلئے ہے، فرمایا:﴿ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴾[المائدة:١٥] (تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آئی)۔ خلاصہ یہ کہ نور کا اطلاق قوی وضعیف ظاہری و باطنی، مادی اور روحانی سب کیلئے عام ہے، بخلاف ضیاء کے۔

مطلب یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی زندگی کا تعلق دن رات کے ساتھ ہے، دن میں جو کام ہوتے ہیں وہ رات کو نہیں ہو سکتے، اور جو کام رات کو انجام پاتے ہیں وہ دن کو نہیں انجام پاتے۔

اللہ تعالیٰ نے سورج کو زیادہ قوی روشنی دی ہے، جب وہ طلوع کرتا ہے تو رات چلی جاتی ہے، اور دن آجاتا ہے، دن میں چونکہ چلنے پھرنے اور کاروبار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس کو بہت روشن بنایا، اور رات سکون اور آرام کیلئے ہے، اس لئے چاند کی روشنی کو مدہم فرمایا۔

سائنسدانوں نے سورج کی شعاعوں سے شمسی توانائی کے ذریعہ بجلی پیدا کی، اور کامیاب رہے، آئندہ دوسرے مرحلے پر ان کا ارادہ ہے کہ گیس کے متبادل سورج کی شعاعوں سے ایندھن تیار کریں گے، اور تیسرے مرحلے میں گاڑیوں کیلئے ڈیزل اور پٹرول کا متبادل کوئی نظام ترتیب دیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں طرح طرح کی حکمتیں اور صلاحیتیں ودیعت کر رکھی ہیں، جن سے انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل اور تجربہ کے ذریعہ الٹ پھیر کر کے ہر قسم کے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ یہ ہمارے پاؤں کے نیچے روندی ہوئی مٹی سے سائنسدانوں نے بے شمار چیزیں اور کارآمد آلات ایجاد کیے ہیں۔ سائنس کسی چیز کی خالق نہیں ہوتی، البتہ موجد ہوتی ہے، یعنی سائنس مٹی اور لوہا پیدا نہیں کرسکتی، البتہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے مٹی اور لوہے سے ہزاروں کارآمد چیزیں مختلف فوائد کیلئے ایجاد کرسکتی ہے۔

پس سورج، چاند اور دیگر ستاروں کو صرف اتنا سمجھنا کہ یہ کائنات کے کناروں، صحراؤں، جنگلوں، سمندروں کو روشنی پہنچانے کیلئے ہیں سراسر غلط اور نادانی ہے، بلکہ ان کے اندر بے شمار فوائد اور منافع ہیں جن تک ابھی انسان اور سائنس نے رسائی نہیں حاصل کی ہے، امید ہے آئندہ رفتہ رفتہ وہاں تک رسائی حاصل ہو۔ ابھی تک تو سائنسدان ان تک نہیں پہنچے ہیں، اور شاید قیامت تک یہ صدمہ اور ارمان ان کے دلوں میں باقی رہے کہ آسمانوں تک ہماری رسائی کیوں نہیں ہوئی؟ وہ اس لئے کہ تمام سیارے، ستارے، کہکشائیں، سورج، اور نظامِ شمسی یہ سارے آسمانوں سے

نیچے ہیں، یہ افلاک اور فضاؤں میں گھوم رہے ہیں، جبکہ آسمان ان سب سے اوپر وراء الوراء ہیں، جہاں تک شاید کوئی رسائی ممکن نہ ہو۔

﴿وَقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ﴾ اور ان کیلئے منزلیں مقرر کر دیں تا کہ تم سالوں کی گنتی اور حساب معلوم کرلو۔ قَدَّرَهٗ کی ضمیر بتأویل کل واحد آفتاب اور چاند دونوں کی طرف راجع ہے۔ اور منازل کا اثبات دونوں کیلئے متحقق ہے۔ سورۂ یٰسین میں ارشاد ہے: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝﴾ [یٰس] (اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ سب اس ذات کا مقرر کیا ہوا نظام ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کا علم بھی کامل۔ اور چاند ہے کہ ہم نے اس کی منزلیں ناپ تول مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ وہ جب لوٹ کر آتا ہے تو کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح ہو کر رہ جاتا ہے۔ نہ تو سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات دن سے آگے نکل سکتی ہے، اور یہ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ اور ان کے لیے ایک اور نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا)۔

سورج کی چال اور راستہ مقرر ہے، اسی پر وہ چلا جاتا ہے، ایک منٹ یا ایک انچ اس سے ادھر ادھر نہیں ہوسکتا، مسلسل اپنے کام پر رواں دواں ہے، اس نے ابتداء آفرینش سے قیام قیامت تک ایک منٹ قرار نہیں پکڑا، یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوگی۔

البتہ! جب توبہ کا دروازہ بند ہوگا، اس وقت اس کو حکم ہوگا کہ جدھر سے غروب ہوا ہے ادھر سے الٹا واپس طلوع کر۔ حدیث میں وارد ہے کہ روزانہ نصف النّہار کے نقطہ پر پہنچ کر سورج عرشِ الٰہی جل شانہ کے نیچے سجدہ کرتا ہے، اور غروب کی طرف چلنے کیلئے اجازت طلب کرتا ہے، جو اسے مل جاتی ہے۔ [رواه البخاري عن أبي ذر ﷺ]

یہ سارا نظام اس زبردست قادر و توانا ہستی کا قائم کیا ہوا ہے جس کا علم وقدرت پوری کائنات کے ذرہ ذرہ پر محیط ہے۔ فرمایا: سورج کی سلطنت دن میں ہے، اور چاند کی رات میں ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ چاند کی نور افشانی کے وقت سورج اس کو آدبائے، یعنی دن اپنے وقت سے آگے بڑھ کر رات کا کچھ حصہ اڑا لے، یا رات سبقت کر کے دن کے ختم ہونے سے پہلے آجائے۔ ہر ایک سورج و چاند اور دیگر اربوں سیارے ستارے باوجود سریع الحرکت تیز رفتاری

کے اور کھلی ہوئی فضاء کے نہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، نہ اپنی چال اور رفتار میں آگے پیچھے کمی بیشی یا سستی کرتے ہیں۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کے نظام سے کائنات کو روشن فرمایا، پھر دونوں کی رفتار کیلئے منزلیں مقرر فرمائیں، انہی منزلوں پر وہ چوبیس گھنٹے رواں دواں ہیں، اور پوری کائنات پر ضوء افشاں ہیں، مجال نہیں کہ وہ بلکہ پورا نظامِ شمسی اپنی حدود اور خطوط سے کوئی ایک قدم آگے پیچھے چلے۔ چاند کی اٹھائیس منزلیں ہیں، وہ ہر روز نئی منزل میں سیر کرتا ہے، پھر دو دن غائب رہتا ہے، یہ غیبوبت سورج کے قرب کی وجہ سے بھی ہے، اور باریکی کی وجہ سے بھی ہے۔ سورج کیلئے بھی منزلیں ہیں، وہ پورا مہینہ ایک منزل میں چلتا ہے، اس کی بارہ برجیں ہیں، ہر برج میں ایک ماہ سفر کرتا ہے۔ موسمی تغیر تبدل اسی وجہ سے ہوتا ہے، کبھی گرمی، کبھی سردی، کبھی بہار، کبھی خزاں۔

اگر سورج پورا سال ایک ہی برج میں چلے تو موسم تبدیل نہ ہو، اور نظامِ عالم درہم برہم ہو۔ قرآن حکیم نے فرمایا: ﴿مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ﴾ [الملک:۳] (تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں پاؤ گے)۔ اللہ تعالیٰ کے نظام میں نہ کوئی عیب ہے، نہ کوئی کمی اور کجی، سارا عالم ایک بے عیب و پُراز حکمت نظام پر چل رہا ہے۔ کبھی دن بڑے، کبھی چھوٹے، یہی حال راتوں کا بھی ہے، ایک علاقے میں دن ہے دوسرے میں رات، علیٰ ہذ القیاس۔

یہ نیرنگیوں والا جہاں ہے، جس کا ہر ذرہ اور ہر لمحہ ربّ العٰلمین جل شانہ کی توحید و وحدانیت کا شاہکار ہے، اور کرم بالائے کرم یہ کہ ہر چیز اور ہر ذرہ اور ہر نظام اور ہر تبدیلی میں خلقت کے منافع وفوائد ملحوظ خاطر رکھے گئے ہیں۔ پھر اس سے بندوں کا یہ نفع بھی متعلق فرمادیا کہ وہ ان کے ذریعہ معلوم کر لیتے ہیں کہ فلاں معاملہ، یا فلاں معاہدہ، یا فلاں کام کو کتنے برس گزر گئے، اور میعاد پورا ہونے میں کتنے برس باقی ہیں۔ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ہمارے عالم اسلام کے ہزاروں تاریخی واقعات، اور ان پر گزرے ہوئے ادوار اور سال وغیرہ یہ سب نظام شمسی کے مرہونِ منت ہیں۔

چاند کے طلوع وغروب، گھٹنے بڑھنے کا ایک ایسا مکمل رہنما نظام ہے کہ حج، ماہِ صیام، زکوٰۃ، اور بہت سے شرعی بنیادی اعمال کا تعلق اسی نظامِ قمری چاند کے ساتھ وابستہ ہے، اسی لئے فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ چاند کا حساب باقی رکھنا فرضِ کفایہ ہے۔ پوری تفصیل سورۂ بقرۃ رکوع (۲۴) میں گزر چکی، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ گو دنیاوی معاملات میں شمسی سال سے حساب رکھا جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

﴿مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں یونہی بے فائدہ پیدا نہیں فرمائی ہیں، ان کی تخلیق میں بڑی حکمتیں ہیں، اور پورے جہاں میں کوئی ایک ادنیٰ چیز ایسی نہیں کہ اس کی تخلیق بے مقصد ہو، یہ الگ بات ہے کہ انسانوں کا علم محدود ہے، انہیں ہر مخلوق کی حکمت معلوم نہیں ہو سکتی ہے، اسی لئے فرمایا:

﴿يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ عقلمندوں اور کھوج لگانے والوں کے لیے واضح طریقہ اور دلائل بیان فرماتے ہیں، جبکہ بے علموں اور غفلت میں ڈوبے لوگ دلائلِ واضحہ سے مستفید نہیں ہوتے، جیسے اندھے نابینا لوگ سورج اور چاند کی روشنی سے مستفید نہیں ہو سکتے۔

﴿اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ﴾ بلاشبہ رات دن کے آگے پیچھے اور چھوٹے بڑے اور سرد گرم ہونے میں، اور ان سب چیزوں میں جو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا فرمائی ہیں ان لوگوں کیلئے دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ رات کی تاریک چادر کو ہٹا کر دن کی سفید چادر پھیلانا، یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، اور اس میں لاکھوں حکمتیں ہیں، اور اگر وہ چاہے کہ دن یا رات دائمی ہو جائے تو وہ اس پر بھی قادر ہے، لیکن بندوں کے منافع و بے شمار فوائد اسی کے ساتھ وابستہ ہیں کہ دن رات کا تبادلہ ہو، کیونکہ بڑی حکمتیں اور بے شمار مصلحتیں اسی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

فرمایا: ہر مخلوق اور ہر چیز کی پیدائش حکمتوں پر مبنی ہے، اور ہر چیز اپنے خالق کی وحدانیت پر گواہ ہے، مگر یہ باتیں صرف ڈرنے والوں کی سمجھ میں آتی ہیں، اور وہی استفادہ کرنے کے اہل ہیں۔ ہر ناداں و گم گشتہ راہ مستفید ہونے کا اہل نہیں۔ مزید تفصیل سورۂ یٰس اور سورۂ قصص میں آنے والی ہے۔ إن شاء الله

❀ ❀ ❀

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا
غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا
سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ہمارے پاس آنے کی امید نہیں رکھتے، اور وہ دنیا والی زندگی پر راضی ہو گئے، اور اس

پر مطمئن ہو گئے، اور وہ لوگ جو ہماری آیات سے غافل ہیں ⑦ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ ان کے اعمال کی وجہ سے دوزخ
ہے ⑧ بیشک جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کئے ان کا ربّ ان کے ایمان کی وجہ سے انہیں راہ بتادے گا، وہ نعمت
کے باغوں میں ہوں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی ⑨ ان میں ان کی یہ بات ہوگی کہ اے اللہ تعالیٰ! تو پاک
ہے، اور اس میں ان کا تحیہ سلام ہوگا، اور ان کی آخری بات اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہوگی ⑩

معارف ومنازل

سورت کے شروع میں انذار اور بشارت کا ذکر ہوا، پھر نافرمانوں اور فرمانبرداروں کا تذکرہ، پھر دلائلِ توحید اور کائنات کی پیدائش کے ساتھ سورج، چاند اور دیگر عظیم مخلوقات کا بیان ہوا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ نیک بختوں نے ان چیزوں میں غور وفکر کیا، اور ایمان لائے، اور نیک اعمال کر کے فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ کے مصداق ثابت ہوئے، جبکہ کچھ بدبختوں نے نہ مظاہر قدرت کو دیکھا، نہ ان میں غور وفکر کیا، اور نہ ایمان پر آمادہ ہوئے، بلکہ دنیاوی زندگی کو اپنا مستقر اور ابدی آخری منزل سمجھ کر اس پر مطمئن اور راضی ہو گئے، اور حیات بعد الموت کا انکار کر بیٹھے۔ یہ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ کے مصداق ثابت ہوئے، انہی کو فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا﴾ بیشک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے انہیں حیات بعد الموت پر یقین ہے ہی نہیں، وہ تو یہ کہتے ہیں: ﴿اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝٣٧﴾ [المؤمنون] (دنیا کی زندگی اتنی ہی ہے کہ ہم زندہ رہتے اور مرتے ہیں مگر دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے)۔ کفار کی اس طرح کی باتیں قرآن کریم میں بکثرت مذکور ہیں۔

﴿وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا﴾ وہ دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے، اور اسی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا، اور مطمئن ہو گئے، کہ بس یہی زندگی ہے، اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں، کھاؤ پیو، عیش وعشرت میں رہو، نہ کوئی قیامت ہے، نہ حساب وکتاب، لوگ جو جنت ودوزخ کی بات کرتے ہیں یہ سب مفروضے اور خیالات ہیں، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات سے غافل ہیں۔ اس آیت نے ایسے بدبخت جہنمیوں کی چار خصلتیں بیان کیں: ایک یہ کہ وہ ہماری ملاقات پر یقین نہیں رکھتے، دوسری یہ کہ وہ دنیاوی زندگی پر راضی ہو گئے، تیسری یہ کہ اس دنیا کے ساتھ مطمئن ہو گئے، چوتھی یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے غافل ہیں، تو نتیجہ یہ ہوا:

﴿أُولَٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے، جسے انہوں نے خود اپنے برے اعمال کی وجہ سے اپنے لئے منتخب کیا ہوا ہے۔ ان کے برعکس ان مؤمنین کا بیان اور انجامِ خیر کا ذکر فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے، نیک عمل میں تمام فرائض اور واجبات، حقوق اللہ تعالیٰ، حقوق العباد اور دیگر حسنات بشمولِ جہاد وغیرہ سب آ گئے۔ عقائد کی درستگی و صحت کا تعلق اٰمنوا کے ساتھ ہے، باقی حسنات کا تعلق عَمِلُوا الصّٰلِحٰت کے ساتھ ہے، تو کیا ہوا؟ وہ یہ ہے:

﴿يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کی وجہ سے ان کی رہنمائی فرمائے گا، یہ اس لئے کہ جس طرح تمام اعمالِ صالحہ کیلئے ایمان شرط ہے اسی طرح جنت اور رضائے الٰہی کیلئے بھی ایمان شرط اور اعمال اسباب کے درجے میں ہیں۔ یہ رہنمائی ابدی نعمتِ عظمیٰ جنت کی طرف ہوگی، جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ جنتی وہاں اپنے اپنے گھروں کا راستہ اور مدخل اس سے زیادہ پہچاننے والے ہوں گے جیسا کہ دنیا میں اپنے اپنے گھروں کا راستہ جانتے تھے۔ اور وہ جب وہاں پہنچیں گے تو ان کی دعاء یہ ہوگی:

﴿سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ﴾ اے اللہ تعالیٰ! تیری ذات پاک ہے، ہم تجھ پر عیب ونقصان سے پاک ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ کی یہ تسبیح وتحمید غیر ارادی طور پر سانس کی طرح جنتیوں کی زبان پر ہر وقت متواتر جاری رہے گی۔ جنت میں کسی مالی یا عبادتِ بدنی کی ضرورت نہیں ہوگی، اور جنت دار الثواب ہے، دار العمل نہیں، البتہ جس طرح دنیا میں سانس سببِ حیات وبقاء ہے، اسی طرح جنت میں ذکر الٰہی، تسبیح وتحمید سانس کی طرح اس کا قائم مقام ہو کر بڑے سکون کے ساتھ بغیر کسی تکلیف اور نیت وارادہ کے چلتی رہے گی، جیسے دنیوی زندگی میں سانس ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ یہ تسبیح وتحمید ان کو الہام ہو جائے گی، اور ان کی زندگی وخوشی کا حصہ بن جائے گی، نہ اس سے غافل رہیں گے، اور نہ اکتائیں گے۔ [مسلم]

حضرت ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی پرندہ اوپر سے گزر رہا ہوگا، اور اہل جنت کو اس کے کھانے کی خواہش ہوگی تو وہ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہہ دیں گے، ان کی خواہش کے مطابق فرشتے اسے حاضر کریں گے، جب فرشتے آئیں گے تو سلام کریں گے، اور جب جنتی جنت کی کوئی نعمت کھائیں گے، یا انہیں کوئی لذت حاصل ہوگی، یا کھانے سے فارغ ہو جائیں گے، یا آپس کی ملاقات کے بعد رخصت ہو جائیں گے، تو ان کی آخری تسبیح یہ ہوگی:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [ابن کثیر]

جنت اللہ تعالیٰ کی رضاء کی جگہ ہے، پاکیزہ ہے، بُرے خیالات سے بھی پاک ہے، جب قلوب و باطن پاک رہیں گے تو زبانوں کا کیا کہنا؟ ان کی زبانوں پر اور فرشتوں کی زبانوں پر، نیز ان کے خدام کی زبانوں پر سوائے تسبیح و تحمید اور تحیۃ وسلام کے کچھ نہ ہوگا، اور ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے بھی سلسلۂ سلام جاری رہے گا، ﴿سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ﴾ [یس:۵۸] (رحمت والے پروردگار کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا)۔

اے ہمارے پروردگار! ہمیں خاتمہ بالخیر کی نعمت عطا فرما، ہمیں نفس وشیطان کے حملوں سے محفوظ فرما، محض اپنے کرم سے جنت اور اس کی تسبیح وتحمید سے مشرف فرما۔ آمین

فائدہ:

اللہ تعالیٰ کے نیک بندے دنیا میں بھی ایسے ہوتے ہیں وہ ہر وقت جنتی زندگی اور جنتی نعمتوں کی نقل اتارتے ہیں، پانی پیتے ہیں یا کوئی کھانا کھاتے ہیں، یا کوئی نہایت معمولی حقیر نعمت کی خوشخبری سنتے ہیں، یا ایک کھجور کھالیتے ہیں، یا سوتے ہیں، یا اٹھتے ہیں، یا چلتے ہیں، یا بیٹھتے ہیں تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتے ہیں، جس کے ثواب کا اندازہ ہی نہیں۔ اسی طرح آپس میں ملتے وقت پیار سے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہتے ہیں، اور جواب بھی وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ سنتے ہیں، یہ عمل نہایت پسندیدہ ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اس پر ہمیشہ مداومت کے ساتھ عمل کریں۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

❀ ❀ ❀ ❀

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑪ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑫

ترجمہ: اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر نقصان واقع کرنے میں جلدی کرتا جیسے کہ وہ بھلائی کیلئے جلدی مچاتے ہیں تو ان کا وعدہ پورا ہو چکا ہوتا، سو جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہم ان کی سرکشی میں انہیں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں ⑪ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، لیٹے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور کھڑے ہوئے، پھر جب ہم اس کی تکلیف ہٹا دیتے ہیں تو وہ اس حال میں گزر جاتا ہے کہ گویا اس نے ہمیں کسی تکلیف کے پہنچ جانے پر پکارا ہی نہ تھا، اسی طرح حد سے بڑھ جانے والوں کیلئے ان کے اعمال مزین کر دیئے گئے ہیں ⑫

معارف ومنازل

ان آیات کریمہ کا مطلب اور خلاصہ یہ ہے کہ شر کی دعا نہیں مانگنی چاہئے، انسان خیر کی بھی دعا کرتا ہے، اور شر کی بھی دعا کرتا ہے، اور دعاؤں کی قبولیت کیلئے بیتاب رہتا ہے، اور جلدی مچاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے مطابق دعائیں قبول فرماتا ہے، خیر کی دعا عموماً جلدی قبول فرمالیتا ہے، اور شر کی دعا جلد قبولیت نہیں پاتی۔ پس مؤمنوں کو چاہئے کہ شر کی دعا نہ کریں، طیش اور غصہ یا ناامیدی کی حالت میں اپنے لئے اپنے عزیزوں کیلئے بیوی بچوں کیلئے، یا عام لوگوں کیلئے بددعا نہ کریں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی جانوں کیلئے اور اپنی اولاد کیلئے اور اپنے اموال کیلئے بددعا نہ کیا کرو، ایسا نہ ہو کہ یہ بددعا قبولیت کی گھڑی میں کر بیٹھو، اور تمہاری یہ بددعا قبول ہو جائے۔ [مسلم]

پس دعا ہمیشہ خیر کی ہو، اور دعا کی شرائط کے تحت ہو، اور قبولیت کیلئے جلدی اور عجلت نہ ہو، اور ناامیدی بھی نہ ہو، اور جلدی نہ مچائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ کی دعا قبول ہوتی ہے بشرطیکہ کسی گناہ کیلئے یا قطع رحمی کیلئے دعاء نہ کرے، اور جب تک کہ جلدی نہ مچائے۔ عرض کیا گیا: یارسول اللہ! جلدی مچانا کیا ہے؟ فرمایا: جلدی مچانا یہ ہے کہ یوں کہنے لگے کہ بھائی میں نے تو دعا کی پھر دعا کی مجھے تو قبولیت نظر نہیں آتی، اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں دعا کر کر کے تھک گئے، یا یوں کہتے ہیں سالوں سے دعا کر رہے ہیں مگر ابھی تک کوئی قبولیت نہیں ہوئی، پھر تنگ دل ہو کر دعا چھوڑ دے۔ [مسلم]

آیت کریمہ کا دوسرا مطلب جو معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ انسان تکلیف اور دکھ والم میں مبتلا ہو، یا خیر وخوشی اور راحت میں ہو، اسے چاہئے کہ ہر وقت غم اور خوشی میں انابت اختیار کرے، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے، شکر وصبر کے ساتھ قرب الٰہی کا طالب رہے۔ یہ ہے مخلص بندوں کا حال کہ غمی وخوشی ہر حال میں دعا کرتے رہتے ہیں۔

ان کے برعکس مفاد پرست، نالائق وخود غرض لوگوں کا وطیرہ اور حال یہ ہے کہ وہ انابت الی اللہ سے محروم ہیں، صبر وشکر سے بے بہرہ اور محروم ہیں، وہ مفاد پرست خود غرض ہیں، جب مصیبت آتی ہے یا پریشانی یا کسی مرض کا حملہ ہوتا ہے تو آسمان کو سر پر اٹھاتے ہیں، لمبی لمبی دعائیں کرتے اور کراتے ہیں، صدقات کرتے ہیں، وظیفے پڑھتے

ہیں، آیت کریمہ کا لاکھ نکالتے ہیں، اور جب مصیبت ٹل جاتی ہے، یا مسئلہ حل ہوجاتا ہے تو ان سب دعاؤں، وظائف، تسبیحات، ختمات کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں، اور بھول جاتے ہیں۔ گویا کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگا ہی نہ تھا۔ مضیبت آئی تو اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے، اور جب اللہ تعالیٰ نے مصیبت دور فرمائی تو مستغنی ہوئے، اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر سارا بھروسہ اسباب پر مرکوز کردیا، اور عزّت وشرف، مال وخوشی کو اپنی ہنر مندی اور تعلیم وسمجھداری کی طرف منسوب کردیا۔ یہ سب گمراہی اور سرکشی ہے۔

آج اچھے خاصے مسلمان، تعلیم یافتہ، صوم وصلوٰۃ کے پابند بھی اس قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنے کمال اور ہنر مندی کا نتیجہ سمجھتے ہیں، انہیں چاہئے کہ اپنی شکل وصورت، آنکھوں اور قدوقامت دل و دماغ اور دیگر اعضاء پر نظر کریں، تو کیا یہ چیزیں بھی کسی ہنر مندی کا نتیجہ ہیں؟

﴿وَلَوۡ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسۡتِعۡجَالَهُمۡ بِالۡخَيۡرِ﴾ اور اگر لوگوں کی عُجلت طلب کی موافق اللہ تعالیٰ فوراً برا نتیجہ دیدیتا، جیسا کہ فوری عجلت طلب پر اچھا نتیجہ دیدیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہوگا: اگر ان لوگوں پر ان کے جلدی مچانے کے موافق اللہ تعالیٰ جلدی عذاب بھیج دیتا، جیسا کہ وہ خیر کیلئے جلدی مچاتے ہیں (اور ان کے جلدی مچانے پر اللہ تعالیٰ خیر بھیج دیتا ہے) تو عذاب کا وعدہ کبھی کا پورا ہوچکا ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کے جلدی کرنے پر اسی وقت عذاب نہیں بھیجتا۔

اسی وقت فوری عذاب نہ بھیجنے میں ایک حکمت یہ ہے کہ سرکشوں کو اللہ تعالیٰ ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے، تا کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں، اور یہ بطور استدراج ہوتا ہے، تا کہ سرکشی میں بڑھتے جائیں، اور تباہی کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ جائیں، اور زیادہ سخت عذاب کے مستحق ہوتے چلے جائیں۔ اس میں واضح طور پر بتادیا کہ عذاب کا مؤخر ہونا اور عذاب کی جلدی طلب کے باوجود عذاب کا جلدی نہ آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ عذاب کی وعید برحق اور سچی نہیں ہے، بلکہ وعید سچی ہے، لیکن عذاب اس وقت واقع ہوگا جب اللہ تعالیٰ کی حکمت متقاضی ہوگی۔

سورۂ عنکبوت میں فرمایا: ﴿وَيَسۡتَعۡجِلُوۡنَكَ بِالۡعَذَابِ ؕ وَلَوۡلَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الۡعَذَابُ ؕ وَلَيَاۡتِيَنَّهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ۝﴾ [العنکبوت] (اور یہ لوگ تم سے عذاب کی جلدی مچارہے ہیں، اگر (عذاب کا) ایک معین وقت نہ ہوتا تو ان پر ضرور عذاب آجاتا، اور وہ آئے گا ضرور، اتنا اچانک کہ ان کو پتہ بھی نہیں چلے گا)۔ اور سورۂ ص میں فرمایا: ﴿وَقَالُوۡا رَبَّنَا عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ يَوۡمِ الۡحِسَابِ﴾ [ص: ۱۶] (اور کہتے ہیں

کہ: اے ہمارے پروردگار! ہمارا حصہ ہمیں روزِ حساب سے پہلے ہی جلدی دیدے)۔اور سورۂ رعد میں فرمایا: ﴿وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ﴾ [الرعد:٦] (اور یہ لوگ خوشحالی سے پہلے تم سے بدحالی کی جلدی مچائے ہوئے ہیں)۔اور سورۂ انفال میں فرمایا: ﴿وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٣٢﴾ [الأنفال] (جب انہوں نے کہا تھا کہ: یا اللہ! اگر یہ وہی حق ہے جو تیری طرف سے آیا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسادے، یا ہم پر کوئی اور تکلیف دہ عذاب ڈال دے)۔

اس طرح کے عذاب کا مطالبہ ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے، غرق شدہ اور تباہ شدہ اقوام نے ہمیشہ اپنے پیغمبروں علیہم السلام سے اسی قسم کے عذابوں کا سرکشی اور غرور واستہزاء کے طور مطالبہ کرچکی ہیں، پھر اس کے نتیجے میں وہ اپنے منہ مانگے عذابوں میں تباہ ہوچکی ہیں۔

﴿وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا﴾ ناشکر اور نافرمان انسان جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں لیٹے ہوئے بیٹھے ہوئے کھڑے ہوئے پکارتا ہے، پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کردیتے ہیں تو ایسے گزر جاتا ہے کہ گویا اس نے تکلیف کے وقت ہمیں پکارا ہی نہ تھا، وہ بالکل بھول جاتا ہے کہ مجھے تکلیف پہنچی تھی، اور میں نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے مانگا، اور وہ مہربان غفور رحیم نے میری تکلیف دور فرمائی۔ جو لوگ ازلی وعدہ کے منکر ہو کر اسے بھول جاتے ہیں وہ اللہ پاک عزّ سلطانہ کی تمام احسانات اور انعامات کو بھی بھول جاتے ہیں۔ دراصل یہ بری خصلت مشرکین کی ہے، مگر بدقسمتی سے بہت سارے مسلمانوں نے بھی اسے اختیار کیا ہوا ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں بہت سے مقامات پر مذکور ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جسے اس بات کی خوشی ہو کہ ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ سختیوں اور پریشانیوں میں اس کی دعا قبول فرمائے تو اسے چاہئے کہ آسائش و خوشحالی کے زمانہ میں زیادہ دعا کیا کرے۔ [ترمذي]

یہ ہے وفادار، نیک کردار مؤمن بندوں کا شعار، اللہ تعالیٰ جس سے راضی ہو تو اس کی توجہ حال میں اپنی طرف مبذول فرمائے گا۔

یک چشم زدن غافل ازان شاہ نباشی ☆ شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ
جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: اور ہم نے تم سے پہلے بہت سی جماعتوں کو ہلاک کیا، جب انہوں نے ظلم کیا، اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے، اور وہ لوگ ایمان لانے والے نہ تھے، ہم اسی طرح مجرموں کو سزا دیا کرتے ہیں﴿۱۳﴾ پھر ہم نے تمہیں زمین میں ان کے بعد خلیفہ بنا دیا تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو﴿۱۴﴾

معارف ومنازل

سابقہ اقوام کی ہلاکت، اور موجودہ قوموں کی آزمائش:

اللہ تعالیٰ شانہ غفور ورحیم ذات ہے، وہ یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ میرے بندے کفر وشرک اور ظلم کی وجہ سے آئے دن ہلاک ہوتے رہیں، اسی لئے وہ ان کیلئے بیش بہا قیمتی ہدایات کا بندوبست فرماتے ہیں، تا کہ لوگ ان پر عمل کر کے بجائے تباہی وہلاکت کے خوشحالی اور ابدی سعادت حاصل کریں۔ اسی لئے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ اس آیت میں مشرکین اور تمام منکرین کو تنبیہ ہے کہ ہمارے ڈھیل دینے سے یہ نہ سمجھو کہ عذاب نہ آئے گا، گزشتہ اقوام کی تاریخ اور ان کی سرکشی اور نافرمانی، اور پھر ان پر تباہ کن عذاب آنے کے واقعات سے عبرت حاصل کرلو۔ وہ لوگ ہر اعتبار سے تم سے قوی وطاقتور تھے، اور مادی اسباب کے اعتبار سے بڑے مضبوط تھے، آج صفحۂ ہستی میں ان کا نام ونشان نہیں رہا۔ عذابِ الٰہی سے بے فکر رہنا بڑی جہالت ہے، مختلف زمانوں میں، مختلف ممالک میں، مختلف قوموں پر عذاب آتا رہا ہے، اسی طرح تم پر بھی اتمامِ حجت کے بعد شاید عذاب آجائے۔ جس ظلم ومعاصی کی وجہ سے وہ تباہ ہوئے وہ سب تمہارے اندر بھی موجود ہے، کیونکہ:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ پھر ہم نے ان ہلاک شدہ اقوام کے بعد تمہیں زمین میں ان کا خلیفہ بنا دیا، تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔ گزشتہ بہت سی قومیں ہلاک ہوگئیں، ان کی حکومتیں اور سلطنتیں خاک میں مل گئیں، تعمیرات، بنگلے، سڑکیں، خزانے باغات، بلڈنگیں، وسائل، اسباب، منصوبے سب برباد ہوئے۔ دور مت جاؤ، ہماری صدی سے کچھ قبل جنگِ عظیم پر ذرا نظر ڈالو، سات کروڑ لوگ

مارے گئے، بیس کروڑ زخمی، لنگڑے، لولے، نابینا، اپاہج ہو گئے، مالی نقصان کا تو اندازہ ہی نہیں۔ یہ ساری جنگ بے مقصد لڑی گئی۔ ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ۝﴾ [الحشر] (عبرت حاصل کرو اے بصیرت والو!)۔ ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝﴾ [الفجر] (یقیناً تمہارا پروردگار سب کو نظر میں رکھے ہوئے ہے)۔

جب گزشتہ اقوام صفحۂ ہستی سے اتمامِ حجت کے بعد مٹ چکی ہیں تو ان کی جگہ موجودہ اقوام خداوند واحد وجبار کی زمین پر آباد ہیں، حکومتیں ہیں، دولتیں ہیں، بے مثال ترقی یافتہ ہیں، اور پرانی قوموں کے خلیفے ہیں، مگر اصل بادشاہی واحد الجبار خدا کی ہے، یہ تمہاری خلافت اس لئے نہیں کہ دنیا ہی کو اپنا مطلوب ومقصود سمجھ کر ربّ العزّت کے ساتھ برسرِ پیکار رہو، اس کے قوانین کو اپنے پاؤں میں روند کر اس کے خلاف جنگ کا اعلان کرو، تمہیں یہ خلافت آمائش کے طور پر دی گئی ہے، وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، اور نظارہ کر رہا ہے، اگر استدراج کے طور پر کسی ظالم کو ڈھیل دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اس نے عذاب وعقاب کو منسوخ کیا ہوا ہے، اگر تم نے گزشتہ اقوام کی ہلاکت سے عبرت کا سبق نہیں سیکھا تو سنو وہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝﴾ [المرسلات] (کیا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر انہی کے پیچھے بعد والوں کو بھی چلتا کر دیں گے۔ ایسا ہی سلوک ہم مجرموں کے ساتھ کیا کرتے ہیں)۔

حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا سرسبز اور میٹھی ہے، اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں پہلے لوگوں کے بعد بسانے والا ہے، سو وہ دیکھے گا کہ تم دنیا میں کیا کرتے ہو، سو تم دنیا سے بچو، اور عورتوں کے فتنہ سے بھی بچو، کیونکہ بنی اسرائیل میں سب سے پہلا فتنہ جو ظاہر ہوا وہ عورتوں کا فتنہ تھا۔ [مسلم]

آج پورے عالم میں بے حیائی اور بے شرمی کی جو آگ (نہ بجھنے والی) لگی ہوئی ہے، مسلم وغیر مسلم معاشرے جو زیر وزبر اور تباہی کے مناظر پیش کر رہے ہیں، وہ سب عورتوں کی وجہ سے ہے۔ مسلم قوم مٹی کے تودوں کے ڈھیر میں ڈوبی ہوئی ہے، وہ مستقل ایک صدمہ ہے، مگر جس مغرب نے اس سلسلے میں پیشرفت کی ہے وہ بھی زندہ درگور ہے، کیونکہ موجودہ زمانے میں اصل حکمران عورت اور دوسرے نمبر پر مال ہے، جبکہ ان دونوں کا فتنہ بڑا خطرناک اور تباہ کن ہے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا
يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۵ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۶ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۱۷

ترجمہ: اور جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، یوں کہتے ہیں کہ آپ اس قرآن کے علاوہ دوسرا قرآن لے آئے، یا اس کو بدل دے، آپ فرما دیجئے کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اسے اپنے پاس سے بدل دوں، میں تو بس اسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، بیشک اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ۱۵ آپ فرما دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو میں تم لوگوں پر اس کی تلاوت نہ کرتا، اور نہ تمہیں اللہ تعالیٰ اس کی اطلاع دیتا، سو میں تمہارے درمیان اس سے پہلے عمر کے ایک بڑے حصہ تک رہ چکا ہوں، کیا تم سمجھ نہیں رکھتے؟ ۱۶ سو اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھے؟ یا اس کی آیات کو جھٹلائے؟ بیشک بات یہ ہے کہ مجرم کامیاب نہیں ہوتے ۱۷

معارف ومنازل

منکرین کا بے سروپا ناممکن مطالبہ:

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ﴾ سے مشرکین مکہ مراد ہیں، جو کہتے رہتے تھے: ﴿لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝۲۶﴾ [فصلت] (اور یہ کافر کہتے ہیں کہ: اس قرآن کو سنو ہی نہیں، اور اس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو تاکہ تم ہی غالب رہو)۔ ﴿فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۳۳﴾ [الأنعام] (دراصل یہ تمہیں نہیں جھٹلاتے، بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں)۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر کو سورۂ انعام، رکوع نمبر چار کے تحت ملاحظہ کیا جائے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اہل مکہ میں سے پانچ آدمیوں نے آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں کہا تھا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو آپ اس قرآن کے علاوہ دوسرا قرآن لے آئیں، جس

میں لات، منات، اور عزیٰ کی عبادت چھوڑنے کا حکم نہ ہو، اوران بتوں کا برائی کے ساتھ ذکر بھی نہ ہو، اگر اللہ تعالیٰ نے ایسی آیات نازل نہیں کی ہیں تو آپ اپنے پاس سے بنادیں، یا اس قرآن کو بدل ہی دیں، آیت عذاب کی جگہ آیت رحمت لکھ دیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [معالم التنزیل]

جن پانچ آدمیوں نے یہ بات کہی تھی ان کے نام یہ ہیں: (۱) عبداللہ بن ابی امیہ (۲) ولید بن مغیرہ (۳) بکر بن حفص (۴) عمرو بن عبداللہ بن ابی قیس (۵) عاص بن عامر بن ہشام۔ ان لوگوں کے کہنے پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جب ان پر ہماری واضح آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے ہیں یعنی آخرت اور بعثت کے منکر ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ آپ اس قرآن کے علاوہ دوسرا قرآن لے آئیں، یا اس کو بدل دیں (لات و منات وعزیٰ کی عبادت کو نہ چھیڑیئے وغیرہ)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں یہ نہیں کرسکتا کہ میں اپنے پاس سے اللہ تعالیٰ کے احکام اور قرآن کی آیات کو بدل دوں، میں تو صرف وحی کا پابند وفرمانبردار ہوں، میری طرف جو وحی آتی ہے اس کا اتباع کرتا ہوں، نہ اپنے پاس سے کچھ کہہ سکتا ہوں، نہ اسے بدل سکتا ہوں، وحی کو بدلنا بہت بڑا گناہ ہے، میں تمہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتا ہوں ایسے ہی اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں کہ اگر اپنے ربّ کے حکم کی خلاف ورزی کی تو بڑے دن کا عذاب گھیر لے گا، میرا کام صرف پہنچانے کا ہے، اپنے پاس سے قرآن بنانے کا نہیں ہے، میں تو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ ہوں، نافرمانی کرلوں تو عذاب میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رکھتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ کا مامور ہوں، اس کے حکموں کا کھول کر بیان کرنے والا ہوں، اگر وہ نہ چاہتا تو میں تم پر اس کی تلاوت نہ کرتا، اور نہ وہ تمہیں بتاتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔

تمہیں یہ دیکھنا اور سوچنا چاہئے کہ میں عرصۂ دراز تک تمہارے اندر رہا ہوں، یعنی چالیس سال تمہاری بستی، تمہارے پڑوس میں گزار چکا ہوں، اس بڑے عرصے میں کبھی میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کا نبی ہوں، اور مجھ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل فرمائی ہے، اگر میں اپنے پاس سے بنا کر کوئی بات کہنے والا ہوتا، اور اپنی باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے تمہارے اندر اپنا کوئی مقام بنانا چاہتا، تو اس سے بہت پہلے ایسا کر چکا ہوتا۔

جب یہ میرا کلام نہیں ہے تو اس میں کیسے ترمیم کروں؟ تم مجھ سے کیسے کہتے ہو کہ میں اپنے پاس سے بنا کر لاؤں؟ کیا تم سمجھ نہیں رکھتے کہ میں نے پوری زندگی تمہارے اندر گزاری؟ اس بارے میں تم خود گواہ ہو کہ میں

نے کوئی خطا، کوئی گناہ، کوئی غلط بیانی، کوئی بددیانتی نہیں کی، کسی کے بارے میں جھوٹ نہیں کہا، تو خوب سوچو، جو شخص لوگوں کے بارے میں جھوٹ اور غلط بیانی نہیں کرتا وہ کیسے خدا کے بارے میں غلط بیانی کرتا ہے؟ یا جھوٹ بولتا ہے؟

اور جب اس کی پوری زندگی بے عیب و بے داغ ہے تو تمہیں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہونا چاہئے، ورنہ تم خود قابلِ ملامت ہو، خوب سمجھو اور فیصلہ کرو۔ آخر میں فرمایا:

﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا﴾ اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور سرکش کون ہوسکتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹی باتیں بناتا ہے، اور جھوٹ موٹ کا دعویٰ کر بیٹھتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا ہے، اس سے بڑھ کر کوئی مجرم اور گناہ گار نہیں ہوسکتا۔

آقا کا چہرہ صداقت کی واضح دلیل ہے:

سبحان اللہ! یہ عام امتی مسلمان کی صفت ہوتی ہے کہ اس کی شناخت پیشانی کے نور سے ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ﴾[الفتح: ۲۹] (ان کی نشانی ان کے چہروں میں سجدے کے اثر سے نمایاں ہے)۔ چنانچہ سرور عالم خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسیلمہ کذاب دونوں کو جنہوں نے دیکھا ہے، وہ دونوں کا فرق اسی طرح پہچان سکتے ہیں جیسے کوئی دن چڑھے کی روشنی اور آدھی رات کی تاریکی میں فرق کرلیتا ہے، اب دونوں کی خصلتوں، اعمال، کردار وگفتار، شجاعت، سماحت وسخاوت، علم اور اخلاق اور کلام وسلام کا موازنہ کرو، تو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ صداقت وحقانیت اور پیغمبری کمالات کا ایک طرف کوہ ہمالیہ کی بلندی ہے، دوسری طرف مکھی مچھر کے پروں کی مکروہ آواز ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ یہود کے بڑے عالم تھے، فرماتے ہیں کہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے پر خوش تھے، ان خوش ہونے والوں میں مَیں بھی تھا، میں نے پہلی بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور پر نظر دوڑائی، تو دل نے گواہی دی کہ حَاشَا وَكَلَّا یہ چہرۂ انور کسی جھوٹے شخص کا ہو ہی نہیں سکتا، اور میں نے سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے جو بات سنی وہ یہ ہے کہ اے لوگو! آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرو، اس کی فلاح کی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو، غریبوں اور بھوکوں کا پیٹ بھر دو، رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرو، راتوں میں نماز پڑھو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں، تم سلامتی کے ساتھ جنت میں جا پہنچو گے۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے مشہور قصیدہ میں یہ فرمایا: ۔

لَوْ لَمْ تَكُنْ فِيهِ اٰيَاتٌ مُبَيِّنَةٌ ★ كَانَتْ بَدِيهَتَهُ تَأْتِيكَ بِالْخَبَرِ

یعنی دلائل اگر آپ کے پاس نہ بھی ہوتیں تو آپ کے چہرۂ انور کی پاکیزگی، سادگی اور معصومیت خوب آپ کی صداقت وحقانیت کی واضح روشن دلیل تھی۔ اس کے بعد اگر مزید تفصیل دیکھنا اور اور مسیلمہ کذاب کا جھوٹا کلام معلوم کرنا ہو تو تفسیر ابن کثیر میں دیکھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اے مشرکین مکہ! میں چالیس سال تمہارے اندر رہا ہوں، میرے اعمال، کردار، اخلاق، گفتار، اور زندگی کے تمام اطوار تمہارے سامنے ہیں، تم مجھے دیکھ چکے ہو، ہر طرح سے پرکھ چکے ہو، ہمیشہ سے صادق اور امین کہتے آئے ہو، اب جب اللہ تعالیٰ کا کلام تمہیں پہنچاتا ہوں تو کیوں دور بھاگتے ہو؟

اس سے معلوم ہوا کہ جب کسی کو کوئی عہدہ سپرد کیا جائے تو اس کا ماضی ضرور دیکھ لیا جائے کہ اب تک اس کا کیا کردار تھا، اس کے اعمال کیا تھے، اس میں دیانت وصداقت، طہارت وتقویٰ کتنا اور کہاں تک تھا، ان چیزوں کو دیکھ کر دینی اور دنیوی بڑے بڑے عہدوں کیلئے لوگوں کا انتخاب اگر کیا جائے تو ان شاء اللہ کوئی پریشانی اور پشیمانی نہیں ہوگی، ورنہ سارا نظام تباہ ہو جائے گا، جیسے یہودیوں اور عیسائیوں کی رائج کردہ جمہوریت ہے کہ اس میں انسانوں کو گنا جاتا ہے، تولا نہیں جاتا، جو کہ سراسر غلط اور ابلیسی نظام ہے، جس کے نتائج ہر شخص کے سامنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔

......❁......❁......❁......

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ⑱ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ⑲ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ⑳

ترجمہ: اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان دے سکیں اور نہ نفع پہنچا سکیں، اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں، آپ فرما دیجئے: کیا تم اللہ تعالیٰ کو وہ

بتاتے ہو جسے وہ نہیں جانتا، آسمانوں اور زمینوں میں، وہ ان لوگوں کے شرک سے پاک ہے، اور برتر ہے⑱ اور لوگ پہلے ایک ہی امت تھے، پھر انہوں نے آپس میں اختلاف کرلیا، اور اگر آپ کے ربّ کی طرف سے پہلے سے بات طے نہ ہوچکی ہوتی تو ان کے درمیان اس چیز میں فیصلہ ہوچکا ہوتا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں⑲ اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے کیوں نازل نہیں کی گئی؟ سو آپ فرما دیجئے کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، سو تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں⑳

معارف ومنازل

مشرکین کی گمراہی، اوران کے ناپاک عقائد:

ان آیات میں پہلے تو مشرکین کی گمراہی کا تذکرہ فرمایا کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ شانہ کی توحید کو چھوڑ کر غیر اللہ اور بے جان بتوں کی عبادت کرتے ہیں، غیر اللہ خواہ جاندار ہو یا بے جاں، جیسے اوثان واصنام، سب کی عبادت حرام اور شرک ہے، جو کہ بغیر توبہ اور توحید اختیار کرنے کے ناقابلِ معافی ہے۔ مشرکین کے معبودانِ باطل نہ کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں، اور نہ کسی نفع کے مالک ہیں۔ نفع ونقصان تو کیا، یہ اپنے دفاع سے بھی عاجز ہیں۔

اسی گمراہی اور سرکشی پر انہیں متنبہ کیا گیا، تو انہوں نے اپنی جہالت اور ہٹ دھرمی سے یہ نکتہ نکالا کہ ہمارا اصل مقصود تو اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرنا ہے، ہم ان معبودوں کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری سفارش کرتے ہیں۔ یہ نکتہ دراصل انہیں شیطان نے سمجھایا، اور اللہ تعالیٰ کی توحید سے ہٹا کر صریح شرک میں مبتلا کردیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ معبودِ حقیقی اور برحق کائنات کا خالق و مالک اور پروردگار ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو واحد لاشریک مانتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ ہر عقیدہ اور ہر عمل وطاعت کو اسی سے معلوم کرے، جو اس کے رسولوں علیہم السلام اور کتابوں کے واسطہ سے معلوم ہوگا۔

یہ ایک حماقت اور سرکشی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اس کی مخلوق کو بھی شریک کردیا، اور پھر ان کے بارے میں سفارشی ہونے کا عقیدہ بھی تجویز کیا، یہ سب سراسر گمراہی اور حماقت ہے، اسی گمراہ کن عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

﴿قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ﴾ آپ فرما دیجئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو وہ بات بتا رہے ہو جسے وہ آسمانوں

میں اور نہ زمین میں نہیں جانتا؟ اللہ تعالیٰ نے تو تمہارے تجویز کردہ معبودوں کو سفارشی نہیں بنایا، اللہ تعالیٰ کا علمِ کلّی ہر چیز کو محیط ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے ان سب کا علم ہے، ان کے علم میں تو ان چیزوں کا سفارشی ہونا نہیں، اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ ہمارے لئے سفارشی ہیں، جس چیز کا وجود آسمانوں میں نہیں، اور زمین میں نہیں ہے، تم اس کے وجود کے کیسے قائل ہو گئے؟ معلوم یہی ہوا کہ یہ عقیدہ تمہارا اپنا خود ساختہ اور خود تراشیدہ ہے، جسے تم نے شیطان کے کہنے پر تجویز کیا ہے، یہ تمہارے کفر پر ایک دوسرا کفر ہے کہ شرک کی نسبت تم نے جھوٹ سے اللہ تعالیٰ کی طرف کردی، یہ وہی عقیدہ ہے کہ جس کی پاداش میں تم ہمیشہ کیلئے دوزخ میں رہو گے، اور جہنم کا ایندھن بن جاؤ گے۔

﴿سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ﴾ وہ ذات واحد وقدّوس جل شانہ ہر عیب ونقص اور ہر قسم کے شریک سے پاک ہے، اور برتر ہے، تمہارے شرک سے۔

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخۡتَلَفُوۡا﴾ یعنی شروع میں سب لوگ ایک جماعت تھے، سو بعد میں انہوں نے اختلاف کرلیا، یعنی سارے بنی آدم کا ایک ہی دین ومذہب تھا، سب موحد تھے، اور دینِ اسلام پر تھے (جو کہ اللہ تعالیٰ کا سارے لوگوں کیلئے پسندیدہ دین ہے) پھر شیاطین کے ذریعہ لوگوں میں اختلاف ہو گیا، طرح طرح کے باطل اور بے بنیاد عقائد شیطان نے لوگوں کو بتادیئے، جس سے لوگ کافر ہوئے اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔

تفسیر درمنثور نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان جو قرنیں تھیں بشمولِ زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام، یہ سارے لوگ برحق شریعت کے موحد تھے۔

نوح علیہ السلام سے کچھ پہلے لوگوں نے اختلافی راہیں نکالیں، اور بجائے ایک مؤمن جماعت ہونے کی دو جماعتیں بن گئیں، یعنی مؤمن اور کافر، اسی خاطر اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، سورۂ نوح میں اس واقعہ کی پوری تفصیل آئے گی، اِن شاءاللہ تعالیٰ، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿وَلَوۡلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّكَ لَقُضِىَ بَيۡنَهُمۡ﴾ اور اگر آپ کے ربّ کی طرف سے پہلے سے بات طے نہ ہوچکی ہوتی تو ان کے درمیان اس چیز میں فیصلہ ہو چکا ہوتا، جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ قرآن حکیم میں چار جگہ مذکور ہے، اور مطلب چاروں کا ایک ہی ہے، لہٰذا یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ کونسی بات ہے جو پہلے سے طے ہو چکی ہے، اس کے بارے میں متعدد اقوال ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے ہرامت کیلئے جو ایک اجل مقرر فرمادی ہے اس اجل سے پہلے انہیں

ہلاک نہیں فرمائے گا، اور مطلب یہ ہے کہ اگر اجل مقرر نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمادیتا اور جھٹلانے والے مکذبین پر عذاب بھیج دیتا، اور یہی حق اور باطل کا فیصلہ ہوتا، یعنی اہل ایمان نجات پاتے اور اہل کفر ہلاک ہوتے۔

اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کا مطلب بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ شانہ نے پہلے سے یہ بات طے فرمادی ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے ثواب اور عقاب کا فیصلہ نہیں ہوگا، بلکہ یہ فیصلہ قیامت کے دن ہوگا، اس لئے دنیا میں ایسا فیصلہ نہیں کیا جاتا کہ عذاب والوں کو یہیں بدلہ مل جائے، اور مستحقین عذاب پر یہیں عذاب آجائے۔

تیسرا قول مفسر کلبی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا گیا ہے، جس کا تعلق ایمان بالغیب کے ساتھ ہے، اور وہ بہت لمبا مضمون ہے، لہٰذا ترک کیا گیا۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ اور وہ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی نشانی ان کے ربّ کی طرف سے کیوں نازل نہ ہوئی؟ یہ ان کا محض بہانہ ہوتا تھا، وہ کسی بھی معجزہ کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرچکے تھے، یعنی معجزۂ شق القمر، مگر وہ ایمان لانے پر تیار نہیں ہوئے۔ سب سے بڑا معجزہ قرآن حکیم ہے، اس کے معارض اور نظیر پیش کرنے سے عاجز آگئے، اس کے علاوہ دیگر بہت سے معجزات کا ظہور ہوچکا تھا، ان کا مقصد ایمان لانا نہ تھا، محض بہانہ ہوتا تھا۔

﴿فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ﴾ آپ فرمادیجئے کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، تم بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار میں ہوں کہ تم پر عذاب کا کب نزول ہوگا، یا نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔

......❁......❁......❁......

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ
اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝٢١ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي
الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ
مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ
مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝٢٢ فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ
عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٢٣

ترجمہ: اور لوگوں کو تکلیف پہنچنے کے بعد جب ہم انہیں اپنی رحمت چکھادیں تو اچانک ہماری آیتوں کے بارے میں مکر کرنے لگتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ مکر کی سزا جلد ہی دینے والا ہے، بلاشبہ ہمارے فرشتے تمہارے مکر کے کاموں کو لکھ لیتے ہیں ﴿۲۱﴾ اللہ تعالیٰ وہ ہے جو تمہیں سمندر اور خشکی میں چلاتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں موجود ہو، اور وہ کشتی اچھی ہوا کے ساتھ چلنے لگے، اور جو لوگ اس میں سوار ہوں وہ اس پر خوش ہو جائیں تو اس کشتی پر ایک سخت ہوا آجائے، اور ہر جگہ سے ان پر موجیں آنے لگیں، اور وہ یقین کرلیں کہ انہیں گھیر لیا گیا ہے، تو اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگتے ہیں، اس کے لئے خالص اعتقاد کرکے: اگر تو نے ہمیں اس سے نجات دے دی تو ہم ضرور ضرور شکر گزاروں میں سے ہوں گے ﴿۲۲﴾ پھر جب اللہ تعالیٰ انہیں نجات دے دیتا ہے تو اچانک وہ زمین میں ناحق بغاوت کرنے لگتے ہیں، اے لوگو! تمہاری سرکشی تمہاری ہی جانوں پر ہے، دنیاوی زندگی میں فائدہ اٹھا رہے ہو، ہماری طرف تم کو لوٹ کر آنا ہے، سو ہم تمہیں بتادیں گے جو تم کرتے تھے ﴿۲۳﴾

معارف ومنازل

صاحب روح المعانیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ پر سات سال تک قحط مسلط کیا تھا، قریب تھا کہ اس کی وجہ سے ہلاک ہوجائیں، انہوں نے (خاص کر ابوسفیان نے) سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ خوشحالی کیلئے دعا فرمائیں، اگر یہ قحط کی مصیبت دور ہوجائے اور ہمیں خوشحالی دستیاب ہوجائے تو ہم ایمان لے آئیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعاء فرمائی، اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا قبول فرمالی، اور اہل مکہ پر رحم فرمایا، قحط دور ہوگیا، پس ایمان لانے کی بجائے پرانا ڈھنگ اختیار کیا، اور قومِ فرعون کی طرح اللہ تعالیٰ کی آیات میں طعن کرنے لگے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بدستور معاندانہ رویہ جاری رکھا، اور ایسی شرارتیں اور حیلہ بازیاں کرنے لگے جو پہلے کرتے رہتے تھے، اسی کو آیت کریمہ نے بیان فرمایا:

﴿وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ﴾ جب ہم لوگوں کو تکلیف پہنچنے کے بعد اپنی رحمت کا مزہ چکھادیتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری آیات کے بارے میں مکر وحیلہ کرنے لگتے ہیں، یعنی ہماری آیات کو نہ ماننے کے بہانے تراش لیتے ہیں، اور طعن وتشنیع شروع کرتے ہیں۔

﴿قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا﴾ آپ فرمادیجئے کہ مکر کی سزا اللہ تعالیٰ جلد ہی دینے والا ہے، جب تم شرارت ومکر

سے پیش آئے تو اطمینان سے نہ بیٹھو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی سزا کیلئے تیار رہو، کیونکہ:

﴿اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ﴾ بلاشبہ ہمارے فرشتے لکھ لیتے ہیں جو تم حیلہ سازیاں کرتے ہو، اللہ تعالیٰ شانہ کے علم میں ہوتے ہوئے تمہاری حرکتیں، شرارتیں حیلہ بازیاں اور طعن و تشنیع دفتروں میں محفوظ ہو چکے ہیں۔

آیت کریمہ کا سببِ نزول خواہ وہی ہو جو صاحب روح المعانی نے لکھا ہے، لیکن کلمہ "النَّاس" سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ اعتبار عموم الفاظ کا ہوگا، قیامت تک آنے والے سارے مکار اور ناشکرے لوگوں کو شامل رہے گا، جیسے قرآن حکیم کی عمومی اور عالمگیری اصطلاح ہے، تو انسانوں کا عام طریقہ کار یہی ہے جس پر تنبیہ ہو رہی ہے کہ جب انسان کو دکھ اور تکلیف کے بعد کوئی نعمت مل جاتی ہے تو وہ ناشکری پر اتر آتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے لگتا ہے، اور حیلہ بازی شروع کرتا ہے، وہ یہ نہیں سوچتا کہ پھر بھی مجھے تکلیف پہنچ سکتی ہے، خواہ دنیا میں خواہ مرتے وقت یا قبر و برزخ میں حتیٰ کہ قیامت کا عذاب تو ہر کافر کیلئے اٹل اور یقینی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ اللہ تعالیٰ عظیم اور بے مثال نعمتوں کی یاد دہانی فرما رہے ہیں، سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ [الاسراء: ۷۰] (اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے، اور انہیں خشکی اور سمندر دونوں میں سواریاں مہیا کی ہیں)۔

کائنات کا چپہ چپہ انسان کی تسخیر میں جکڑا ہوا ہے، خشکیوں، جنگلوں، صحراؤں، پہاڑوں، دریاؤں، ستاروں یہاں تک کہ آج فضاؤں پر بھی انسانی تسخیر کارگر ہے، نتیجہ ظاہر ہے کہ پوری کائنات انسان کے لیے ہے، اور خود انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے سمندروں کو انسانی تسخیر کا حصہ بنایا، سمندروں میں پہاڑوں جیسی کشتیاں اربوں کروڑوں ٹن وزنی مال ایک ملک سے دوسرے ملک تک ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک سفر کر کے پہنچاتی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی تسخیر اور اس کا خالص انعام ہے کہ اس نے انسان کے دائرہ اقتدار کو اتنا وسیع کر دیا کہ وہ ناعاقبت اندیش آج زمین کی وسعتوں اور فلک بوس بلند و بالا پہاڑوں سے مطمئن اور سیراب نہیں ہوتا۔

آفتاب، چاند، مریخ و مشتری اور دیگر سیاروں کی طرف بڑھ رہا ہے، اور فلکیات پر کمند ڈالنے اور انہیں مسخر کرنے کی فکر میں ہے، دنیا کا ایک حصہ بھوک سے مر رہا ہے، پیٹ بھرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، جبکہ دوسرا حصہ کھربوں بلکہ بے شمار پیسے کائنات کی تسخیر پر صرف کر رہا ہے، چیونٹی کی جب موت قریب آتی ہے تو اسے پر لگ جاتے ہیں، ابھی عنقریب شاید اس جہاں کا بستر گول ہونے کا وقت آپہنچا ہے، کہ پوری کائنات پر کفر و شیطانیت کا قبضہ مضبوط

ہو رہا ہے، اور اتنے فرعون پیدا ہوئے ہیں کہ اصلی فرعون ان کے بوٹ اور چپلوں کے گرد وغبار میں گم ہو گیا ہے۔ اُس فرعون نے کیا دیکھا، کیا کھایا، کیا عیش کیا، اس کی چار سو دس سالہ زندگی کی عیش وعشرت ایک طرف، جبکہ ہمارے زمانہ کے فرعونوں کے صرف ایک دن کی خرمستیاں ایک طرف پھر بھی یہ زیادہ ہیں۔

سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کافروں کی جنت ہے، اس حدیث پر ہمارے مسلمانوں کا عقیدہ پختہ جما ہوا تھا، مگر آج عقیدہ سے بڑھ کر خوب اچھی طرح اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں، اور یہ جنت نما دنیا اتنے عروج و ترقی پر ہے کہ اس کے حقائق کو تفصیلاً بیان کرنا ممکن ہی نہیں، اور نہ کسی کے قلم میں اتنی ہمت ہے، اور غریب ملکوں کے بڑے بڑے حکمرانوں کے یومیہ اخراجات کروڑوں میں ہیں۔ حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيل۔

تو آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وہی ذات ہے جو تمہیں خشکی میں اور سمندر میں چلاتا ہے، خشکی میں انسانی چال وچلن جس انداز پر ہم دیکھ رہے اور مشاہدہ کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ نہایت حیران کن ہے، گاڑیوں اور دیگر مشینریوں کی وہ بھر مار ہے کہ انسانی عقل کام چھوڑ دیتی ہے، چونکہ دریائی سفر ایک اعتبار سے سہل اس لئے ہے کہ وہاں سڑک بنانے اور اخراجات کرنے کی ضرورت ہی نہیں، مگر مشکل اس لئے ہے کہ وہاں غرقاب ہونے اور سمندری طوفانوں سے ٹکرانے کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے، موجودہ ترقی یافتہ دنیا نے ایک حد تک سمندر کو مسخر کر کے اس پر قابو پالیا ہے، اور مزید خواب خرگوش میں رہ کر آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے۔

قدرت نے کافی استدارج میں رکھ کر ڈھیل دی ہوئی ہے، کبھی کبھی جزوی سونامی خفیف انداز میں ظاہر ہوتے ہیں، اور گم ہو جاتے ہیں۔ پانی کے جہاز اتنے بڑے ہیں کہ پناہ بخدا! انسان انہیں دیکھ کر پاگل ہو جاتا ہے، زمانہ نزول قرآن میں بادبانی کشتیاں ہوتی تھیں، اُن کی رفتار کا تعلق ہوا کے ساتھ مربوط ہوتا تھا، ہوا موافق ہوئی تو کشتیاں چلنے لگیں، اگر ہوا بند ہوگئی تو کھڑی ہوگئیں، ﴿فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ﴾ [الشوریٰ: ٣٣] (پس وہ جہاز سمندر کی پشت پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں)۔

ہوا موافق ہے، اور نرم وخوشگوار ہے تو خوشیاں منا رہے ہیں، ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں، اگر تیز ہوا چلنے لگی اور ہر طرف سے موجیں اٹھ اٹھ کر آنے لگیں تو قیامت آگئی ڈرنے لگے، اور اضطرابی کیفیت میں جیتے جاگتے ڈوب گئے، اور یقین کر لیا کہ اب گھیرے میں آگئے، اس وقت سوچتے ہیں کہ جان کیسے بچے، یہ وہ اضطراری وقت ہے کہ کافروں کے سارے باطل عقائد درست ہو جاتے ہیں، اور وہ تمام نقلی اور باطل معبودوں کو بھول جاتے ہیں، قرآن

کریم نے فرمایا: ﴿ رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ۝ ﴾ [الاسراء] (تمہارا پروردگار وہی ہے جو تمہارے لیے سمندر میں کشتیاں لے چلتا ہے، تا کہ تم اس کا فضل تلاش کرو۔ یقیناً وہ تمہارے ساتھ بڑی رحمت کا معاملہ کرنے والا ہے۔ اور جب سمندر میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو جن کو تم پکارکرتے ہو وہ سب غائب ہو جاتے ہیں۔ بس اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے۔ پھر جب اللہ تمہیں بچا کر خشکی تک پہنچادیتا ہے تو تم منہ موڑ لیتے ہو۔ اور انسان بڑا ہی ناشکرا ہے)۔

جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں، تمہارے ذہنوں سے ان کا وجود ہی نکل جاتا ہے، تو ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر نظر نہیں جاتی، کافر تو کافر ہے ایسے وقت میں دہریہ یعنی منکرِ خدا بھی قائل ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگتا ہے، تو ایسے وقت میں کٹر سے کٹر کافر و مشرک بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں خالص اعتقاد کے ساتھ دُعاء و التجا کرنے لگتا ہے، سارے بیوفاؤں کو بھول جاتا ہے، اور اصلی حقیقی خدا کو یاد کرتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ! اگر آپ نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ضرور ضرور آپ کے شکر گزار بندوں میں ہوں گے۔

پھر جب اللہ تعالیٰ مصیبت سے بچا دیتا ہے اور سختی سے نجات دیتا ہے تو پھر وہی اللہ تعالیٰ کی زمین میں سرکشی، بغاوت، شرارت کرنے لگ جاتے ہیں، جس کا انہیں کوئی حق نہیں، ایک رکوع پہلے گزرا تھا: ﴿مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ﴾ [یونس: ۱۲] (اس طرح چل کھڑا ہوتا ہے جیسے کبھی اپنے آپ کو پہنچنے والی کسی تکلیف میں ہمیں پکارا ہی نہ تھا)۔

اول تو شرک ایک سرکشی اور بے انصافی ہے، پھر مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کو خلوصِ عقیدہ کے ساتھ یاد کرنا اور آئندہ سرکشی سے تائب ہونے کا اور اسلام قبول کرنے کا وعدہ کرنا، پھر منحرف ہونا، اور دھوکہ کرنا بری بات ہے، یہ دھوکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہیں، اپنی جانوں کے ساتھ ہے، جس کا عذاب کفر کے عذاب سے علیحدہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ یہ کشتی والے وعدہ خلاف ہیں، پھر بھی اتمامِ حجت کی خاطر اور دنیا والوں پر ظاہر کرنے کی خاطر ان کی دعا قبول فرما کر انہیں نجات دیدیتے ہیں۔

یاد رکھو! یہ وہ پاکیزہ بلند و بالا بے غرض دربار ہے جس سے کوئی محروم نہیں۔

﴿فَلَمَّآ اَنۡجٰىهُمۡ اِذَا هُمۡ يَبۡغُوۡنَ﴾ حق تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان اور نعمت نجات کا شکرادا کرتے، مگر ایسا نہیں ہوا، تو انہوں نے اپنا نقصان کیا، اور وہ یہ:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغۡيُكُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ﴾ اے لوگو! تمہاری بغاوت اپنی ہی جانوں پر ہے، کیونکہ اس کا وبال تمہارے ہی اوپر پڑنے والا ہے، جو بھی برائی کرو گے اس کی سزا تمہیں ہی بھگتنا پڑے گی۔

﴿مَّتَاعَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ثُمَّ اِلَيۡنَا مَرۡجِعُكُمۡ فَنُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ﴾ یہ تھوڑا سا چندروزہ نفع ہے، نہ یہاں کی خوشی ابدی ہے اور نہ غمی، یہ دنیوی زندگی کسی کی آخری منزل اور ابدی نہیں، البتہ سمجھدار اسی کی قربانی دے کر آخرت کی ابدی خوشحالی حاصل کر سکتے ہیں، پھر ہماری طرف تمہارا لوٹنا ہوگا، تو ہم تمہیں بتادیں گے جو کام تم کیا کرتے تھے، اگر اس دنیا پر جمے رہے تو ایسے لوگوں کا انجام برا ہوگا۔ اب آنے والی آیات کریمہ میں یہی حقیقت کھل کر سامنے آنے والی ہے، فرمایا:

اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ
الۡاَرۡضِ مِمَّا يَاۡكُلُ النَّاسُ وَالۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَ
ازَّيَّنَتۡ وَظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَيۡهَاۤ ۙ اَتٰٮهَاۤ اَمۡرُنَا لَيۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا
حَصِيۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی اتارا، پھر اس پانی کی وجہ سے زمین سے نکلنے والی ہری بھری چیزیں جنہیں انسان اور مویشی کھاتے ہیں خوب گنجان ہو کر نکلیں، یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی رونق کا پورا حصہ لے لیا، اور اس کی خوب زیبائش ہوگئی، اور زمین والوں نے خیال کرلیا کہ ہم اس پر صاحبِ قدرت ہو چکے ہیں، تو رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا سو ہم نے اسے ایسا بنادیا جیسے کٹا ہوا ڈھیر ہو، گویا کہ کل اس کا وجود ہی نہ تھا، ہم اسی طرح آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں، ایسے لوگوں کیلئے جو سوچتے ہیں ﴿۲۴﴾

معارف ومنازل

دنیوی زندگی نہایت خستہ، زوال پذیر اور فانی ہے:

اللہ تعالیٰ شانہ نے اس آیت کریمہ میں دنیا کی حالت ایک عام فہم مثال کے ذریعہ بیان فرمائی ہے، دنیا کی ظاہری زیب وزینت (جوخوبصورت رنگدار سانپ کی سی ہے) اس کی زیبائش پر جولوگ فریفتہ دیکھے جاتے ہیں، اور آخرت سے محض یہ نہیں کہ غافل رہتے ہیں، بلکہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں، ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اس (متاعِ قلیل) تھوڑی سی حقیر دنیا کی وجہ سے آخرت سے غافل نہ ہوں۔ارشاد فرمایا کہ:

دنیا کی ایسی مثال ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسایا، اس پانی کی وجہ سے طرح طرح کے پودے اُگے، سبزیاں نکلیں، گھاس برآمد ہوئی، پھولوں کی رنگ برنگ غنچے پیدا ہوئے، اور ان چیزوں کی وجہ سے زمین ہری بھری اور دیکھنے میں جاذبِ نظر خوبصورت معلوم ہونے لگی، سبزہ لہلہانے لگا، نظروں کو بھانے لگا، زمین کے مالکان بے حد خوش ہوئے، اور انہوں نے خیال کیا کہ بس اب تو یہ سب کچھ ہمارے قبضے میں ہے، ہم خوب عیش کریں گے، منافع کمائیں گے، وہ اسی سوچ وبچار میں تھے کہ ناگہاں دن یا رات کو اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا، وہ حکم عذاب کی صورت میں آ گیا، اور اسے کٹے ہوئے کھیت کی طرح کر دیا، ایسا معلوم ہوا کہ کھڑی کھیتی خاکستر ہو کر کٹا ہوا ڈھیر بن گیا، اب جب دیکھنے والے نظر ڈالتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہاں کل کچھ بھی نہ تھا۔

یہی مثال پوری دنیا کی ہے، افراد کی بھی یہی مثال ہے، قوموں کی بھی، ملکوں اور سلطنتوں کی بھی، حکومتوں کی بھی، مال وجائیداد کی بھی، فوج وحشم کی بھی۔ یہ سارے کے سارے چندروزہ ہیں، زوال پزیر ہیں، تباہیوں کے منتظر ہیں۔ایک ملک ایسا تھا کہ اس کے قلمرو میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، پورے عالم پر حکمرانی کرتا تھا، قہرِ الٰہی کی زد میں آیا تتر بتر ہو گیا، اب ایک مختصر قلیل رقبہ میں محبوس ہو گیا، یعنی برطانیہ۔

نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ سارا نظام باری باری سے آخرت کی طرف حساب وکتاب اور جنت ودوزخ کیلئے چلتا رہے گا، پس خوش قسمت ہیں وہ لوگ جنہیں ایمان کی دولت نصیب ہوئی، وہ اس ویراں دنیا سے نکل کر ابدی راحت والی زندگی میں پہنچے، اور بدقسمت ہیں وہ لوگ جو دنیاوی زندگی (اپنی جنت) سے خالی ہاتھ نکل کر ابدی دوزخ میں پہنچ گئے۔

﴿كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ﴾ ہم اسی طرح اتمامِ حجت کیلئے آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں، ان لوگوں کیلئے جو فکر کرتے ہیں یہی فکر کرنے والے مستفید ہوتے ہیں اور جنت کا استحقاق پاتے ہیں، جن کا متصل بیان آنے والا ہے، اور جو فکر نہیں کرتے ہیں وہ نقصان اٹھاتے ہیں ان کے نقصان کا حال بھی متصل آنے

والا ہے، اسی کو فرمایا:

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى
وَزِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَھُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ
كَسَبُوا السَّـيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُھُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ
اُغْشِيَتْ وُجُوْهُھُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے، اور جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت دیتا ہے ۝ جن لوگوں نے اچھائی کے کام کئے ان کیلئے خوبی ہے، اور اس سے زائد بھی ہے، اور ان کے چہروں پر نہ کدورت چھائے گی اور نہ ذلت، یہ لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۝ اور جن لوگوں نے بُرے کام کئے ان کی بُرائی کی سزا برائی کے برابر ملے گی، اور ان پر ذلت چھا جائے گی، انہیں اللہ تعالیٰ سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا، گویا کہ ان کے چہرے اندھیری رات کی طرح ٹکڑوں سے ڈھانک دیئے گئے ہیں، یہ لوگ دوزخ والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے ۝

معارف ومنازل

یہ تین آیات ہیں: پہلی آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دار السلام (سلامتی کے گھر) یعنی جنت کی طرف بلاتا ہے، جو دینِ اسلام اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے اور اپنے بندوں کیلئے پسند وانتخاب فرمایا ہے وہ سراپا سلامتی کا راستہ ہے، اس میں دنیا میں بھی سلامتی ہے، اور آخرت میں بھی۔ چونکہ جنت میں جانے والے ہمیشہ جنت ہی میں رہیں گے وہاں نہ موت آئے گی، نہ وہاں سے کہیں اور جگہ جانا ہوگا، اور نہ کسی قسم کی پریشانی ہوگی، نہ غم نہ رنج اور نہ کوئی تکلیف، اس لئے جنت کا ایک نام دار السلام بھی ہے، یعنی سلامتی کا گھر۔

بعض علماء نے فرمایا کہ یہاں سلام معنی مصدری نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے، تو دار السلام کا معنی ہوگا: اللہ تعالیٰ کا گھر، جس میں جنتی حضرات اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ ان کے میزبان ہوں گے، تو میزبان بھی سلام کہلائے، اور وہ گھر بھی سلامتی کا گھر کہلائے، جنت میں لے جانے والے عقائد اور اعمال کو سُبُلَ السَّلٰمِ کہا

گیا ہے: ﴿یَّهۡدِیۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ [المائدۃ:١٦] (جس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی خوشنودی کے طالب ہیں)۔

اور اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ آپس میں ملاقات کے وقت السلام علیکم کہا کرو، اور جواب میں وعلیکم السلام کہا کریں۔اس طرح آپس میں ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیا کریں، جنت میں بھی آپس کی ملاقات میں ایک دوسرے کو سلامتی کی دعادیں گے، فرمایا: ﴿وَتَحِیَّتُهُمۡ فِیۡهَا سَلٰمٌ﴾ [یونس:١٠] (اور جنت میں ان کا خیر مقدم سلام ہوگا)۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی جنتیوں کیلئے سلام کی خوشخبریاں ہوں گی، سورۃ یٰس میں ہے: ﴿سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ الرَّحِیۡمٍ﴾ [یٰس:٥٨] (رحمت والے پروردگار کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا)۔

جب فرشتے جنتیوں کے پاس آئیں گے تو وہ انہیں سلام پیش کریں گے: ﴿وَالۡمَلٰٓئِکَةُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ کُلِّ بَابٍ۝٢٣ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَی الدَّارِ﴾ [الرعد:٢٤] (اور فرشتے ان کے پاس ہر دروازے سے داخل ہوں گے۔کہ تم نے جو صبر سے کام لیا تھا اس کی بدولت اب تم پر سلامتی ہی سلامتی نازل ہوگی، اور بہترین انجام کا گھر ہے) عام حالات میں بھی جنتیوں کا تحیۃ سلام ہی ہوگا: ﴿اِلَّا قِیۡلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴾ [الواقعۃ:٢٦] (سلامتی ہی سلامتی کی بات ہوگی)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں سلامتی ہی سلامتی ہے، تو اسی مناسبت سے جنت کا نام بھی دار السلام ہوا، جو کہ اسلام کے طفیل سے حاصل ہوئی۔

﴿وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ﴾ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیدیتا ہے، سیدھا راستہ اسلام ہے، جو کہ جنت کا راستہ ہے، اور عقائدِ صحیحہ واعمالِ صالحہ پر مرتب ہوتا ہے۔

﴿لِلَّذِیۡنَ اَحۡسَنُوا الۡحُسۡنٰی وَزِیَادَةٌ﴾ جن لوگوں نے اچھے کام کئے ان کے لیے حُسنیٰ ہے، اور زیادہ انعام ہے۔حُسنیٰ کے معنی ہیں: "خوبی"۔مفسرین کرام نے فرمایا: حُسنیٰ سے جنت مراد ہے، اور زیادہ سے دیدارِ الٰہی مراد ہے۔جنت میں ہر قسم کی نعمتیں ہوں گی، کسی چیز کی کمی نہ ہوگی، وہ ایک ایسی جگہ ہے کہ: مَالَا عَیۡنٌ رَأَتۡ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتۡ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلۡبٍ۔ نہ اسے آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا ہے، نہ وہم وگمان کی وہاں تک رسائی ہوئی ہے۔لیکن ان نعمتوں کا جو سردار ہے وہ دیدارِ الٰہی ہے۔

تفسیر درمنثور میں حضرت صُہیب رومی، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت کعب بن عجرہ اور حضرت اُبی بن

کعب اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے متعدد کتبِ حدیث کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "زِیَادَۃ" کی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ زیادۃ سے ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ کا دیدار مراد ہے۔ اسی طرح یہ تمام روایات تفصیل کے ساتھ تفسیر مظہری، ابن جریر، روح المعانی سب میں موجود ہیں۔ صحیح مسلم نے حضرت صُہیب رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنتی جب جنت میں داخل ہوجائیں گے تو اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہوگا: کیا تم کچھ اور چاہتے ہو جو تمہیں عطا کردوں؟ وہ عرض کریں گے (ہمیں اور کیا چاہئے؟) کیا آپ نے ہمارے چہرے سفید نہیں کردیئے؟ اور کیا آپ (جل جلالہ) نے ہمیں جنت میں داخل نہیں فرمایا؟ اور کیا آپ نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں دی؟ اس کے بعد پردہ اٹھایا جائے گا، اور وہ لوگ ربّ العزّت کا دیدار کریں گے، انہیں کوئی بھی ایسی چیز نہ دی جائے گی جو انہیں اپنے ربّ کے دیدار سے بڑھ کر محبوب ہو۔ اس کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [مسلم]

سورۃ القیٰمۃ کی آیت: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾ [القیامۃ] (اس روز بہت سے چہرے تروتازہ چمکدار ہوں گے اور اپنے رب جل شانہ کی طرف دیکھتے ہوں گے) کے تحت اس مسئلے پر مفصل کلام آئے گا۔ اِن شاءاللہ تعالیٰ، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔ اہل جنت کیلئے مزید انعام:

﴿وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ﴾ ان کے چہروں پر کدورت چھائی ہوئی نہ ہوگی، اور نہ ذلت۔ سورۃ القیٰمۃ میں فرمایا: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾ [القیامۃ] (اس روز بہت سے چہرے تروتازہ چمکدار ہوں گے اور اپنے ربّ جل شانہ کی طرف دیکھتے ہوں گے)۔ سورۃ المطفّفین میں ارشاد فرمایا: ﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾ [المطففین: ٢٤] (تو ان کے چہروں میں نعمت کی تروتازگی کو پائے گا)۔ جو شخص جنت (دارالسلام) میں ہوا پنے ربّ جل شانہ کے دیدار سے مشرف ہو، اس کا چہرا اتنا خوبصورت، دلکش، حسین و جمیل ہوگا کہ چودھویں رات کا چاند بھی اس سے اکتسابِ فیض کرے گا۔

جنت میں خوبصورتی اور مسحور کن جمال وحسن کا قدرتی بازار ہے، وہاں بدصورتی کا نہ کوئی نام ہے نہ ہی وجود، جہاں ستر ٧٠ جوڑے ریشمی لباس میں ملبوس حوروں کی پنڈلیوں اور بازوؤں کا گوشت پوست کے اندر سے ہڈی کا مغز نظر آتا ہو، وہاں کے حُسن وخوبصورتی کا نہ کوئی اندازہ ہوگا، نہ حد۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ یہ لوگ جنت والے ہوں گے، اور اس میں ہمیشہ رہیں

گے۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا﴾ اور جن لوگوں نے بُرے کام کیے (جیسے کفر وشرک جو کہ سب گناہوں کا بدتر گناہ ہے) ان کی سزا ان کے اعمال جیسی ہوگی، ان پر نہ کوئی ظلم ہوگا، نہ کوئی زیادتی، برابر سرابر کا بدلہ ہوگا۔

جہاں ایک نیکی پر سات سو تک یا بیس لاکھ تک ثواب ہوسکتا ہے وہاں گناہوں کا معاملہ ایسا نہیں، نیکیوں کی پرورش ہوتی ہے، ایک کھجور کا ثواب پہاڑوں کے برابر ہوگا۔ [عمدة القاري: ج ۷] مگر گناہ بڑے ہوں یا چھوٹے وہی کے وہی رہیں گے، ان کی پرورش نہیں ہوگی، اس لئے ارشاد فرمایا: ﴿بِمِثْلِهَا﴾۔ صحیحین کی حدیث ہے کہ گناہوں میں اضافے میں مُضاعفہ نہیں فرمایا۔

﴿وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾ ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، اور انہیں اللہ تعالیٰ سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔

﴿كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا﴾ ان کی بدصورتی کا یہ حال ہوگا کہ گویا ان کے چہروں کو اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیا گیا ہے، یہ بدصورتی کی ایک انتہائی ناقابلِ برداشت کیفیت کی مثال ہے۔ سورۂ زُمر میں ارشاد ہے: ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ﴾ [الزمر: ۶۰] (تو قیامت کے دن ان لوگوں کو دیکھے گا جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا کہ ان کے چہرے سیاہ ہیں، کیا دوزخ تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ نہیں ہے؟) سورۂ عبس میں فرمایا: ﴿وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝۴۱ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝۴۲﴾ [العبس] (اور اس دن بہت سے چہرے ایسے ہوں گے کہ ان پر بدرونقی ہوگی، ان پر بدصورتی چھائی ہوئی ہوگی، یہ وہ کافر فاجر لوگ ہوں گے)۔

فائدہ:

حُسن، جمال اور خوبصورتی اسبابِ محبت میں پہلے درجے پر ہے، اور اس کی مقابل وضد قبح وبدصورتی بھی اسبابِ بُغض ونفرت کے پہلے درجے پر ہے۔ دنیا والے تفریحِ طبع کی خاطر سالانہ بین الاقوامی جلسہ وسیمینار منعقد کرتے ہیں، جس میں حسینۂ عالم کا انتخاب ہوتا ہے، مگر قبیحِ عالم کا انتخاب کبھی نہیں ہوتا، کیونکہ قبح وبدصورتی تمام جہاں میں مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔ یہی بدصورتی دوزخیوں کیلئے مُنتَخب شدہ ہے، جبکہ اہل جنت اول سے آخر تک خوبصورت اور اعلیٰ درجے کی خوبصورتی اور حسن وجمال میں ہوں گے، جس سے آگے خوبصورتی اور حسن وجمال کا کوئی درجہ نہیں

ہوگا، جبکہ جہنمیوں کی قباحت اور ان کی بدصورتی بھی اعلیٰ درجے کی ہوگی، جس سے آگے بدصورتی کا کوئی درجہ نہ ہوگا۔

خوبصورتی اللہ تعالیٰ کے انعاموں میں سے ایک بہت بڑا انعام ہے، تمام کائنات کی خوبصورت ترین ہستی سید کائنات آقائے دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، اس چیز میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی برابر وشریک نہیں ہے، دوسرے درجے میں سیدنا یوسف علیہ السلام تھے، جن کی پیشانی اور چہرۂ انور کی جھلک سے مصری خواتین نے ہاتھ کٹوائے، حسن وخوبی کی ایک روحانی جھلک بھی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے امت کے اصحابِ باطن پر تقسیم فرمایا ہے۔

ہندوستان کے کئی ہندو اور سکھ علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کے چہرے کو دیکھنے سے مسلمان ہوئے۔ واللہ اعلم

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَاۗؤُكُمْ ۚ
فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاۗؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٢٨﴾ فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ
مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٣٠﴾

ترجمہ: اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے شرک کیا کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو، پھر ہم ان کے آپس میں جدائی کر دیں گے، اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے ﴿۲۸﴾ سو اللہ تعالیٰ ہمارے تمہارے درمیان گواہ کافی ہے، بیشک بات یہ ہے کہ ہم تمہاری عبادت سے غافل تھے ﴿۲۹﴾ اس موقع پر ہر شخص اپنے ان کاموں کو جانچ لے گا جو اس نے پہلے کئے تھے، اور وہ اپنے مالکِ حقیقی کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے، اور جو کچھ جھوٹ تراش رکھا تھا وہ سب غائب ہو جائے گا ﴿۳۰﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

قیامت کے روز عابد ومعبود کا اجتماع ہوگا:

اللہ تعالیٰ شانہ کی عدالت قائم ہو جائے گی، اس مرحلے میں عابدین ومعبودین کا اجتماع ہوگا، اس قسم کے مختلف اجتماعات کا تذکرہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں مذکور ہے، ایک اجتماع ابلیس کے ساتھ بھی ہوگا، جس کا بیان

سورۂ ابراہیم میں ان شاء اللہ آنے والا ہے۔

ارشاد فرمایا کہ وہ دن قابلِ ذکر ہے جب ہم سب کو جمع کریں گے، جمع ہونے والوں میں موحدین بھی ہوں گے اور مشرکین بھی، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ﴾ [المائدة:١٠٩] (جس دن اللہ رسولوں کو جمع فرمائے گا، پس (ان سے) کہے گا کہ تمہیں کیا جواب دیا گیا؟) اس کی تفصیل وہاں گزر چکی ہے۔

اس اجتماع میں مشرکین کے معبود بھی حاضر ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا: اے شرک کرنے والو! تم اور تمہارے وہ معبود جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا تم پوجا کرتے تھے اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو:

﴿مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ﴾ یعنی انتظار کرو، اور دیکھو کہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ اس کے بعد ان کے درمیان جدائی کردی جائے گی، مشرکین کے شرکاء جن کی عبادت کرتے تھے وہ اپنی پرستش کرنے والوں سے کہیں گے کہ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے، یعنی معبودین عابدین کی عبادت سے انکار کریں گے، اس کے جواب میں عابدین کہیں گے: کیوں نہیں ہم ضرور تمہارے پرستار تھے، اور تمہاری پوجا کرتے تھے، اس پر ان کے معبودین کہیں گے: ہمارے تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ گواہ ہے، ہم تو تمہاری عبادت سے غافل تھے، بے خبر تھے۔

بہر حال! عابدین ومعبودین ایک دوسرے پر جھوٹے الزام بھی لگائیں، اور جھوٹ بول کر اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی پیش کریں گے، اس پر ان کے تعلقات بھی منقطع ہو جائیں گے، اگر چہ یہ ایک طرف ہوگا، کیونکہ ان کے معبود اکثر بت اور بے جان اوثان واصنام ہوتے تھے۔ رہا ابلیس کی بیزاری، براءت اور انکار وہ بعد میں آنے والا ہے۔

مشرکین نے جن بتوں کو اپنے لیے شُفَعَاء تجویز کیا وہ ختم ہوا، اس طرح وہ اپنے شفعاء سمیت جہنم میں گر گئے، سورۂ انعام آیت (۹۴) رکوع (١٠) میں تفصیل گزر چکی ہے۔

﴿هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ﴾ وہاں روزِ قیامت ہر شخص اپنے کئے ہوئے اعمال کو جانچ لے گا، مشرکین اپنے اعمالِ شرکیہ اور ان کے بطلان کو، اور مؤمنین اپنے اعمالِ صالحہ اور ان کی قبولیت کو، اور اپنی اپنی ہر خیر وشر کا اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کریں گے، کسی کا ذرہ بھر گناہ یا نیکی پردۂ خفاء میں نہیں رہے گا۔

قُلۡ مَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اَمَّنۡ يَّمۡلِكُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَمَنۡ يُّخۡرِجُ الۡحَىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَيُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَىِّ وَمَنۡ يُّدَبِّرُ الۡاَمۡرَ‌ؕ فَسَيَقُوۡلُوۡنَ اللّٰهُ‌ۚ فَقُلۡ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ۝۳۱ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الۡحَـقُّ‌ۚ فَمَاذَا بَعۡدَ الۡحَـقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ‌ۖ فَاَنّٰى تُصۡرَفُوۡنَ ۝۳۲

ترجمہ: آپ فرمادیجئے: وہ کون ہے جو تمہیں آسمان سے اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یا وہ کون ہے جو کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے؟ اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردے سے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ سو وہ ضرور یوں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، تو آپ فرمادیجئے کہ پھر کیوں نہیں ڈرتے ہو؟ ۝۳۱ سو وہ اللہ تعالیٰ تمہارا حقیقی ربّ ہے، سو پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟ پھر کہاں پھرے جارہے ہو؟ ۝۳۲

معارف ومنازل

ان آیات میں توحید کے عقلی دلائل پیش کئے گئے ہیں، اور انداز یہ ہے کہ سوالات کے جوابات طلب کئے گئے ہیں کہ تمہیں داخلی اور خارجی ہر قسم کی نعمتیں عطا کرنے والی کونسی ذات ہے؟ ہر انسان بلکہ یہی مشرک اگر ذرا غور و فکر کریں گے تو ان کا جواب یہی ہوگا کہ تمام نعمتیں مہیا کرنے والا فقط اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس کو خود یہی مشرک سمندری سفر میں طوفان آنے پر خلوص کے ساتھ پکارتے ہیں، پھر جب یہ بات ہے تو پھر مشرکین سے اگلا سوال ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک کیوں بناتے ہو؟ جن کا حال ابھی معلوم ہوا کہ قیامت کے روز وہ تم سے بَری ہو کر تمہیں بے یارومددگار چھوڑ کر تمہارے ساتھ دوزخ میں گرائے جائیں گے، لہٰذا تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اسی سے ڈرا کرو، تو فرمایا:

﴿قُلۡ مَنۡ يَّرۡزُقُكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ﴾ آپ ان کفار سے دریافت فرمایئے کہ آسمان سے اور زمین سے تمہیں کون رزق دیتا ہے؟ اور تمہاری سننے کی قوت اور دیکھنے کی قوت کا مالک کون ہے؟ مطلب یہ ہے کہ تمہارے ظاہری حواس اور اعضاء قوت سامعہ و باصرہ وغیرہ کا مالک کون ہے؟ اور یہ بھی بتاؤ کہ مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ کون نکالتا ہے؟ مرغی سے انڈا اور انڈے سے چوزا نکالنے والا کون ہے؟

مردہ کافر والدین سے زندہ مسلمان اولاد، اسی طرح زندہ مسلمان والدین سے کافر مردہ اولاد، یا یوں کہئے: جاہلوں سے عالم اور عالموں سے جاہل اولاد پیدا کرنے والا کون ہے؟ اور یہ بھی بتاؤ کہ پورے عالم میں تصرفات،

نشیب وفراز، رات دن کی تبدیلی، موسموں، ہزاروں پیداواروں کو وجود بخشنے والا اوران کی تدبیر کرنے والا، نظامِ عالم کوخوش اسلوبی اور کامیابی سے چلانے والا کون ہے؟

جب آپ ان لوگوں سے یہ سوالات دریافت فرمائیں گے تو ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی جواب نہ ہوگا کہ ان چیزوں کا مالک ومختار، پیدا کرنے اور چلانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جب وہ یہ جواب دیں تو آپ فرمادیجئے کہ پھر تم اس رازق، خالق، مالک، متصرف سے کیوں نہیں ڈرتے؟ اور خالص اس کی عبادت کیوں نہیں کرتے؟ اس کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو، وہ تمہارے نزدیک بھی عاجز، بے جان، بے اختیار ہیں، ان کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ یہ سراسر تمہاری حماقت اور گمراہی ہے، اور حق کے بعد گمراہی کے سوا رہ ہی کیا گیا؟

جانتے بوجھتے سمجھتے اقرار کرتے گمراہی اختیار کرنا سب سے بڑی نادانی ہے، حق کو چھوڑ کر کہاں پھرے جارہے ہو؟ لہٰذا تم اگر کامیابی چاہتے ہو تو باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف آؤ، اور تمہارے فائدے کی خاطر اللہ تعالیٰ جو کھول کر تمہیں سمجھا رہے ہیں اس کی قدر کرو، یہی معبودِ برحق قیامت کے روز تمہیں نوازے گا، جبکہ دوسرے تمام معبود تم سے بیزاری اور براءت کا اظہار کریں گے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ
مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ
هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ
اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ٞ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ
اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

ترجمہ: اسی طرح آپ کے ربّ کی یہ بات نافرمانوں کے بارے میں ثابت ہوچکی ہے کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے ﴿۳۳﴾ آپ فرمادیجئے: کیا تمہارے شریکوں میں کوئی ایسا ہے جو مخلوق کو پیدا کرے؟ پھر اسے دوبارہ زندہ کرے؟ آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو ابتداءً پیدا فرماتا ہے، پھر اس کو دوبارہ پیدا فرمائے گا، سو تم کہاں پھرے جارہے ہو؟ ﴿۳۴﴾ آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ حق کی راہ بتاتا ہے، سو جو حق کی راہ بتاتا ہو وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے، یا وہ شخص جو ہدایت نہیں پاتا؟ مگر جب اسے راہ بتائی جائے، سو تمہیں کیا ہوا تم کیسی تجویز کرتے ہو؟ ﴿۳۵﴾ اور ان میں سے

اکثر لوگ صرف اٹکل کے پیچھے چلتے ہیں، بلاشبہ اٹکل حق کے بارے میں ذرا بھی مفید نہیں ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کاموں کو جاننے والا ہے جن کاموں کو وہ کرتے ہیں ﴿۳۶﴾

معارف ومنازل

﴿لَّا يَهِدِّيٓ﴾ اصل میں لَا يَهْتَدِيْ تھا، تاء کو دال بنا کر دال میں ادغام کیا گیا۔ فرمایا: تیرے ربّ کی طرف سے یہ طے ہو چکا ہے کہ یہ لوگ عناد و سرکشی میں اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ ان کے ایمان لانے کی امید نہیں، لہٰذا آپ تسلی رکھیں، اور پریشان نہ ہوں۔ پھر ارشاد ہوا کہ آپ ان سے دریافت کیجئے کہ وہ کون ہے جو ابتداءً مخلوق کو پیدا فرماتا ہے؟ اور انہیں موت دے کر دوبارہ زندگی عطا فرمائے گا؟ اس بات کو جان لو کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی پیدا فرماتا ہے، اور موت دے کر دوبارہ زندہ فرمائے گا۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد تم کہاں الٹے پھرے جا رہے ہو؟

پھر فرمایا کہ آپ ان سے سوال فرمایئے کہ بتاؤ تمہارے شرکاء میں وہ کون ہے جو حق کا راستہ بتاتا ہے؟ آپ خود ہی جواب میں فرمایئے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی حق کا راستہ بتاتا ہے، اور جو حق کا راستہ بتائے وہ زیادہ لائقِ اتباع ہے، یا وہ شخص جو خود ہی ہدایت نہیں پاتا، مگر یہ کہ اسے ہدایت دی جائے، اور ظاہر ہے کہ جو خود ہدایت یافتہ نہیں وہ دوسروں کو کیا ہدایت دے گا؟

ع اوخویشتن گم ست کرا رہبری کند

سو جو تمہارے معبود گم گشتہ بے راہ ہیں، بے جان، بے حرکت ہیں، وہ نقصان پر قادر نہیں ہیں، کسی بھی چیز میں ہدایت یافتہ نہیں ہیں، بالفرض اگر جاندار بھی ہوں جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام، حضرت عزیر علیہ السلام اور باقی دنیا کے پیر و فقیر اور اولیا کرام، اور سید و سادات وغیرہ، یہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تابع ہستیاں ہیں، پھر اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور سوال کرنے والے لوگ ہیں، یہ کسی معجزہ یا کرامت کے اظہار و اصدار پر قدرت ہی نہیں رکھتے، انہوں نے ساری زندگی تعلیم و اصلاحات اور ہدایت پر صرف کی، توحید کی اشاعت و پھیلانے کو شعار بنا کر اعلاءِ حق پر محنت کی۔

پھر فرمایا: ﴿وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا﴾ کہ ان مشرکین میں اکثر وہ لوگ ہیں جو محض اٹکل و گمان اور خیالوں کے پیچھے چلتے ہیں، وہ انہی خیالات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سوا بے جان پتھروں کی پرستش کرتے ہیں، عقائد گمان و اٹکل جیسے ظنی اور بے بنیاد چیزوں سے ثابت نہیں ہوتے۔ عقائد کے لئے دلائلِ قطعیہ کا ہونا ضروری ہے، جیسے

اصول فقہ میں ثابت ہے۔ سورۂ نجم میں فرمایا: ﴿اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ﴾ [النجم: ۲۳] (یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے تجویز کر لئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی دلیل نہیں بھیجی، یہ لوگ صرف گمان اور اپنے نفسوں کی خواہشوں پر چل رہے ہیں) اور ظاہر یہ ہے کہ یہ نفسانی خواہشات اور اٹکل وخیالات انہیں شیطان نے سکھائے ہیں، اس لئے فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَفْعَلُوْنَ﴾ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے افعال وکردار سے باخبر ہے، وہ اسی کے مطابق انہیں سزا دے گا۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ
الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ
وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ یُحِیْطُوْا
بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا یَاْتِهِمْ تَاْوِیْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا یُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِیْنَ ﴿۴۰﴾ وَ
اِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِیْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾

ترجمہ: اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے جو افتراء کیا گیا ہو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہو، بلکہ وہ ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے ہیں، اور احکامِ ضروریہ کی تفصیل بیان کرنے والا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رب العٰلمین کی طرف سے ہے ﴿۳۷﴾ کیا وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس کو آپ نے اپنے پاس سے بنا لیا ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ تم اس جیسی سورت لے آؤ، اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن لوگوں کو بلا سکتے ہو انہیں بلا لو، اگر تم سچے ہو ﴿۳۸﴾ بلکہ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسے جھٹلایا جسے اپنے احاطہ علمی میں نہیں لائے، اور ابھی اس کا نتیجہ ان کے سامنے نہیں آیا، ایسے ہی جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے، سو دیکھ لیجئے ظالموں کا کیسا انجام ہوا؟ ﴿۳۹﴾ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے، اور بعض وہ ہیں جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے، اور آپ کا رب فساد کرنے

والوں کوخوب جانتا ہے﴿۴۰﴾ اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو آپ فرمادیجئے کہ میرے لئے میرا عمل ہے، اور تمہارے لئے تمہارا عمل ہے، تم اس سے بری ہو جو میں کام کرتا ہوں، اور جن کاموں کو تم کرتے ہو میں ان سے بری ہوں﴿۴۱﴾

معارف ومنازل

قرآن کریم کا پورے جہاں کو چیلنج:

یہاں سے کتاب اللہ کی حقانیت کا بیان ہو رہا ہے، اسی کے ساتھ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا بھی بیان ہے، مشرکینِ مکہ کہتے تھے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہیں، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پاس سے بنالیا ہے، کبھی کہتے تھے کہ یہ پرانے ماضی کے بادشاہوں کے قصے ہیں، اول تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی کہ یہ ایسی کتاب نہیں ہے کہ کسی غیر اللہ کی طرف سے ہو، یہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے برحق کتاب ہے، جو گزشتہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کنندہ ہے، اور جو احکام اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقرر کیا ہے ان کی تفصیل کنندہ ہے۔

پھر ان مشرکین کو چیلنج کیا، اور فرمایا کہ آپ ان سے یہ فرمادیں کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ قرآن اپنے پاس سے بنا کر پیش کیا ہے، تو تم فصحاء و بلغاء و شعراءِ عرب ہو، تم صرف اس جیسی ایک مختصر سورت بنا کر لے آؤ، اور ساری مخلوق سے اس بارے میں جو جو مدد لے سکتے ہو لے لو، سورۂ بقرہ رکوع (۳) میں فرمایا: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ [البقرة:۲۳] (اور اگر تم شک میں ہو اس کتاب کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو اس کی مثل کوئی سورت پیش کرو) کی تفسیر کے ذیل میں اس کی تفصیل و تشریح گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ ہو۔

زمانۂ نزول قرآن سے لے کر آج تک کوئی بھی قرآن مجید کے مقابلہ میں ایک چھوٹی سی سورت بھی بنا کر نہیں لاسکا، اور قیامت تک بھی نہیں لاسکیں گے، سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ [الاسراء:۸۸] (آپ فرمادیجئے کہ اگر سارے انسان اور سارے جنات اس بات کے لئے جمع ہو جائیں کہ قرآن مجید جیسا کلام بنا کر لے آئیں تو نہیں لاسکیں گے، اگرچہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔

جب قرآن کی سچائی ثابت ہوگئی، تو قرآن مجید لانے والے سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت

اور سچائی ثابت ہوگئی، اس کے بعد فرمایا:

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ﴾ ان لوگوں نے ایسی چیز کو جھٹلایا جو ان کے احاطہ علمی میں نہیں ہے، قرآن کو سمجھتے نہیں، اور نہ ہی سمجھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر غور کرتے تو اس کی حقیقت اور حقانیت سمجھ میں آجاتی، اب جبکہ جھٹلانے پر تلے ہوئے ہیں تو جھٹلانے کا نتیجہ دیکھ لیں گے۔

(تَاْوِيْلُهٗ کے معنی ہیں: نتیجہ وانجام) یعنی ان کی اس تکذیب کا برا انجام سامنے آئے گا، جیسا کہ ان سے پہلے تکذیب کرنے والوں پر عذاب آچکا ہے، تو دیکھیں ان کا انجام کتنا برا ہوا؟

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ﴾ ان میں سے کچھ اس پر ایمان لائیں گے، اور کچھ ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ مفسدین کو خوب جانتا ہے، اس میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی ہے کہ آپ اپنا کام کرتے جائیں، جو ایمان نہیں لاتے آپ ان پر دلگیر اور پریشان نہ ہوں، وہ ہرگز عذاب سے نہ بچ سکیں گے۔

﴿وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ﴾ جو لوگ تکذیب پر مصر ہیں، حجت قائم ہونے کے بعد بھی تصدیق نہیں کرتے، تو آپ ان سے یہ فرمادیجئے کہ میرا عمل میرے لئے ہے (فائدہ مند وکامیاب) تمہارا عمل تمہارے لئے ہے (ناکامی وخسران) تم میرے عمل سے بری ہو، اور میں تمہارے عمل سے بری ہوں، مجھے میرے عمل کا ثواب ملے گا، تمہیں تمہارے عمل کی سزا ملے گی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّ لٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ: اور ان میں بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، کیا آپ بہروں کو سنادیں گے؟ اگرچہ وہ سمجھ بھی نہ رکھتے ہوں ﴿۴۲﴾ اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں، کیا آپ اندھوں کو راہ بتادیں گے؟

اگر چہ وہ دیکھتے بھی نہ ہوں ﴿۴۳﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ﴿۴۴﴾ اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں جمع فرمائے گا گویا کہ وہ دن کے حصے میں سے صرف ایک گھڑی ٹھہرے ہیں، وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے، بیشک وہ لوگ خسارے میں پڑ گئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو جھٹلایا، اور وہ ہدایت پانے والے نہ تھے ﴿۴۵﴾ اور اگر ہم اس میں سے کچھ حصہ آپ کو دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، یا ہم آپ کو وفات دے دیں، تو ہماری طرف ان سب کو لوٹنا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس پر گواہ ہے جو کام وہ لوگ کرتے ہیں ﴿۴۶﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیت میں فرمایا تھا کہ آپ مشرکین کے ایمان سے امید قطع فرمائیں، وہ تکذیب پر مُصِر ہیں، اور ایمان نہیں لائیں گے، آپ ان سے کہہ دیں: میرا عمل میرے لئے ہے، تمہارا عمل تمہارے لئے ہے، یعنی: ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ [الکافرون: ٦] (تمہارے لیے تمہارا دین ہے، اور میرے لیے میرا دین ہے) کی طرح اب ان آیات میں گویا اس حکم کی علّت کا بیان ہو رہا ہے، وہ یہ کہ یہ مشرکین فطری استعداد کھو چکے ہیں، ان میں ایمان کی نہ صلاحیت ہے، نہ استعداد، یہ گونگے، بہرے، اندھے اور ناسمجھ ہیں، ان میں کوئی باطنی صلاحیت نہیں، تو فرمایا:

﴿وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ﴾ ان میں سے کچھ لوگ آپ کی طرف بظاہر کان لگاتے ہیں، جب آپ قرآن پڑھتے ہیں، اور حکمت وشریعت کی باتیں سناتے ہیں، تو یہ لوگ ظاہراً کان لگا کر سنتے ہیں، لیکن دل کے کانوں اور باطنی رغبت سے نہیں سنتے، قلبی توجہ سے نہیں سنتے ہیں، استعدادِ فطری چونکہ ضائع کر چکے ہیں، تو کچھ بھی نہیں سمجھتے، پاگلوں جیسے ہیں۔

﴿اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ تو کیا آپ دل کے بہروں کو سنا دیں گے، جبکہ وہ بے سمجھ وبے فہم بھی ہوں، اگر بہرے کے پاس سمجھ ہو تو قرائن سے کچھ سمجھ بھی لیتا ہے، اگر بے سمجھ بہرا ہو تو جاہلِ مرکب ہو کر کچھ بھی نہیں سمجھ سکتا، تو آپ جس طرح بے عقل بہرے کو کچھ نہیں سنا سکتے، اسی طرح ان لوگوں کو بھی نہیں سنا سکتے جو دل کے کان سے سننے اور فکر ونظر سے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ﴾ اور ان میں سے کچھ لوگ اپنی آنکھوں سے آپ کی طرف دیکھتے ہیں، سچائی

کی نشانیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، نبوت کی علامات ان کو نظر آتی ہیں، لیکن وہ دل کے اندھے ہیں، قلبی بینائی نہ ہونے کی وجہ سے تصدیق نہیں کرتے ہیں، گویا وہ بصارت اور بصیرت دونوں سے محروم ہیں۔

﴿اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَلَوْ كَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ﴾ تو کیا آپ اندھوں کو راہ دکھادیں گے؟ خواہ وہ بے بصارت ہونے کے ساتھ بے بصیرت بھی ہوں۔ اندھے میں اگر بصیرت نہ ہو تو اس کو راستہ کیسے دکھایا جا سکتا ہے؟ جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ [الحج: ۸۶] (سو کچھ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، مگر اندھے ہوجاتے ہیں دل جو سینوں میں ہیں) آنکھوں سے دیکھ کر اگر دل سے غور نہ کیا تو نہ دیکھنے کے برابر ہے، حقیقت میں خطرناک اندھاپن وہی ہے جس میں دل اندھے ہوجائیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ﴾ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے ہیں، وہ اپنی فطری استعداد اور خیر وبھلائی کی صلاحیتوں کو کفر وشرک اور معاصی وسرکشی کی وجہ سے ضائع کرتے ہیں، اگر انہیں حق وہدایت کا راستہ دکھایا جائے اسے قبول نہیں کرتے ہیں۔ تفصیل متعدد جگہوں میں گزر چکی، خاص کر سورۂ اعراف کے آخر سے کچھ قبل میں۔

﴿وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ یَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ﴾ اور جس روز اللہ تعالیٰ انہیں جمع فرمائے گا تو ایسا معلوم ہوگا کہ دنیا میں یا قبروں میں ان کا قیام گھڑی بھر رہا تھا، انہیں ہولناک منظر کی وجہ سے ایسا معلوم ہوگا کہ دنیا میں یا قبروں میں ان کا قیام گویا گھڑی بھر رہا تھا، منظر کی ہولناکی کی وجہ سے وہ دنیوی زندگی یا قیام قبر کی میعاد کو گھڑی بھر سمجھیں گے، دنیا کی لمبی عمر اور برزخ کا لمبا قیام انہیں ہولناک منظر کی وجہ سے ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک مختصر وقفہ ہو۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ﴾ [الروم: ۵۵] (جس دن قیامت قائم ہوگی مجرمین قسمیں کھائیں گے کہ ہم ایک گھڑی سے زیادہ (دنیا یا برزخ میں) نہیں رہے)۔

﴿یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَهُمْ﴾ باہم ایک دوسرے کو شناخت کریں گے، جیسے دنیا میں ان کا باہمی تعارف تھا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ باہمی پہچان قبروں سے اٹھنے کے وقت تو ہوگی، پھر قیامت کی ہولناکی کی وجہ سے باہمی تعارف جاتا رہے گا۔ بعض آثار میں آیا ہے کہ آدمی اپنے برابر والے کو پہچان تو لے گا، مگر ہیبت اور خوف کی وجہ سے اس سے بات نہیں کریگا۔ [مظهري]

﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ﴾ منکرینِ حشر باہم تعارف کے دوران کہیں گے کہ آج گھاٹے

میں پڑ گئے، جنہوں نے قیامت کا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونے کا انکار کیا تھا، یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت ہے کہ ایمان کو چھوڑنے والے اور کفر و شرک پر جمے رہنے والے گھاٹے میں پڑ گئے، وھو الراجح۔

﴿وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ کیونکہ وہ دنیا میں ہدایت یافتہ نہ ہوئے، اسی وجہ سے خسارے اور گھاٹے میں پڑ گئے۔

﴿وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ﴾ اور جس عذاب کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے تھوڑا سا اگر آپ دکھلا دیں (تو آپ دیکھ ہی لیں گے)، یا ہم آپ کو وفات دیدیں (یعنی کفار پر نزول عذاب سے پہلے)، سو کفار کو روزِ قیامت ہمارے پاس لوٹ کر ہی آنا تو ہے، یہ عذاب سے تو چھوٹ ہی نہیں سکتے، تو اس صورت میں ان کا عذاب ہم آخرت میں آپ کو دکھا دیں گے۔

مطلب آپ کی تسلی ہے کہ کفار پر اگر آپ کی وفات سے پہلے عذاب آیا تو آپ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے، اگر آپ کی حیاتِ طیبہ میں عذاب نہیں آیا تو قیامت میں مشاہدہ کریں گے۔ بہر حال! ان کے لئے عذاب مقرر ہی ہے، جس سے وہ کسی صورت چھوٹ نہیں سکتے ہیں۔

﴿ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ﴾ پھر یہ سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے افعال و کردار پر پوری پوری اطلاع ہے، اور وہ اپنے علم کے مطابق بدلہ دے گا۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى
هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ
اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ
بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ
تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾
وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕۚ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: اور ہر امت کے لئے ایک رسول ہے، سو جب ان کے پاس ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے

درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کردیا جاتا ہے، اوران پر ظلم نہیں کیا جاتا ﴿۴۷﴾ اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ ﴿۴۸﴾ آپ فرمادیجئے کہ میں اپنی جان کے لئے کسی بھی ضرر یا نفع کا مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے، ہر امت کے لئے ایک وقت مقرر ہے، جب ان پر مقرر وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں ﴿۴۹﴾ آپ فرمادیجئے کہ تم بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب رات کو آجائے یا دن کے وقت آجائے، تو اس میں وہ کونسی چیز ہے جس کی مجرمین جلدی مچارہے ہیں؟ ﴿۵۰﴾ کیا پھر جب وہ واقع ہو ہی جائے تو اس پر ایمان لاؤ گے؟ اب ایمان لاتے ہو؟ حالانکہ تم اس کے جلدی آنے کا تقاضا کرتے تھے ﴿۵۱﴾ پھر ان لوگوں سے کہا جائے گا جنہوں نے ظلم کیا کہ ہمیشگی کا عذاب چکھ لو، تمہیں ان ہی اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جن کی تم کمائی کرتے تھے ﴿۵۲﴾ اور وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں: کیا یہ حق ہے؟ آپ فرمادیجئے: ہاں! میرے ربّ کی قسم، بلاشبہ وہ حق ہے، اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو ﴿۵۳﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ شانہ نے ازلی وعدے کی یاددہانی کے لئے انبیاء ورسل علیہم السلام کا سلسلہ جو جاری فرمایا اس آیت کریمہ میں اسی کی نشاندہی ہے، فرمایا:

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ کہ قیامت کے دن ہر امت کے رسول موجود ہوں گے، جو دنیا میں ان کی طرف مبعوث ہوئے تھے، امتیں موجود ہوں گی، اوران کے رسول علیہم السلام بھی موجود ہوں گے، جو اہل کفر کے کفر اور اہل ایمان کے ایمان پر گواہی دیں گے، اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کردیا جائے گا، اور ذرہ بھر کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ اس آیت کا مفہوم وہی ہے جو سورۃ النساء کی آیت کا ہے: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ﴾ [النساء: ۴۱] (اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لے کر آئیں گے؟)۔ اور سورۂ زمر کی آیت: ﴿وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ [الزمر: ۶۹] (اور انبیاء اور سب گواہوں کو حاضر کردیا جائے گا، اور لوگوں کے درمیان بالکل برحق فیصلہ کیا جائے گا۔ اوران پر کوئی ظلم نہیں ہوگا) کے موافق ہے۔

اور بعض مفسرین نے آیت بالا کا یہ مطلب بتایا ہے کہ دنیا میں جو رسول علیہم السلام امتوں کے پاس آئے، ان

کی انہوں نے جو تکذیب کی، اور اس تکذیب پر جو ان پر عذاب آیا اس آیت میں اسی کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر امت کے لئے ایک پیغمبر ہے، وہ پیغمبر جب ان کے پاس آجاتے ہیں، اور احکام پہنچا دیتے ہیں، پھر اس کے بعد کچھ لوگ مانتے ہیں، اور کچھ نہیں مانتے، تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے، اہل ایمان کی نجات ہو جاتی ہے، اور کافر و مشرک ہلاک کر دیئے جاتے ہیں، اور کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا، کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے اتمامِ حجت کے بعد ہو رہا ہے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ جب بار بار عذاب کی وعید سنتے تھے تو منکرین کہتے تھے کہ عذاب کی وعید کہاں تک سنیں، یہ عذاب کب ہوگا؟ دیر کیوں کرتے ہو؟ ایک مرتبہ آ ہی جائے تو ہم بھی دیکھ لیں کیسا عذاب ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ڈھیل تھی اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے مزید تکذیب میں آگے بڑھ جاتے تھے، اور طنز و مزاح کے طور پر کہتے تھے: یہ وعدہ کب ہوگا؟ اگر تم سچے ہو تو اسے پورا کر کے دکھاؤ، اور عذاب بھی لاؤ۔ ان کا یہ قول استفہامِ انکاری کے طور پر تھا، جواب ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ آپ فرما دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے کسی ضرر اور نفع کا مالک نہیں ہوں، مگر جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہے، جب اپنے بارے میں میرا یہ حال ہے تو تم پر عذاب لانا میرے اختیار میں کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھ سے تقاضا کرنا سراسر جہالت ہے۔

﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ ہر امت کے لئے ایک وقت مقرر ہے، جب ان کا مقررہ وقت آ پہنچے گا تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ عذاب کا وقت آجانے پر عذاب واقع ہو جائے گا، جن جن امتوں کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب کا وقت مقرر ہے وہ دونوں میں مبتلاءِ عذاب ہوں گے، اور جن کے لئے دنیا میں عمومی عذاب دینے کا فیصلہ نہیں کیا گیا آخرت میں تو ان کے کفر کی وجہ سے ان کو عذاب ہونا ہی ہے۔ اجلِ مقرر پر عذاب سامنے آ ہی جائے گا، یہ لوگ جو جلدی مچاتے ہیں اور بار بار کہتے ہیں کہ عذاب کب آئے گا؟ اس وجہ سے حق تعالیٰ سبحانہ نے اپنی مقرر کردہ اجل سے پہلے عذاب نہیں لائے گا، تو کفار نے جو ﴿مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾ کہہ کر جلدی عذاب مانگا تھا ان کو جواب مل گیا، اول یہ کہ عذاب پیغمبروں علیہم السلام کے ہاتھوں میں نہیں، وہ کسی ضرر و نفع کے مالک نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔

دوسرا جواب یہ ہوا کہ ہر چیز کے لئے جو اجل مقرر ہے، اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی، اگر عذاب آئے گا

معارف ومنازل

منکرینِ قیامت، مشرک وکفار جنہوں نے زندگی بھر دینی احکام اور ملّتِ اسلام کی مخالفت کی، قیامت اور حساب کو جھٹلاتے رہے، جب وہاں ہر طرح کا عذاب ان کے سامنے آئے گا تو ان کی سراسیمگی اور بوکھلاہٹ قابلِ دید ہوگی، تو جان کے بدلے، فدیہ دے کر عذاب سے بچنے کے لئے سب کچھ فدیہ میں دینے کو راضی ہوں گے۔ اگر بالفرض انہیں پوری زمین کے خزانے، دفینے اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب اور اس جیسا اور بھی ان کو مل جائے تو وہ ان سب کو اپنی جان کے بدلے دینے کو تیار ہو جائیں گے، مگر وہاں کچھ بھی کسی کے پاس نہ ہوگا۔ اور اگر بالفرض سب کچھ پاس ہو، اور جان کا بدلہ دینے لگیں تو قبول نہ ہوگا۔

سورۂ آل عمران میں اس کی تفسیر ہوگئی، فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ﴾ [آل عمران: ۹۱] (جن لوگوں نے کفر اپنایا اور کافر ہونے کی حالت ہی میں مرے، ان میں سے کسی سے پوری زمین بھر کر سونا قبول نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے اس کی پیشکش ہی کیوں نہ کرے)۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ﴾ [المائدة: ۳۶] (بیشک جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے اگر زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب ان کے پاس ہوں، اور اتنی ہی اور بھی ہوں) کی تفسیر میں دیکھیں۔ فرمایا:

﴿وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ﴾ قیامت کے دن جب عذاب دیکھیں گے تو ندامت اور پشیمانی کو دل میں رکھیں گے، بول ہی نہیں سکیں گے، تو دل ہی دل میں پشیمان ہوتے رہیں گے کہ کاش مؤمن ہوتے تو آج عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔

﴿وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ اور ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ انصاف کے ساتھ ہی تو ہے، اور کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

﴿اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ خبردار! اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور زمین میں ہے، یہ مجرمین بھی اس کی مخلوق ومملوک ہیں، اسی بنیاد پر وہ ثواب وعقاب کا مالک ہے۔

﴿أَلَآ إِنَّ وَعۡدَ ٱللَّهِ حَقّٞ﴾ خبردار! اس کا وعدہ سچا ہے، ثواب وعقاب کا وعدہ کر چکا ہے، جسے ضرور پورا فرمائے گا، تاکہ اس کا عدل واضح ہو، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، اسی لئے وہ ایمان نہیں لاتے، اور عذاب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

﴿هُوَ يُحۡيِۦ وَيُمِيتُ وَإِلَيۡهِ تُرۡجَعُونَ﴾ وہ زندہ فرماتا ہے، اور موت دیتا ہے، اور اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے، جو لوگ موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے قائل نہ تھے آج انہیں شرمندگی ہوگی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُم مَّوۡعِظَةٞ مِّن رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٞ لِّمَا فِي ٱلصُّدُورِ وَهُدٗى وَرَحۡمَةٞ
لِّلۡمُؤۡمِنِينَ ﴿٥٧﴾ قُلۡ بِفَضۡلِ ٱللَّهِ وَبِرَحۡمَتِهِۦ فَبِذَٰلِكَ فَلۡيَفۡرَحُواْ هُوَ خَيۡرٞ مِّمَّا يَجۡمَعُونَ ﴿٥٨﴾

ترجمہ: اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے، اور ایسی چیز آئی ہے جس میں سینوں کے لئے شفاء ہے، اور ہدایت ہے، اور رحمت ہے مؤمنین کے لئے ﴿٥٧﴾ آپ فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ کے فضل اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے خوش ہوجاؤ، سو وہ اس پر خوش ہوں، یہ اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں ﴿٥٨﴾

معارف ومنازل

قرآن کریم ہدایت، رحمت، شفاء اور موعظہ ہے:

مسلسل منکرین سے خطاب ہوتا رہا، اور جس حقیقی سرمایہ نور وہدایت کے وہ منکر رہے اور اسی انکار نے انہیں ابدی جہنمی بنا دیا، تو اسی نور وہدایت کو مؤمنین کے لئے ذریعہ نجات بنا کر انہیں پیش فرما رہے ہیں، تو ارشاد ہوا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ﴾ اے دنیا میں قیامت تک آنے والے لوگو!

﴿قَدۡ جَآءَتۡكُم مَّوۡعِظَةٞ مِّن رَّبِّكُمۡ﴾ یقیناً تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے ایک عظیم الشان نصیحت آ گئی ہے، یعنی سرورِ عالم ﷺ کی زبانی قرآن کریم تم کو پہنچ گیا، یہ قرآن حکیم پیامِ بیداری ہے، اور ایک عظیم یادداشت ہے، جو اچھی باتوں کی دعوت دے رہا ہے، اور بری باتوں سے منع کر رہا ہے، کیونکہ قرآن ہزاروں اوامر اور نواہی کا جامع ہے، اور یہ اوامر ونواہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، اور اللہ تعالیٰ حکیم ہے، جس چیز کا امر فرما رہے ہیں وہ یقیناً اچھا اور فائدہ مند ہے، اور جس چیز سے منع فرما رہے ہیں یقیناً وہ مُضر اور نقصان دہ ہوگا۔

﴿وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ اور دلوں کی بیماریوں کے لئے شفاء بخش و اکسیر ہے، امراض قلبی یعنی غلط عقائد دنیا کی رغبت اور اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری چیزوں سے دلوں کا لگاؤ و تعلق اور وابستگی۔

ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ ایک آدمی نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے سینہ کا دکھ ہے، فرمایا: قرآن پڑھا کرو، اللہ تعالیٰ نے قرآن کے متعلق فرمایا ہے: ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾۔ اس حدیث کی شاہد واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کی روایت بھی ہے، جس کو بیہقی نے شعب الایمان میں بیان کیا۔

﴿وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ﴾ اور راہنما ہے صحیح عقائد و افکار کا، جنت و نجات کا راستہ بتانے والا قرب الٰہی کے مدارج پر پہنچانے والا اور سراسر رحمت ہے۔ سبحان اللہ! کتاب لانے والے رحمة للعلمين صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خود کتاب رحمة للمؤمنين اور هدى للمتقين۔ یعنی وہ لوگ جو کہ قرآن مجید سے فائدہ اٹھانے والے ہیں، بازار تو کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے مگر فائدہ وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو خرید کر لاتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن قرآن پڑھنے والے سے کہا جائے گا: پڑھتا جا، اور اوپر چڑھتا جا، اور تو جس طرح دنیا میں ترتیل کرتا تھا اسی طرح ترتیل کر (عجلت نہ کر) تیرا مقام وہ جگہ ہے جہاں تو آخری آیت کی تلاوت کرے گا۔ [رواه أحمد والترمذي و النسائي وأبو داؤد]

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اس آیت کریمہ میں قرآن کریم کی چار مخصوص صفات کا ذکر فرما کر کلام حکیم کی شان و عظمت کو واضح فرمایا:

پہلی صفت ﴿مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ موعظہ، وعظ و نصیحت اس خالص پیغام کو کہتے ہیں جس سے انسان ابدی، روحانی ہدایت و رہنمائی حاصل کرے۔ قرآن مجید اس معنی میں تمام دنیا کی کتابوں سے ممتاز ہے، اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی اور نصیحتوں، سعادتوں، شرافتوں، کرامتوں اور برکتوں پر مشتمل کتاب ہے، جس کی پورے عالم میں کوئی نظیر و مثال نہیں ہے۔

دوسری صفت ﴿وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ باطنی تمام بیماریوں کا علاج ہے، ظاہری بیماریوں کا زیادہ سے زیادہ آخری مرحلہ موت ہے، اور موت برحق ہے، کوئی بری چیز تو نہیں، مگر باطنی امراض کا نتیجہ نہایت خطرناک ہے، اور

وہ جہنم ہے، اور قرآن حکیم انہی امراض کا علاج ہے جو کوئی اس پر عمل کرے گا وہ ابدی شقاوتوں، عذابوں، اور ذلتوں سے محفوظ رہے گا۔

قرآن مجید کی تیسری صفت ﴿وَهُدًى﴾ یہ ہدایت والی کتاب ہے، یہ کتاب اعمالِ سیئہ، خصائلِ رذیلہ اور برے عقائد وگندے اعمال کے دلدل سے نکال کر روشنی کا وہ مینار دکھائے گی، اور اعمالِ صالحہ پر آمادہ کرے گی کہ اس کی مثال نہ ہو، بڑے کافر، بڑے، سرکش، مانے ہوئے بدمعاش، شیطان صفت غنڈوں پر جب اس کتاب کی تلاوت ہوچکی ہے تو وہ پانی پانی ہو کر غوث واقطاب اور اوتاد کے زمرے میں شامل ہوچکے ہیں۔

جب فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا نے اس کی تلاوت کی تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسے جری و بہادر کفر پر ناز کرنے والے کا بھی دل پارہ پارہ ہوا، اور اسلام قبول کیا۔

نمیدانی کہ سوز قرأت تو ☆ دگرگون کرد و تقدیر عمر را

اب اگر کسی نام نہاد مسلمان پر اور اس کے مردہ وخفتہ دل پر قرآن کا اثر نہیں ہوتا تو یہ کمی قرآن کی نہیں، بلکہ اس بے ضمیر مسلمان کی ہے جس کے قلب ودماغ پر شیطان کا قبضہ اور تسلط ہے، اندھوں کو کبھی یہ بڑا سورج نظر نہیں آیا۔

سلمان زفارس ست و بلال از حبش صہیب از روم ☆ زخاک مکہ ابوجہل کا این چہ بوالعجبی ست

چوتھی صفت ﴿وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یہ قرآن مؤمنین کے لئے رحمت ہے وہ عذابِ الٰہی سے بچ گئے، تمام معاصی سے بچ گئے، ماں بھی معلوم اور باپ بھی معلوم بہن بھی معلوم اور معزز۔ آپ ذرا ترقی یافتہ یورپ کی سیر و سیاحت کریں وہاں کا معاشرہ دیکھ آئیں تب آپ کو قرآن کی قدرومنزلت اور اس کی لانے والی ہستی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام معلوم ہوگا۔

نفس نفس پہ برکتیں قدم قدم پہ رحمتیں ☆ جہاں جہاں گزر ہوا وہاں وہاں سحر ہوئی

جہاں گزر نہیں ہوا وہاں ہے رات، آج تک، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اَلْفَ اَلْفَ مَرَّہٖ بِعَدَدِ کُلِّ ذَرَّۃٍ۔

﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ چاہیے کہ وہ خوش ہوجائیں۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اس کا فضل اور اس کی رحمت کو طلب کیا کرو، اور یوں کہو: "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ وَرَحْمَتِکَ"۔

﴿هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ یہ قرآن بہت بہتر ہے ان چیزوں سے جنہیں زندگی بھر لوگ اکھٹے کرتے رہتے

ہیں، اگر کسی کے پاس صرف قرآن مجید ہو اور کوئی مال نہ ہو تو وہ غنی شمار ہوگا، فرشتے صبح و شام اس سے مصافحہ کریں گے، جب موت آئے گی تو یہ کلامِ ربانی ساتھ ہی ہوگا، یہ بہت بڑا اعزاز اور سعادت ہے، اگر کسی کے پاس پہاڑوں جتنا مال ہو، اور وہ قرآن سے محروم ہو وہ غنی نہیں فقیر ہے، موت کے ساتھ ہاتھ خالی روانہ ہوگا، اور بہت پریشانی اٹھائے گا۔

تو فرمایا کہ قرآن مجید کے ساتھ خوشیاں مناؤ، اور اپنے آپ کو سعادت مندوں میں شمار کرو، دنیا داروں کی طرف نظر اٹھا کر بھی مت دیکھو۔ سورۂ حجر کے آخری رکوع کی تلاوت کرو، اور معنی پڑھو، تب پتہ چلے گا کہ حاملِ قرآن کا مقام کتنا بلند ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۝٥٩ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝٦٠

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ تم بتاؤ جو رزق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نازل فرمایا تم نے اس میں سے خود ہی بعض کو حلال اور بعض کو حرام تجویز کیا، آپ فرمادیجئے: کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کی اجازت دی ہے یا تم اللہ تعالیٰ پر افتراء کرتے ہو؟ ۝٥٩ اور قیامت کے دن کے بارے میں ان لوگوں کا کیا گمان ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں؟ بلا شبہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل فرمانے والا ہے، لیکن ان میں سے بہت سے لوگ شکر ادا نہیں کرتے ۝٦٠

معارف و منازل

جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو منبعِ رشد و ہدایت بنایا، اور تمام کائنات کی نجات کا اسی کو ذریعہ و سبب بنایا تو پھر لوگوں کا فرض ہے کہ وہ حلت و حرمت، جواز و عدم جواز، بلکہ ثواب و عقاب تک سارے مسائل قرآن کریم سے حاصل کریں، بلکہ پوری شریعت پر چلنے کا ڈھنگ قرآن حکیم سے حاصل کریں، اللہ تعالیٰ کائنات کا رب ہے، سارے انسانوں کا خالق و مالک ہے، اور سب کا رازق و روزی رساں ہے، اور ان کی ہدایت و روحانی غذا و خوراک کے لئے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا ہے، اور کتابیں نازل فرمائیں۔

یہ آسمانی کتابیں اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات پوری شریعت کی ترجمان ہیں، حلال و حرام سے لے کر

جواز ومباح تک کے احکام شریعت نے وضاحت کے ساتھ بیان فرما کر سارے انسانوں پر اتمامِ حجت قائم کردی ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ اشیاء تک کے احکام بیان فرمائے، یہاں تک کہ کوئی چیز کوئی مسئلہ پردۂ خفا میں نہیں رہا، پھر تمہیں مکلّف بنا کر ان احکام پر چلنے اور عمل کرنے کا حکم دیدیا، اب تمہارا کام ہے عمل کرنا، نہ کہ احکام بنانا، اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے احکام میں ترمیم کرنا۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانا یہ تمہارے دائرۂ اختیار میں نہیں، اب قرآن حکیم میں اور احادیثِ مبارکہ میں حلال وحرام کی ساری تفصیلات موجود ہیں۔

مشرکین نے جو اپنی طرف سے حلال وحرام تجویز کر رکھا ہے اس آیت نے ان کی تردید فرمائی، اور امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے لئے بھی پیش بندی فرمادی کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات سے ہٹ کر اپنے طور پر حلال وحرام تجویز کرنے سے پرہیز کریں، اور واضح طور پر بتادیا کہ تحلیل وتحریم قرار دینے کا اختیار صرف مالکِ حقیقی کو حاصل ہے، جو چیزوں کا پیدا کنندہ ہے، بندوں کو تحلیل وتحریم کا کوئی اختیار نہیں، اور ان کی مداخلت حرام اور جرمِ عظیم ہے، اور بندگی کے خلاف ہے، اور شریعت سے بغاوت ہے۔

الرِّزق:

رزق روزی کے معنی میں ہے، اس کا اطلاق صرف خوراک پر نہیں ہوتا، بلکہ عربی زبان میں رزق کا لفظ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جیسے رَزَقَهُ اللّٰهُ وَلَدًا، یا رُزِقَ عِلْمًا وَعَمَلًا، یا مَنْ رُزِقَ الهجی حُرِمَ الْغِنی، جس کو عقل ودانشمندی مل جاتی ہے وہ مال سے محروم رکھا جاتا ہے، کیونکہ اکثر بے عقل مالدار ہوتے ہیں۔ بخاری ومسلم کی حدیث ہے کہ حاملہ عورت کے پیٹ میں جب بچہ ہوتا ہے تو فرشتہ وہاں چار چیزوں کو رقم کرتا ہے: ذکورت وانوثت، سعادت وشقاوت، عمر واجل اور رزق۔

تو ظاہر ہے کہ رزق سے صرف کھانا اور خوراک مراد نہیں، بلکہ جو کچھ اس بچے کو ملنے والا ہے وہ سب کچھ مراد ہے، مثلاً علم، عمل، اقتدار، اولاد، عزت وشرف وغیرہ۔ قرآن حکیم میں فرمایا: ﴿وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ﴾ [الذاریات: ۲۲] (اور آسمان ہی میں تمہارا رزق بھی ہے، اور وہ چیز بھی جس کا تم سے وعدہ کیا جارہا ہے)۔ اسی طرح فرمایا: ﴿وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ﴾ [الواقعة: ۸۲] (اور تم نے اسی کو اپنا روزگار بنالیا ہے کہ (اس کو) جھٹلاتے رہو)۔ اہلِ جنت کے متعلق ارشاد ہے: ﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا﴾ [مریم: ۶۲] (اور وہاں ان کا رزق انہیں صبح وشام ملا کرے گا)۔

مطلب یہ ہے کہ رزق صرف خوراک اور ماکولات و مشروبات کو نہیں کہا جاتا، بلکہ اس کے معنی بہت وسیع ہیں، اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق میں غیر شرعی تصرف کرنا اور اللہ تعالیٰ، اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف کام کرنا، احکامِ الٰہی کو سراسر نظر انداز کرنا قطعاً ناجائز اور حرام ہے، خواہ وہ رزق کھانے پینے سے متعلق ہو، یا مکان ولباس ہو، یا علم سے متعلق ہو، یا ملازمت واقتدا سے متعلق ہو۔ اس میں حرام چیزوں کو حلال سمجھنا، اور حلال چیزوں کو حرام سمجھنا، تو آیت کریمہ کی وعید سب کو شامل ہے۔ مشرکین نے جو حلّت وحرمت وضع کی، مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام وغیرہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام میں گزر چکی، وہاں دیکھ لیں۔

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا﴾ آپ مکہ کے مشرکین سے کہہ دیجئے کہ یہ بتلاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے فائدے کے لئے جو رزق اتارا ہے تو تم نے از خود اس کا کچھ حصہ حلال اور کچھ حصہ حرام قرار دے دیا۔ اَنْزَلَ کے معنی ہیں: اوپر سے اتار دیا، اس لئے کہ رزق وروزی ہو یا اور سب کچھ صدر دفتر منظوری کا اوپر ہے، اس لئے اَنْزَلَ فرمایا۔ یا اس لئے کہ اکثر چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں، جن کے لئے پانی بارش کا نزول اوپر سے ہوتا ہے، دونوں معنی درست ہیں۔

﴿قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ﴾ آپ ان سے سوال کیجئے کہ کیا اس حلت وحرمت کی اجازت تمہیں اللہ تعالیٰ نے دی ہے، یا تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہو؟۔ افتراء کے معنی ہیں: جھوٹ، تہمت۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی ہے، یہ تمہاری سرکشی اور بہتان تراشی کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا تم عذاب کے لئے تیار ہو جاؤ، فرمایا:

﴿وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر دروغ بندی کرتے ہیں ان کا کیا گمان ہے کہ وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی گرفت سے بچ جائیں گے؟ ہرگز نہیں بچیں گے، مبتلاء عذاب ہو کر ہمیشہ کے لئے ذلیل ہو جائیں گے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ﴾ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا اور بڑا مہربان ہے، اس نے پیدا کیا، اور عقل وشعور سے نوازا، انبیاء کرام علیہم السلام پر کتابیں نازل کیں، توبہ کا دروازہ کھلا رکھا، مگر:

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾ اکثر لوگ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے، پس اگر دنیا میں ان کی ڈھیل ہوتی ہے تو آخرت میں ڈھیل نہیں ہوگی۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾

ترجمہ: اور آپ جس کسی حال میں بھی ہوں، اور قرآن مجید کا جو بھی کوئی حصہ تلاوت کر رہے ہوں، اور تم لوگ جو بھی کوئی عمل کرتے ہو ہم ضرور اس سے باخبر ہوتے ہیں، جبکہ تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو، اور زمین وآسمان میں ذرہ برابر کوئی چیز ایسی نہیں جو تیرے ربّ کے علم میں نہ ہو، اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس سے چھوٹی ہو یا بڑی ہو جو کتابِ مبین میں نہ ہو ﴿٦١﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ کا ذکر کرنے سے مقصود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تسکین دینا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مخالفین کو متنبہ کرنا ہے۔ ایک طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ارشاد ہو رہا ہے کہ پیغامِ حق کی تبلیغ اور خلق اللہ کی اصلاح میں جس تندہی و جانفشانی، اور جس صبر وتحمل سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کام کر رہے ہیں وہ ہماری نظر میں ہے، ایسا نہیں ہے کہ اس پرخطر کام پر مامور کر کے ہم نے تم کو تمہارے حال پر چھوڑ دیا ہو، جو کچھ تم کر رہے ہو وہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں، اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس سے بھی بے خبر اور لاتعلق نہیں ہیں، کیونکہ تیرے ربّ کا علم کائنات کے ہر ہر ذرہ پر محیط ہے، اور وہ محض خبردار نہیں ہے، بلکہ کائنات کے چھوٹے یا بڑے ہر قسم کے ذرات اس کے مشاہدے میں ہیں۔

دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مخالفین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ ایک داعیٔ حق اور خیر خواہ خلقِ خدا کی اصلاحی اور دینی کوششوں میں روڑے اٹکا کر تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ کوئی تمہاری ان حرکتوں اور چیرہ دستیوں کو دیکھنے والا نہیں ہے، اور کبھی تمہارے ان کرتوتوں کی باز پرس نہ ہوگی، خبردار رہو، وہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں کتاب مبین میں ثبت ہو رہا ہے۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۝۶۲ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ ۝۶۳ لَهُمُ الۡبُشۡرٰى فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِى الۡاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۝۶۴

ترجمہ: خبردار! بلاشبہ جو اولیاء اللہ ہیں ان پر کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے ۝۶۲ جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے رہے ۝۶۳ ان کے لئے بشارت ہے دنیاوی زندگی میں، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے کلمات میں کوئی تبدیلی نہیں، یہ بڑی کامیابی ہے ۝۶۴

معارف ومنازل

ولایت کیا ہے، اور ولی کسے کہتے ہیں؟

ولاءتوالی کا لغوی معنی ہے: دو یا زیادہ چیزوں کا براہ راست بلا واسطہ تعلق اور اتصال۔

مجازاً اس سے مراد ہوتا ہے: قرب ونزدیکی۔ یہ قرب کبھی نسبی ہوتا ہے، کبھی دینی، کبھی جنسی، کبھی احسانی، کبھی مکانی، کبھی اعتقادی۔ بہر حال! قرب کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے درجات اور مراتب بھی بہت مختلف ہوتے ہیں، کمی بیشی کے اعتبار سے، حتّٰی کہ اگر ایک باپ کے دس بیٹے ہوں تو مختلف اسباب کے تحت ان کے مراتب بھی ایک جیسے اور برابر نہیں ہوتے ہیں۔

چونکہ اللہ تعالیٰ شانہ کا قرب ہر بندہ کو حاصل ہے، کوئی اس قرب سے محروم نہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ﴾ [ق:۱۶] (یعنی رگِ جان سے بھی زیادہ ہم بندے سے قریب ہیں)۔ اس قرب کی اگر چہ کیفیت معلوم نہیں، مگر اس قرب کا تعلق سب کے ساتھ ہے، اور اگر صحیح دیکھا جائے تو تمام الطاف ونوازشات کا مبدأ اصلی یہی قرب ہے، جس کے اسباب ومدارج بہت زیادہ ہیں، ہر مخلوق کے ساتھ اس کا الگ تعلق ہے۔ اس کے بعض اسباب غیر اختیاری اور فطری ہیں، اور بعض اختیاری اور کسبی ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حدیث قدسی ہے، ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا بندہ نوافل کے ذریعہ سے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے پیار کرنے لگتا ہوں، جب میں اس کو پیار کرتا ہوں تو پھر میں اس کے "کان" بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اور میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، یعنی اس کا ہر عمل میرا عمل شمار ہوتا ہے، وہ ہر قسم کی سچائی و

محبت اورقرب کا مظہر رہے گا، مجال نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی ادنیٰ عمل انجام دیدے"۔ [بخاري]

اس مخصوص قرب کا ابتدائی درجہ ایمان ہے، جیسے فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ اور سورۂ بقرہ میں فرمایا:﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ﴾ [البقرة: ۲۵۷] (اللہ ولی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان اندھیروں سے نکالتا ہے)۔ سورۂ محمد میں ارشاد فرمایا: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ﴾ [محمد ﷺ: ۱۱] (اور یہ اس وجہ سے کہ اللہ مولیٰ ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، اور یہ کہ کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں ہے)۔

اور اس مخصوص قرب کا آخری درجہ، یعنی انتہائی درجہ انبیاء کرام علیہم السلام کا خصوصی حصہ ہے، جن کے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درجات ترقی پذیر ہیں، جن کی کوئی انتہاء نہیں، صوفیاء کرام کی اصطلاح میں کم از کم وہ درجہ جس پر لفظِ ولی کا اطلاق ہوسکتا ہے اس شخص کا ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہر وقت ڈوبا رہتا ہے، وہ صبح وشام اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے میں مشغول رہتا ہے، اور دنیا کی ہر چیز سے بیگانہ اور غافل رہتا ہے۔ محبتِ الٰہی اور ذکرِ الٰہی میں سرشار رہتا ہے، کسی غیر کی محبت کا اس کے پاس نہ وجود ہوتا ہے اور نہ خیال۔ یعنی باپ، ماں، بیوی، اولاد، مال، بھائی بہن وغیرہ۔

یہ نہیں کہ یہ سب مرے ہوئے ہیں، بلکہ سب موجود اور زندہ ہیں، ان کی بھی محبت ہے، دھیان ہے، مگر محبتِ الٰہی کے مقابلہ میں مغلوب ہے، اور ان تمام سے اگر محبت ہے تو وہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک درجے تک ان سے محبت رکھنے کی اجازت اور حکم دیا ہوا ہے، اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ۔

بہر حال! فرقِ مراتب کا لحاظ ہر چیز میں رکھا گیا ہے، جیسے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر غیر اللہ میں یعنی لوگوں کے ساتھ اگر محبت ہوتی ہے تو محض اللہ تعالیٰ کے لئے، اگر نفرت ہوتی ہے تو محض اللہ تعالیٰ کے لئے، اگر کسی کو کچھ دینا ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے، اور اگر کسی کو کچھ نہ دینا ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے۔ الغرض ہر عمل، ہر گفتار، ہر کردار میں رضاءِ الٰہی زیرِ نظر ہو، اور قلب و دماغ کا تصور ہو، اور اس گروہ کی آپس میں محبت لوجہ اللہ ہوتی ہے، اور اتباعِ شریعت نیز اتباعِ سنت حرزِ جان ہوتا ہے، ایک ادنیٰ سنت کے چھوٹ جانے اور نظر انداز ہونے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورا خاندان تباہ ہوگیا، یا آسمان گر گیا۔

حضرات صوفیاء کی اصطلاح میں اس کو فناءِ قلب کہتے ہیں، ولی کا ظاہر و باطن تقویٰ سے آراستہ ہوتا ہے، جو

افعال واعمال اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں ان سے وہ دور رہتا ہے، شرک خفی وجلی سے دوری وہ تو مخصوص بنیاد ہے، یہاں تک کہ لایعنی کام یعنی بے مقصد جائز کام کو خیرآباد ہی کر دیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے: ''مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ''۔ [متفق علیہ]

لایعنی اور بے مقصد کاموں کے چھوڑنے سے اسلام میں خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ ولی کی صفات میں سے ایک یہ ہے کہ اس میں کبر وغرور اور انانیت کا نام ونشان نہیں ہوتا، وہ اپنے آپ کو تمام انسانوں حتیٰ کافروں اور جانوروں سے بھی کمتر اور ناکارہ سمجھتا ہے۔ بانی دیوبند حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے: ؎

زمن دارد سگ نصرانیان عار ☆ کہ اواست بیگناہ و من گنہگار

مجھ سے تو عیسائیوں کا کتا بھی شرم کھاتا ہے، کیونکہ وہ بیگناہ ہے اور میں گنہگار ہوں۔ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حقیقت میں انسان سے جب غرورِ نفس ختم ہو جاتا ہے تو ولایت آجاتی ہے، اگر رائی برابر غرور ہوگا تو وہ بھی ولایت کے آنے میں پہاڑ کے برابر رکاوٹ ہے۔ ولایت کسی ڈگری اور پیشہ کا نام نہیں کہ چند دن کی محنت و مشقت اور چند اوراد او روظائف کی مشق سے پیدا ہو، یا کسی قبر کے مجاور بننے سے حاصل ہو، یا کسی گدی نشینی سے پیدا ہو، یا گدی نشینوں کے مرنے کے بعد چند لوگ مل کر کسی قریبی رشتہ دار کی دستار بندی کر کے اسے اس منصب پر براجمان کرتے ہوں، یا جمہوری طریقے سے کسی ولایت کے لئے انتخاب ہو، یہ سارے طریقے انگریزوں کی پیداوار اور ایجادات ہیں۔

یہ قوم ایجادات کے فن میں اتنی ماہر ہے کہ پورے عالم کو مشینریوں کی مارکیٹ بنا دیا ہے، اور مذہبی سطح پر اسلام کو کمزور اور متنازع بنانے کے معاملے میں اتنی محنت اور کوشش کی اور اتنا سرمایہ صرف کیا جس کا اندازہ نہیں۔

علامہ امیر شکیب ارسلان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عیسائیوں نے اسلام کے خلاف اور اسلام کے اصلی خدوخال مٹانے کے سلسلہ میں پانچ لاکھ سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ یہ عیّار و مکّار قوم اسلام کے خلاف وہ وہ کام کر چکی، یا آئندہ کر دینے کا ارادہ رکھتی ہے کہ چنگیز خان کے مظالم بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں، خاص کر برصغیر میں انہوں نے اسلام کے خلاف جو منصوبے تیار کئے ان میں سے ایک یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ جھوٹے مصنوعی نبی، مصنوعی اولیاء، مصنوعی علماء، مفکر، صاحب قلم، صوفیا، گدی نشین، پیر فقیر، مزارات وغیرہ کا سلسلہ شروع ہو کہ خوب کاروبار اور تجارت القبور والاعراس کا دور دورہ ہو، اور مسلمان اپنے اصلی سرمایہ توحید سے بیگانہ ہو کر شرک کی نجاست

میں لت پت ہوں (العیاذ باللہ)۔

چنانچہ یہ سب کچھ ہوا، اور بڑے پیمانہ پر ہوا، جس کا نتیجہ ہر ذی شعور کے سامنے ہے، اور پوری امت اِلَّا ماشاء اللہ شرک جلی کا شکار ہے، مزارات پر وہ وہ مخرب اخلاق مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر یہود و ہنود بھی شرم محسوس کرتے ہیں۔

ع یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائے یہود

(اقبالؒ)

آج یہ کاروباری تجارت اپنے عروج پر ہے، بعض گدی نشین انگریزی بال ٹائی کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہیں، نہ انہیں احساس ہے اور نہ معتقدین کو، ایک بے دینی کا عالم ہے جس میں ساری خلقت پھنسی ہوئی ہے، اس کے ساتھ انگریزوں نے پگڑی عمامہ علماء کے سر سے اتار کر انہیں اونٹ کے کوہان کے برابر قرہ قلی پہنائی، جس کی بہت بڑی قیمت ہے، اور ان کی پگڑی اتار کر نکمّے لوگوں کے سروں پر رکھی، تاکہ سنتِ نبوی کی خوب بے حرمتی اور تذلیل ہو، یعنی ہوٹلوں کے بیروں کے سروں اور ڈاکیہ یعنی ڈاکخانہ کے نکمّے درجے کے ڈاک تقسیم کرنے والوں کے سروں پر پگڑی رکھ دی، اور قلیوں کے اور باجے بجانے والوں کے سروں پہ۔ ۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا ☆ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بہر حال! تقویٰ کا وہ مرحلہ جس میں آدمی تمام گناہوں اور رذائل و امراضِ باطنہ سے محفوظ ہو، اور محاسن و اخلاقِ فاضلہ اور طاعات و اتباعِ سنت کے ساتھ موصوف ہو، اور غیر اللہ سے سراسر دور اور ناآشنا و لاتعلق ہو، صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اس کو فناء فی النفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ صوفیا حضرات کا قول ہے کہ اس درجہ پر جب ولی پہنچ جاتا ہے تو اس کا شیطان اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے، اور فرمانبردار بن جاتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ [الحجر: ۴۰] (مگر تیرے بندے ان میں سے چنے ہوئے)۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ وہ جو ایمان لائے، یہ ابتدائی اور پہلا درجہ ہے، مگر یہ ایمان عام مؤمنین کے ایمان سے کئی گنا کامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ صورت ایمانی نہیں بلکہ حقیقت ایمان ہے، جس کا محل قلب ہے، کمالِ ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے قلب میں اطمینان پیدا ہو جائے، لمحہ بھر یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہو، کسی اور تو کیا اپنے نفس کی طرف بھی توجہ نہ ہو، بھوک و پیاس سے بھی فارغ ہو۔ ۔

ہر کہ در اقلیم لا، آباد شد ☆ فارغ از بند زن و اولاد شد
میکند از ماسوا قطع نظر ☆ مے نہد ساطور بر حلق پسر

﴿وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾ شرک و معاصی اور صغیرہ و کبیرہ ہر قسم کے گناہوں سے پرہیز رکھتے ہیں۔ ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو نہ انبیاء ہیں نہ شہداء، لیکن قیامت کے دن ان کے مرتبۂ قرب کو دیکھ کر انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: جو بندگان خدا سے محض اللہ تعالیٰ کے لئے محبت رکھتے ہیں، آپس میں باہم نہ ان کی رشتہ داریاں ہیں، نہ مالی لین دین، نہ قرابت، نہ مالی لالچ کی وجہ سے محبت ہو، خدا کی قسم ان کے چہرے قیامت کے دن مجسم نور بالائے نور ہوں گے، ان کو کسی عذاب کا خوف نہ ہوگا، جبکہ اور لوگوں کو عذاب کا خوف ہوگا، جب اور لوگ غم میں مبتلا ہوں گے وہ غمگین نہیں ہوں گے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ [معالم، بيهقي، شعب الايمان، أبو داؤد]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیت: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ﴾ کا مطلب دریافت کیا گیا، تو فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واسطے آپس میں محبت رکھتے ہیں۔ ابن مردویہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ [مظهري]

حصولِ ولایت کے اسباب و ذرائع:

مرتبۂ ولایت کا حصول سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرتَو اندازی سے ہوتا ہے، خواہ عکسِ رسالت براہ راست پڑے یا کسی ایک واسطہ سے یا چند واسطوں سے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نائبوں سے محبت اور ان کی ہمنشینی اور اطاعت حصول ولایت کے لئے ضروری ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ انور، جسمِ اطہر، نفسِ اقدس کا رنگ ولی کے قلب، قالب اور جسم پر ان ہی دونوں اوصاف کی وجہ سے چڑھ جاتا ہے، اور یہی ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ﴾ ہے جس کے متعلق فرمایا: ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ [البقرة:١٣٨] (اللہ نے رنگ چڑھا دیا ہے، اور کون ہے جو اللہ سے بہتر رنگ چڑھائے؟)۔

طریقِ مسنون کے مطابق ذکر اللہ کی کثرت (صلوٰۃ و سلام کی کثرت بھی) عکس پذیری کے لئے مددگار ہوتی

ہے، اس سے دل کا میل دور ہوجاتا ہے اور آئینۂ قلب کی صفائی ہوکر عکس پذیری کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ سرور عالم ﷺ نے فرمایا: ہر چیز کی منجھائی ہوتی ہے، اور دل کو مانجھنے والا اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ [رواه البيهقي عن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ]

امام مالک، امام احمد اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو دو آدمی میرے لئے باہم محبت کرتے ہیں، میرے لئے مل کر بیٹھتے ہیں، میرے لئے خرچ کرتے ہیں ان سے میری محبت واجب ہوجاتی ہے۔ امام احمد، طبرانی اور حاکم رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے آیا ہے کہ ایک شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ! آپ اس شخص کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو کسی قوم سے محبت رکھتا ہے مگر اس قوم کے عمل تک اس کی رسائی نہیں ہوئی؟ فرمایا: آدمی کا شمار انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا جن سے اس کو محبت ہوتی ہے۔ رسائی نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کے عمل اس قوم کے عمل کی طرح اونچا نہ ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں ایسی حدیث مروی ہے۔ [مظهري]

اولیاء اللہ کی علامات کیا ہیں؟

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اولیاء اللہ کون ہوتے ہیں؟ فرمایا: جن کے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے۔ [معالم]

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میرے بندوں میں میرے اولیاء وہ ہیں جن کی یاد میرے ذکر سے اور میری یاد ان کا ذکر کرنے سے ہوتی ہے۔ [معالم]

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا: کیا میں تم کو نہ بتادوں کہ تم میں سب سے اچھے لوگ کون ہیں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ضرور بتایئے، فرمایا: جن کو دیکھنے سے اللہ تعالیٰ جل شانہ کی یاد آتی ہو۔ [ابن ماجة]

عام لوگ کشف و کرامت کو ولایت کی خصوصی نشانی سمجھتے ہیں، مگر یہ غلط ہے، بہت سے اولیاء کشف و کرامت سے خالی ہوتے ہیں، اور کبھی بطور استدراج دوسرے لوگوں میں جو ولی نہیں ہوتے بھی خرق عادات اور

انکشافات غیبی پائے جاتے ہیں، اس لئے کشف وکرامت معیار ولایت نہیں ہے۔ [مظهري]

حکایت:

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور گیارہ سال رہا، یہ شخص عالم تھا، گیارہ سال پورے ہونے پر رخصت ہونے لگے، تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر کوئی مقصد ہے تو بتاؤ، کہنے لگے: تسکینِ خاطر کے لئے کوئی کرامت دکھا دیجئے، فرمایا: گیارہ سال میں خلافِ سنت کوئی عمل دیکھا؟ کہنے لگے: نہیں، فرمایا: یہی تو سب سے بڑی کرامت ہے، اس پر تم بھی عامل رہو۔

دراصل نبی کا معجزہ ہو یا ولی کی کرامت یہ کسبی اور ارادی نہیں کہ جب وہ چاہے تو اس کا اظہار کرے، یہ اللہ تعالیٰ شانہ کا اختیار اور اسی کا فعل ہے۔ اس پر تفصیلی کلام سورۂ فاتحہ کے تفسیری فوائد میں دیکھیں۔

﴿لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾ ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے، اور آخرت میں بھی، اس دنیا میں جب ان کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے انہیں بشارت سناتے ہیں، اور ان پر استقامت کا نزول ہوتا ہے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ فرماتے ہیں: اَلْاِسْتِقَامَةُ فَوْقَ الْكَرَامَةِ۔ کہ استقامت کرامت سے بھی اعلیٰ ہے۔

﴿لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے کلمات میں، اور اسی طرح اس نے اپنے نیک بندوں کے ساتھ جو وعدے کئے ہیں ان میں کسی بھی تبدیلی کا امکان نہیں، وہ سب پورے ہو کر رہیں گے۔

﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے، اور یہی اولیاء اللہ کا مقام ہے۔

خوشخبری:

ولایتِ خاصہ اور ولایتِ عامہ دونوں اونچے اور نہایت بلند و بالا ہیں، البتہ ولایتِ عامہ سارے مؤمنین کے لئے ہے، اور یہ اتنا اونچا مقام ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں، اس کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ ایک نہایت بے عمل ادنیٰ مسلمان قیامت کے دن تمام کفار و مشرکین پر بھاری ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ برکت و شرف اسی ولایتِ عامہ کا ہے، جسے قرآن حکیم نے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ میں بیان فرمایا۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

ترجمہ: اور آپ کو ان کی بات رنجیدہ نہ کرے، بلاشبہ ساری عزّت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، وہ سننے والا ہے، اور جاننے والا ہے﴿۶۵﴾ خبردار! اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے شرکاء کو پکار رہے ہیں وہ کس چیز کا اتباع کر رہے ہیں، یہ لوگ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں، اور صرف اٹکل پچو گمان کرتے ہیں﴿۶۶﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے تمہارے لئے رات کو پیدا فرمایا، تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو، اور دن کو دیکھنے کا ذریعہ بنایا، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں﴿۶۷﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ مشرکین اور معاندین کے ناجائز رویہ سے رنجیدہ نہ ہوں، ساری عزّت، سارا غلبہ تمہارے ربّ کے ہاتھ میں ہے، اس نے لکھا ہے: ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ﴾ [مجادلة: ۲۱] (اللہ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور بضرور میں اور میرے رسول غالب رہیں گے)۔

﴿وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ﴾ ان نافرمانوں کی بات آپ کو رنجیدہ و پریشان نہ کرے۔

﴿اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا﴾ ساری کی ساری عزّت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا مشن غالب بنائے گا، اور آپ کو عزّت دے گا، اور آپ کے دشمنوں کو خوار و ذلیل بنا کر مغلوب فرمائے گا، لہٰذا آپ غم نہ کریں۔

﴿هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ اللہ تعالیٰ تمام باتوں کا سننے والا اور جاننے والا ہے، ہر چیز اس کی نگاہ میں اور قبضہ قدرت میں ہے، وہ اپنی حکمت کے مطابق فیصلہ فرمائے گا۔

﴿اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اس کے قبضہ قدرت میں بھی ہے، جس طرح چاہے گا تصرف فرمائے گا۔

﴿وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ﴾ جولوگ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو شریک بناتے ہیں اور ان کو پکارتے ہیں اور انہیں حاجت روا اور مشکل کشاء اور سفارشی سمجھتے ہیں یہ سب بے بنیاد اور محض انکل پر کام چلاتے ہیں، توفرمایا:

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ﴾ یہ لوگ صرف گمان کے پیچھے چلتے ہیں، اور محض انکل پچو باتیں کرتے ہیں، ان کے پاس کوئی دلیل نہیں گمان ہی گمان ہے، عبادت اور عقائد دونوں ایسی چیزیں ہیں جن کے لئے جب تک ٹھوس ثبوت اور محکم دلیل نہ ہو یہ محض ظن وتخمینوں سے ثابت نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل کی نعمت سے نوازا، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی توحید پر گواہ ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے، پھر قرآن حکیم اپنے انوار و برکات کے ساتھ نازل ہوا، بہت سارے معجزات بھی ان کے سامنے آئے، مگر ان کی بدبختی ہے کہ سوائے شیطان کے کسی کا کہنا نہ مانا۔

﴿وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾ نہیں ہیں یہ لوگ مگر انکل دوڑانے والے، محض بے حقیقت باتیں کر کے دل خوش کرتے ہیں۔

﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا﴾ اللہ تعالیٰ ہی رحیم وکریم ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی، تاکہ تم اس میں آرام وسکون حاصل کرو، اور دن کو روشن بنایا تاکہ تم اس میں دیکھ سکو اور کام کر سکو۔ دراصل یہ انسانوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے عقلی دلیل بیان کی ہے کہ اگر تم رات اور دن کے تغیر وتبدل میں غور وفکر کرو تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور عظیم انقلابی قدرت اور کمال وتصرف آسانی سے سمجھ میں آجائے، رات اور دن خود بخود کی گردش اور تبدیلی کے ساتھ نہ چھوٹے بڑے ہوتے ہیں نہ آگے پیچھے ہوتے ہیں، بلکہ ربّ العزت کا ترتیب دیا ہوا نظام ہے، جس پر پوری کائنات گھوم رہی ہے۔

سورۂ فرقان میں ارشاد فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا﴾ [الفرقان:۶۲] (اللہ تعالیٰ کی وہی ذات ہے جو رات اور دن کو آگے پیچھے لاتی ہے، اس شخص کے لیے جو نصیحت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، یا شکر بجالانا چاہتا ہو) پس تم خوب غور وفکر کرو، سمجھو، پھر ان نعمتوں پر اپنے ربّ کا شکر ادا کرو، اور فرمانبردار بنو۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ﴾ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سنتے ہیں، اور سنی ان سنی نہیں کرتے ہیں، رات اور دن دونوں ایسی چیزیں ہیں جو نظروں کے سامنے ہیں، پوری دنیا ان

دونوں مظاہر سے خالی نہیں ہوتی ، اور عجیب پختہ نظام ہے کہ یہ دونوں کبھی جمع بھی نہیں ہوتے ، ایک کی موت میں دوسرے کی حیات ہے، اگر سارا جہاں مل کر انہیں مختصر وقت کے لئے آگے پیچھے کرنا چاہے تو ممکن نہیں ، چالیس سال سے زیرِ زمین ایک بہت بڑے حیران کن نظام کے ذریعہ یہودی اقوام اور یورپ کے چند ممالک جد وجہد میں مصروف ہیں کہ اس خدائی نظام میں تبدیلی لائیں، رات دن اور موسموں کو اپنے تصرف میں لائیں، پھر پورے عالم پر کنٹرول کر کے ساری انسانیت کو غلام بنا کر ان پر حکومت کریں۔

ع این خیال ست ومحال ست وجنون

اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ اور دیگر کافر اقوام کو ایک ایسے مربوط استدراج میں پھنسایا ہوا ہے کہ ان کی گرفت کے لئے انہیں آزمایا ہوا ہے، اور امتحان میں ڈالا ہوا ہے، دیکھو اس کا انجام کیا ہوگا؟

﴿وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللهُ﴾ لہٰذا یہ پختہ اور محکم نظام اپنے ربّ کے تکوینی نظام پر چلتا رہے گا، اور ان کا الٹ پھیر کرنے والا اور آگے پیچھے لانے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے، دن اور رات دونوں کا نظام بہت بڑا ہے، اور سورج کے ساتھ وابستہ ہے، اور اس کا حجم زمین سے تیرہ لاکھ مرتبہ بڑا ہے، اس پر یہ بیچارے کتے اور خنزیر کے گوشت پر گزارہ کرنے والے کیا کمند ڈالیں گے؟ اور کیا قبضہ جمائیں گے؟ ایک سو سال سے زائد عرصہ گزرا جنہوں نے مشین ایجاد کی تھی کہ کسی نہ کسی طرح موت پر قبضہ جمائیں، اسے ختم کردیں، اگر واقعی کوئی فرشتہ اس نظام پر مقرر ہے تو اسے پکڑلیں، اور آئندہ ساری دنیا کو موت سے نجات ہی دیں، بس ہمیشہ کے لئے عیش کریں، زندہ رہیں، پھر بڑھاپے اور بیماریوں سے تمام جہاں کو نجات دیں۔

پہلے یورپ ایڑی چوٹی کا زور لگا تا رہا، اب سب سے بڑا کافر اور منکر خدا چائنا کو بھی شریک کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نظام ایسا ہے کہ جب تک وہ چاہے گا اس کے مقرر کردہ اصولوں پر قائم رہے گا، اسے نہ کوئی روک سکے گا اور نہ ہی تبدیل کرسکے گا، یہ سارے شیاطین اور ابناءِ شیاطین اپنے پیشرو گمراہوں کے پیچھے مرتے رہیں گے، اور جہنم رسید ہوں گے، تیرے عظیم ربّ کا نظام اسی طرح چلتا رہے گا۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ

بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۸ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝۶۹

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝۷۰

ترجمہ: اوران لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے، وہ اس سے پاک ہے، وہ غنی ہے، اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، تمہارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیا تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کا تم علم نہیں رکھتے؟ ۶۸ آپ فرمادیجئے: بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوں گے ۶۹ دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے، پھر ہماری طرف کو لوٹنا ہے، پھر ہم انہیں ان کے کفر کی وجہ سے سخت عذاب چکھائیں گے ۷۰

معارف ومنازل

یہاں مشرکین کے اس قول کی تردید میں تین (۳) باتیں کہی گئی ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ بے عیب ہے، دوسری یہ کہ وہ غنی اور بے نیاز ہے، تیسری یہ کہ آسمان وزمین کی ساری موجودات اس کی ملکیت ہیں۔ یہ مختصر جوابات تھوڑی سی تشریح سے بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

ظاہری بات ہے کہ بیٹا یا تو صلبی ہوسکتا ہے یا متبنّیٰ، اگر یہ لوگ کسی کو خدا کا بیٹا صلبی معنوں میں قرار دیتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو اس حیوان پر قیاس کرتے ہیں جو شخصی حیثیت سے فانی ہوتا ہے، اور جس کے وجود کا تسلسل بغیر اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ اس کی کوئی جنس ہو، اور اس جنس سے کوئی اس کا جوڑا ہو، اور ان دونوں کے صنفی تعلق سے اس کی اولاد ہو، جس کے ذریعہ سے اس کا نوعی وجود اور اس کا کام باقی رہے۔ بہرحال!

اور اگر یہ لوگ اس معنی میں خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں کہ اس نے کسی کو متبنّیٰ بنایا ہے تو یہ دو حال سے خالی نہیں: یا تو انہوں نے خدا تعالیٰ کو اس انسان پر قیاس کیا ہے جو لاولد ہونے کی وجہ سے اپنے جنس کے کسی فرد کو اس لئے بیٹا بناتا ہے کہ وہ اس کا وارث ہو، اور اس نقصان سے جو اسے بے اولاد رہ جانے کی وجہ سے پہنچ رہا ہے (برائے نام ہی سہی) کچھ تو تلافی کردے، یا پھر ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی انسان کی طرح جذباتی خیالات رکھتا ہے، اور اپنے بے شمار بندوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کو کچھ ایسی محبت ہوگئی ہے کہ اس نے اسے بیٹا بنالیا ہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو بہرحال اس عقیدے کے بنیادی تصورات میں خدا تعالیٰ پر

بہت سے عیوب، بہت سی کمزوریوں، بہت سے نقائص اور بہت سی احتیاجوں کی تہمت لگی ہوئی ہے۔ اسی بناء پر پہلے فقرے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب ونقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جو تم اس کی طرف منسوب کررہے ہو۔ دوسرے فقرے میں ارشاد ہوا کہ وہ ان حاجتوں سے بھی بے نیاز ہے جن کی وجہ سے فانی انسانوں کو اولاد کی یا بیٹا بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے، اور تیسرے فقرے میں صاف کہہ دیا گیا کہ زمین وآسمان میں سب اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے مملوک ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا مخصوص ذاتی تعلق نہیں ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسے وہ اپنا بیٹا یا اکلوتا یا ولی عہد قرار دیدے۔

صفات کی بناء پر بیشک اللہ تعالیٰ بعض بندوں کو بعض کی بنسبت زیادہ محبوب رکھتا ہے، مگر اس محبت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی بندے کو بندگی کے مقام سے اٹھا کر خدائی صفات میں شرکت کا مقام دیا جائے، زیادہ سے زیادہ اس محبت کا تقاضا بس وہ ہے جو اس سے پہلے کی ایک آیت میں بیان کردیا گیا ہے کہ جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، دینا اور آخرت دونوں جہانوں میں ان کے لئے بشارت ہی بشارت ہے۔ فرمایا:

﴿قَالُوا اتَّخَذَ اللهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ﴾ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے، اس غلط عقیدہ کے ماننے والے سب سے پہلے یہود تھے، پھر نصاریٰ، پھر مشرکین۔

﴿سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِيُّ﴾ اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب ونقائص سے پاک ہے اور بے نیاز ہے۔

﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ آسمان وزمین کی ہر چیز اس کی ملکیت ہے، اسے کسی اولاد کی ضرورت ہی کیا؟ پس تمہیں ایسی تہمتوں کا جواب دینا ہی پڑے گا، کیونکہ:

﴿اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا﴾ کیا تمہارے پاس اس کی کوئی سند اور دلیل ہے؟

﴿اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ تم اللہ تعالیٰ کے بارے ایسی باتیں کرتے ہو جن کو خود نہیں جانتے ہو۔

﴿قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ﴾ آپ فرمادیجئے: بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہیں وہ جھوٹے کبھی فلاح نہیں پائیں گے، مشرک کیلئے کبھی فلاح نہیں۔

﴿مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا﴾ یہ چند روزہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے، جس کے لئے کوئی بقاء نہیں، یہ کتنا معیوب ہے، ایک یہ کہ معیوب ہے اور ردی وکمزور ہے، پھر چار روزہ ہے، کوئی سامان رہنے والا نہیں ہے، چند دن میں خراب

ہو جائے اور قابل استعمال نہ رہے۔

﴿ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ﴾ پھر ان سب کا ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے، تمام اچھے برے انسانوں کی اللہ تعالیٰ کے ہاں حاضری ہوگی، اور حساب دینا ہوگا، اور ہر بات کا جواب بھی خود دینا ہوگا، نہ کسی کی وکالت چلے گی اور نہ نیابت ہوگی۔

﴿ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ﴾ پھر ہم انہیں سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے۔

﴿بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ﴾ اس وجہ سے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے، شرک ایک مستقل بغاوت اور اکبر الکبائر ہے، پھر اللہ تعالیٰ پر تہمت باندھنا اور اس کے لئے اولاد ثابت کرنا مزید کفر میں ترقی ہے، پس ایسے سرکشوں کا عذاب نہایت ہی سخت ہوگا۔

❀ ❀ ❀

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ
غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ۝ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا
عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَ
جَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ۝

ترجمہ: اور آپ ان کو نوح کا قصہ پڑھ کر سنایئے، جبکہ نوح نے اپنی قوم سے کہا کہ: اے میری قوم! اگر میرا قیام کرنا اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی یاددہانی کرنا تم پر بھاری ہے تو میں نے صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا، سو تم سب مل کر اپنے شرکاء کے ساتھ اپنی تدبیر کرلو، پھر وہ تمہاری تدبیر ڈھکی چھپی نہ رہے، پھر تم میرے بارے میں جو چاہو فیصلہ کرلو، اور مجھے مہلت نہ دو۝ سو اگر تم روگردانی کرو تو میں نے تم سے کسی معاوضہ کا سوال تو کیا نہیں ہے، میرا اُجر تو صرف اللہ تعالیٰ پر ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے رہوں۝ سو انہوں نے ان کو جھٹلایا، پھر ہم نے ان کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دے دی، اور ہم نے انہیں پہلے لوگوں کے بعد زمین کو آباد کرنے والا بنا دیا، اور ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات جھٹلایا، سوائے مخاطب! دیکھ لے جن کو ڈرایا گیا تھا ان کا کیسا انجام ہوا؟۝

معارف ومنازل

اب تک مشرکین کی گمراہی اور تکذیب کا سلسلہ چل رہا تھا، اب سرور عالم ﷺ کو خطاب ہو رہا ہے کہ آپ نے معقول دلائل اور پر مغز نصائح کے ذریعہ ان سرکشوں کو سمجھایا، مگران پر اثر نہیں ہوا۔ اب انہیں نوح علیہ السلام کا قصہ سنادیں، اسی قصے میں وہ اپنے اور تمہارے معاملے کا جواب بھی پالیں گے۔ یہاں نوح علیہ السلام کا واقعہ اجمالی طور پر مذکور ہے، تفصیل کے ساتھ سورۂ ہود اور سورۂ نوح میں مذکور ہے۔ اسی طرح دوسری چند سورتوں میں بھی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں ساڑھے نوسو سال قیام فرمایا۔ [العنکبوت]

اور ان کو طرح طرح سے سمجھایا، توحید کی دعوت دی، شرک کی قباحت و ناپاکی بیان فرمائی، لیکن وہ لوگ شرک سے باز نہ آئے، اور مخالفت پر کمر بستہ رہے، اور یہاں تک کہہ دیا: ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ﴾ [الشعراء:۱۱۶] (اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو تم سنگسار کئے جانے والے لوگوں میں سے ہو جاؤ گے)۔ فرمایا:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ﴾ اے محمد! آپ مشرکین مکہ کو نوح علیہ السلام کا قصہ سنائیے۔

﴿اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ﴾ جبکہ انہوں نے اپنی قوم کو تبلیغ کر کے کہا۔ حضرت نوح علیہ السلام حضرت شیث علیہ السلام کی نسل سے تھے، آپ علیہ السلام کے والد حضرت لامک یا لمک موحّد تھے، اور والدہ بھی۔

﴿يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ اے میری قوم! اگر تم پر میرا قیام شاق ہو گیا ہے، یعنی ہزار سال کے قریب میرا تمہارے اندر رہنا اور قیام کرنا اگر تم پر ناگوار ہو گیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ پڑھ کر تمہیں نصیحت کرتا رہا ہوں اگر یہ تذکیر ونصیحت تم کو ناگوار ہوئی ہے تو:

﴿فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ﴾ پس میں اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھتا ہوں۔

﴿فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ﴾ تم مع اپنے مفروضہ باطل شرکاء کے مجھے ضرر پہنچانے کی خوب تدبیر کرو۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم اپنے کام یعنی مجھے ختم کرنے اور مارنے کا پختہ عزم کرلو، اور اپنے شرکاء کو بھی طلب کرو۔

﴿ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً﴾ اپنی تدبیروں کو خوب سوچ لو، تا کہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے۔ (غمة کے معنی ہیں: پوشیدہ)۔

﴿ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ﴾ پھر جو کچھ میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو اسے پورا کرو، اور کر گزرو، اور مجھے کوئی مہلت بھی نہ دو، پھر انتظار کس بات کا ہے؟ چونکہ حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے پروردگار پر پورا پورا بھروسہ تھا اس لئے انہیں چیلنج کیا، اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ مشرک کچھ بھی نہ کر سکیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حفاظت کی یقین دہانی کرائی تھی، اور کشتی تیار کرنے کا حکم بھی دیا ہوا تھا۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ﴾ پھر بھی اگر تم اعراض ہی کئے جاؤ، یعنی تم نے میری نصیحت سے اگر اعراض کیا، تو میرا کیا نقصان کیا؟ میں تم سے کسی اجر کا طلبگار نہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر روگردانی کرو گے تو اپنا نقصان کرو گے، میرا کچھ نقصان نہ ہوگا، میں تم سے کسی اجر کا طلبگار نہیں کہ تمہاری روگردانی سے مجھے وہ اجر نہ ملے، کیونکہ:

﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ میرا اُجر ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل کر ہی رہے گا۔

﴿وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کروں، اور فرمانبردار بندوں میں شامل ہو جاؤں۔

﴿فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ﴾ قوم حق واضح ہونے کے باوجود آپ علیہ السلام کی تکذیب پر جمی رہی، اور سرکشی پر مصر رہی، تو ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں غرق ہونے سے بچا لیا، طوفان سے نجات دیدی۔ یہ اسی (۸۰) آدمی تھے۔

﴿وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ﴾ اور ہم نے ان کو ہلاک شدگان کا جانشین بنا لیا۔

﴿وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ اور جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا ان کو طوفان میں غرق کر دیا۔

﴿فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ﴾ سو آپ دیکھئے کہ جو لوگ ڈرائے گئے تھے ان کا انجام کیا اور کیسا ہوا؟ اس میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی کا پیغام ہے، اور مشرکین مکہ کے لئے اِنذار و تخویف ہے کہ نافرمانوں کا انجام ایسا ہی ہوگا تم بھی انتظار کرو۔

...... ۞ ...... ۞ ...... ۞ ......

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ
كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ
مُّبِيْنٌ ﴿٧٦﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿٧٧﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا
لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٨﴾

ترجمہ: پھر ہم نے نوح کے بعد کتنے ہی پیغمبر بھیجے جو اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے، سو وہ ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لے کر آئے، سو وہ ایسے نہ تھے کہ جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے تھے اس پر ایمان لے آئیں، ہم اسی طرح حد سے نکل جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں ﴿٧٤﴾ پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی آیات کے ساتھ فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرف بھیجا سو ان لوگوں نے تکبر کیا، اور وہ مجرم لوگ تھے ﴿٧٥﴾ سو جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آ گیا تو کہنے لگے کہ بلا شبہ یہ تو کھلا جادو ہے ﴿٧٦﴾ موسیٰ نے کہا کہ جب تمہارے پاس حق آ گیا تو کیا تم اس کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟ اور جادو کرنے والے کامیاب نہیں ہوتے ﴿٧٧﴾ وہ کہنے لگے: کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ جس چیز پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے تو ہمیں اس سے ہٹا دے، اور زمین میں تم دونوں کو سرداری مل جائے، اور ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں ہیں ﴿٧٨﴾

معارف ومنازل

حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے بعد زمین پر صرف انہی اسی (۸۰) لوگوں کی آبادی رہی، البتہ حضرت نوح علیہ السلام کے تینوں بیٹے سام، حام، یافث کی نسل بکثرت اور جلدی پھیل گئی، جن سے کئی قومیں مختلف علاقوں میں معرض وجود میں آئیں، تباہ شدہ اقوام یعنی عاد وثمود، قوم لوط، اصحاب الایکہ وغیرہ یہ سب نوح علیہ السلام کے بیٹوں کی اولاد ہیں، اور موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہیں۔ البتہ قوم شعیب علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے متصل پہلے ہے۔ واللہ اعلم

فرعون کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد ایسے وقت میں ہوئی جبکہ مشرق وسطیٰ کی سرزمین میں سوائے حضرت شعیب علیہ السلام کے کوئی دوسرے پیغمبر موجود نہیں تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام وحضرت ہارون علیہ السلام کا واقعہ فرعون کی تباہی وہلاکت اور بنی اسرائیلی واقعات پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ اعراف میں بیان ہوئے، اس مقام پر مزید تفصیل درکار نہیں۔ قرآن کریم کی آیات میں جتنی تفصیل ہے اسی کو دیکھ کر پوری حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ فرمایا:

﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ﴾ پھر نوح علیہ السلام کے بعد ہم نے بکثرت پیغمبروں کو ان کی قوموں کے پاس ہدایت وتبلیغ کے لئے بھیجا۔

﴿فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ یہ پیغمبر اپنی اپنی قوموں کے پاس کھلے دلائل اور ہدایات لے کر آئے۔

﴿فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ﴾ سو وہ ایسے لوگ نہ تھے کہ ان سے پہلے جن لوگوں نے جھٹلایا تھا، یہ بعد والے اس پر ایمان لے آئیں، پیچھے والے اکثر تکذیب کرنے میں پہلے والے مکذبین کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں، اور چلتے ہیں۔

﴿كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ اسی طرح ہم حد سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگاتے ہیں۔ یہ حکم عام ہے، گذشتہ امتوں اور اس آخری امت کے کفار ومنافقین سب کو شامل ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان ہوا۔

﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ﴾ پھر ان پیغمبروں کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس بھیجا، اپنی نشانیاں دے کر۔ وہ نو (۹) نشانیاں تھیں، جن کا ذکر الاعراف میں بیان ہو چکا ہے، اور سورۃ بنی اسرائیل میں تفصیل کے ساتھ آنے والا ہے۔

﴿فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ﴾ پس انہوں نے تکبر وغرور کیا، حق سے منکر ہو گئے، کیونکہ وہ مجرم لوگ تھے۔

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ﴾ پھر جب ہماری طرف سے ان کے پاس حق پہنچ گیا تو انہوں نے کہا: یہ تو کھلا جادو ہے، سرکشی اور غرور کی بنیاد پر انہوں نے معجزات کو جادو شمار کیا، اور وہ اچھی طرح جانتے بھی تھے کہ یہ معجزہ ہے جادو نہیں، مگر قصداً وعناداً انہوں نے اسے جادو کہا، اور کہنے لگے: جادو ہے۔

﴿قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: کیا حق جب تمہارے پاس آ گیا تو تم اس کو سحر کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟

﴿تَقُوْلُوْنَ﴾ کا مقولہ محذوف ہے، یعنی اِنَّهٗ سِحْرٌ۔ یہاں اَسِحْرٌ الگ جملہ ہے، مقولہ نہیں، گویا موسیٰ علیہ السلام نے تعجب وانکار کے طور پر کہا کہ تم لوگ حق ومعجزہ کو سحر کہتے ہو، یہ غلط ہے، پھر فرمایا: کیا یہ سحر وجادو ہے؟

﴿وَلَا يُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ﴾ جادوگر آخرت میں فلاح نہیں پاتے، یا یہ معنی ہے کہ نبی کے مقابلے میں فلاح نہیں پاتے، مطلق فلاح کی نفی نہیں، کیونکہ جادوگر اپنے فن میں بہت دنیوی فوائد حاصل کرتے رہتے ہیں۔

﴿قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا لِتَلۡفِتَنَا عَمَّا وَجَدۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوۡنَ لَـكُمَا الۡكِبۡرِيَآءُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَمَا نَحۡنُ لَـكُمَا بِمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ ان لوگوں نے کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ جس مذہب پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے اس سے ہم کو پھیر دو، الگ کردو؟ یعنی بت پرستی اور فرعون کی پوجا سے ہم کو پھیرنے کے لئے آئے ہو، اور اپنے لئے ہمارے مصر میں سرداری اور حکمرانی کا حصول چاہتے ہو کہ فرعون چلتا ہوجائے، اس کی جگہ تم دونوں بھائیوں کی حکمرانی ہو۔ یاد رکھیے: تمہارا یہ مطلب ہرگز پورا نہ ہوگا، اور ہم میں سے کوئی تمہاری تصدیق نہیں کرے گا، اور تمہارے اوپر ایمان نہیں لائے گا۔

وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ائۡتُوۡنِىۡ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيۡمٍ ۝٧٩ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰٓى اَلۡقُوۡا
مَاۤ اَنۡتُمۡ مُّلۡقُوۡنَ ۝٨٠ فَلَمَّاۤ اَلۡقَوۡا قَالَ مُوۡسٰى مَا جِئۡتُمۡ بِهِ ۙ السِّحۡرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبۡطِلُهٗ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝٨١ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۝٨٢

ترجمہ: اور فرعون نے کہا کہ میرے پاس ہر جادوگر کو لے آؤ (یعنی تمام جادوگروں کو حاضر کردو) جو خوب جاننے والے ہوں ۝٧٩ سو جب جادوگر آئے تو موسیٰ نے ان سے کہا: ڈال دو تم جو کچھ ڈالنے والے ہو ۝٨٠ سو جب انہوں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا: تم جو کچھ لائے ہو یہ جادو ہے، بلاشبہ عنقریب اللہ تعالیٰ اسے باطل کردے گا، بیشک اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کا کام نہیں بننے دیتا ۝٨١ اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کے موافق حق کو ثابت فرماتا ہے، اگرچہ مجرمین برا مانیں ۝٨٢

معارف ومنازل

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضاء فرعون اور اس کے درباریوں نے دیکھا، تو ان کی دنیا بدل گئی، فرعون کا پیشاب خطا ہوا، مگر گھمنڈ اور کبر پھر خدائی والا تصور کہاں اسے ایمان پر آمادہ کرتا؟ کہنے لگا: یہ کھلا ہوا جادو

ہے، اس لئے جادوگروں کو ملک کے اطراف واکناف سے جمع کیا جائے، تاکہ جادو کا مقابلہ جادو سے ہو۔

اس وقت ملک میں کم وبیش ستر (۷۰) ہزار کے قریب مانے ہوئے ماہر جادوگر تھے، وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ تمام ملکی امور اور پورا انظام جادو پر چلتا تھا، چنانچہ فرعون کے قلمرو میں جتنے ماہر جادوگر تھے سب بلا لئے گئے، شہر سے باہر ایک بہت طویل وعریض چٹیل میدان میں ایک ایسے شاہی جشن کا اہتمام کیا گیا جس کے دیکھنے کے لئے دور دراز سے ایک جھلک دیکھنے کے لئے لوگ قطار در قطار آتے تھے، پورے میدان کو ایسا سجایا گیا تھا جیسے فرعون کی تاج پوشی کا جشن ہو، قطاروں میں رنگ برنگ خیمے، سڑکیں، روشنیوں کے قمقمے اس زمانے کے مطابق کھانے پینے کے سرکاری سطح پر اخراجات اور رہنے کے لئے خیمے، تفریح کے لئے سجائے ہوئے مسافر خانے، مہمان خانے، گھوڑوں کے اصطبل وغیرہ، جادوگروں کی رہائش گاہیں، ایک الگ خوبصورت بستی کی شکل میں تھیں۔ کچھ مؤرخین نے لکھا ہے کہ مصر میں سرکاری سطح پر قومی دن کا جشن بھی اتنے اہتمام سے نہیں منایا جاتا تھا۔

ایک طرف تو یہ حیران کن منظر تھا، جادوگر بڑے رُعب ورَعب اور بے مثال غرور وسر بلندی میں فوجیوں کے پہرے میں پیلے رنگ کے لباس میں براجماں ہوئے تھے۔ دوسری طرف سے میدان سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے سایہ میں پھٹے پرانے سفید لباس میں ملبوس، گدڑیوں میں چمکتے دمکتے دونورانی لعل فیصلہ اور مقابلہ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں، لگتا ہے کہ آسمانی عظمتیں اور برکتیں ان کے گرد گھومنے کے لئے منتظر ہیں، وہ اپنے درویشانہ لباس میں پرسکون مطمئن نظر آتے تھے، کیونکہ انہیں پیغام دیا گیا تھا کہ: ﴿قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی﴾ [طٰہٰ: ۴۶] (تم دونوں نہ ڈرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، میں سن رہا ہوں، اور دیکھ رہا ہوں)۔

اس پیغام کو اگر پوری کائنات کے ساتھ تولا جائے تو خدا کی قسم یہ پیغام بھاری رہے گا، جب جادوگر فرعونی دربار میں پہنچے تو انعامات کا مطالبہ ہوا، فرعون نے بڑے بڑے انعامات کی منظوری دے دی (مقربین درگاہ کا خطاب ومرتبہ)۔ میدان بڑا وسیع تھا، بیچ کے حصہ میں حق وباطل کا مقابلہ ہونا تھا، اردگرد چاروں طرف سے منظر دیکھنے والے تماشائیوں کے لئے ایسا انتظام کیا گیا تھا (موجودہ اسمبلی ہالوں کی طرح) کہ سارے لوگ بخوشی پورے منظر اور مقابلہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے۔

چنانچہ جادوگر میدان میں آگئے، اور لوگوں نے جذباتی انداز میں ان پر پھولوں کی بارش کردی، اور مقابلے کی بات چلائی، جب وہ لوگ سامنے آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ فرمائیے: آپ اپنی لاٹھی پہلے ڈالیں

گے یا ہم پہلے ڈالیں؟

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر جادوگروں نے اپنی وضع قطع اور لباس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مطابق بنایا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: پہلے تم ڈالو، انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں، جن سے میدان کی کیفیت بدل گئی، ان رسیوں اور لاٹھیوں نے سفید رنگ کے سانپ بن کر پورے میدان کو بھر دیا، اور مختلف سمت میں دوڑتے ہوئے کودتے ہوئے سارے مجمع کو حیران کر دیا، ایک ایسا منظر تھا جو دیکھنے کے قابل تھا، کہ پورے میدان میں ستر اسی ہزار سانپوں کا راج ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو اس نے اژدہا بن کر سر اٹھالیا، اور لمحوں میں ان ستر اسی ہزار سانپوں کو ایک لقمہ بنا کر نگل لیا، اب کیا ہوا حق و باطل کا معرکہ فوراً اختتام کو پہنچا، اور پورے مجمع نے چیخ کر ماتم شروع کیا۔ فرعون اور اس کے درباری شرمندگی اور خجالت کے غم میں ڈوب کر غرق ہوئے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے لباس میں ملبوس ہزاروں جادوگر مقابلہ کے میدان میں سجدہ ریز ہیں، مجال نہیں کہ وہ سر اٹھا کر ذرا ادھر ادھر دیکھنے کی جرأت کریں، زور زور سے سجدے میں روتے ہوئے کہہ رہے ہیں: ﴿اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٤٧ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝٤٨﴾ [الشعراء] (ہم نے ایمان لایا ربّ العالمین پر، موسیٰ اور ہارون کے ربّ پر)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پہلے ہی فرمادیا تھا کہ دیکھو، تم جو کچھ لے کر آئے ہو وہ جادو ہے، اور میں جو لے کر آیا ہوں یہ جادو نہیں بلکہ معجزہ ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے جادو کو اس معجزہ سے باطل فرمائے گا، مزید تفصیل اگر دیکھنی ہو تو سورۂ اعراف میں دیکھیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کا کام نہیں بننے دیتا، یعنی حق کے مقابلہ میں فساد نا کام ہے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ۭ وَاِنَّ
فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝٨٣ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ
بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝٨٤ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً
لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝٨٥ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝٨٦ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ

تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ: سو موسیٰ پر ان کی قوم میں سے تھوڑے سے لوگ ایمان لائے، وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے کہ کہیں وہ انہیں فتنے میں نہ ڈالے، اور بلاشبہ فرعون اس زمین میں بلندی والا تھا، اور اس میں شک نہیں کہ وہ حد سے آگے بڑھ جانے والوں میں سے تھا﴿۸۳﴾ اور موسیٰ نے کہا کہ: اے میری قوم! اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہوئے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو﴿۸۴﴾ انہوں نے کہا کہ: ہم نے اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کیا، اے ہمارے ربّ! تو ہمیں ظالم قوم کے لئے فتنہ نہ بنا﴿۸۵﴾ اور اپنی رحمت سے ہمیں کافر قوم سے نجات دے﴿۸۶﴾ اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ تم اپنی قوم کے لئے مصر میں گھر برقرار رکھو، اور اپنے گھروں کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو، اور نماز قائم کرو، اور مؤمنین کو خوشخبری دو﴿۸۷﴾

معارف و مسائل

جس وقت ساحرینِ فرعون نے اپنی شکست تسلیم کر لی، اور وہ سارے کے سارے بیک زبان ہو کر مسلمان ہوئے، یہ معاملہ فرعون کے لئے تباہ کن ثابت ہوا، ایسا سمجھو کہ فرعون کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہوا، اس کے نتیجے میں بنی اسرائیل قوم کے لوگ تقریباً سب کے سب خفیہ طور پر مسلمان ہوئے، اور کچھ قبطیوں میں بھی اسلام کے گرویدہ پیدا ہو گئے، مگر فرعون چونکہ ظالم وجابر اور خونخوار تھا اس سلسلے میں اس کی گرفت بہت سخت تھی، اس لئے لوگ خوف اور ڈر کے مارے اپنے ایمان کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے کہہ چکے تھے کہ تم لوگ پہلے کی طرح دیہات کا رخ کرو، وہاں بود و باش رکھو، فرعونیوں کے ساتھ خلط ملط رہنے میں ایک نقصان یہ ہے کہ وہ تمہارا تجسس کریں گے، تمہاری نماز اور ایمانیات کو فرعونیوں تک پہنچائیں گے، اور تمہیں فتنوں میں مبتلا کریں گے۔ دوسرا یہ کہ فرعونیوں کے ساتھ اکٹھے رہنے میں تمہارے اخلاق پر ان کا برا اثر پڑے گا، فرعون کی قوم میں چند افراد کا اسلام بشمول حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا فرعون کی بیوی کے اور حضرت حزقیل علیہ السلام نیز فرعون کا قریبی ایک رشتہ دار اور فرعون کی بیٹی کی خادمہ اور اس کے شوہر، ان سب کا واقعہ سورۂ مومن اور سورۂ تحریم میں آنے والا ہے۔ ان شاء اللہ

بنی اسرائیل کے لوگ تقریباً سب مسلمان ہو چکے تھے، مگر خوف کی وجہ سے اپنے ایمان کا اظہار نہیں کر سکتے

تھے۔ ایک حد تک فرعون کے لوگ بھی جانتے اور کہتے تھے کہ یہ لوگ ہمارے قبطی نہیں، یہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے، اور اسی کی امت ہیں، وہ ہر حال میں اسی کے وفادار رہیں گے، مگر صدیوں سے چونکہ وہ لوگ فرعونیوں کے ساتھ رہ رہے تھے، اور ان کے درمیان کئی پشتوں سے رشتے اور تعلقات رکھنے کی وجہ سے کچھ مراسم بھی رکھتے تھے، اور اس کے علاوہ وہ محکوم تھے، اور فرعونیوں کے خدمتگار بھی شمار ہوتے تھے، لہٰذا ان اسباب کی وجہ سے وہ فرعونیوں کی نظر میں چنداں برے اور خراب لوگ نہ تھے۔

﴿فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ﴾ پس موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق نہیں کی مگر اس کی قوم کے تھوڑے آدمیوں نے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ قَوْمِهٖ کی ضمیر فرعون کی طرف راجع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول حضرت عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ قومِ فرعون کے قلیل آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے، مثلاً فرعون کی بیوی اور فرعون کا خزانچی اور خزانچی کی بیوی وغیرہ۔ [مظهري]

﴿عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ﴾ ڈرتے ڈرتے رہتے تھے کہ اگر فرعون اور اس کے سرداروں کو ایمان کا پتہ چلا تو سخت مصیبت میں ڈال دیں گے۔

﴿وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ اور بلاشبہ فرعون ملک مصر میں طاقتور متکبر و مغرور تھا، اور حد سے زیادہ تجاوز کرنے والا ظالم وجابر تھا، اسی وجہ سے اس نے ملوکیت پر قناعت نہیں کی ربوبیت کا دعویٰ کر کے اعلان عام کیا: ﴿اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ [النازعات: ٢٤] (میں تمہارا بڑا خدا ہوں) العیاذ باللہ

﴿وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ﴾ اور موسیٰ علیہ السلام نے جب لوگوں کو خوفزدہ دیکھا تو کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے ہو تو اسی پر اعتماد اور بھروسہ کرو، مت ڈرو سوائے خدا کے کسی فرعون یا کسی جابر و ظالم سے، اگر تم سچے مسلمان اور فرمانبردار ہو۔ لوگوں نے جواب دیا:

﴿فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا﴾ انہوں نے صدق و اخلاص کے ساتھ کہا کہ ہمارا اعتماد اور بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی پر ہے، پھر انہوں نے دعا کی:

﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٥﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٦﴾﴾ اے ہمارے ربّ! ہم کو ان ظالم لوگوں کا تختۂ مشق نہ بنا، اور ہم کو ان کافروں کے گروہ سے اپنی رحمت سے نجات عطاء فرما

۔توکل کے ساتھ جو دعا ہوتی ہے اس کی قبولیت کا امکان زیادہ ہے، اگر توکل کے ساتھ دعا نہ ہو تو تنہا توکل بھی کفایت کرسکتا ہے، کیونکہ توکل مقام دعا سے اونچا ہے۔ یہی اصحاب باطن کا قول ہے۔

﴿وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی کے پاس وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنے لوگوں کے لئے مصر میں گھر مقرر کرو (تیار کرو) اور اپنے گھروں کا رخ قبلہ کی طرف کرو، یا قبلہ سے مراد مسجد ہے کہ اپنے گھروں کو مسجد بناؤ، اور ان میں نماز ادا کرو، اگر باہر نماز پڑھو گے تو پکڑے جاؤ گے، لہٰذا گھروں کو مصلیٰ یعنی جائے نماز بناؤ، اور نمازیں پڑھا کرو، اور اس پر آپ مؤمنین کو بشارت سنائیں کہ ان شاءاللہ تم کامیاب ہوجاؤ گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بنی اسرائیلی قوم نے فرعون کی غلامی سے نجات پائی، اور فرعون ستر (۷۰) لاکھ کی فوج وحشم کے ساتھ بحر قلزم میں غرق ہوا۔

❁ ❁ ❁

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰىٓ اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

ترجمہ: اور موسیٰ نے عرض کیا کہ اے ہمارے ربّ! بے شک آپ نے فرعون کو اور اس کے سرداروں کو دنیا والی زندگی میں زینت اور اموال دیئے ہیں، اے ہمارے ربّ! یہ اس لئے ہیں کہ وہ آپ کے راستے سے ہٹایا کریں، اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو نیست ونابود کردیجئے، اور ان کے دلوں کو سخت کردیجئے، سو وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں ﴿۸۸﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول کرلی گئی، سو تم دونوں

ثابت قدم رہو، اور ان لوگوں کے راستہ کا ہرگز اتباع نہ کرو جو نہیں جانتے ﴿۸۹﴾ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار دیا، پھر بغاوت اور زیادتی کرتے ہوئے فرعون اور اس کا لشکران کے پیچھے ہولیا، یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو کہنے لگا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں ﴿۹۰﴾ کیا اب ایمان لاتا ہے؟ حالانکہ اس سے پہلے نافرمانی کرتا رہا، اور تو فساد کرنے والوں میں سے ہے ﴿۹۱﴾

معارف ومنازل

موسیٰ علیہ السلام کی بددعا، اور فرعون کی ہلاکت:

بے مقصد اور سرکشی میں مست فرعون اُلوہیت کا مدعی اور خود کو بڑا رب کہنے والا موسیٰ علیہ السلام کا برملا عام مذاق اڑانے والا اور حاکمِ اعلیٰ مالکِ کائنات جل جلالہ کی ہم سری کا مدعی صیاد کے قفس میں بلبلا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے واویلا کرنے سے نہ شرمایا، اور چیخ چیخ کر ڈوب گیا۔ الحمدللہ

اس اجمال کی تفصیل یہ کہ اس ظالم فرعون اور اس کی قوم کا مصر پر اقتدار تھا، ان کے پاس دنیا کا سب سے بڑا دریا "دریائے نیل" تھا، اور بے تحاشا اسباب واموال کی فراوانی تھی، فرعون بڑے کروفر اور نہایت خوشحالی کی زندگی اور اسبابِ تعیش اور زیب وزینت کی فراوانی میں رہتا تھا، اس کی قوم بھی بڑی خوشحالی میں ہوتی تھی، اور بنی اسرائیل جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ہمراہ مصر جا کر آباد ہوئے تھے، اُس وقت یہ پوری قوم و قبیلہ ستر (۷۰) مرد وعورتوں پر مشتمل تھا، فرعون کی قوم بنی اسرائیل قوم سے خدمت لیتی تھی، اور ایک اعتبار سے اجنبیت اور اقلّیت کی وجہ سے انہیں قبطیوں نے غلام بنا دیا تھا اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے تھے جو ایک زیر دست ماتحت لوگوں کے ساتھ ہو، ان سے خدمت لیتے کبھی بیگاریں لیتے تھے، عام مجلسوں میں انہیں نیچے بیٹھنے کا حکم دیتے تھے، اور ان پر طرح طرح کا ظلم کرتے تھے۔ قرآن کریم نے اسی ظلم وستم کی نشاندہی کی ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس آئے تو فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، میں تمہاری ہدایت ورہنمائی کے لئے آیا ہوں، اس موقع پر انہیں یہ ہدایت دے کر بھیجا گیا تھا: ﴿لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ﴾ [طٰہٰ:۴۷] (ڈرو نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں، سن بھی رہا ہوں، اور دیکھ بھی رہا ہوں۔ اب اس کے پاس جاؤ، اور کہو کہ ہم دونوں تمہارے

رب کے پیغمبر ہیں، اس لیے بنو اسرائیل کو ہمارا ساتھ بھیج دو، اور انہیں تکلیفیں نہ پہنچاؤ)۔

بنی اسرائیل مال کے اعتبار سے بھی کمزور تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ اے اللہ تعالیٰ! آپ نے فرعونیوں کو دنیاوی ساز و سامان دیا ہوا ہے جو اس بات کا ذریعہ بن رہا ہے کہ وہ لوگوں کو آپ کے راستے سے ہٹا دیں، اور گمراہ کریں۔

﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۸۸﴾ اے ربّ! ان کے مالوں کو ختم فرما دیجئے، اور ان کے دلوں کو سخت کر دیجئے، تاکہ دردناک عذاب دیکھنے تک ایمان نہ لائیں، اور دنیا و آخرت دونوں میں کفر کی سزا چکھ لیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے جاتے تھے، اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے جاتے تھے، دعا کرنے والے کی دعا پر آمین کہنا بھی دعاء میں شریک ہونے کا عندیہ ہے، اس لئے دعا کی نسبت دونوں کی طرف ہوئی، اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرمایا:

﴿قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا﴾ تمہاری دعا قبول ہوگئی، سو تم ثابت قدم رہو، عجلت نہ کرو، اور استقامت کے ساتھ نبوت کے فرائض انجام دیتے رہو، یعنی تبلیغِ حق کا کام کرتے رہو، اور جو لوگ نادان ہیں ان کی راہ کا اتباع نہ کرو، تمہاری مدد کا وعدہ تو ہے، لیکن اس کے ظہور میں جو دیر لگے اس دیر سے مت گھبرانا، جیسا کہ وہ لوگ گھبرا جاتے ہیں، جو عادۃُ اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتے، اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں پر ان کی نظر نہیں ہوتی۔

صاحب روح المعانی نے ﴿فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ کی یہی تفسیر کی ہے۔
اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن جریج اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہم سے نقل کیا ہے کہ چالیس سال کے بعد اس دعا کا نتیجہ ظاہر ہوا، فرعون اور اس کا لشکر ہلاک ہوا، اور بنی اسرائیل نے ان کے شر سے نجات پائی۔

جب دعا کی قبولیت کا وقت آپہنچا تو موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے روانہ ہوئے، اس وقت بنی اسرائیلی مرد عورت چھوٹے بڑے چھ لاکھ تھے، اور پیچھے سے فرعون ستر (۷۰) لاکھ فوجیوں اور نیم فوجیوں کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکلا، اور بحر قلزم کی موجوں کی نذر ہوگیا۔ [تفصیل سورۂ طٰہٰ، الشعراء، الدخان میں ہے]

﴿وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا﴾ ہم نے بنی اسرائیل کو دریا پار کرا دیا، عبور کرا کے دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دیا، پیچھے سے فرعون اپنے لشکر کے ساتھ آپہنچا، ظلم اور زیادتی کے ارادے سے جب فرعون اور اس کے لشکر کو دریا میں گھس جانے پر خوف طاری ہوا تو حضرت جبریل علیہ السلام

گھوڑی پر سوار بشکلِ انسانی سب سے پہلے دریا میں گھس گئے، فرعون کا گھوڑا گھوڑی کے پیچھے ہنہناتے ہوئے گھس گیا، پھر سارے لشکر کے گھوڑے داخل ہو گئے۔

اس جگہ دریا کا عرض تقریباً بارہ میل ہے، جب آخری آدمی بھی دریا میں گھس گیا، اور پہلا آدمی فرعون دوسرے کنارے سے باہر نکلنے کے قریب پہنچا، تو یکدم پانی برابر ہو گیا، اور مصریوں کا خدا ہونے کا جھوٹا دعویدار اپنے لشکر کے ساتھ غرق ہوا۔

﴿حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَکَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ یہاں تک کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بولا: مجھے یقین ہو گیا کہ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں جس کو بنی اسرائیلی مانتے ہیں، اور میں اس کے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے فوراً اس کے منہ کو کیچڑ سے بھر دیا، اور خاموش کرا دیا۔

﴿آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَکُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ﴾ کیا اب تجھے یقین آ گیا؟ کیا یہ توبہ کرنے کا کوئی وقت ہے کہ تم توبہ کر رہے ہو؟ ساری عمر تباہی مچائی، نافرمانی کی، الوہیت کا مدعی رہا، اب بندگی اختیار کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور وہ بھی ایسے وقت جبکہ توبہ کا دروازہ بند ہو چکا۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِیْنَ یَمُوْتُوْنَ وَهُمْ کُفَّارٌ﴾ [النساء:١٨] (اور ایسوں کی توبہ نہیں جو کرتے ہیں برے کام یہاں تک کہ جب سامنے آ جائے ان میں سے کسی کی موت تو کہنے لگا: میں توبہ کرتا ہوں اب، اور نہ ایسوں کی توبہ جو مرتے ہیں حالتِ کفر میں)۔

فرعون کا خاتمہ کفر پر ہوا:

محقق جلال الدین دوانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ فرعون نے چونکہ کلمۂ توحید زندگی میں پڑھ لیا تھا اس لئے اس کی توبہ قبول ہو گئی، اور وہ مسلمان مرا۔ علامہ دوانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی قدس اللہ سرہ کی پیروی کی ہے، حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے کہ فرعون مسلمان مرا۔

حق یہ ہے کہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ظاہر نصوص کے خلاف ہے، آپ کے سکر کی حالت کے بکثرت الفاظ شرع کے مطابق نہیں ہیں۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا فرعون کے متعلق یہ قول بھی اجماعِ امت کے خلاف ہے، اور صحیح احادیث سے مطابقت نہیں رکھتا۔ علامہ دوانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: فرعون کا دوزخی ہونا کسی آیت سے ثابت نہیں، اور جن جن آیات میں عذاب

دوزخ کا ڈراوا دیا گیا ہے وہ آل فرعون کے متعلق ہیں، نہ کہ فرعون کے لئے، دیکھو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَدۡخِلُوۡۤا اٰلَ فِرۡعَوۡنَ اَشَدَّ الۡعَذَابِ﴾ [غافر: ۴۶] (فرعون کے آل کو سخت عذاب میں داخل کرو)۔ اسی طرح: ﴿فَاَوۡرَدَهُمُ النَّارَ﴾ [هود: ۹۸] (یعنی اپنے متبعین کو دوزخ میں اتار دیا)۔ اسی طرح: ﴿وَحَاقَ بِاٰلِ فِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ﴾ [غافر: ۴۵] (یعنی آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر کی وجہ سے فرعون کو عذاب نہ ہوگا، بلکہ بندوں پر اس نے جو ظلم وزیادتی کی یہ اسی وجہ سے ہے، اور اس اعتبار سے بہت سے دیگر مسلمانوں کو بھی عذاب ہوگا، اگر انہوں نے لوگوں پر ظلم وزیادتی کی ہو، کیونکہ حقوق العباد کسی سے معاف نہیں ہوتے۔

میں کہتا ہوں (صاحب مظہری) کہ علامہ دوانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دلیل لغو ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ﴿فَحَشَرَ فَنَادٰی ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَکَالَ الۡاٰخِرَةِ وَالۡاُوۡلٰی ﴿۲۵﴾ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَعِبۡرَةً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ﴿۲۶﴾﴾ [النازعات] (فرعون نے سب کو جمع کر کے کہا: میں تم سب کا ربّ اعلیٰ ہوں، آخر اللہ تعالیٰ نے اس کی پکڑ کی، اور اس کو دنیا وآخرت میں (یا اگلوں پچھلوں کے لئے) عبرت بنا دیا۔ بیشک اس میں عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو ڈرتے ہوں)۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ کفر کی وجہ سے آخرت میں فرعون پر عذاب ہوگا۔

دوسری آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا نقل کی ہے: ﴿رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَیۡتَ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَاَهٗ﴾ [یونس: ۸۸] اس کے آخر میں فرمایا ہے: ﴿قَدۡ اُجِیۡبَتۡ دَّعۡوَتُکُمَا﴾ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لئے بددعا کی تھی اور درخواست کی تھی کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہو، اور یہ دعا قبول کر لی گئی، پس اس کا خاتمہ کفر پر ہوگیا، پھر اس کا انکار آیت کا انکار ہے۔ [مظهري]

﴿فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡكَ بِبَدَنِكَ لِتَکُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَكَ اٰیَةً﴾ سو آج ہم تیرے بدن کو نجات دیتے ہیں، یعنی پانی کے اوپر تیرا دیتے ہیں، پھر کنارے پر پہنچا کر اسے محفوظ کراتے ہیں، تاکہ آنے والی نسلیں تجھے دیکھ کر عبرت حاصل کریں، یہ وہ ناداں فاتر العقل شخص ہے، جس نے چار روزہ اقتدار کے نشہ میں خدائی کا دعویٰ کیا، جس کے نتیجے میں پوری فوج وحشم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اُسے غرق کیا ہے، لوگ تجھے دیکھ دیکھ کر تجھ پر لعنت برسائیں، اور تیری حماقت سے عبرت حاصل کریں، پوری کائنات میں تم وہ واحد گمراہ حکمران ہو جس کی لاش لوگوں کی عبرت کے لئے محفوظ رکھی گئی ہے۔

اس آیت کریمہ سے اتنا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کر دیا، اور اس کی نعش کو پانی میں بہنے سے اور دریائی جانوروں کے کھانے سے محفوظ فرمادیا، اس نعش کو لوگوں نے دیکھا اور شناخت بھی کیا، قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت یا لفظ نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ کتنے عرصے تک اس کی نعش کو محفوظ رکھا گیا، ویسے تو اہلِ مصر کو نعشوں پر مصالحہ لگا کر انہیں باقی رکھنے کا شوق تھا، وہ اپنے بادشاہ اور شہزادے وشہزادیوں کی نعشوں کو حنوط لگا کر محفوظ کرتے تھے، یہ فرعون سے بہت پہلے کا رواج مصریوں میں عام تھا، اب بھی مصری عجائب گھروں میں کوئی تین ہزار سال پرانی نعشیں ممی لگی ہوئی بکثرت موجود ہیں، اور فرعون کی ممی شدہ یعنی حنوط شدہ نعش مصر میں موجود ہے، جس کے گوشت و پوست تو کب سے ختم ہو چکے ہیں، مگر ہڈیوں کا ڈھانچہ بدستور موجود ہے، جہاں جہاں جوڑ کھل گئے ہیں چاندی کے تاروں اور مصالحہ کے ذریعہ سے انہیں جوڑا گیا ہے، اور شکست وریخت سے ایک حد تک محفوظ ہے، اور موٹے شیشے کے صندوق میں بند ہے، لوگ بخوشی اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

موجودہ وقت میں اس کا فوٹو اتارنا ممنوع ہے، کیونکہ برقی شعاعوں نے اسے بہت نقصان پہنچایا ہوا ہے، جن کا وہ مزید متحمل نہیں۔ مزید تحقیق اگر مطلوب ہو تو دائرۃ المعارف میں دیکھیں۔ واللہ اعلم

فائدہ:

اس آیت کریمہ اور سابقہ آیات سے چند فوائد معلوم ہوئے، وہ یہ ہیں:

(۱)- نزولِ تورات سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم جو مصر میں تھی وہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کے دین پر عمل کرتی تھی، وہ لوگ مسجد میں نماز پڑھنے کے پابند نہیں تھے، اگر وہ گھروں میں نماز پڑھتے تو وہ صحیح ہوتی، تورات کے نزول کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا، پھر وہ مسجد کے علاوہ کہیں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔

(۲)- بنی اسرائیل کا قبلہ جیسے کہ سورۂ بقرہ میں واضح ہوا کعبۃ اللہ شریف ہی تھا، جن یہودیوں نے جو دعویٰ کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا قبلہ بیت المقدس تھا وہ بلا دلیل ہے۔ البتہ بعد میں بنی اسرائیل نے کعبہ کو چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنایا۔

(۳)- جب کسی قوم کے ایمان سے مایوسی ہو تو ان کے لئے بددعا کرنا جائز ہے، جیسے نوح علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام دونوں نے بددعا کی، اور قبول بھی ہو گئیں۔

(۴)-سینکڑوں سالوں سے فرعونیوں نے اسرائیلیوں پر ظلم کیا، پھر ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرعون کی پوری قوم سوائے بوڑھوں، بچوں، اور عورتوں کے غرق ہوگئی، یہ ظلم وشرک کا نتیجہ ہوا، اور بنی اسرائیلی قوم صحیح سلامت نجات پائی، یہ ان کے صبر کا انجام تھا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاؤں کا بھی نتیجہ تھا۔ واللہ اعلم

(۵)-نزع کے وقت نہ توبہ کا اعتبار ہے اور نہ ہی کسی کافر کے ایمان کا اعتبار ہوگا۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ
اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ
فَسْــَٔـلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾
وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کا اچھا ٹھکانہ دیا، اور انہیں پاکیزہ چیزیں کھانے کو دیں، سو انہوں نے اختلاف نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کے پاس علم پہنچ گیا، بلاشبہ آپ کا ربّ قیامت کے دن ان چیزوں میں ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے ﴿۹۳﴾ سو اگر آپ کو اس میں شک ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتارا تو آپ ان لوگوں سے دریافت کر لیجئے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں، بلاشبہ آپ کے ربّ کے پاس سے آپ کے پاس حق آ گیا ہے، سو آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں ﴿۹۴﴾ اور ان لوگوں میں سے ہرگز نہ ہو جایئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا، ورنہ آپ تباہ کاروں میں سے ہو جائیں گے ﴿۹۵﴾ بیشک جن لوگوں پر آپ کے ربّ کی بات ثابت ہوگئی وہ ایمان نہ لائیں گے ﴿۹۶﴾ اگرچہ ان کے پاس تمام دلیلیں آ جائیں، جب تک کہ وہ دردناک عذاب کو دیکھ نہ لیں ﴿۹۷﴾

معارف ومنازل

فرعون کی تباہی کے بعد بنی اسرائیل بخیر وعافیت وہاں سے روانہ ہوئے، یہ لوگ صدیوں سے فرعونیوں کی

غلامی میں رہے، فرعونیوں کے نمک خوار اور کاسہ لیس رہے، مذہب سے اور مذہبی تعلیمات سے اتنے جاہل کہ انہیں اپنے دین کی تین چار اصولی باتوں تک کا علم نہ تھا، صرف اتنا جانتے تھے کہ ہم انبیاء کرام علیہم السلام کی اولاد ہیں اور بس۔ یہ اتنے خبیث اور ناپاک تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ دیکھ کر ہزاروں جادوگر تو ایمان لائے، اور جانوں کی قربانی دی، مگر یہ بنی اسرائیل ٹس سے مس بھی نہیں ہوئے، اور مسلسل سرکشی کرتے رہے، ان کی آنکھوں کے سامنے فرعون اپنے پورے لشکر کے ساتھ غرق ہوا، مگر ان پر کوئی اثر نہ پڑا۔

جب یہ وہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں فلسطین جارہے تھے ایک مشرک قوم پر ان کا گزر ہوا تو کہنے لگے: اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایسا معبود بناؤ جیسے ان لوگوں کا ہے، جب یہ وہاں سے روانہ ہوئے تو اپنی شرارتوں کی وجہ سے چالیس سال میدان "تیہ" میں سرگرداں دربدر گھومتے رہے، اس کے بعد انہیں اپنے وطن میں ٹھکانا مل گیا، اور وہاں صاحب اقتدار ہوگئے۔ ٹھکانا بھی اچھا ملا اور کھانے پینے کی اچھی پاکیزہ چیزیں نصیب ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں پر انہیں زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں مشغول رہنا چاہیے تھا، اور خوب شکر کرنا چاہیے تھا، لیکن انہوں نے نافرمانیوں کا وہ سلسلہ شروع کیا جن سے عقلمند انسانوں کا خون خشک ہو جاتا ہے، اس سلسلے میں ان کی چالیس شرارتوں کا بیان سورۂ بقرہ میں گزرا، پھر دین میں اختلافات شروع کئے، یہ کسی جہالت کی وجہ سے نہیں، بلکہ علم پہنچنے کے بعد نزولِ تورات کے بعد یہ بہتر (۷۲) فرقے ہوگئے، طرح طرح کی تحریفات کر کے توریت جیسی کتاب کا حلیہ بگاڑ دیا۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ بلاشک آپ کا ربّ قیامت کے دن ان امور میں فیصلہ فرمادے گا جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس سے وہ یہودی مراد ہیں جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھے، یہ لوگ پہلے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے انتظار میں تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور ان کو قرآن کریم سنایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کو دیکھ کر اچھی طرح جان لیا کہ یہ نبی موعود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ [البقرۃ:۲:۱۴۶] (وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں)۔ لیکن بغض وعناد اور حسد کی وجہ سے منکر ہوگئے، تصدیق نہیں کی، اور تکذیب کی وجہ سے کافر ہوگئے، سوائے چند آدمیوں کے، جو آٹھ نو کی تعداد میں تھے۔

﴿فَإِنْ كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتٰبَ مِن قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝٩٤ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُونَ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۝٩٥﴾ اس میں بظاہر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے، لیکن حقیقت میں اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اور قرآن مجید کے بارے میں شک کرتے تھے، کیونکہ صاحب وحی کو اپنی وحی اور رسالت میں شک ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور نبی کا مقام اتنا اونچا اور بلند ہوتا ہے کہ جہاں شک کا شائبہ اور تصور نہیں ہوتا۔

اور قرآن کریم میں اکثر باتوں میں ظاہری خطاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، مگر مراد امت ہے، جیسے: ﴿يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ [الطلاق: ۱] (اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو)۔ اور ﴿يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ﴾ [الأحزاب: ۱] (اے نبی! اللہ سے ڈریں)۔ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ [الإخلاص: ۱] (کہہ دیں کہ اللہ ایک ہے)۔ اور ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ [الفلق: ۱] (کہو کہ میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں) وغیرہ۔

یہ جتنے احکام ہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ان کے عموم میں سارے لوگ آجاتے ہیں، اور شامل ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اہل علم خوب جانتے ہیں۔ تو یہاں ظاہری خطاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، مگر مراد وہ لوگ ہیں جو شک کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شک کرنے والے لوگوں سے آپ پوچھ لیں، جو پہلے سے کتاب پڑھتے تھے، یعنی یہود و نصاریٰ سے معلوم کرلیں کہ تمہاری کتابوں میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی خبر ہے یا نہیں؟ اور اس بارے میں جو تمہارے پاس علم ہے اس کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وہ صفات منطبق ہوتی ہیں یا نہیں؟ جو تم پڑھتے آئے ہو، پس اگر وہ ضد اور حسد کو اگر چھوڑ دیں تو واقعی بتائیں گے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ برحق نبی ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتاب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح برحق آخری کتاب ہے۔

بعض علماء مفسرین نے یوں فرمایا ہے کہ فَإِنْ كُنتَ میں جو خطاب ہے اس سے عام انسان مراد ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ اے انسان! اگر تجھے اس وحی میں شک ہے جو بواسطہ خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیری طرف بھیجی گئی ہے تو تم تو ان لوگوں سے دریافت کرلو جو اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی کتاب تورات وانجیل پڑھتے آرہے ہیں، وہ تجھے بتادیں گے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی بشارتیں دی ہیں، اور ان کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر موجود ہے، یہ بات دل کو زیادہ لگتی ہے، اور آنے والے کلمات جیسے: ﴿فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ﴾ اور ﴿فَتَكُونَ مِنَ الْخٰسِرِينَ﴾ اسی توجیہ کے ساتھ منطبق ہیں، اور خطاب عام انسان کو ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ حَقَّتۡ عَلَيۡهِمۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ﴾ بیشک جن لوگوں کے لئے آپ کے ربّ کا حکم (ازلی فیصلہ) طے ہو چکا ہے (کہ وہ ایمان سے محروم رہیں گے) وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿وَلَوۡ جَآءَتۡهُمۡ كُلُّ اٰيَةٍ﴾ اگر چہ آ جائے ان کے پاس ہر نشانی، کیونکہ ایمان کا اصلی سبب تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے، اور جب اللہ تعالیٰ شانہ کی مشیت نہیں تو ایمان کیسے لائیں؟

﴿حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ﴾ جب تک اپنی آنکھوں سے دردناک عذاب نہ دیکھ لیں گے۔ اس کی مثال فرعون ہے، جس کے پاس تمام نشانیاں، ساری دلیلیں، ہر قسم کے معجزات واضح سامنے آئے، مگر ازلی فیصلہ کے مطابق ایمان سے محروم رہا۔ چاہیے تھا کہ جادوگروں کے ساتھ وہ اور اس کی قوم ایمان سے مشرف ہوتے، اب مرنے کے ساتھ عذابِ الیم کو دیکھ کر اضطراری ایمان لانے سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ آخری آیت گزشتہ طویل مضمون کا تتمہ ہے۔

فَلَوۡلَا كَانَتۡ قَرۡيَةٌ اٰمَنَتۡ فَنَفَعَهَاۤ اِيۡمَانُهَاۤ اِلَّا قَوۡمَ يُوۡنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوۡا
كَشَفۡنَا عَنۡهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡىِ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَمَتَّعۡنٰهُمۡ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۹۸﴾

ترجمہ: سو کوئی بستی ایمان نہ لائی جس کا ایمان لانا اسے نفع دیتا، مگر یونس کی قوم، جب وہ قوم ایمان لائی تو ہم نے رسوائی والا عذاب دنیا والی زندگی میں ان سے ہٹا دیا، اور انہیں ہم نے ایک وقت تک فائدہ پہنچایا ﴿۹۸﴾

معارف ومنازل

اس آیت میں غفلت شعار اور بے وقوف گناہگاروں کو تنبیہ ہے کہ توبہ کرنے میں غفلت نہ کرو، جیسے گناہوں میں عجلت کرتے ہو اسی طرح توبہ میں بھی عجلت کرو، اور زندگی کی فرصت کو غنیمت جانو، انکار اور سرکشی سے اب بھی باز آ جاؤ، ورنہ ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب توبہ کرو گے تو توبہ قبول نہ ہوگی، اگر ایمان لاؤ گے تو ایمان بھی مقبول نہ ہوگا، اور وہ وقت وہ ہوگا جبکہ موت کے وقت آخرت کا عذاب سامنے آ جائے۔ اسی سلسلے میں حضرت یونس علیہ السلام اور ان کی قوم کا واقعہ ذکر فرمایا گیا، جس میں بڑی بڑی عبرتیں ہیں اور نصیحتیں ہیں۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ منکر قومیں ایسے وقت ایمان لے آتیں کہ ان کا ایمان ان کو نفع

دیتا؟ یعنی موت کے وقت، یا وقوع عذاب اور مبتلاء عذاب ہو چکنے کے بعد، یا قیامِ قیامت کے وقت، جبکہ توبہ کا دروازہ بند ہوجائے گا، کسی کی توبہ اور ایمان مقبول نہ ہوگا، اس سے پہلے پہلے اپنی سرکشی سے باز آجائیں، اور ایمان لے آئیں، بجز قوم یونس علیہ السلام کے، کہ انہوں نے ایسا وقت آنے سے پہلے ہی جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا دیکھا تو فوراً توبہ کرلی، اور ایمان لے آئے، جس کی وجہ سے ہم نے ان سے رسوا کرنے والا عذاب ہٹالیا۔ وہ مسلسل توبہ میں اجتماعی طور پر سجدے میں پڑے رہے، حتّٰی کہ عذاب واپس ہوگیا۔

اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کا عذاب سامنے آجانے پر بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں ہوتا، بلکہ توبہ قبول ہوسکتی ہے۔ البتہ آخرت کا عذاب سامنے آجانے پر نہ توبہ قبول ہوتی ہے، اور نہ ہی ایمان قبول ہوگا، پس آخرت کے عذاب کا سامنے آنا یا قیامت کے دن ہوگا یا موت کے وقت، خواہ وہ طبعی موت ہو یا کسی دنیوی عذاب میں مبتلا ہوکر ہو، جیسے فرعون کو پیش آیا، اس لئے قومِ یونس علیہ السلام کی توبہ کا قبول ہوجانا عام ضابطۂ الٰہیہ کے خلاف نہیں، بلکہ اس کے ماتحت ہے، کیونکہ انہوں نے اگرچہ عذاب آتا ہوا دیکھ کر توبہ کی، مگر عذاب میں مبتلا ہونے اور موت سے پہلے کرلی۔

بخلاف فرعون اور دوسرے لوگوں کے، جنہوں نے عذاب میں مبتلا ہونے کے بعد اور غرغرۂ موت کے وقت توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا، اس لئے ان کا ایمان معتبر نہ ہوا، اور توبہ قبول نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں فرعون کا معاملہ اور بھی پیچیدہ ہے، کیونکہ فرعون والے سینکڑوں سردار کئی مرتبہ موسیٰ علیہ السلام سے کہتے رہتے تھے کہ یہ عذاب دور کرو، فلاں کام ایسا کرو تو:

﴿لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ﴾ [الأعراف: ۱۳۴] (ہم ضرور بضرور آپ کی تصدیق کریں گے، اور ضرور بضرور بنی اسرائیل کو آپ کے ساتھ بھیج دیں گے)۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے وہ کام ہوجاتا تو وہ اپنے معاہدے سے منحرف ہوجاتے، اب ڈوبتے وقت اس نے جو توبہ کی اور ایمان کا اقرار کیا تو اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ اپنی توبہ میں پہلے کی طرح مخلص نہیں ہے، اس لئے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فوراً کارروائی کی، اور اس کے منہ میں کیچڑ بھر دی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خلاف ضابطہ اس کا ایمان قبول ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، وہ ضابطوں کا کہاں پابند ہے؟ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خلاف ضابطہ پیدا فرما کر اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا، تو اگر وہ فرعون جیسے مدعی الوہیت کو معافی دیدے تو اس کے لئے کیا مشکل ہے؟ وہ ہر چیز پر قادر ہے، ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُونَ﴾ [الأنبياء: ۲۳] (وہ جو کچھ کرتا ہے اس کا کسی کو جواب دہ نہیں ہے، اور ان سب کو جوابدہی

کرنی ہوگی)۔

قوم یونس علیہ السلام کے واقعہ کی ایک نظیر خود قرآن کریم میں بنی اسرائیل کا وہ واقعہ ہے جس میں کوہِ طور کو ان کے سروں پر معلق کر کے ان کو دنیا کے عذاب سے ڈرایا گیا، اور توبہ کرنے کا حکم دیا گیا، انہوں نے توبہ کر لی، تو وہ قبول ہوئی، عذاب ہٹ گیا تو یہ بنی اسرائیل کی توبہ ہو یا قوم یونس علیہ السلام کی ہو، یہ عذاب دنیوی ہے، اخروی نہیں ہے، پھر عذاب کے آنے سے پہلے ہونے والی توبہ ضابطہ کے مطابق ہے مخالف نہیں۔ [قرطبي]

حضرت یونس علیہ السلام کا مفصل واقعہ:

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ جس کا کچھ حصہ تو خود قرآن مجید میں مذکور ہے، اور کچھ روایات حدیث وتاریخ سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم عراق میں موصل کے مشہور مقام ''نینویٰ'' میں بستی تھی، ان کی تعداد قرآن کریم میں ایک لاکھ سے زیادہ بتلائی ہے، اس قوم کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت یونس علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، اور انہیں یہ حکم دیا کہ آپ ان کو توحید کا پیغام سنائیں، اور ایمان کی دعوت دیدیں، چنانچہ ان کی قوم نے ایمان لانے سے انکار کیا، اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو حکم دیا کہ عذاب آنے والا ہے، حضرت یونس علیہ السلام نے قوم میں یہ اعلان کر دیا، قوم نے آپس میں مشورہ کیا تو اس پر سب کا اتفاق ہوگیا کہ ہم نے کبھی یونس علیہ السلام کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا، اس لئے ان کی بات نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

مشورہ میں یہ طے ہوا کہ دیکھا جائے کہ یونس علیہ السلام رات کو اپنی جگہ ہمارے اندر مقیم رہتے ہیں تو یقین کرو کچھ نہیں ہوگا، اور اگر وہ یہاں سے کہیں چلے گئے تو یقین کرلو کہ صبح کو ہم پر عذاب آئے گا۔ حضرت یونس علیہ السلام بارشادِ خداوندی رات کو اس بستی ''نینویٰ'' سے نکل گئے، جب صبح ہوئی تو عذابِ الٰہی ایک سیاہ دھوئیں اور بادل کی شکل میں ان کے سروں پر منڈلانے لگا، اور آسمانی فضاء سے نیچے ان کے قریب ہونے لگا، تو ان کو یقین ہوگیا کہ اب ہم سب ہلاک ہونے والے ہیں، یہ دیکھ کر انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو نہ پایا اور تلاش شروع کی کہ توبہ کر کے ان کے ہاتھ پر مشرف بایمان ہوجائیں، اور پچھلے گناہوں اور انکار سے توبہ کرلیں۔

جب انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو نہ پایا تو خود ہی اخلاص نیت کے ساتھ توبہ واستغفار میں لگ گئے، بستی سے نکل کر ایک میدان میں آگئے، عورتیں بچے اور جانور سب اس میدان میں جمع کر دیئے گئے، ٹاٹ کے کپڑے پہن کر گڑگڑائے، اور خوب روتے رہے، اس میدان میں عجز وزاری کے ساتھ توبہ کرنے اور عذاب سے پناہ مانگنے میں

اس طرح مشغول ہو گئے کہ پورا میدان آہ و بکا سے گونجنے لگا، ربّ العزّت ''التواب الرحیم'' عزّوجل نے ان کی توبہ قبول فرمائی، اور عذاب ان سے ہٹا دیا، جیسا کہ آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

روایت کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کہ یہ عاشورا دسویں محرم کا دن تھا ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا﴾ [النساء:۱۴۷] (کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر، اگر تم حق کو مانو اور یقین رکھو اور اللہ تعالیٰ قدر داں ہے، سب کچھ جاننے والا ہے)۔ اللہ تعالیٰ تو سرکش گمراہوں کو عذاب دیتا ہے، جو لوگ حق وصداقت پر چلتے ہیں انہیں عذاب دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ادھر یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ عذاب سے قوم ہلاک نہ ہوئی تو واپس قوم کے پاس آنے میں حجاب محسوس ہوا، انہیں یہ معلوم نہ ہوا کہ پوری قوم مسلمان ہو چکی ہے، وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں، لہٰذا وہ وہاں سے چلے گئے اور دریا کے کنارے پہنچے، تو ایک کشتی میں سوار ہو گئے، کشتی روانہ ہو کر وسط دریا میں پہنچی تو اضطرابی حرکت کرنے لگی، ملاحوں نے سواریوں سے کہا کہ تم لوگوں میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو اپنے آقا کو چھوڑ کر بھاگ آیا ہے، لہٰذا ہم قرعہ ڈال لیتے ہیں جس کا نام نکلے گا اسے دریا میں ڈال دیتے ہیں، تین مرتبہ قرعہ ڈالا تو ہر بار حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں وہ غلام ہوں جو اپنے آقا کے فرمان کا انتظار کئے بغیر بھاگ آیا ہوں، لہٰذا انہوں نے چھلانگ لگا کر خود کو سمندر میں ڈال دیا، پہلے سے انتظار میں موجود بہت بڑی مچھلی نے ان کو نگل لیا۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوم کو چھوڑ کر چلے جانے کا حکم نہیں ہوا تھا اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ بھاگنے والا غلام میں ہی ہوں، کشتی کے سارے سواروں کو غرقاب ہونے سے بچانے کے لئے مجھے ہی اپنی جان کو سمندر میں ڈال دینا چاہیے، لہٰذا سمندر میں خود سے چھلانگ لگا دی۔

مچھلی کو حکم ہوا تھا یہ تمہاری خوراک نہیں، انہیں بغیر کسی تکلیف کے اپنے پیٹ میں حفاظت سے رکھنا۔ قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر آپ علیہ السلام کا اور مچھلی کے پیٹ کا تذکرہ فرمایا ہے، کبھی ذَالنُّون کے ساتھ، کبھی صَاحِبِ الْحُوْت کے ساتھ، دونوں کا ترجمہ مچھلی والا ہے۔ ان کا مچھلی کے پیٹ میں رہنے کا واقعہ سورۂ انبیاء رکوع (۶) اور سورۂ صافات (ع ۵) اور سورۃ القلم (ع ۲) میں مذکور ہے۔

سورۂ صافات میں کشتی میں سوار ہونے اور قرعہ ڈالنے اور پھر سمندر سے باہر ڈال دیئے جانے اور ان کے

اوپر کدو کا درخت ﴿شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ﴾ [الصافات:۱۴۶] (کدو کا درخت) اگا دینے کا، اور ان کی قوم کی تعداد ﴿مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ﴾ [الصافات:۱۴۷] (ایک لاکھ، یا زیادہ) کا تذکرہ ہے، اور وہاں یہ بھی فرمایا: ﴿فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ﴾ [ ] () جیسا کہ یہاں سورۂ یونس میں ایمان لانے پر عذاب ٹل جانے اور بعد میں کچھ زمانہ تک دنیا سے نفع حاصل کرنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ مزید تفصیل سورۂ انبیاء اور سورۂ صافات اور سورۂ نٓ والقلم میں دیکھیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ: اور اگر آپ کا ربّ چاہتا تو زمین میں جتنے بھی لوگ ہیں سارے کے سارے ایمان لے آتے کیا آپ لوگوں پر زبردستی کریں گے تاکہ وہ مومن ہوجائیں؟ ﴿۹۹﴾ اور کسی شخص سے یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ایمان لے آئے، اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر گندگی واقع کرتا ہے جو سمجھ نہیں رکھتے ﴿۱۰۰﴾ آپ فرمادیجئے: دیکھ لو آسمانوں میں اور زمین میں کیا چیزیں ہیں، اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے انہیں دلائل اور ڈرانے والی چیزیں نفع نہیں دیتیں ﴿۱۰۱﴾ سو کیا وہ یہ انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس انہیں لوگوں کے واقعات آجائیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ آپ فرمادیجئے کہ تم انتظار کرلو میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں ﴿۱۰۲﴾ پھر ہم اپنے رسولوں کو نجات دیتے ہیں اور اسی طرح ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہمارے ذمہ ہے کہ ہم ایمان والوں کو نجات دیں گے ﴿۱۰۳﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

درکارخانہ عشق از کفر ناگزیر ست ☆ دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

ان آیات میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں مؤمن بھی رہیں گے اور کافر بھی رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے ساتھ جزا وسزا کے لئے جنت اور دوزخ پیدا فرما کر یہی فیصلہ کیا کہ دنیا میں دونوں کے لئے کام کرنے والے

موجود ہوں، تاکہ کارخانۂ قدرت دونوں سے آباد رہے، یہی اس کی حکمت کا تقاضا ہے، اگر وہ چاہتا تو زمین پر بسنے والے سارے کے سارے ایمان لے آتے، مگر وہ یہ نہیں چاہتے۔ جب اللہ تعالیٰ کی حکمت کا فیصلہ اسی میں ہے کہ زمین پر مؤمن وکافر دونوں آباد ہوں تو آپ کو اس پر اصرار نہیں ہونا چاہیے کہ سب لوگ مؤمن ہو جائیں، کیا آپ زبردستی کر کے لوگوں کو مؤمن بنائیں گے؟

ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ زبردستی کر کے لوگوں کو مؤمن بنالیں، جو شخص مؤمن ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے اذن اور مشیت سے مؤمن ہوتا ہے۔ ہاں! یہ بات بھی ہے کہ جو لوگ عقل کو کام میں نہیں لاتے ایمان کی خوبی اور برتری انہیں ناپسند ہے، تو اللہ تعالیٰ کفر کی نجاست اور گندگی ان پر واقع کرتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾ [الصف:۵] (جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کردیا)۔ یا ﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ [النساء:۱۱۵] (اس کو ہم اسی راہ کے حوالے کردیں گے جو اس نے خود اپنائی ہے) یعنی اگر کوئی کفر وشرک کا دلدادہ ہے، اور اسلام سے منحرف ہے، تو ہم اسے پھیر دیں گے وہاں جدھر وہ پھرنا چاہتا ہے۔ پھر عام دعوت دیدی کہ تم غور اور فکر کرو اور دیکھو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کیا چیزیں ہیں؟

یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی توحید وصفات پر کھلی ہوئی چیزیں ہیں، یعنی دلیلیں ہیں، دلیلیں بھی ہیں اور ڈرانے والی وعیدیں بھی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں علیہم السلام اور کتابوں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں، لیکن عقل ودانش کو جن لوگوں نے معطل کیا ہوا ہے، یہ چیزیں ان کے لئے کارآمد نہیں ہیں، پس ان دلائل کے ہوتے ہوئے وہ ایمان نہیں لاتے، تو انہیں کس چیز کا انتظار ہے؟ کیا وہ اس انتظار میں ہیں کہ ان کے سامنے ایسے واقعات آجائیں جو ان سے پہلی امتوں کے واقعات گزر چکے ہیں، جنہوں نے کفر اختیار کر کے انبیاء ورسل علیہم السلام کی تکذیب کی، اور اس کی پاداش میں وہ ہلاک ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ﴾ ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار میں ہیں کہ مکذبین اور جھٹلانے والوں کا انجام سامنے آئے گا، کیونکہ کافر اور ظالم کے لئے کبھی فلاح نہیں، اور مؤمن کے لئے ہر صورت میں نجات اور فلاح متعین ہے۔

﴿ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ﴾ جب ہمارا عذاب آتا ہے تو ہم مکذبین پر عذاب کا کوڑا برساتے ہیں، اور انہیں ہلاک کردیتے ہیں (جیسا کہ فرعون اور اس کے جرار لشکر کے ساتھ ہوا)۔ پھر اپنے رسولوں

علیہم السلام کو اور ان کے ساتھ اہل ایمان کو نجات دے دیتے ہیں، کیونکہ:

﴿حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ﴾ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم اہل ایمان کو نجات دیتے ہیں، اس میں قیامت تک آنے والے اہل ایمان کے لئے بشارت ہے، اور یہ نجات و بشارت دنیوی بھی ہے اور اخروی بھی۔ اگر حَقًّا عَلَيْنَا کے کلمہ پر غور کیا جائے تو اتنا بڑا اعزاز اور تسلی ہے کہ جس کی حد نہ ہو۔

قُلْ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ
اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ
وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٥﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ
فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا
رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٧﴾

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کی طرف سے شک میں ہو سو میں ان لوگوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، لیکن میں اس کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں موت دیتا ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان والوں میں سے ہو جاؤں ﴿١٠٤﴾ اور یہ بھی حکم ہوا ہے کہ اپنی ذات کو اس دین کی طرف اس طرح سے متوجہ رکھوں کہ دوسرے سب طریقوں سے علیحدہ رہوں، اور یہ کہ ہرگز مشرکوں میں سے مت ہو جانا ﴿١٠٥﴾ اور تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مت پکار، جو تجھے نفع نہ دے سکے اور نہ ضرر دے سکے، سو اگر تو نے ایسا کیا تو بلاشبہ تو ظالموں میں سے ہو جائے گا ﴿١٠٦﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی تکلیف پہنچا دے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اسے دور کرنے والا نہیں، اور اگر وہ تیرے ساتھ خیر کا ارادہ فرمائے تو اس کے فضل کو کوئی بھی ہٹانے والا نہیں، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اپنے فضل سے نواز دے، اور وہ غفور ہے رحیم ہے ﴿١٠٧﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ عبادت کے لائق ہیں، خیر و شر، نفع و نقصان کا وہی مالک ہے:

ان آیات میں توحید کے بنیادی ارکان کا بیان ہے۔ پہلا یہ کہ عبادت کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور

کوئی نہیں۔ دوسرے یہ کہ نفع ونقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ تیسرے یہ کہ ملتِ ابراہیمی دینِ حنیف صرف اسلام ہے۔ چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین توحید ہے۔ پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر خیر وشر کا مالک ہے، اس کے کسی بھی حکم کو کوئی نہیں روک سکتا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آپ تمام انسانوں کو خطاب کر کے فرمادیں کہ تمہیں میرے دین کے بارے میں شک ہے تو یہ تمہاری گمراہی اور جہالت ہے کہ حق میں شک کرتے ہو، اور مشکوک و باطل بتوں کو حق سمجھتے ہو، یہ تمہارا پاگل پن ہے، تمہارے اس شک کا مجھ پر کوئی اثر کبھی بھی ہونے والا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن بے جان بے اختیار چیزوں کی تم عبادت کرتے ہو میں کبھی بھی ان کی عبادت نہیں کر سکتا۔ (یہ مضمون وہی ہے جسے سورۃ الکفرون میں بیان فرمایا)۔

اگر تم اس غلط فہمی میں ہو کہ (العیاذ باللہ) میں کبھی تمہارا دین قبول کرلوں گا، تو یہ تمہاری گمراہی، خام خیالی اور بھول ہے، میں تو اس ذات پاک کی عبادت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا جو تمہیں موت دیتا ہے (تہدید وتوبیخ کے طور پر صرف موت کو ذکر فرمایا) تم اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لئے فکر کرو، اگر تم نے دینِ توحید کو قبول نہ کیا اور شرک وکفر پر تمہاری موت آگئی تو تمہارا بیڑا غرق ہو جائے گا، اور ابدی دوزخ تمہارا ٹھکانا ہی ہے۔

﴿وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں شامل ہو جاؤں جو اہل ایمان ہیں۔ حنیف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت ہے، جو کہ تمام ادیان سے بیزار رہے، اور صرف اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف متوجہ اور مائل رہے۔ یہ بہت بڑا کمال ہے کہ پورے جہاں والوں سے بیزاری ہو اور صرف ربّ العزت سبحانہ کے ساتھ دوستی اور یاری ہو۔ ہمارے سردار سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی حنیفیت کے سرمایۂ سعادت ہیں، اور آیت کریمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اسی کا امر اور حکم ہو رہا ہے۔

سورۂ انعام میں اسی مضمون کو بہت پیارے انداز میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا، اور کہا: ﴿قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ﴾ [الأنعام:٥٦] (آپ فرمادیجئے کہ مجھے اس سے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کی تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، آپ فرمادیجئے کہ میں تمہاری خواہشوں کا اتباع نہیں کرتا، کیونکہ مجھے اس سے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کی تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمادیجئے کہ میں تمہاری خواہشوں کا

اتباع نہیں کرتا، کیونکہ اس حال میں تو میں بے راہ ہو جاؤں گا، اور ہدایت پر نہ رہوں گا)۔

﴿وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ اور مجھے یہ بھی حکم ہوا ہے کہ ہر طرف سے کٹ کر خالص دینِ توحید پر قائم رہنا، اور اسی دینِ توحید پر استقامت اختیار کرنا۔

﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت نہ کرنا جو تجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیں (عبادت کی صورت میں) اور نہ کوئی ضرر و نقصان پہنچا سکیں (بصورت عبادت نہ کرنے کے) اگر بالفرض تو نے ایسا کیا تو بلاشک ایسے حال میں تو ظالموں میں شمار ہوگا، یہاں ظالم سے مراد مشرک اور شرک ہے جیسے ارشاد ہے۔ ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان:۱۳] (بیشک شرک کرنا بڑا ظلم ہے)۔

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ﴾ اور اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی دکھ پہنچا دے تو اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو کوئی دور کرنے اور ہٹانے والا نہیں، اور اگر اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی خیر اور راحت پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی روکنے والا نہیں، لوٹانے والا نہیں۔

﴿يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ وہ اپنے بندوں کو دکھ، سکھ جب دینا چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے، اور وہی بڑی مغفرت اور رحمت والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خیر و شر دونوں اس کے قبضہ قدرت میں ہیں، پس تم ہمیشہ اس سے خیر کا سوال کرو، اور خیر کا راستہ جو کہ اسلام ہے اسے قبول کرو، اور شر سے اور شر کے راستہ کفر و شرک سے پرہیز کرو، توبہ کرو، اور تمام معاصی کو ترک کرو، تا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا صحیح طور پر مستحق بن جاؤ، اور ابدی سعادت جو کہ خیر ہی خیر ہے اس کو حاصل کرو۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ
لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ
مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

ترجمہ: آپ فرما دیجئے: اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس حق آ گیا ہے، سو جو شخص

ہدایت پا جائے وہ اپنی ہی جان کے لئے ہدایت پاتا ہے، اور جو شخص گمراہی میں رہے تو اس کی گمراہی اسی کے نفس پر پڑنے والی ہے، اور میں تم پر مسلط نہیں کیا گیا ۱۰۸ اور آپ اس کا اتباع کیجئے جس کی آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے، اور صبر کیجئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے، اور وہ فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ۱۰۹

معارف ومنازل

یہ سورۂ یونس کی آخری دو آیات ہیں۔ ان سے چار آیات پہلے عام انسانوں کو خطاب تھا، اور اب سورت کے ختم پر آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ تمام انسانوں سے فرمادیں کہ تمہارے ربّ کی طرف سے تمہارے پاس حق آپہنچا ہے، اسے بخوشی قبول کرو، اور میں تم پر مسلط نہیں کیا گیا ہوں کہ تم سے قبول کروا کر چھوڑوں، جو شخص بخوشی قبول کرے گا اور ہدایت کی طرف آئے گا اس کا نفع اسی کو دنیا وآخرت میں حاصل رہے گا، اور جو حق کو چھوڑ کر باطل پر جما رہے گا، اس کا وبال اسی کی جان پر ہوگا۔ ہر شخص اپنے نفع اور نقصان کا خود مالک اور انتخاب کنندہ ہے، زبردستی اور جبر کسی پر نہیں۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا کہ آپ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے آپ اس کا اتباع کیجئے، اتباع وحی میں دعوت وتبلیغ کا کام بھی ہے، اس کام کے انجام دینے پر جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کریں، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا انتظار کر لیجئے، وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے، جو حق کو تسلیم کرے گا اس کو ابدی نعمتوں سے نوازے گا، اور جو حق کو تسلیم نہیں کرے گا وہ ذلیل وخوار ہوگا۔

سُورَۃ ھُود

مکیۃٌ آیاتہا ۱۲۳ رکوعاتہا ۱۰

سورۂ ہود مکی ہے، اس میں ایک سوتیئس (۱۲۳) آیتیں، اوردس (۱۰) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۂ ہود ہے، جو اس سورت کی پچاسویں (۵۰) آیت میں موجود ہے، یہ نام اسی سے ماخوذ ہے (سورتوں کے نام توقیفی ہیں قیاسی نہیں) یہ ترتیبِ تلاوت میں گیارہویں سورت ہے، اور ترتیبِ نزول میں (۵۲) نمبر پر ہے۔

نزول:

سورۂ ہود بالاتفاق مکی ہے، مکی دور کے آخر میں اس کا نزول ہوا، اس سورت کی ایک سوتیئس (۱۲۳) آیات، اور دس رکوع ہیں۔ نیز یہ سورت ایک ہزار چھ سو پچیس (۱۶۲۵) کلمات، اور چھ ہزار نو سو پانچ (۶۹۰۵) حروف پر مشتمل ہے، اور اس کا نزول سورۂ یونس کے بعد ہے۔

ربط:

گزشتہ سورۂ یونس کے مضامین اور سورۂ ہود کے مضامین تقریباً قریب قریب ہیں، دونوں میں توحید باری تعالیٰ کا دلائل عقلیہ ونقلیہ سے اعلیٰ انداز پر اثبات کا بیان ہے، قیامت اور اس کی ہولنا کیوں، نیز صداقتِ قرآن اور اثبات وحقانیتِ رسالت، اور تذکیراتِ ثلاثہ وغیرہ کا بیان دونوں سورتوں میں ایک جیسے مضامین کا بیان ہے۔

☆☆☆

مختصر موضوع:

سورۂ ہود کا موضوع نہایت واضح ہے، اول سے آخر تک توحید باری تعالیٰ، رسالت، فرائضِ انبیاء علیہم السلام، اثباتِ قیامت، انبیاء علیہم السلام کے صبر وتحمل، اوران کی بردباری کا بیان، مکذبینِ توحید ورسالت کی ہلاکت اور تباہی کے واقعات، طوفان کا تفصیلی تذکرہ، نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے صبر واستقلال کا بیان، نیز استقامت کی ترغیب اور اس کی فضیلت کا بیان، صبر وتوکل کی ترغیب اور فوائد کا بیان، وغیرہ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍۙ ① اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِىۡ لَـكُمۡ مِّنۡهُ نَذِيۡرٌ وَّبَشِيۡرٌۙ ② وَّاَنِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُمَتِّعۡكُمۡ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤۡتِ كُلَّ ذِىۡ فَضۡلٍ فَضۡلَهٗ ؕ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنِّىۡۤ اَخَافُ عَلَيۡكُمۡ عَذَابَ يَوۡمٍ كَبِيۡرٍ ③ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ‌ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ④ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ يَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ لِيَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡهُ ؕ اَلَا حِيۡنَ يَسۡتَغۡشُوۡنَ ثِيَابَهُمۡ ۙ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ‌ ۚ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ⑤

ترجمہ: الرٰ یہ کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں پھر واضح طور پر بیان کی گئی ہیں حکمت والے باخبر کی طرف سے ہے ① یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو بیشک میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا ہوں اور بشارت دینے والا ہوں ② اور یہ بات کہ تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو پھر اس کے حضور میں توبہ کرو وہ تمہیں مقرر کردہ اجل تک خوش عیش زندگی دے گا اور ہر زیادہ عمل کرنے والے کو اس کا ثواب عنایت فرمائے گا، اور اگر تم اعراض کرو تو میں تم پر بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں ③ تم کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ④ خبردار وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ وہ اس سے چھپالیں، خبردار! جب وہ اپنے کپڑوں کو اوڑھ لیتے ہیں وہ اس وقت سب باتیں جانتا ہے جو پوشیدہ طور پر کرتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں، بلاشبہ وہ سینوں کے اندر کی چیزوں کو جانتا ہے ⑤

معارف ومنازل

حروف مقطعات پر سورۂ بقرہ کے شروع میں مفصل کلام ہو چکا ہے۔ سورۂ ہود کی ان ابتدائی آیات میں

صداقتِ قرآن اور صداقتِ رسالت کے ساتھ اچھے اور مدلل انداز پر توحید باری تعالیٰ کا اثبات ہو رہا ہے، اس کے ساتھ نیک اور برے اعمال کے ثواب وعقاب کا بھی تذکرہ ہے، اور اس کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ کے علمِ محیط، یعنی علمِ کلی اور علم غیب کا بھی ذکر ہے، جس کی وجہ سے قیامت کے روز ثواب وعقاب کا ترتب ہوگا، اور وعدو عید کے تقاضے پورے ہوجائیں گے، فرمایا:

﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾ یہ قرآن ایک ایسی بابرکت کتاب ہے جس کی آیتیں دلائل سے محکم کی گئی ہیں، پھر (اس کے ساتھ ساتھ) صاف صاف بیان کی گئی ہیں، یہ حکیم وخبیر جل جلالہٗ کی طرف سے ہے، اس کتاب میں خوب واضح طور پر یہ بتایا گیا ہے:

﴿اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ﴾ کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو، اور ساتھ ہی صداقتِ رسالت کا تذکرہ ہے:

﴿اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ﴾ بلاشبہ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا ہوں، اور بشارت دینے والا ہوں، یعنی شرک اور کفر کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں، اور توحید کے ثواب پر بشارت دینے والا ہوں، اب بشارت کو پہلے بیان فرمایا۔

﴿وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ﴾ پہلے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور توحید کا اقرار کرو، اور اس سے مغفرت طلب کرو، پھر اس کے حضور میں توبہ کرو، یعنی معاصی سے اجتناب کرو، اعمالِ صالحہ پیش کرتے رہو، چاہیے کہ استغفار اور توبہ نیز اعمالِ صالحہ پر دوام واستمرار ہو، جس پر آئندہ جملہ قرینہ ہے، یعنی:

﴿يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں خوش عیش اور اطمینان وسکونِ قلب والی زندگی عطا فرمائے گا۔

﴿اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ یہ خوش عیش اور راحت والی زندگی ایک وقت مقررہ تک تمہیں حاصل رہے گی، پھر جب تقدیر کے مطابق زندگی کے ایام پورے ہوں گے، اور موت آئے گی تو یہ عارضی چندروزہ خوشحال زندگی ابدی و سرمدی خوشحالیوں کی دائمی زندگی سے بدل جائے گی، بمطابق: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ [البقرة:٢٠١] (اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی اچھائی دے، اور آخرت میں بھی اچھائی دے)۔

واضح رہے کہ خوش حال زندگی مال وسرمایہ کا نام نہیں، بلکہ صبر وشکر کے ساتھ اطمینان قلبی اور روحانی فرحت و سرور کا نام ہے، جو کہ ہر متقی پرہیز گار مسلمان کو حاصل ہے، اگر چہ وہ مالدار نہ ہو۔ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [الرعد:٢٨] (جنہوں نے ایمان لایا، اور ان کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوں)۔

ہزاروں مسلمان ایسے ہیں کہ نانِ شبینہ پر قدرت نہیں رکھتے، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ ایمانی سرور واطمینان عطا کیا ہوا ہے کہ وہ سب سے زیادہ خوشحال صابر وشاکر نظر آتے ہیں، یہی اہل اللہ کی نشانی ہے کہ ان کی زندگی کا رخ صرف آخرت کی طرف ہے، بلکہ وہ ہر لمحہ اپنے فقر پر اور دنیا سے بے رغبتی پر لذت وخوشی محسوس کرتے ہیں، اور مالداروں کی زندگی پر انہیں ایسا رحم آتا ہے جیسا کہ کسی کو کسی سخت لاعلاج مریض پر رحم آجائے، پھر فرمایا:

﴿وَیُؤْتِ کُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ﴾ اور ہر فضیلت والے کو جو زیادہ اعمالِ صالحہ بجالائے اس کے اعمالِ فاضلہ کا زیادہ اجر وثواب عطا فرمائے گا، ثواب اگرچہ قلیل عمل کا بھی کئی گنا زیادہ ملے گا، مگر ترغیب کے طور پر فرمایا کہ جتنا ہی زیادہ عمل ہوگا اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا، پس تم زیادہ ثواب کمانے اور اونچے اونچے جنتی درجات کی تحصیل میں بکثرت اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرو۔ بشارت اور وعدہ کے بعد اب انذار اور وعید کا تذکرہ فرمایا:

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ كَبِیْرٍ﴾ اور اگر تم اس سے اعراض کرو جو میں نے تم کو بتایا، نہ توحید کو مانو، نہ رسالت کو، نہ قرآن کو اور نہ بشارت کو، تو مجھے خوف واندیشہ ہے کہ تم بڑے دن کے بڑے عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے، اور یہ ذہن سے نکالو کہ تم بڑے دن سے بچ جاؤ گے، نہیں نہیں بلکہ:

﴿اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ تمہیں بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا ہے، وہ بعد از موت دوبارہ زندہ کرنے پر اور اپنے پاس محاسبہ کے لئے اور سزا دینے پر بڑا قادر ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ﴿وَمَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ﴾ [القمر: ۵۰] (اور ہمارا امر ایک ہی ہے، جیسے آنکھ کی جھپک)۔ اور یوں فرمایا: ﴿فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾﴾ [النازعات] (بس وہ ایک زور کی آواز ہوگی، اور اچانک وہ کھلے میدان میں ہوں گے)۔ پھر فرمایا:

﴿اَلَاۤ اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَهُمْ ۙ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے علم محیط کی وسعت کا بیان ہے کہ وہ ہر کھلی چھپی چیز کو یکساں جانتا ہے، حتیٰ کہ دلوں اور قلوب کے اندر کے قصد وارادوں پر بھی مطلع رہتا ہے، پھر کوئی مجرم اپنے جرم کو اس سے مخفی رکھ کر ہرگز نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

ان آیات کریمہ کے شان نزول میں مفسرین کا اختلاف ہے، صحیح ترین روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بخاری شریف میں ہے کہ بعض مسلمانوں پر حیاء کا اس قدر حد سے زیادہ غلبہ ہوا کہ بول وبراز استنجاء اور جماع وغیرہ

ضروریاتِ بشریہ کے وقت بدن کے کسی حصہ کو ننگا کرنے سے شرماتے تھے، کہ آسمان والا ربّ العالمین ہم کو دیکھتا ہے، برہنہ ہونا پڑتا تو فرطِ حیاء سے جھکے رہتے، اور شرمگاہ کو چھپانے کے لئے سینہ کو دہرا کئے لیتے تھے، اس طرح کے آثار کبھی غایتِ تأدّب مع اللہ تعالیٰ اور غلبۂ حیاء سے پیدا ہو سکتے ہیں، اور صوفیاء کی اصطلاح میں ایسے لوگ مغلوب الحال کہلاتے ہیں۔

چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کسی مسئلہ میں ایسا غلو آئندہ امت کو پریشان کرسکتا تھا، اس لئے قرآن حکیم نے اس کی اصلاح فرمائی کہ اگر بوقتِ ضرورت بدن کھولنے میں اللہ تعالیٰ سے حیاء آتی ہے اور شرم محسوس کرتے ہو اس لئے جھکے جاتے ہو تو غور کرو کہ کپڑے پہننے کی حالت میں تمہارا ظاہر و باطن کیا خدا کے سامنے نہیں ہے؟ جب انسان اس سے کسی وقت بھی چھپ نہیں سکتا، پھر ضروریاتِ بشریہ کے متعلق حد سے زیادہ تعمق و غلو درست نہیں ہے۔

﴿اَلْجُزْءُ الثَّانِي عَشَرَ﴾

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ
مُّبِيْنٍ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ
اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ
هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا
يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

ترجمہ: اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں ہے جس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ ہو، اور وہ ہر ایک کے مستقل ٹھکانے کو اور عارضی ٹھکانے کو جانتا ہے، سب کچھ کتاب مبین میں ہے ⑥ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا فرمایا، اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے، اور اگر آپ ان سے کہیں کہ بیشک تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے، تو کافر لوگ ضرور یوں کہیں گے کہ بس یہ تو کھلا ہوا جادو ہے ⑦ اور اگر ہم تھوڑی سی مدت تک ان سے عذاب مؤخر کر دیں تو وہ ضرور یوں کہیں گے کہ عذاب کو کونسی چیز روک رہی ہے؟ خبردار! جس دن ان کے پاس عذاب آجائے گا تو وہ ان سے ہٹایا نہ جائے گا، اور جس کا وہ مذاق بنایا کرتے تھے وہ ان کو گھیر لے گا ⑧

معارف ومنازل

پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کو بتایا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، اب ان آیات میں اس کی رزاقیت اور خالقیت کا بیان ہے، ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ کہ زمین پر جتنے بھی چلنے پھرنے والے جاندار ہیں، انسان ہوں یا حیوان، چھوٹے ہوں یا بڑے، خشکی پر ہوں یا دریائی کیڑے مکوڑے، چرند، پرند، ان سب کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، یعنی ان ساری مخلوقات کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لگا لیا ہے، اور کس کو مجال ہے کہ ان بے شمار مخلوقات کے رزق اور دوسری ضروریات کو پورا کر سکے؟

حضرت سلیمان علیہ السلام سارے جہاں کی حکمرانی اور پیغمبری کے باوجود صرف ایک ہی مچھلی کی خوراک پوری نہ کر سکے، وہ بھی ایک وقت کے لئے، اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور مہربانی ہے، کیونکہ اس پر کسی کا کوئی حق اور رزق واجب نہیں ہے، اگر آپ اس کی رزاقیت کی گہرائی میں سوچیں گے اور مطالعہ کریں گے تو آپ کی عقل جواب دے گی، کیونکہ کائنات اور اس پر موجود مخلوقات کا احاطہ صرف اسی کے ساتھ خاص ہے، اسی کو فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعِمُونِ ﴿٥٧﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴿٥٨﴾﴾ [الذاریات] (اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے کسی قسم کا رزق نہیں چاہتا، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ اللہ تو خود ہی رزاق ہے، مستحکم قوت والا ہے)۔

تمام مخلوقات کے خالق و مالک کو کیا ضرورت کہ ان ضعیف و کمزور اور فقیر و مسکین بندوں سے اپنے لئے کوئی رزق طلب کرے یا انہیں یہ حکم دیدے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے رزق کا انتظام کرو، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، فرمایا: ﴿وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا﴾ کہ جتنے بھی چلنے پھرنے والے ہیں ان سب کی فہرست، نوعیت، خوراک، مقدارِ روزی اور ان کے ٹھکانے اور جائے استقرار و بود و باش وغیرہ سب اسے معلوم ہیں، اور اس کا علم سب پر محیط ہے، اور اسے دریاؤں، جنگلوں، صحراؤں اور فضاؤں میں بسنے والی مخلوقات کی جگہوں کا پتہ ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی کو بھول جائے، یا نظر انداز کر دے۔ یہاں تک کہ پہاڑوں میں رہنے والے کیڑے مکوڑے، چیونٹیوں کے سوراخوں میں بسنے والے اور ساتوں سمندروں کی تہہ میں بسنے والے ہر قسم کے جاندار اور حیوانات کا اسے پورا پورا علم حاصل ہے۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ساتوں سمندروں کی تہہ میں چلنے پھرنے والی چیونٹیوں کو دیکھتا بھی ہے، اور ان کے پاؤں کی آواز بھی سنتا ہے۔

مُسْتَقَر و مُسْتَوْدَع کی تفسیر:

ان دونوں کی تفسیر کئی طرح سے کی گئی ہے، ہم نے جو ترجمہ میں ان دونوں کا جو معنی اختیار کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی شانِ رازقیت کی توضیح سے قریب تر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین پر رہنے والوں کے ٹھکانے دو طرح کے ہیں: کچھ تو وہ ہیں جن میں ان کا مستقل قیام ہے، اور کچھ عارضی ٹھکانے ہیں، جہاں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ دونوں ٹھکانوں پر رزق پہنچاتا ہے، ایک جاندار صبح ایک علاقہ میں ہوتا ہے شام کو کئی ہزار میل دوسرے علاقہ میں

پہنچ جاتا ہے، تو اس کا رزق اس کے ساتھ گھومتا ہے۔

بعض چیزیں ایک براعظم میں پیدا ہورہی ہیں، اور دوسرے براعظم کے لوگ اسے کھا رہے ہیں، امریکہ کا سیب اور دوسرے پھل مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے لوگوں کی غذا بن رہے ہیں، جہاں بیس ہزار میلوں کا فاصلہ ہے، یہ روزانہ کا مشاہدہ ہے، اور اس طرح کی چیزوں کا حال سب کو معلوم ہے۔

صاحب روح المعانی نے بحوالہ مستدرک حاکم حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ مُسْتَقَر سے مراد ماں کا رحم ہے، اور مُسْتَوْدَعٌ سے موت آنے کے مواقع مراد ہیں۔

بعضوں نے کہا کہ مستقر رحمِ مادر ہے، اور مستودع باپ کی پیٹھ ہے۔ اسی طرح بعضوں نے مستقر حیاتِ دنیوی کو قرار دیا ہے، اور مستودع برزخ کو۔ بہرحال! یہ سب تأویلات ہیں، اور مطلب ان کا یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر مرزوق یعنی رزق پانے والے کی ابتدائی حالت کا علم ہے کہ اسے کس وقت سے رزق کی حاجت ہوتی ہے، اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی حاجت کب ختم ہوگی۔ یعنی موت کے ساتھ حاجت ختم ہوجاتی ہے، اور موت کب ہوگی، کہاں ہوگی، کس کیفیت میں ہوگی، اس وقت تک رزق کا سلسلہ جاری رہے گا۔

رزق مُقدَّر پورا کئے بغیر کسی کو موت نہ آئے گی:

رزق کی کمی بیشی، سختی فراوانی وغیرہ امور سب کا فیصلہ اسی وقت ہوچکا ہے جبکہ بچہ ماں کے پیٹ میں تھا، اسی طرح اجل وعمر کا اور ذکورت وانوثت اور سعادت وشقاوت کا۔ بعض چیزوں کا قضائے معلق کے ساتھ اور دس فیصد قضائے مبرم کے ساتھ۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے جتنا رزق کسی کے لئے مقرر فرمادیا ہے اس کو پورا کئے بغیر وہ دنیا سے نہیں جاسکتا، جتنا رزق مقدر ہے وہ مل کر ہی رہے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ میرے دل میں جبریل امین علیہ السلام نے یہ بات ڈال دی ہے (وحی کے ذریعہ) کہ اس وقت تک کسی کو موت نہیں آئے گی جب تک کہ وہ اپنا رزق پورا نہ کرے گا۔

فرمایا: لَنْ تَمُوْتَ نَفْسٌ حَتّٰی تَسْتَکْمِلَ رِزْقَهَا فَاتَّقُوا اللهَ وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ۔ کوئی شخص اپنا رزق مکمل کیے بغیر ہرگز نہیں مرے گا، سو تم لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور رزق طلب کرنے میں خوب کا خیال رکھو (حلال ذریعہ سے کماؤ) اور اگر رزق کے ملنے میں دیر ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کے ذریعہ طلب نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ

کا فضل اس کی نافرمانیوں کے ذریعہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ [رواہ الحاکم کمافي الترغیب]

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ رزق بندے کو اسی طرح طلب کرلیتا ہے جس طرح اسے موت طلب کرلیتی ہے۔ [رواہ البزار وابن حبان في صحیحہ کمافي الترغیب]

اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے اگر کوئی شخص اپنے رزق سے بھاگے تو وہ اسے پکڑ لے گا جیسا کہ اُسے موت پکڑ لے گی۔ [رواہ الطبراني في الأوسط و الصغیر کمافي الترغیب]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کھجور پڑی ہوئی دیکھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اٹھالیا، وہیں پر ایک سائل موجود تھا وہ کھجور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے عطا فرمادی، اور فرمایا کہ خبردار! اگر تو اس کے پاس نہ آتا تو یہ تیرے پاس آجاتی۔ [رواہ الطبراني بإسناد جید کمافي الترغیب]

اللہ تعالیٰ شانہ بے حد رحیم وکریم ہے، وہ دشمنوں کافروں کو بھی رزق وروزی اور اولاد عنایت کرتا ہے، اور فاسقوں وفاجروں کو بھی، کیوں نہیں، وہ تو سب کا خالق ومالک ہے۔

﴿كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ ہر جاندار کے لئے ان کا رزق وروزی اور تمام حالات کھلی کتاب لوح محفوظ میں لکھے ہوئے درج ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی قسمتیں لکھ دی تھیں، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اس وقت ربّ العزّت سبحانہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ [مسلم]

﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ﴾ اللہ تعالیٰ سبحانہ وہی ذات پاک ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔

﴿وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾ اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ اس مضمون کی تفصیل سورۂ بقرہ، اعراف اور سورۂ یونس میں گزر چکی ہے، وہاں دیکھی جائے۔

﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ اچھا عمل کرنے والا تم میں سے کون ہے، یعنی باوجود عالمِ کل ہونے کے پھر بھی جانچ کرنے والے ممتحن کی طرح تمہارے ساتھ معاملہ کرے گا، تاکہ تمہارا استحقاق ثواب وعذاب ظاہر ہوجائے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا تاکہ تم ان کو دیکھ کر اس

کی توحید پر استدلال کرو، اور اس نے جو تمہاری حاجت کو پورا کرنے کا سامان پیدا فرمایا ہے تم ان سے منتفع ہو کر اس کا شکر ادا کرو، اور اعمالِ صالحہ میں لگ جاؤ، اور بہتر سے بہتر عمل میں کوشش کرو، آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق تمہارے امتحان اور جانچ کے لئے ہے۔

﴿اَحۡسَنُ عَمَلًا﴾ فرمایا اکثر عملاً نہیں فرمایا، علماء امت نے اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ عمل اچھے سے اچھا ہونا چاہیے، اگرچہ مقدار میں کم ہو۔ اور ہر عمل میں اچھائی دو طرح سے آتی ہے: اول یہ کہ اس میں اخلاص ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب ہو۔ دوئم یہ کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہو۔ بہت سے لوگ عمل زیادہ کرتے ہیں لیکن اخلاص نہیں ہوتا، جو شرعاً مطلوب نہیں، یہ دونوں چیزیں ثواب کو کھو دینے والی ہیں۔ اکثر لوگوں کے عقائد اور اعمال میں شرک اور بدعات کا اختلاط ہوتا ہے، جن کے ہوتے ہوئے وہ ثواب اور شرفِ قبولیت سے محروم رہتے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۞ تَصۡلٰی نَارًا حَامِیَةً ۞﴾ [الغاشیۃ] (مصیبت جھیلتے ہوئے تھکن سے چور۔ وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے)۔ پوری تفصیل وہاں دیکھیں۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف عامل بنا کر بھیجا تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے کچھ وصیت فرمایئے، ارشاد فرمایا: "اَخۡلِصۡ دِیۡنَکَ یَکۡفِکَ الۡعَمَلُ الۡقَلِیۡلُ"۔ [الترغیب] تو اپنے دین میں اخلاص رکھ، تجھے تھوڑا عمل بھی کافی ہوگا۔

اس تشریح کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عمل کم کرے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اچھا عمل کرے خوبی کے ساتھ انجام دے، اچھا عمل اگر زیادہ ہو تو نور علی نور یہ بہت اچھی بات ہے، جیسے ابھی گزرا ﴿وَّیُؤۡتِ کُلَّ ذِیۡ فَضۡلٍ فَضۡلَهٗ﴾ کی تفسیر میں۔ مگر اگر عمل کی کثرت کی فکر میں حدودِ شرعیہ کا خیال نہیں رکھتے یہ اچھا نہیں ہوتا، پھر اس غیر شرعی کثرت سے وہ کم عمل بہتر ہوگا جو حدودِ شرعیہ کے مطابق ہو۔

﴿وَلَئِنۡ قُلۡتَ اِنَّکُمۡ مَّبۡعُوۡثُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡمَوۡتِ لَیَقُوۡلَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا سِحۡرٌ مُّبِیۡنٌ﴾ اگر آپ ان سے کہیں کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے، یعنی جس خالق عزوجل نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا ہے وہ تمہیں دوبارہ بھی پیدا کرے گا، تو صاف کہہ دیں گے کہ ہم اسے نہیں مانتے، حالانکہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر ضد و عناد اور سرکشی کی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر اور قرآن کریم کو کھلا جادو قرار دیتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جلدی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔

﴿وَلَىِٕنۡ اَخَّرۡنَا عَنۡهُمُ الۡعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعۡدُوۡدَةٍ لَّيَـقُوۡلُنَّ مَا يَحۡبِسُهٗ﴾ اور اگر ہم مدت معدودہ تک عذاب کو ملتوی کر دیں تو یہ لوگ یوں کہیں گے کہ اس کو کس نے روک رکھا ہے؟ اس بات کے کہنے سے ان کے دو مقصد تھے: ایک تو وعید کو جھٹلایا، اور مطلب یہ تھا کہ جو آپ ﷺ کہتے ہیں کہ عذاب آئے گا، اور ہمیں موردِ عذاب ٹھہراتے ہیں تو وہ آ کیوں نہیں رہا؟ اسے کس نے روک رکھا ہے؟ دوسرے آخرت کے بارے میں مطلب یہ تھا کہ جیسے دنیا میں عذاب کی وعیدیں سناتے ہیں اور عذاب نہیں آتا ایسے ہی موت کے بعد اٹھایا جانا ہے (دوبارہ زندگی) اور عذاب کا ہونا یہ بھی ایسی ہی بات ہے جو واقع ہونے والی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے فرمایا:

﴿اَلَا يَوۡمَ يَاۡتِيۡهِمۡ لَيۡسَ مَصۡرُوۡفًا عَنۡهُمۡ﴾ خبردار! جس دن ان کے پاس عذاب آجائے گا تو اسے ہٹایا نہ جائے گا۔

﴿وَحَاقَ بِهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ﴾ اور وہ چیز انہیں گھیر لے گی جس کا مذاق بناتے تھے، اگر کسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی گرفت میں دیر ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ عذاب کا وجود ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے عذاب نہیں آئے گا، اور میعاد مقررہ پر جب عذاب آ گیا تو ہرگز نہیں ٹلے گا۔

فائدہ:

امت کا لفظ قرآن وحدیث میں بہت سے معانی کے لئے مستعمل ہے: (۱) بمعنی مدت جیسے اس آیت میں، اور سورۂ یوسف میں فرمایا: ﴿وَادَّكَرَ بَعۡدَ اُمَّةٍ﴾ [یوسف:۴۵] (اور یاد آیا ایک مدت کے بعد) بمعنی مدت۔ (۲) بمعنی امام کے، جیسے: ﴿اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا﴾ [النحل:۱۲۰] (بیشک ابراہیم امام تھے فرمانبردار)۔ (۳) ملّت اور دین کے معنی میں، جیسے مشرکین نے کہا تھا: ﴿اِنَّا وَجَدۡنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ﴾ [الزخرف:۲۲] (ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے ایک دین پر)۔ (۴) جماعت کے معنی میں، جیسے فرمایا: ﴿وَجَدَ عَلَيۡهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسۡقُوۡنَ﴾ [القصص:۲۳] (کنویں پر لوگوں کی ایک جماعت پائی جو پانی پلا رہے تھے)۔ (٦) قوم کے معنی میں، جیسے: ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلٌ﴾ [یونس:۴۷] (ہر قوم کے لیے ایک رسول ہیں)۔ یا ﴿كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ﴾ [آل عمران:۱۱۰] (تم بہترین قوم ہو) جس میں مؤمن کافر سب داخل ہیں۔ پھر امتِ اجابت اور امتِ دعوت الگ الگ شمار ہوں گی۔ (٦) گروہ اور طائفہ کے معنی میں، جیسے: ﴿وَمِنۡ قَوۡمِ مُوۡسٰۤى اُمَّةٌ﴾ [الأعراف:۱۵۹] (اور موسیٰ کی قوم

میں سے ایک گروہ ہے)۔یا ﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ﴾ [آل عمران: ۱۱۳] (اہل کتاب میں سے ایک گروہ ہے)۔[ابن کثیر اختصارًا]

وَلَىِٕنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱

ترجمہ: اور اگر ہم انسان کو اپنی رحمت چکھادیں پھر ہم اسے اس سے چھین لیں، تو وہ ناامید ناشکرا ہوجاتا ہے ۝۹ اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی تھی ہم اسے نعمت چکھادیں تو وہ کہتا ہے کہ میری ساری بدحالیاں دور ہوگئیں، بیشک وہ اترانے لگتا ہے شیخی بگھارتا ہے ۝۱۰ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے صبر کو اختیار کیا، اور نیک کام کرتے رہے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے مغفرت ہے، اور بڑا اجر ہے ۝۱۱

معارف ومنازل

دکھ اور درد میں صبر کرنا مغفرت کا باعث ہے:

لوگوں کے مزاجوں میں اور طرزِ عمل میں جو خامیاں ہیں انہی کا بیان ہے، مگر اہل ایمان ان سے مستثنیٰ ہیں، وہ یہ کہ راحت کے بعد کی سختی پر مایوس اور ناامید ہوجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کرکے آئندہ کے لئے بھلائی کو بھول بیٹھتے ہیں، گویا کہ نہ کبھی اس سے پہلے کوئی آرام دیکھا تھا، نہ اس کے بعد کسی راحت کی امید ہے۔ یہی حال اس کے برخلاف بھی ہے کہ اگر سختی کے بعد آسانی ہوگئی تو کہنے لگتے ہیں کہ بس اب برا وقت ٹل گیا، اپنی حالت پر اور اپنے پاس کی چیزوں پر مست وبے فکر ہوجاتے ہیں، اترانے لگتے ہیں، شیخی وغرور کرتے ہیں، اور آگے کسی سختی کی آمد سے بالکل مطمئن ہوجاتے ہیں، اور ناشکری اختیار کرتے ہیں، اور اپنے کو دوسروں سے بڑا خیال کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ نہ سختی پر صبر، اور نہ آسانی وراحتوں پر شکر، یہ عام انسانوں کا مزاج ہے۔

البتہ اہل ایمان اس قسم کی بے صبری اور ناشکری سے مستثنیٰ ہیں، فرمایا:

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ﴾ ہاں ہاں! وہ لوگ

ایسے نہیں ہوتے جو صبر کرتے ہیں، اور نیک عمل کرتے ہیں، یہ لوگ مصیبت کے آنے پر اور نعمت کے جانے پر صبر کرتے ہیں، اور اعمالِ صالحہ میں مشغول رہتے ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بھی ہے، یہ لوگ کسی بھی مرحلے میں اللہ تعالیٰ سے ناامید نہیں ہوتے ہیں، اور اس کی نعمتوں پر غرور اور شیخی وتکبر نہیں کرتے ہیں، وہ صبر وتوکل اور شکر کو حرزِ جان سمجھتے ہوئے نہ خود کو بڑا کہتے ہیں، اور نہ ہی دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

یہ ہے رضا بالقضاء، جسے ایمان کی علامت قرار دیا گیا، اور مؤمنوں کو اس عظیم الشان نعمت سے نوازا گیا، تو انعام یہ ملا کہ مغفرت ملی اور اجر عظیم کے مستحق ٹھہرے۔

دعاء:

ہماری درخواست ہے کہ اے تمام کائنات کے مالک! ہمیں ایسے بندوں میں شامل فرما۔آمین

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعۡضَ مَا يُوۡحٰۤى اِلَيۡكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدۡرُكَ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِ كَنۡزٌ اَوۡ
جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ نَذِيۡرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ وَّكِيۡلٌ ﴿۱۲﴾ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا
بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمۡ
يَسۡتَجِيۡبُوۡا لَـكُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اُنۡزِلَ بِعِلۡمِ اللّٰهِ وَاَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: سو ایسا ہونے والا تو نہیں ہے کہ آپ ان احکام میں سے بعض احکام کو چھوڑ دیں جو آپ کے پاس وحی کے ذریعہ بھیجے جاتے ہیں، اور اس بات سے آپ کا دل تنگ ہو رہا ہے کہ وہ یوں کہہ رہے ہیں کہ ان پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا؟ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا اختیار رکھنے والا ہے ﴿۱۲﴾ کیا وہ یوں کہتے ہیں کہ اس نے خود سے بنا لیا ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ تم اس جیسی دس سورتیں لے آؤ جو بنائی ہوئی ہوں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا جس کو بھی بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو ﴿۱۳﴾ سو اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو یقین کر لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق اتارا گیا ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو کیا تم اسلام قبول کرنے والے ہو؟ ﴿۱۴﴾

معارف ومنازل

ابھی گزرا کہ ایمان والے صابر وشاکر رہتے ہیں، اور وہ اپنے پاکیزہ ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں، اور کبھی ناامید نہیں ہوتے، اس کے ساتھ متصل آپ ﷺ کو خطاب ہو رہا ہے کہ ساری خدائی ایک طرف اور آپ کی شان عالی ایک طرف، آپ کو جو مرتبہ ومقام حاصل ہے وہ بہت اونچا ہے، آپ سید الشاکرین اور رئیس الصابرین ہیں، لوگوں کے طعن وتشنیع سے نہ تنگ دل ہوں، اور نہ خاطر پر کوئی بوجھ محسوس کریں، آپ کا کام انذار ہے، آپ اپنے کام میں ہر لحہ مشغول رہیں، اور فرضِ منصبی میں سستی نہ کریں۔

یہ کبھی کہتے ہیں کہ یہ بشر کیوں ہے؟ اگر یہ رسول ہے تو کھانے پینے کا محتاج کیوں ہے؟ بازاروں میں کیوں آمد ورفت کرتا ہے؟ اس کی تائید کے لئے کیوں کوئی فرشتہ نہیں اترا؟ اسے کوئی خزانہ کیوں نہیں دیا گیا؟ اس کے کھانے کے لئے کسی خاص باغ کا کیوں انتظام نہیں ہوا؟ آپ ﷺ کو ساحر، مسحور، مجنون وغیرہ سب کچھ کہا گیا، جتنے منہ اتنی باتیں۔

ارشاد فرمایا، اور تسلی دیدی، اور دلاسا دیا گیا کہ آپ بے فکر ہی رہیں، آپ ملول خاطر نہ ہوں، آزردہ دل نہ ہوں، اپنے کام میں لگے رہیں، آپ اپنے مالک کی حفاظت میں ہیں، اس کی نظر میں ہیں، آپ کا دین کرۂ ارض پر پھیل کر چکے گا، فتح ونصرت آپ کے قدموں کی زیارت وقدم بوسی کے لئے منتظر ہے۔ ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ [الکوثر:۳] (بیشک تمہارا دشمن ہی وہ ہے جس کی جڑ کٹی ہوئی ہے)۔ آپ کے دشمنوں کے مقدر میں سوائے رسوائی اور ذلت کے کچھ بھی نہیں۔ آپ ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ [الانشراح:۴] (اور ہم نے تمہاری خاطر تمہارے تذکرے کو اونچا مقام عطا کر دیا ہے) کے علمبردار تو ہیں۔ ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف:۳۵] (تم اسی طرح صبر کیے جاؤ جیسے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا ہے)۔

آپ اپنے سے پہلے رسولوں علیہم السلام کو دیکھیے، سب جھٹلائے گئے، ستائے گئے، طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے، مگر صابر رہے، ثابت قدم رہے، آپ ان سب کے سالار اور امام ہیں۔ (ﷺ) تو فرمایا:

﴿فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ﴾ آپ تنگدلی کی وجہ سے بعض ان چیزوں کو چھوڑ تو نہ بیٹھیں گے جو آپ کی طرف وحی کی گئی ہیں، اور وہ کافروں کو ناگوار ہیں، اور چونکہ آپ انہیں شتر بے مہار کی طرح چھوڑ کر کبھی ایسا نہیں کر سکتے، لہٰذا تنگدل ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ:

﴿اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ﴾ آپ صرف ڈرانے والے ہیں، اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ کی کوئی ذمہ داری نہیں، آپ نے اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچادیا، آپ کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا اختیار ہے، یہ لوگ معجزات کی فرمائش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ ان کی مرضی کے مطابق معجزات ظاہر فرمائے، یا ظاہر نہ فرمائے، جو معجزات سامنے ہیں کیا وہ کم ہیں؟ جسے ماننا نہیں وہ فرمائشی معجزہ دیکھ کر بھی نہ مانے گا، انہوں نے شق القمر جیسے معجزے کی فرمائش کی جب وہ ظاہر ہوا تو بھی منحرف ہو کر اسے جادو اور سحر بتایا۔

ان کے سامنے جو معجزے موجود ہیں ان میں قرآن مجید بہت بڑا معجزہ ہے، اس قرآن کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ آپ نے اسے خود سے بنایا ہے، پس آپ ان سے فرما دیجئے کہ تم اس جیسی دس سورتیں اپنی بنائی ہوئی لے آؤ، اور اللہ تعالیٰ کے سوا جس جس کو چاہو اپنی مدد کے لئے بلالو، اور اس کے مقابلے میں پیش کرو، اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنایا ہوا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو تم ہی میں سے ایک فرد ہیں، جنہوں نے کسی انسان سے کچھ بھی نہیں پڑھا، تم سارے فصحاء بلغاء ہو، قرآن جیسی دس سورتیں بنائی ہوئی لے آؤ، بیس تیس افراد نہیں، بلکہ جس جس کو چاہو ان سے تعاون حاصل کر کے اس کام کے لئے بلالو، اور اپنے ساتھ ملالو۔

یہ بہت بڑا چیلنج ہے، جسے آج تک کسی فرد اور کسی تنظیم یا قوم نے قبول نہیں کیا، جس کے سامنے بات آئی ہر ایک نے کان پکڑ کر اپنے عجز کا اعتراف کیا۔

پہلے دس سورتیں بنانے کا چیلنج کیا گیا تھا، پھر ایک سورت بنا کر لانے کے لئے فرمایا گیا؛ پھر بھی کسی سے کچھ نہ ہوسکا۔ درحقیقت قرآن کریم بہت بڑا معجزہ ہے، اور قیامت تک کے لئے دائمی اور بین الاقوامی معجزہ ہے، جس کا چیلنج پورے جہاں کے تمام اقوام کے لئے ہے۔

﴿فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا﴾ اگر یہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو سمجھ لو کہ وہ جھوٹے ہیں، اور قرآن کسی انسان کا بنا ہوا نہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ نازل ہوا ہے، اور یہ بھی جان لو کہ حق تعالیٰ شانہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

اس مضمون پر مفصل کلام سورۂ بقرہ رکوع (۳) میں گزر چکا ہے، وہاں دیکھیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿١٥﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦﴾ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا
وَّرَحْمَةً ۭ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ
مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٧﴾

ترجمہ: جو شخص دنیا کو اور اس کی زینت کو چاہتا ہے ہم اس کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پوا ردے دیں گے، اور اس میں ان پر ظلم نہ ہوگا ﴿١٥﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے علاوہ کچھ نہیں ہے، اور دنیا میں انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ سب برباد ہو گیا، اور جو کچھ کرتے تھے وہ سب باطل ہو گیا ﴿١٦﴾ جو شخص قرآن پر قائم ہے جو اس کے ربّ کے پاس سے آیا ہے، اور اس کے ساتھ اسی میں سے گواہ بھی ہے، اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی، کیا منکر آدمی اس کے برابر ہو سکتا ہے؟ یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور جماعتوں میں سے جو شخص اس کا منکر ہو سو دوزخ اس کی جگہ ہے جس میں اس کے بھیجنے کا وعدہ ہے، سوائے مخاطب! تو اس کے بارے میں شک میں نہ پڑ، بیشک وہ تیرے ربّ کی طرف سے حق ہے، اور بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿١٧﴾

معارف و منازل

سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾﴾ [البقرۃ] (اب بعض لوگ تو وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما، اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اور انہی میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما، اور آخرت میں بھی بھلائی، اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنے اعمال کی کمائی کا حصہ ملے گا، اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے)۔

سورۂ نساء میں فرمایا: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

سَمِيۡعًاۢ بَصِيۡرًا﴾[النساء: ۱۳۴] (جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہے اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب موجود ہے۔ اللہ ایسا ہے کہ ہر بات کو سنتا ہے، اور ہر چیز کو جانتا ہے)۔

اور سورۂ بنی اسرائیل میں زیادہ وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا: ﴿مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ الۡعَاجِلَةَ عَجَّلۡنَا لَهٗ فِيۡهَا مَا نَشَآءُ لِمَنۡ نُّرِيۡدُ ثُمَّ جَعَلۡنَا لَهٗ جَهَنَّمَ‌ ۚ يَصۡلٰٮهَا مَذۡمُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا‏۝۱۸ وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَاُولٰٓـئِكَ كَانَ سَعۡيُهُمۡ مَّشۡكُوۡرًا‏۝۱۹﴾ [الإسراء] (جو شخص دنیا کے فوری فائدے ہی چاہتا ہے تو ہم جس کے لئے چاہتے ہیں جتنا چاہتے ہیں اسے یہیں پر جلدی دے دیتے ہیں۔ پھر اس کے لیے ہم نے جہنم رکھ چھوڑی ہے، جس میں وہ ذلیل وخوار ہو کر داخل ہوگا۔ اور جو شخص آخرت چاہے اور اس کے لیے ویسی ہی کوشش کرے جیسی اس کے لیے کرنی چاہئے، جبکہ وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش کی پوری قدردانی کی جائے گی)۔

جو لوگ صرف متاعِ دنیا کے لئے سرگرداں ہیں، اور آخرت پر یقین نہیں رکھتے، یا اسے عبث سمجھتے ہیں، یہ لوگ وہ ہیں جنہیں قرآن کریم: ﴿لَا يَعۡلَمُوۡنَ، لَا يَشۡعُرُوۡنَ، لَا يَعۡقِلُوۡنَ، لَا يَفۡقَهُوۡنَ﴾ کہتا ہے۔ فرمایا:

ربّ العزّت انہیں اپنی حکمت ومصلحت کے موافق دنیا میں ہر قسم کا سامانِ زینت نعمت وخوشحالی دیدیتے ہیں، تاکہ ان کی جدوجہد اور فانی نیکیوں کا فانی چار روزہ پھل ان کو مل جائے، اور اگر آخری سعادت مقدر نہیں، تو شقاوت کا پیمانہ پوری طرح لبریز ہو کر نہایت ذلّت ورسوائی کے ساتھ دوزخ کے ابدی جیل خانہ میں دھکیل دیئے جائیں۔ ان کے مقابل ان عقلمندوں اور دور اندیش مؤمنوں کا تذکرہ ہے کہ جنہوں نے دنیا کو ایک راہ گزر سمجھ کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتلائے ہوئے فرمودات پر عمل کیا، اور آخرت کو اپنی اصلی منزل سمجھ کر اس کی خاطر جدوجہد جاری رکھی، اور ثواب کے کاموں میں مشغول رہا، دنیاوی فانی لذتوں اور چار روزہ عیش وعشرت سے بغاوت کی، تو ربّ الجلیل عزّ سبحانہ کے حضور ان کی بڑی پذیرائی اور قدردانی ہوگی، اور انہیں وہ سب کچھ ملے گا جو دنیا والوں کے وہم وگمان سے بالاتر ہوگا۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سرورِ عالم ﷺ کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، اس وقت آپ ﷺ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے، آپ ﷺ کے نیچے کوئی بچھونا نہیں تھا، اور آپ ﷺ کے پہلو مبارک پر چٹائی کی لکیروں کے نشانات نمایاں تھے، اور تکیہ بھی چمڑے کا تھا، جس میں کھجور کی چھال بھری تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ دعا کیجئے تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو مالی وسعت عطا فرمائے، کیونکہ فارس و

روم کے لوگوں (دشمنانِ خدا) کو مالی وسعت حاصل ہے، اور آپ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول ہیں، آپ کا یہ حال ہے۔

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اے خطاب کے بیٹے! تم ابھی تک ان ہی خیالات میں مبتلا ہو؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی مرغوب چیزیں ان کو دنیا ہی میں دی گئی ہیں۔ ایک اور روایت میں یوں ہے کہ کیا تم لوگ اس پر راضی نہیں ہو کہ مرغوب چیزیں ان کے لئے دنیا میں ہوں، اور ہمارے لئے آخرت میں ہوں؟ [بخاري]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی مؤمن کی ایک نیکی کے عوض میں بھی کمی نہیں فرمائے گا، اس کی وجہ سے دنیا میں بھی عطا فرمائے گا (مال، عزّت، توفیق، عبادات، خوشحالی وغیرہ) اور آخرت میں بھی عنایت فرمائے گا، لیکن کافر نے جو نیکیاں کیں جس میں اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کا دھیان رکھا ان نیکیوں کے عوض اللہ تعالیٰ اسے صرف دنیا ہی میں دے دیتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے پاس ایک نیکی بھی نہ ہوگی کہ جس پر اسے ثواب دیا جائے۔ [مسلم]

کافر دنیا میں کچھ ایسے عمل کرتے ہیں جو نیکی کی فہرست میں آسکتے ہیں، مثلاً مریضوں کا مفت علاج کر دیا، شفا خانے بنوا دیئے، سڑکیں بنائیں، پانی کی سبیلیں لگا دیں، غریبوں کو کھانے کھلائے، وغیرہ، وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے ہمیں عذاب نہیں ہوگا، اور ہمیں ان اعمال کا ثواب ہی ملے گا، تو قیامت کے روز انہیں بتا دیا جائے گا کہ دنیا میں جو نیک عمل کیا اس کا بدلہ تمہیں دنیا ہی میں دیا گیا، اور کفر و شرک اور دوسرے معاصی کی وجہ سے تمہارے لئے عذاب ہی عذاب ہے، پس جن لوگوں نے آخرت کو چھوڑ کر دنیا میں توحید سے منحرف ہو کر دنیاوی لذّتوں، آرام و آسائش اور ہر قسم کی خوشحالی کا انتخاب کیا، اور حقوق اللہ وحقوق الرسول ﷺ اور حقوقِ شریعت سے بغاوت کی، تو اگر یہ لوگ کچھ نیک اعمال بھی انجام دیں تو ان کی نیکیاں آخرت میں ضبط اور ناکارہ ہو جائیں گی، ان کا پہاڑ جتنا عمل رائی کے برابر بھی ثواب کا استحقاق حاصل نہ کر پائے گا۔

یہی دنیا ان کی جنت ہے، جتنے چاہیں مزے اُڑائیں، خوب عیش کریں، ان سے کہا جائے گا: ﴿أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا﴾ [الأحقاف: ۲۰] (تم اپنی صوری نیکیوں کے مزے دنیا میں لے چکے، اور وہاں کی لذّتوں سے خوب فائدہ اٹھایا) اب یہاں کی عیش وعشرت میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، یہاں تمہارے لئے کچھ بھی نہیں۔

﴿أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ﴾ یہ ہمزہ استفہامِ انکار کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک وہ شخص

ہے جو قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہے، اور اس پر ایمان لایا ہے، اور اس کے پاس قرآن کریم کی سچائی کے دو گواہ موجود ہیں، کیا وہ شخص اس دوسرے شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو قرآن کا منکر ہے؟ تو ظاہر ہے کہ یہ دونوں کبھی برابر نہیں۔ مفسرین نے اسی طرح عبارت محذوف مان کر تفسیر کی ہے، جیسے فرمایا: ﴿أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ﴾ [القلم:۳۵] (کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟)۔

اب رہا یہ کہ وہ دو گواہ کون ہیں؟ بعضوں نے کہا کہ پہلا گواہ حضرت جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، دوسرا گواہ توریت شریف ہے۔ بعضوں نے کہا کہ پہلے گواہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، دوئم گواہ توریت شریف ہے۔ بعضوں نے کہا کہ اول گواہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں، دوئم توریت شریف ہے، یہ قول حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ضعیف ہے۔

مگر صاحب مظہری اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک صحیح ہے۔ [دیکھو مظہری] آخری قول یہ ہے کہ اول گواہ خود قرآن مجید کے اندر ہے، یعنی اس کا اعجاز اور اس کی فصاحت و بلاغت، اور دوسرا گواہ دنیا میں قرآن کریم کے آنے سے پہلے ہی موجود ہے، یعنی تورات شریف، جو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی تھی، جیسے ارشاد ہے:

﴿وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً﴾ وہ امام بھی ہے اور رحمت بھی، اور احکامِ قرآنیہ کی تصدیق بھی کرتی ہے، اور امتثالِ اوامرِ الٰہیہ پر جو ثواب ملنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے وہ تورات میں بھی ہے، اور قرآن مجید میں بھی تورات اس کی تصدیق کرتی ہے، لہٰذا وہ سراپا رحمت ہے۔

﴿أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ یہ لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں۔ صاحب معالم التنزیل فرماتے ہیں کہ ان ایمان لانے والوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ تمام مسلمان مراد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ﴾ اور کافروں کی جماعتوں اور گروہوں میں سے جو شخص قرآن کریم کا منکر ہو اس سے یہ وعدہ ہے کہ وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔

﴿فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ﴾ تو اے مخاطب! تو قرآن کریم کی طرف سے شک میں مت پڑ۔

﴿اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ بیشک وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے۔

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ لیکن بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اس میں واضح طور پر بتا دیا کہ اہل اسلام کے علاوہ جتنے بھی گروہ اور جماعتیں ہیں وہ سب دوزخی ہیں، اور دوزخ میں جانے والے ہیں، بِقَوْلِهٖ تَعَالٰى: ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [آل عمران: ۸۵] (جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی دین کا طالب ہو تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں ہوگا، اور وہ آخرت میں خسارہ والوں میں سے ہوگا) خواہ بظاہر کیسے ہی اچھے عمل کرنے والے ہوں، اور خواہ اپنے دین کو آسمانی دین بتاتے ہوں، جیسے یہود ونصاریٰ۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جان ہے، میرے نبی ہونے کی خبر جس کسی انسان کو بھی پہنچے گی اور وہ میرے اُس دین پر ایمان لائے بغیر مر جائے گا جو دین میں لے کر بھیجا گیا ہوں وہ ضرور دوزخ والوں میں سے ہوگا چاہے، یہودی ہو یا نصرانی۔ [مسلم]

یہود اور نصاریٰ کا ذکر خصوصیت سے اس لئے فرمایا کہ وہ اپنے پاس دینِ سماوی کے مدّعی ہیں، اس لئے فرمایا: "لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اتِّبَاعِيْ"۔ اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے، اور میری بعثت کا زمانہ پالیتے، تو میری اتباع کے بغیر ان کو کوئی چارہ نہیں ہوتا، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے تمام ادیان منسوخ ہو گئے، اور قابلِ اتباع نہ رہے، اور نہ ہی قابلِ نجات رہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا؟ یہ لوگ اپنے ربّ پر پیش کئے جائیں گے، اور گواہی دینے والے کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ربّ کی طرف نسبت کر کے جھوٹ بولا، خبردار! ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ⑱ جو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے رہے، اور اس میں کجی تلاش کرتے رہے، اور یہ لوگ آخرت کے منکر ہیں ⑲ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں عاجزی کرنے والے نہ تھے، اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں ہے، ان کو دوہرا عذاب دیا جائے گا، یہ لوگ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اور نہ دیکھتے تھے ⑳ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں کو برباد کر بیٹھے، اور وہ جو کچھ انہوں نے جھوٹ بنایا تھا وہ سب غائب ہوگیا ㉑ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارے میں ہوں گے ㉒ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور اپنے ربّ کی طرف جھکے، یہ لوگ جنت والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ㉓ دونوں فریق کی مثال ایسی ہے جیسا اندھا اور بہرا، اور دیکھنے والا اور سننے والا، کیا دونوں حالت کے اعتبار سے برابر ہوں گے؟ کیا تم نہیں سمجھتے؟ ㉔

معارف ومنازل

ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، اور مؤمنوں کے لئے مغفرت ہے:

مشرکین اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے تھے، اور اس کے لئے شریک ٹھہراتے تھے، یہی حال یہود و نصاریٰ کا بھی تھا، اور جب انہیں اس بارے میں نصیحت کی جاتی تھی تو کہتے تھے: ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس:۱۸] (یہ بت اللہ تعالیٰ کے حضور ہمارے لئے سفارشی ہیں) اور یہ بھی کہتے رہتے تھے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر:۳] (ہم ان کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں گے)۔

ظاہر ہے کہ یہ باطل عقیدہ ان کا اپنا تجویز کردہ ہے، اور یہ بھی کہتے تھے کہ: ﴿وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا﴾ [الأعراف: ۲۸] (ایسا کرنے کا ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا ہے) حالانکہ یہ سراسر جھوٹ اور اللہ تعالیٰ پر افتراء اور بہتان ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک سارے انبیاء کرام علیہم السلام کی یہی تعلیم رہی ہے کہ: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [الصافات:۳۵] (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں)۔ ﴿لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ [الاخلاص] (نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں)۔

پس ان کے عقائد سارے باطل ہیں، اور اللہ تعالیٰ پر افتراء و بہتان ہے، ان کے ان مذموم ومنگھڑت اور باطل عقائد کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو یہ بات بتائی گئی ہے، حالانکہ ربّ العزّت وحدہٗ لاشریک لہٗ کی طرف سے ایسی کوئی بات کبھی بھی نہیں بتائی گئی، بلکہ تمام انبیاء ورسل علیہم السلام اور آسمانی کتابیں اس قسم کے عقائد کا مسلسل ہر زمانے میں تردید فرماتے رہے ہیں، اور ہر قسم کے شرکیہ عقائد کی پرزور نفی فرماتے رہے ہیں، اس لئے ارشاد ہوا کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر افتراء کرے؟ اور مالک الملک عزّوجل پر جھوٹ باندھے؟ اور دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۝﴾ [مریم] یعنی یہ ایسی بھاری بات کہی گئی اور ایسا سخت گستاخانہ کلمہ منہ سے نکالا گیا جسے سن کر اگر آسمان وزمین اور پہاڑ مارے ہول کے پھٹ پڑیں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں تو کچھ بعید نہیں، اس گستاخی پر اگر غضبِ الٰہی بھڑک اٹھے تو پورا عالم تہ وبالا ہو جائے، اور آسمان وزمین تک کے پرخچے اُڑ جائیں۔ محض اس کا حلم مانع ہے کہ ان بیہودگیوں کو دیکھ کر دنیا کو ایک دم تباہ نہیں کرتا، جس خداوند قدوس کی توحید پر آسمان وزمین، پہاڑ، غرض ہر علوی وسفلی چیز شہادت دے رہی ہے، انسان کی یہ جسارت وگستاخی کہ اس کے لئے اولاد کی احتیاج ثابت کرنے لگے۔ العیاذ باللہ

﴿وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰۤؤُلَاۤءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ﴾ اور وہاں جو گواہ ہوں گے وہ کہیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ربّ پر جھوٹ باندھا۔ گواہوں سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ عظام علیہم السلام اور دیگر مؤمنین مراد ہیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ان کے اعضاء اور جوارح مراد ہیں جو ان کے خلاف گواہی دیں گے، یہ گواہی دینے والے حضرات یہ اعلان بھی فرمائیں گے کہ:

﴿اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ خبردار! ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ پھر ان ظالموں کی بُری حرکتیں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے رہے، اور اس کے راستے کے بارے میں کجی تلاش کرتے تھے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دین میں عیب نکالتے تھے، خود تو ایمان نہیں لاتے تھے، اور جو لوگ اسلام قبول کر چکے تھے ان کو بدظن کرنے کی کوشش کر کے اسلام سے ہٹانا چاہتے تھے، اور:

﴿وَهُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ﴾ اور وہ آخرت کے منکر تھے۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَمۡ يَكُوۡنُوۡا مُعۡجِزِيۡنَ فِى الۡاَرۡضِ﴾ یہ لوگ زمین میں اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہ تھے کہ کہیں بھاگ کر چھپ جاتے، یا اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہو جاتے، یا موت سے بچ جاتے، جب دنیا میں اللہ تعالیٰ کو عاجز کر کے کہیں نہیں جا سکتے تھے تو آخرت میں کیسے چھوٹ کر جا سکتے ہیں؟ جہاں سب لوگ حساب کے لئے جمع کئے جائیں گے۔

﴿وَمَا كَانَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ اَوۡلِيَآءَ‌ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الۡعَذَابُ‌ؕ مَا كَانُوۡا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ السَّمۡعَ وَمَا كَانُوۡا يُبۡصِرُوۡنَ﴾ اور ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہوگا، وہ جن کو شفعاء و سفارشی سمجھتے تھے وہ سارے دوزخ میں ہوں گے، اور ان کا عذاب دوہرا کر دیا جائے گا۔ ایک عذاب ان کے اپنے کفر کا اور دوسرا عذابِ اللہ تعالیٰ کے راستے سے لوگوں کو روکنے کا، اور دینِ الٰہی میں عیب نکالنے کا۔ یہ لوگ حق سے دور بھاگتے تھے، حق نہیں سن سکتے تھے، اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زرین باتوں سے اتنی نفرت کرتے تھے کہ اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالتے تھے، تاکہ کچھ نہ سن پائیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا یہی حال تھا، اور یہ لوگ دیکھ بھی نہیں پاتے تھے، قصداً اور عناداً وسرکشی کی وجہ سے قدرت کی نشانیوں کے دیکھنے سے منحرف تھے، جیسا کہ سورۂ اعراف میں فرمایا کہ یہ گونگے بہرے اندھے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ۝۲۱ لَا جَرَمَ اَنَّهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ هُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ۝۲۲﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو خسارے میں ڈال رکھا ہے، اور ان سے وہ سب کچھ گم ہو گیا جو وہ جھوٹ باندھا کرتے تھے، اور یہ لازمی بات ہے جس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لوگ آخرت میں خسارہ میں سب سے بڑھ کر ہوں گے، کیونکہ دنیاوی تجارت میں خسارہ مال کا ہوتا ہے، جو کہ قابل برداشت ہے، مگر اُخروی اور دینی تجارت میں خسارہ جانوں کا ہوتا ہے، جو کہ تباہ کن ہے۔

انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی، اور آخرت کے بدلے دنیا خریدی، اور ابدی راحتوں کے بدلے ابدی عذاب اور جہنم خرید کر اپنی جانوں کو گنوا بیٹھے۔ ﴿فَمَا رَبِحَتۡ تِّجَارَتُهُمۡ وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ﴾ [البقرة: ۱۶] (پس ان کی تجارت نے کوئی نفع نہیں کیا، اور نہ وہ راہ پانے والے تھے) کے مصداق بنے۔

ان کے بعد اہلِ ایمان کی تجارت کا بیان ہے، جنہوں نے خوب نفع کمایا، اور ہدایت پائی۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ بیشک جولوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے اور اپنے ربّ کی طرف جھکے (سجدے کئے اور ہر طرف سے کٹ کر انابت الی اللہ کی) یہ لوگ اہلِ جنت ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ آئندہ دونوں فریقوں کی مثال کا بیان:

﴿مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ﴾ [الآیہ]

دونوں فریق کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص اندھا بہرا ہو، اور دوسرا شخص دیکھنے والا اور سننے والا ہو، پہلی مثال کافر کی ہے، جو حق کی طرف سے اندھا اور بہرا بنتا ہے، اور دوسری مثال مؤمن کی ہے جو حق کو دیکھتا بھی ہے، اور سنتا بھی ہے، اور قبول بھی کرتا ہے۔

﴿هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا﴾ کیا یہ دونوں فریق اپنی حالت کے اعتبار سے برابر ہیں؟ یعنی برابر نہیں ہیں، جس طرح اندھا اور بہرا دیکھنے والے اور سننے والے کے برابر نہیں اسی طرح کافر اور مؤمن برابر نہیں۔

﴿اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴾ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ یہ فرق اتنا واضح اور بدیہی ہے کہ اسے ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ اس فرق کا نتیجہ اور انجام قیامت کے دن ظاہر ہوگا کہ وہاں مؤمن کا اکرام واعزاز ہوگا، اور کافر کی عَلٰى رُؤُسِ الْاَشْهَادِ رسوائی ہوگی۔ جبکہ مؤمن کی پردہ پوشی ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن اپنے ربّ سے قریب ہوگا، اور اللہ تعالیٰ سبحانہ اس کی پردہ پوشی فرمائے گا (اس کے گناہوں کا کسی کو علم نہ ہوگا)۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا کہ تجھے اپنا فلاں فلاں گناہ یاد ہے؟ وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرلے گا (ہاں یاد ہے) اور وہ اپنے دل میں یہ سمجھے گا کہ میں تو ہلاک ہوگیا (یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے بندہ کے درمیان ہوگا، تنہائی میں، ان گناہوں کا کوئی اعلان نہ ہوگا) تب اللہ تعالیٰ ارشاد ہوگا کہ میں نے دنیا میں تیری پردہ پوشی کی، اور آج ان گناہوں کو بخشتا ہوں، معاف کرتا ہوں۔ اس کے بعد اس کی نیکیوں کا اعمالنامہ اسے دیدیا جائے گا (یعنی داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، جو جنتی ہونے کی نشانی ہے)۔

رہے کافر اور منافق، تو ان کے بارے میں گواہی دینے والے گواہی دیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ربّ پر جھوٹ بولا، خبردار! ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، یعنی ان کافروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے جس کا نتیجہ جہنم ہی ہے۔ [بخاري]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّىْ لَـكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ‌ؕ اِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰٮكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰٮكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُــنَا بَادِىَ الرَّاْىِ‌ۚ وَمَا نَرٰى لَـكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: تحقیق ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا کہ میں تمہیں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں ﴿۲۵﴾ کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بلا شبہ میں تمہارے بارے میں ایک بڑے تکلیف دینے والے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں ﴿۲۶﴾ اس پر ان کی قوم کے سرداروں نے کہا جو کافر تھے کہ ہم تمہیں اپنے ہی جیسا آدمی دیکھ رہے ہیں، اور جو لوگ تمہارا اتباع کرنے والے ہیں ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ ہم میں رذیل ترین لوگ ہیں، جو سرسری رائے میں تمہارے ساتھ ہوئے ہیں، اور ہم اپنے اوپر تمہاری کوئی فضیلت نہیں دیکھتے ؛ بلکہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں ﴿۲۷﴾

معارف ومنازل

حضرت نوح علیہ السلام توحید کی دعوت دینے والے دنیا میں سب سے پہلے رسول ہیں۔ آپ علیہ السلام کی تشریف آوری حضرت آدم علیہ السلام سے ایک ہزار سال بعد ہے۔ تفصیلی حالات سورۂ اعراف میں لکھ چکے ہیں۔

محمد بن اسحاق نے عبید بن عمیر لیثی کی روایت سے لکھا ہے کہ قوم کے نافرمان اور مشرک لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ بہت ظلم وزیادتی کرتے تھے، وہ آپ علیہ السلام کو پکڑ کر پچھاڑ کر اتنا گلا گھونٹتے تھے کہ آپ علیہ السلام بیہوش ہو جاتے تھے، اور جب ہوش آجاتا تو ان کی ہدایت کے لئے دعا فرماتے: الٰہی! میری قوم کو معاف کردے، یہ لوگ ناداں ہیں۔ جب قوم کی نافرمانی بڑھتی چلی گئی اور قوم کے ہاتھوں سے مسلسل اذیت اور دکھ میں اضافہ ہوتا رہا، تو آپ علیہ السلام ناامید ہو گئے، اور آئندہ نسل کا انتظار کرنے لگے کہ شاید ان کی اگلی نسل ہدایت قبول کرے، یوں ہی نسل در نسل چلتی گئی، اور پچھلی نسل اگلی نسل سے زیادہ خبیث ہوتی رہی، اور پچھلے لوگ آپ علیہ السلام کو مجنون اور دیوانہ کہتے رہے، اور یہ کہنے لگے کہ یہ دیوانہ ہمارے باپ دادوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے، یہ پاگل ہے۔ بڑا زمانہ نسل بعد نسل یعنی ساڑھے نو سو سال گزر گئے، تب حکم آیا کہ آئندہ کسی کے ایمان کی امید وتوقع نہ کرو، تب آپ علیہ السلام نے بددعا کی، اور آپ علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم ہوا۔ یہ تفصیل آنے والی ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّىْ لَـكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ‌ؕ اِنِّىْۤ اَخَافُ

عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ یقیناً ہم نے نوح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا، اور انہوں نے کہا تھا کہ میں تمہیں واضح طور پر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں، اور کھول کر بیان کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ معبودِ حقیقی واحد لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اگر میری بات نہیں مانو گے تو مجھے دکھ والے دن کے عذاب کا تمہارے متعلق ڈر ہے۔ قوم نے بجائے بات ماننے کے الٹا یہ جواب دیا:

﴿فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا﴾ قوم کے سرداروں نے کہا: اے نوح! تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو، ہم تمہارے اندر کوئی ایسی خصوصیت نہیں دیکھتے جس کی وجہ سے تم نبوت سے سرفراز ہوئے ہو، تمہارا نبی ہونا ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ:

﴿وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ﴾ کہ جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا ہے وہ ہم میں سے سب سے بڑھ کر ذلیل اور گھٹیا لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو تمہارے ساتھ لگ گئے ہیں وہ بھی کوئی سوچ سمجھ کر ساتھ نہیں لگے، یوں ہی بے سوچے سمجھے ساتھ ہو گئے ہیں۔ دراصل یہ مسلمان غریب لوگ تھے، ان کے پاس دنیوی مال وجاہ کچھ بھی نہ تھا، اس لئے سرداروں نے انہیں رذیل اور پست کہا۔ یہ بات ہر زمانہ کے گمراہ اور مالدار لوگ کہا کرتے ہیں، صرف نوح علیہ السلام کی قوم کی شرارت نہیں، بلکہ مکہ کے مشرکین کا بھی یہی اعتراض تھا، اور آج بھی، بلکہ قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا، کہ دیندار مخلص طبقہ مالداروں اور سرداروں کی نظر میں ہلکا اور خفیف شمار ہوتا ہے۔ مگر اصل میں یہی لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مقرّب اور حقیقی مسلمان کہلائیں گے۔

روم کے بادشاہ ہرقل نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے دس سوالات پوچھے، یہ سارے سوالات سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی حقانیت کے متعلق تھے، ان میں سے ایک سوال یہی تھا کہ ان پر ایمان لانے والے اکثر مالدار لوگ ہیں یا غریب؟ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اکثر اتباع کرنے والے غریب لوگ ہیں، اس پر ہرقل نے کہا کہ یہی ان کی صداقت کی دلیل ہے، کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ماننے والے غریب ہی ہوتے ہیں۔

یہ سعادت غریبوں کی قسمت میں ہوتی ہے، جس سے بڑے لوگ عام طور پر محروم ہوتے ہیں، اِلَّا مَاشَاءَ اللہ آج کے زمانہ میں بھی دیکھیں تو قرآن کریم کے حفاظ اور قاری لاکھوں میں ہیں، جو کہ سب کے سب غریبوں کی اولاد ہیں، کیا آپ نے کسی سردار سرمایہ دار یا وزیر کے گھرانے میں یہ نعمت دیکھی ہے؟ سارے اسلامی اعمال اس وقت جو ہیں غریبوں کی بدولت باقی اور زندہ ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سارے غریب دیندار ہیں، غریبوں میں بھی بکثرت

بے دینی عام ہے، البتہ جتنے دیندار اگر آپ کو نظر آتے ہیں تو وہ سب بلکہ اسی (۸۰) فیصد غریب ہیں، اور مالداروں کا دین اور اتباعِ شریعت ان کے اپنے مزاج کا ہوتا ہے۔

﴿وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ﴾ قوم نے کہا: اے نوح! ہم تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں دیکھتے، نہ مال میں، نہ عزّت وجاہ میں، پر یہ کیسی نبوت اور پیغمبری ہے جو تمہیں عطا ہوئی؟ اس کے حقدار تو ہم ہی ہیں، نہ کہ تم۔

﴿بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ﴾ بلکہ ہم تم سب کو جھوٹے خیال کرتے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۞۲۸ وَيٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۞۲۹ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۞۳۰ وَلَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَاۤ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَاۤ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْۤ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۞۳۱

ترجمہ: نوح نے قوم کے جواب میں کہا: اے میری قوم! بتاؤ اگر میں اپنے ربّ کی طرف سے دلیل پر ہوں، اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت عطا فرمائی ہو، پھر وہ تمہیں دکھائی نہ دیتی ہو، تو کیا ہم اسے تم پر چپکا دیں گے؟ حالانکہ تم اس سے نفرت کرنے والے ہو۲۸ اور اے میری قوم! میں تم سے اس پر کوئی مال طلب نہیں کرتا، میرا اجر صرف اللہ تعالیٰ ہی پر ہے، اور جو لوگ ایمان لائے ہیں میں ان کو ہٹانے والا نہیں ہوں، بیشک وہ اپنے ربّ سے ملاقات کرنے والے ہیں، لیکن میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت کر رہے ہو۲۹ اور اے میری قوم! اگر میں ان کو ہٹا دوں تو مجھے اللہ تعالیٰ کے مواخذہ سے کون بچائے گا؟ کیا تم نہیں سمجھتے ہو؟۳۰ اور میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں، اور میں غیب کو نہیں جانتا، میں یہ نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، اور جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقارت کے ساتھ دیکھ رہی ہیں میں ان کے بارے میں یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ ہرگز انہیں خیر عطا نہ فرمائے گا، جو کچھ

ان کے دلوں میں ہے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے اگر میں ایسا کروں تو میں بے شک ظالموں میں سے ہو جاؤں گا ﴿۳۱﴾

معارف ومنازل

ان چاروں آیتوں کا مطلب اور مراد یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جواب دیا کہ سچی نبوت یقین اور واضح چیز میرے پاس تو میرے ربّ کی طرف سے آچکی، بہت بڑی رحمت ونعمت اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی، اور وہ تم سے پوشیدہ رہی، تم اسے نہ دیکھ سکے، نہ تم نے اس کی قدردانی کی، نہ اسے پہچانا، بلکہ بے سوچے سمجھے تم نے اسے دھکے دیدیئے، اور اسے جھٹلانے لگ گئے، اب بتلاؤ کہ تمہاری اس ناپسندیدگی کی حالت میں میں کیسے یہ کرسکتا ہوں کہ تمہیں اس کا ماتحت بنادوں؟

فرمایا: میری قوم والو! میں تم سے اس پر کوئی مال نہیں مانگتا، میرا ثواب تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، نہ میں ایمانداروں کو اپنے پاس سے نکال سکتا ہوں، بلکہ میں نے انہیں اپنے ربّ سے ملوانا ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ جہالت کررہے ہو، جن لوگوں سے تم نفرت کررہے ہو وہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہیں، میں ان سے کیسے دور رہوں، یا انہیں اپنے سے دور رکھوں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے درجات ہیں۔ پس اے قوم کے لوگو! میں ان ایمانداروں کو اگر اپنے پاس سے نکال دوں تو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں میری مدد کون کرسکتا ہے؟ کیا تم غور وفکر کچھ نہیں کرتے؟ میں تمہیں جو نصیحت کررہا ہوں اور جتنی خیر خواہی کررہا ہوں یہ سب اللہ کے واسطے، اور تمہاری نجات کے لئے کررہا ہوں، پس میرا مطلب تمہارا ایمان ہے، اور صد افسوس کہ چند لوگ میری بات مان کر خدا کے پسندیدہ بنے، تم انہیں ناپسند کر کے میری رفاقت سے دور رکھنا چاہتے ہو، یہی مطالبہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہوا تھا، جس پر سورۂ انعام کی آیت: ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ﴾ [الأنعام:۵۲] (اور ان لوگوں کو اپنی مجلس سے نہ نکالنا جو صبح وشام اپنے پروردگار کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پکارتے رہتے ہیں) کا نزول ہوا تھا۔

پھر فرماتے ہیں کہ میں صرف اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، تمہیں خالص توحید کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو واحد لاشریک مانو، خاص اس کی عبادت کرو، غیر اللہ کی عبادت چھوڑ دو، اور اسے ناجائز وحرام سمجھو، تم سب کے لئے میری دعوت عام ہے، جو قبول کرے گا نجات پائے گا، اللہ تعالیٰ کے خزانوں کے ہیر پھیر کی مجھ میں قدرت نہیں، مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں امت پر مالی فضیلت رکھتا ہوں، اور میرے پاس خداداد مال کے خزانے ہیں، میں غیب

نہیں جانتا ہوں، میں فرشتہ نہیں ہوں، تمہاری طرح کا انسان ہوں، جن لوگوں کو تم رذیل سمجھتے ہو میں اس کا قائل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں خیر وثواب نہیں ملے گا، مجھے کسی کے باطن کا علم نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کو اس کا علم ہے، اگر وہ ظاہر کی طرح باطن میں بھی ایماندار ہیں تو انہیں ضرور اس کا اجر وثواب ملے گا، اور یہی میرے ربّ کا ایمانداروں کے ساتھ وعدہ ہے، اور ربُّ العزّت کسی کے احسان اور ایمان اور نیکیوں کو ضائع نہیں فرمائے گا، جو ان کے متعلق غلط بات کہے گا وہ ظالموں میں شمار ہوگا۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾
قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ
اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: وہ کہنے لگے کہ اے نوح! تم ہم سے جھگڑے، اور تم نے ہم سے زیادہ جھگڑا کرلیا، لہٰذا ہمارے پاس وہ لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو، اگر تم سچے ہو ﴿۳۲﴾ نوح (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ اس چیز کو تمہارے پاس اللہ تعالیٰ ہی لائے گا اگر وہ چاہے، اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو ﴿۳۳﴾ اور میری خیر خواہی تمہیں فائدہ نہیں دے سکتی، اگر میں تمہاری خیر خواہی کا ارادہ کروں، اگر اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ہو کہ وہ تمہیں گمراہ کرے وہ تمہارا ربّ ہے، تم اسی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۳۴﴾

معارف ومنازل

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، کافی عرصہ گزر گیا، ایمان وتوحید کی دعوت کو جھگڑے سے تعبیر کرتے رہے، جان خلاصی کا سوچا، اور کہنے لگے: اے نوح! تم ہمیں کہتے رہے کہ اگر میری بات نہیں مانو گے، تو عذاب آئے گا، روز روز کے جھگڑوں سے بہتر ہی ہے کہ جس عذاب کی دھمکی دیتے چلے آتے ہو لاؤ وہ عذاب۔

انہوں نے عذاب کا خود مطالبہ اس وجہ سے کیا کہ انہیں عذاب کے آنے کا یقین نہیں تھا، یہ چیز تمام ہلاک شدہ اقوام میں مشترک رہی ہے کہ استہزاء کے طور پر انہوں نے عذاب کا مطالبہ کیا، اگر انہیں سو فیصد عذاب کی آمد کا یقین ہوتا تو کبھی جرأت نہ کرتے۔ کچھ تفصیل سورۂ اعراف اور سورۂ انفال میں گزر چکی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ میں تو اللہ تعالیٰ کا مامور ہوں، عذاب کی وعید بھی میں نے اسی کی طرف سے سنائی ہے، میں خود عذاب نہیں لاسکتا، یہ اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے، اگر وہ چاہے گا تو تم پر عذاب لے آئے گا، اس صورت میں تم اسے عاجز نہیں کرسکو گے، نہ عذاب کو روکنا تمہارے اختیار میں ہوگا، نہ بھاگ کر جان بچانا تمہارے اختیار میں ہوگا، میں نے پوری زندگی تمہاری خیر خواہی کی، طرح طرح سے سمجھایا، اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں بہت تکلیف اٹھائی، تمہاری ہر نسل کے سمجھانے میں پوری جد جہد کی، اور تمہیں عذابِ الٰہی سے بچانے کی پوری کوشش کی، اگر اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ تمہیں گمراہی پر ہی رکھے جس کی وجہ تمہارا غرور وعناد ہے تو میری نصیحت تمہارے لئے کارگر نہیں ہوسکتی، تمہارا ربّ مالک الملک کسی کو بلا وجہ عذاب نہیں دیتا، جب تک کہ وہ خود اپنے لئے تباہی کے اسباب پیدا نہ کرے، تم اگر اسی طرح کافر ومشرک ہی رہو گے تو تمہارا انجام یقیناً برا ہوگا، کیونکہ تم سب اس کے پاس پہنچو گے۔

....

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ اِنِ افۡتَرَیۡتُهٗ فَعَلَیَّ اِجۡرَامِیۡ وَاَنَا بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُجۡرِمُوۡنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن کو اپنے پاس سے بنالیا؟ آپ فرمادیجئے کہ اگر میں نے اس کو اپنے پاس سے بنالیا ہے تو مجھ ہی پر اس کا جرم ہے، اور میں اس سے بری ہوں جو جرم تم کرتے ہو ﴿۳۵﴾

معارف ومنازل

خوشتر آن باشد کہ سرّ دلبران ☆ گفتہ آید در حدیث دیگران

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی جو تفسیر لکھی ہے وہ یہ ہے کہ یہ درمیانی کلام (یعنی جملہ معترضہ) اس قصے کے بیچ میں اس کی تائید اور تقریر کے لئے ہے، اللہ تعالیٰ شانہ اپنے آخری رسول سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے کہ یہ کفار تجھ پر اس قرآن کے از خود بنالینے کا الزام لگا رہے ہیں، تو آپ جواب دیں کہ اگر ایسا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہے، میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کیسا کچھ ہے؟ پھر کیسے ممکن ہے کہ میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹ وافتراء گھڑلوں؟ ہاں تم اپنے گناہوں کے ذمے دار ہو۔ [ابن کثیر]

اور صاحب روح المعانی کا رجحان یہی ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کے مکالمہ کا تتمہ ہے، جو ان کی قوم سے ہوا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے یوں کہا تھا

کہ نوح علیہ السلام نے جو دعویٰ نبوت کیا ہے یہ ان کی بنائی ہوئی بات ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوح علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ آپ انہیں جواب دیدیں کہ اگر بالفرض میں نے اپنے پاس سے کوئی بات بنائی ہو تو یہ میرا جرم ہے جو مجھ پر عائد ہے، اور تم میرے جرم سے بری ہو تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ میں نے اپنے پاس سے یہ بات کہی ہے، مجھ پر بہتان لگا رہے ہو، یہ تمہارا جرم ہے، میں تمہارے جرم سے بری ہوں، اس کی سزا تم خود بھگت لوگے۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۞
وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۞ وَيَصْنَعُ
الْفُلْكَ ۗ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ۭ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ
كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۞ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۞

ترجمہ: اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ بلاشبہ تمہاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ اور کوئی شخص ہرگز ایمان نہ لائے گا، سو یہ لوگ جو کام کرتے تھے آپ ان کی وجہ سے رنجیدہ نہ ہوں ۳۶ اور ہمارے حکم سے کشتی بنا لیجیے، اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے خطاب نہ کرنا، بلاشبہ یہ لوگ غرق کئے جانے والے ہیں ۳۷ اور وہ کشتی بنا رہے تھے، اور جب ان کی قوم کے سردار ان پر گزرتے تھے تو ان سے ہنسی کرتے تھے، وہ جواب دیتے تھے کہ آج اگر تم ہم پر ہنس رہے ہو تو بلاشبہ ہم تم پر ہنسیں گے، جیسا کہ تم ہنسی کر رہے ہو ۳۸ سو عنقریب تم جان لوگے کہ کس کے پاس عذاب آتا ہے؟ جو اس کو رسوا کر دے گا، اور اس پر دائمی عذاب نازل ہوگا ۳۹

معارف ومنازل

نوح علیہ السلام کی کشتی پر کافروں کا ہنسی مذاق کرنا:

نوح علیہ السلام کی قوم نے جب عذابوں کا مطالبہ شروع کیا تو آپ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ تعالیٰ! زمین پر کسی کافر کو رہتا بستا نہ چھوڑ، پروردگار میں عاجز آ گیا ہوں، تو میری مدد فرما۔ اسی وقت وحی آئی کہ جو ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ اب اور کوئی ایمان نہ لائے گا، تو ان پر افسوس نہ کر، نہ ان کا ایسا کوئی خاص خیال کر، ہمارے دیکھتے (راہنمائی) اور ہماری ہدایات وتعلیم کی روشنی میں ایک کشتی تیار کر، اور ظالموں کے بارے میں ہم سے

کوئی بات نہ کر، ان کا غرق ہونا مقرر ہو چکا ہے۔ بعض سلف کہتے ہیں کہ حکم ہوا لکڑیاں کاٹ کر تختہ بنا کر سکھا کر تیار کرو، اس میں ایک سو سال گزر گئے، پھر مکمل تیاری میں سو سال اور لگ گئے۔ ایک قول ہے کہ چالیس سال لگے۔ واللہ اعلم۔ ایک قول دو سال کا بھی ہے۔

امام محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ تورات سے نقل کرتے ہیں کہ یہ کشتی ساگ کی لکڑی سے تیار ہوئی، اس کا طول اسی (۸۰) ہاتھ تھا، اور چوڑائی پچاس ہاتھ تھی، اندر باہر سے روغن کیا گیا تھا، پانی اور لکڑی کاٹنے کے اوزار پرزے بھی تھے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ لمبائی تین سو ہاتھ تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ طول بارہ سو ہاتھ تھا، اور چوڑائی چھ سو ہاتھ تھی۔ اس میں تین درجے (طبقے) تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ طول دو ہزار ہاتھ اور چوڑائی ایک سو ہاتھ کی تھی۔ واللہ اعلم

اور اونچائی تیس (۳۰) ہاتھ تھی، ہر طبقہ دس ہاتھ کا تھا، سب سے نیچے کے حصے (طبقے) میں جنگلی جانور اور چوپائے تھے، درمیانی درجے میں انسان تھے، اوپر کے حصے میں پرندے تھے، دروازہ چوڑان میں تھا، اوپر سے بالکل بند تھی۔ [ابن کثیر]

ہاتھ سے مراد آدھا گز نہیں، بلکہ ہاتھ کے پوروں سے مونڈھے تک پورا ہاتھ۔ [مظهري]

علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک غریب اثر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اگر آپ بحکمِ اللہ تعالیٰ کسی ایسے مردے کو زندہ کرتے جس نے کشتی نوح علیہ السلام دیکھی ہو تو ہمیں اس سے معلومات حاصل ہوتیں، آپ علیہ السلام انہیں لے کر چلے، ایک ٹیلے پر پہنچ کر وہاں کی مٹی اٹھالی، اور فرمایا: جانتے ہو یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (علیہ السلام) کو ہی معلوم ہے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: یہ پنڈلی ہے حام بن نوح کی، پھر آپ علیہ السلام نے اپنی لکڑی اس ٹیلے پر مار کر فرمایا: اللہ تعالیٰ کے حکم سے اٹھ کھڑے ہو، اسی وقت ایک بوڑھا آدمی اپنے سر سے مٹی جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، آپ علیہ السلام نے اس سے پوچھا: کیا تو بڑھاپے میں مرا تھا؟ اس نے کہا: نہیں، مرا تو تھا جوانی میں، لیکن اب دل پر یہ دہشت بیٹھ گئی کہ شاید قیامت برپا ہوئی، اس دہشت نے بوڑھا کر دیا۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھا حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی بابت اپنی معلومات بیان کرو، اس نے کہا: وہ بارہ سو ہاتھ لمبی اور چھ سو ہاتھ چوڑی تھی، تین درجوں کی تھی، ایک میں جانور اور چوپائے تھے، دوسرے میں انسان،

تیسرے میں پرندے۔ جب جانوروں کا گوبر پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ ہاتھی کی دم ہلاؤ، آپ علیہ السلام کے ہلاتے ہی اس سے خنزیر نر مادہ نکل آئے، اور سارا میل کھانے لگے، پھر جب چوہے کشتی کے تختے کترنے لگے، تو حکم ہوا کہ شیر کی پیشانی پر ہاتھ لگاؤ، اس سے بلی کا جوڑا نکلا، اور چوہوں کو بھگادیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سوال کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو شہروں کے غرقاب ہونے کا کیسے پتہ چلا؟ اس نے کہا کہ انہوں نے کوے کو خبر لینے کے لئے بھیجا، لیکن وہ ایک لاش پر بیٹھ گیا، دیر تک نہ آیا، آپ علیہ السلام نے اس کے لئے ہمیشہ ڈرتے رہنے کی بددعا کی، اسی لئے وہ گھروں سے مانوس نہیں ہوتا، پھر آپ علیہ السلام نے کبوتر کو بھیجا، وہ اپنی چونچ میں زیتون کے درخت کا پتہ لے کر آیا، اور اپنے پنجوں میں خشک مٹی لایا، اس سے معلوم ہوا کہ شہر ڈوب چکے ہیں، آپ علیہ السلام نے اس کی گردن میں حضرہ کا طوق ڈال دیا، اور اس کے لئے امن اور اُنس کی دعاء کی، بس وہ گھروں میں رہتا سہتا ہے۔

حواریوں نے کہا کہ اے رسول اللہ! آپ انہیں ہمارے ہاں لے چلیں کہ وہ ہم میں بیٹھ کر اور بھی باتیں ہمیں سنائیں، آپ علیہ السلام نے فرمایا: یہ تمہارے ساتھ کیسے آسکتا ہے جبکہ اس کی روزی نہیں، پھر فرمایا: اللہ تعالیٰ کے حکم سے جیسا تھا ویسا ہی ہوجا، وہ اسی وقت مٹی ہو گیا۔ [تفسیر ابن کثیر]

ادھر نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے ادھر قوم نے ان پر مذاق شروع کیا کہ پہلے تو نبی بنے ہوئے تھے اب ترکان بڑھئی بن گئے، وہ بھی بغیر پانی کے کشتی بنا رہے ہیں۔ طرح طرح سے ستا کر پریشان کر رہے تھے، آپ علیہ السلام نے فرمایا: آج جو کچھ استہزاء کر سکتے ہو کرو، مگر وہ دن بھی دور نہیں کہ تمہارے استہزاء کا جواب اور بدلہ ہم دیں گے، جب تم غرقاب ہو جاؤ۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ۭ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۴۰

ترجمہ: یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا، اور تنور سے پانی اُبلنے لگا، تو ہم نے کہا: اس کشتی میں ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ (یعنی ہر جنس سے دو عدد) سوار کرو، اور اپنے گھر والوں کو بھی سوار کر دو، سوائے اس کے جس کے بارے میں پہلے سے فیصلہ ہو چکا ہے، اور ان لوگوں کو بھی سوار کر لو جو ایمان لائے ہیں، اور ان کے ساتھ کم آدمی ایمان

لائے۔

معارف ومنازل

جب کشتی بن کر تیار ہوئی اور عذاب کا وہ لمحہ بھی آپہنچا جس کے ذریعہ طاغوتی قوتوں کو تہہ وبالا کرنا منظور تھا، اور شرک وبت پرستی کی نجاستوں کو دھو کر پانی کے ذریعہ پوری دھرتی کو پاک وصاف کرنا تھا، طوفان کی ابتداء ہوگئی، تنور سے بجائے آگ کے پانی کا چشمہ ابلنا شروع ہوگیا، صرف اہل ایمان کے لئے حکم تھا کہ انہیں کشتی میں سوار کیا جائے، اور حیوانات، چوپائے، چرند، پرند، درند کی نسلوں کو بھی بچانا اور آئندہ زمین پر پھیلانا تھا، اس لئے اس کا بھی مکمل انتظام ہونے لگا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ یہ ساری خلقت کشتی کے پاس جمع ہوگئی، جن میں سے ہر جنس کے دو عدد نر مادہ اٹھا کر کشتی میں ڈال دیئے، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ نوح علیہ السلام نے اپنے گھر کے افراد اور دیگر اہل ایمان کو کشتی میں بٹھایا۔ البتہ جن نافرمانوں کی تباہی کا بوجہ کفر فیصلہ ہو چکا تھا انہیں چھوڑ دیا گیا۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور اس کے بطن سے پیدا شدہ کافر بیٹے کنعان نامی۔

اور ایمان لانے والے حضرات جنہیں قرآن حکیم نے قلیل بتایا ان کے بارے میں متعدد اقوال ہیں، مگر کسی صحیح سند سے ثابت نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ اسی (۸۰) افراد تھے، جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، ان میں نوح علیہ السلام کے تین بیٹے سام، حام، یافث اور ان تینوں کی بیویاں بھی تھیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں: ایک مؤمنہ تھی اور دوسری کافرہ، کافرہ اپنے بیٹے سمیت غرق ہوئی، اور مؤمنہ کشتی میں سوار کر لی گئی۔

اب کشتی میں بنی آدم اہل ایمان کے ساتھ حیوانات، چوپائے، چرند، پرند وغیرہ سب سوار کرالئے، اس وقت طوفانی پانی کی ابتداء تھی جو کہ تنور سے پانی کا چشمہ جاری ہوا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو بتادیا گیا تھا کہ جب تنور سے پانی ابلنے لگے تو سمجھ لو کہ اب طوفان کی ابتداء ہوگئی، یہ مطلب نہیں کہ سارا پانی تنور ہی سے نکلے گا، کیونکہ سورۂ قمر میں ارشاد یوں ہے: ﴿فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝١١ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝١٢﴾ [القمر] (سو ہم نے خوب بہنے والے پانی سے آسمان کے دروازے کھول دیئے، اور زمین سے چشمے جاری کر دیئے، پھر پانی اس کام کے لئے مل گیا جو پہلے سے تجویز ہو چکا تھا)۔

مطلب یہ ہے کہ آسمان کا پانی اور زمین کا پانی دونوں طغیانی کے ساتھ مل گئے، جس سے پوری آبادی، شہر، بستی اور دیہات غرقاب ہو گئے، حتیٰ کہ پہاڑوں کی بلند چوٹیاں بھی پانی میں غائب ہوگئیں۔ سورۃ الحاقہ میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾ [الحاقة:۱۱] (بیشک جب پانی میں طغیانی آگئی تو ہم نے تمہیں یعنی تمہارے باپ دادوں کو کشتی میں سوار کردیا) تم جن کی پشتوں میں تھے۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۟ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

ترجمہ: اور نوح نے کہا: اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا، بلاشبہ میرا ربّ بالیقین بخشنے والا ہے مہربان ہے ﴿۴۱﴾ اور وہ کشتی ان کو لے کر پہاڑوں جیسی موجوں میں چلنے لگی، اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور وہ ان سے ہٹا ہوا تھا کہ اے میرے چھوٹے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ، اور کافروں کے ساتھ مت ہو ﴿۴۲﴾ وہ کہنے لگا کہ میں عنقریب کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچالے گا، نوح نے جواب دیا کہ آج اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں، مگر وہی جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، اور ان دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی، سو وہ غرق ہونے والوں میں سے ہوگیا۔

معارف ومنازل

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں یعنی اہل ایمان سے فرمایا کہ کشتی میں سوار ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور ٹھہرنا، یعنی اس کے چلنے کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے نام سے ہے، اور اس کا ٹھہرنا بھی اللہ تعالیٰ کے نام سے ہوگا۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ دورانِ طوفان جب حضرت نوح علیہ السلام کشتی کو روکنا چاہتے تھے تو بِسْمِ اللّٰہِ پڑھتے تھے، اور جب چاہتے تھے کہ چل پڑے تو بِسْمِ اللّٰہِ کہتے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں ان کی نجات اور ظالموں مشرکوں کی غرقابی پر یہ دعاء تعلیم فرمائی: ﴿فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴾[المؤمنون:۲۸](سو جب تو اور تیرے ساتھی کشتی پر بیٹھ جائیں تو یوں کہنا کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی)۔ اور یہ بھی ہدایت فرمائی: ﴿وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ۝۲۹﴾[المؤمنون] (یعنی دعاء میں یوں کہیے کہ اے رب! مجھے برکت والی جگہ میں اتار، اور تو بہترین اتارنے والوں میں سے ہے)۔ یہ دعا کشتی سے اترنے کے لئے تلقین فرمائی۔

مدارِ نجات صرف ایمان ہے، نسبت ونسب کچھ نہیں:

نوح علیہ السلام کی بیوی کا دوزخی اور کافرہ ہونے کا تذکرہ سورۂ تحریم کے آخر میں ہے، ازدواجی تعلق بہت بڑا رشتہ اور نسبت ہے، مگر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے کارآمد نہیں، باپ بیٹے کا رشتہ بھی بڑا رشتہ ہے، اور زبردست نسبی نسبت ہے، مگر وہ بھی بغیر ایمان کے سودمند نہیں، جب نبوت کا رشتہ بغیر ایمان موجبِ نجات نہیں تو باقی رشتے کس باغ کی مولی ہوں گے؟ ؎

آنرا بری از صومعہ دردار گبران افگنی ☆ این را بری از بتکدہ سرحلقہ رندان کنی

چوں و چرا با کارتو عقل زبوں را کے رسد ☆ ہم قادر مطلق توئی ہر آنچہ خواہی ان کنی

پسر نوح بابدان بـــہ نشست ☆ خاندان نبوتش گم شد

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۝۴۴

ترجمہ: اور حکم ہوا کہ اے زمین! اپنے پانی کو نگل لے، اور اے آسمان! تھم جا، اور پانی کم ہو گیا، اور فیصلہ کر دیا گیا، اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی، اور کہہ دیا کہ کافروں کے لئے دوری ہے۝۴۴

معارف ومنازل

پانی کا طوفان اتنا شدید تھا کہ عالم سفلی کا رنگ تبدیل ہوا، عورتوں نے اپنے بچوں کو سینوں سے ساتھ لگایا، جب پانی وہاں پہنچ گیا تو بچوں کو کندھوں پر اوپر اٹھالیا، جب پانی وہاں تک آیا تو بچوں کو سروں پر اٹھایا، جب پانی اور اوپر آیا تو بچوں کو پھینک دیا، بڑے منحوس لوگ تھے، اسی تباہی میں بھی پشیمان اور تائب نہیں ہوئے، پانی رفتہ رفتہ

پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی اوپر ہوگیا، اوراس کی موجیں بھی پہاڑوں کی طرح تھیں، اتنے بےتحاشا کثیر پانی سے کون بچ سکتا تھا سوائے ان اہل ایمان کے؟ جو کشتی میں سوار تھے۔

یہ طوفان کتنے دن رہا؟ اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں: ایک قول یہ ہے کہ کشتی ایک سو پچاس دن پانی پر رہی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ وہ چھ ماہ تک پانی پر تیرتی رہی، صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ پھر جب طوفان ختم ہوا تو زمین کو حکم ملا کہ اپنے پانی کو جذب کر لے، اور آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برسانا بند کردے، لہٰذا پانی کم ہوگیا، اور کچھ پانی سمندروں میں گر گیا، اور اہل کفر کی غرقابی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فیصلہ ہوا تھا اس کے مطابق وہ سب ہلاک ہوگئے، کشتی چلتے چلتے جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی۔

لیکن اس سے اترنا کب ہوا؟ اس کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک ماہ تک جودی پہاڑ پر رہے، جب حضرت نوح علیہ السلام کو یہ معلوم ہوگیا کہ پانی ختم ہوا ہے اور زمین خشک ہے، اور اس پر قیام کرنا آسان ہے، تو کشتی کو وہیں چھوڑ کر سب نیچے اتر گئے، اور سارے حیوانات، چوپائے، چرند پرند، حشرات الارض سب کو اتار کر زمین پر چھوڑ دیا، اور اس کے بعد نئی دنیا کی آبادی میں لگ گئے، اسی بنیاد پر حضرت نوح علیہ السلام آدمِ ثانی کہلائے، اور آپ علیہ السلام کے تینوں بیٹوں حام، سام، یافث کی نسل سے دنیا کی آبادی تیزی کے ساتھ شروع ہوگئی، موجودہ زمانے میں دنیا کی آبادی ساڑھے چھ ارب انسانوں پر مشتمل ہے، یہ سب حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں کی اولاد ہیں۔

جودی پہاڑ پر کشتی رک گئی:

جودی پہاڑ آج بھی اسی نام سے قائم ہے، اس کا محلِ وقوع حضرت نوح علیہ السلام کے وطنِ اصلی عراق، موصل کے شمال میں جزیرۂ ابن عمر کے قریب آرمینیہ کی سرحد پر ہے، یہ ایک کوہستانی سلسلہ ہے، جس کے ایک حصہ کا نام جودی ہے، اسی کے ایک حصے کو ''اراراط'' کہا جاتا ہے۔ موجودہ تورات میں کشتی ٹھہرنے کا مقام کوہ اراراط کو بتلایا ہے، ان دونوں باتوں میں کوئی ایسا تضاد نہیں، مگر مشہور قدیم تاریخوں میں بھی یہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہری تھی۔ قدیم تاریخوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ عراق کے بہت سے مقامات میں اس کشتی کے ٹکڑے اب تک موجود ہیں، جن کو تبرک کے طور پر رکھا اور استعمال کیا جاتا ہے۔

تفسیر طبری بغوی اور مظہری میں ہے کہ نوح علیہ السلام ماہ رجب کی ۱۰ تاریخ کو کشتی میں سوار ہوئے تھے، چھ مہینے تک یہ کشتی طوفان کے اوپر چلتی رہی، جب کشتی بیت اللہ شریف کے مقام پر پہنچی تو سات مرتبہ طواف کیا، اللہ تعالیٰ

نے بیت اللہ شریف کواوپر اٹھا کر بلند کر کے غرق ہونے سے بچالیا تھا، پھر ۱۰ محرم یوم عاشوراء کوطوفان ختم ہوا اور کشتی کو جبل جودی پر ٹھہرنے کا حکم ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس روز شکرانہ کے طور پر روزہ رکھا، اور کشتی میں جتنے آدمی تھے سب کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ کشتی میں شریک سب جانوروں نے بھی اس دن روزہ رکھا۔ [قرطبي مظهري]

روزِ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ کی اہمیت تمام شرائع انبیاء کرام علیہم السلام میں قدیم سے چلی آتی ہے، ابتداء اسلام میں رمضان کی فرضیت نازل ہونے کے بعد صومِ عاشوراء کی فرضیت منسوخ ہوگئی، مگر سنت واستحباب دائمی وابدی ہے۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۴۵﴾ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْــٴَـلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْــٴَـلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَتَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۴۷﴾ قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَعَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۴۸﴾

ترجمہ: اور نوح علیہ السلام نے اپنے ربّ کو پکارا، اور عرض کیا: اے میرے ربّ! بیشک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے، اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے، اور تو اَحکم الحاکمین ہے ﴿۴۵﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نوح! بلاشبہ وہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے، بیشک اس کا عمل درست نہیں، سوتو مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں، میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں شامل نہ ہونا ﴿۴۶﴾ نوح نے عرض کیا کہ اے میرے ربّ! بیشک میں اس بات کی آپ سے پناہ چاہتا ہوں کہ میں آپ سے وہ سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں، اور اگر آپ نے میری بخشش نہ فرمائی تو میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوجاؤں گا ﴿۴۷﴾ حکم ہوا کہ اے نوح! تم اتر جاؤ سلامتی کے ساتھ جو ہماری طرف سے ہے، اور برکتوں کے ساتھ جو تم پر اور ان جماعتوں پر ہیں جو تمہارے ساتھ ہیں، اور بہت سی جماعتیں ایسی ہیں جنہیں ہم نفع پہنچائیں گے، پھر انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا ﴿۴۸﴾

معارف ومنازل

حضرت نوح علیہ السلام کا لڑکا کنعان جس کے غرقاب ہونے کا واقعہ گزر گیا، اس کے بارے میں انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا تھا، اور کہا:

﴿رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَہۡلِیۡ﴾ اے میرے ربّ! میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے، اور بیشک آپ کا وعدہ سچا ہے، اور آپ اُحکم الحاکمین ہیں، اور تو نے میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کیا ہے، لہٰذا میرے بیٹے کو ڈوبنے سے بچائیے۔ یہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ یہ التجاء اس کے غرقاب ہونے سے پہلے ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیٹے کے ڈوبنے کے بعد نوح علیہ السلام نے عرض کیا ہو کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا، اسی وجہ سے میں نے اس کو کشتی میں سوار کرنا چاہا، اور اسے کہہ بھی دیا کہ: ﴿یٰبُنَیَّ ارۡکَبۡ مَّعَنَا وَلَا تَکُنۡ مَّعَ الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ (اے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہوجا، اور کافروں کے ساتھ مت ہوجا)۔

اے ربّ! تو نے میرے اہل کو بچانے کا وعدہ بھی کیا تھا، پھر میرے بیٹے کو کیوں نہیں بچایا؟ پس یہ جملہ استفہامیہ محذوف ہوگا، یہ اس بناء پر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے بیٹے کے کفر کا سو فیصد یقین نہ تھا، اس لئے عرض گزار ہوئے۔ بخلاف بیوی کے کہ اس کا کفر حضرت کے سامنے واضح تھا، اس لئے اسے کشتی کی سواری سے باز رکھا۔

تفسیر مظہری اور ابن کثیر نے اسی توجیہ کو بیان فرمایا جو کہ اچھی توجیہ ہے انہیں جواب ملا:

﴿قَالَ یٰنُوۡحُ اِنَّہٗ لَیۡسَ مِنۡ اَہۡلِکَ ۚ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ﴾ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا: اے نوح! حقیقت یہ ہے کہ وہ تیرے اہل میں سے ہی نہیں، کیونکہ مؤمن کا کافر کے ساتھ رشتہ ولایت نہیں، اور اس کا عمل اچھا نہیں، کیونکہ وہ کافر ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ معنی ہو کہ اس کو بچانے کا سوال کرنا درست عمل نہیں۔

﴿فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ﴾ پس تو مجھ سے ایسی بات کا سوال نہ کر جس کے صحیح یا غلط ہونے کا تجھے علم نہیں۔

﴿اِنِّیۡۤ اَعِظُکَ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ﴾ میں تجھے قطعی نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے مت بنو۔

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ﴾ نوح علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے رب! میں اس بات سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں کہ اس چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

﴿وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ﴾ اور اگر آپ نے میری مغفرت نہ فرمائی اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں خسارہ والوں میں سے ہو جاؤں گا۔

﴿قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ تم سلامتی کے ساتھ اتر جاؤ، اور برکتوں کے ساتھ اتر جاؤ، جو تم پر اور تمہارے ساتھ جماعتوں پر ہوں گی، جنہوں نے ایمان قبول کیا، لہٰذا آپ کی تصدیق کی وجہ سے انہیں سلامتی اور برکات کا تحفہ دیا جا رہا ہے۔ آئندہ جو لوگ انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لائیں گے، وہ بھی اس بشارت کے مستحق اور حقدار ہوں گے، لیکن اگر آنے والے جو لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب پر اترے تو ان کے لئے یہ پیغام ہے کہ:

﴿وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ﴾ اور بہت سی جماعتیں ایسی ہوں گی (آپ کی غرق شدہ قوم کی طرح) جو دائرۂ ایمان سے نکل جائیں گی، ان کو ہم دنیا میں ایسی زندگی دیں گے جس سے وہ خوب فائدہ اٹھائیں گی، پھر کفر و سرکشی کی پاداش میں دردناک عذاب انہیں پہنچ جائے گا، اور یہ فیصلہ قیامت تک آنے والے کافروں اور مشرکین سب کے لئے ہوگا، خواہ وہ عاد و ثمود ہوں یا اور کوئی۔

تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ ۚ مَا كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا ۛ فَاصۡبِرۡ ۛؕ اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۹﴾

ترجمہ: یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے، آپ کی طرف وحی بھیجتے ہیں، اس سے پہلے آپ ان کو نہیں جانتے تھے، اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی، سو آپ صبر کیجئے، بلاشبہ انجام کار متقیوں ہی کے لئے ہے ﴿۴۹﴾

معارف و منازل

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبر کی تلقین کے ساتھ یہ بتایا جا رہا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم کی غرقابی اور ان کے ساتھ اہل ایمان کی نجات کی عجیب و غریب داستان یہ آپ کے ربّ سبحانہ و تعالیٰ کی عظیم قدرتوں کی شاہکار ہے، اور یہ سب غیب کی خبریں ہیں، اے سرور کائنات خاتم المرسلین! آپ بذات خود اور آپ کی قوم ان خبروں سے واقف نہیں تھے، ان خبروں کو نہ آپ نے سنا اور نہ کبھی آپ کے خیال میں آئیں، اور نہ کبھی کسی افسانہ سنانے والے کو پتہ چلا،

یہ محض وحی الٰہی کی برکات ہیں، جو آپ کو سنائی جا رہی ہیں۔

محض یہ نہیں، بلکہ اولین وآخرین اور ازل سے لے کر ابد تک کے حالات آپ کو بتائے جا رہے ہیں، یہ آپ کا ایک عظیم معجزہ ہے کہ پوری کائنات کے نشیب وفراز آپ کے سامنے ہیں عقلمندوں دانشوروں اور صحیح فکر وسوچ رکھنے والوں کو چاہیے کہ بلا چون وچرا آپ کی تصدیق پر متوجہ ہو جائیں، اور نوح علیہ السلام کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نجات دہندہ تسلیم کرلیں۔ پس اگر کنعان کی طرح کوئی بدقسمت ہو تو آپ رنجیدہ نہ ہوں، آپ اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کے سردار ہیں، نوح علیہ السلام کی طرح صبر اختیار کریں، اور فیصلہ کریں کہ انجام خیر متقیوں کے لئے ہے۔

(۱) نوح علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام کے درمیان (۱۰۵۶) سال کا فاصلہ ہے، صحیح روایت یہی ہے کہ ان دونوں کے درمیان صرف حضرت شیث علیہ السلام ہیں۔ اور حضرت ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام کے بعد ہیں، جو لوگ حضرت ادریس علیہ السلام کو نوح علیہ السلام کے اجداد میں شمار کرتے ہیں وہ صحیح نہیں۔ مزید تحقیق کے لئے البدایہ والنہایہ اور فتح الباری جلد ششم دیکھیں۔

(۲) حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جو شرک وبت پرستی کے خلاف مبعوث ہوئے، بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حدیث شفاعت بخاری ومسلم میں یہی ہے۔ اس سے پہلے: ﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ [البقرة: ۲۱۳] (لوگ ایک ہی گروہ تھے) کا عام دور دورہ رہا۔

(۳) دنیا میں شرک کیسے آیا؟ کس طرح آیا؟ اور کب آیا؟ اس کی تفصیل سورۂ نوح کی تفسیر میں دیکھیں۔

(۴) دنیا میں شرک اور بت پرستی کے جرم میں جتنی قومیں تباہ ہو چکی ہیں ان کی تعداد کا علم صرف رب العزت سبحانہ کے پاس ہے، قرآن کریم نے موعظہ اور نصیحت اور عبرت کے لئے صرف سات ہلاک شدہ قوموں کا ذکر کیا ہے۔

(۵) ہادی برحق ہدایت دینے والا صرف حق تعالیٰ سبحانہ کی ذات ہے، حضرت آدم علیہ السلام کا بیٹا قابیل کافر رہا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا یا باپ آزر کفر پر مرا، حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کنعان کفر پر غرق ہوا، حضرت نوح علیہ السلام حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں کافرہ اور جہنمی رہیں، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشفق ومہربان چچا ابوطالب اسلام سے برگشتہ رہے۔ یہ نسبی رشتہ اس وقت کارآمد ہے جبکہ اس کے ساتھ دینی قرابت بھی ہو، ورنہ تو یہی جواب ہے: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ﴾ (یہ آپ کے خاندان سے نہیں)۔ اصل رشتہ وہ ہے جو دینی اور اسلامی ہو، اس کے بغیر تمام خونی اور نسبی رشتے غیر معتبر ہیں، اور نجارت کے لئے کارآمد نہیں ہیں۔

(٦) نوح علیہ السلام کے طوفان کے بارے جمہور علماء، مفسرین، مؤرخین اور محققین کا فیصلہ یہی ہے کہ یہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا ہوا ہے، زمین کا کوئی ایسا حصہ نہیں جو اس طوفان کی زد میں نہ آیا ہو۔ مگر اہلِ تورات، فلاسفہ، جغرافیہ داں وغیرہ اس کو جزوی طوفان کہتے ہیں، جو صرف ایک لاکھ چالیس ہزار مربع میل پر آیا، جہاں تک قوم نوح کی آبادی تھی، وہ اسی رقبہ تک محدود تھا۔ واللہ اعلم

(٧) تباہ شدہ اقوام پر طرح طرح کے عذاب آئے، اور وہ سارے عذاب بہت مختصر اور محدود رہے، اور مختصر وقت میں قوموں کو صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹا کر گزر گئے۔ مگر طوفانِ نوح کی شان اور حقیقت کچھ اور ہے، کیونکہ یہ عذاب فوری بھی نہیں، اور مختصر بھی نہیں، اس کے بڑے بڑے لمبے لمبے مقدمات ہیں، اور نہایت حیران کن انتظامات ہیں، اس کی تیاری کے لئے جو کام انجام دیئے گئے مگر وہ بھی تو کسی عذاب اور پریشانی سے کم نہیں۔

دیکھیں! ایک پیغمبر کے پاس نہ اسباب ہیں نہ وسائل، اور نہ ہی افرادی قوت، اسے حکم دیا جا رہا ہے کہ لکڑی کے درخت لگاؤ، اور ہزاروں مخالفتوں کے ہوتے ہوئے ان کی نگہداشت جاری رکھو، اس پر سو یا پچاس یا چالیس سال لگ جاتے ہیں، اب حکم ہوتا ہے کہ کٹائی کرو، اور تختے بناؤ، پھر ایک ایسی سہ منزلہ کشتی تیار کرو جس کا طول بارہ سو ہاتھ ہو، عرض چھ سو ہاتھ ہو، اونچائی تیس ہاتھ ہو، پھر ہر طبقہ میں جانوروں کے جوڑے جوڑے کے لئے الگ الگ خانے ہوں، اونٹوں کا پنجرہ الگ، گائے کا الگ، بھینس کا الگ، پھر ان کا جمع ہونا اور اپنے اپنے خانوں میں انہیں داخل کرانا، ان سب کے لئے چھ ماہ کی مکمل خوراک کا انتظام کرنا، اس پورے نظام کی تیاری پر پورے ایک سو سال لگ جاتے ہیں، اور اس ساری سو سالہ محنت کا دارومدار صرف ایک شخص پر ہے، وہ پیغمبر نوح علیہ السلام۔ اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کی تیاری پر ذرا غور فرمائیں، اور خوب سوچیں، آخر راز کیا ہے؟

ادھر عذاب بھیجنے والا اتنا طاقتور ہے کہ یہ عذاب کیا ہے وہ تو اس پر بھی قادر ہے کہ چشم زدن میں پورے جہاں کو تہہ و بالا کردے، وہ علیم ہے، حکیم ہے، ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ [هود: ١٠٧] (جس چیز کا ارادہ کرے اس کو خوب کرنے والا ہے) ہے، اس کی حکمتوں تک کسی کو رسائی حاصل نہیں، لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ۔

ہر مسلمان کو، خاص کر علماء کرام کو دعوت فکر دینا مقصد ہے۔ واللہ الهادي

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝٥٠

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ يٰقَوْمِ
اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَ لَا
تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ
بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۳﴾ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْۤا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ ؕ
مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ
مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَ یَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۚ وَ لَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ
شَیْءٍ حَفِیْظٌ ﴿۵۷﴾ وَ لَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَ نَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ
غَلِیْظٍ ﴿۵۸﴾ وَ تِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَ عَصَوْا رُسُلَهٗ وَ اتَّبَعُوْۤا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۵۹﴾ وَ اُتْبِعُوْا
فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾

ترجمہ: اور قوم عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں، تم صرف جھوٹ بولتے ہو ﴿۵۰﴾ اے میری قوم! میں تم سے اس پر کوئی مزدوری طلب نہیں کرتا، میرا اجر صرف اللہ تعالیٰ پر ہے، جس نے مجھے پیدا فرمایا، کیا تم سمجھ نہیں رکھتے؟ ﴿۵۱﴾ اور اے میری قوم! تم اپنے ربّ سے مغفرت طلب کرو، اور اس کے حضور میں توبہ کرو، وہ تم پر خوب بارشیں بھیج دے گا، اور تمہیں جو قوت حاصل ہے اس سے زیادہ قوت عطا فرمائے گا، اور تم مجرم بن کر روگردانی کرنے والے نہ بنو ﴿۵۲﴾ وہ کہنے لگے کہ اے ہود! تم ہمارے پاس کوئی دلیل نہ لائے، اور ہم تمہارے کہنے کی وجہ سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں، اور ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ﴿۵۳﴾ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تمہیں خرابی پہنچادی ہے۔ ہود نے کہا کہ بیشک میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں، اور تم گواہ ہو جاؤ کہ بیشک میں ان چیزوں سے بری ہوں جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ شریک قرار دیتے ہو ﴿۵۴﴾ سو تم سب مل کر میرے بارے میں تدبیریں کرلو، پھر مجھے مہلت نہ دو ﴿۵۵﴾ بیشک میں نے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جو میرا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی، زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں ہے جس کی پیشانی اس کی گرفت میں نہ ہو، بیشک میرا ربّ صراط مستقیم پر ہے ﴿۵۶﴾ سو اگر تم روگردانی کرو تو میں

سب کچھ پہنچا چکا ہوں جو پیغام دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، اور میرا ربّ تمہارے سوا کسی دوسری قوم کو تمہارے قائم مقام کردے گا، اور تم اسے کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکو گے، بیشک میرا ربّ ہر چیز پر نگہباں ہے۝ اور جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو اور ان لوگوں کو نجات دیدی جو ایمان لا کر ان کے ساتھ تھے، اور ہم نے انہیں سخت عذاب سے نجات دیدی۝ اور یہ تھے قومِ عاد کے لوگ، جنہوں نے اپنے ربّ کی آیات کا انکار کیا، اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی، اور ہر سرکش ضدی کی بات کا اتباع کیا۝ اس دنیا میں ان پر لعنت لگادی گئی، اور قیامت کے دن بھی، خبردار! بلاشبہ قومِ عاد نے اپنے ربّ کے ساتھ کفر کیا، خبردار! قومِ عاد کے لئے دوری ہے جو ہود کی قوم ہے۝

معارف ومنازل

قوم نوح علیہ السلام کی سرکشی اور طوفانی عذاب کے بعد قومِ عاد کی سرکشی کا بیان شروع ہو رہا ہے، یہ لوگ بڑی قوت والے اور بڑے ڈیل وڈول والے تھے، ان کو اپنی قوت پر بڑا گھمنڈ تھا، ﴿وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾۔ [فصلت:۱۵] (اور انہوں نے کہا: کون ہم سے قوت میں زیادہ ہے؟)۔

ان کا پورا تفصیلی قصہ سورۃ الفجر میں لکھ چکے ہیں۔ جہاں ارشاد ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ۝ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ۝﴾ [الفجر] یعنی کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قومِ عاد، یعنی قومِ ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ جن کی قدوقامت (۱۸ فٹ) ستونِ جیسی تھی، جن کے شہروں میں ان جیسا پیدا نہیں کیا گیا، یہ بڑے متمدن مالدار اور خوشحال تھے، احقاف یمن میں رہتے تھے، انہیں عادِ اولیٰ کہا جاتا ہے۔ قومِ ثمود سے دوسو سال پہلے گزرے ہیں، تباہ کن آندھی نے انہیں ہمیشہ کے لئے ایسا تباہ کیا کہ ان کا نام ونشان باقی نہ رہا۔

حضرت ہود علیہ السلام قومِ عاد ہی میں سے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا، حضرت ہود علیہ السلام نے ستر سال تک مسلسل انہیں تبلیغ کی، توحید کی دعوت دی، شرک وبت پرستی سے انہیں منع کرتے رہے، اور ان سے فرمایا: دیکھو! میں تمہارا خیر خواہ ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کے لئے بھیجا ہے، تم اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرو، اور خاص اس کی عبادت کرو، اور جو تم نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تم ان بے جان

معبودوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک بتاتے ہو، یہ تمہارا افتراء اور جھوٹ ہے۔

سورۂ اعراف میں ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بھی یاد دلائیں، اور ان سے فرمایا کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں قومِ نوح (علیہ السلام) کے بعد زمین میں بسایا ہے، اور ان کا نائب وخلیفہ بنایا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں ڈیل وڈول بھی خوب دیا ہے، تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو، لیکن ان بدبختوں نے کہا کہ تم بے وقوف آدمی ہو، اور ہم تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں (اعراف میں دیکھو)، اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ تم ہمارے پاس کوئی دلیل وحجت نہیں لائے ہو، جس کی وجہ سے ہم تمہیں اللہ تعالیٰ کا رسول تسلیم کریں (یہ انہوں نے عناداً کہا، ورنہ ان کے پاس سب کچھ آچکا تھا)۔ اور مذاق کے طور پر انہوں نے یہ کہا کہ ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ یہ جو تم الٹی پلٹی بہکی باتیں کرتے ہو، تم پر ہمارے معبودوں میں سے کسی نے کچھ کردیا ہے، یعنی آسیب وغیرہ پہنچا کر دیوانہ بنادیا ہے۔

آپ ہمیں کہتے ہیں کہ اپنے معبودوں کو چھوڑ دو، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کی بے ڈھنگ باتوں سے ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ کر تمہارے ایک معبود پر جھک جائیں، نہ ہم تمہاری بات ماننے کے لئے تیار ہیں، اور نہ تم پر ایمان لانے کے لئے، جبکہ آپ جھوٹے بھی ہیں۔

یہ سن کر اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تمہارا جواب یہی ہے تو سنو! میں تمہارے معبودوں سے بیزار ہوں، اور میں اس پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہوں، اور تم بھی گواہ رہو کہ اب تم میرے دشمن ہو، اپنی دشمنی میں تم کوئی کسر نہ اٹھا کر رکھو، مجھے تکلیف پہنچانے میں جو بھی تدبیر کرسکتے ہو کرلو، اور تم سب مل کر میرے خلاف جو سازش اور مکر وحیلہ کرسکتے ہو اس پر عمل کرو، اور مجھے ذرا سی بھی مہلت نہ دو، تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے ہو، کیونکہ میرا بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہے، جو میرا ربّ بھی ہے، اور تمہارا بھی ربّ ہے، میں تمہیں تمہاری کثرت وقوت کے باوجود کچھ بھی نہیں سمجھتا، میرا اعتماد اس ذات پاک پر ہے کہ زمین پر جتنے چلنے پھرنے اور حرکت کرنے والے جاندار ہیں اس کے قبضہ قدرت اور ملکیت میں ہیں، ان سب کی پیشانی اسی واحد وجبار کے ہاتھ میں ہے، وہ مالک وقادر بھی ہے، اور حافظ ونگہبان بھی، تم بھی تو اس کی مخلوق ہو، اور معمور ومجبور ہو، اگر وہ چاہے تو بآسانی میرا بدلہ تم سے لے سکتا ہے، اور تمہیں قصہ پارینہ بنا کر ختم کرسکتا ہے، کیونکہ اس کی رضا اور خوشنودی صراط مستقیم کے ساتھ وابستہ ہے۔

انہوں نے لوگوں سے یہ بھی کہا کہ تم توحید اختیار کرو، اور اپنے گناہوں سے توبہ کرکے استغفار کیا کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسمان کے دروازے کھول کر مسلسل بارشوں کا انتظام فرمائے گا، تمہاری زمین آباد ہو کر عجیب و

غریب سبزوں، درختوں، پھلوں، غلوں اور پھولوں کا گہوارہ بن جائے گی، آبادی بڑھے گی، تمہیں خوشحالی ملے گی، اور تمہاری قوت میں مزید اضافہ ہوگا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تین سال سے بارشیں نہیں ہوئی تھیں، عورتیں بانجھ ہو چکی تھیں، اولاد پیدا نہ ہونے کی وجہ سے تعداد میں کمی ہو رہی تھی، ان تمام پیش کشوں کا کوئی فائدہ سامنے نہیں آیا، اور وہ مسلسل ضد وہٹ دھرمی میں مست ہی رہے، ستر سال کی مسلسل تبلیغ کے بعد نوحؑ علیہ السلام کی طرح پیمانہ صبر لبریز ہوتا رہا، پھر واضح کر کے فرمایا: دیکھو! اگر تم مسلسل روگردانی کرو گے، اور توحید کا پیغام بدستور ٹھکراؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے، اور قوم نوح علیہ السلام کا انجام تمہارے سامنے ہے، جن کے خلیفہ تم ہو، اس طرح تمہاری ہلاکت کے بعد دوسری قوم آئے گی تم اپنے قوت کے گھمنڈ میں نہ رہو، میرا ربّ بہت قوی اور غالب ہے، تم اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، جبکہ وہ تمام قوتوں کا مالک ہے۔

آخرالامر انہوں نے قوم نوح (علیہ السلام) کی طرح عذاب کا مطالبہ شروع کیا، انہیں کیا یقین تھا کہ واقعی عذاب آئے گا، مگر ہوا وہی جسے انہوں نے خود مانگا۔ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا: ﴿قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَ غَضَبٌ﴾ [الأعراف: ۷۱] (تم پر تمہارے ربّ کی طرف سے عذاب اور غصہ نازل ہونے کا فیصلہ ہو چکا) پس کیا ہوا؟ وہ یہ ہے: ﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ۝ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ۝﴾ [الحاقۃ] (اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے، نکلی جائے ہاتھوں سے مقرر کر دیا اس کو ان پر سات رات اور آٹھ دن تک لگاتار، پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اس میں پچھڑ گئے، گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کے کھوکلے، پھر تو دیکھتا ہے ان میں کوئی بچا؟)۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر تند و تیز خطرناک اور غضب کی ہوا بھیجی، یہ مسلسل سات رات آٹھ دن تک بغیر کسی وقفے کے لگاتار چلتی رہی، جس سے بڑے بڑے مضبوط قلعے اور ان کی دیواریں چھلنی کی طرح سوراخ ہو گئیں، لوگ بڑے تن آور قد آور تھے، (۱۸) فٹ ان کا ادنیٰ قد ہوتا تھا، انہوں نے میدان میں اتر کر لنگوٹ کس کر مقابلہ کے لئے پیغمبر علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ [فصلت: ۱۵] (کون ہے ہم سے زیادہ پہلوان؟)۔ انہیں جواب ملا تھا: ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً﴾ [فصلت: ۱۵] (کیا یہ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس نے انہیں پیدا فرمایا وہ زیادہ ہے ان سے زور میں)۔ اللہ تعالیٰ نے چیلنج قبول فرماتے ہوئے ان طاقتور پہلوانوں کو ہوا کے

تھپڑوں سے ایسے کھوکھلا کر کے گرادیا گویا کھجور کے بیجان کھو کھلے تنے ہیں، جن کا سرا اوپر سے کٹ گیا ہو۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ
الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿٦١﴾ قَالُوْا یٰصٰلِحُ
قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ
اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ یَّنْصُرُنِیْ
مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَیْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ ﴿٦٣﴾ وَیٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ
فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِیْبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ
ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ
مِّنَّا وَمِنْ خِزْیِ یَوْمِىٕذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ﴿٦٦﴾ وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا
فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿٦٧﴾ كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَاۤ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾

ترجمہ: اور ہم نے قومِ ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں، اس نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا، اور تمہیں اس میں آباد فرمایا، سوتم اس سے مغفرت طلب کرو، پھر اس کے حضور میں توبہ کرو، بیشک میرا ربّ قریب ہے، قبول کرنے والا ہے ﴿٦١﴾ وہ کہنے لگے کہ اے صالح! اس سے پہلے تو ہمیں تم سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، کیا تم ہمیں ان چیزوں کی عبادت سے روکتے ہو جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے؟ اور بلا شبہ ہم اس بات کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں جس کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو ﴿٦٢﴾ صالح نے کہا: اے میری قوم! تم بتاؤ اگر میں اپنے ربّ کی طرف سے دلیل پر ہوں، اور اس نے مجھے اپنی طرف سے رحمت عطا فرمائی ہے، پھر وہ کون ہے جو مجھے اللہ تعالیٰ سے بچالے گا اگر میں اس کی نافرمانی کروں؟ سوتم میرے لئے نقصان ہی کو بڑھا رہے ہو ﴿٦٣﴾ اور اے میری قوم! یہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی ہے، یہ بطور نشانی کے ہے، سوتم اسے چھوڑے رکھو اللہ تعالیٰ کی زمین میں کھاتی پھرے، اور اسے برائی کے ساتھ ہاتھ نہ لگانا، پھر تمہیں جلد آنے والا عذاب پکڑ لے گا ﴿٦٤﴾ سو انہوں نے اس کو مار ڈالا، اس پر صالح نے کہا کہ تم تین دن اپنے

گھروں میں بسر کرلو، یہ ایسا وعدہ ہے جو جھوٹا ہونے والا نہیں ہے ﴿۶۵﴾ پھر جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے صالح کو اوران لوگوں کو جوان کے ساتھ اہل ایمان تھے اپنی رحمت سے نجات دے دی، اوراس دن کی رسوائی سے نجات دی، بیشک تیرا ربّ قوت والا ہے، اور زبردست ہے ﴿۶۶﴾ اور جن لوگوں نے ظلم کیا انہیں چیخ نے پکڑ لیا، سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے ہوئے رہ گئے ﴿۶۷﴾ جیسا کہ وہ ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، خبردار! قومِ ثمود نے اپنے ربّ کے ساتھ کفر کیا، خبردار! دوری ہے ثمود کے لئے ﴿۶۸﴾

معارف ومنازل

حضرت صالح علیہ السلام قومِ ثمود کی طرف اللہ تعالیٰ کے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ سورۂ اعراف رکوع (۱۰) میں اس واقعہ کی تفصیل گزر چکی ہے۔

قوم کو آپ علیہ السلام نے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کی اوراس کے سوا دوسروں کی عبادت سے روکنے کی نصیحت فرمائی، سارے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا یہی ایک مشترک مقصد ہوتا ہے کہ پوری انسانیت اللہ تعالیٰ کی عبادت پر قائم رہے، اور غیر اللہ کی ہر قسم کی عبادت سے پرہیز کرے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں بتلایا کہ انسان کی ابتدائی پیدائش اللہ تعالیٰ نے مٹی سے شروع کی ہے، تمہارے سب کے باپ دادے اور حضرت آدم علیہ السلام اور سب کی پیدائش مٹی سے ہے، پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ ہی نے تمہیں اپنی زمین پر بسایا ہے، اور تمہاری تمام ضروریات کا اپنے فضل وکرم سے انتظام فرمایا ہے، تو جو خالق و مالک ہے، اور رازق و منتظم ہے، وہی عبادت کا حقدار و لائق ہے، نہ اور کوئی، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو، اس کے حضور جھکو، اور توبہ کرو، وہ تم سے بہت ہی قریب ہے، اور تمہاری توبہ قبول کرنے والا ہے۔

پھر قوم نے سرکشی اور غرور کی بنیاد پر یہ کہا کہ اے صالح! آئندہ ہمیں اس طرح کی باتیں نہ بتانا، اس سے پہلے تو ہماری بہت کچھ امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں، ہم چاہتے تھے کہ تم کو اپنا سردار بنالیں، لیکن تو نے ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا، تم نے ہمیں ہمارے بزرگوں باپ دادوں کی چال اوران کے طور طریقوں سے ہٹانے اور دور رکھنے کا پروگرام پیش کیا، ہمیں تو اس طرز دادا پر بہت غصہ اور شک ہے، تم نے وہ بات کہی جو کسی صورت ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے ان کے شکوک دور کرتے ہوئے فرمایا: میں اپنے ربّ کی طرف سے دلیل پر ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے رحمت عطا کی ہے، اگر تمہاری جہالت پر مبنی باتوں کا اتباع کروں تو اللہ تعالیٰ کا نافرمان بن جاؤں، تو اس کے عذاب اور گرفت سے مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا، لہٰذا ہر حال میں اس کا حکم وفرمان تمہارے سامنے بیان کرتا رہوں گا۔

پھر انہوں نے پہاڑ سے اونٹنی نکالنے کا مطالبہ کیا، اور وعدہ کیا اگر یہ معجزہ ظاہر ہوا تو ہم سب ایمان لائیں گے، پھر جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے اونٹنی ظاہر ہوئی، وہ گابھن تھی، فوراً اسی شکل وصورت میں ان کی فرمائش کے مطابق اس کا بچہ بھی پیدا ہوا، تو یہ ظالم ایمان لانے سے منکر ہوگئے، صرف چھ ہزار آدمیوں نے ایمان قبول کیا۔ اس کی پوری تفصیل سورۂ فجر کے فوائد میں آئے گی۔ اِن شاءاللہ تعالیٰ۔

حضرت صالح نے علیہ السلام انہیں اونٹنی کے متعلق ہدایات دیں، اور ساتھ ساتھ اونٹنی کے ساتھ ظلم وزیادتی کی صورت میں سخت عذاب سے بھی خبردار کیا، مگر یہ سب بے سود ثابت ہوئے، یہاں تک کہ انہوں نے اونٹنی کو ہلاک کیا، جس پر حضرت صالح علیہ السلام نے تین دن کے اندر اندر عذاب آنے کی اطلاع دی کہ پہلے روز تمہارے چہرے زرد پڑ جائیں گے، دوسرے روز ان کے چہروں کا رنگ سرخ ہوجائے گا، تیسرے روز ان کے چہرے سیاہ ہوجائیں گے، یہ اسی طرح ہوتا رہا، ایک دوسرے کو وہ دیکھتے رہے، اور عذاب کا یقین کرتے رہے، مگر توبہ کی توفیق سے محروم رہے، تیسرے روز فرشتۂ عذاب کی چیخ سے اور زمین کی ہولناک جنبش سے اوندھے منہ اپنے گھروں اور میدانوں میں پڑے تھے۔ یہ ہے ثمود اصحابُ الحجر کا مختصر قصہ اور داستان۔

ان کی ہلاکت قومِ عاد کے دوسو (٢٠٠) سال بعد ہے۔ سعودی عرب کے آخر میں مملکت اردن وشام کے درمیان مدائنِ صالح کے نام سے ان کے پہاڑی مکانات اب بھی موجود ہیں۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ
حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ
اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٠﴾ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ

يَعْقُوبَ ﴿٧١﴾ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْٓا

اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿٧٣﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ

عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَاۗءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿٧٥﴾

يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَاۗءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿٧٦﴾

ترجمہ: اور ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے، انہوں نے سلام کے الفاظ بولے، ابراہیم نے سلام کا جواب دیا، پھر دیر نہ لگائی کہ ایک تلا ہوا بچھڑا لے آیا ﴿۶۹﴾ سو جب ابراہیم نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں پہنچ رہے ہیں تو ان کی طرف سے خوفزدہ ہو گئے، انہوں نے کہا کہ آپ ڈریں نہیں، بیشک ہم قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں ﴿۷۰﴾ اور ان کی بیوی کھڑی ہوئی تھی سو وہ ہنس پڑی، پس ہم نے اسے اسحٰق کی اور اسحٰق کے پیچھے یعقوب کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی ﴿۷۱﴾ وہ کہنے لگی: ہائے خاک پڑے! میں بچہ جنوں گی؟ حالانکہ میں بڑھیا ہوں، اور میرے شوہر بڑے میاں ہیں، یہ تو ایک عجیب چیز ہے ﴿۷۲﴾ وہ کہنے لگے: کیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تعجب کرتی ہے؟ اے اہلِ بیت! تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، اور اس کی برکتیں ہوں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ مستحق حمد ہے، بڑائی والا ہے ﴿۷۳﴾ پھر جب ابراہیم کا خوف جاتا رہا، اور اس کے پاس خوشخبری آگئی، تو ہم سے قومِ لوط کے بارے میں جدال شروع کر دیا ﴿۷۴﴾ بیشک ابراہیم بردبار، رحمدل، رجوع کرنے والے تھے ﴿۷۵﴾ اے ابراہیم! اس بات سے اعراض کرو، بیشک تمہارے ربّ کا حکم آچکا ہے، اور بیشک ان پر عذاب آنے والا ہے، جو واپس نہ ہوگا ﴿۷۶﴾

معارف ومنازل

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس دو فرشتے مہمان بن کر بشکلِ انسان آتے ہیں، جو قومِ لوط کی ہلاکت کی خبر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں فرزند ہونے کی بشارت لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں، وہ آکر سلام کرتے ہیں، آپ علیہ السلام ان کے جواب میں سلام کہتے ہیں، سلام کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے سامنے مہمانداری پیش کرتے ہیں، بچھڑے کا گوشت، جسے گرم پتھروں پر کباب کیا گیا تھا، وہ پیش فرماتے ہیں، جب دیکھا کہ آنے والے مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے ہی نہیں، اس پر وہ خوفزدہ ہو گئے، دل میں خوف پیدا ہوا، اور زبان سے اس کا اظہار بھی فرمایا۔ سورۃ الحجر میں ہے: ﴿قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ﴾ [الحجر: ۵۲] (یعنی تمہارے نہ کھانے سے

ہمیں ڈر لگتا ہے)۔

اس وقت دستر خوان پر ان کے ساتھ وہ بھی بیٹھ گئے تھے، اس زمانہ کے لوگوں میں رواج تھا کہ جو لوگ کسی کو اگر گزند پہنچانا چاہتے تو نمک حرامی سے پرہیز کرتے، یعنی اس کے کھانے سے اجتناب کرتے، اور اس کو عیب جانتے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے معاشرے پر رحم فرمائے جو کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے تو اس کا کھانا خوب مزے سے کھا کر کارروائی کرتا ہے۔

اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کام کاج میں لگی ہوئی تھیں، اور قریب میں کھڑی تھیں، فرشتوں نے جب کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلبِ مبارک میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے، تو اس کیفیت کو دیکھ کر حضرت سارہ علیہا السلام ہنس پڑیں، یہ آپ کا ہنسنا غیر اختیاری تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوفزدہ دیکھ کر مہمان فرشتوں نے کہا: آپ خوف نہ کیجئے، ہم کوئی انسان نہیں، فرشتے ہیں، قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں، کہ انہیں ہلاک کر دیں۔ حضرت سارہ علیہا السلام کو قومِ لوط کی ہلاکت کی خبر نے خوش کر دیا۔ اسی کے ساتھ انہیں دوسری خوشخبری بھی سنائی گئی کہ اس ناامیدی کی عمر میں تمہارے ہاں جلیل القدر بچہ پیدا ہوگا، انہیں یہ بھی تعجب تھا کہ جس قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اتر رہا ہے وہ قوم پوری غفلت میں ہے۔

الغرض فرشتوں نے انہیں حضرت اسحٰق علیہ السلام اور ان کے پیچھے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری سنائی، یہ سن کر حضرت سارہ علیہا السلام نے عورتوں کی عام عادت کے مطابق اس خوشخبری پر تعجب کا اظہار کیا، اور سورۃ الذاریات میں ارشاد ہے: ﴿فَأَقْبَلَتِ امْرَأَتُهُ فِي صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوزٌ عَقِيمٌ ۝٢٩ قَالُوا كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ ۝٣٠﴾ [الذاریات] (پھر سامنے آئیں ان کی عورت بولتی ہوئی، پھر پیٹا اپنا ماتھا اور کہنے لگی: کہیں بڑھیا بانجھ؟ وہ بولے: یوں ہی کہا تیرے ربّ نے، بیشک وہ بڑی حکمت والا، علم والا ہے) کہ میاں بیوی دونوں کے اس بڑھے ہوئے بڑھاپے میں اولاد کیسی؟ یہ تو سخت حیرت کی بات ہے۔ فرشتوں نے کہا کہ امرِ الٰہی میں کیا حیرت؟ تم دونوں کو اس عمر میں یعنی بڑھاپے میں ہی اللہ تعالیٰ بیٹا عطا فرمائے گا، اس کا فیصلہ ہو چکا ہے، گو تم سے آج تک کوئی اولاد نہیں ہوئی، اور تمہارے شوہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر بھی ڈھل چکی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کمی نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ جو چاہے گا وہی ہوگا، خواہ اسباب کچھ بھی ہوں۔

فرشتوں نے ان کے لئے دعا فرمائی: اے نبی کے اہلِ خانہ، اہل بیت! تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں

ہوں، اللہ تعالیٰ شانہ تعریفوں والا اور بزرگ ہے۔

مہمانوں کے نہ کھانے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خوفزدہ ہونا یہ امرِ طبعی ہے، یہ منصب نبوت کے خلاف نہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی لاٹھی کے سانپ بننے پر خوفزدہ ہو گئے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قومِ لوط کے بارے میں مجادلہ و بحث:

وہ یہ ہے کہ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ فرشتے قومِ لوط کی ہلاکت کے لئے بھیجے گئے ہیں، تو آپ علیہ السلام فرمانے لگے کہ اگر کسی بستی میں تین سو مؤمن ہوں تو کیا پھر بھی اس بستی کو ہلاک کیا جا سکتا ہے؟ فرشتوں نے جواب دیا کہ نہیں، پھر پوچھا: اگر چالیس مؤمن ہوں؟ جواب ملا: نہیں، پھر دریافت کیا: اگر تیس ہوں تو کہا گیا کہ پھر بھی نہیں، یہاں تک کہ تعداد گھٹاتے پانچ کی بابت پوچھا، فرشتوں نے یہی جواب دیا کہ نہیں، پھر ایک کی نسبت سوال کیا، تو یہی نہیں والا جواب ملا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ﴿قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ڭ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ڭ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ﴾ [العنکبوت: ۳۲] (یعنی فرشتوں نے کہا کہ وہاں حضرت لوط علیہ السلام کی موجودگی کا ہمیں علم ہے، ان کو اور ان کے اہل کو ہم بچائیں گے، سوائے ان کی کافرہ بیوی کے کہ وہ ہلاک شدگان میں سے ہوگی)۔ اب ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہوا، اور وہ خاموش ہو گئے۔ فرمایا: ابراہیم علیہ السلام بردبار، رحمدل اور رجوع کرنے والے تھے۔

فائدہ:

اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ ذَبِیحُ اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، کیونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی تو بشارت دی گئی تھی، اور ساتھ ہی ان کے ہاں اولاد ہونے کی بھی بشارت دی گئی تھی، حضرت اسماعیل علیہ السلام عمر میں حضرت اسحاق علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے، تیرہ سال کا قول ضعیف ہے۔

فائدہ:

یہاں ان آیات کریمہ میں تصریح ہے کہ اہلِ بیت کا اطلاق بیوی یعنی حضرت سارہ علیہا السلام پر ہو رہا ہے، تو ہمارے آقا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں شامل ہیں، پس جو لوگ (روافض) ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو اہل بیت سے خارج مانتے ہیں اس کا جواب ان کے پاس بھی نہیں، یہ

آیت ان کے منہ پر طمانچہ ہے۔

فائدہ:

جب فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی خوشخبری سنائی تو اس وقت آپ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال تھی، اور حضرت سارہ علیہا السلام کی عمر اسی (۸۰) سال تھی، جو کہ بہت بڑی عمر ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ابو الانبیاء ہیں، چار ہزار پیغمبر علیہم السلام آپ علیہ السلام کی نسل میں ہیں، اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ علیہ السلام ہی کا مقام ہے، وہ بھی اس پر قدرت نہیں رکھتے کہ اپنی بیوی کو اولاد عطا کرے، اس بڑھاپے تک اولاد کے لئے دعا کرتے ہی رہے، مگر اجابت نہیں ہوئی۔

ہمارے زمانے کے مصنوعی تجارت، پیشہ دین سے آزاد، پیروں اور فقیروں، سادات اور گدی نشینوں نے عوام الناس جُہلاء کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈال رکھا ہے کہ تھوک کے حساب سے لوگوں کو بچے دینے کی پیش کش کر رہے ہیں، اور اولاد دینے کا پورا ٹھیکہ ان کے پاس ہے، تعویذ گنڈوں کی وہ بے تحاشا خرید و فروخت کا سلسلہ رواں دواں ہے، پناہ بخدا، روزِ قیامت اور قبر میں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے؟

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ۝٧٧ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ
یُهْرَعُوْنَ اِلَیْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ قَالَ یٰقَوْمِ هٰۤؤُلَآءِ بَنَاتِیْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ؕ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ۝٧٨ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ
بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ۝٧٩ قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ ۝٨٠
قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْكُمْ
اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِیْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ۝٨١
فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۝٨٢ مُّسَوَّمَةً
عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ۝٨٣

ترجمہ: اور جب ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لوط کے پاس آئے تو وہ ان کی وجہ سے رنجیدہ ہوئے، اور ان

کی وجہ سے تنگ دل ہوئے، اور کہنے لگے: آج کا دن مصیبت کا دن ہے ﴿۷۷﴾ اور ان کی قوم کے لوگ ان کے پاس جلدی جلدی دوڑتے ہوئے آگئے، اور وہ اس سے پہلے برے کام کیا کرتے تھے۔ لوط نے کہا: اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں، وہ تمہارے لئے پاکیزہ ہیں، سو تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھی بھلا مانس نہیں ہے؟ ﴿۷۸﴾ کہنے لگے کہ تمہیں تو معلوم ہے کہ ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں ہے، اور تم تو جانتے ہو کہ ہمارا کیا مطلب ہے؟ ﴿۷۹﴾ لوط نے کہا: کاش میرا تم پر زور چلتا ہوتا، یا میں کسی مضبوط پائے کی پناہ لیتا ﴿۸۰﴾ فرشتوں نے کہا: اے لوط! بیشک ہم تیرے ربّ کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ لوگ ہرگز تم تک نہیں پہنچ سکیں گے، سو تم رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ، اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے پھر کر نہ دیکھے، مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جانا، بیشک اسے وہی عذاب پہنچنے والا ہے جو قوم کے سب لوگوں کو پہنچے گا ﴿۸۱﴾ بیشک صبح کا وقت ان کے عذاب کے لئے مقرر ہے، کیا صبح قریب نہیں ہے؟ ﴿۸۲﴾ جب حکم ہمارا آپہنچا تو ہم نے زمین کے اوپر کے تختے کو نیچے کر دیا، اور ہم نے اس زمین پر کنکر کے پتھر برسائے جو لگاتار گر رہے تھے، جن پر آپ کے ربّ کے پاس سے نشان لگائے ہوئے تھے، اور یہ بستیاں ان ظالموں سے دور نہیں ﴿۸۳﴾

معارف ومنازل

قومِ لوط کا کردار، اور لوط علیہ السلام کی بے بسی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رخصت ہو کر یہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے، یہ فرشتے امرد خوبصورت بڑے حسین تھے، تاکہ قومِ لوط علیہ السلام کی پوری آزمائش ہو جائے، اور فرشتوں کے سامنے ان کی تباہی کا راز کھل جائے۔ حضرت لوط علیہ السلام ان پاکیزہ خوبصورت پھولوں جیسے مہمانوں کو دیکھ کر پریشانیوں کے سمندر میں ڈوب گئے، اور خون کے آنسو رونے لگے، اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھانے لگے، اور سوچنے لگے کہ اگر انہیں مہمان بناتا ہوں تو ممکن ہے خبر پا کر لوگ چڑھ دوڑیں، کیونکہ ان کی بے شرمی اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے، اور اگر انہیں مہمان نہیں رکھتا تو یہ بیگانہ معصوم لوگ ان ظالموں کے ہاتھ چڑھ جائیں گے، زبان سے بھی نکل گیا کہ آج کا دن نہایت اندوہناک پریشان کن دن ہے۔

قوم والے اپنی شرارت سے باز نہیں آئیں گے، اور مجھ میں ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، کیا ہوگا؟

حضرت قتادہ ؒ فرماتے ہیں کہ لوط علیہ السلام بستی سے باہر اپنی زمین میں تھے کہ یہ مہمان وہاں آپ علیہ السلام کے پاس آئے، شرما شرمی انکار تو نہ کر سکے، ان کو لے کر گھر لے آئے، راستے میں صرف اس نیت سے کہ یہ اب بھی واپس چلے جائیں، ان سے کہا کہ یہ لوگ بہت برے ہیں، خدا کی قسم ان سے برے لوگ شاید کہیں بھی نہیں، کچھ دور جا کر پھر یہی کہا، اور گھر پہنچنے تک چار بار یہی کہتے رہے۔

اگر یہ عام لوگ ہوتے تو گھبرا کر چلے جاتے، مگر چونکہ بشکلِ انسان فرشتے تھے، اور قوم کی ہلاکت کا پیغام لے کر آئے تھے، اور بڑے مطمئن تھے، اس لئے ہر چند معذرت سنتے رہے پرواہ نہیں کی، چابی ان کے ہاتھ میں تھی، مگر ماجرا اور قوم کی شرارت دیکھنا چاہتے تھے، اور ان کی بیہودہ گفتگو سننا چاہتے تھے، اس لئے بروقت لوط علیہ السلام کے سامنے اپنے آنے کا مقصد اور اپنے فرشتہ ہونے کا اظہار نہ کر سکے، تاکہ پیغمبر علیہ السلام کے صبر اور بے بسی کا، اور قوم کی بے حیائی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں۔

جب پیمانہ صبر جب لبریز ہوگا، اور پیغمبر علیہ السلام تڑپ تڑپ کر رونے لگے گا، اور ہر منحوس کافر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنے معصوم مہمانوں کی عزّت بچانے کی کوشش کرے گا، تب ان کے سامنے راز کھول کر ہمیں کہنا پڑے گا کہ گھبرائیں مت، ہم تک کسی خبیث کی رسائی نہیں ہوسکتی، ہم فرشتے ہیں، سمیع وبصیر غیور ربّ کا پیغام لے کر آئے ہیں، فی الحال مٹی کی مٹھی لے کر ان کی طرف پھینکنا ہے، یہ صبح تک اندھے ہو جائیں گے، اور خوب تڑپ کر آہ وفغان میں مبتلا ہو جائیں گے۔

اس دوران آپ علیہ السلام اپنے اہل بیت کو لے کر یہاں سے نکلیں گے، اور اندھوں کے اندر سے نکل کر جائیں گے، پیچھے ہماری وہ وحشتناک کارروائی ہوگی، جسے چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا ہوگا، جسے دیکھ کر یا سن کر لوگ طوفانِ نوح کی نیرنگیوں کو بھی بھول جائیں گے "اللہ اللہ"۔ پیغمبر علیہ السلام نے بڑی بے تابی میں کہا کہ اپنی یہ کارروائی ابھی جلدی شروع کیوں نہیں کرتے؟ صبح کا وقت تو دور ہے، فرشتوں نے کہا: تاکہ آسانی کے ساتھ آپ علیہ السلام کے اہل وعیال اس سرزمین سے نکل جائیں، کیونکہ ہم نے پوری دھرتی کو جہاں اس قوم کی بستیاں آباد ہیں (یہ کل ۱۲ یا ۱۸ بستیاں تھیں) باقی زمین سے کاٹ کر آسمان تک لے جانا ہے، پھر الٹا کر کے تہہ وبالا اوپر نیچے کر کے اسی جگہ پلٹانا ہے۔ [درمنثور]

قومِ لوط کا اصلی چہرہ، اور ان کی ہلاکت وتباہی کا بیان:

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کا حکم بھی یہی تھا کہ جب تک قوم کا نبی تین مرتبہ ان کی برائی بیان نہ کرے اس وقت تک

قوم کو ہلاک نہ کرنا۔ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے چل کر دوپہر کو یہ فرشتے نہر سدوم کو پہنچے، وہاں لوط علیہ السلام کی صاحبزادی جو پانی لینے گئی تھیں مل گئیں، انہوں نے ان سے پوچھا کہ یہاں ہم کہیں ٹھہر سکتے ہیں؟ ہم مہمان ہیں، تو لڑکی نے کہا کہ آپ یہاں رکیں میں واپس آکر تمہیں جواب دوں گی، اسے خوف ہوا کہ اگر یہ لوگ قوم کے ہاتھ لگ گئے تو ان کی بڑی بے عزّتی ہوگی، اس نے آکر والد صاحب لوط علیہ السلام سے ذکر کیا کہ شہر کے دروازے پر چند پردیسی نوعمر جوان لوگ ہیں، ان جیسے حسین تو میں نے آج تک کوئی خوبصورت انسان نہیں دیکھے، آپ جائیں انہیں کہیں ٹھہرائیں، ورنہ قوم والے انہیں ستائیں گے۔

اور اس بڑی بستی سدوم کے لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہہ رکھا تھا کہ دیکھو! کسی باہر والے کو تم اپنے یہاں مت ٹھہراؤ، پھر ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، آپ علیہ السلام نے جب یہ حالت سنی تو جا کر چپکے سے انہیں اپنے گھر لے آئے، کسی کو کانوں کان خبر نہ دی، مگر آپ علیہ السلام کی کافرہ بیوی جو قوم سے ملی ہوئی تھی اس کے ذریعہ بات پھوٹ نکلی، اب کیا تھا کہ سارے بدمعاش دوڑے بھاگے آگئے، ان کی خوشیوں کا کوئی اندازہ نہ ہوا، اور بدکاری والی خصلت ان کی عادت اور فطرت بن چکی تھی، وہ ہر وقت شرابی کی طرح اس کے نشے میں بیتاب اور مست نظر آتے تھے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ السلام نے زوردار نصیحتوں کا سلسلہ شروع فرمایا، کہ تم لوگ اپنی اس خِصلتِ بد سے توبہ کرو، اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو پیدا فرما کر تمہاری جنسی خواہشات پوری کرنے کے لئے تمہیں دیدیا، اور تمہاری قوم کی عورتیں میری بیٹیاں ہیں، ان سے نکاح کر کے خوب تسکین حاصل کرو، اور اپنی نسل کی آبیاری کرو، آرام کی زندگی گزارو، اور ان سے لطف اندوز ہوتے رہو، وغیرہ۔

مگر یہ بدبخت ظالم کہاں مانتے تھے، وہ کہنے لگے کہ ہم تو پہلے ہی آپ علیہ السلام کو منع کر چکے تھے کہ باہر کے کسی کو اپنے ہاں مہمان نہ ٹھہرایا کرو، اور ہمیں تمہاری قوم کی عورتوں سے کوئی سروکار نہیں، اور تجھے معلوم ہے کہ ہمارا ارادہ کیا ہے؟ یعنی ہمارا ارادہ ان مہمان لڑکوں سے ملنے کا ہے، اس وقت مہمان گھر کے اندر تھے، اور پیغمبر علیہ السلام گھر کے دروازے پر کھڑے پہرہ دے رہے تھے، اور لوگوں نے آپ علیہ السلام کے گھر کو گھیرے میں لیا ہوا تھا، اور زبردستی اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے، جبکہ پیغمبر علیہ السلام نہایت بے کسی کے عالم میں ہاتھ باندھ کر ہاتھ جوڑ کر انہیں منع کرتے، اور روکتے رہتے تھے، یہاں تک کہ رو رو کر خدا کا واسطہ دے کر کہنے لگے: کاش اگر آج میرا کوئی جتھہ یا معاون ومددگار جماعت ہوتی، تو میرا یہ حال نہ ہوتا، اور میں تمہیں تمہاری شرارت کا اپنے قبیلہ اور کنبہ کے ذریعہ مزہ چکھا دیتا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو حضرت لوط علیہ السلام پر کہ وہ زور آور قوم وقبیلہ کی پناہ لینا چاہتے تھے۔[بخاري] مراد اس سے ذات باری تعالیٰ جل شانہ ہے، کتنا اچھا ہوتا کہ وہ اس کی پناہ کو طلب کرتے۔ ہاں! شدت پریشانی میں شاید اس طرف متوجہ نہ ہوئے، آپ علیہ السلام کے بعد جو پیغمبر بھیجا گیا وہ اپنی قومی ثروت میں ہی بھیجا گیا۔[ابن کثیر]

جب لوط علیہ السلام کی تنگ دلی، حزن وملال، افسردگی اپنی انتہاء کو پہنچی، اور لوگوں کی سرزوری اور کشمکش میں بھی اضافہ ہوتا رہا، تو اس وقت فرشتوں نے پردۂ خفا کو کھولتے ہوئے حقیقتِ حال کا اظہار فرمایا:

﴿قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ﴾ ہم تیرے رب تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قاصد ہیں، یہ لوگ ہم تک یا آپ تک پہنچ ہی نہیں سکتے، مزید زاری ومنت کی ضرورت نہیں، آپ درمیان سے ہٹیں، ہمیں مختصر کارروائی کا موقع فراہم کریں، یہ سارے ابھی لحوں میں اندھے ہو جائیں گے، اور اپنے گھروں تک پہنچنے کی محتاج ہو کر گلی کوچوں میں تڑپ تڑپ کر گرتے رہیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہو گیا، یہاں تک کہ چند گھنٹے بعد صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔ آپ رات کے آخری حصے میں اپنے اہل وعیال کو لے کر یہاں سے نکل جایئے، خود ان سب کے پیچھے رہیے۔﴿وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ﴾[الحجر:٦٥] (اور آپ خود ان کے پیچھے پیچھے چلیے)۔

اور سیدھے اپنی راہ چلیے، قوم کی آہ وبکا پر ان کے چیخنے چلانے پر تمہیں مڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے (کیونکہ عذاب کی کارروائی بہت نرمی اور آہستگی سے شروع ہو جائے گی، اول آہستہ آہستہ زمین میں جنبش اور زلزلہ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی، پھر آہستہ آہستہ زمین اوپر کو اٹھتی رہے گی، یہاں تک کہ زمین کا یہ پورا حصہ جہاں تک اس قوم کی آبادی ہے باقی زمین سے کٹ کر جدا ہو کر آسمانوں کی بلندی پر پہنچ کر زوردار قوت کے ساتھ الٹ کر اپنے مستقر پر دے مارا جائے گا)۔

پھر اس اثبات سے حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا استثنا کیا گیا، کہ وہ اس حکم کی پابندی نہ کر سکے گی، وہ عذاب کے وقت قوم کی ہائے وائے سن کر مڑ کر دیکھے گی، اس لئے قضاء الٰہی میں اس کا بھی ان کے ساتھ ہلاک ہونا طے ہو چکا ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ لوط علیہ السلام کی کافرہ بیوی یہاں سے نکلنے میں آپ علیہ السلام کے ساتھ تھی، لیکن عذاب کے نازل ہونے پر (کیونکہ عذاب آہستہ آہستہ شروع ہو گیا تھا) قوم کا شور اور آہ وبکا سن کر صبر نہ کر سکی، مڑ کر ان کی طرف دیکھا، اور زبان سے نکل گیا: ہائے میری قوم! اسی وقت آسمان سے ایک پتھر اس پر بھی گرا، اور اس کا کام بھی تمام ہو

گیا۔[ابن کثیر]

حضرت حذیفہ ابن الیمان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس خبیث قوم کے پاس آتے، انہیں نصیحت فرماتے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ کا عذاب نہ خریدو، مگر انہوں نے حضرت خلیل علیہ السلام کی بات بھی نہ مانی۔

حضرت لوط علیہ السلام کھیتی سے مہمانوں کو لے کر جب روانہ ہوئے تھے تو گھر پہنچنے سے پہلے راستے میں چار مرتبہ فرشتوں کے سامنے اپنی قوم کی برائی بیان فرمائی تھی، آپ علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ گھبرا کر واپس چلے جائیں تاکہ میری بدنامی اور ان کی بے عزّتی نہ ہو، کیونکہ اس وقت ان کو یہ معلوم نہ ہوا کہ یہ فرشتے ہیں، اس پر حضرت جبریل علیہ السلام نے مکمل اطمینان کیا کہ نبی کی تین مرتبہ شہادت کے بعد ہمیں کارروائی کا حکم ہوا ہے، چنانچہ شہادت مکمل ہوگئی، اور کارروائی کا جواز ہوگیا۔[ابن کثیر]

پس حضرت جبریل علیہ السلام نے عذاب کی اجازت طلب کی، اور انہیں اجازت مل گئی، چنانچہ فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ﴾ اس آیت کریمہ میں صرف دو عذابوں کا بیان ہے، جبکہ سورۂ حجر میں ایک تیسرے عذاب کا بھی ذکر فرمایا:

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ﴾[الحجر: ۷۳](چنانچہ سورج نکلتے ہی ان کو چنگھاڑ نے آ پکڑا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر تینوں طرح کا عذاب آیا: چیخ نے بھی پکڑا، اور ان کی زمین کا تختہ بھی الٹ دیا گیا، اور ان پر پتھر بھی برسائے گئے۔ تو فرمایا: جب ہمارا امر آ پہنچا، اور جو فرشتے عذاب کے لئے بھیجے گئے تھے انہوں نے ان بستیوں کا تختہ الٹا کر پلٹ دیا، نیچے کی زمین اوپر اور اوپر کی زمین نیچے ہوگئی، جہاں سے جہنم نزدیک ہے، اور پوری قوم اس میں دب کر ہلاک ہوگئی، اور فرشتوں نے اوپر سے پتھر بھی برسادیئے، جو کنکر کے پتھر تھے، وہ لگاتار برس رہے تھے، اور ان پتھروں پر نشان بھی لگے ہوئے تھے، (جیسے کہ اَبرَہہ اَشرم کے لشکر پر ابابیل نے نشان زدہ پتھر گرائے تھے)۔ بعض علماء تفسیر نے فرمایا ہے کہ ہر پتھر جس شخص پر پڑتا تھا اس پر اس کا نام لکھا ہوا ہوتا تھا، اس کو قرآن حکیم نے مُسَوَّمَةً یعنی نشان زدہ اسی لئے فرمایا۔[معالم التنزیل]

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ جو لوگ اس علاقے میں موجود تھے ان پر زمین الٹنے کا عذاب آیا، اور جو لوگ ادھر ادھر نکلے ہوئے تھے ان پر پتھر برسے، اور وہ پتھروں کی بارش سے ہلاک ہوگئے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ان میں سے ایک شخص مکہ معظمہ میں تجارت کے لئے گیا ہوا تھا، وہ شخص مکہ مکرمہ میں رہنے کی وجہ سے بچ گیا

تھا، جب وہ چالیس دن کے بعد حرم شریف سے نکلا تو اس کو بھی پتھر لگ گیا، جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔

سِجِّیل کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ لفظ معرّب ہے، سنگ اور گل سے مرکب ہے، فارسی میں سنگ پتھر کو اور گل مٹی کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ پتھر ایسے تھے جو اینٹ کی طرح مٹی سے بنے ہوئے تھے، پھر آگ میں پکا کر پتھر بنائے گئے تھے، جنہیں جھانوہ کہتے ہیں، یہ بڑے سخت اور گول ہوتے ہیں، عام طور پر لوگ اسے غلیل میں استعمال کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ یہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی قول ہے۔

قومِ لوط کی بستیوں کے متعلق علماء تفسیر نے متعدد اقوال بیان کئے ہیں، مجموعی طور پر بارہ یا اٹھارہ بستیوں کا ذکر ہے، یعنی چھوٹی بڑی ملا کر، البتہ بڑی بستیوں کے نام یہ ہیں:

میعہ، صموہ، عصرہ، دوما، اور صدر مقام، سب سے بڑی بستی کا نام سدوم ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ پورے علاقے کا نام بھی سدوم ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام اسی سدوم میں رہتے تھے۔ یہ بستیاں نہر اردن کے قریب تھیں، اور ہر بستی کی آبادی ایک لاکھ پر مشتمل تھی۔ البتہ سدوم دیگر بستیوں سے کافی بڑی تھی، اب یہاں بحیرۂ مردار یا بحر میت ہے، جو آج بھی موجود ہے، جس کا پانی نہایت ہی مردار اور بدبودار ہے، جس میں کوئی جانور نہیں، اور یہ جانوروں کو ہلاک کرتا ہے، اس کے پانی سے سبزی، پھل، درخت اور گھاس کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا، اور یہ وہاں کے لوگوں کی نظر میں اب بھی مقامِ عبرت ہے، گویا کہ یہ ایک قسم کا جہنمی پانی ہے۔

فوائد:

(۱) جب تک کسی قوم کے ایمان کا امکان ہو اس وقت تک ان پر آسمانی عذاب نہیں آتا، اور جب یہ امکان ہی ختم ہو گیا، اور ناامیدی ہو گئی تو عذاب آسکتا ہے۔

(۲) قوموں پر جو عذاب آیا ہے اس کا سب سے بڑا سبب کفر اور شرک رہا ہے، دوسرے گناہ اس کفر و شرک کے معاون کے درجے میں رہے ہیں۔

(۳) بڑوں پر عذاب تو ان کے کفر و شرک اور تکذیب انبیاء علیہم السلام کی وجہ سے آتا ہے، ان کے چھوٹے بچے چونکہ ماں باپ کے تابع ہوتے ہیں اس لئے وہ بھی عذاب کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، یا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہی ہوتا ہے کہ یہ بچے بالغ ہونے کے بعد ایمان نہیں لائیں گے، اور ماں باپ، آباء و اجداد کے نقش قدم پر چل کر کفر اختیار کریں گے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قیامت کا فیصلہ کفار کے بچوں کے متعلق کچھ اور ہو، جیسے کہ علماء کرام کے

درمیان مختلف فیہ ہے۔ واللہ اعلم

(۴) گزشتہ امتوں کے مجموعی گناہ ان کی ہلاکت کا سبب بنے، جبکہ اس آخری امت میں وہ عجیب قسم کے گناہ نمایاں ہیں، جن کی کوئی حد نہیں۔ یورپ اور چائنا اور دوسرے ممالک میں ایک گھنٹے کے اندر جو گناہ شرک وکفر، لواطت، زنا، قتل وغارت ہوتے رہتے ہیں جو ہلاک شدہ اقوام کی پوری زندگی کے گناہوں سے زیادہ ہیں، پھر بھی وہ آسمانی عذابوں سے محفوظ ہیں، یہ سب کچھ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل اور وسیلہ سے ہے، جس کی تفصیل ان شاء اللہ سورۂ انبیاء کی تفسیر میں بیان کریں گے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنبياء:۱۰۷] (ہم نے آپ کو مخلوقات کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے)۔

(۵) ﴿هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ يَاهُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ﴾ یہاں بَنَاتِيْٓ سے آپ علیہ السلام کی نسبی اور صلبی بنات مراد نہیں، جیسا کہ تحریف شدہ بائبل میں ملعون عیسائیوں نے لکھا ہے، جس منحوس قوم نے خدا تعالیٰ شانہ کو معاف نہ کیا ہو وہ لوط علیہ السلام کو کیا معاف کرے گی؟ انبیاء کرام علیہم السلام کا ادب واحترام جو قرآن مجید کے ماننے والوں کی قسمت میں ہے وہ کسی قوم میں نہیں۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ہرگز نہ سمجھا جائے کہ لوط علیہ السلام نے اپنی لڑکیوں کی نسبت یہ فرمایا تھا، نہیں، بلکہ نبی اپنی پوری امت کا گویا باپ ہوتا ہے۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہے یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کی عورتوں سے بے نکاح ملاپ کرنے کو فرمایا ہو، نبوت کی شان وعصمت اس سے بھی بالاتر ہے، بلکہ آپ علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ جس مقصد کے لئے عورت کی تخلیق ہے تم ان سے نکاح کرلو، اور تسکین حاصل کرلو، مردوں سے بالکل دور رہو۔ ان کے علاوہ لاکھوں مفسرین کرام اسی ایک بات پر متفق رہے ہیں کہ بَنَاتِيْ سے مراد روحانی بنات ہیں، نہ کہ صلبی اور نسبی، بلکہ روحانی کے ساتھ اختلاط بھی اسی صورت میں ہے جبکہ عقد نکاح کے تحت ہو۔ وَاللهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ وَلَهُ الْحَمْدُ

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۚ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿٨٦﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ
تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿٨٧﴾

ترجمہ: اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، تمہارے لئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، بیشک میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ آسودہ حال ہو، بیشک میں تم پر ایک ایسے دن کے عذاب کا اندیشہ کرتا ہوں جو گھیر لینے والا ہوگا ﴿۸۴﴾ اور اے میری قوم! انصاف کے ساتھ ناپ تول کو پورا کرو، اور لوگوں کو چیزیں گھٹا کر نہ دو، اور زمین میں فساد مچانے والے نہ بنو ﴿۸۵﴾ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا جو کچھ بچ جائے وہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم مؤمن ہو، اور میں تم پر پہرہ دینے والا نہیں ہوں ﴿۸۶﴾ وہ لوگ کہنے لگے کہ اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں یہ بتاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادے کرتے رہے ہیں؟ یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا چھوڑ دیں؟ بیشک تم تو بڑے بردبار ہو نیک چلن ہو ﴿۸۷﴾

معارف ومنازل

حضرت شعیب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے دو قوموں میں مبعوث فرمایا۔ ایک اصحاب مدین، دوسرے اصحابُ الایکہ۔ مدین والوں کا تذکرہ سورۂ اعراف، سورۂ ہود اور سورۂ عنکبوت میں ہے۔ اور اصحابُ الایکہ کا ذکر سورۃ الشعراء میں ہے۔ یہ لوگ بھی مشرک تھے، غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے، تجارتی کاروبار میں بڑی خیانت کرتے، ناپ تول میں کمی کرتے تھے، حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو تبلیغ کی اور توحید کی دعوت دی، شرک سے منع فرمایا، اور تطفیف سے یعنی لین دین میں کمی اور خیانت سے منع فرمایا، اور یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ لوگوں کو ان کے مال پورے انصاف سے ادا کرو، ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو، اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا جو حلال مال بچ جائے تمہارے لئے بہتر ہے جو تم ناپ تول میں کٹوتی کرتے ہو، تھوڑا حلال مال اس حرام مال سے بہتر ہے جو زیادہ ہو، حلال مال میں برکت ہوتی ہے اگرچہ کم ہو، اور حرام اگرچہ زیادہ ہو مگر بے برکت ہے، اور آخرت میں جہنم میں لے جانے والا ہوتا ہے۔

اور یہ بھی فرمایا کہ زمین میں فساد نہ مچاؤ، یعنی شرک نہ کرو، غیر اللہ کی عبادت نہ کرو، کاروبار یعنی تجارت میں

ناپ تول میں بے انصافی نہ کرو، یہ ساری چیزیں زمین میں فساد مچانے کے اسباب ہیں، اور میں تم پر پہرہ دار نہیں ہوں جو تمہیں زبردستی مسلمان بناؤں، یا زبردستی نیکی کی راہ پر ڈال دوں، اگر تم نے میری بات نہ مانی تو مجھے تمہارے لئے سخت عذاب کا اندیشہ ہے، کیونکہ تم سے پہلے لوگ جو ہلاک ہوئے وہ اسی شرک اور نافرمانی کی وجہ سے ہوئے، لہٰذا تم ان کی ہلاکت سے سبق سیکھو، عبرت حاصل کرو۔

قوم والوں نے کہا: اور بیہودگی پر اتر آئے، اور کہنے لگے: واہ میاں! تم بڑے نمازی آئے، کیا تمہاری نماز یہی بتاتی ہے کہ ہم ان چیزوں کی عبادت چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے ہوئے آئے ہیں؟

نماز کا ذکر انہوں نے استہزاء اور تمسخر کے طور پر کیا، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ تمہاری نماز عجیب ہے کہ ہم جو سامان مالِ تجارت فروخت کرتے ہیں اس پر پابندی لگاتی ہے، یہ ہمارا ہی مال ہے، جیسے چاہیں بیچیں، پورا ناپ تول کردیں یا اس میں کمی کریں، تمہیں اور تمہاری نماز کو اس سے کیا سروکار ہے؟ تم تو بڑے بردبار اور نیک چلن معلوم ہوتے ہو، اور دوسروں پر اعتراض کر کے انہیں گھٹیا سمجھتے ہو، یہ بھی انہوں نے بطور استہزاء اور تمسخر کے طور پر کہا۔

یہ جو انہوں نے کہا کہ ہمارا مال ہے، ہم اس میں جو چاہیں تصرف کریں، یہی بات ہمارے زمانے کے رسمی مسلمان بھی کہا کرتے ہیں، جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ سودی کاروبار نہ کرو، رشوت کا لین دین نہ کرو، ذخیرہ اندوزی نہ کرو، احتکار سے پرہیز کرو، بیمہ کمپنی میں مال جمع نہ کرو، غیر شرعی محرّمات کی خرید و فروخت نہ کرو، گناہ کا سامان نہ خریدو، ممنوعاتِ شرعیہ کے کاروبار چھوڑ دو، تو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ مولویوں کا عجیب مزاج ہے، اور یہ ان کا عجیب ڈھنگ ہے، ہر معاملے میں مداخلت کرتے ہیں، ہر شخص کا اپنا پیشہ ہے، جو چاہے کرے، اپنا مال ہے چوری کا نہیں کہ اس میں کسی کو مداخلت کی گنجائش ہو، انہوں نے خواہ مخواہ جائز و ناجائز کا رٹ لگایا ہوا ہے، اور برکت و بے برکتی کا مسئلہ کھڑا کیا ہے، یورپ میں یہ ہوتا ہے وہ ہوتا ہے، وہاں کوئی بے برکتی نہیں، خوشحالی ہے، ارزانی ہے، یہاں مولانا صاحبان شور مچاتے ہیں، اور ہماری آزادی سلب کرتے ہیں، یہ قیامت کی علامات ہیں وغیرہ۔ دیکھیں! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ایسے بے ضمیر لوگوں سے عرض ہے کہ تم جو کہتے ہو مال ہمارا ہے، یہ تمہاری بھول اور نادانی ہے، مال کو تو چھوڑ یئے وہ تمہارا کہاں سے ہوگا؟ تم خود اپنے نہیں ہو، تم اور تمہارے اموال سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہیں، وہ جب چاہے تم سے جان اور مال اور اولاد چھین لے، کیا تمہارے پاس مقابلے کی جرأت ہے؟ اور تم اللہ پاک کے حکم کو ٹال

سکتے ہو؟ ذرا ہوش کے ناخن لو، اور اس کی رضا و حکم کے سامنے جھکو، ورنہ تمہارا حشر نہایت برا ہوگا، یہ اس کا کرم ہے کہ چار دن کے لئے تمہیں مجازی مالک بنا دیا، پھر تم سرکش ہو گئے، اور اپنا مال کہنے سے نہ شرمائے۔ مولوی تو تم تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانے والے ہیں، فقط۔

قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ وَرَزَقَنِىۡ مِنۡهُ رِزۡقًا حَسَنًا ؕ وَمَاۤ
اُرِيۡدُ اَنۡ اُخَالِفَكُمۡ اِلٰى مَاۤ اَنۡهٰٮكُمۡ عَنۡهُ ؕ اِنۡ اُرِيۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ ؕ وَ
مَا تَوۡفِيۡقِىۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَيۡهِ اُنِيۡبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوۡمِ لَا يَجۡرِمَنَّكُمۡ شِقَاقِىۡۤ اَنۡ
يُّصِيۡبَكُمۡ مِّثۡلُ مَاۤ اَصَابَ قَوۡمَ نُوۡحٍ اَوۡ قَوۡمَ هُوۡدٍ اَوۡ قَوۡمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوۡمُ لُوۡطٍ
مِّنۡكُمۡ بِبَعِيۡدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ رَحِيۡمٌ وَّدُوۡدٌ ﴿۹۰﴾

ترجمہ: شعیب نے کہا کہ اے میری قوم! تم بتاؤ اگر میں اپنے ربّ کی طرف سے دلیل پر ہوں، اور اس نے مجھے اپنی طرف سے ایک بڑی دولت عطا فرما دی ہے، تو میں تمہیں حق کی دعوت دینا کیسے چھوڑ دوں؟ اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میں اس طرح تمہاری مخالفت کروں کہ جن کاموں سے روکتا ہوں، انہیں خود کرنے لگوں، میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں، جہاں تک مجھ سے ہو سکے، اور جو کچھ مجھے توفیق ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا، اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ﴿۸۸﴾ اور اے میری قوم! میری مخالفت تم کو اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تمہیں اس طرح کا عذاب پہنچ جائے جو قومِ نوح یا قوم ہود یا قوم صالح کو پہنچا، اور قوم لوط تم سے دور نہیں ہے ﴿۸۹﴾ اور تم اپنے ربّ سے استغفار کرو، پھر اس کے حضور میں توبہ کرو، بیشک میرا ربّ رحم فرمانے والا ہے، بڑی محبت فرمانے والا ہے ﴿۹۰﴾

معارف ومنازل

انبیاء کرام علیہم السلام کا پیغام اصلاح پر مبنی ہے:

جب حضرت شعیب علیہ السلام قوم کے بیہودہ جوابات سے مطمئن نہیں ہوئے، تو ایک دوسرے انداز سے انہیں نصیحت شروع فرمائی، انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! تم ہی بتاؤ اگر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل پر ہوں، جو

حق بات کہتا ہوں، اور حق کی طرف بلاتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت بڑی رحمت یعنی نبوت سے نوازا ہے، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں تبلیغ کرنا اور حق کی دعوت دینا چھوڑ دوں؟

اور پھر یہ بھی سمجھ لو کہ میں تمہیں جو کچھ بتاتا ہوں خود اس کے خلاف نہیں کرتا، اگر میرے قول وفعل میں تضاد ہوتا تو تم کہہ سکتے تھے کہ دوسرے کو نصیحت اپنے کو فضیحت، قول وعمل میں تضاد ہے، یہ ایک بہت بڑا عیب ہوتا، لیکن میں تمہیں وہی بات بتاتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں، میرا مقصد تمہاری ہمدردی ہے، خیر خواہی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ میں تمہاری جہاں تک میرے لئے ممکن ہے اصلاح کرتا رہوں، میرا منصب مجھے اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ تمہاری اصلاح میں کوئی کمی نہ کروں، اور تمہارے زنگ آلود قلوب کو نبوت کی بھٹی میں چاندی کی طرح صاف وروشن کردوں، اور جو کچھ میں نیک کام کرتا ہوں یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے، میں نے اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کیا، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں، اور تمہیں بھی اسی کی دعوت دیتا ہوں۔

آگے فرمایا: دیکھو! تم لوگ ضد نہ کرو، عناد پر کمربستہ نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ میری مخالفت تمہارے لئے عذاب کا ذریعہ نہ بن جائے، جیسے قومِ نوح اور قومِ ہود اور قومِ صالح نے اپنے پیغمبروں علیہم السلام کی مخالفت کی، اور انہیں جھٹلایا، تو ان پر عذاب آیا، ان ہلاک شدہ قوموں میں سے قومِ لوط بھی تھی، جسے زیادہ زمانہ نہیں گزرا، اور تمہارے قرب وجوار میں بھی ہیں، جن کے اثرات کا تم بخوبی اندازہ کرسکتے ہو۔ تم ان متمدن اقوام کی ہلاکت سے عبرت حاصل کرو، اور اپنے لئے عذاب کو دعوت نہ دو۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے مزید فرمایا کہ اپنے ربّ سے استغفار کرو، اپنے گناہوں خاص کر شرک اور مالی خیانتوں، ناپ تول میں کمی کرنے سے توبہ کرو، بلکہ ہر گناہ سے توبہ کرکے اپنی اصلاح کرو، صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، توحیدِ الٰہی پر مضبوطی سے قائم رہو، پھر دیکھو کہ تم پر بے موسم آسمانی رحمتوں اور عنایتوں کی بارش ہوتی رہے گی، اور تمہاری تقدیر دوستی اور محبوبیت والی زندگی جسے جنتی زندگی کہتے ہیں اس کے اندر داخل ہوجاؤ گے، کیونکہ میرا ربّ رحیم بھی ہے، اور بہت محبت کرنے والا ودود بھی ہے، پس تم اس کی رحمتوں اور مودّتوں کے حقدار بنو گے۔

فائدہ:

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: ﴿وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا﴾ جس کی تفسیر مفسرین حضرات نے نبوت سے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بڑی دولت یعنی نبوت عطا کی ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس کا معنیٰ متبادر لیا ہے، اور

وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حلال مال عطا فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ مجھے اجر و مزدوری کا تم سے مطالبہ نہیں، جیسے دوسرے موقع پر فرمایا: ﴿لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾ [ھود:۵۱] (میں تم سے اس پر مزدوری نہیں مانگتا، میرا اللہ ہی پر ہے) میں تمہیں بے لوث بغیر کسی اجر و مزدوری کے تبلیغ کرتا رہوں گا۔

دوئم یہ کہ میں اپنے ربّ کی طرف سے دلیل پر ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حلال مال وافر مقدار میں عطا فرمایا ہے، میں تمہیں جو کچھ کہتا ہوں اس پر خود بھی عمل کرتا ہوں، میں نے اپنے اس مال میں نہ خیانت کی نہ تجارت کے سلسلہ میں ناپ و تول میں کمی کی، نہ کسی طرح سے کسی کا حق مارتا ہوں، میرا اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر ہے، تمہیں بھی اسی کی نصیحت کرتا ہوں۔ یہ مطلب نہایت موزون ہے۔ الحمد للہ

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ۝۹۱ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاۗءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۹۲ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝۹۳ وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝۹۴ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۝۹۵

ترجمہ: وہ لوگ کہنے لگے: اے شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو اس میں سے بہت سی باتیں ہم نہیں سمجھتے، اور بلاشبہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے درمیان کمزور ہو، اور اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے، اور ہمارے نزدیک تم کچھ عزّت والے نہیں ہو ۝۹۱ شعیب نے کہا کہ اے میری قوم! کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک عزت میں بڑھ کر اللہ تعالیٰ شانہ سے زیادہ ہے، اور تم نے اسے پس پشت ڈال دیا، بلاشبہ میرا ربّ ان کاموں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جنہیں تم کرتے ہو ۝۹۲ اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر کام کرتے رہو، میں بھی عمل کر رہا ہوں، تم عنقریب جان لوگے کہ کس کے پاس عذاب آتا ہے، جو اسے رسوا کر دے گا، اور یہ بھی جان لوگے کہ وہ کون شخص ہے جو جھوٹا ہے انتظار کرو، بیشک میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ۝۹۳ اور جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے اپنی رحمت

سے شعیب کو اوران لوگوں کو نجات دیدی جوان کے ساتھ ایمان لائے، اور جن لوگوں نے ظلم کیا انہیں سخت اواز نے پکڑ لیا، سو وہ اپنے گھروں میں اوندھے گرے ہوئے رہ گئے ﴿۹۴﴾ گویا وہ ان میں رہے ہی نہ تھے، خبردار! مدین کے لئے دوری ہے، جیسا کہ ثمود دور ہوئے ﴿۹۵﴾

معارف ومنازل

گلیم بخت کسے را کہ بافتند وسیاہ ☆ بآب زمزم وکوثر سفید نتواں کرد

یہ ضدی قوم جس نے آخر صفحۂ ہستی سے مٹ کر تباہ ہونا تھا، پھول کا جواب پتھر سے دینا شروع کیا، پیغمبر خدا علیہ السلام کو ایک قسم کا مجنون ومخبوط الحواس کہہ کر یہ جواب دیا کہ تمہاری باتیں ہماری عقل وسمجھ سے بالاتر ہیں، آپ ہمیں صحیح معنی میں سمجھا نہیں سکتے، آپ کی بے ڈھنگ باتوں سے ہماری تشفی نہیں ہورہی، ہم آپ کو اپنے اندر نہایت کمزور سمجھتے ہیں، اگر آپ ہر اعتبار سے مضبوط ومستحکم ہوتے تو آپ کی باتوں کی کچھ قدردانی ہوتی۔ وہی پرانی باتیں ہیں کہ آپ کے پاس کوئی خزانہ بھی نہیں، باغ نہیں ہے، کوئی ترجمان فرشتہ بھی نہیں ہے، ہم کیسے آپ پر یقین کریں، آپ نے ہمیں اتنا تنگ کیا ہوا ہے کہ ہم آپ سے بیزار ہیں، ہمارے دلوں میں تمہاری کوئی قدرومنزلت نہیں، اگر آپ کا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم پتھروں سے مار مار کر تمہاری جان لیتے، اور تمہیں سنگسار کر کے راحت حاصل کرتے۔

خطیب الانبیاء:

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کا سچا نبی ہوں، میں تمہیں اس لئے تبلیغ کرتا ہوں کہ یہ فریضہ ہے، اور خلقِ خدا کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ بھی ہے، اور تم کہتے ہو کہ اگر تمہارا خاندان نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کر کے ہلاک کرتے، کیا تمہارے نزدیک میرا خاندان اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ عزّت والا ہے؟ تم نے میرے خاندان کا خیال تو کیا، اور اللہ تعالیٰ کو تم نے پس پشت ڈال دیا، اسے راضی رکھنے کا تمہیں بالکل خیال نہ آیا، بلاشبہ میرا ربّ تمہارے سب اعمال کو جانتا ہے، تم عذاب کے مستحق ہو چکے ہو، جب تم ایمان نہیں لاتے تو عذاب تم پر آنے ہی کو ہے، یہ ایسا عذاب ہوگا جو رسوا اور تباہی کردے گا، اور بتادے گا کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے۔

تم لوگ مجھے دعوائے نبوت میں جھوٹا قرار دیتے ہو، تو عذاب آنے سے واضح ہو جائے گا کہ میں جھوٹا نہیں ہوں، تم ہی جھوٹے ہو، تم اپنی جگہ عمل کرتے رہو، میں اپنی جگہ اعمال میں مشغول ہوں، تم بھی منتظر رہو میں بھی انتظار

میں رہوں گا کہ دیکھیں عذاب کب آتا ہے، اور کس پر آتا ہے؟

ان لوگوں کے لئے عذاب کا فیصلہ ہو چکا تھا، اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو آپ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے، اپنی مہربانی سے بچا لیا، اور ظالموں کو چیخ نے پکڑ لیا، اور اس چیخ کی وجہ سے وہ سب ہلاک ہو گئے، یہ لوگ بھی اپنے گھروں میں اس طرح اوندھے منہ پڑے رہ گئے کہ گویا وہ ان میں رہے ہی نہ تھے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو گئے، جیسے ثمود اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو گئے۔ تفصیل سورۂ اعراف میں گزر چکی ہے۔

البتہ وہاں فرمایا تھا: ﴿فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ﴾ [الرجفۃ:۷۸] (ان کو سخت زلزلہ نے پکڑ لیا) اور یہاں فرمایا: ﴿فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ﴾ (ان کو چیخ نے پکڑ لیا) اس میں کوئی تعارض کی بات نہیں ہے، کیونکہ ان پر دونوں طرح کا عذاب آیا تھا، پہلی مرتبہ زبردست چیخ آئی، اور اسی کے ساتھ زلزلہ بھی آیا، اور کام تمام کیا۔

وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ فِرۡعَوۡنَ ۚ
وَمَاۤ اَمۡرُ فِرۡعَوۡنَ بِرَشِيۡدٍ ﴿۹۷﴾ يَقۡدُمُ قَوۡمَهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَاَوۡرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئۡسَ الۡوِرۡدُ
الۡمَوۡرُوۡدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتۡبِعُوۡا فِىۡ هٰذِهٖ لَعۡنَةً وَّيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ بِئۡسَ الرِّفۡدُ الۡمَرۡفُوۡدُ ﴿۹۹﴾

ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور روشن دلیل کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، سو ان لوگوں نے فرعون کی بات کا اتباع کیا، اور فرعون کی بات صحیح نہ تھی ﴿۹۷﴾ قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا، پھر وہ ان کو دوزخ میں اتار دے گا، اور وہ بری جگہ ہے جس میں ان لوگوں کا اترنا ہوگا ﴿۹۸﴾ اور ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت لگا دی گئی، اور قیامت کے دن بھی ان پر لعنت ہوگی، برا انعام ہے جو انہیں دیا گیا ﴿۹۹﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے نو آیات بینات کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے متعلق حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے حضور سفارش کی، تو ان کو بھی منصب نبوت کے ساتھ نوازا گیا، اور ان کی مدد ومعاونت کے لئے منتخب کیا گیا۔ سورۂ اعراف

میں پوری تفصیل کے ساتھ ان کا واقعہ مذکور ہوا، اور آئندہ بھی متعدد سورتوں میں ان کی تفصیلات آتی رہیں گی۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو قرآن کریم نے جس انداز میں سب سے زیادہ بیان فرما کر ان کی قوم کی سرکشیوں اور شرارتوں کو بیان فرمایا ہے، یہ ایک منفرد خصوصیت ہے، جس میں کوئی قوم ان کی شریک نہیں ہے، فرعون کی قوم کے سرداروں نے فرعون ہی کی بات مانی، اور آیات بینات اور جادوگروں کی شکست اور ان کے ایمان لانے کے مشاہدہ کے باوجود فرعون کی رائے پر چلتے رہے، اور عوام الناس بھی اپنے بڑوں کا اتباع کرتے رہے، ان سب کا قائد فرعون ہی تھا، یہ دنیا میں بھی کفر وضلال کا قائد بنا رہا، اور قیامت کے دن بھی جہنم کی طرف اپنی قوم کا قائد بنے گا، اور اسی کی قیادت میں پوری قوم کو اللہ تعالیٰ کی عدالتِ عالیہ سے جہنم کی ابدی سزا کا حکم سنایا جائے گا، چنانچہ وہ مع اپنی قوم کے جہنم میں اترے گا۔

یہ لوگ دنیا میں ملعون ہوئے، اور آخرت میں بھی ملعون ہوں گے، یہ لعنت بہت برا انعام ہے جو انہیں دیا گیا۔ قرآن حکیم نے سب امتوں کی ہلاکت کے واقعات بیان فرمائے، مگر اس قوم کی ہلاکت کو خصوصیت کے ساتھ بکثرت بیان فرمایا، اس لئے کہ اس کے قائد اور اس کی قوم کے جرائم بنسبت دوسروں کے زیادہ ہیں، اور سب سے بڑا جرم الوہیت کا دعویٰ ہے۔ العیاذ باللہ

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآىِٕمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ: یہ بستیوں کی خبریں ہیں جن کو ہم آپ سے بیان کرتے ہیں، ان میں سے بعض بستیاں قائم ہیں، اور بعض بالکل ختم ہوگئیں ﴿۱۰۰﴾ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن ان لوگوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا، ان کے معبودوں نے جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارا کرتے تھے کچھ بھی فائدہ نہ دیا، جب آپ کے ربّ کا حکم (عذاب) آ گیا، اور انہوں نے کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا سوائے ہلاکت اور تباہی کے ﴿۱۰۱﴾

معارف ومنازل

سورۂ ہود کے رکوع (۳) سے لے کر یہاں تک سات انبیاء کرام علیہم السلام کی قوموں کی بربادی کا حال بیان

فرمانے کے بعد یہاں فرمایا کہ ہم آپ کو ان بستیوں کی خبریں سناتے ہیں، ان ہلاک شدہ بستیوں میں سے بعض بستیاں اب بھی دنیا میں موجود ہیں، کچھ تو کھنڈرات کی صورت میں ہیں، اور کچھ ایسی ہیں کہ ان کے رہنے والوں کی ہلاکت کے بعد دوسرے لوگ ان میں رہنے لگے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ﴾ [ابراھیم: ۴۵] (اور تم ان لوگوں کی بستیوں میں رہ چکے تھے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا)۔

اور کچھ ایسی بستیاں ہیں جن کا بالکل خاتمہ ہو گیا، جیسے قومِ لوط کی بستیاں تھیں، ان قوموں کی ہلاکت کے واقعات مخاطبین نے پہلے بھی سن رکھے ہیں، اور آپ نے بھی بتا دیئے، اور صرف زبانی کہا سنا نہیں ہے، بلکہ ان میں سے بعض کی ہلاکت کے آثار بھی موجود ہیں، جیسے قومِ ثمود کے پہاڑی مکانات اور یہ اہل مکہ تجارت کی غرض سے وہاں گزرتے بھی ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ۝ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ [الصافات] (اور تم ان پر سے گزرا کرتے ہو صبح ہوتے اور رات کے وقت، کیا پھر بھی تمہیں عقل نہیں آتی؟)۔

پس ان گزرنے والے ظالموں کو عبرت حاصل کرنا لازم ہے، ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، انہوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا، اور جب عذاب کا وقت آ گیا تو ان کے معبودوں نے جن کی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر وہ عبادت کرتے تھے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، اور ذرا بھی ان کے کام نہ آئے، بلکہ ان کی عقیدت اور تعظیم و عبادت کی وجہ سے اِن کے پرستاروں کو ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ملا، ان کی عبادت کی وجہ سے اسبابِ ہلاکت میں اضافہ ہی ہوتا رہا، یہاں تک کہ وہ دنیا و آخرت دونوں میں رسوا و ذلیل ہوئے۔

.......✿.......✿.......✿.......

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝۱۰۲ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ
خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝۱۰۳ وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا
لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝۱۰۴ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝۱۰۵ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا
فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝۱۰۶ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۗءَ
رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝۱۰۷ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۗءَ رَبُّكَ ۭ عَطَاۗءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝۱۰۸ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَاۗءِ ۭ

مَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا كَمَا يَعۡبُدُ اٰبَآؤُهُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوۡهُمۡ نَصِيۡبَهُمۡ غَيۡرَ مَنۡقُوۡصٍ ۱۰۹

ترجمہ: اور آپ کے ربّ کا پکڑنا اسی طرح ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، جبکہ وہ ظالم ہوں، بیشک اس کا پکڑنا دردناک ہے سخت ہے ۱۰۲ بلاشبہ اس میں اس شخص کے لئے عبرت ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہو، یہ ایسا دن ہوگا جس میں تمام آدمی جمع کئے جائیں گے، اور یہ وہ دن ہوگا جو سب کی حاضری کا دن ہے ۱۰۳ اور ہم اسے مؤخر نہیں کر رہے ہیں، مگر تھوڑی سی مدت کے لئے ۱۰۴ جس وقت وہ دن آئے گا کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر بات نہ کر سکے گا، سو ان میں شقی ہوں گے اور سعید ہوں گے ۱۰۵ سو جو لوگ شقی ہوں گے وہ دوزخ میں ہوں گے، اس میں ان کی چیخ وپکار ہوگی (گدھے کی طرح آواز نکالیں گے) ۱۰۶ وہ اس میں ہمیشہ ٹھہرے رہیں گے، جب تک کہ آسمان اور زمین قائم رہیں، الَّا یہ کہ آپ کے ربّ کی مشیت ہو، بیشک آپ کا ربّ جو کچھ چاہے پورے طور سے کرسکتا ہے ۱۰۷ اور لیکن وہ لوگ جو سعید ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان وزمین قائم رہیں، الَّا یہ کہ آپ کے ربّ کی مشیت ہو، یہ بخشش بھی منقطع نہ ہوگی ۱۰۸ سوائے مخاطب! جس چیز کی یہ لوگ عبادت کرتے ہیں تو اس کے بارے میں شک میں نہ پڑنا، یہ لوگ اسی طرح عبادت کر رہے ہیں جیسا کہ پہلے ان کے باپ دادا عبادت کرتے تھے، اور ہم ان کو ان کا پورا پورا حصہ دے دیں گے، جس میں کچھ بھی کمی نہ ہوگی ۱۰۹

معارف ومنازل

جس طرح ان ظالموں کی ہلاکت ہوئی ان جیسا جو بھی ہوگا اسی نتیجے کو وہ بھی دیکھے گا، اللہ تعالیٰ کی پکڑ بہت المناک اور سخت ہوتی ہے، جیسے فرمایا: ﴿اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِيۡدٌ﴾ [البروج: ۱۲] (بیشک تیرے ربّ کی پکڑ بہت سخت ہے)۔ بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ڈھیل دے کر پھر پکڑنے کے وقت ناگہاں دبا لیتا ہے، پھر مہلت نہیں ملتی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تلاوت کی۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تو مشو مغرور بر حلم خدا ☆ دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

کافروں کی ان ہلاکتوں اور مؤمنوں کی ان نجاتوں میں صاف دلیل ہے ہمارے ان وعدوں کی سچائی پر جو ہم نے قیامت کے بارے میں کئے ہیں، جس دن تمام اول وآخر کے لوگ جمع کئے جائیں گے، ایک بھی باقی نہ چھوٹے گا، وہ بڑا بھاری دن ہے، تمام فرشتے، تمام رسول علیہم السلام تمام مخلوقات حاضر ہوں گی، حاکمِ حقیقی عادل پورا

انصاف کرے گا۔

قیامت کے دیر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ربّ العزّت جل جلالہ یہ بات پہلے ہی مقرر کر چکا ہے کہ اتنی مدّت تک دنیا بنی آدم سے آباد رہے گی، اتنی مدّت خاموشی رہے گی، پھر فلاں وقت قیامت قائم ہوگی، جب خیر وبھلائی کا خاتمہ ہوگا اور شر وفساد کا دور دورہ ہوگا، جس دن قیامت آجائے گی تو کوئی نہ ہوگا جو اجازتِ الٰہی کے بغیر کوئی لب کشائی کرے، مگر رحمٰن عزّشانہ جسے اجازت دے، اور وہ بات بھی ٹھیک بولے: ﴿وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ﴾ [طٰہٰ:۱۰۸] (یعنی تمام آوازیں رحمٰن عزّوجل کے سامنے پست ہوں گی)۔

بخاری ومسلم کی حدیثِ شفاعت میں ہے: اس روز صرف رسول (علیہم السلام) ہی بولیں گے، اور ان کا کلام بھی صرف یہی ہوگا کہ اے اللہ! سلامت رکھ، اے اللہ! سلامتی دے۔ میدان محشر میں سفید چہرے والے سعید بھی ہوں گے، اور سیاہ چہرے والے شقی بھی ہوں گے۔ اس آیت کے اترنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پوچھتے ہیں کہ پھر یا رسول اللہ! ہمارے اعمال اس بناء پر ہیں جس سے پہلے ہی فراغت کرلی گئی ہے یا کسی اور بنا پر؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ اس حساب پر جو پہلے سے ختم ہو چکا ہے، جو قلم تقدیر چل چکا ہے، لیکن ہر ایک کے لئے وہی آسان ہوگا جس کے لئے اس کی پیدائش کی گئی ہے۔ [ابن كثير بحواله مسند أبو يعلى]

بخاری میں ہے: "اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ"۔ جن کی پیدائش جنت کے لئے ہوا سے جنتی اعمال کی توفیق ہوگی، اور دوزخی اعمال سے نفرت ہوگی، اسے دیکھو تو شب وروز اعمالِ صالحہ ادا کرنے میں مشغول نظر آئے گا، اور جن کی پیدائش جہنم کے لئے ہو وہ دوزخی اعمال میں مصروف نظر آئے گا، اور جنتی اعمال سے دور رہے گا۔ البتہ اعتبار خاتمہ ہی کا ہوگا۔ [بخاري]

اے ہمارے پروردگار! اپنے فضل وکرم سے سارے مسلمانوں کا خاتمہ بالخیر فرمادیں، شقی اور بدبختوں کے متعلق فرمایا کہ وہ گدھے کی طرح چیخیں گے۔ زَفِیر گدھے کی ابتدائی آواز کو کہتے ہیں، اور شَهِيق آخری آواز کو کہا جاتا ہے، یعنی کفار کا چیخنا اور پکارنا گدھے کی آواز کی طرح ہوگا۔

آیت کریمہ میں اہل شقاوت کی سزا اور اہل سعادت کی جزاء بیان فرمانے کے بعد فرمایا:

﴿مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ﴾ یعنی ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ کے بعد اس قید کا مطلب کیا ہے؟ اس بارے میں مفسرین کرام نے فرمایا ہے کہ یہ اہل عرب کے محاورہ کے مطابق ہے، کیونکہ قرآن کریم کا نزول اہل عرب

کے محاورہ پر ہے، اس لئے یہاں وہی مراد ہوگا، اہل عرب یہ الفاظ بول کر دوام اور ہیشگی مراد لیا کرتے ہیں، اور یہ بھی ان کے محاورے میں ہے کہ یہ باقی رہے گا جب تک دن رات کا چکر چلے گا، پس ان الفاظ سے دوام اور ہیشگی مراد ہے، کوئی قید مراد نہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد جنت ودوزخ کے آسمان وزمین مراد ہوں، اور جنت ودوزخ کے آسمان وزمین دائمی ابدی ہیں، ہمیشہ رہیں گے، پس یہ خٰلِدِیْنَ کے لئے تاکید ہوگی، جس طرح خٰلِدِیْنَ کے بعد بسا اوقات کلمۂ اَبَدًا کا ذکر تاکید اور پختگی کے لئے مذکور ہوتا ہے۔ سورۂ زمر میں جنت کے لئے ارض کا بھی ثبوت ہے، فرمایا: ﴿وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاۤءُ﴾ [الزمر: ۷۴] (اور ہمیں اس سرزمین کا ایسا وارث بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنا ٹھکانا بنالیں)۔ اور سماء کا اطلاق بلندی اور اوپر کی ہر چھت کے لئے مستعمل ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہر جنت کا آسمان وزمین ہے۔ [ابن کثیر]

کیونکہ ہر نیچے والے حصے کو زمین کہنا، اور اوپر والے کو آسمان کہنا متعارف بھی ہے، اور واقع بھی ہے۔ جب جنتوں کے متعلق فرش اور اَرَائِک تختوں اور فرشوں کا اثبات ہے، تو یہی نچلا حصہ زمین ہی کہلائے گا، اسی طرح بلندی کے اثبات سے سماء اور چھت ہی مراد ہوگی، اور یہ دونوں دائمی اور ابدی ہیں، تو جنتیوں اور دوزخیوں کے لئے بھی دوام وخلود کا اثبات ہی مراد ہے، آخر میں فرمایا:

﴿اِلَّا مَا شَاۤءَ رَبُّكَ﴾ یہاں اللہ تعالیٰ کی منشاء کا ذکر ہے۔ دوسری آیت میں ہے: ﴿النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اِلَّا مَا شَاۤءَ اللّٰهُ﴾ [الأنعام: ۱۲۸] (آگ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں ہمیشہ رہا کریں گے، مگر جو اللہ چاہے)۔ اس استثناء کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں: علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے خالد بن معدان، ضحاک، قتادہ اور ابن سنان رحمۃ اللہ علیہم کے اس قول کو پسند فرمایا ہے کہ یہ استثناء موحد گناہگاروں کی طرف عائد ہے۔

صاحب معالم امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے فراء رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ استثناء قدرتِ باری تعالیٰ کے ساتھ متعلق ہے، نہ کہ عادتِ ایزدی کے ساتھ۔ ویسے اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو اس خلود فی الجنة اور خلود فی النار کو ختم کردے، تو وہ ایسا کرسکتا ہے، مگر وہ کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خلود سے استثنا تو ہے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ خلود کا فیصلہ فرما چکے ہیں، لہٰذا وہ کسی فریق کو نکالے گا نہیں، کیونکہ خلود کا ذکر قرآن کریم میں اَبَدًا کی تاکید کے ساتھ بار بار موجود ہے، (اس کی پوری تحقیق ہم آیت کریمہ: ﴿لّٰبِثِيْنَ فِيْهَاۤ اَحْقَابًا﴾ [النباء: ۲۳]

کے تحت لکھ چکے ہیں وہاں دیکھیں)۔

امام فراء رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کو صاحب روح المعانی نے بھی بحوالہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نقل کیا ہے۔ پھر بعض افاضل سے نقل کیا ہے کہ اس استثناء کا یہ فائدہ ہے کہ کوئی شخص یوں نہ سمجھ لے کہ دوزخیوں کو عذاب دینا اور جنتیوں کو جنت کی نعمتیں عطا کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ واجب ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے ذمہ کچھ بھی واجب نہیں (وہ فاعلِ مختار ہے) وہ جو چاہے کرے، نہ وہ عذاب دینے پر مجبور ہے، اور نہ انعام واکرام پر، اگر وہ کسی دوزخی کو دوزخ سے نکال کر باہر کردے، یا کسی جنتی کو جنت سے نکالے تو وہ یہ کرسکتا ہے، اس کی مشیت وارادہ اور اختیار نہ کبھی سلب ہوا اور نہ سلب ہوگا، اس کی قدرت دائمی ابدی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ مشرکوں کے شرک کے باطل ہونے پر ہرگز شبہ نہ کرنا، ان کے پاس بجز باپ دادوں کی اندھی اور بھونڈی تقلید کے اور دلیل ہے ہی کیا؟ ان کی نیکیوں کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں مل چکا ہے، آخرت میں سوائے سخت عذاب کے انہیں کچھ نہیں ملے گا، اور جو خیر وشر کے وعدے ہیں سب پورے ہونے والے ہیں، ان کے عذاب کا مقررہ حصہ انہیں پورا پورا ملے گا، جس میں ذرہ بھر کی کمی کا امکان نہیں۔

❁ ❁ ❁

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ
وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿١١٠﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ
خَبِيْرٌ ﴿١١١﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١٢﴾ وَلَا
تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا
تُنْصَرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ
ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿١١٤﴾ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٥﴾

ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی سو اس میں اختلاف کیا گیا، اور اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بات طے شدہ نہ ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کردیا گیا ہوتا، اور بلاشبہ وہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں جو تردد میں ڈالنے والا ہے ﴿١١٠﴾ اور بیشک جتنے لوگ ہیں آپ کا رب انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیدے گا، بیشک وہ ان کے

اعمال سے باخبر ہے ﴿۱۱۱﴾ سو آپ استقامت پر رہیے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے، اور جو لوگ توبہ کر کے آپ کے ساتھی ہیں وہ بھی استقامت پر رہیں، اور حد سے آگے نہ بڑھیں، بیشک وہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے، اور ان لوگوں کی طرف مت جھکو جنہوں نے ظلم کیا، ایسا کرو گے تو تمہیں آگ پکڑے گی، اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں، پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی ﴿۱۱۳﴾ اور دن کے دونوں طرفوں میں اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کیجئے، بیشک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لئے ﴿۱۱۴﴾ اور آپ صبر کیجئے، کیونکہ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا ﴿۱۱۵﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب دی تھی، اس میں اختلاف کیا گیا، کسی نے مانا کسی نے نہیں مانا، اس میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تسلی ہے کہ اگر قرآن کریم کے بارے میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا، لہٰذا آپ رنجیدہ نہ ہوں، کیونکہ ازلی فیصلہ بھی یہی ہے، ﴿فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ﴾ [شوریٰ:۷] (ایک گروہ جنت میں ہوگا، اور ایک گروہ جہنم میں ہوگا)۔ ابھی شقی وسعید لوگوں کا تذکرہ ہو چکا۔ ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ [ھود:۱۱۸] (اور اگر آپ کا ربّ چاہتا تو سارے لوگوں کو ایک ہی جماعت بنا دیتا)۔

ع دوزخ کرا بسوز گر بولہب نباشد

چونکہ اللہ تعالیٰ عذاب کے لئے (قیامت کی طرح) وقت مقرر کر چکے ہیں، وہ بغیر مدت پوری کئے اور اتمام حجت مکمل کئے عذاب نہیں دیا کرتے ہیں، اس لئے یہ تاخیر ہے، ورنہ ابھی انہیں ان کے گناہوں کا مزہ چکھایا جاتا، اور صفۂ ہستی سے مٹایا جاتا۔

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ﴾ کا یہی مطلب ہے جس کا پہلے بیان ہو چکا ہے۔ پھر فرمایا:

﴿وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ﴾ اور بلا شبہ یہ لوگ قرآن مجید کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں، جس نے تردد وتذبذب میں ڈال رکھا ہے، جس طرح یہ لوگ تردد میں پڑے ہوئے ہیں اسی طرح کے لوگوں کا رویہ تورات کے بارے میں بھی تھا، اگر یہ آج عذاب سے بچ گئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے مطمئن

ہوں، کیونکہ آنے والا عذاب بہر صورت ان کے لئے مقرر ہے۔

﴿وَاِنَّ کُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ﴾ بیشک روزِ قیامت آپ کا ربّ انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا، کیونکہ انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا علم ہے۔ البتہ آپ کے ساتھی ہیں انہیں بھی استقامت پر رہنا ضروری ہے، جس صراط مستقیم کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے منتخب کیا ہوا ہے اس تک پہنچنے کا واحد راستہ یہی استقامت ہے، یہ وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مؤمن بندوں کو اپنے رسولوں علیہم السلام اور کتابوں کے ذریعہ سے بتایا ہے، اور اس پر انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے متبعین چلتے رہے ہیں۔

صراط مستقیم کو پوری طرح پکڑ لینا، اور تمام احکامِ الٰہیہ کو پوری طرح بجالانا، ادھر ادھر میلان سے بچنا، اور برابر آخر دم تک اس پر عامل رہنا ہی استقامت ہے۔ اس آیت میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ آپ کو جس طرح کا حکم دیا گیا ہے بالکل اسی طرح اہتمام اور پابندی کے ساتھ چلتے رہیں، اور ساتھ ہی:

﴿وَمَنْ تَابَ مَعَكَ﴾ بھی فرمایا کہ جن لوگوں نے کفر وشرک سے توبہ کی ہے، اور ایمان قبول کیا ہے، وہ لوگ بھی آپ کی قیادت میں استقامت کے ساتھ چلتے رہیں۔ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو کامل استقامت پر تھے ہی، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا تاکیدی حکم فرمادیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کو بھی مامور فرمایا کہ استقامت اختیار کریں، ہمیشہ پابندی سے احکامِ شرعیہ پر عمل کرتے رہیں، اور مامورات کو زندہ رکھ کر تمام منہیات سے بچتے رہیں۔

درحقیقت استقامت بہت بڑی چیز ہے، اور نہایت سخت بھی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف جو لوگ بڑھتے ہیں، اور مقربین کے درجات تک پہنچنے کی جدوجہد کرتے ہیں، اور استقامت کے مدارج حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو انہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق ومدد حاصل ہوجاتی ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ﴾ [البقرۃ: ۴۵] (اور یہ بہت بھاری ہے، مگر ان پر نہیں جو خشوع رکھتے ہیں)۔ ایسے لوگوں پر سخت سے سخت اعمال آسان ہو جاتے ہیں، اور شریعت کے تقاضوں پر چلنا ان کی فطرت اور عادت بن جاتی ہے۔ ؎

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد ☆ فارغ از بند زن واولاد شد

می کند از ماسوا قطع نظر ☆ می نہد ساطور بر حلق پسر

کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک بکری کی قربانی سے بھی ہچکچاتے ہیں، لیکن کچھ لوگ وہ بھی تو ہیں کہ جان و مال واولاد سب کی بخوشی قربانی دینے پر خوشی وراحت محسوس کرتے ہیں، دنیا میں اب بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ الحمد للہ

حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے دینِ اسلام سے متعلق ایسی چیز بتا دیجئے کہ مجھے آپ کے بعد کسی اور شخص سے دریافت کرنا نہ پڑے، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ"۔ تم اپنے ایمان واسلام کا اقرار کرنے کے بعد زندگی بھر اس پر استقامت سے رہو، اور جم کر رہو، اور اسلام پر ثابت قدم رہو۔ [مسلم]

اسی کو قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ [حٰم السجدة:۳۰] (تحقیق جنہوں نے کہا: رب ہمارا اللہ تعالیٰ ہے، پھر اسی پر قائم رہے، ان پر اترتے ہیں فرشتے کہ تم مت ڈرو، اور نہ غم کھاؤ، اور خوشخبری سنو اس بہشت کی جس کا تم سے وعدہ تھا)۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَکَ﴾ تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شَمِّرُوْا شَمِّرُوْا۔ یعنی تیار ہو جاؤ، تیار ہو جاؤ، اور اس کے بعد آپ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ [درمنثور]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے، یعنی آپ پر بڑھاپے کے آثار جلدی ظاہر ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: سورۂ ہود، سورۂ واقعہ، سورۃ المرسلات، سورۂ نبا اور سورۂ شمس نے بوڑھا کر دیا۔ [ترمذی، مشکوۃ]

ان سورتوں میں قیامت کے احوال اور اہوال مذکور ہیں، ان اہوال کی فکرمندی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنا متاثر کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبل از وقت بوڑھے ہو گئے۔

روح المعانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس آیت سے زیادہ شدید کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ بعض اکابر حضرت ابو علی سری رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلہ میں ایک خواب بھی نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا (زہے سعادت) تو عرض کیا کہ اے حبیب رب العٰلمین! آپ نے فرمایا ہے کہ مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا، سورۂ ہود میں ایسی کونسی بات ہے جس کی وجہ سے آپ بوڑھے ہو گئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس میں جو استقامت کا حکم ہے اس نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ [حاشیة مشکوة، قرطبی]

یہ خواب اس کے معارض نہیں ہے کہ سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں میں جو قیامت کے احوال اور اہوال مذکور

ہیں ان کی وجہ سے بڑھاپا آ گیا، کیونکہ وہ سب امور اور امر بالا استقامت سب بڑھاپے کا سبب بن سکتے ہیں، جن کے رتبے میں کسی ادنیٰ کمی کا امکان بھی نہیں ہے۔ آپ ﷺ پر خشیت الٰہی کا بیحد غلبہ تھا، استقامت کے باوجود آپ ﷺ کو یہ فکر لاحق ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے جیسی اور جس طرح کی استقامت کا حکم دیا ہے وہ شاید پوری نہیں ہوئی، اس فکرمندی نے آپ ﷺ کی صحت کو متاثر کیا۔

اور پھر جس استقامت کا حکم آپ ﷺ کو ہوا اس کا حکم ﴿وَمَنْ تَابَ مَعَكَ﴾ بھی تو ہے، اور مَعَكَ کا حکم ابدی ہے، قیامت تک سب آنے والوں کے لئے ہے، تو کیا امت اجابت اس کو پورا کرسکتی ہے؟ اسی کی طرف تو اشارہ ہے، جو فرمایا:

﴿وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ یہاں یہ دونوں جمع کے صیغے ہیں، جس میں پوری امت داخل ہے، اور یہ سب کو شامل ہے۔ استقامت کا حکم دے کر یہی بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود سے آگے نہ بڑھو، ورنہ استقامت میں فرق آئے گا، اور اعتدال قائم نہ رہے گا، جسے صراط مستقیم کہا گیا ہے، کیونکہ حدود سے آگے بڑھ جانا ہی تو بدعاتِ اعتقادیہ اور بدعاتِ اعمالیہ میں مبتلا کردیتا ہے، اور اس حد سے نکلنے کو غلو کہا جاتا ہے، اسی غلو نے تو نصاریٰ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں خدا اور خدا کا بیٹا ہونے کے فاسد اعتقاد پر آمادہ کردیا، جس سے وہ سارے کافر ہوگئے، فرمایا: ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ [المائدۃ:۱۷] (یقیناً کافر ہوگئے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ مسیح بن مریم ہے)۔

اور آج بھی اس مردار عقیدہ نے ہمارے ہاں بہت سے مدعیانِ اسلام اور مدعیانِ محبت کو بھی اس کفر پر آمادہ کیا کہ سرور عالم ﷺ کی بشریت کا انکار کریں، اور آپ ﷺ کو مختار کل کا لقب دے کر اللہ تعالیٰ شانہ کے ساتھ برابر کریں، اور اللہ تعالیٰ شانہ کی مخصوص صفات آپ ﷺ کے لئے ثابت کریں، اور یہاں تک کہہ دے:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر ☆ اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

اس مذموم کافرانہ عقیدے میں اور نصاریٰ کے عقیدے میں ذرہ برابر فرق نہیں ہے، اور یہ آپ ﷺ کے ساتھ کتنا ظلم و زیادتی ہے کہ آپ ﷺ کی بشریت سے انکار کرکے آپ ﷺ کو انسانیت اور اولاد آدم علیہ السلام کی فہرست سے خارج کردیا جائے، اور قرآنی نصوصِ قطعیہ کا کھلم کھلا انکار کرکے کفر اختیار کیا جائے۔

ان عقائد کفریہ کا سہارا لے کر ایسے لوگوں نے پوری سنتِ مطہرہ کو یورپ والوں کے کہنے پر حلیہ وصورت اصلیہ سے محروم کرکے اس کی جگہ بدعاتِ عملیہ، رسمیہ، مذمومہ، غیر شرعیہ کے انبار لگا دیئے، اور ان کے بڑے شیعہ امام

نے انگریزوں کوخوش کرنے کی خاطر نابغہ روزگار مسند ہند حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فتویٰ کے خلاف اور ملکۂ برطانیہ کی حمایت میں فتویٰ جاری کر دیا، کہ ہندوستان دار الاسلام ہے، اور گوروں کی فوج کے خلاف جہاد حرام ہے، "اِعْلَامُ الْاِعْلَامِ بِاَنَّ هِنْدُوسْتَانَ دَارُ الْاِسْلَامْ"۔ پھر فرمایا:

﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ اوران لوگوں کی طرف مت جھکو جنہوں نے ظلم کیا، ایسا کروگے توتمہیں آگ پکڑ لے گی۔اس آیت کریمہ نے مسلمانوں کے لئے ایک ایسا راہنما اصول بیان فرمایا کہ اس پر چل کر مسلمان پوری دنیا میں اپنا علم، اپنا عمل، اپنے اخلاق، مذہب، عقائد، اعمال اور معاشی زندگی اور حقیقی اسلامی تشخص برقرار رکھ سکتا ہے، جس کی بدولت غیر اقوام یہود ونصاریٰ، بت پرست، صابی، ہندو، مجوس وغیرہ کے معاشرہ عقائد، اعمال، طرزِ زندگی وغیرہ سے امتیازی شان وشوکت حاصل ہوسکتی ہے، جس کے ذریعے اسلامی عقائد واعمال و اخلاق دیگر اقوام کے عقائد واعمال افکار واخلاق سے صاف اور پاک رہیں گے، جس میں غیر مسلم معاشرے کا کوئی ادنیٰ عمل بھی مخلوط نہ ہوگا، بات اپنی جگہ صحیح اور معیاری ہے، مگر مسلم قوم نے اس زرین ہدایت کوشعار نہیں بنایا، تب ہی تو نتیجہ اس کے برعکس رہا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

فرمایا: تم استقامت والے لوگ ہو، تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ کامل وپاکیزہ اورحق پر ہوتے ہوئے ظالموں، بے انصافوں، کافروں، خبیثوں کی طرف جھکو، اور اپنا اصلی مقام وتشخص کھو بیٹھو، ایسا کرنے سے انہی کے قافلے میں شامل رہوگے، اوران کی طرح تم بھی جہنم کی آگ کا ایندھن بنو گے۔ "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ"۔ [مشکوۃ]

کسی فرد یا جماعت یا قوم کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کی جتنی بھی صورتیں ہوسکتی ہیں آیت کریمہ کا مفہوم ان سب کو شامل ہے، اگر کوئی شخص کافروں، زندیقوں، ملحدوں اور فاسقوں کی طرف مائل ہوجائے، اوران کے کسی کفرو الحاد اور فسق والے اعتقاد کو اپنالے، تو یہ دوزخ کے دائمی عذاب کا سبب ہے، جس کے لئے بغیر قبل از موت توبہ کے کسی طرح مغفرت کی گنجائش نہیں۔

اعتقادیات کے علاوہ اعمال میں بھی کافروں، ملحدوں اور فاسقوں کی طرف جھکنے اور مائل ہونے سے اجتناب فرض ہے، برے، بدکار، گندے لوگوں کی دوستی، مصاحبت اور رفاقت رنگ لائے بغیر نہیں رہتی، خربوزہ سے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے، فاجر وبدکار لوگوں کی صحبت انسان کو تباہ کر کے چھوڑتی ہے، اور یہی اثر نیک لوگوں کی دوستی و مصاحبت کا بھی ہے کہ زنگ، آلود سیاہ کار لوگ جب اللہ والوں کی صحبت میں پہنچتے ہیں تو کندن بن کر چاندی کی طرح پاک وصاف ہوجاتے ہیں۔

بڑے افسوس کی بات ہے کہ پورے کرۂ ارض پر آج مسلمان ملکوں اور عوام مسلمانوں میں اسلامی معاشرہ، اسلامی طرزِ زندگی، اسلامی اعمال اور اسلامی اخلاق واطوار ناپید ہیں، سارے مسلمان (اِلَّا ماشاء اللہ) غیروں کی بھونڈی تقلید اور کافروں والے طور وطریقوں پر چل رہے ہیں، اور اسی کو اصل زندگی قرار دے کر اسلامی زندگی کی برکات سے محض یہ نہیں کہ محروم ہیں، بلکہ بدقسمتی سے اسلام اور اسلامی آبِ حیات سے متنفر ہیں، اور غیر اسلامی طرز زندگی کو ترقی کا نام دیتے ہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کاروان جاتا رہا ☆ کاروان کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

پس ایسے مسلمانوں کی زندگی اس قابل ہے کہ اس پر ماتم اور تعزیت کی جائے، انہیں چاہیے کہ اپنی آخرت اور اپنے ایمان کی فکر کریں، نہیں تو ایسے بےعمل مسلمانوں کا مستقبل نہایت ہی تاریک ہوگا۔ وَاللهُ الْمُوَفِّقُ وَهُوَ الْهَادِیْ۔ اسی خاطر آخر میں فرمایا:

﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مدد گار نہیں، پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی۔ اس میں تنبیہ اور تمہید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کی فکر کرو، اور ایمان و اعمالِ صالحہ کے ذریعہ قربِ الٰہی کے طلبگار بنو، ورنہ ہلاکت یقینی ہے۔ پھر ارشاد ہوا:

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾ اور دن کے دونوں طرفوں میں اور رات کے کچھ حصوں میں نماز قائم کیجئے۔ اسلام میں کلمۂ توحید کے بعد وہ سب سے بڑا عظیم عمل جس کے ذریعہ بندہ کا ربط وتعلق حق تعالیٰ سبحانہ کے ساتھ قائم رہتا ہے وہ نماز ہی ہے، جسے خوش قسمت سعادت مند مسلمان جان ومال سے زیادہ عظیم اور قیمتی سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ حضرات مفسرین کے نزدیک اس سے پانچوں نمازیں مراد ہیں۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دن کے دونوں طرفوں سے صبح اور ظہر اور عصر مراد ہے، اور رات کے حصوں سے مغرب اور عشاء مراد ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ فجر اور ظہر سے دن کے ایک طرف کی نمازیں مراد ہیں، اور عصر اور مغرب سے دن کی دوسری طرف کی نمازیں مراد ہیں، اور: ﴿زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾ سے عشاء کی نماز مراد ہے۔

اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ آیت کریمہ میں صرف فجر اور عصر کا ذکر ہو، چونکہ فجر کو اٹھنے میں دشواری ہوتی ہے، اور عصر کاروبار کا وقت ہوتا ہے، اس لئے ان کی پابندی کا خصوصی ذکر ہے۔ فرمایا: اور ﴿زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾ سے عشاء کی نماز بھی مراد ہوسکتی ہے۔ اور اس کی تاکید اس لئے فرمائی کہ یہ سونے کا وقت ہے، اور نماز تہجد بھی مراد ہوسکتی ہے، جس کے بہت بڑے فضائل ہیں، اور یہ مقربین کی نماز ہے، جیسا کہ سورۂ مزمل میں ہے، اور نماز تہجد رات کے

مختلف حصوں میں ادا کی جاسکتی ہے۔

البتہ یہ ضروری نہیں کہ آیت کریمہ میں پانچوں نمازوں کا ہی ذکر ہو۔اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ سورۂ روم کی آیت: ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۝۱۷ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ۝۱۸﴾ [الروم] (پس اللہ کی تسبیح کرو اس وقت بھی جب تمہارے پاس شام آتی ہے، اور اس وقت بھی جب تم پر صبح طلوع ہوتی ہے۔اور اسی کی حمد ہوتی ہے آسمانوں میں بھی، اور زمین میں بھی، اور سورج ڈھلنے کے وقت بھی، اور اس وقت بھی جب تم پر ظہر کا وقت آتا ہے) میں پانچوں نمازوں کا ذکر ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ﴿طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ سے صبح اور عصر کی نماز اور ﴿زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ﴾ سے مغرب اور عشاء کی نمازیں مراد ہیں، اور ظہر کی نماز سورۃ الاسراء کی آیت: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾ [الإسراء:۷۸] (اور سورج ڈھلنے کے وقت سے لے کر رات کے اندھیرے تک نماز قائم کرو) میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم

نیکیوں سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں:

﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ سب سے بڑی نیکی نماز ہے، اقامتِ صلوٰۃ کے فوراً بعد اس کے بے شمار فوائد کا ذکر فرما کر ترغیب دیدی کہ نیکیوں کی بدولت گناہ معاف ہوجاتے ہیں، پھر نیکی جتنی بڑی ہوگی اسی طرح بہت سے سیآت کے لئے کفارہ بن جائے گی، مثلاً نماز، یہ کوئی ایک نیکی شمار نہیں، بلکہ وضو وطہارت سے لے کر سلام تک بیس سے زائد نیکیوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر نیکی کے ساتھ کئی گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔لطف یہ ہے کہ صغیرہ گناہ خواہ جتنے بکثرت ہوں وہ معمولی اور مختصر نیکیوں سے بھی معاف ہوجاتے ہیں۔البتہ کبائر یعنی بڑے گناہوں کے لئے توبہ شرط ہے۔مگر کبھی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو نماز باجماعت جیسی نیکی سے کبیرہ گناہ بھی معاف فرمائے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے لئے آسان ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا، اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے مدینہ کے دور والے حصے میں ایک اجنبی عورت سے چھیڑ چھاڑ کی ہے، اور یہ چھیڑنا بدکاری کی حد تک نہیں پہنچا، اب میں آپ کے پاس حاضر ہوں، آپ میرے بارے میں جو فیصلہ چاہیں صادر فرمائیں۔مطلب یہ ہے کہ شریعت کی رُو سے جو سزا مقرر ہے آپ مجھ پر جاری فرمائیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہیں موجود تھے، انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تیری پردہ پوشی فرمائی، تو بھی اگر اپنی پردہ

پوشی کرلیتا تو بہتر ہوتا،لیکن آنحضرت ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا، وہ شخص وہاں سے اٹھ کر چلا گیا، پھر سرورعالم ﷺ نے اس کے پیچھے ایک آدمی بھیجا کہ اسے حاضر کرو، تو وہ اسے لے کر آیا، آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر سنادی: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ اس پر حاضرین میں سے ایک شخص نے اور دوسری روایت میں ہے کہ خود اسی شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ حکم صرف اسی شخص کے لئے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ یہ تمام لوگوں کے لئے ہے۔

ایک اور روایت میں یوں ہے کہ سائل نے سوال کیا، ادھر جماعت کھڑی ہوگئی، نماز کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا: کیا تو ابھی ہمارے ساتھ نماز میں شریک رہا؟ اس نے کہا: ہاں! اس پر آپ ﷺ نے آیت کی تلاوت فرمائی۔ [بخاري]

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سرورعالم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تو جہاں کہیں بھی ہو اللہ تعالیٰ سے ڈر، اور گناہ کے بعد نیکی کر، وہ نیکی اس گناہ کو مٹا ڈالے گی، اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آ۔ [مشکوۃ]

صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ سرورعالم ﷺ نے فرمایا: پانچ نمازیں اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک ،اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک ان تمام گناہوں کا کفارہ ہوجاتے ہیں جو ان کے درمیان صادر ہوں، جبکہ یہ شخص کبیرہ گناہوں سے بچا رہا ہو۔ مطلب آسان ہے کہ بڑے گناہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے، مگر چھوٹے گناہ دوسرے ہر طرح کے نیک کام سے خواہ وہ فرائض ہوں یا واجبات یا سنن اور مستحبات، حتیٰ کہ مباح کے درجہ کے نیک کام سب مراد ہوسکتے ہیں۔

ضروری وضاحت، اور صغیرہ گناہوں کی معافی:

تفسیر بحر محیط میں محققین علماء اصول کا یہ قول نقل کیا ہے کہ صغیرہ گناہ حسنات اور نیکیوں سے اس شرط پر معاف ہوتے ہیں کہ جب آدمی اپنے اس صغیرہ گناہ کے کرنے پر نادم ہو، اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے، اور گناہوں پر اصرار نہ کرے، کیونکہ اصرار سے صغیرہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔ اور روایاتِ حدیث میں جتنے واقعات کفارہ ہوجانے کے منقول ہیں وہ بہت ہی ہیں، مگر ان سب میں یہ تصریح بھی ہے کہ ان گناہوں کا کرنے والا جب اپنے فعل پر نادم ہو، اور آئندہ کے لئے توبہ کرے، اس پر سرورعالم ﷺ نے اس کو گناہ معاف ہوجانے کی بشارت سنائی۔

صغیرہ اور کبیرہ گناہوں میں جو فرق ہے وہ تین طرح کا ہے، اس کی تفصیل گزر چکی ہے، اور علماء کرام نے

مستقل رسالوں میں شائع کئے ہیں۔

مسند احمد میں بروایت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے، تو اس کو چاہئے کہ وضو کر کے دو رکعت نماز نفل ادا کر لے، تو اس گناہ کی معافی ہو جائے گی، اس کو نمازِ توبہ کہتے ہیں، اس قسم کی احادیث تفسیر ابن کثیر میں موجود ہیں۔

﴿ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ﴾ یہ ایک نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے۔ ماقبل کی تمام باتیں قرآنی اوامر ونواہی، اور ہر طرح کے احکام وفضائل نہایت کارآمد اور فائدہ مند ہو سکتے ہیں ایسے پختہ عقیدہ رکھنے والے نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے جن کو حق اور ہدایت کی تلاش وطلب ہو، اور جو لوگ طلب حق سے محروم ہوں وہ ان قیمتی ہدایات سے بھی محروم ہی رہیں گے۔

﴿وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ قدم قدم پر نوازشات وعنایات کی بارشیں ہو رہی ہیں، فرمایا: نماز قائم کرو، ہر وقت ذکر الٰہی میں لگے رہو، استقامت اختیار کرو، توبہ اور نیکیوں کے ذریعہ گناہوں کو معاف کراؤ، مصائب پر، عبادات پر استقامت کے ساتھ صبر کر کے محسنین حضرات میں شامل ہو جاؤ، اور بڑے بڑے ثوابوں کو سمیٹ لو، کیونکہ محسنین وہ بڑے اونچے لوگ ہوتے ہیں جن کا مقام یہ ہے: "تَعْبُدُ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ اِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ"۔ [متفق علیہ]

مطلب یہ ہے کہ دل اور خیالات کا رخ حق تعالیٰ شانہ کی عظمت وجلال کی طرف موڑ دینا، اور دنیا میں رہتے ہوئے اس سے کنارہ کش ولاتعلق رہنا۔

کیا ہر شخص ایسا کر سکتا ہے؟ اور اس میدان کا باسی بن سکتا ہے؟

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں ☆ این خیالست ومحالست وجنوں

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

ترجمہ: سو جو اُمتیں تم سے پہلے گزری ہیں ان میں ایسے سمجھدار لوگ کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد کرنے سے روکتے؟ بجز چند آدمیوں کے، جن کو ہم نے عذاب سے بچالیا، اور جن لوگوں نے ظلم کی راہ اختیار کی وہ اسی عیش وعشرت کے پیچھے پڑے رہے، جس میں وہ تھے، اور یہ لوگ مجرم تھے ﴿۱۱۶﴾ اور آپ کا ربّ ایسا نہیں ہے جو بستیوں کو بطورِ ظلم کے ہلاک فرمادے، حالانکہ ان کے رہنے والے اصلاح کرنے والے ہوں ﴿۱۱۷﴾ اور اگر آپ کا ربّ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی جماعت بنادیتا، اور وہ برابر اختلاف میں رہیں گے ﴿۱۱۸﴾ مگر جس پر آپ کا ربّ رحم فرمائے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی لئے پیدا فرمایا، اور آپ کے ربّ کی بات پوری ہوگی کہ میں جہنم کو جنات سے اور انسانوں سے دونوں جماعتوں سے بھر دوں گا ﴿۱۱۹﴾

معارف ومنازل

امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے غفلت سبب ہلاکت ہے:

ان آیات کریمہ میں فرمایا کہ جو گزشتہ اُمتیں گزری ہیں ان میں ایسے سمجھدار بصیرت والے کیوں نہ ہوئے جو زمین میں فساد کرنے سے روکتے؟ ہاں! ان میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو فساد سے روکنے کے کام میں لگے، انہیں ہم نے نجات دیدی، کیونکہ وہ خیر والے لوگ تھے، اور خیر کی دعوت دیتے، اور فساد سے روکتے تھے۔

یہ ترجمہ اس صورت میں ہے جبکہ لَوْلَا اپنے اصلی معنی میں ہو، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ لَوْلَا نفی کے معنی میں ہے، اور مطلب یہ ہے کہ پچھلی اُمتوں میں ایسے اہل رائے اور اہلِ فہم نہ تھے، جو لوگوں کو زمین میں فساد کرنے سے روکتے، ان میں صرف تھوڑے سے لوگ تھے، جنہوں نے یہ کام انجام دیا، ادھر تو نہی عن المنکر کرنے والوں کا فقدان، اور ادھر مال ودولت والوں کے پاس مال کی بہتات وفراوانی اور ان لوگوں نے کفر اور ظلم اختیار کیا، اور اپنی لذّتوں اور مستیوں میں پڑے رہے، اور جرائم کا مسلسل ارتکاب کرتے رہے، لہٰذا ان کو ہلاک کردیا گیا، بس چند ہی آدمی بچے جنہیں ہم نے نجات دیدی، یہ لوگ ایمان پر اور ایمانی تقاضوں پر قائم تھے، منکرات سے بچتے تھے، دوسروں کو برائیوں سے روکتے تھے۔

اس بات میں اس امتِ حاضرہ کو تنبیہ ہے کہ کفر وظلم کو چھوڑیں، اور عیش وعشرت کے پیچھے نہ لگیں، اور قوموں کے ذمہ داروں کو تنبیہ ہے کہ وہ اپنی سمجھ اور بصیرت کو کام میں لائیں، اور علماء کرام کو بھی تنبیہ ہے کہ حُبِّ مال اور عیش و

عشرت سے پرہیز کریں، اور نہی عن المنکر کا خاص کر فریضہ ادا کریں، اور لوگوں کو فساد فی الارض سے منع کرتے رہیں۔

اس آیت میں اہل الرائے اور سمجھدار لوگوں کو لفظ "أُولُوْبَقِيَّةٍ" سے تعبیر کیا ہے، بقیہ کا لفظ باقیماندہ چیز کو کہا جاتا ہے، اور انسان کی عادت یہ ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہوتی ہے اس کو ہر حال میں اپنے لئے محفوظ اور باقی رکھنے کا اہتمام کرتا ہے، ضرورت پڑنے پر دوسری ساری چیزیں قربان کر دیتا ہے مگر اس کو نہیں جانے دیتا اسی لئے عقل و بصیرت کو "بقیہ" کہا جاتا ہے، کہ وہ سب سے زیادہ قیمتی اور عزیز ہے۔

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ﴾ آپ کا ربّ ایسا نہیں ہے کہ لوگوں پر ظلم کرے، وہ جو عذاب دیتا ہے، یا ہلاک کرتا ہے، اس کا سبب کفر اور شرک ہوتا ہے، اور جب ان کے ساتھ معاصی بھی شامل ہوں تو ہلاکت اور زیادہ یقینی ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ صرف معاصی بغیر شرک و کفر کے ہلاکت کے اسباب میں شمار نہیں، پس معاصی میں عمومی عذاب جس سے مکمل تباہی ہو ممکن نہیں۔ ہاں! چھوٹے چھوٹے عذاب آئیں گے، مگر تباہ کن نہیں، وہ بھی ایسی صورت میں جب نہی عن المنکر مفقود ہو، اگر نہی عن المنکر کا سلسلہ باقی ہو تو اس امت پر کبھی عذاب نہیں آئے گا، سوائے نہایت قلیل جزئی عذاب کے۔ واللہ اعلم

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جس کسی بھی قوم میں کوئی ایسا شخص ہو جو اِن میں رہتے ہوئے گناہوں میں مبتلا ہو، اور وہ قدرت رکھتے ہوئے اس کی حالت کو نہ بدلیں، تو مرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ ان پر عذاب بھیجے گا۔ [أبو داؤد]

یہی روایت امام ابو داوٗد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کی ہے پس یہ عذاب اس قسم کے جزئی عذاب ہوں، مثلاً مہنگائی، قحط، زلزلہ عام بیماری، بدامنی، بے انصافی، چوری، ڈاکے، قتل و غارت، سیلاب وغیرہ، یہ سارے جزئی عذابات ہیں، اور تباہ کن نہیں ہیں۔ واللہ اعلم

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی امت میں بنا دیتا، اور سب ایک ہی دین پر ہوتے، دنیا میں ہر طرف ہر زمانہ میں اسلام ہی اسلام ہوتا، اور سب تکوینی طور پر قہراً و جبراً مسلمان ہو جاتے، مگر ایسا نہیں ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ لوگوں کا ابتلاء و امتحان ہو، حق و باطل دونوں سامنے ہوں، لوگوں کو پورا پورا انتخاب کا حق ہوتا کہ جنت و دوزخ کا راستہ ہموار ہو، اور ایمان کے ساتھ کفر کے اور حق کے ساتھ باطل کے تقاضے بھی پورے ہوں، کسی پر جبر و زبردستی نہ ہو، ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ

شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الكهف: ٢٩] (یعنی جسے ایمان قبول کرنا ہو وہ اپنے اختیار سے قبول کرے، اور جسے کفر پر رہنا ہو وہ اپنے اختیار سے کفر پر رہے)۔

جب حق قبول کرنے پر اِکراہ وزبردستی نہیں کیا، بلکہ بااختیار رہنے دیا، تو شیاطین کی کوششوں اور نفوسِ انسانی کے تقاضوں پر چلنے والے کافر رہیں گے، اور نفس وشیطان کے حکموں پر نہ چلنے والے مؤمن رہیں گے، اس طرح حق و باطل والوں میں ہمیشہ اختلاف رہے گا۔

﴿وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ اور انہیں اسی لئے پیدا فرمایا کہ وہ مختلف رہیں، تاکہ اسی اختلاف کے نتیجے میں: ﴿فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ﴾ [هود: ١٠٥] (پس ان میں سے بعض بد بخت اور بعض نیک بخت ہیں) کا روزِ قیامت فیصلہ ہو جائے، اور جنت ودوزخ کی بھرائی کا کام انجام پائے۔ فرمایا:

﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ اور آپ کے ربّ کی یہ بات پوری ہوگی کہ میں جہنم کو جنات اور انسانوں سے بھر دوں گا، یہی بات سورۂ الٓمٓ سجدة میں بھی مذکور ہے، فرمایا: ﴿وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ [السجدة: ١٣] (اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو ہدایت دیدیتے، لیکن میرا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ میں دوزخ کو جنات سے اور انسانوں سے بھر دوں گا) جو اس میں اکھٹے جلتے رہیں گے۔

سورۂ صٓ میں ابلیس لعین سے بھی یہی فرمایا: ﴿لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [ص: ٨٥] (میں ضرور بضرور جہنم کو بھر دوں گا تجھ سے اور جنہوں نے تیری پیروی کی ان سب سے)۔

اور جب یہ فیصلہ ہے تو اہل کفر کا وجود بھی تکوینی طور پر ضروری ہے، تاکہ حق تعالیٰ شانہ کی تمام صفات کے تقاضے پورے ہوں، جیسے فرمایا: ﴿يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَاءُ﴾ [العنکبوت: ٢١] (اللہ عذاب دے جس کو چاہے، اور رحم کرے گا جس پر چاہے) پھر ہر ایک مکلّف بغیر کسی جبر واکراہ اپنے ارادے اور اختیار سے اپنے لئے راستہ متعین کرے، یا ہدایت وجنت پائے، یا ضلالت وجہنم اختیار کرے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ

وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ
اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ
يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

ترجمہ: اور رسولوں کے قصوں میں سے یہ قصے ہم ایسے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں، اوران قصوں میں آپ کے پاس حق آ گیا ہے، اور اہل ایمان کے لئے نصیحت ہے ﴿۱۲۰﴾ اور آپ ان لوگوں سے فرمادیجئے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ پر عمل کرتے رہو، ہم اپنی جگہ پر عمل کرتے ہیں ﴿۱۲۱﴾ اور تم انتظار ہی کرو، ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں ﴿۱۲۲﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے آسمان اور زمین میں غیب کی چیزوں کا علم، اور اسی کی طرف تمام امور جمع اور رجوع کریں گے، سو آپ اس کی عبادت کریں، اور اسی پر اعتماد کریں، اور آپ کا ربّ ان کاموں سے غافل نہیں جو تم کرتے ہو ﴿۱۲۳﴾

معارف ومنازل

حل لغات:

نَقُصُّ بیان کرتے ہیں۔ اَنْبَآءُ یا نَبَأٌ بمعنی اخبار۔ نُثَبِّتُ تقویت دینا۔ فُؤَاد بمعنی دل۔ مَوْعِظَة نصیحت۔ ذِكْرٰى نصیحت اور یادگار۔ غَيْب ہر وہ پوشیدہ چیز جو حواس سے مخفی ہو۔ يُرْجَعُ الْاَمْرُ کسی چیز کا لوٹنا۔ تَوَكَّل بھروسہ۔

سورۂ ہود کا اکثر حصہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی امتوں کے واقعات پر مشتمل ہے، اختتام پر دوبارہ اجمال کے ساتھ اشارہ فرمایا جارہا ہے، اوران تمام واقعات کے بیان کرنے کے فوائد میں سے ایک اہم فائدے کی نشان دہی ہورہی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات سنانے سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ آپ کے قلب مبارک کو اطمینان وسکون حاصل ہو، اور یہ جو قصے آپ سے بیان کئے گئے ہیں، یا ان میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ سب صحیح ہے، اور حق ہے، ان میں اہل ایمان کے لئے نصیحت ہے، اور یاددہانی ہے کہ جس کا نتیجہ عبرت اور سبق ہے۔

لوگ آپس میں بیٹھ کر تفریحِ خاطر کے طور پر قصہ گوئی کرتے ہیں، مگر قرآن حکیم جو قصے اور واقعات بیان کرتا ہے وہ اس لئے کہ یہ واقعات مواعظ ونصائح اور درس عبرت و یاددہانی کے طور پر سنائے جائیں، تاکہ ان کی روشنی

میں لوگ اپنی اصلاح کرلیں، اس کے ساتھ ایک عجیب وغریب اَحسَنُ الْقِصَصِ کا تذکرہ ہورہا ہے، جس کے مضامین میں سینکڑوں مواعظ ونصائح مخفی ہیں۔

یعنی سیدنا حضرت یوسف صدیق اللہ علیہ السلام کا واقعہ، پھر فرمایا کہ جولوگ ان واقعات کے دیکھنے اور سننے کے باوجود ایمان نہیں لاتے، آپ ان سے فرمائیے کہ اپنی تباہی کا اسی طرح انتظار کرو، جس طرح ہلاک شدہ اقوام نے بڑے غروراور شدت کے ساتھ اپنے انبیاء کرام علیہم السلام سے جلدی عذاب لانے کی درخواست کی، اور غضبِ الٰہی کو للکار کر جلدی تباہی کو دعوت دی، اے مشرکین مکہ! تم بھی اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر مجھ سے جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہو، مجھے اس قسم کے غیبی عذابوں کا پتہ نہیں، اور دسترس بھی نہیں۔ میں اور کچھ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ اپنے ربّ پر بھروسہ واعتماد کروں، کیونکہ سارے انسانوں کا اور ان کے اعمال کا، اور تمام امور کا اسی ذات پاک کی طرف لوٹنا ہے، اور رجوع کرنا ہے، وہ ذرہ ذرہ سے باخبر ہے، اور تمام اشیاء پر اس کا علم محیط ہے، اسی کے مطابق وہ ان سے حساب لے گا، اور ہر ایک لئے جزاوسزا کا فیصلہ فرمائے گا۔

فائدہ:

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جمعہ کے روز سورۂ ہود کی تلاوت کیا کرو۔ [مشکوۃ عن الدارمي]

سورۂ ہود کی تفسیر ختم ہوئی۔ الحمد للہ رب العٰلمین۔

سُورَةُ یُوسُف

مکیۃ آیاتھا ١١١ رکوعاتھا ١٢

سورۂ یوسف مکی ہے، اس میں ایک گیارہ (١١١) آیتیں، اور بارہ (١٢) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۂ یوسف (علیہ السلام) ہے، جو اس سورت کی آیت نمبر ٤ میں موجود ہے اسی سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول سورۂ ہود کے بعد ہے۔ یہ سورت ترتیبِ تلاوت میں بارہویں نمبر پر ہے، اور ترتیبِ نزول کے اعتبار سے ٥٣ نمبر پر ہے، اس کے بارہ رکوع، ایک سو گیارہ آیات ہیں، اور یہ سورت آٹھ سو آٹھ کلمات (٨٠٨)، اور گیارہ سو سینتالیس (١١٤٧) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط:

(١) گزشتہ سورت انبیاء کرام علیہم السلام کے حالات پر مشتمل تھی، یہ سورت اس کا تتمہ ہے۔ (٢) گزشتہ سورت میں قوموں کی زیادتیوں کا بیان ہوا، یہاں اپنے بھائیوں کے ظلم وستم کا بیان ہے۔ (٣) گزشتہ سورت میں صبر کا حکم ہوا، جبکہ اس سورت میں اس کے نمونہ کا بیان ہو رہا ہے۔ (٤) گزشتہ سورت میں توحید، معاد، صداقتِ رُسل علیہم السلام اور حقانیتِ قرآن مجید کا بیان تھا، اس سورت میں بھی انہی بنیادی چیزوں کا بیان ہے۔

مختصر موضوع:

بنی اسرائیل کے سب سے پہلے نبی سیدنا یوسف علیہ السلام کے مکمل واقعہ کا بیان کہ انہی بھائیوں کے بے حد ظلم و ستم اور سخت کٹھن امتحانات سے گزرنا پڑا، اعتماد و توکّل علیٰ اللہ تعالیٰ کے بے مثال مظاہرے اور نمونے، سچے خوابوں کا تذکرہ، عفو و درگزر کے بے مثال واقعات، پیغمبروں علیہم السلام کی بے بسی اور عاجزی، اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں، اور نہ ہی فاعل مختار، بنی اسرائیل کا مصر میں داخلہ اور اس کے اسباب، "اَشَدُّ الْبَلَاءِ الْاَنْبِیَاء" کا ایک نمونہ، حضرت یوسف علیہ السلام کی خود ساختہ غلامی سے بادشاہت و نبوت تک کا تذکرہ۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سورۂ یوسف کا موضوع دراصل سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاندار اور روشن مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔ یہ سورت مکی دور کے آخری حصے میں نازل ہوئی، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کفارِ مکہ کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کافی رنجیدہ اور پریشان تھے، اس عجیب و غریب سورت کے نزول کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پریشانیاں ایک حد تک کم ہوگئیں۔ اس سورت نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی اور دشمنوں کی تمام ناکامیوں کا مژدہ سنایا، جیسے سیدنا یوسف علیہ السلام کی کامیابی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناعاقبت اندیش بھائیوں کی ناکامی اور شرمساری کا واضح بیان۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا نسب نامہ:

یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم الخلیل علیہم السلام۔ حضرت یوسف علیہ السلام حسن و خوبیوں کے پیکر، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے ہیں، اور ان کی والدہ ماجدہ کا نام راحیل بنت لابان ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان کے ساتھ بے حد محبت تھی، بلکہ عشق تھا (غیر اختیاری شغف)، اور اس لئے کسی وقت بھی ان کی جدائی گوارا نہ کرتے تھے، یہ بھی اپنے والد، دادا، پردادا کی طرح سن رُشد کو پہنچ کر ربّ العزّت جل شانہ کے جلیل القدر پیغمبر بنے، اور ملّتِ ابراہیمی کی دعوت و تبلیغ کی خدمت سرانجام دی، یہی وجہ ہے کہ ابتدائے زندگی ہی سے ان کی فطری اور دماغی استعداد دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں بالکل جدا اور نمایاں تھی۔ یعقوب علیہ السلام کے عشق و محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یوسف علیہ السلام کی پیشانی کا چمکتا ہوا نورِ نبوت پہچانتے، اور وحی الٰہی کے ذریعہ اس کی اطلاع پاچکے تھے۔

قرآن حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر خیر:

حضرت یوسف علیہ السلام کا قرآن حکیم نے چھبیس (۲۶) مرتبہ ذکر کیا ہے، جن میں سے چوبیس (۲۴) مرتبہ

صرف سورۂ یوسف میں، اور ایک جگہ سورۂ انعام میں، اور ایک جگہ سورۂ غافر میں آیا ہے۔ اور ان کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ پردادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کے نام پر بھی قرآن کی ایک سورت (سورۃ یوسف) نازل ہوئی، جو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات سے متعلق عبرت وموعظت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔

سورۃ یوسف:

قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو "احسن القصص" کہا ہے، اس لئے کہ اس ایک واقعہ میں جس قدر عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ ونصائح ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعہ میں یکجا میسر نہیں ہیں۔ ان شاء اللہ پوری سورت کی تفصیلات کے بعد آخر میں اجمال کے ساتھ بہت خوبصورت انداز میں بیان کریں گے، جن سے اہل علم کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔

درحقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب دلکش ودل پرور اور زمانہ کے عروج وزوال کی زندہ یادگار ہے، کس کو یقین آئے گا کہ یہ ایک کمسن چاند جیسے خوبصورت بچہ کنعان کے کنویں کی تاریکیوں سے نکل کر مصر کے بازار میں غلاموں کے حلیہ ولباس میں فروخت ہو کر شاہی دربار میں بحیثیت غلام پہنچے گا؟ پھر پاکدامنی کا وہ ریکارڈ قائم کرے گا جس پر قدسی فرشتے بھی رشک کریں گے، پھر زندان پہنچ کر صبر واستقلال کا مظاہرہ پیش کرے گا۔ شاید اس لئے یہ بے نظیر ہے کہ اس کے خون میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کا خون مکرم شامل ہے۔ ؎

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہئے ☆ کہ دانہ خاک میں ملکر گل وگلزار ہوتا ہے

اے بندہ بمن بیا وخود را ترہ کن ☆ پس اگر شاہ جہانت نکنم گلہ کن

بڑے شاہی اعزاز کے ساتھ زندان کی کوٹھڑی سے نکل کر اسی دربار میں پہنچتا ہے جہاں اسے غلام رکھا گیا تھا، پھر بادشاہ وقت اسے بادشاہت کی پیش کش کر کے ہاتھ جوڑتے ہوئے اسے شاہی تخت پر بٹھا دیتا ہے، اور آپ علیہ السلام نوے (۹۰) یا اسی (۸۰) سال تک مصر پر حکومت کر کے عدل وانصاف اور مساوات کا وہ نظام قائم کرتے ہیں جسے سو فیصد نبوت کا نظام کہا جاتا ہے، حتیٰ کہ ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ چند عرصہ، یعنی چار سو سال بعد جب میرے بھائی موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام میرے خاندان کو یہاں کے حکمرانوں سے آزاد کر کے فلسطین روانہ ہوں گے تو میرے تابوت حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے مزار کے ساتھ سپرد خاک فرمائے۔ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَعَلَىٰ جَمِيعِ الْأَنبِيَاءِ

دامان نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار ☆ گل چین تواز تنگی داماں گلہ دارد

یہ واقعہ اگر چہ ایک فرد کا ہے، مگر اس کی پہنائیوں میں ایک بہت بڑا جہاں پوشیدہ ہے۔ تفسیر درمنثور بحوالہ دلائل النبوت امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک یہودی عالم حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ یوسف تلاوت فرمارہے تھے، وہ کہنے لگا کہ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ سورت آپ کو کس نے سکھائی ہے؟ فرمایا کہ یہ سورت مجھے اللہ تعالیٰ سبحانہ نے سکھائی ہے، اسے بڑا تعجب ہوا، اور یہودیوں کے پاس واپس پہنچ کر اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم وہ اسی طرح قرآن پڑھتے ہیں جیسا کہ توریت میں (بعض) چیزیں نازل ہوئی ہیں۔

اس کے بعد وہ ان لوگوں کو اپنے ہمراہ لے کر آیا، حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان صفات سے پہچان لیا جنہیں وہ جانتے تھے، اور مہر نبوت کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں شانوں کے درمیان دیکھ لیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرأت سننے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ یوسف تلاوت فرمارہے تھے، انہیں بھی تعجب ہوا، اور پھر اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ [ابن کثیر باختصار اور درمنثور جلد چہارم]

شانِ نزول:

سورۂ یوسف کے شانِ نزول کے بارے میں حدیثی روایات اور مفسرین حضرات کے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ کفارِ مکہ نے ایک مرتبہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق "یہود" سے گفتگو کی، اور اپنی درماندگی اور پریشانی کا اظہار کیا، کہ وہ ہمارے معبودوں کو باطل کہتا ہے، اور صرف اپنے ایک خدا کو برحق اور حقیقی معبود کہتا ہے، اس پر یہود کے علماء نے ان سے کہا کہ اس مدعی نبوّت کو ملامت کرنے اور جھوٹا بنانے کے لئے تم ان سے یہ سوال کرو کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کیوں شام سے مصر منتقل ہوئی؟ اور یوسف علیہ السلام سے متعلق جو واقعات ہیں ان کی تفصیل اور حقیقت کیا ہے؟ اگر یہ نبی نہیں ہے تو ہرگز نہ بتا سکے گا۔

کفارِ مکہ نے یہود کی ہدایت کے مطابق ذات اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ دونوں سوال کئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی الٰہی کے ذریعہ وہ سب کچھ ان کو سنا دیا جو سورۂ یوسف میں موجود ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۟﴿۱﴾ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۲﴾ نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ
اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ۖ وَاِنۡ كُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِهٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِيۡنَ ﴿۳﴾

ترجمہ: الٓرٰ، یہ کتاب مبین کی آیات ہیں ﴿۱﴾ بیشک ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی تا کہ تم سمجھو ﴿۲﴾ ہم آپ سے سب سے اچھا قصہ بیان کرتے ہیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے، اور تم اس سے پہلے بے خبر تھے ﴿۳﴾

معارف ومنازل

الٓرٰ حروفِ مقطعات پر سورۂ بقرہ کے شروع میں مفصل کلام ہو چکا ہے۔

شروعِ سورت میں کلام اللہ کی حقانیت کا بیان ہے۔ اول یہ کہ وہ کتاب مبین ہے، یعنی روشن کتاب ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن حکیم کے پینتالیس نام لکھے ہیں، انہی میں سے ایک "کتاب مبین" ہے۔ تفصیل ہم نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں لکھی ہے۔

دوئم یہ کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوئی ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے۔

سوئم یہ کہ یہ کتاب عربی زبان میں ہے، اور عرب ہی اس کے اولین مخاطب ہیں۔ فرمایا: ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ﴾ [ابراھیم: ۴] (اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان میں)۔ سورۂ شعراء میں فرمایا: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۹۵﴾﴾ [الشعراء] (بیشک یہ قرآن ربّ العالمین کا نازل کیا ہوا ہے۔ امانتدار فرشتہ اُسے لے کر اترا ہے۔ تمہارے قلب پر اتارا ہے تا کہ تم ان (پیغمبروں) میں شامل ہو جاؤ جو لوگوں کو خبر دار کرتے ہیں)۔

چہارم مقصد نزول کا بیان ہے، ﴿لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ﴾ تا کہ تم سمجھو، قرآن کریم تحریف شدہ تورات شریف کی طرح داستان گوئی یا محض اشخاص واقوام وقبائل کے تاریخی حالات کا مرقع نہیں ہے، بلکہ وہ جن تاریخی واقعات کو بیان کرتا ہے اس کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے، اور وہ عبرت وموعظت اور تذکیر ونصیحت کا مقصد وحید ہے، اس لئے اپنے بارے میں کہتا ہے: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ [الزمر: ۲۳] (اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں)۔

جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے سلسلۂ کلام جاری ہوا ہے، فرشتے آپس میں بولتے رہتے ہیں، جنات کا آپس میں اور انسانوں کا آپس کی باتوں کا قیامت تک گفتگو اور تکرار جاری رہتا ہے۔ قرآن کریم ان سب سے بہتر ہے۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو اَحسن القصص اس لئے فرمایا کہ یہ قصہ بے شمار عجائبات پر مشتمل ہے، مثلاً بے نظیر عبرتیں اور بصیرتیں، رشد وہدایت کے گوشوں سے نقاب کشائی، کئی طرح کی حکمتیں، قدرت الٰہی کے عجیب وغریب مظاہرے، علماء کے خصائل، عورتوں کی بداخلاقی اور مکاری، تقویٰ وطہارت اور عفت کے موجزن دریا میں غوطہ خوری، صبر واستقامت، حسد وعناد کے بے شمار نقائص، خوابوں کی نرالی تعبیر، عفو ودرگزر کی عجیب مثالیں، حکومت اور حکمرانی کے طرز وطریقے۔

الغرض یہ اَحسن القصص اتنے بے شمار مواعظ ونصائح اور حکمتوں اور عبرتوں پر مشتمل ہے جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا، تو انہی وجوہات کی بنا پر یہ اَحسن القصص قرار پایا، اس کے ساتھ صاحب قصہ کی ذاتی شرافت، نبوت، عفت، پاکیزگی اور مکارمِ اخلاق اور نسبی شرافت نے مزید واقعہ کی اہمیت کو روشن کرکے اسے چار چاند لگادیئے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا: یا رسول اللہ! "کریم" کون ہے؟ فرمایا: یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم الخلیل علیہم السلام۔ [بخاری]

دراوصافش کرم رسم قدیم ست ☆ کریم ابن الکریم ابن الکریم ست

[جامی]

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝۴ قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰۤى
اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۵

ترجمہ: اور جب کہ یوسف نے اپنے والد سے کہا کہ اے میرے ابا! میں نے دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج مجھے سجدہ کئے ہوئے ہیں ۝۴ ان کے والد نے کہا کہ اے میرے چھوٹے بیٹے! تم اپنا خواب اپنے بھائیوں کو مت بتانا، ورنہ وہ تمہارے لئے کوئی بری تدبیر کریں گے، بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ۝۵

معارف ومنازل

حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل تھا، اسرائیل کے معنی ہیں: عبد اللہ۔ یہ حضرت اسحق علیہ السلام کے بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں، جن کی بشارت کا واقعہ سورۂ ہود میں گزر چکا ہے۔ قومِ بنی اسرائیل انہی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے پانچ شادیاں یکے بعد دیگرے کیں، ان کی مذکر اولاد میں بارہ بیٹے تھے، جو مختلف بیویوں کی اولاد تھے، سب سے چھوٹے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین ایک بیوی (راحیل) کے بچے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کی بہن سے شادی کی جو زندہ تھیں اور ان دونوں بچوں کی خالہ تھیں، دیگر دس لڑکے سب عمر میں بڑے تھے، اور فوت شدہ تین بیویوں کے اولاد تھے۔

چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام حد سے زیادہ حضرت یوسف علیہ السلام سے محبت کرتے تھے، اور ہر وقت ان کو اپنے پاس رکھتے تھے، اور ان کی تربیت کا زیادہ خیال رکھتے تھے، اس لئے دوسرے بھائیوں کو حسد پیدا ہوا، اور وہ اس چیز کو پسند نہیں کرتے تھے، اور انہیں ناگوار معلوم ہوتا تھا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام بھی اس حقیقت حال سے باخبر تھے، اور بیٹوں کے حاسدانہ رویہ سے پریشان بھی رہتے تھے۔

عین اسی کشمکش کے زمانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ سورج و چاند اور گیارہ ستارے میرے سامنے سجدہ ریز ہو کر میرے قدموں پر سجدہ کر رہے ہیں، صبح تنہائی میں حضرت والد ماجد سے اپنا خواب بیان کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس خواب سے اور اس کی تعبیر سے بڑی مسرت حاصل ہوئی، اور ساتھ میں پریشانی لاحق ہوئی، جس کے دفعیہ میں بیٹے سے فرمایا کہ اپنا یہ خواب چھپائے رکھو، اور کبھی اپنے بھائیوں کے سامنے ظاہر نہ کرو، کیونکہ وہ تمہارے حال پر اور اس خواب کی بلندی پر راضی نہیں رہیں گے، اور تمہارے خلاف کوئی پلان اور سازش تیار کریں گے، تمہیں نقصان پہنچانے کی کوئی بری تدبیر کریں گے، کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے، اور سازشوں کا تیار کرنے والا ہے۔

سبحان اللہ! یہ گمان پر مبنی خطرہ بعد میں حقیقت بن گیا، جس کا بیان آنے والا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام کو پہلے تو یہ نصیحت کی کہ اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان مت کرنا، اور پھر یہ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ
يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۞

ترجمہ: اور تمہارا ربّ اسی طرح تمہیں منتخب فرمائے گا، اور تمہیں خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمائے گا، اور وہ تم پر اور یعقوب کی آل پر اپنی نعمت پوری فرمادے گا، جیسا کہ اس نے اپنی نعمت اس سے پہلے تمہارے دونوں دادوں ابراہیم اور اسحٰق پر پوری فرمادی، بیشک تمہارا ربّ جاننے والا ہے، حکمت والا ہے۔

معارف ومنازل

بالائے سرش زہوشمندی ☆ میتافت ستارۂ بلندی

انبیاء کرام علیہم السلام بڑے عقلمند اور عقل ودانش کے پیکر ہوتے ہیں، ہر چیز کی خاص کر انسانوں کی فطرت و دانشمندی کی شناخت کے بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام دوسرے بیٹوں کے مقابلے میں حضرت یوسف علیہ السلام سے جو بے پناہ عشق اور محبت رکھتے تھے وہ اس لئے کہ بچپن ہی میں ان کی فطری اور دماغی صلاحیتوں کا مطالعہ کر چکے تھے، اور ان کی پیشانی میں ابھی سے نورِ نبوت کے آثار انہیں معلوم اور محسوس ہوتے تھے، اس لئے پہلے انہیں یہ نصیحت فرمائی کہ اپنا خواب بھائیوں کو نہ بتانا۔ دوئم انہیں ان کے مستقبل سے آگاہ فرماتے ہوئے کہا کہ بیٹا میں یہ سمجھ رہا ہوں اور یقین کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ یَجْتَبِیْكَ تمہیں منتخب فرمائے گا (نبوت عطا فرمائے گا) اور تمہیں تعبیر خواب کا علم عطا کرے گا۔

اور تم پر اپنا انعام پورا فرمائے گا، جس میں نبوت کی نعمت سرفہرست ہے، اللہ تعالیٰ تم پر اور آل یعقوب علیہ السلام پر اپنا انعام کامل فرمائے گا، جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے پردادا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر، اور تمہارے دادا حضرت اسحٰق علیہ السلام پر اپنا انعام کامل فرمایا تھا، بیشک تیرا ربّ علم والا ہے، حکمت والا ہے، اس کے فیصلے علم اور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

خواب کی حقیقت، اور اس کی اقسام:

عالمِ اسرارِ شریعت حضرت قاضی ثناء اللہ مجددی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مظہری میں خواب اور اس کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ خواب کی حقیقت یہ ہے کہ نفس انسان جس وقت نیند یا بے ہوشی کے سبب ظاہر بدن کی تدبیر سے فارغ ہوجاتا ہے، تو اس کو اس کی دقتِ خیالیہ کی راہ سے کچھ صورتیں دکھائی دیتی ہیں، اسی کا نام خواب ہے۔ پھر اس کی تین قسمیں ہیں، جن میں سے دو بالکل باطل ہیں، جن کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں ہوتی، اور ایک اپنی ذات کے اعتبار سے صحیح اور صادق ہے، جس کو بخاری شریف کی حدیث میں رُؤْیَا صَالِحَة اور رؤیائے صادقہ

سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

مگر اس صحیح وصادق قسم میں (بشرطیکہ انبیاء کرام علیہم السلام کا خواب نہ ہو) بھی کبھی کبھی بیرونی عوارض شامل ہو جاتے ہیں، اور اسے ناکارہ و بے اعتبار بنا دیتے ہیں۔

خواب کی پہلی قسم یہ ہے کہ انسان جو مختلف صورتوں اور واقعات کا نیند میں مشاہدہ کرتا ہے، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ حالتِ بیداری میں جو کچھ کرتا ہے یا سنتا ہے یا دیکھتا ہے وہی کچھ بعینہٖ اسی کیفیت یا معمولی ردوبدل کے ساتھ اسے نیند میں نظر آتا ہے، یا محسوس ہوتا ہے (جیسے بلّی کو گوشت کا نظر آنا جو مشہور ہے) یہ ہے حدیث النفس، اس قسم کے خواب کا کوئی مطلب نہیں ہوتا، یہ خواب اور بیداری کے حالات ایک جیسے ہیں۔

اور دوسری قسم یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شیطان مختلف حقائق اور صورتیں سونے والے کو القاء کرتا اور دکھاتا ہے، پھنسا کر کبھی خوش کر کے کبھی پریشان کر کے، یہ قسمِ دوئم شیطانی خواب کہلاتا ہے، یہ بھی قسم اول کی طرح باطل اور بے حقیقت ہے۔

تیسری قسم جو حق اور صحیح ہے، جس کی تعبیر و مطلب بھی ہے، اور الہامی بھی ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری یا کسی صدمہ ونقصان کے پہنچنے کا قبل از وقت پیغام اور اطلاع ہے، اسی کا نام ہے رویائے صادقہ، یعنی سچے خواب۔ سرورِ عالم [فِدَاهُ اَرْوَاحُنَا] صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے، فرمایا: مؤمن کا خواب ایک کلام ہے، جس میں وہ اپنے ربّ جل شانہ سے شرفِ مکالمہ حاصل کرتا ہے۔ یعنی الہام کی شکل میں، زہے سعادت ہو اس بندہ کے لئے۔ [مظهري بحواله طبراني]

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے خواب سارے اسی قسم کے ہوتے ہیں، اسی وجہ سے ان کے خواب سو فیصد سچے الہامی ہوتے ہیں، اور انہیں وحی کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمانبردار بیٹے سے فرمایا:
﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [الصافات:۱۰۲] (پھر جب وہ لڑکا ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا، تو انہوں نے کہا: بیٹے! میں خواب دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب سوچ کر بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے کہا: ابا جان! آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے، ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے)۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی ☆ سکھایا جس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

البتہ! عام مسلمانوں کے خواب میں ہر طرح کے احتمالات ہوتے ہیں، اس لئے وہ کسی کے لئے حجت نہیں ہوتے، اور نہ ہی ان سے شرعی مسائل کا اثبات ہوتا ہے، کیونکہ عام لوگوں کے خواب نفسانی خواہشات یا گناہوں کی کدورت وغیرہ سے خالی نہیں ہوتے، آدمی جتنا متقی و پرہیز گار ہو معصوم نہیں ہوتا، اصل چیز عصمت ہے، جو کہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کا خاصہ ہے۔

سچے خوابوں کو نبوت کا جزء بتایا گیا ہے:

صحیح احادیث میں تیسری قسم کے سچے خوابوں کو نبوت کا جزء کہا گیا ہے، اس بارے میں روایات مختلف ہیں، بعض روایات میں چالیسواں جزء، اور بعض میں چھیالیسواں جزء، اور بعض میں انچاس اور پچاس اور ستر واں جزء ہونا منقول ہے۔ یہ سب روایات تفسیر قرطبی میں جمع کر کے حافظ مغرب حضرت ابن عبد البر مالکی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تحقیق نقل کی ہے کہ ان روایات میں کوئی تضاد اور تعارض نہیں۔

مشکوٰۃِ نبوت سے نکلی ہوئی باتوں کا محمل نہایت واضح اور صاف ہے، اور ہر روایت ایک بنیادی حقیقت کی ترجمان ہے، اور وہ یہ ہے کہ سارے خواب دیکھنے والے برابر نہیں ہوتے، اور سارے خواب بھی ایک جیسے نہیں ہوتے، پس اختلاف کا تعلق خواب دیکھنے والوں کے اختلاف احوال و کردار کی بناء پر ہے، جو لوگ تقویٰ و دیانت اور سچائی کے ساتھ متصف ہوں ان کے خواب نبوت کے چالیسویں جزء کے درجے میں ہیں، اور جو لوگ دوسرے درجے میں متقی شمار ہوں ان کا چھیالیسواں، اور ان کے بعد والوں کا انچاس اور پچاسواں درجہ، اور آخری لوگوں کا ستر واں جزء شمار ہوگا۔

اب یہ بات قابلِ غور ہے کہ خواب کوئی بھی (یعنی بیان شدہ اجزاء) ہو ان سچے خوابوں کے جزء نبوت ہونے سے کیا مراد ہے، اور یہ جزئیت کیسی ہے؟ صاحب تفسیر مظہریؒ نے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ سلسلہ وحی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تئیس (۲۳) سال جاری رہا، ان میں سے پہلے چھ ماہ میں وحی الٰہی رویائے صالحہ وصادقہ کے ذریعہ جاری رہی، اور باقی پینتالیس چھ چھ ماہ میں رویائے صالحہ کے علاوہ حضرت جبریل امین علیہ السلام کے ذریعہ بیداری میں وحی آتی رہی، اس حساب سے سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء شمار ہوئے، اور باقی روایات کا محمل وہی ہے جو ابھی بیان ہوا، یعنی ان میں مدت وحی کا لحاظ نہیں، بلکہ خواب دیکھنے والوں کے حالات کا لحاظ ہے۔

اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ جس طرح نبوت کے ساتھ وحی غیر اختیاری ہے، یعنی پیغمبر ﷺ کے اختیار سے باہر ہے، اسی طرح الہامی خواب بھی وحی اور نبوت کی طرح غیر اختیاری ہے، مگر یہ قاعدہ خاص ہے، عام نہیں کہ دیگر غیر اختیاری چیزوں کو شامل ہو۔ واللہ اعلم

سچے خواب حسبِ تصریحِ حدیث بلاشبہ جزءِ نبوت ہیں، مگر نبوت نہیں، نبوت تو حضرت خاتم الانبیاء ﷺ پر ختم ہو چکی ہے، اب تو قیامت تک آپ ﷺ کا دین، آپ ﷺ کی کتاب، آپ ﷺ کی شریعت، آپ ﷺ کے معجزات، آپ ﷺ کے انوار و برکات کا سلسلہ منشاءِ الٰہی کے مطابق باقی رہے گا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ"۔ یعنی آئندہ نبوت کا کوئی جزء باقی نہیں رہے گا سوائے مبشرات کے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ مبشرات سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا: سچے خواب۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبوت ہر اعتبار سے ختم ہے، البتہ اس کے انوار و برکات جو دنیا میں باقی ہیں، مثلاً قرآن حکیم، احادیثِ مقدسہ، یا مؤمنوں کے سچے خواب، وغیرہ۔

کسی کافر یا منافق وفاسق کا خواب بھی سچا ہو سکتا ہے:

مختصر یہ کہ سچے خواب مؤمنوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ کافر اور بدتر لوگوں کے خواب بھی سچے ہو سکتے ہیں، اسی سورۂ یوسف ہی میں یہ بات آنے والی ہے۔ اسی طرح مؤمنین کے خواب بھی کبھی جھوٹے اور بے حقیقت ہو سکتے ہیں۔ عاتکہ بنت عبد المطلب نے غزوۂ بدر کے موقع پر سچا خواب دیکھا، جس کی تفصیل گزر چکی۔ اسی طرح کسریٰ شاہِ ایران نے سرورِ عالم ﷺ کی آمد و بعثت کے بارے میں سچا خواب دیکھا۔ اسی طرح بخت نصر کافر بادشاہ نے خواب دیکھا، حضرت دانیال علیہ السلام نے اس کی تعبیر بتادی، سورۂ بقرہ میں اس کا تذکرہ ہو چکا۔

فوائد:

(۱) خواب بسا اوقات خوش کن ہوتا ہے، مگر اس کی تعبیر پریشان کن ہوتی ہے، اور کبھی اس کا برعکس ہوتا ہے۔

(۲) خواب کی تعبیر ایسے آدمی سے پوچھنا چاہیے جو تعبیر جانتا ہو، اور دوست بھی ہو۔

(۳) خواب کا تعلق کبھی دیکھنے والے کے ساتھ ہوتا ہے، کبھی کسی اور کے ساتھ بھی۔ پھر بعض اوقات موسم، سردی، گرمی کی وجہ سے تعبیر میں فرق ہوتا ہے، احتیاط رہے۔

(۴) اگر خواب کی تعبیر اندھا دھند بغیر علم کے کر دی تو نقصان کا اندیشہ ہے، یہ ایک مستقل بابِ علم ہے، اس

کے اصول ہیں، اور بہت سے قواعد ہیں، لہٰذا بیان کرنے اور تعبیر کرنے میں احتیاط ضروری ہے۔

حکایت:

خلیفہ ہارون رشیدؒ کی بیوی محترمہ زبیدہ نے خواب دیکھا کہ سارے لوگ باری باری اور اجتماعی طور پر میرے ساتھ زنا کررہے ہیں، اور میں کسی کو منع نہیں کرتی، جب بیدار ہوگئی تو رونے لگی، اور قریب تھا کہ غم کے مارے مرجاتی، صبح خادمہ کنیز سے کہا: جاؤ امام الرؤیا حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی تعبیر معلوم کرو، دیکھو! میرا نام نہ لینا، اپنا نام لینا، کہ میں نے ایسا ایسا خواب دیکھا۔ جب خادمہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچی تو وہ وضو فرمارہے تھے، لڑکی نے عرض کی: حضرت صاحب! میں نے رات کو ایسا خطرناک خواب دیکھا جو میرے ہوش پر چھا گیا، بہت ہی پریشان ہوں، چنانچہ مکمل خواب بیان کیا، اب حضرت نے پوچھا تم کون ہو؟ کہنے لگی: میں امیر المؤمنین کے گھر کی خادمہ کنیز ہوں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: سبحان اللہ! یہ کسی کنیز کا خواب نہیں ہوسکتا، یہ خواب تو کسی شہزادی کا ہوسکتا ہے، سچ بولو تو تعبیر بتادوں گا، ورنہ جاؤ۔ لڑکی جب زبیدہ کے پاس آئی تو ماجرا سنادیا، اب زبیدہ کو کچھ اطمینان حاصل ہوا، تو خادمہ سے کہنے لگی: جاؤ اس دفعہ صاف میرا نام لے لو، اب جب اس نے آکر صاف بتادیا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: خوش قسمت عورت ہے، جاؤ میری طرف سے انہیں مبارک باد پیش کرو، یہی خواب نہر زبیدہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

ایک شخص نے حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں نے خواب دیکھا کہ میرا گھر جل گیا، فرمایا: تمہارے مکان میں خزانہ مدفون ہے، کھدائی کرکے نکالو، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

عرصہ بعد ایک دوسرے شخص نے بعینہٖ یہی خواب دیکھا، اور آپ سے تعبیر معلوم کرنا چاہی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جلدی جاؤ بیوی، بچے اور سارا سامان نکالو، چنانچہ سامان نکالنے کے بعد گھر میں آگ لگ گئی، تو اس پر شاگردوں نے پوچھا کہ حضرت! خواب ایک ہی ہے، تو تعبیر میں یہ فرق کس طرح پیدا ہوا؟ تو فرمایا کہ پہلا خواب سردی کے موسم کا تھا، جس کی تعبیر ہے سونے کا خزانہ، اور دوسرا خواب گرمی کے موسم کا ہے جس کی تعبیر ہے آگ۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَاِخْوَتِهٖٓ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝ اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِۨ ۝ ۨاقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا

يَّخۡلُ لَكُمۡ وَجۡهُ اَبِيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ قَوۡمًا صٰلِحِيۡنَ ۝ قَالَ قَآٮِٕلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ وَاَلۡقُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّيَّارَةِ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ۝

ترجمہ: بلاشبہ یوسف اوران کے بھائیوں کے قصہ میں سوال کرنے والوں کے لئے دلائل ہیں ۝ جبکہ ان کے بھائیوں نے یوں کہا کہ یوسف اوران کا بھائی ہمارے باپ کو زیادہ پیارے ہیں، حالانکہ ہم سب مل کر پوری ایک جماعت ہیں، بلاشبہ ہماراوالد کھلی غلطی پر ہے ۝ یوسف کو قتل کردو، یا کسی زمین میں اسے ڈال دو، ایسا کرنے سے تمہارے والد کا رخ تمہاری طرف ہوجائے گا، اوراس کے بعدتم صلاح والے بن جاؤ گے ۝ ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو، اوراسے کسی اندھیرے کنویں میں ڈال دو، تاکہ اس کو قافلہ والوں میں سے کوئی مسافر اٹھالے اگرتم کو کرنا ہی ہے ۝

معارف ومنازل

فرمایا: یوسف علیہ السلام اوران کے بھائیوں کے واقعات میں سوال کرنے والوں کے لئے نشانیاں، اوردلائل ہیں۔ یہ سوال کرنے والے یہود بھی ہوسکتے ہیں، اور کفار قریش بھی، کیونکہ یہود نے براہ راست اور کفار مکہ نے یہود کے کہنے اور بتانے پر بغرضِ امتحان سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام اوران کی اولاد ملکِ شام سے کیوں جا کر مصر میں آباد ہوئے؟ اور یوسف علیہ السلام کا واقعہ اوراس کی تفصیلات کیا ہیں؟

اس پر سورۂ یوسف کا نزول ہوا تھا، اور پورا واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھ کر سنایا تھا، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی مکمل صداقت اورقرآن حکیم کی حقانیت روزِ روشن کی طرح معلوم ہوگئی، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، جوانباء الغیب سے صحیح خبر دیتے ہیں۔

دوسرے معنی یہ ہے کہ اس واقعہ کی حقیقت اور ہر طرح کی تفصیلات سے قیامت تک آنے والے سائلین پوچھنے والے، اورعبرت حاصل کرنے والے لوگوں کے لئے بڑے اچھے اسباق اور عبرت کی نشانیاں ہیں، جن سے مسئلہ توحید، قدرتِ الٰہی، تقدیرِ الٰہی اوراحکامِ الٰہی کے اثبات کے علاوہ بہت سی ایمان افروز چیزیں معلوم ہوتی ہیں، کہ ایک معصوم بے گناہ بچے پر کیا کچھ ظلم ہورہا ہے، اسے اپنے بھائی ستر اسی فٹ گہرے کنویں میں پھینک کر اس کی زندگی کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، اور وجہ کچھ بھی نہیں، صرف یہ ہے کہ باپ کی محبت اس کے ساتھ کیوں زیادہ ہے؟

عقلمندوں کے مذہب میں یہ چیز ہرگز کسی کی بھی خاص کر اپنے بھائی کی ہلاکت کا سبب نہیں بن سکتی۔ پھر نہ باپ مجرم، اور نہ ہی یہ بھائی۔

ہم دنیا میں عموماً دیکھتے رہتے ہیں کہ لوگوں کے قلوب میں سارے بیٹوں کی، سارے بھائیوں اور بہنوں کی، اسی طرح ساری بیویوں کی، انبیاء کرام علیہم السلام کے نزدیک سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کی، پیروں کے ہاں سارے مریدوں، اور اساتذہ کے نزدیک سارے شاگردوں کی ایک جیسی محبت کبھی نہیں ہوتی۔

محبت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ غیر اختیاری ہے، پھر سب میں برابری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر دوسرے پہلو پر نظر کرو تو حسن و جمال ہے، تو ظاہر ہے کہ حسن و جمال کے نصف کا مالک صرف یوسف علیہ السلام تھے، باقی نصف دوسرے لوگوں کا حصہ قرار پایا۔ تیسرا سبب عقل و ہنر اور دانشمندی و کمال ہے، جو کہ سارے بھائیوں میں مفقود ہے، اور اس ہونہار چھوٹے بچے کی پیشانی میں ابھی سے صغر سنی میں نبوت کے انوار روزِ روشن کی طرح جگمگا رہے ہیں، اور والد جو کہ جلیل القدر پیغبر ہیں، ان کا اچھی طرح بالمشافہہ مشاہدہ بھی فرما رہے ہیں، تو کیا اس محبت میں والد یا بچے یا دونوں کا قصور ہو سکتا ہے؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں۔

اس واقعہ سے دو ہزار سال بعد انہی بنی اسرائیل کے عظیم پیغمبر خلیفہ اللہ تعالیٰ حضرت داؤد علیہ السلام تشریف لاتے ہیں، جن کے انیس صاحبزادے ہیں، جن میں سب سے چھوٹے حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں، جو کہ باپ کے وارث بن رہے ہیں، اور نبوت اور سلطنت دونوں کو وراثت میں پاتے ہیں، اس لئے کہ ان میں اہلیت تھی، باقی (۱۸) بھائی اس اہلیت سے خالی تھے۔ اسی طرح کائنات کے چشم و چراغ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لخت جگر چار صاحبزادیاں ہیں، سب سے چھوٹی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بتول ہیں، اور باقی بہنوں سے ممتاز ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نسب عالی انہی سے دنیا میں جاری ہے۔ اور "سيدة نساء أهل الجنة" کا شرف وانعام بھی انہی کو حاصل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام پر بھائیوں نے جو ظلم کیا وہ بہت ہی بھیانک اور ناقابلِ برداشت ظلم تھا، قرآن کریم نے نہایت اختصار اور کنائی الفاظ میں اس کو کنویں میں گرانے کا تذکرہ فرمایا، اور گھر سے روانگی کے بعد تین میل کی مسافت طے کرنے اور کنعانی کنویں تک اس پورے راستے میں اس نرم و نازک بچے کے ساتھ جو ظلم و استبداد ہوتا رہا، اور اس کا سارا بدن لہولہان کیا، اور وہ روتے روتے رحم و مہربانی کی، ان سے بھیک مانگتے رہے۔

اس حصے کو قرآن حکیم نے نظر انداز کر کے اہل ایمان پر بہت رحم فرمایا، اس خوف سے کہ کہیں مسلمانوں کے

کلیجے پھٹ نہ جائیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے سارے بھائی پیغمبر و نبی تھے۔ سبحان اللہ و بحمدہ! ایسے لوگوں نے شاید منصبِ نبوت کا اندازہ نہیں لگایا۔ واللہ اعلم۔ تو فرمایا:

﴿اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ﴾ کہ انہوں نے آپس میں یوں کہا کہ ہمارے والد کو یوسف علیہ السلام اور اس کے حقیقی بھائی بنیامین زیادہ پیارے ہیں، حالانکہ ہم عصبہ ہیں، ہماری پوری جماعت ہے۔ عصبہ اس جماعت کو کہتے ہیں جو آپس میں متفق ہوں، اور اس کی تعداد دس سے پندرہ تک ہو، اور ہم یہ جماعت والے زیادہ بھی ہیں، بڑے بھی ہیں، مالداری زراعت اور دیگر ہر قسم کی خدمات والد کے لئے انجام دیتے رہتے ہیں، جبکہ یہ دوسرے دونوں بھائی عمر میں چھوٹے ہیں، اور ان کی کوئی جماعت بھی نہیں، والد صاحب کو چاہیے کہ ان کی بنسبت ہمارے ساتھ محبت کرے، مگر ایسا نہیں، اور ابا جان کے کردار کا رخ صحیح نہیں، اور وہ بلاشبہ غلطی پر ہیں، اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ ان کی محبت کا رخ اپنی طرف پھیر لیں، اور وہاں سے انہیں ہٹا دیں، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے (یہ پٹی انہیں شیطان نے پڑھائی) کہ یوسف علیہ السلام کو باپ کے سامنے سے ہٹا دیں۔

اور اس کے دو طریقے ہیں: یا تو اس کو قتل کر دیں، یا کہیں دور دراز جنگل میں پھینک دیں، جہاں سے کوئی خیر وخبر نہ پہنچے۔ جب یوسف علیہ السلام ان کے سامنے سے دور ہو جائے گا، تو محبت کا سارا رخ ہماری ہی طرف ہوگا، اور ہم والد کے مقرب ومحبوب بن جائیں گے۔

اس سازش پر اتفاق ہونے کے بعد انہوں نے کہا کہ ہم صالحین بن جائیں گے، یعنی توبہ کریں گے، گناہ معاف ہو جائے گا۔ یا یہ معنی پھر ہماری ہر طرح کی پریشانی دور ہو جائے گی، پھر ہم مطمئن ہو جائیں گے۔

بنیامین چونکہ دوسرے درجے میں تھے، انہیں چھوڑ کر صرف یوسف علیہ السلام کو ختم کرنے پر متفق ہو گئے، اور فیصلہ قتل کا ہو گیا، سب سے بڑے بھائی یہودا نے کہا کہ قتل جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب اچھا نہیں ہوتا، البتہ جنگل میں لے جا کر کسی اندھیرے کنویں میں ڈالنا بہتر ہوگا۔ اس طرح یہاں سے مسافر ہر وقت گزرا کرتے ہیں، تو کنویں کے پاس سے جو قافلہ گزرے گا تو اس کی آواز سن کر اسے نکالے گا، اور دور کسی ملک میں لے جا کر فروخت کرے گا، یا غلام بنائے گا، اس طرح ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے محمد بن اسحاق رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ یہ رائے سب سے بڑے بھائی نے دی، جس کا نام روبیل تھا۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہودا تھا۔ کنویں میں ڈالنے کا واقعہ عنقریب آنے والا ہے۔ اب ارشاد ہے:

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ
يَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ
وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: کہنے لگے کہ اے ہمارے باپ! کیابات ہے آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اطمینان نہیں کرتے؟ حالانکہ ہم اس کے خیر خواہ ہیں (۱۱) آپ اس کو کل ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ وہ ہمارے ساتھ کھائے اور کھیلے، اور ہم ان کی پوری حفاظت کرنے والے ہیں (۱۲) ابا نے کہا کہ بیشک یہ بات مجھے رنجیدہ کرتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ، اور میں اندیشہ کرتا ہوں کہ تم اس سے غافل ہو جاؤ، اور اس کو بھیڑیا کھا جائے (۱۳) کہنے لگے کہ اگر اس کو بھیڑیا کھا جائے اور ہماری پوری جماعت ہے تو ہم بالکل ہی خسارے میں پڑنے والے ہو جائیں گے (۱۴)

معارف ومنازل

برادرانِ یوسف علیہ السلام نے اپنے اس ناپاک منصوبے پر عمل کرنے کا، اور اسے عملی جامہ پہنانے کا پختہ ارادہ کرلیا، وہ اتنے بے رحم اور خدا اور رسول کے نافرمان تھے کہ انہیں کسی قسم کا خوف وخطرہ نہ تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے سامنے بے بس تھے، آخر کیوں کہتے ہیں کہ مجھے خوف ہے، میرے بچے کو بھیڑیئے کھا جائیں گے؟

دراصل ان کو بھیڑیئے کہہ کر کنایہ واشارہ سے کام لیا، صاف طور پر اگر انہیں ہی بھیڑیا کہتے تو شاید معاملہ مزید خراب ہو جاتا، چنانچہ ہوا بھی ایسا ہی کہ ان لوگوں نے بھیڑیئے سے بھی بدتر کام کیا، اور تمام دینی، اخلاقی اور انسانی اقدار کا ستیاناس کیا، اور پوری انسانیت کی گردنوں کو شرم وحیا سے جھکا دیا، چنانچہ انہوں نے باپ سے کہا:

﴿يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ﴾ ہم اپنے بھائی یوسف (علیہ السلام) کے بڑے خیر خواہ ہیں، مگر آپ کیوں ہم پر اعتماد نہیں کرتے؟ اور کیوں اندیشہ کرتے ہیں آپ؟

﴿اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ کل اس کو ہمارے ساتھ جنگل کو بھیج دیجئے تاکہ جنگلی درختوں کا پھل کھائے، اور خوب سیر وتفریح کرے، شکار کرے، تیر اندازی کرے، ہم ہر طرح ان کی حفاظت کریں گے، اور واپس لائیں گے۔ ابا جان نے فرمایا:

﴿اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ﴾ تم اس کو لے کر چلو گے مجھے اس سے رنج و

غم ہوگا، اور میں اس کی جدائی پر بے صبر رہوں گا، اور مجھے اندیشہ ہے کہ کھیل کود میں مصروف ہو کر اس سے غافل رہو گے، اور بھیڑیا اس کو کھا جائے گا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ کسی بھیڑیے نے یوسف علیہ السلام پر حملہ کیا۔ نبی کا خواب سچا ہوتا ہے، مگر تعبیر میں غلطی ہوئی، تب انہوں نے بھیڑیے سے اندیشہ کا اظہار تو کیا، مگر وہ یہ نہ سمجھے کہ بھیڑیے یہی اس کے بھائی ہیں، جو بھیڑیے والا کام کریں گے۔

الذِّئْبُ میں الف لام جنسی ہے، یعنی کوئی بھی بھیڑیا۔

﴿قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ﴾ ابا جان! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارے چاق و چوبند اور طاقتور لشکر کی موجودگی میں ہمارے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے، پھر تو ہم خسارے میں ہوں گے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہم پوری جماعت پوری قوت کے ساتھ شیروں کا مقابلہ کر سکتے ہیں، بھیڑیا بیچارہ ہمارے سایہ سے شاید بھاگ جائے اور جان بچائے، ہماری موجودگی میں ہمارے بھائی جان کو اگر بھیڑیا کھا جائے تو یہ ہماری بدنصیبی ہوگی، ابا جان خالی خولی اندیشہ نہ کریں، مطمئن ہو کر بھائی جان کو ہمارے ساتھ کر دیں، اور ہماری ہمدردی و حفاظت کا مظاہرہ کریں۔ اب کیا ہوا اندیشہ کرتے ہوئے خوف و ڈر کو چھپاتے ہوئے بامرِ مجبوری بادل نخواستہ بیٹے کو درندوں کے سپرد فرمایا، اور انہیں سو فیصد ان کے حسد و دشمنی کا پورا پورا یقین تھا، پھر کیا ہوا، تو فرمایا:......

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: پھر جب یوسف کو لے گئے اور اس پر متفق ہو گئے کہ اسے اندھیرے کنویں میں ڈال دیں، اور ہم نے اس کے پاس وحی بھیج دی کہ تم ضرور یہ بات انہیں جتلاؤ گے، اور وہ نہیں جانیں گے ﴿۱۵﴾ اور وہ لوگ شام کے وقت روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس آئے ﴿۱۶﴾ کہنے لگے: اے ابا جی! بلاشبہ بات یہ ہے کہ ہم سب آپس میں ایک

دوسرے سے آگے بڑھنے کے لئے دوڑ لگانے میں مشغول ہو گئے، اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا، سواسے بھیڑیا کھا گیا، اور آپ ہماری بات کا یقین نہیں کریں گے اگر چہ ہم سچے ہیں ⑰ اور وہ اس کے کرتے پر جھوٹا خون لے آئے، یعقوب نے کہا: بلکہ بات یہ ہے کہ تمہارے نفسوں نے تمہیں ایک بات بنا کر دی ہے، سو میں صبر ہی کروں گا، جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا، اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کرتا ہوں ⑱

معارف ومنازل

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّآ أَن يَشَاءَ اللَّهُ﴾ تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں وہی ہو گا جو اللہ تعالیٰ شانہ چاہے گا۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کا کسی طرح سے بھائیوں کو علم ہوا تھا جس سے ان کے حسد میں اور اضافہ ہو گیا، پھر والد نے اس کا بھی اندازہ لگایا، اور صد فیصد اسے یقین آ گیا کہ یہ لوگ کسی طرح سے کوئی غلط قدم اٹھا کر میرے لخت جگر محبوب بچے کو ضرور کوں ضرر و نقصان پہنچائیں گے، اگر وہ ڈٹ کر اپنے بیٹے کو کسی طرح ان کے حوالے نہ کرتے تو وہ اس بات پر قادر تھے، مگر نوشتہ ازل تقدیر مبرم کو کیا کوئی کسی تدبیر سے روک سکتا ہے؟

نتیجہ یہی ہوا کہ ننگی تلوار کی طرح لٹکتی ہوئی تقدیر سامنے آئی، اور یوسف علیہ السلام بامر مجبوری دشمنوں کے نرغے میں آ گئے، اور وہ انہیں طرح طرح کے عذاب دیتے ہوئے اس کنویں کے پاس پہنچ گئے جہاں پہلے سے آسمانی فرشتے نظارہ دیکھنے کے لئے اور کچھ یوسف علیہ السلام کو سہارا دے کر آرام سے کنویں میں بٹھانے کے لئے موجود تھے۔

جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو سنگدلی کا مزید مظاہرہ یہ کیا کہ ان کی قمیص اتار کر انہیں بے ستر کیا، اور دھکا دے کر کنویں میں گرا دیا۔ فرشتہ رحمت نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لے کر کنویں کے پانی کے اوپر ایک لکڑی کے تختے پر بٹھا دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر اس وقت کیا تھی؟ بعض مفسرین حضرات نے کہا ہے کہ ان کی عمر پندرہ اور چودہ سالوں کے درمیان تھی۔ اور بعض حضرات نے نہایت کم بتایا، یعنی سات سال۔ بہر حال یہ واضح ہو کہ وہ نہایت ہوشمند سمجھدار اور ہوشیار تھے، البتہ سن بلوغ کو نہیں پہنچے تھے، تقریباً دس اور چودہ کے درمیان ہوں گے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخی روایات سے بیان کیا ہے کہ جب یہ لوگ یعقوب علیہ السلام کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو یوسف علیہ السلام جس بھائی کے مونڈھے پر تھے اس نے اس کو زمین پر پٹخ دیا، یوسف علیہ السلام ان کے ساتھ پیدل چلنے لگے، مگر کم عمری کی وجہ سے تیز چلنے میں تکلیف محسوس کی، تو دوسرے بھائی کی پناہ لی، مگر اس نے ہمدردی نہ

کی، پھر تیسرے اور چوتھے علیٰ ہذا القیاس سب سے معاونت کے طلبگار ہوئے مگر سب ترشروئی اور تلخی سے جواب دے کر کہنے لگے کہ تو نے جو گیارہ ستارے اور چاند وسورج اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھے تھے ان کو پکارو، وہی تیری مدد کریں۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وجہ سے فرمایا کہ بھائیوں کو کسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب معلوم ہو گیا تھا، اور وہ خواب ہی ان کی شدت غیظ وغضب اور بے رحمی کا سبب بنا۔

آخر جب ان کی بے رحمی حد سے گزر گئی تو یوسف علیہ السلام نے بڑے بھائی کو حق سبحانہ وتعالیٰ کا واسطہ دے کر اور بوڑھے باپ کی بے انتہاء شفقت اور بصورتِ قتل ان کی پریشانی کی یاد دہانی کرا کر ان سے رحم ومہربانی کی اپیل کی، چنانچہ اس نے براندوختہ ہو کر بھائیوں کو مزید ظلم وتشدد اور ان کے قتل سے منع کیا، اور کسی کنویں میں گرانے اور ڈالنے پر رضامند کیا۔ بھائیوں نے اسے بھی کہا تھا کہ تمہارا مطلب اگر یہ ہے کہ ہم اسے سلامتی کے ساتھ واپس لے جا کر باپ کے حوالہ کریں، اور اس سے پختہ وعدہ لے لیں کہ ہماری ان ایذا رسانیوں کو معاف کرے، اور زندگی بھر باپ کو نہ بتائیں تو ہم تمہیں بھی قتل کر لیں گے۔

انہوں نے جب ان درندہ بھائیوں کو کسی نرمی رحمدلی اور کسی رعایت پر نہیں تیار پایا تو انہیں یہ مشورہ دیا کہ یہاں قریب ہی ایک پرانا کنواں ہے جس میں بہت سی جھاڑیاں پیدا ہو چکی ہیں سانپ، بچھو اور طرح طرح کے موذی جانور اس میں رہتے ہیں، تم اس کو اسی کنویں میں ڈال دو، اگر اس کو کسی سانپ وغیرہ نے ڈس کر ختم کیا تو تمہاری مراد پوری ہو جائے گی، اور اپنے ہاتھوں کے قتل کے گناہ سے بری رہو گے، اور اگر یہ زندہ رہا تو یہ کنواں عام قافلوں کے آنے جانے کے راستے پر ہے شاید کوئی قافلہ یہاں آجائے اور پانی کے لئے کنویں میں ڈول ڈال دے، اور یہ کنویں سے نکل آئے، تو وہ اس کو اپنے ساتھ کسی دوسرے ملک میں پہنچا دیں، اور غلام بنائیں تو بھی تمہارا مقصد پورا ہو گا، اس مشورہ کو سب نے قبول کیا جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿فَلَمَّا ذَهَبُوۡا بِهٖ وَاَجۡمَعُوۡۤا اَنۡ يَّجۡعَلُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ﴾ جب یہ ظالم اپنے مظلوم پھولوں سے خوبصورت اور جنت کے غلمانوں اور جنتی حوروں سے زیادہ حسین اپنے بھائی یوسف صدیق علیہ السلام کو جنگل میں مارتے ہوئے لہولہان کرتے ہوئے لے گئے تو انہیں بے رحم اور سانپوں کے مسکن والے کنویں میں ڈال دیا، اس وقت وہ مسلسل رحم کی اپیل کرتے رہے، اور بخشش وشفقت کی بھیک مانگتے رہے، مگر شنوائی نہیں ہوئی۔

اس وقت زمینی ظلم وستم کی انتہاء ہو گئی، اور زمینی کارروائی اپنے اختتام کو پہنچی، اب آسمانی کارروائی کا وقت اور

پیغام آپہنچا، اور آسمانی طناب جو مخصوص حکمتوں کے تحت بند تھا، اور فرشتے منتظر کسی آنے والے حکم کے لئے کھڑے تھے، اور حق سبحانہ وتعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ تمام ناامیدیوں اور مایوسیوں کے بعد عنایتوں کا دروازہ کھول دیتے ہیں، چنانچہ سید الملائکہ حضرت جبریل علیہ السلام پہنچے اور کنویں میں آرام سے اتار کر تسلی دی، اور فرمایا اور بشارت دی کہ گھبرائیں مت ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ [الشرح:۵] (بیشک سختی کے ساتھ آسانی ہے)۔

آپ بحفاظت کنویں سے نکلیں گے، پھر اور ملک میں پہنچ جائیں گے، اور بحکم الٰہی وہاں کے بادشاہ بنیں گے، تمام سرخ وسفید آپ کے ہاتھ میں ہوگا، آپ کو نبوت، علم رویاء، اور بادشاہت سے نوازا جائے گا، جن لوگوں سے آپ نے شفقت کی اپیل کی اور رحم وکرم کی بھیک مانگی یہی لوگ فقیر وسائل بن کر آپ کے سامنے نمازیوں کی طرح ہاتھ باندھ کر رزق وروزی کی اپیل کریں گے، اور ہاتھ باندھ کر آپ سے خیرات کی بھیک مانگیں گے۔ اس وقت وہ آپ کو نہیں پہچانیں گے، اور آپ کی شناخت نہیں کر کے یہ کہیں گے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا﴾ [یوسف:۸۸] (اے عزیز! ہم پر اور ہمارے گھر والوں پر سخت مصیبت پڑی ہوئی ہے، اور ہم ایک معمولی سی پونجی لے کر آئے ہیں، آپ ہمیں پورا پورا غلہ دے دیجئے، اور اللہ کے لیے ہم پر احسان کیجئے)۔

کنعان کے بوسیدہ کنویں سے نکال کر عزیز وشاہ مصر بنانا، اور چار سو سال بعد اسی متمدن ترقی یافتہ مصر کے فرعون کو ستر (۷۰) لاکھ فوجیوں سمیت دریائے قلزم میں غرق کرنا یہ کس کا کام ہے؟ اول الذکر پر لطف وکرم کی بارش، ثانی الذکر پر قہر وغضب کے تازیانہ اور عذابوں کی بارش، یہ ہمارے نہیں سارے جہانوں کے خالق ومالک واحد لاشریک جل شانہ کے کمالات کی ایک ادنیٰ جھلک ہے، اور ان زرین واقعات کے بیان کرنے والے سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر پانی کے قطرات اور زمین کے ذرات سے زیادہ صلوٰۃ وسلام ہو۔ یہی مطلب ہے آیت کریمہ:

﴿وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ کا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ وحی الہامی اور القائی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی کی گئی، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت چھوٹے نابالغ بچے تھے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ یہ وحی نبوت تھی، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچپن میں نبوت سے نوازا گیا۔ بہر حال کچھ بھی ہو وحی ایک بہت بابرکت پیغام ہے، جس کی نسبت حق تعالیٰ شانہ کی طرف ہے، اور جس چیز کی نسبت اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف ہو اس کی عظمت وبرتری کو سلام ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ مفسرین نے اس جگہ یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کا واقعہ یوں بیان کیا ہے کہ جب ان کو کنویں میں ڈالنے لگے تو وہ کنویں کی منہ سے چمٹ گئے، پھر بھائیوں سے رحم کی اپیل کی اور جواب وہی ملا کہ گیارہ ستارے چاند وسورج جو تیرا سجدہ کر رہے تھے انہیں بلاؤ۔ تاریخی حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کل تین روز کنویں میں رہے، بڑے بھائی یہودا اپنے دوسرے بھائیوں سے چھپ کر آب ودانہ خوراک لاتے رہے، اور رسی کے ذریعہ ان تک پہنچاتے۔ میں کہتا ہوں یہ تاریخی افسانہ ہے، یوسف علیہ السلام ان دنوں میں بادشاہ حقیقی کے مہمان رہے، انہیں کسی ظالم یہودا کی خوراک کی حاجت نہ تھی، وہ حضرت مریم علیہا السلام اور دوسرے اہل اللہ کی طرح جنت کا پھل کھاتے رہے۔ واللہ اعلم

﴿وَجَآءُوٓا اَبَاهُمۡ عِشَآءً يَّبۡكُوۡنَ ۝١٦ قَالُوۡا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ﴾ برادرانِ یوسف علیہ السلام جو کہ قاتل بھی تھے، ظالم وخائن وعاصی اور مجرم بھی تھے، مگر مچھ کی طرح کے آنسو بہا کر روتے ہوئے شام کو والد کے پاس پہنچے، اور کہنے لگے: ابا جی! ہم سب تو آپس میں دوڑ لگانے لگے، اور یوسف علیہ السلام کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا، ہمارا خیال تھا کہ (ہمارے سوا) وہاں کوئی بھیڑیا نہ آئے گا، لیکن بھیڑیا آگیا اور آپ کے لخت جگر ہمارے بھائی جان یوسف (علیہ السلام) کو کھا گیا، ہائے ہمارے لئے اور ساتھ ساتھ روتے رہے۔

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ملامت شدہ اور مجرم کی یہی شناخت اور علامت ہے، خاص کر قاتل مجرم کی یہی علامت ہے، ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا (چور کی داڑھی میں تنکا) کہ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ہم کتنے ہی سچے ہوں، آپ یقین کرنے والے نہیں ہیں۔ یہ انہوں نے بات کو سچا ثابت کرنے کے لئے کہا، اور کنویں میں حضرت یوسف علیہ السلام کو گرانے سے پہلے ان کی قمیص کو اتارا تھا، جو کہ سالم تھی، اور اس پر کسی جانور کا خون لگایا تھا۔

بڑے ناداں بے عقل وبے شعور تھے، انہیں یہ خیال نہیں آیا کہ باپ کے علاوہ ہر کوئی ہمارے اس جھوٹ کو سمجھے گا کہ بھیڑیا چیر پھاڑ کر آدمی کو کھاتا ہے، جبکہ اس تعلیم یافتہ بھیڑیا نے بڑے اطمینان سے کرتہ اتار کر کھالیا، جو کہیں سے پھٹا ہوا نہیں ہے، بالکل سالم ہے، بھیڑیے نے کھایا ہوتا تو کرتہ پھٹ جاتا، مگر ایسا نہیں۔

میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ بھیڑیے نے یوسف علیہ السلام کو نہیں کھایا، بلکہ تمہارے نفسوں نے ایک مکر تمہیں سمجھادی ہے، اور ایک جھوٹا بہانہ لے کر آئے ہو، اور میں اب کچھ بھی نہیں کرسکتا ہوں، اب تو میں صبر جمیل ہی اختیار کروں گا (صبر جمیل وہ ہے جس میں کوئی حرف شکایت نہ ہو) اور تم جو کچھ بیان کررہے ہو اس پر میں اللہ تعالیٰ ہی

سے مدد طلب کروں گا۔

پھر یہ غم وصدمہ بہت لمبا ہوا، آنسوؤں کے بہانے سے اور شب وروز کے رنج والم سے قوت بینائی بھی ختم ہوگئی، اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ کہ اس سلسلے میں چالیس سالہ غم فراق کے باوجود کسی قسم کی وحی کا نزول نہیں ہوا۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ ادھر حضرت یوسف علیہ السلام کو باپ کی پریشانی اور صدمہ کا شب وروز احساس رہا، اور وہ بھی والد کے لئے بے قرار اور نہایت رنجیدہ رہتے تھے، اس کے باوجود ان کو حکم ملا تھا کہ تم اپنے کسی قسم کے بھی حال واحوال موت وحیات کی اپنے خاندان کو اطلاع نہ کرنا۔ واللہ أعلم وأحکم وھو الحکیم

فائدہ:

امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ پیراہن یوسف علیہ السلام عجائبات روزگار میں سے ہے، تین عظیم الشان وقائع اس پیراہن یعنی کرتہ سے وابستہ ہیں: ① پہلا واقعہ کرتہ کو خون آلود کر کے والد کو دھوکہ دینے، اور کرتے کی شہادت سے برادران یوسف علیہ السلام کے جھوٹ ثابت ہونے کا ہے۔ ② دوسرا واقعہ زلیخا کا کہ اس میں بھی یوسف علیہ السلام کا کرتہ ہی شہادت میں پیش ہوا ہے، جس کا بیان آنے والا ہے۔ ③ تیسرا واقعہ اسی کرتہ سے یعقوب علیہ السلام کی بینائی لوٹ کر آ گئی جو آئندہ بیان ہوگا۔

......۞......۞......۞......

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۭ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: اور ایک قافلہ آ گیا انہوں نے پانی لانے والے کو بھیجا، اس نے اپنا ڈول ڈالا اور وہ کہنے لگا: کیا ہی خوشی کی بات ہے کہ یہ ایک لڑکا ہے، اور انہوں نے اسے سامان تجارت بنا کر چھپالیا، اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ﴿۱۹﴾ اور انہوں نے اسے معمولی سی قیمت پر بیچ دیا جو گنتی کے چند درہم تھے، اور یہ لوگ اس سے بے رغبت تھے ﴿۲۰﴾

معارف ومنازل

مشہور کہاوت ہے کہ مارنے والے سے بچانے والا طاقتور ہے، اور یہ بھی مشہور ہے کہ جسے خدا رکھے اسے

کون چکھے، ایک عاف نے کہا:

چون وچرا در کار تو جملہ جہانرا کے رسد ☆ اے مالک کون ومکان ہر آنچہ خواہی آن کنی

سَیَّارَۃ قافلہ کو کہتے ہیں، جدید عربی میں سیارہ موٹر گاڑی کو کہتے ہیں۔ وَارِد کے معنی ہیں: قافلہ کی ضروریات پورا کرنے والا۔ دَلْو ڈول، جس کے ذریعہ کنویں سے پانی نکالا جائے۔

تین دن کے بعد ملک شام سے ایک تجارتی مال بردار قافلہ مصر کے لئے روانہ ہوتا ہے، اور راستے سے بھٹک کر ایک غیر معروف راستے کے ذریعہ یہاں پہنچتا ہے، اور اسی کنویں کے پاس پڑاؤ کرتا ہے جہاں کائنات کا ایک آفتاب عالمتاب سکونت پزیر ہے، ”عَلَیْهِ وَعَلٰی جَمِیْعِ الْأَنْبِیَاءِ اَلْفَ اَلُوْفِ الصَّلٰوۃِ وَالتَّسْلِیْمَات“۔

لوگوں اور ظاہر بینوں کی نظر میں یہ ایک اتفاقی واقعہ تھا کہ شامی قافلہ راستہ بھول کر یہاں پہنچا، اور اس پرانے غیر آباد کنویں سے واسطہ پڑا، لیکن راز کائنات کا جاننے والا جانتا ہے کہ یہ سب واقعات ایک مربوط اور مستحکم نظام کی ملی ہوئی کڑیاں ہیں۔ یوسف علیہ السلام کا پیدا کرنے والا، اور بادشاہ حسن بنانے والا، اور ان کی حفاظت کرنے والا، اور پھر موت کے منہ سے نجات دینے والا، مستقبل میں انہیں مصر کا والی بنانے والا، اس قافلہ کو راستہ سے ہٹا کر اس غیر معروف علاقے میں اتار لاتا ہے، اور اس کو اس غیر آباد کنویں پر پہنچا دیتا ہے، اور اس کو ایک مقدس ہستی کے کنویں سے نکالنے کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

یہی حال ہے ان تمام حالات وواقعات کا جن کو عام انسان اتفاقی حوادث سمجھتے ہیں، اور فلسفہ والے ان کو بخت واتفاق کہا کرتے ہیں، جو درحقیقت نظام کائنات سے ناواقفیت پر مبنی ہوتا ہے، ورنہ سلسلۂ تکوین میں کوئی بخت و اتفاق نہیں، حق سبحانہ تعالیٰ جس کی شان ﴿فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ﴾ [البروج: ۱۶] (خوب کرنے والا ہے اس کام کو جس کا ارادہ کرے) ہے، مخفی حالات واسرار کے تحت ایسے حالات پیدا فرمادیتے ہیں کہ ظاہری وقائع سے ان کا جوڑ سمجھ میں نہیں آتا، تو انسان انہیں اتفاقی حوادث قرار دیتا ہے۔

بہر حال! قافلہ کا آدمی جس کا نام مالک بن دعبر بتایا جاتا ہے، اس کنویں پر پہنچتا ہے، اس نے ڈول کنویں میں ڈالا، جسے یوسف علیہ السلام نے قدرتِ الٰہی کی امداد سمجھ کر مشاہدہ کیا، ڈول کی رسی ہاتھوں میں پکڑ لی، پانی کے بجائے ڈول کے ساتھ ایک ایسی ہستی کا منور چہرہ سامنے آگیا جن کی آئندہ ہونے والی عظمتِ شان سے بھی قطع نظر کی جائے تو موجودہ حالت میں بھی اپنے حسن وجمال اور معنوی کمالات کے درخشاں نشانات اس کی عظمت کے لئے کچھ کم نہ تھے۔

ایک عجیب انداز سے کنویں کی گہرائی سے برآمد ہونے والے اس کمسن حسین اور ہونہار بچے کو دیکھ کر مالک پکار اٹھا:

﴿یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ﴾ ارے بڑی خوشی کی بات ہے، یہ تو بڑا اچھا درخشندہ بچہ نکل آیا ہے۔ صحیح مسلم کی حدیثِ معراج میں ہے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آسمانوں پر میں یوسف علیہ السلام سے ملا تو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے پورے عالم کے حسن و جمال میں سے آدھا ان کو عطا فرمایا ہے، اور باقی آدھا سارے جہاں والوں پر تقسیم ہوا ہے۔

﴿وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً﴾ یعنی ایک عمدہ گراں قیمت اور مالِ تجارت سمجھ کر اسے چھپالیا۔ مطلب یہ ہے کہ شروع میں مالک اسے دیکھ کر تعجب و خوشی میں پکار اٹھا، مگر پھر معاملہ پر غور کر کے یہ قرار دیا کہ اس کا چرچا نہ کیا جائے، یہ بہت قیمتی سرمایہ اور مالِ تجارت ہے، اسے چھپا دیا جائے، کیونکہ یہ ایک بہت بڑا سرمایہ ہے، اس کی بہت بڑی قیمت ہوگی، لہٰذا اس کی پورے قافلے میں تشہیر نہ ہو، ورنہ سارے قافلے والے اس میں شرکت کا دعویٰ کریں گے۔

اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے موقع پر پہنچ کر اصل واقعہ کو چھپا کر ان کو ایک مالِ تجارت بنالیا، اور قافلہ والوں سے کہا کہ یہ لڑکا ہمارا غلام ہے، باغی ہے، خدمت کرنے سے اور بکریاں چرانے سے بھاگتا ہے اور یہاں آکر کنویں میں پناہ لی ہے، تم قافلہ والوں نے بہت برا کیا جو ہمارے غلام پر قبضہ جمایا، البتہ اتنی سی بات ہے کہ ہم اس کے رویہ اور کردار سے تنگ آچکے ہیں، روز روز بھاگنے اور شرارت کرنے سے تھکتا نہیں، اگر آپ اسے خریدنا چاہتے ہیں تو ہم فروخت کرنے پر تیار ہیں، پس قافلہ والے ان کے خریدنے پر راضی ہوگئے۔

تو آیت کریمہ کے معنی یہ ہوئے کہ برادران یوسف علیہ السلام نے خود ہی یوسف علیہ السلام کو ایک مالِ تجارت بنالیا، جیسے کہ غلاموں کے بیچنے کا رواج عام ہے، چنانچہ برادران یوسف علیہ السلام نے انہیں قافلہ والوں پر فروخت کیا۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ﴾ شروع سے آج تک جو کچھ ہوا اور گزرا سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔

﴿وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِیْهِ مِنَ الزّٰهِدِیْنَ﴾ لفظ شِرا عربی میں خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے لئے مستعمل ہے، یہاں بھی ایسا ہے، ضمیر اگر برادران یوسف علیہ السلام کی طرف راجع ہو تو فروخت کرنے کے معنی ہوں گے، اگر قافلہ والوں کی طرف عائد ہو تو خریدنے کے معنی ہوں گے۔ ثَمَن سے مراد قیمت طے شدہ۔ بَخْسٍ کے معنی ہیں: حقیر اور معمولی۔ مَعْدُوْدَة گنتی کے چند دراہم۔ الزّٰهِدِیْنَ کے معنی ہیں: بیزار ہونا، بے رغبت ہونا، تارکِ دنیا کو اسی وجہ سے زاہد کہتے ہیں کہ وہ دنیا سے بے رغبت ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ بھائیوں نے انہیں چند حقیر معمولی گنتی کے دراہم کے عوض فروخت کیا، اور وہ ان سے بیزار و بے رغبت تھے (اردو میں

کہتے ہیں کہ کوڑی کے دام بیچنا) مرغوب چیز کو لوگ بڑی قیمت پر بیچتے ہیں، اور غیر مرغوب چیز کو معمولی حقیر اور چند ٹکوں پر بیچتے ہیں۔ ﴿فَاعْتَبِرُوْا يَأُولِي الْأَلْبَابِ﴾۔

اس سلسلہ میں حدیث کی صحیح مرفوع روایت نہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اثر میں ہے کہ بیس دراہم پر فروخت ہوئے، ہر بھائی کا دو درہم حصہ بن گیا۔ دوسرے حضرات سے تیس درہم، سترہ درہم، چالیس درہم کا قول بھی منقول ہے۔ مگر اصل چیز وہی ہے کہ نہایت حقیر قیمت پر، جیسے کہتے ہیں کوڑی کے دام پر بیچنا، اور وجہ خود قرآن حکیم نے ذکر فرمائی کہ وہ جان خلاصی چاہتے تھے، اور ان سے بیزار تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کے خلاف قیامت کے دن میں مدعی ہوں گا:

پہلا وہ شخص جس نے میرا نام لے کر کسی سے عہد کیا، اور پھر دھوکہ دیا، اور عہد شکنی کی۔

دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد انسان کو فروخت کیا، پھر اس کی قیمت کھا گیا۔

تیسرا وہ شخص جس نے مزدور سے کام لیا، پھر اس کی اجرت ادا نہ کی۔ [بخاري]

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۭ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: اور اہل مصر میں سے جس شخص نے یوسف کو خریدا تھا اس نے اپنی عورت سے کہا کہ اسے عزّت کے ساتھ رکھو، ممکن ہے ہمارے کام آجائے، یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں، اور اس طرح ہم نے یوسف کو اس سرزمین میں قوت دیدی اور تاکہ اسے خوابوں کی تعبیر دینا بتلادیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے کام پر غالب ہے، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے ﴿۲۱﴾ اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے حکمت اور علم عطا کیا، اور ہم اسی طرح اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں ﴿۲۲﴾

معارف ومنازل

تُندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب ☆ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو سستے دام فروخت کر کے بڑی خوشی محسوس کی، اور ساتھ ساتھ قافلہ والوں سے کہا کہ یہ بہت شریر ہے، بھاگنے اور دھوکہ دینے میں بہت بڑا ماہر ہے، اسے ایسے آزاد چھوڑنے میں بڑا نقصان ہوگا، اسے باندھ کر کسی اونٹ پر بٹھا دو چلنے میں، اور کہیں پڑاؤ ڈالنے میں نگرانی کرو، اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہ بڑا جھوٹا ہے کہ تمہارے پورے قافلے کو اگر چاہے تو بیچ ڈالے۔

بہر حال! وہ ایک دو منزل تک قافلہ کے ساتھ چلتے رہے تاکہ یوسف علیہ السلام قافلہ والوں کو صحیح اور اصلی صورت حال بیان نہ کر سکے، اور ہمارے پورے علاقہ سے نکل جائے، تیسری منزل پر پہنچنے کے بعد وہ واپس ہو گئے، ان کے غائب ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے مالک سے کہا کہ مسلسل مجھے باندھے رکھنے سے تکلیف ہو رہی ہے، مجھے کھول دو تو بہتر ہے، میں بھاگنے والا نہیں، اور حقیقی صورت حال یہ ہے کہ میں کسی کا غلام بھی نہیں، اور میں پیغمبر زادہ ہوں، اگر تم میرے والد کو نہیں جانتے تو اتنا ضرور جانتے ہوگے یا سن چکے ہوگے کہ اس سرزمین میں ایک بہت بڑے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام گزرے ہیں، وہ میرے پردادے ہیں، اور میں ان کا پڑپوتا ہوں، اور یہ دسوں آدمی میرے بھائی تھے جنہوں نے پہلے مجھے کنویں میں ڈالا، پھر بھگوڑے غلام کہہ کر تم پر فروخت کیا، لہٰذا آپ مجھے بے گناہ سمجھ کر کھول دیں، اور مجھ پر رحم کریں، آپ مجھے جدھر لے جائیں اور جہاں کہیں فروخت کریں مجھے ہرگز انکار نہیں، میں بخوشی تمہارے ساتھ چلوں گا، اور فرمانبردار رہوں گا۔

مالک نے یہ سب کچھ سننے کے بعد اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا، انہوں نے کہا کہ تجھے یاد نہیں کہ اس کے مالکوں نے کہا تھا کہ یہ بڑے بھگوڑے اور جھوٹے ہیں، ان کے جھوٹ کا پردہ کھل گیا، اور معلوم ہوا، خبردار! ان کو کھولنا نہیں، یہ آج تک ہم نے نہیں سنا کہ بھائیوں نے اپنے بھائی کو کسی کنویں میں گرایا ہو، یا پھر اپنے کسی بھائی کو غلام بنا کر فروخت کیا ہو، ہم سب نے ان لوگوں کو بار بار دیکھا، اور ملاحظہ کیا، وہ سارے خوبصورت اور شریف لوگ تھے، اور اس غلام سے اتنے بیزار اور تنگ تھے کہ ایک اونٹ کی قیمت پر اسے فروخت کر کے جان خلاصی کی، اور دو تین منزل تک ہمارے ساتھ رہے کہ کہیں کسی حیلہ بہانہ سے یہ بھاگ نہ جائے، لہٰذا اس کے بیان پر بھروسہ نہ کرو، اور اسے

باندھے رکھو، جب مصر پہنچیں گے تو پہلی فرصت میں اسے فروخت کریں گے، یہ بہت خوبصورت بچہ ہے جلدی فروخت ہو جائے گا، اور بہت مال ہمارے پاس آجائے گا۔

مالک ساتھیوں کے مشورے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ سو رہے تھے، بیدار ہونے پر مالک نے کہا: بیٹا میرے دوستوں نے تمہارے اس بیان پر اعتماد نہیں کیا، لہٰذا آپ اسی طرح رہیں گے، جب مصر پہنچیں گے تب تمہارے ہاتھ پاؤں کھولیں گے، تاکہ لینے والوں کو شبہ نہ ہو کہ یہ بھگوڑا ہے، ورنہ تمہیں کوئی بھی نہیں خریدے گا۔ یوسف علیہ السلام یہ سن کر خاموش ہوئے، اور اپنے مستقبل کے بارے میں اللہ پاک سے دعا کی۔ وہ دراصل کنویں میں حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد اور خوشخبری سنانے پر مطمئن تھے۔

چلتے چلتے قافلہ مصر پہنچا، اس وقت مصر ترقی یافتہ آباد اور دریائے نیل کی وجہ سے خوشحال ملک تھا، وہاں کی تہذیب وتمدن بڑا قابلِ تعریف تھا، گویا وہ ایک بین الاقوامی تجارتی مرکز تھا، چاروں اطراف سے تجارتی قافلے وہاں آتے رہتے تھے، وہاں ایک خصوصی مارکیٹ اور منڈی بھی تھی جس میں غلام اور لونڈیاں فروخت ہوتے تھے، باہر سے جب کوئی غلام یا لونڈی لاتے تو خصوصیت کے ساتھ اس کی تشہیر کرتے، باقاعدہ اعلان ہوتا، اور جوق در جوق لوگ آتے معائنہ کرتے، بولیاں لگا کر فروخت کرتے۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ مصری منڈیوں میں سب سے بڑی اور مشہور منڈی یہی ہوتی تھی، وہاں کے تاجر سب سے پہلے علی الصبح اسی منڈی کا رخ کرتے تھے، قافلہ کے مالک اور اس کے ساتھیوں سے لوگ مال خریدنے آئے تو انہوں نے اپنے دیگر غلام اور کنیزوں کو پیش کیا، جنہیں مختلف لوگوں نے حسبِ سابق روایتوں کے مطابق خرید اور لے گئے، انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو چھپا کر ایک مکان میں رکھا تھا، اور ان کی قیمت اور فروخت پر سوچ رہے تھے، چنانچہ انہوں نے منڈی کے چیئرمین سے خفیہ بات کی کہ ہمارے پاس چھوٹی عمر کا ایک فرشتہ ہے، بشکلِ انسان، آج تک شاید دنیا والوں نے ایسا پری پیکر نہ دیکھا ہے نہ سنا ہے۔

منڈی کے چیئرمین نے جس کا نام زعبر تھا اس کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، دیکھنے پر اس نے کہا کہ عام تجار اس کو نہیں لے سکتے ہیں، اور نہ اس کا تحفظ کر سکتے ہیں، میں اس کی بڑی قیمت مقرر کر کے پورے شہر میں اعلان اس طرح کروں گا کہ اس غلام کے صرف دیکھنے کے لئے ایک ہزار درہم کا ٹکٹ جاری کروں گا، پہلے سرمایہ دار اسے دیکھیں گے، پھر اس کی قیمت سونے جواہرات سے اس کا وزن مقرر کروں گا۔

چنانچہ اعلان ہوا، تین دن زائرین کا سلسلہ جاری رہا، وقت کے امراء، وزراء آتے رہے، اوران کی بیگمات بھی آتی رہیں، اور ملاحظہ کرتی رہیں، عزیز مصر جس کا نام قطفیر تھا وہ بھی اپنی بیوی راعیل یعنی زلیخا کے ساتھ آیا، اس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا، اور عہدہ کے لحاظ سے وزیر خزانہ تھا، اور لاوَلَد تھا، یہ شخص بہت بڑا مالدار تھا، اور عنین ہونے کی وجہ سے بے اولاد تھا، یہ شخص نہایت شریف انسان تھا، بعد میں یہ اوراس کی بیوی زلیخا اور بادشاہ مصر ریان بن ولید اور بہت سے دیگر عوام وخواص حضرت یوسف علیہ السلام پر ایمان لائے، اور جہنم سے رہائی پائے۔

مصر کے ترقی یافتہ ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ "اہرام مصر" جو کہ دنیا کے عجائبات میں پہلے نمبر پر ہے چارسودس (۴۱۰) فٹ کی بلندی پر کالے اور شیشے کی طرح چمکدار پتھر جس خوبصورتی کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں جنہیں دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں، اور دل باغ باغ ہوجاتے ہیں، یہ اہرام مصر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے سے اٹھارہ سوسال پہلے بنے ہوئے تھے، جس وقت احقاف اور یمن پر قوم عاد کی حکومت تھی جن کے بادشاہ کے محل کی بلندی پانچ ہزار فٹ تھی۔ دیکھیں: تفسیر قرطبی سورۂ ابراہیم۔

بہر حال! عزیز مصر نے (جو یوسف علیہ السلام پر ایمان لاکر جنتی بنے) جب حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا اور ملاحظہ کیا تو چیئرمین زعبر سے کہا کہ قیمت کیا رکھی ہے؟ اس نے کہا: اس کے وزن کے برابر جواہرات، جس میں چاندی ملاوٹ نہ ہو، انہوں نے قبول کیا اور خرید لیا، قرآن حکیم نے اسی کو فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ﴾ شراء کی نسبت عزیز کی طرف ہے، نہ کہ اس کی بیوی کی طرف۔

مطلب یہ ہے کہ جس قافلہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں سے خریدا تھا وہ انہیں مصر لے گئے، اور وہاں جاکر فروخت کردیا، خریدنے والا عزیز مصر تھا (میں کہتا ہوں اس خوش قسمت انسان نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ جنت کو بھی خرید لیا) جو کہ بادشاہ مصر کا وزیر خزانہ تھا۔ عزیز مصر نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس بچے کو اس نظر سے نہ دیکھنا کہ یہ زرخرید غلام ہے، بلکہ یہ ایک ہونہار بچہ ہے، اس کو اکرام واحترام کے ساتھ رکھنا، اس سے خدمت نہ لینا، بلکہ تم اس کی خادمہ بننا، اسے ہر قسم کی سہولت اور آرام مہیا کرنا، ممکن ہے کہ آئندہ چل کر یہ ہمیں نفع دے، یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں۔

اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں! جو شخص کل اپنے بھائیوں کی وجہ سے کنویں کی زینت بنا، پھر بیس درہم پر فروخت ہوا تھا، آج ہیرے جواہرات کے وزن پر خریدا گیا، اور عزیز مصر کے گھر کی زینت بنا ہے، اور عزت واکرام کے ساتھ

رہ رہا ہے، ﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ﴾ [آل عمران:۲۶] (یعنی اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے ہر قسم کی خیر وبھلائی) اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ﴾ اور اسی طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو سرزمین (مصر) میں قوت عطا کی، عزیز مصر کے دل اور گھر میں جب ان کی عزّت ہونے لگی تو دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی ان کی عزّت ہونے لگی، کیونکہ ان کی خریداری کے واقعہ نے پورے مصر کو ہلا کر رکھ دیا، اور پورے اہل مصر کو ان کی قدر و منزلت سے آگاہ کیا، اور شہرت دی۔

﴿وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ اور تاکہ ہم انہیں خوابوں کی تعبیر کا علم دیں، یہی وہ علم ہے کہ جس کے وسیلہ اور ذریعہ سے حضرت یوسف علیہ السلام بغیر کسی جمہوری ووٹ کے، اور بغیر کسی شاہی خاندان کے فرد ہونے کے براہ راست ربّ العزّت سبحانہٗ کے فرمان کے ساتھ پورے مصر کے والی بنے، جس کا بیان آنے والا ہے، اسی کو فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ﴾ اور اللہ تعالیٰ اپنے کام پر غالب ہے، سارا جہاں ہی تو اسی کا ہے، جس پر اس کا غلبہ ہے، اور اس کی سلطنت ہے، جس کو چاہے دے جسے چاہے نہ دے۔

تاریخ کے اوراق میں لکھا ہے کہ محترمہ زلیخا نے کہا تھا ایمان لانے کے بعد: "سُبحٰنَ الَّذِیْ جَعَلَ الْعَبِيْدَ مُلُوْكًا لِطَاعَتِهِمْ"۔ اشارہ ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف۔ "سُبحٰنَ الَّذِیْ جَعَلَ الْمُلُوْكَ عَبِيْدًا لِمَعْصِيَتِهِمْ" اشارہ ہے ان کی اپنی طرف۔ یہ عنایاتِ الٰہی کے کرشمے اور کڑیاں ہیں کہ مصر پہنچا کر آپ علیہ السلام کو بادشاہوں کے گھر میں رکھا تاکہ یہاں سے تخت وتاج تک بآسانی رسائی ہو، اور ابھی سے امورِ سلطنت کی تعلیم سیکھنے کا موقع میسر ہو۔

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ مگر اکثر لوگ ان امور کے جاننے والے نہیں ہوتے۔

﴿وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾ اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے حکمت اور علم عطا کیا، حکمت اور علم سے نبوت مراد ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان کو بعد میں نبوت عطا کی گئی، کنویں میں ہوتے ہوئے جو وحی بھیجی گئی تھی وہ وحی نبوت نہیں تھی، وہ الہام تھا، اور الہام پر بھی وحی کا اطلاق ہوتا ہے، فرمایا: ﴿وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى﴾ [القصص:۷] (اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو الہام کیا)۔

﴿وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اور ہم نیک کام کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْۤ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۳

ترجمہ: اور وہ جس عورت کے گھر میں تھے اس نے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلایا، اور دروازے بند کردیئے، اور کہنے لگی کہ آجاؤ، میں تم ہی سے کہہ رہی ہوں، انہوں نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں، بیشک تیرا شوہر میرا مربی ہے، اس نے میرا اچھا ٹھکانا بنایا ہے، بیشک بات یہ ہے کہ ظلم کرنے والے کامیاب نہیں ہوتے ۝۲۳

معارف ومنازل

امتحانات کا سلسلہ چل رہا ہے، اب کا امتحان ایک نیا امتحان ہے، کیونکہ اونچے درجے تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ خاردار کانٹوں کی سیڑھیوں پر چڑھ کر بلندی تک رسائی حاصل کی جائے، اور دنیا کے سامنے بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ نبوت کا منصب اور عصمت کا مقام عالی کیا ہے۔ آپ علیہ السلام کے حسن وجمال اور جوانی کی حیرت انگیز خوبیاں اور نزاکتیں عزیز مصر کی بیوی پر اس طرح اثر انداز ہوئیں کہ وہ غیر اختیاری طور پر ہوش وحواس کھو بیٹھی، اور عشق ومحبت کی اس آخری خطرناک سرحد پر پہنچ گئی، جسے ”شغف“ اور بے تابی کہتے ہیں۔ ؎

عشق رانازم کہ یوسف رابازار آورد ☆ ہمچوصنعاز اہدے راز یر زنار آورد

مرد اکثر وبیشتر قوی الاعصاب ہوتا ہے، جلدی عشق وہوا کے دریا میں غرق نہیں ہوتا، عورت بیچاری کمزور اعصاب کے ساتھ اس میں برداشت کا مادہ نازک ہوتا ہے، اسی وجہ سے اسے صنفِ نازک کہتے ہیں، وہ کبھی بھی عشقیہ جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی، یہ مرحلہ بظاہر شر کا مرحلہ ہے، مگر قدرت نے اسے خیر تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا ﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ [البقرۃ:۲۱۶] (اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو)۔

اس امتحان کے بعد اسی طرح کا ایک اور امتحان آنے والا ہے، اس کے بعد نو سال اور نو مہینے کا جیل میں بھی رہنے کا امتحان ہوگا، ان تینوں امتحانوں میں کامیابی کے بعد ملک مصر کے والی بننے کی خوشخبری کا مرحلہ ہوگا، بتاؤ اللہ

تعالیٰ کو کیا منظور ہے؟ اور تقدیر کا کیا فیصلہ ہے؟ یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن میں سینکڑوں واقعات کو چھوڑ کر صرف اس واقعہ پر اُحسن القصص کی مہر لگ گئی۔ شاعر نے اچھا کہا: ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ☆ بہت مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عزیز مصر کا گھر ہے، اس میں کس چیز کی کمی ہے؟ محل کے اندر تہ بہ تہ سات کمرے ہیں، ان میں آرائش و زیبائش اور خوشحالی کے سارے سامان مہیا اور تیار ہیں، دوپہر کا وقت ہے، عورت نہایت بیدار اور خوبصورت ہے، عشقیہ جذبات سے مخمور ہے، لگتا ہے کہ وہ ہوش وحواس کھو چکی ہے، صرف اتنا جانتی ہے کہ میں شہزادی مخدومہ ہوں، اور یہ لڑکا غلام اور خادم ہے، بس اس کی فراست یہاں پر ختم ہوگئی، آگے اسے یہ پتہ نہیں کہ ان کے خون میں ابراہیم واسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کا خون شامل ہے، اور یہ بھی نہیں جانتی کہ یہ امت کے پیغمبر اور جبریل امین علیہ السلام کے ہم نشیں ہیں۔ اور یہ بھی نہیں جانتی کہ ان کے سر پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے، وغیرہ وغیرہ۔

وہ بیچاری سمجھتی ہے کہ یہ عنفوان شباب کے جذبات رکھنے والا جوان ہے، اس کے پاس بھی نفس ہے، خواہشات ہیں، تو کہتی ہے: یوسف! آؤ کسی کام کے انجام دہی میں میری مدد کرو، اندر چلو، وہ آگے اور یہ خود پیچھے دروازوں کو بند کر کے آخری کمرے میں پلنگ کے پاس پہنچتی ہے، اس معصوم کو پتہ ہی نہیں کہ دروازے جو کہ سات تھے بند ہو چکے ہیں، اور سب کو اندر سے تالا لگ چکا ہے۔ وہاں پہنچ کر بڑی متانت اور محبت سے عرض کرتی ہے:

﴿هَيْتَ لَكَ﴾ آجائیں، میں حاضر ہوں، یہ کام شروع کرو، اب اس معصوم کو اندازہ ہوا، پہلے استعاذہ پڑھا، پھر اسے خوب سمجھایا اور نصیحت فرمائی، جب مایوس ہوئے تو بھاگنا شروع کیا، یہ آگے وہ پیچھے، دروازے خود بخود کھلتے گئے، جب آخری کمرے پر پہنچا جس کا ایک دروازہ سڑک پر کھلتا تھا یہاں وہ بھی پہنچ گئی، اور پیچھے سے پکڑنے کے لئے آپ علیہ السلام کی قمیص پر ہاتھ ڈال دیا، تو قمیص پیچھے سے پھٹ گئی، اس وقت عزیز مصر باہر سے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گھر پہنچ گئے، اور یہ ماجرا دیکھ کر حیران ہو گئے، تو بلا تأمل (جیسے کہ زبان کی تیزی عورتوں کی عادت ہوتی ہے) شرمندگی چھپاتے ہوئے کہنے لگی: ہائے

﴿مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ حضرت یوسف علیہ السلام نے خاموشی میں نقصان سمجھا، فوراً بول اٹھے:

﴿قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ﴾ ہر شخص تقریباً اوروں کو نہ سہی اپنے گھر کے افراد کے خیالات وعزائم

سے اکثر باخبر ہوتا ہے، اس بیچارے وزیر نے حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق پہلے سے طے کیا ہوا تھا کہ یہ بشکلِ انسان فرشتہ ہیں، اور ہر شخص اپنی بیوی سے خوب باخبر ہوتا ہے، اس کو کوئی التباس پیدا نہ ہوا، اور سمجھ گئے، فرمایا:

﴿وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ﴾ حضرت یوسف علیہ السلام جس عورت کے گھر میں تھے اس عورت نے اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلایا، اور دروازے بند کر لئے۔

﴿وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ﴾ اور کہنے لگی کہ آجاؤ، تم سے تو کہہ رہی ہوں۔

هَيْتَ، هَيْتُ، هَيْتِ تینوں حرکتوں کے ساتھ اسم فعل کے معنی میں ہیں، آ ؤ۔

﴿لَكَ﴾ یعنی تم سے کہہ رہی ہوں۔

﴿قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ میں ایسے کام سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔

﴿اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ تم امانت اور بیوی ہو اپنے شوہر کی جو کہ میرا مولیٰ اور محسن ہے، مجھے اپنے گھر میں احسان کے ساتھ رکھا ہوا ہے، میں اس کی کیسے خیانت کروں؟ اسی طرح میرے ربّ نے اس کے ذریعہ سے ان کے گھر میں مجھے احسان کے ساتھ رکھا ہوا ہے، میں کیسے اپنے ربّ کے حکموں کے خلاف غلط کام کروں؟ کیونکہ ایسا کرنے والا خائن ہوتا ہے، جو کبھی فلاح نہیں پاتا، اس موقع پر انہوں نے حق تبلیغ ادا کرتے ہوئے زلیخا سے بھی کہا کہ تم اپنے شوہر کے حق میں خیانت سے بچو، اور ظالم بننے سے پرہیز کرو۔

❁ ❁ ❁

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝۲۴ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۭ قَالَتْ مَا جَزَاۗءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْۗءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۲۵ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۲۶ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۲۷ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝۲۸ يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۫ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـــِٕيْنَ ۝۲۹ۧ

ترجمہ: اور اس عورت نے ان کے ساتھ اپنا کام نکالنے کا مضبوط ارادہ کر لیا تھا، اور وہ بھی ارادہ کر لیتے اگر

اپنے ربّ کی دلیل نہ دیکھ لیتے اسی طرح تا کہ ہم ان سے برائی کو اور بے حیائی کو دور رکھیں، بیشک وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے ﴿۲۴﴾ اور وہ دونوں آگے پیچھے دروازے کی طرف دوڑے، اور اس عورت نے پیچھے سے ان کا کرتہ چیر دیا، اور دونوں نے اس عورت کے سردار کو دروازہ کے پاس پالیا، وہ کہنے لگی: جو شخص تیرے گھر والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اسے جیل میں ڈال دیا جائے، یا دردناک سزا دی جائے ﴿۲۵﴾ یوسف نے کہا: اسی نے مجھے اپنی مطلب برآری کے لئے پھسلایا، اور اس کے خاندان میں سے ایک گواہی دینے والے نے گواہی دی کہ اگر اس کا کرتہ سامنے سے پھاڑا گیا ہے تو عورت نے سچ کہا اور یہ شخص جھوٹے لوگوں میں سے ہے ﴿۲۶﴾ اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھاڑا گیا تو اس عورت نے جھوٹ کہا اور یہ سچوں میں سے ہے ﴿۲۷﴾ پھر جب اس کے کرتے کو دیکھا گیا کہ پیچھے سے پھاڑا گیا ہے تو کہنے لگا کہ بیشک یہ عورتوں کی فریب کاری میں سے ہے، بیشک تمہارا فریب بڑا ہے ﴿۲۸﴾ یوسف! اس بات کو جانے دو، اور اے عورت! تو اپنے گناہ کے لئے استغفار کر، بلاشبہ تو ہی گناہگاروں میں سے ہے ﴿۲۹﴾

معارف ومنازل

حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت، اور زلیخا کا مجرم ٹھہرانا:

عزیز مصر کی بیوی کی بدنیتی اور غلط اقدام گناہ پر اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت وعفت اور بے گناہی پر اللہ تعالیٰ شانہ کا فیصلہ، اور شاہد کی انوکھی عجیب مدلل گواہی، پھر عزیز مصر کی اپنی بیوی کی طرفداری سے اجتناب اور یوسف علیہ السلام کی براءت کا غیر جانبدارانہ انصاف کے ساتھ اظہار سے پورے واقعہ کی صفائی کا بیان، یہ ایک پیغمبرانہ معجزہ ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے یہ وقت سخت آزمائش کا وقت تھا، شاہی خاندان کی نوجواں حسین عورت، لالہ رو، پری پیکر، محبوب نہیں بلکہ عاشق آرائش حسن وزینت کی بے پناہ نمائش، ناز وعشوہ طرازیوں کی بارش، دوسری طرف یوسف علیہ السلام خود نوجواں حسینوں کا تاجدار، بادشاہ حسن کی خوبیوں سے آشنا، دروازے بند، رقیبوں کا خوف، نہ ڈر، گھر کی مالکہ خود ذمہ دار۔

مگر ان تمام سازگار حالات میں کیا یوسف علیہ السلام کے دل نے ایک لمحہ کے لئے بھی عزیز مصر کی بیوی کی حوصلہ

افزائی کی؟ کیا ان کے دل نے قرار چھوڑ کر بے قراری اختیار کی؟ کیا نفس نے جہانی قلب کو ایک لمحہ کے لئے بھی متزلزل کیا؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ اس کے برعکس اس امینِ نبوت اور پیکرِ عصمت و پاکدامنی مہبطِ وحی الٰہی نے دو ایسے دلکش اور مسلم ومحکم دلائل سے "مصری عورت" کو سمجھایا جو ایک ایسی ہستی سے ہی ممکن تھا، جن کی تربیت براہ راست آغوشِ الٰہی میں ہوئی ہو۔ فرمایا:

"یہ ناممکن ہے، پناہ بخدا" میں کیسے اس کی نافرمانی کروں جس کا اسم جلالت "اللہ" ہے؟ اور وہ تمام کائنات کا مالک اسرار ورموز کا خالق کائنات کے ہر پوشیدہ ذرات کا دانا وبینا اور جاننے والا ربّ ہے، اور کیا میں اپنے اس مربی "عزیز مصر" کی امانت میں خیانت کروں؟ اس کے باغ کو تاراج کروں؟ اس کی عزّت کا تمسخر اور مذاق اڑاؤں جس نے ایک بدوی غلام رہنے کی بجائے مجھے اپنے شاہی مکان میں رکھ کر شہزادوں کے برابر اکرام وعزّت سے نوازا، اور مجھے عزّت وحرمت عطا کی، اگر میں ایسا کروں تو ظالم ٹھہروں گا، اور ظالموں کے لئے انجام ومآل کے اعتبار سے کبھی فلاح نہیں ہے۔

خوب غور کرو، یہی وہ برہان ربی ہے کہ جس کا ذکر آیت کریمہ میں ہے، یہ ایک بلند وبالا پیغمبرانہ سوچ ہے، جس میں منعم حقیقی اور منعم مجازی دونوں کے حقوق کی پاسداری اور عزّت واحترام ہے، جس کا تصور اور ایفاء اور نگہبانی انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ مخصوص ہے۔

مگر عزیز مصر کی بیوی پر اس نصیحت کا مطلق اثر نہ ہوا، اور اس نے اپنے ارادے کو عملی شکل دینے پر اصرار کیا، تب یوسف علیہ السّلام نے اپنے اس برہان ربّ کے پیش نظر جس کا ذکر ابھی ہو چکا تھا عزیز مصر کی بیوی کے حکم وفرمائش اور مطلب برآری سے صاف صاف انکار کیا، اور نہ مانا۔

﴿وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ مفسرین حضرات نے اس آیت کی مختلف تفسیریں کی ہیں، لیکن چند سطور پہلے ہم نے جو معانی بیان کئے ہیں وہ شان نبوت کے مطابق بھی ہیں، اور بے غبار بھی ہیں، اور ضعیف وبے سند باتوں کے پیچھے پڑنے سے مستغنی کرنے والے بھی ہیں۔ وہ اس طرح کہ قرآن حکیم نے اوّل سے آخر تک اس واقعہ میں عزیز مصر کی بیوی کی شناخت کار، اور حضرت یوسف علیہ السّلام کی عصمت وجلالت قدر کا تذکرہ فرمایا ہے، کیونکہ ایک طرف خاندانی شرافت کے علاوہ نبوت وصدیقیت کا مقام ہے، دوسری طرف صرف انسانیت، شرک وکفر اور بت پرستی کا مظاہرہ ہے، اور تاریخ گواہ ہے کہ مصر کے اندر بت پرستی اور کفر کے علاوہ اور کچھ نہ

تھا، اور سارے لوگ کافر تھے، اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے:

﴿مَعَاذَ اللهِ اِنَّهُ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ فرمان کے بعد یہی معنی برمحل ہو سکتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کی زبان سے برہان ربّ کے سن لینے کے بعد بھی جب عورت اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئی، اور اپنے ارادے پر مصر رہی تو یوسف علیہ السلام نے اس کے ارادہ اور خواہش کو مضبوطی سے قطعاً رد فرمایا، اور برہان ربّ کے سامنے اس کے "ھم" کی مطلق پرواہ نہ کی، اور نتیجہ یہ نکلا کہ یوسف علیہ السلام اس سے بچنے کے لئے دروازوں کی طرف بھاگے، اور عزیز مصر کی بیوی راعیل (زلیخا) نے ان کا پیچھا کیا، اور پکڑنے اور قابو کرنے کے لئے دوڑ لگائی۔

بعض مفسرین نے اس تفسیر پر جس کے معنی یہ ہیں کہ اس عورت نے یوسف علیہ السلام سے ارادہ بد کیا، اور وہ بھی ارادہ کرتے اگر اپنے ربّ کے برہان کو نہ دیکھ لیتے، پر اعتراض یہ کیا ہے کہ عربی گرامر کا تقاضا ہے کہ "لَوْلَآ" کلام کے شروع میں مستعمل ہونا چاہیے، اس لئے کہ وسط کلام میں اس کا استعمال نحوی قاعدہ کے خلاف ہے، مگر اس تفسیر کے مطابق "لَوْلَآ" وسط کلام میں ہوگا، اور تعبیر یہ ہوگی کہ:

﴿وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ﴾ اور یوسف علیہ السلام بھی گناہ کا قصد کر لیتے اگر اپنے ربّ کے برہان کو نہ دیکھ لیتے۔

مگر یہ اعتراض اس لئے درست نہیں کہ اس مقام پر بھی "لَوْلَآ" کا استعمال شروع کلام ہی میں ہوا ہے، اور نحوی قاعدہ کے مطابق دال علیٰ الجواب مقدم ہے، اور "لَوْلَآ" کا جواب جو بعد میں مذکور ہوتا ہے اس کا دال علیٰ الجواب کی وجہ سے مقدر ومحذوف ہے، اور یہ اس لئے صحیح ہے کہ فصاحت وبلاغت کا تقاضا ہے کہ ایک جانب مناسبتِ کلام کو قائم رکھا جائے، یعنی دونوں کے ارادے وعدم ارادے کا ایک ہی جگہ ذکر ہو۔

اور دوسری جانب نحوی قاعدہ کے پیش نظر "لَوْلَآ" کا جواب اس کے بعد آئے، اور یہ دونوں باتیں جب ہی ہوسکتی ہیں کہ "هَمَّ بِهَا" کو دال علیٰ الجواب بنا کر "هَمَّتْ بِهٖ" کے ساتھ ذکر کیا جائے، اور "لَوْلَآ" کا جواب "فَهَمَّ بِهَا" کو مقدر تسلیم کیا جائے، لہٰذا مسطورہ بالا تفسیر ہی شک وشبہ سے بالاتر حقیقت حال کو واضح اور ظاہر کرتی ہے۔

قرآن مجید میں اس کی نظیر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے تذکرہ سے متعلق یہ آیت ہے: ﴿اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا﴾ [القصص: ١٠] (قریب تھا کہ وہ (والدہ موسیٰ علیہ السلام) اس کو ظاہر کر دے اگر ہم اس

کے دل کو مضبوط نہ بنا دیتے) یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کو مضبوط کیا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے راز کو ظاہر نہ کر سکیں، اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ظاہر کر دیتیں۔

دیکھئے! یہاں بھی "لَوْلَا" سے دال علی الجواب مقدم ہے، اور "لَوْلَا" کا جواب "لَتُبْدِیْ بِہٖ" مقدر و محذوف ہے۔ اسی طرح اس مقام پر بھی یہ معنی ہیں کہ اگر یوسف علیہ السلام کو برہان ربّ حاصل نہ ہوتا تو وہ بھی ارادۂ بد کر لیتے، مگر وہ ارادۂ بد سے بچ گئے، کیونکہ وہ برہان ربّ دیکھ چکے تھے۔

اس تفسیر میں یوسف علیہ السلام کے لئے کسی ادنیٰ بشری تقاضے کے ہم و ارادے کی مکمل نفی ہے، اور یہی شان نبوت کے عین مطابق ہے۔

تعجب ہے ان علماء کرام پر کہ اس حقیقی اور واضح تفسیر جو کہ بے داغ بھی ہے کو چھوڑ کر "وَهَمَّ بِهَا" پر وقف کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے "هَمّ" کا اثبات کیا، پھر بامرِ مجبوری رکیک تاویلات کا سہارا لے کر کہنے لگے کہ یہ معمولی ہم تھا، بشری تقاضے نبوت کے منافی نہیں ہوتے، جیسے کہ روزہ دار کو طبعاً پانی کی غیر اختیاری رغبت ہوتی ہے، جو کہ روزہ کے لئے مضر نہیں، انہوں نے نبوت کو عام روزہ دار پر قیاس کیا، لہٰذا اس قسم کے جوابات کی ضرورت ہی کیا ہے؟ واللہ اعلم

اور مزید حیرانی ہے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے عظیم محدث و مفسر پر، جو کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو جیل میں ڈالنا یہ ان کے گناہ "هَمّ" کی سزا ہے، اور اس کی نسبت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف کرتے ہیں، اس روایت پر آئندہ کلام ہوگا۔ إن شاء اللہ

یہاں دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ "برھان ربّ" کیا تھا جسے قرآن حکیم نے ذکر فرمایا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنی بلیغانہ اور معجزانہ خطابت میں خود ہی اس کو اس طرح ادا کیا ہے کہ سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، دروازوں کے بند ہو جانے پر عزیز کی بیوی کو حضرت یوسف علیہ السلام نے جو جواب دیا ایسے مقام کے لحاظ سے اس سے بہتر جواب کیا ہو سکتا تھا سو یہی وہ "برھان ربّ" تھا جس کا بیان ابھی ہوا۔ اور یہ جواب حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا ہوا، اور جس نے یوسف علیہ السلام کو بے داغ رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے بڑے شدومد سے اس کے بعد یہ بیان کیا:

﴿ كَذٰلِكَ ﴾ یوں ہی ہوا۔

﴿لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ﴾ تاکہ ہٹادیں ہم ان سے برائی اور بے حیائی۔

﴿اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾ بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن اس قسم کے "ھمّ" سے، اس لئے پاک رہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عصمت و پاکدامنی کا فیصلہ شروع ہی سے کردیا تھا، پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی عصمت وحفاظت کے بعد اس کے خلاف کوئی شائبہ بھی ان میں پایا جاتا؟

پھر خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت کا نظر آنا اور ان کا اشارہ سے منع کرنا، یا فرشتہ کا ظاہر ہوکر ان کو اس سے روکنا، یا عزیز مصر کا گھر میں رکھے ہوئے صنم پر اس کی بیوی کا پردہ ڈالنا، اور حضرت یوسف علیہ السلام کا اس سے عبرت حاصل کرنا یہ اور اس قسم کے تمام اقوال کے مقابلہ میں "برھان ربّ" کی وہی تفسیر بہتر تفسیر ہے جو خود قرآن کریم کی نظم وترتیب سے ثابت ہے، یعنی:

(۱) ایمان باللہ کا حقیقی تصور (۲) اور مجازی مربی کے احسان کی احسان شناسی اور وصف امانت داری جس کا ذکر عزیز مصر نے یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنی بیوی سے کیا تھا: ﴿اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ﴾ اس کی عزّت وحرمت رکھنا، اور یوسف علیہ السلام نے اسی کو پیش نظر رکھ کر فرمایا: ﴿اَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾ عزیز مصر نے مجھ کو عزّت دی، تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اس کی امانت میں خیانت کر کے اس کی بے عزّتی کروں؟

اس کی تائید کے لئے یہ سنیں کہ حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "برھان" وہ نورِ نبوت تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سینے میں ودیعت کردیا تھا، یہی نورِ نبوت اس عمل سے مانع ہوگیا، جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب تھا۔ صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں: میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے۔ [مظهري]

﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ﴾ یہاں مضارع کا صیغہ (جو کہ حال اور مستقبل دونوں کے لئے ہے) اس لئے ہے کہ ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام کی ہر قسم کی برائی اور بے حیائی سے زمانۂ حال میں حفاظت فرماتے ہیں، اسی طرح استقبال میں بھی ان کی حفاظت کی پیش بندی کرکے راستہ ہموار فرماتے ہیں، اس سلسلے میں ہم یہ کہنے پر حق بجانب ہیں کہ یوسف علیہ السلام کو یہ معاملہ جو پیش آیا تو یہ بھی دراصل ان کی تربیت کے سلسلے میں ایک ضروری مرحلہ تھا، ان کو بدی اور بے حیائی سے پاک کرنے اور ان کی طہارت نفس کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لئے حکمت و مصلحت خداوندی میں یہ ناگزیر تھا، تاکہ ان کے سامنے معصیت کا ایک ایسا نازک موقع پیش آئے، اور اس آزمائش کے وقت وہ اپنے ارادے کی پوری قوت وطاقت اور پرہیزگاری وتقویٰ کے پلڑے میں ڈال

کر اپنے نفس کے برے میلانات کو ہمیشہ کے لئے قطعی طور پر شکست دیدیں۔

خصوصیت کے ساتھ اس مخصوص طریقہ تربیت کے اختیار کرنے کی مصلحت اور اہمیت اس اخلاقی ماحول کو نگاہ میں رکھنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے، جو اس وقت کی مصری سوسائٹی میں پایا جاتا تھا۔ آگے رکوع (۴) میں اس ماحول کی جو ایک ذراسی جھلک دکھائی گئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے "مہذب مصر" میں بالعموم اور اس کے اونچے طبقے میں بالخصوص صنفی آزادی قریب قریب اسی پیمانے پر تھی جس پر آج ہم اپنے زمانے کے اہل مغرب اور مغرب زدہ طبقوں کو فائز پا رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو ایسے بگڑے ہوئے لوگوں میں رہ کر کام کرنا تھا، اور یہ کام بھی ایک معمولی اور عام آدمی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ فرمان روائے ملک کی حیثیت سے کام کرنا تھا۔

اب یہ ظاہر ہے کہ جو خواتین اور اونچے طبقے کی عورتیں ایک خوبصورت حسین غلام کے آگے بچھی جارہی تھیں وہ ایک جوان اور خوبصورت فرمانروا کو پھانسنے اور بگاڑنے کے لئے کیا نہ کر گزرتیں، اسی کی پیش بندی اللہ تعالیٰ شانہ نے اس طرح فرمائی کہ ایک طرف تو ابتداہی میں اس آزمائش سے گزار کر حضرت یوسف علیہ السلام کو پختہ کر دیا، اور دوسری طرف خود خواتین مصر کو بھی ان سے مایوس کر کے سارے فتنوں کا دروازہ بند کر دیا۔

﴿وَاسۡتَبَقَا الۡبَابَ وَقَدَّتۡ قَمِيۡصَهٗ مِنۡ دُبُرٍ وَّاَلۡفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الۡبَابِ﴾ اور وہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے، اور عورت نے پیچھے سے اس کا کرتہ پھاڑ ڈالا، اور دونوں نے اس عورت کے شوہر کو دروازے کے پاس کھڑا پایا۔

خلاصہ کلام:

جب یہ دونوں دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ عزیز مصر سامنے کھڑے ہیں، اس طرح راز کھل گیا اور عزیز مصر نے محسوس کیا کہ کوئی معاملہ ضرور ہے، عورت نے اپنی شرمندگی اور گناہ چھپانے کی خاطر مظلومانہ انداز میں استغاثہ کر کے کہا: میں کیا کروں تمہارے اس غلام نے مجھ پر دست اندازی کر کے مجھ سے کسی غلط چیز کا مطالبہ کیا ہے (یعنی زنا بالجبر) اس کا یہی علاج ہے کہ اسے جیل میں رکھا جائے، اور سخت سزا دلوائی جائے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے اور بہت کچھ کہا ہو، مگر قرآن حکیم نے مختصراً خلاصہ ذکر فرمایا۔

حضرت یوسف علیہ السلام اپنی پیغمبرانہ شرافت کی بناء پر غالباً اس کا راز فاش نہ فرماتے، اور اسے معاف کرتے، مگر جب عورت نے پیش قدمی کر کے یوسف علیہ السلام پر تہمت لگائی تو انہوں نے مجبور ہو کر اپنے دفاع اور عزت بچانے

کے پیش نظر ارشاد فرمایا کہ بات وہ نہیں ہے جو تمہاری بیوی کہہ رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ مجرم ہے، اور میں بے گناہ ہوں، وہ اپنے مطلب کے لئے مجھے پھسلا رہی تھی۔

اب یہ بڑا نازک معاملہ ہے، عزّت وننگ کا سوال ہے، ایک بہت بڑی بدنامی کا معاملہ ہے، ایک طرف بیوی کی دوسری طرف سے شریف اور پسندیدہ غلام کی، جس کی شرافت وطہارت اور پیغمبرانہ خصلتوں کا اس نے قریب سے مطالعہ کیا ہوا تھا، وہ بے چارہ ششدر رہ کر مخمصے میں ڈوب گیا، نہیں جانتا تھا کیا کرے، کوئی گواہ ندارد، کوئی علامت بھی ظاہر نہیں، اور معاملہ اپنے گھر کا ہے۔

مگر اللہ تعالیٰ شانہ اپنے مخلص بندوں اور برگزیدہ ہستیوں کو جس طرح گناہ سے بچا لیتے ہیں اسی طرح ان کی عزّت نفس کو بھی داغدار ہونے سے حفاظت فرماتے ہیں، اور یہ چیز خاص کر انبیاء کرام علیہم السلام کے لئے مزید ضروری ہوتی ہے کہ ان کی عصمت ہر طرح محفوظ ہو۔

بالکل نزدیک اس عورت کے کسی رشتہ دار کا گھر ہے، جس میں ایک شیر خوار بچہ اپنے گہوارہ (بھنگوڑے) میں سویا ہوا آرام کر رہا ہے، یہ دوپہر کا وقت ہے، گھر کے تمام لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اسی مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے، اچانک بچے کو چھینک آئی اور خلاف عادت بولنے لگا، سب لوگ متوجہ ہو کر سننے لگے، حیران ہوئے یہ کیا کہہ رہا ہے، بچے نے کہا: مسئلہ یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کا کرتہ پھٹا ہوا ہے اسے غور سے دیکھو، اگر وہ سامنے سے پھٹا ہوا ہے تو عورت بے قصور ہے اور یوسف علیہ السلام جھوٹا ہے، اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو وہ سچا اور بے قصور ہے اور عورت قصوروار جھوٹی ہے۔ بچے نے دو تین مرتبہ یہ شہادت دہرائی، اتنے میں عزیز مصر بھی آئے اور زلیخا کا ایک چچازاد بھائی جو بڑا عقلمند بھی تھا وہ بھی آیا، اور اپنے کانوں سے سنا، اور نہایت حیران رہے کہ یہ بچہ معاملہ سے کیسے واقف رہا۔

اس عقلمند شخص نے یہ بھی کہا کہ زنا بالجبر میں تو عورت کے بھی کپڑے پھٹ جاتے ہیں، اور دست وگیر میں عورت کے چہرے اور ہاتھوں پر خراش پیدا ہوتے ہیں جو کہ یہاں کچھ بھی نہیں، اور بچے نے عورت کا کوئی ذکر ہی نہ کیا، پھر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی بچے نے اس عمر میں کوئی بات کی ہو، چنانچہ یہ مسئلہ فوراً حل ہو گیا، جس سے محض یہ نہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت ثابت ہوئی، بلکہ پورے خاندان میں ان کی قدر ومنزلت پر چار چاند لگ گئے، اور عورت شرمندہ اور ملامت ہو کر گھر میں چھپ گئی۔ آئندہ رکوع میں پھر اس کا تذکرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ربّ العزّت ایسے مواقع پر اپنے لطف وکرم سے اپنی ضعیف ترین مخلوقات سے کام لیتے ہیں۔

ابرہہ کے لشکر کو ابابیل سے تباہ کیا۔ غار ثور میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی مکڑی اور کبوتروں سے حفاظت فرمائی۔ حضرت مریم علیہا السلام کی صفائی پر نوزائدہ فرزند مکرم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے گواہی دی۔ بنی اسرائیل کے راہب جریج رحمہ اللہ کی صفائی پر پانچ دن کے بچے قابوس نے گواہی دی۔ اصحاب الاخدود کے موقع پر بھی شیر خوار بچے نے گواہی دی۔ فرعون کے زمانے میں بھی شیر خوار بچے نے گواہی دی۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بچپن (شیر خوارگی) میں بات کرنے والوں کی فہرست دس بتادی ہے، جنہوں کسی طرح بات کی ہے، یا کسی کے لئے گواہی دی ہے، وہ درج ذیل ہیں:

تکلم في المهد النبي محمد ★ ويحى وعيسى والخليل المكرم

ومبرى جريج ثم شاهد يوسف ★ وطفل لدى الأخدود يرويه مسلم

وطفل عليه مز بالأمة التى ★ يقال لها تزنى ولاتتكلم

وماشطة في عهد فرعون طفلها ★ وفي زمن الهادي المبارك يختم

عزیز مصر نے جب اپنے دوستوں کی موجودگی میں کرتہ کا ملاحظہ کیا، اور خرق عادت اس شیر خوار بچے کی شہادت پر بھی غور کیا تو انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت و بزرگی کا بخوبی اندازہ ہوا، اس نے اپنی بیوی کو ملامت کرتے ہوئے فرمایا: یہ سب تمہارا مکر وحیلہ اور ناجائز حرکت ہے، مجرم تمہی ہو، یہ ایک ایسی خرق عادت ہے جسے کوئی رد نہیں کرسکتا، پھر کہا کہ عورتوں کا مکر وحیلہ بہت بڑا اور زیادہ ہے، اور مکر وفریب میں عورتیں بڑی ماہر ہیں، وہ ظاہراً اپنے ضعف و کمزوری کا اور بے گناہی کا رٹ لگاتی ہیں، مگر اندر سے وہ بہت مکار اور فریب ودھوکہ دہندہ ہیں۔

پھر حضرت یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ ویسے بھی شرافت و دیانت کے مالک ہیں، اس معاملہ کو رفع دفع کریں، اور بھول جائیں، آئندہ نہ اس کا تذکرہ کریں نہ طبیعت پر بوجھ محسوس کریں، وغیرہ۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ عزیز مصر اپنی بیوی کا غلام تھا، اور بے غیرت انسان تھا، اس نے اپنی بیوی کو نہ طلاق دی اور نہ سزا دی۔ میں بحیثیت ایک طالب علم کے ایسے حضرات کے ساتھ اتفاق بھی نہیں کرتا، اور نہ ہی تردید کرتا ہوں۔ آپ خوب غور کریں اور جان لیں کہ "الحياء شعبة من الإيمان"۔ وہ بے چارہ مشرک وبت پرست کافر تھا، آپ اپنے زمانے کے کافروں کو دیکھیں، بلکہ مغرب زدہ عام لوگوں پر نظر ڈالیں کہ کیا ہو رہا ہے، حالانکہ اس وقت چاروں افق پر اسلام کا ستارہ بھی چمک رہا ہے۔ یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ کے زمانہ پر دنیا کا حال کیا، اور کیسے

تھا۔ واللہ ولي التوفيق وله الكبرياء۔

﴿وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ﴾ کہ تو اپنے گناہ کے لئے استغفار کر، بلاشک تو خطا کاروں میں سے ہے۔ کفار بھی استغفار کے قائل ہوتے ہیں، اول اس لئے کہ بعض گناہ ایسے ہیں کہ تمام مذاہب کے لوگ انہیں گناہ سمجھتے ہیں جیسے قتل زنا، جھوٹ، فریب، چوری، وغیرہ یہ سب چیزیں غیر مسلموں کے نزدیک بھی گناہ ہیں۔

دوئم یہ کہ دہریہ اور منکرین خدا کے علاوہ تمام کفار اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی خالقیت و مالکیت کے قائل ہیں، ان کا شرک صرف عبادت اور تصرف واختیار میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر اپنے بتوں، دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہیں، اور انہیں نفع ونقصان میں اللہ تعالیٰ کا شریک مانتے ہیں۔ سورۃ الانعام میں تفصیل گزر چکی ہے۔

عورتوں کے مکر اور حیلہ سازی کا بیان:

﴿اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ﴾ اگر چہ یہ قول عزیز مصر کا ہے، مگر واقع میں کتاب وسنت کا بھی یہی حکم اور فرمان ہے۔ عورت چونکہ ناقص العقل والدین ہے، بدنی کمزوری کے ساتھ اس میں عقل و دین کی کمزوری اعلیٰ درجے کی ہے، اس لئے گناہوں اور خطاؤں اور غیر اخلاقی افعال میں پیش پیش ہے، اور درحقیقت دیناوی فتنوں اور معاشرتی برائیوں میں عورت کا حصہ بنسبت مردوں کے زیادہ ہے۔ شیطان اکثر وبیشتر عورتوں کا تعاقب اس لئے کرتا ہے کہ ان کو شیطان بآسانی شکار کرتا ہے، اور پھر وہ اپنی شرارت اور خیانت وچاپلوسی اور ناز ونخرے ودیگر ذرائع سے مردوں کو بہت جلد شکار کرتی ہے، بلکہ یہ اس کا مخصوص ذاتی حربہ وتیر کمان ہے، عورتوں کو چالبازی میں وہ مہارت حاصل ہے، جس کے ذریعہ اگر وہ چاہیں تو بادشاہوں کو تخت سے اتار دیں، تو وہ یہ سب کچھ بآسانی کرسکتی ہیں۔

سرور عالم ﷺ نے ایک مرتبہ عید کی نماز کو جاتے ہوئے عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ”مَا رَاَيْتُ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدَاكُنَّ“۔ [بخاري]

ہوشمند ودانا آدمی کی عقل کو ختم کرنے میں اور اسے بیوقوف بنانے میں تم سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مَاتَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً هِيَ اَضَرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ“۔ [متفق عليه] میں نے اپنے بعد عورتوں سے بڑھ کر کوئی ایسا فتنہ نہیں چھوڑا جو مردوں کے لئے ضرر دینے دینے میں عورتوں سے بڑھ کر ہو۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ فَاِنَّ اَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ“ [مسلم] کہ دنیا سے بچو، اور عورتوں سے بچو، یعنی

ان دونوں میں احتیاط کرو، اور سوچ سمجھ کر انہیں استعمال کرو، ان کے فریب میں نہ آنا، کیونکہ بنی اسرائیل قوم کا جو سب سے پہلا فتنہ تھا، وہ عورتوں کی وجہ سے تھا، اس کی ابتدا عورتوں نے کی تھی۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اَلنِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّیطٰنِ" [مشکوۃ] کہ عورتیں شیطان کے جال ہیں، شیطان ان کے ذریعہ مچھلی والے کی طرح مردوں کو شکار کرتا ہے، گمراہ کرتا ہے، بہکاتا ہے، خراب کرتا ہے، اور جو مرد اپنی نادانی اور عشق ومحبت کی بنیاد پر عورتوں کو پھول اور راحت وسکوں کا ذریعہ سمجھتے ہیں ایک مناسب اندازے تک یہ بات درست ہے، بشرطیکہ وہ دیندار، صالحہ، متقیہ، خداترس، اور امانتدار وفرمانبردار، باحیا ہوں۔ ورنہ یہ پھول خاردار کانٹوں سے بھی بدتر ہیں۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کے حقوق اور اقدار وحدود مقرر کئے ہیں، اگر انہیں ان کے حقوق اور حدود پر پابند کیا جائے تو معاشرہ اور گھریلو حدود ایک حد تک درست رہیں گے، اور اگر یورپ اور دیگر اقوام کی طرح انہیں شتر بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دیا گیا تو اسی دنیوی معاشرہ کو جہنم بنانے کی بآسانی نوبت آجائے گی، اور پورے عالم میں فتنہ اور فساد وگمراہیوں کا دور دورہ ہوگا۔ آج کا یورپ جس نے عورتوں کو مردوں کے برابر لانے کی غلطی کی خود پریشان اور گومگو میں مبتلا ہے، اس کا پورا معاشرہ تباہ ہے، وہ اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے مگر کامیابی مشکل ہے۔

رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم اور عورت کا مقام:

اسلام نے محض یہ نہیں کہ خالق ومخلوق کے منقطع رشتوں کو جوڑا، بلکہ پوری کائنات کے اندر جتنے رشتے مخلوقات کے ہو سکتے تھے ان سب کی پاسبانی کی رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی، سب سے بڑی خصوصیت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب عالی کا یہی تقاضا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری کائنات کی تمام مخلوقات کے حقوق کی ازسرنو شیرازہ بندی کریں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے اقوام عالم نے جہاں اپنے محسن وخالق ومالک حق سبحانہ وتعالیٰ کے حقوق کو محض نظر انداز نہیں بلکہ کرید کرید کر انہیں تبدیل اور ضائع کیا، اور یہ سب کچھ قصداً وعملاً منصوبہ بندی کے تحت ہوتا رہا۔

وہاں دیگر کمزور مخلوقات کے حقوق کے تحفظ وپاسداری کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، پوری کائنات کی تحقیقات اور ریسرچ سے پتہ چلتا ہے کہ سابقہ آسمانی ادیان اور دیگر اقوام نے جس طرح انسانیت کی تذلیل کی کسی اور مخلوق کی اتنی تذلیل نہیں ہوئی خاص کر صنف نازک عورتوں کی، جنہیں ایک طرف باعث ننگ وعزت قرار دے کر ایک طبقہ نے انہیں زندہ درگور کرنے پر فخر محسوس کیا، اور ایک طبقہ نے انہیں خنزیر اور کتوں سے بدتر قرار دے کر

جانوروں کی طرح منڈیوں بازاروں میں بھیڑ بکریوں کی طرح بولیاں لگا کر فروخت کیا۔

اگر چند ایک کو اپنی جنسی خواہشات اور ہوس پورا کرنے کی خاطر باقی رکھا تو انہیں ناپاکی کے ایام میں گھروں سے نکال کر گھروں کے پیچھے کتے اور مرغیوں اور گدھوں کی جھونپڑیوں میں بیدردی کے ساتھ قید و بند میں رکھا، نہ سلام، نہ کلام، نہ لطف وعنایت، نہ روٹی، نہ طعام، نہ علاج۔ وہ ہفتہ دس دن تک موت وحیات کی کشمکش میں گزار کر جنگلی بھوت کی شکل میں جب صفائی کا اہتمام کرتیں تو انہیں شرم محسوس ہوتی کہ کہاں جائیں، کیا کریں، کہاں بیٹھیں وغیرہ۔

اور ایک طبقہ نے اسے اتنی بے قیمت اور منحوس وناپاک قرار دیا کہ جب اس کے شوہر کا انتقال ہوا تو اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے مردہ شوہر کے ساتھ سپرد آتش کیا گیا، وہ چیختی چلاتی آسمان سر پر اٹھاتی کوئی شنوائی نہ ہوتی، کیونکہ یہ منحوس ہے، اسی وجہ سے اس کا تو شوہر مرا، یہ تو ہندوؤں کی مہربانی رہی۔

دوسری اقوام نے یہ سزا تجویز کی کہ اس کو زندگی بھر کسی سے شادی کی اجازت نہ ہو، یہ منحوس ہے، پوری زندگی بیوگی کی نذر ہوگئی، ستر اسی سال تک خوار وذلیل ہوتی، لوگ اس سے بیزار رہتے، غمی اور خوشیوں میں محفلوں میں اس کی شرکت پر پابندی تھی۔

ایک طبقہ نے عورت کو بازیچۂ اطفال بنا کر اس کی عصمت دری کا یہ سوچا کہ اسے مجبور کیا، ایک نہیں دس پندرہ بیس تک مردوں کے ہوس کا شکار بنایا، اسے ایک مکان میں بند کر کے رکھا اور باری باری اس کی عصمت دری کرتے رہتے۔

ایک طبقہ وہ آزاد خیال لوگوں کا تھا کہ عورت کو گھر سے اٹھا کر جنگل لے گئے، پھر اجتماعی زنا کر کے، یا اسے وہیں قتل کر گئے، یا کسی تاریکی میں گھر پہنچا کر چھوڑ گئے، اب یہ زندگی بھر نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی رہی۔

جب اسلام کا روشن سورج طلوع ہوا تو عرش عظیم سے ایک مقدس بابرکت قانون کی منظوری کے ساتھ یہ سارے ظلم وستم مٹ گئے، ختم ہو گئے، عورت تو عورت ہے گدھے، کتے، بلیوں تک کے حقوق کا راستہ ہموار ہوا، جانوروں کو چھوڑیئے کیڑے مکوڑے، حشرات الارض، چیونٹیوں کے حقوق معلوم ہوئے۔ عورتوں کو وہ مقام ملا جو کسی کے وہم وگمان میں نہ ہو، یہ اس کا حق مہر ہے، یہ میراث میں اس کا حصہ ہے، کسی اجنبی مرد کو اس کے ساتھ محفل ومجلس کی اجازت نہیں، چلتے راستے پر کسی کو اس کے ساتھ سلام وکلام کی اجازت نہیں، کسی کو اس کے ہاتھ پاؤں بالوں چہروں کی طرف نظر اٹھانے کی اجازت نہیں، ان کے سروں پر عزّت وحرمت کا تاج رکھ کر ان کو ایسا تحفظ دیا گیا جس کی نظیر

نہیں۔

علماء تفسیر و حدیث وفقہ نے ان کے حقوق پر کتابیں تصنیف فرمائیں، ان کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑا گیا کہ یہ اس کی بندیاں ہیں (اللہ اللہ)۔ یہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیاں ہیں، امت کی مائیں ہیں، بہنیں ہیں، بیٹیاں ہیں، دادیاں، نانیاں، پھوپھیاں، اور خالائیں ہیں۔ اِن شاءاللہ سورۃ احزاب میں مزید فوائد آنے والے ہیں۔

اربوں کھربوں صلوٰۃ وسلام اس ذات عالی پر جس نے ہمیں ایمان کا شرف عطا فرمایا، جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کا شرف عطا فرمایا۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۡ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: اور چند عورتوں نے کہا جو شہر میں رہتی تھیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو مطلب حاصل کرنے کے لئے پھسلاتی ہے، اس غلام کے عشق نے اس کے دل میں پوری طرح جگہ پکڑ لی ہے، بیشک ہم تو اس عورت کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہے ہیں ﴿۳۰﴾ پھر جب اس نے ان عورتوں کی مکر کی باتیں سنیں تو انہیں بلوا بھیجا، اور ان کے لئے ایک مجلس تیار کی جس میں تکیہ لگا کر بیٹھیں، اور ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھری دیدی، اور یوسف سے کہا کہ ان کے سامنے نکل آ، سو جب ان عورتوں نے انہیں دیکھا تو حیران رہ گئیں، اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہنے لگیں حاشَ لِلّٰہ یہ شخص بشر نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے ﴿۳۱﴾ وہ عورت کہنے لگی: سو یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں تم نے مجھے ملامت کی، اور واقعی میں نے اس سے اپنا مطلب حاصل کرنے کی خواہش کی، سو وہ بچ گیا، اگر اس نے وہ بات نہ مانی جس کا میں اسے حکم دے رہی ہوں تو ضرور اس کو جیل میں بھیج دیا جائے گا، اور یہ ضرور بے عزت ہوگا ﴿۳۲﴾

معارف ومنازل

عزیز مصر نے فضیحت ورسوائی سے اگرچہ بچنے کے لئے اس معاملہ کو یہیں پر ختم کیا، مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی، اور رفتہ رفتہ شاہی خاندان کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیز مصر کی بیوی کس قدر بے حیا اور ناداں ہے کہ اپنے غلام پر مفتون وفریفتہ ہے، اتنے بڑے مرتبے کی عورت اور غلام سے محبت؟ آہستہ آہستہ یہ عیب جوئی کی خبر عزیز مصر کی بیوی تک پہنچ گئی، اور اس کو عورتوں کا یہ طعن وملامتی بیحد شاق گزرا، اور اس نے چاہا کہ اس کا انتقام لے، اور اپنی بدنامی کو مٹائے، اور ایسا انتقام لے کہ جس بات پر وہ مجھ پر طعن کرتی ہیں اسی میں ان کو بھی شریک کیا جائے۔

یہ سوچ کر ایک روز اس نے شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتوں کو دعوت دی، اور ایک مجلس کی اچھی خاصی پر رونق نشستگاہ مرتب کی، جب وہ سب آگئیں تو ان کا استقبال اور خوش آمد کیا، تھوڑی دیر بعد دسترخوان بچھا کر انہیں سلیقہ سے بٹھالیا، اور بڑے بڑے تکیوں پر ٹیک لگا کر ان کے ہاتھوں میں تیز وباریک چھریاں دے کر ہر قسم کے پھل اور کھانے کی فرمائش کی، خوب ہنسی مذاق گپ شپ کے ساتھ کھانا شروع ہوا، گوشت اور ترنج چھریوں سے کاٹ کر کھانے لگیں، حضرت یوسف علیہ السلام ایک نزدیکی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے، عین اسی وقت کنیز سے کہا گیا کہ یوسف علیہ السلام کو بلا لاؤ، جب وہ ہال کے دروازے پر نمودار ہوئے تو سب کی نظریں ادھر کو لگ گئیں، پھر کیا تھا کہ سب کی سب ہوش وحواس کھو بیٹھیں، جمالِ یوسف علیہ السلام کی ایک جھلک دیکھنے سے ان کی دنیا بدل گئی، اور چھریوں سے پھل کاٹنے کے بجائے اپنی اپنی انگلیوں کو کٹوا کر لہولہان کر گئیں۔ بقول صاحب مظہری غیر اختیاری کیفیت اور صدمہ سے حائضہ ہو گئیں، اور بے ساختہ کہنے لگیں کہ کون کہتا ہے یہ انسان ہے؟ بخدا یہ تو نور کا پتلا اور بزرگ وپاکیزہ فرشتہ ہے۔

یہ منظر اور گفتگو دیکھ کر عزیز کی بیوی نہایت محظوظ ہوئی، اور اپنی کامیابی اور ان کی شکست پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگی: یہی تو وہ غلام ہے جس کے عشق ومحبت کے بارے میں تم نے مجھے مطعون کر رکھا ہے، اور تیر ملامت کا نشانہ بنایا ہوا ہے، مجھے آفرین دیدو کہ میں شب وروز اس کے ساتھ ہوتے ہوئے برداشت کر رہی ہوں، تم نے تو ایک جھلک دیکھنے پر اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا۔

اس پر سب نے اس کے صبر وبرداشت کی تعریف کی، اور یوسف علیہ السلام سے کہنے لگیں کہ یہ تمہاری محسن اور مالکہ ہے، تم اس کی ہر بات کو مانو، اور اسے خوش رکھو۔ ساتھ انہوں نے زلیخا سے بھی درخواست کی کہ اس کی ضیافت

میں ہمارا سب کا حق ہے، براہ کرم باری باری سے اس کو ہم سب کے پاس بھیجا کرو تا کہ ہم سب اس سے استفادہ کریں، یہی معنی ہے آیت کریمہ کا:

﴿رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ﴾ جمع کے صیغہ کے ساتھ، پھر نو دس سال بعد جب شاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل سے نکل جانے اور اپنے پاس آنے کا حکم دیدیا تو حضرت یوسف علیہ السلام بغیر صفائی حاصل ہونے کے قاصد سے صرف عزیز کی بیوی کے بلانے کا نہیں کہا، بلکہ یہ فرمایا:

﴿قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ﴾ کیونکہ یک نہ شد دو شد، پہلے صرف امرأۃ العزیز کے نرغے میں تھے، اب پوری ٹیم اس سے مطالبہ کرنے لگی تھی، تب ہی تو بادشاہ نے پوری جماعت کو صفائی دینے کے لئے طلب کیا، اور فرمایا کہ بتاؤ تمہاری یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا ضد تھی؟ اب سب نے بیک زبان جواب دیا:

﴿قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی قسم! ہم نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی، اور زلیخا نے بادشاہ کے سامنے عورتوں کے مجمع میں صاف صاف اقرار کیا کہ اس سے پہلے میں نے ہی اپنی خواہش پوری کرنے کا اس سے مطالبہ کیا تھا، مگر:

﴿فَاسْتَعْصَمَ﴾ اس نے انکار کیا۔ اور جب بادشاہ کی مجلس میں پہنچ گئی تو وہاں بھی کہا:

﴿قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ٘ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ تو پہلی مرتبہ ایک عورت کا مسئلہ رہا، اب پوری جماعت مطالبہ پر اتر آئی، اور صاف صاف کہنے لگیں، پریشر ڈالتے ہوئے: اے یوسف! تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں: یا ہماری بات مانو یا جیل جانا منظور کرو۔ انہوں نے جیل جانے کو منظور فرمایا، اور اس لئے اللہ تعالیٰ سے بھی دعا کی جیسے آئندہ مذکور ہوگا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مصیبت طلب کرنا بہتر نہیں، پس حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل کی مصیبت کے لئے خود دعا کی اور اسے کیوں طلب کیا؟ یہ ہے اعتراض۔

جواب نمبر (۱): جیل ایک دنیوی مصیبت ہے، جس میں کوئی دینی نقصان نہیں ہے، بلکہ بہت سے فوائد ہیں، جبکہ مصری عورتوں کی فرمائش پوری کرنے میں دینی اور اخروی نقصان زیادہ ہے، اس لئے دنیوی مصیبت کو دینی مصیبت پر ترجیح دی گئی، اور یہی شان نبوت کا خاصہ ہے۔

جواب نمبر(۲): آیت کریمہ میں عافیت اور مصیبت سے خلاصی کے لئے دعاء ہے، اور بصورت عدم قبولیت پھر جیل کے لئے دعا ہے۔

جواب نمبر(۳): جیل اگر چہ ایک مصیبت ہے مگر اس میں عافیت کا پہلو بھی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام مسلسل پریشانیوں سے گزرے، نہایت مایوس ہوئے، عزیز کی بیوی کا واقعہ ان کے اعصاب پر بڑا نا قابلِ برداشت بوجھ ثابت ہوا، وہ یہی چاہتے تھے کہ لوگوں سے کسی طرح دور رہوں، اور کسی خلوت میں بیٹھ کر ذکرِ الٰہی میں مصروف رہوں، اور جس گھر میں مجھے جس عورت سے واسطہ پڑا وہ گھر میرے لئے جیل خانہ سے کئی گنا زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے، لہٰذا میرے لئے جیل خانہ بہتر ہی رہے گا، عبادت اور تبلیغ اور دینی امور وغیرہ بخوبی انجام پائیں گے، اور یہی انہیں کنویں کے زمانہ میں بھی وحی کے ذریعہ معلوم ہوا تھا، چنانچہ دعا کی:

﴿رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ﴾ اے میرے ربّ! یہ عورتیں مجھے جس کام کی دعوت دے رہی ہیں اس کے مقابلے میں مجھے جیل جانا محبوب ہے، اور اگر آپ مجھ سے ان کی چالبازی دفع نہیں کریں گے تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرما کر عزیز مصر کے دل میں ڈال دیا اور اس نے بھی اپنی سلامتی اور نیک نامی اسی میں پائی کہ ان کے جیل جانے کے بعد رفتہ رفتہ لوگوں کے دلوں سے یہ بدنام واقعہ محو ہو جائے گا، پھر مستقبل کے لئے آئندہ کوئی لائحہ عمل طے کرلیں گے، چنانچہ بامرِ الٰہی آپ علیہ السلام کو جیل بھیج دیا گیا تا کہ ہر قسم کی بدنامی اور غلط افواہیں اور چرچے بند ہوں۔

.......❁.......❁.......❁.......

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ ۚ وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ كَیْدَهُنَّ اَصْبُ
اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۳۳﴾ فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَیْدَهُنَّ ؕ اِنَّهٗ هُوَ
السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۴﴾ ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِیْنٍ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: یوسف نے کہا: اے میرے ربّ! یہ عورتیں مجھے جس کام کے لئے دعوت دے رہی ہیں اس کے مقابلہ میں مجھے جیل جانا محبوب ہے، اور اگر آپ مجھ سے ان کی چالبازی کو دفع نہ کریں گے تو میں ان کی طرف مائل ہو

جاؤں گا، اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا ﴿۳۳﴾ سو ان کے ربّ نے ان کی دعا قبول کر لی، سو عورتوں کی چالبازی کو یوسف سے ہٹا دیا، بلاشبہ وہ سننے والا ہے، جاننے والا ہے ﴿۳۴﴾ پھر نشانیاں دیکھنے کے بعد ان لوگوں کی سمجھ میں یہ آیا کہ ایک وقت تک یوسف کو جیل میں رکھیں ﴿۳۵﴾

معارف ومنازل

غور کیجئے! عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کونسی راہ اختیار نہیں کی جس سے یوسف علیہ السلام کو رام کیا جا سکے، پھر اس میں ناکامی کے بعد اس نے دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی، اور انہوں نے اپنے ممکنہ داؤ گھات یوسف علیہ السلام پر استعمال کی، مگر پھر بھی ناکامی رہی، اب آخری درجہ اور سب سے بڑا حربہ یہ تھا کہ اس نے دھمکی دی کہ یوسف علیہ السلام اس میں شادکامی کریں، ورنہ وہ قید خانہ میں ڈالے جائیں گے۔ ایسی حالت میں ایک باخدا انسان صاحبِ عزیمت و استقامت ہستی اور خوفِ خدا کو تمام کائنات کے غیظ و غضب پر غالب رکھنے والا انسان اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا تھا کہ خدایا میں اس عملِ بد کے مقابلہ میں زندان کو ترجیح دیتا ہوں، مجھے قید و بند سب منظور ہے، مگر تیری نافرمانی منظور نہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قید کی طلب ہے، زندان کے شوق کا اظہار ہے، مصیبت اور بلاؤں کی دعوت ہے؟ ہر گز نہیں، بلکہ لطیف پیرایہ میں وہ کہا جا رہا ہے جو اعلانِ حق اور خداترسی کا صحیح درجہ ہے۔ یوسف علیہ السلام نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ عزیز کی بیوی کو مخاطب کرے، یا مہمان عورتوں کو اپنی گفتگو میں تخاطب کا موقع دے، بلکہ انہوں نے مَنِ ابْتَلٰی بِبَلِیَّتَیْنِ فَلْیَخْتَرْ اَھْوَنَ ھُمَا پر عمل کیا۔

اللہ تعالیٰ شانہ کا حکم ہے کہ میرا بندہ اگر حلال و حرام میں مبتلا ہو تو حلال کو اختیار کرے، اور اگر دو حلال یا دو حرام کے امتحان میں مبتلا ہو تو جو کم اور آسان ہو اسے اختیار کرے، یہاں ایک طرف قید و بند اور سزا ہے، دوسری طرف گناہ کا ارتکاب اور عیش و عشرت ہے، اس وقت عام مسلمان کو بھی یہ حکم ہے کہ گناہ کو چھوڑ کر قید و بند کو ترجیح دے۔ یوسف علیہ السلام جیسے پیغمبر کے لئے کیسے ممکن ہوگا کہ قید و بند کے بدلے گناہ کو ترجیح دیدے؟ اس کے علاوہ اس قید و بند کی صعوبتوں کے بعد ہی اس کے لئے تمام راحتوں اور برکتوں کے اجراء کا وعدہ ہے۔

فارسی کا مقولہ ہے: ”بسوزد کہ بسازد“ کوئی کھانے کی چیز جب تک آگ کی حرارت کو برداشت نہ کرے اس میں کھانے کی قابلیت کیسے پیدا ہوگی؟ اسی طرح بزرگوں کا مقولہ ہے: رُبَمَا کَمِنَتِ الْمِنَنُ فِی الْمِحَنِ۔ اللہ

تعالیٰ کے اکثر احسانات وکرم مصائب کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی ساری زندگی اسی مقولہ کی ہو بہو مصداق ہے۔ کنویں سے لے کر بادشاہت تک تمام زندگی محنتوں، غموں کی نذر ہوگئی، اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے ان گمراہ اور بدقماش عورتوں پر یہ ظاہر کردینا ضروری سمجھا کہ جس طرح ان کے تمام مکر وفریب، خوشامد اور چاپلوسی ناکام رہی، اسی طرح ان کی دھمکی اوران کا عذاب بھی میرے ارادہ حق اور استقامت وخداترسی کو متزلزل یا باطل نہیں کرسکتا۔

یہ عورت کہتی ہے کہ یا مجھ کو شادکام کریں، ورنہ جیل خانہ جائیں، تو میں جیل خانہ کو اس کے ارادۂ بد کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہوں، ایک نہیں لاکھوں بار تا کہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لئے ایک نمونہ اور مثال بن جائے کہ حق سبحانہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینا اس کے بندوں کا شعار ہی ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسانوں کی رضا وخوشنودی کے بدلے میں کائنات کے مالک کی حکم عدولی اور نافرمانی کروں؟ کیونکہ جیل پھر بھی جیل ہے، اس میں لوگ بدستور زندہ رہ رہے ہیں، اگر میرے بدن کے اعضاء ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر مجھے اس کے بدلے پورے اعزاز وجاہ کی پیشکش ہو تو میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کے عوض موت اور اپنے وجود ختم کرنے پر محض تیار نہیں بلکہ فخر محسوس کرتا ہوں، میں ملّتِ ابراہیمی کا امین ہوکر کیسے برداشت کرسکتا ہوں کہ حسین عورتوں کے گناہ کی پیش کش قبول کرتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے معبودِ برحق کے حکموں کے خلاف عمل کروں؟ جس کی خاطر انہوں نے آگ کو سینے سے لگایا تھا، میں بھی جیل کو سینے سے لگانے کے لئے تیار ہوں۔ بالفرض اگر جیل کی بجائے مجھے بھی آگ کی دھمکی ملے تو سنتِ ابراہیمی کے زندہ کرنے پر فخر کرتے ہوئے قبول کرتا ہوں۔

یک جان بستاند وصد جان دہد ☆ ہرچہ در وہمت نیاید آن دہد

اب اندازہ لگایئے کہ اس اعلانِ حق اور اظہارِ استقامت کا اس دعا سے کیا تعلق جو ایک شخص خواہ مخواہ اپنے لئے مصیبت کا طلبگار ہو، بلکہ مردانِ خدا کا یہی ہر زمانہ شعار رہا ہے، اور قیامت تک رہے گا۔ یہ عزم واستقامت ہر مدّعی حق کو حاصل نہیں ہوتا، یہ یا تو انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے، یا اُن رجال کی رگ کے جواُن کے صحیح اور حقیقی وارث ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں کہ کنویں کو برداشت کررہے ہیں، اور جیل کی کال کوٹھڑی کو ترجیح دے رہے ہیں، ان کے بھائی بھی تو نبی زادے تھے، جیل تو کیا وہ یوسف علیہ السلام کے حق میں باپ کی محبت کو بھی برداشت نہ کرسکے، جس کے عوض بہت سے کبائر کے مرتکب ہوئے، لہٰذا اللہ پاک نے منظوری دیدی اور دعا قبول ہوئی، جیل کا دروازہ بھی کھل گیا۔

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب ☆ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

یوسف علیہ السلام کی صداقت کی آیات ونشانیاں واضح ہوگئیں، اور عورتوں کا مکر وحیلہ اور تمام پوشیدہ راز کھل گئے، عزیز مصر کی بیوی مدعی ہے، پھر مدعیوں کا دائرہ آہستہ آہستہ وسیع تر ہوا، شاہی خاندان اور عمائدین کی بیگمات سب نے مل کر مدعیوں کی فہرست میں نام لکھوا لئے۔ دوسری جانب مدعیٰ علیہ ہیں جن کی عمر سولہ سال ہے، نہ باپ معلوم نہ ماں، نہ پورے دار الحکومت میں اس کی شناخت وتعارف ایک زرخرید گمنام غلام ہے، اور عدالت کا سربراہ قطفیر یا قطفیر یا قوطیفار جو بھی ہو یہ شخص مدعیہ عورت کا شوہر ہے، مذہب کے اعتبار سے سارے بت پرست کافر ہیں، جبکہ مدعیٰ علیہ ان کا دشمن مسلمان ہے (کافر مسلمان کے دشمن ہی تو ہیں) اور مقدمہ کسی مال وجائیداد کا بھی نہیں، بلکہ سربراہ عدالت کے اپنے گھر اور ننگ وعزت کا ہے، اب کیا ہوگا؟

مقامِ عبرت:

اگر یہ مقدمہ اسی نوعیت کے ساتھ کا فرانہ سہی کسی مسلمان ملک کے سربراہ کی بیوی نہ سہی خادمہ وکنیز کا ہوتا تو انصاف سے بتاؤ اس کا فیصلہ کیا اور کیسے ہوتا؟ مگر ایسا نہیں ہوا جیسے ہمارے ناقص اور اسلام سے باغی ذہن سوچتے ہیں، بلکہ یہ فیصلہ ہوا کہ عمر بھر نہیں چند سال کے لئے یوسف علیہ السلام کو جیل میں رکھو۔ اور اے قرآن کے نام لینے والو! ذرا عبرت تو سیکھو اور دیکھو، اس بنی بر انصاف تاریخی فیصلے کا نتیجہ کیا ہوا؟ وہ یہ کہ صرف دس سال گزرنے کے بعد عدالت کا سربراہ قطفیر اور اس کی بیوی راعیل ملک کا بادشاہ ریان بن ولید یا ریان بن اسید، باقی عمائدین اور وزراء اور ان کی مدعیہ بیگمات سب نے اسلام قبول کیا، اور کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ یوسف صدیقُ اللّٰهِ پڑھا۔ یہ سب حضرت یوسف علیہ السلام کی برکت، تقویٰ، بیمثال استقامت اور عصمت وامانت کے طفیل ہوا۔ عَلَيْهِ وَعَلٰى نَبِيِّنَا الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ

سیدنا یوسف علیہ السلام رعمیس کی جیل میں:

جس مجلس شوریٰ کا سربراہ عزیز مصر تھا اس نے فیصلہ کیا کہ فی الحال مصلحت اسی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اگر چہ مجرم نہیں مگر اسے چند وقت یعنی غیر معینہ مدت کے لئے جیل میں رکھا جائے، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بدنامی کا داغ جو کہ پورے شہر میں مشہور ہو چکا ہے وہ دھل جائے گا، اور اس کو جیل میں رہ کر اپنی اصلاح کا بھی موقع ملے گا، اور عوام ان کے جیل جانے سے یہ اندازہ لگائیں گے کہ وہ مجرم ہیں، اور خواتین بے گناہ ہیں، اس طرح شاہی خاندان کی عورتوں کا وقار مجروح نہیں ہوگا، اور ان کی عزت بھی بچ جائے گی، اور ان کی اشک شوئی بھی ہو جائے گی۔

اور زلیخا کا یہ بھی خیال تھا کہ یوسف علیہ السلام قید کی سختی سے تنگ ہوکر معافی مانگیں گے، اور میرے ہوجائیں گے، اور آئندہ مجھے اپنی محسنہ سمجھ کر میرا ہر مطالبہ پورا کریں گے، گویا وہ اپنی خام خیالی میں اس طرح غلط فیصلے کرتے رہے، ان کو نبی اور نبوت کے مقام کا ذرہ برابر علم حاصل نہ تھا۔

یوسف علیہ السلام جیل میں:

جب یہ حسن و جمال کے مالک جیل پہنچے اور ایک بے گناہ کو خطا کار اور معصوم کو مجرم بنادیا گیا تاکہ عزیز کی بیوی فضیحت و بدنامی سے بچ جائے، اور وہ مجرم ہونے سے پاک ہوجائے، جب آپ علیہ السلام جیل میں وارد ہوئے تو جیل پھر جیل نہ رہی، وہ ایک عبادت خانہ، درسگاہ اور خانقاہ بن گئی، جہاں آپ علیہ السلام کے علمی اور عملی جواہر پوری جیل میں روزِ روشن کی طرح پھیل گئے، اور قید خانہ کا افسر بالا جیلر جو تھا وہ آپ علیہ السلام کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگیا، اور جیل کا تمام انتظام وانصرام آپ علیہ السلام کے سپرد کیا، اور کہنے لگا: آپ جیسے پاکباز، راست گو، شریف النفس ہستی کی یہاں آمد میری سمجھ سے بالاتر ہے، اگر میں بااختیار ہوتا تو آپ کو فوراً رہائی دے دیتا۔

اکثر دیکھا گیا ہے اور تجربہ بھی ہے کہ بڑے سے بڑے شریر لوگ جب جیل میں جاتے ہیں تو نرم ہوجاتے ہیں، اور بات بھی سنتے ہیں اور قبول بھی کرتے ہیں، خاص کر جو شخص ان کے ساتھ احسان وخیر خواہی کے ساتھ پیش آئے، تو اس کی بڑی قدر کرتے ہیں، اس بنا پر جب آپ علیہ السلام نے داروغہ جیل کی وجہ سے جیل میں خود مختاری حاصل کی تو جیلیوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی خبر گیری، بیمار پرسی، تسلی دینا وغیرہ اصلاحی کام شروع کئے، تو قیدیوں میں اور ان کے رشتہ داروں میں آپ علیہ السلام کی شہرت بہت زیادہ ہوگئی، اور آپ علیہ السلام کی ہمدردیوں کا خوب چرچا ہونے لگا۔

آپ علیہ السلام کی عبادت اور ساری رات کی عبادتوں اور درگاہ الٰہی میں رو رو کر الحاح وزاری اور نجات وتقویٰ اور روا داریوں سے متأثر ہوکر کئی لوگ مشرف باسلام ہوئے، انہی میں سے ایک یہی جیل کا افسر بالا بھی تھا، کیونکہ آپ علیہ السلام کی آمد سے ایک طرف مجموعی ماحول کی کایا پلٹ گئی تو دوسری طرف جیل کے قیدیوں کا ماحول اور رنگ بدل گیا۔

چو آن دل زندہ در زندان در آمد ☆ بہ جسم مردہ گوئی جان در آمد

در آن محنت سرا افتادہ جوشی ☆ بر آمد زان گرفتاران خروشی

[مثنوي]

اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ علیہ السلام کے ظاہری حسن وجمال کے ساتھ جب آپ علیہ السلام کے باطنی تقویٰ وکمالات

کے رموز واسرار ظاہر فرمائے تو آپ علیہ السلام نے جیل والوں کو دعوت وتبلیغ کے انوار وبرکات سے خوب نوازا، اور انہیں خوابوں کی صحیح اور درست تعبیر بھی بتائی، جن میں سے نمونہ کے طور پر دو خوابوں کا آئندہ تذکرہ آنے والا ہے۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۳۶

ترجمہ: اور یوسف کے ساتھ دو جوان جیل میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میں خواب میں اپنے کو دیکھ رہا ہوں کہ شراب نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا کہ میں خواب میں اپنے کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے پرندے کھا رہے ہیں، آپ ہمیں اس کی تعبیر بتا دیجئے، بلاشبہ ہم آپ کو نیک آدمیوں میں سے سمجھ رہے ہیں ۳۶

معارف ومنازل

حسن اتفاق سے یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو اور نوجوان قید خانے میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک بادشاہ مصر کا ساقی تھا، اور دوسرا شاہی باورچی خانہ کا داروغہ تھا، ان دونوں پر الزام تھا کہ وہ دونوں بادشاہ کو زہر کھلا کر مروانا چاہتے تھے، وہ اس طرح کہ مصر کے کچھ بڑے سرداروں اور عمائدین نے بادشاہ کو قتل کروانے کا منصوبہ بنایا تھا، ان لوگوں نے ساقی یعنی بادشاہ کے شراب پلانے والے اور شاہی باورچی خانہ کے داروغہ کو استعمال کرنا چاہا، منصوبہ بنانے والوں نے زہر لا کر ان کے حوالہ کیا، اور انہیں رشوت دے کر آمادہ کیا کہ شراب اور کھانے میں زہر ملا کر بادشاہ کو پلائیں، ساقی نے ان کے کہنے پر عمل نہیں کیا، اور خباز نے کھانے میں زہر ملا کر پیش کیا، تو ساقی نے کھانے سے پہلے بادشاہ کو اطلاع دی، اس پر دونوں گرفتار ہوئے اور جیل بھیج دیئے گئے۔

تحقیقات کے بعد باورچی مجرم پایا گیا تو اسے سزائے موت دے دی گئی، اور ساقی نے چونکہ شراب میں زہر نہیں ملایا تھا لہٰذا وہ بری ہو گیا۔ اب یہ دونوں پریشانی کے عالم میں حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا اپنا خواب بیان کیا، ایک نے خواب یہ دیکھا کہ میں انگور نچوڑ رہا ہوں، یعنی شراب تیار کر رہا ہوں، یہ ساقی تھا۔ دوسرے (باورچی) نے کہا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے جا رہا ہوں اور ان روٹیوں میں سے اڑتے ہوئے پرندے کھا رہے ہیں، تو انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ آپ ہمیں اچھے

نیک آدمی معلوم ہوتے ہیں، لہٰذا ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر بتادیجئے، آپ علیہ السلام نے انہیں تعبیر بتانے کا وعدہ کیا، مگر پہلے انہیں توحید کی تبلیغ کی۔

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِۦٓ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِۦ قَبْلَ أَن يَأْتِيَكُمَا ۚ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِى رَبِّىٓ ۚ إِنِّى
تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِٱللَّهِ وَهُم بِٱلْـَٔاخِرَةِ هُمْ كَٰفِرُونَ ﴿٣٧﴾ وَٱتَّبَعْتُ مِلَّةَ ءَابَآءِىٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْحَٰقَ
وَيَعْقُوبَ ۚ مَا كَانَ لَنَآ أَن نُّشْرِكَ بِٱللَّهِ مِن شَىْءٍ ۚ ذَٰلِكَ مِن فَضْلِ ٱللَّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى ٱلنَّاسِ وَلَٰكِنَّ
أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٨﴾ يَٰصَٰحِبَىِ ٱلسِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلْوَٰحِدُ ٱلْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾
مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِۦٓ إِلَّآ أَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ۚ إِنِ
ٱلْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا۟ إِلَّآ إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ ٱلدِّينُ ٱلْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٠﴾

ترجمہ: یوسف نے کہا: جو کھانا تمہیں دیا جاتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمہیں خواب کی تعبیر بتادوں گا، یہ اس علم میں سے ہے جو میرے ربّ نے مجھے سکھایا ہے، بلاشبہ میں نے ان لوگوں کے دین کو چھوڑ رکھا ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے، اور وہ آخرت کے منکر ہیں ﴿٣٧﴾ اور میں نے اپنے باپ دادوں ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے دین کا اتباع کیا ہے، یہ ہمارے لئے کسی طرح بھی درست نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، یہ ہم پر اور دوسرے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اور لیکن بہت سے لوگ شکر ادا نہیں کرتے ﴿٣٨﴾ اے میرے جیل کے دو ساتھیو! کیا بہت سے معبود جدا جدا بہتر ہیں، یا اللہ تعالیٰ بہتر ہے؟ جو تنہا ہے زبردست ہے ﴿٣٩﴾ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا جن لوگوں کی عبادت کرتے ہو وہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے تجویز کر لئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی کوئی سند نازل نہیں فرمائی، حکم بس اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہ سیدھا راستہ ہے، اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿٤٠﴾

معارف ومنازل

حضرت یوسف علیہ السلام صرف یہ نہیں کہ نبی زادہ تھے، بلکہ خود بھی درجۂ نبوت پر فائز تھے، اسلام کی تبلیغ کا ذوق وشوق ان کے ریشہ ریشہ میں پیوست اور موجزن تھا، اور دین کی اشاعت ان کا نصب العین تھا، گو کہ وہ قید

میں تھے مگر مقصد حیات اور فرض منصبی کیسے بھول جاتے؟ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ انہیں ہر طرف سے اس امر پر مجبور کئے ہوئے تھا کہ جوں ہی کوئی موقع دستیاب ہو وہ فوراً تبلیغ اسلام اور توحید الٰہی کا سلسلہ اور تعلیم شروع کریں۔

انہوں نے دونوں قیدیوں کی آمد کو غنیمت جانتے ہوئے ان کو محبت اور نرمی سے سمجھانا شروع کیا، اور کہا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے جو باتیں مجھے تعلیم فرمائی ہیں منجملہ ان کے یہ علم بھی اس نے عطا فرمایا ہے میں اس سے پہلے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے تمہارے خوابوں کی تعبیر تمہیں بتادوں گا، مگر میں تم سے ایک بات کہتا ہوں ذرا اس پر بھی غور کرو اور سمجھو، یقین کرو، وہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کی ملّت کو اختیار نہیں کیا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے، اور آخرت کے بھی منکر ہیں، میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی ملّت کی پیروی کی ہے، ہم ایسا نہیں کرسکتے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہے جو اس نے ہم پر اور لوگوں پر کیا ہے، لیکن اکثر لوگ اس عظیم نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اے دوستو! تم نے اس پر بھی غور کیا کہ جدا جدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ تعالیٰ کا جو یکتا اور سب پر غالب ہے؟ تم اس کے علاوہ جن کی عبادت کرتے ہو اُن کی حقیقت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جن کو تمہارے باپ دادوں نے گھڑلیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے کوئی سند نہیں اتاری۔ اکثر علماء کے نزدیک آیت:

﴿قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا﴾ کا مطلب اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ تمہارے گھروں سے جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے اس کی مقدار، نمونہ، وقت اور دوسری کیفیت بتادیتا ہوں، گویا آپ علیہ السلام کا یہ معجزہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے کی طرح تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا: ﴿وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ﴾ [آل عمران:۴۹] (اور میں تم کو خبر دوں گا اس چیز کا جو تم کھاتے ہو اور ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں)۔

آگے یہی تصریح ہے کہ میرا یہ سب کچھ بتانا اور تمہارے خوابوں کی تعبیر تمہیں بتانا یہ کسی سحر و جادو اور علم نجوم یا کہانت پر مبنی نہیں، بلکہ اس کی بنیاد اور سرچشمہ علم وحی ربانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے سکھایا اور بتایا ہے۔ میرا مسلک و مشرب ان لوگوں کا نہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے، بلکہ میں اس برحق ملت پر ایمان رکھتا ہوں جو میرے باپ دادوں کی ملت ہے جس میں صرف ایک ہی پروردگار کا تصور ہے جو تنہا تمہاری ساری حاجات پوری کرنے پر قادر ہے، تم لوگوں نے یا عام انسانوں نے ہر ہر حاجت کے لئے الگ الگ معبود جو تجویز کئے ہیں، وہ ہرگز صحیح اور فائدہ مند

نہیں، یہ سارے باطل، بے جاں، بے حرکت بت ہیں جو دیکھنے سننے اور نفع ونقصان اور حاجت برآری سے عاجز ہیں، اور انہوں نے تمہاری تخلیق نہیں کی ہے، بلکہ تم نے اپنے ہاتھوں سے ان کی تخلیق کی ہے، وہ کیسے معبود بن سکتے ہیں؟ جبکہ وہ خود عاجز مخلوق ہیں۔

جن کی عبادت بھی کرتے ہو ان کی حقیقت اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جن کو تمہارے باپ دادوں نے گھڑ لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ہرگز کوئی سند نہیں اتاری، حکومت تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، اس نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر آدمی نہیں جانتے۔ یہ یاد رکھیں کہ اس طرح کا وعظ حضرت یوسف علیہ السلام ہر وقت قید خانے میں کرتے رہتے تھے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ
فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱

ترجمہ: اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا، اور دوسرے کو سولی پر چڑھایا جائے گا، اور اس کے سر میں سے پرندے کھا جائیں گے، جس بات کے بارے میں تم معلوم کر رہے تھے اس کا فیصلہ ہو چکا ہے ۝۴۱

معارف ومنازل

رشد وہدایت کے اس پیغام کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں جوانوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر سنائی، فرمایا: دیکھو! تم میں سے ایک شخص اپنے آقا کو شراب پلائے گا، یعنی وہ ساقی جیل سے رہا ہو کر واپس اپنی ڈیوٹی پر چلا جائے گا، اس کے علاوہ جو دوسرا آدمی ہے اس کو سولی دی جائے گی، تم نے جو خواب دریافت کئے ان کی یہی تعبیر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کی تعبیر دے دی تو وہ کہنے لگے: نہیں نہیں، ہم نے کوئی خواب نہیں دیکھا، ہم تو یوں ہی دل لگی کے طور پر سوال لے کر آئے تھے، اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ﴾ جس کے بارے میں تم سوال کر رہے تھے اب تو وہی فیصلہ ہوگا

جوتعبیر کے ذریعہ بتایا جاچکا ہے۔ [روح المعاني، مظهري وغيره]

اس بناء پر بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص جھوٹا خواب بنا کر کسی تعبیر کے جاننے والے شخص سے تعبیر لے گا تو تعبیر کے مطابق واقع ہو جائے گا، اور جھوٹ بنانے کی اسے سزا مل جائے گی۔ [ابن کثیر]

کیونکہ خواب جب نبوت کا (۴۶) واں جزء قرار پایا تو اس کی بے احترامی قابل مؤاخذہ ہوگی۔ واللہ اعلم

وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ ﴿٤٢﴾

ترجمہ: اور جن دو جوانوں نے خواب کی تعبیر دریافت کی تھی ان میں سے جس شخص کے بارے میں یوسف نے گمان (یقین) کیا کہ وہ رہا ہونے والا ہے اس سے کہا کہ تو اپنے آقا کے سامنے میرا تذکرہ کر دینا، پھر اس شخص کو شیطان نے اپنے آقا سے تذکرہ کرانا بھلا دیا، سو یوسف جیل میں چند سال رہے ﴿۴۲﴾

معارف ومنازل

حضرت یوسف علیہ السلام جب خواب کی تعبیر سے فارغ ہو گئے تو آپ علیہ السلام کو یقینی طور پر یہ اندازہ ہو گیا کہ تین دن کے اندر ساقی کی رہائی ہو جائے گی، اور یہ چونکہ بے گناہ ہے تو اپنے آقا کے پاس پہنچ کر حسب سابق ساقی بنے گا تو اس سے فرمانے لگے:

﴿اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ﴾ اس سے یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ بادشاہ سے کہنا کہ ایک بے قصور اور بیگناہ آدمی اس طرح مجرم بنا کر قید زندان میں ڈال دیا گیا ہے، اور اس تفسیر کے بعد وہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ اگرچہ مصائب اور ضرورت کے موقع پر انسان کا انسانوں سے مدد لینا اور استعانت طلب کرنا حق پرستی اور خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے تاہم بمصداق حسنات الأبرار سيات المقربين نیکوں اور اچھے لوگوں کی بعض بھلائیاں مقربین بارگاہ الٰہی کے شایان شان نہیں ہوتیں۔

اس لیے بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام جیسی ہستی کے لئے یہ موزوں نہ تھا کہ وہ اللہ

تعالیٰ پر بھروسہ کے ساتھ دنیاوی اسباب پر بھروسہ کریں، اور بادشاہ سے مدد طلب کریں، اس لئے خدا تعالیٰ کا فیصلہ یہ ٹھہرا کہ ان کو ابھی چند سال اور قید خانے میں رکھا جائے، اور ساقی کو شیطان نے ایسا بھلا دیا کہ وہ یوسف علیہ السلام کا کچھ بھی ذکر نہ کرسکا، اور اسے یاد تک نہ آیا۔

علامہ ابن جریر اور بغوی رحمۃ اللہ علیہما نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ "فَأَنْسَاهُ" کی ضمیر کو یوسف علیہ السلام کی طرف راجع کرتے ہیں، اور یہ معنیٰ کرتے ہیں کہ شیطان نے یوسف علیہ السلام کو بھلا دیا۔ ان کا بادشاہ کی مدد کے لئے ساقی سے کہنا بہتر اور موزوں نہیں ہے۔ مگر حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس توجیہہ کو سختی کے ساتھ رد کردیا، اور اس تفسیر کو غلط ثابت کردیا، اور یہ اسرائیلیات میں سے ہے۔

اس تفسیر کے برعکس بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ﴾ کہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ ایک ایسا شخص ہم کو اس طرح دین حق کی تلقین کرتا ہے، اور وہ اپنی ملّت ہماری ملّت سے جدا بتاتا ہے، اور اس پر بہترین دلائل دیتا ہے، اور تفسیر کی صحت کے لئے دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر قرآن کریم میں یوسف علیہ السلام اور ان دو شخصوں کے درمیان صرف دو ہی باتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے: ایک دعوت وتبلیغ اسلام کا، اور دوسرے خواب اور اس کی تعبیر کا، تیسری کسی بات کا اشارہ تک نہیں، یعنی کسی اشارہ یا کنایہ سے بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان ہر دو اشخاص کے سامنے اپنا قصہ بیان کیا ہو، اور ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہو، پھر بغیر ذکر سابق کے اس طرح:

﴿اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ﴾ میں اجمال کے کیا معنیٰ؟ علاوہ ازیں اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے زندان سے باہر آنے کی طلب وجستجو کا یہ حال تھا تو جب ساقی کے یاد آنے اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر دینے کے بعد بادشاہ نے ان کی رہائی کا حکم دیدیا، تو کیوں فوراً باہر نہ نکل آئے، اور تفتیش حال کا مطالبہ کیوں کیا؟ یہ تو رہائی کے بعد بھی ہوسکتا تھا، اور عصمت اور بیگناہی کا فیصلہ باہر آکر بھی کیا جاسکتا تھا۔

آیات کی ترتیب ونظام کے پیش نظر یہی تفسیر راجح اور مبنی برصواب ہے کہ ﴿اذْكُرْنِي﴾ میں انہوں نے اپنے بارے میں نہیں، بلکہ دین حق کے بارے میں پیغام بھیجا، اس امید پر کہ شاید بادشاہ اس طرف متوجہ ہو، یا اس سلسلے میں بالواسطہ یا بغیر واسطہ میرے ساتھ رابطہ کرنے کا فکرمند ہو، اور میرے ذمہ جو تبلیغ کا حق ہے ایک حد تک وہ بھی ادا ہو۔

وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّیْۤ اَرٰی سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ؕ
یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِیْ فِیْ رُءْیَایَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْیَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِیْلِ
الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾ وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾
یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ
یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ
فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ
لَهُنَّ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

ترجمہ: اور بادشاہ نے کہا کہ بیشک میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ سات گائیں موٹی ہیں جنہیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور سات بالیں ہری ہیں اور ان کے علاوہ خشک بالیں ہیں، اے درباروالو! مجھے میرے خواب کے بارے میں جواب (یعنی تعبیر) دو اگر تم خواب کی تعبیر دیتے ہو﴿۴۳﴾ وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ تو یوں ہی خیالی خواب ہیں، اور ہم خیالی خوابوں کی تعبیر نہیں جانتے ہیں﴿۴۴﴾ اور وہ شخص بول اٹھا جو دو قیدیوں میں رہا ہوا تھا، اور اسے ایک مدت کے بعد یاد آگیا، کہ: میں تمہیں اس کی تعبیر سے باخبر کردوں گا، لہٰذا تم لوگ مجھے بھیج دو﴿۴۵﴾ اے یوسف! اے سچے! ہمیں ایسی سات موٹی گایوں کے بارے میں جواب دیجئے جنہیں سات دبلی گائیں کھائے جارہی ہیں، اور سات ہری بالوں اور ان کے علاوہ خشک بالوں کے بارے میں بتائیے تاکہ میں ان لوگوں کے پاس واپس ہو جاؤں، امید ہے کہ وہ بھی جان لیں گے﴿۴۶﴾ یوسف نے کہا کہ سات سال لگاتار (متواتر) کھیتی کرو گے، پھر جو تم کھیتی کاٹ لو تو اسے اس کی بالیوں ہی میں چھوڑے رکھنا، مگر تھوڑا سا مال جس میں سے تم کھاتے رہو﴿۴۷﴾ پھر اس کے بعد سخت سات سال آئیں گے جو اس سب کو کھا جائیں گے جو تم نے ان کے لئے پہلے سے بچا کر رکھا ہوگا، بجز اس کے جو تم چھوڑو گے﴿۴۸﴾ پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی اور اس میں رس نچوڑیں گے﴿۴۹﴾

معارف ومنازل

حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ واقعہ مصر کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے، یہ شاہی خاندان نسلی اعتبار سے ”عمالقہ“ میں سے تھا، عمالقہ کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے (طالوت وجالوت کے واقعہ میں)۔ مصر کی تاریخ میں ان کو

"ہکسوس" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے، اوران کی اصلیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ چرواہوں کی ایک قوم تھی، جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم عرب سے آئی تھی، اور دراصل یہ "عرب عاربہ" ہی کی ایک شاخ تھی۔ نیز قدیم قبطی اورعربی زبانوں کی باہمی مشابہت ان کے عرب ہونے کی مزید دلیل ہے۔[ترجمان القرآن]

اور مصر کے مذہبی تخیل کی بناء پر ان کا لقب "فاراع" (فرعون تھا) اس لئے کہ مصری دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور مقدس دیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھا، اور بادشاہ وقت اس کا اوتار اور "فاراع" کہلاتا تھا، یہی فاراع عبرانی میں فارعن اور عربی میں فرعون کہلایا، اور یوسف علیہ السلام کے زمانے کے فرعون کا نام عرب مؤرخوں نے ریان بن ولید بتایا ہے، اور مصری آثار میں آیونی کے نام سے موسوم ہے۔

بہرحال! ابھی یوسف علیہ السلام زندان ہی میں تھے کہ وقت کے فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں، اور سات دبلی، دبلی گائیں موٹی گایوں کو نگل گئیں، اور سات سرسبز وشاداب بالیں ہیں اور سات خشک۔ اور خشک بالیوں نے سرسبز کو کھالیا، اِن پر لپٹ کر ان کو قابو کرلیا اور فنا کردیا۔ بادشاہ صبح اٹھا تو پریشان خاطر تھا، اور اس عجیب وغریب خواب سے حیران تھا، فوراً دربار کے مشیروں سے (عموماً فرعونوں کے پاس دربار میں جادوگر اور کاہنوں کا ہجوم ہوتا تھا) اپنا خواب بیان کیا اور خواب کی تعبیر کا استفسار کیا۔ شاہی درباری بھی اس کو سن کر فکرمند اور پریشان ہوئے اور تردد میں پڑگئے، اور جب حل نہ کرسکے تو اپنی درماندگی اور بیچارگی کو چھپانے کے لئے کہنے لگے: بادشاہ سلامت! یہ خواب نہیں ہے، بلکہ پریشان کن خیالات ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں ہے، ہم سچے خواب کی تعبیر دے سکتے ہیں، لیکن پریشان کن خیالات حل نہیں کرسکتے۔

بادشاہ کو درباریوں کے جواب سے اطمینان نہ ہوا، اس اثناء میں ساقی کو اپنا خواب اور یوسف علیہ السلام کی تعبیر کا واقعہ یاد آگیا، اس نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی کہ اگر کچھ مہلت عنایت ہو تو میں اس کی تعبیر لاسکتا ہوں، مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دیجئے، بادشاہ کی اجازت سے وہ قید خانہ پہنچ گیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کا خواب سنایا، اور کہا کہ آپ اس کو حل فرمایئے، کیونکہ آپ سچائی اور تقدس کے پیکر ہیں، آپ ہی اس کو حل کرسکتے ہیں، اور کیا عجب ہے کہ جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے جب میں صحیح تعبیر لے کر ان کے پاس جاؤں تو وہ آپ کی حقیقی قدر و منزلت معلوم کرلیں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا کمال صبر واستقلال اور جلالت قدر کا اندازہ کیجئے، ساقی کو نہ ملامت کی، اور نہ

برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا، اور نہ عطاء علم میں بخل سے کام لیا، اور نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھے بے قصور سالوں سے زندان میں ڈالا ہے وہ اگر تباہ ہوجائیں اور اس خواب کا حل نہ پا کر برباد ہوجائیں تو اچھا ہے، ان کی یہی سزا ہے، مگر نہیں ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔

یہ ہے انبیاء کرام علیہم السلام کی شان اور ان کی شفقت کہ دشمنوں اور کافروں کی بربادی بھی نہیں چاہتے، بلکہ اسی وقت خواب کی تعبیر دی، اور از راہ لطف و کرم اپنی طرف سے اس سلسلہ میں صحیح تدبیر بھی بتلادی، اور ساقی کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

اس خواب کی تعبیر اور اس کی بناء پر جو کچھ تم کو کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ تم سات برس تک لگاتار کھیتی کرتے رہو گے، اور یہ تمہاری خوشحالی کے سال ہوں گے، جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آئے تو جس قدر مقدار تمہارے سال بھر کھانے کے لئے ضروری ہو اس کو الگ کردو، اور باقی غلہ کو ان کی بالیوں ہی میں رہنے دو تاکہ گل سڑنے اور گھن وغیرہ سے محفوظ ہو، اس کے بعد سات برس بہت سخت مصیبت کے آئیں گے، وہ تمہارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم کر دیں گے، اس کے بعد پھر ایک برس ایسا آئے گا کہ خوب پانی برسے گا، کھیتیاں ہری بھری ہوں گی، اور لوگ پھلوں سے اور دانوں سے عرق اور تیل بہتات کے ساتھ نکالیں گے۔

یعنی موٹی گائیں اور سبز بالیں خوش حالی کے سال ہیں، اور دبلی گائیں اور خشک بالیں خشک سالی کے برس جو خوشحالی کی پیداوار کو کھا جائیں گے۔ دیکھیں یہ قرآن عزیز کی فصاحت و بلاغت کا اعجاز ہے کہ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر خواب اور اس سے متعلق تدبیر کو ایک ہی جملہ میں ساتھ بیان کر دیا ہے، تاکہ کلام میں تکرار کی نوبت نہ آئے۔ ساقی نے یہ سب معاملہ بادشاہ کے سامنے جا کر انہیں سنایا، بادشاہ اس عجیب و غریب بیمثال تعبیر اور پھر اس کی تدبیر کو سن کر بڑے تعجب میں پڑ گیا، اور ان کے علم و دانش فراست اور جلالتِ قدر کا محض یہ نہیں کہ قائل ہو گیا بلکہ ان پر گرویدہ ہو کر ان کی ملاقات اور زیارت کے لئے بیتاب ہو گیا، اور بے ساختہ کہنے لگا کہ انہیں میرے پاس لاؤ۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ ﴿٥٠﴾ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ إِذْ رَاوَدتُّنَّ يُوسُفَ عَن نَّفْسِهِ ۚ قُلْنَ حَاشَ

لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ؗ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ

وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ۝۵۲

ترجمہ: اور بادشاہ نے کہا کہ اس شخص کو میرے پاس لے آؤ، سو جب قاصد یوسف کے پاس آیا تو یوسف نے کہا کہ تو اپنے آقا کے پاس واپس جا، پھر اس سے دریافت کر و کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے؟ بیشک میرا ربّ ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے۝۵۰ اس نے کہا کہ اے عورتو! تمہارا کیا واقعہ ہے جب کہ تم نے یوسف سے اپنی مطلب برآری کی خواہش کی؟ انہوں نے جواب میں کہا: حَاشَ لِلّٰهِ ہم اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں، ہمارے علم میں ایسی کوئی بات نہیں کہ ہم یوسف کی طرف کوئی برائی منسوب کرسکیں، عزیز کی بیوی نے کہا: اس وقت حق ظاہر ہوگیا، میں نے اسے اپنی مطلب برآری کے لئے اسے پھسلایا، اور بیشک وہ سچے لوگوں میں سے ہے۝۵۱ یہ اس لئے کہ وہ جان لے کہ میں نے اس کے پیچھے اس کی خیانت نہیں کی، اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلنے دیتا۝۵۲

اَلْجُزْءُ الثَّالِثَ عَشَرَ

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِىْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىْ ۭ اِنَّ رَبِّىْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: اور میں اپنے نفس کو بری نہیں بتاتا، بلاشبہ نفس برائی کرنے کا خوب زیادہ حکم دیتا ہے، بجز اس کے جس پر میرا ربّ رحم فرمائے، بیشک میرا ربّ غفور ہے، رحیم ہے ﴿۵۳﴾

معارف ومنازل

بادشاہ نے کہا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ، جب بادشاہ کا پیغام رساں اور قاصد یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور بادشاہ کے طلب واشتیاق کا حال سنایا کہ وہ آپ علیہ السلام کے آنے اور دیکھنے کے لئے بیتاب ہے، آپ علیہ السلام فوراً چلئے میں آپ کو لے کر اعزاز کے ساتھ دربارشاہی تک پہنچاؤں گا۔

توحضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے باہر آنے سے انکار کردیا، اور فرمایا کہ اس طرح تو میں جانے کو تیار نہیں ہوں، تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ یہ تحقیق کرے کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے؟ پہلے یہ بات صاف ہو جائے کہ انہوں نے کیسی کچھ مکاریاں کی تھیں؟ اور میرا پروردگار ان کی مکاریوں سے خوب واقف ہے۔

دیکھو! حضرت یوسف علیہ السلام بے قصور اور بے خطا برسوں سے قید خانہ میں بند تھے، اور بلا وجہ وہ قیدی بنے ہوئے تھے، اب جبکہ بادشاہ نے مہربان ہو کر رہائی کا مژدہ سنایا تو چاہیے تھا کہ وہ مسرت وخوشی کے ساتھ زنداں سے باہر نکل آتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، اور گزشتہ معاملے کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام خانوادۂ نبوت سے ہیں، اور خود بھی برگزیدہ نبی وپیغمبر ہیں، اس لئے غیرت وحمیت اور عزّت نفس کے بدرجہ اتم مالک ہیں، انہوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ کی اس مہربانی پر میں رہا ہو گیا تو یہ بادشاہ کا رحم وکرم سمجھا جائے گا، اور میرا بے قصور وصاحب عصمت ہونا پردۂ خفا میں رہ جائے گا، اور یہی سمجھا جائے گا کہ بادشاہ کے حکم سے ایک مجرم کی رہائی ہوگئی، اور یہ نہیں سمجھیں گے کہ ایک بے قصور انسان جنہیں ظالموں نے ناحق زنداں میں ڈالا تھا اس کی رہائی ہوگئی، اس طرح صرف عزّت نفس کو ٹھیس نہیں لگے گی، بلکہ دعوت وتبلیغ کے اس اہم مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا، جو میری زندگی کا

نصب العین ہے، پس اب بہترین وقت ہے کہ معاملہ کی اصل صورت سامنے آجائے، اور حق ظاہر اور واضح ہو جائے، اور میری پاکدامنی سب کے سامنے ظاہر ہو جائے۔

صحیحین (بخاری ومسلم) کی روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے اس واقعہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے ضبط وصبر کو بہت ہی سراہا، اور تواضع وکسر نفسی کی حد تک اس کو بڑھا کر یہ ارشاد فرمایا: "لَوْ لَبِثْتُ فِی السِّجْنِ مَالَبِثَ یُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ"۔ [متفق علیه]

یعنی اگر میں اس قدر لمبی مدت تک قید میں رہتا جس قدر کہ یوسف علیہ السلام رہے تو بلانے والے کی دعوت فوراً قبول کر لیتا۔

اس جگہ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ یوسف علیہ السلام کا معاملہ براہ راست عزیز کی بیوی کے ساتھ پیش آیا تھا مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ان مصری عورتوں کا حوالہ دیا جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے، حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا کیوں کیا؟

اس کی دو وجہیں تھیں: ایک یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اگرچہ عزیز کی بیوی سے زیادہ تکلیف پہنچی تھی مگر قید کے اس معاملہ میں مصری عورتوں کی بھی سازش رہی، اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک یوسف علیہ السلام کی عاشق اور ان کو اپنی جانب مائل کرنے کی آرزومند تھی، اور ناکامی کی صورت میں سب نے مل کر عزیز کی بیوی کو اس کے قید والے فیصلہ میں مشورہ اور اشارہ دیدیا، اور عملی جامہ پہنا کر چھوڑا، یہی وجہ ہے کہ زندان کا معاملہ ان عورتوں کے کہنے کے بعد پیش آیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سمجھتے تھے کہ عزیز نے میرے ساتھ بے انتہا حسن سلوک برتا ہے، میری عزّت اور میرا احترام کیا ہے، اس لئے موزوں نہیں ہے کہ میں اس کی بیوی کا نام لے کر اس کی دل آزاری یا رسوائی کا باعث بنوں۔

غرض بادشاہ نے جب یہ سنا تو ان عورتوں کو بلوایا، اور ان سے کہا کہ صاف صاف اور صحیح بتاؤ کہ اس معاملہ کی اصل حقیقت کیا ہے؟ جب کہ تم نے یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے تھے تاکہ تم اس کو اپنی طرف مائل کر لو۔ وہ یک زبان ہو کر بولیں:

﴿قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے لئے پاکی ہو۔

﴿مَا عَلِمۡنَا عَلَيۡهِ مِن سُوٓءٍ﴾ ہم نے اس میں برائی کی کوئی بات نہیں پائی۔ اس مجمع میں عزیز کی بیوی بھی موجود تھی (اور اب وہ عشق ومحبت کی بھٹی میں پہلے کی طرح خام نہ تھی، بلکہ کندن تھی، اور ذلت ورسوائی کے خوف سے آگے نکل چکی تھی) اس نے جب یہ دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کی خواہش ہے کہ حقیقت حال سامنے آجائے اور جو کچھ گزرا ہے وہ پردۂ خفاء میں نہ رہے، تو بے اختیار بول اٹھی اور کہنے لگی:

﴿الۡـٰٔنَ حَصۡحَصَ الۡحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدۡتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيۡنَ﴾ جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہوگئی، ہاں! وہ میں ہی تھی جس نے یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے، بلاشبہ وہ اپنے بیان میں سچا ہے، اور سچوں میں سے ہے، اس کے بعد ارشاد ہے:

﴿ذٰلِكَ لِيَعۡلَمَ اَنِّىۡ لَمۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَيۡبِ﴾ اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے بعض مفسرین حضرات نے یہ ترجمہ کیا: "یہ میں نے اس لئے کہا کہ اس (عزیز مصر) کو معلوم ہوجائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کے معاملے میں خیانت نہیں کی، نیز اس لئے کہ "واضح ہوجائے" اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کی تدبیروں پر کبھی کامیابی کی راہ نہیں کھولتا، میں اپنے نفس کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتا، آدمی کا نفس تو برائی کے لئے بڑا ہی ابھارنے والا ہے، مگر ہاں! اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے، بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔

اس ترجمہ کا مطلب یہ ہے کہ عزیز کی بیوی کا مقولہ ہے: ﴿لَمۡ اَخُنۡهُ﴾ کی ضمیر کا مرجع عزیز کو قرار دیا ہے۔

اور عام مفسرین اس پورے مقولے کو حضرت یوسف علیہ السلام کا مقولہ قرار دیتے ہیں، اور ﴿لَمۡ اَخُنۡهُ﴾ کی ضمیر کو اسی طرح عزیز کی بیوی کی طرف پھیرتے ہیں، پھر آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ یوسف علیہ السلام نے کہا: یہ اس واسطے کہ عزیز کو معلوم ہوجائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی، اور اللہ تعالیٰ دغابازوں کا فریب کامیاب نہیں کرتا، اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا، بیشک نفس سکھاتا ہے برائی، مگر یہ کہ رحم کرے جس پر میرا پروردگار، بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔

اور ﴿وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفۡسِىۡ﴾ کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے چونکہ اپنی عصمت نفس کا اس موقع پر زبردست مظاہرہ کیا تھا تو ایک جلیل القدر نبی اور مقرب بارگاہ الٰہی ہونے کی وجہ سے یہ ظاہر کردینا بھی ضروری تھا کہ میری پاکبازی اور عصمت کا یہ معاملہ میرے اپنے نفس کی بدولت نہیں ہے، کیونکہ نفس انسانی کو تو اکثر برائی پر ابھارتا ہے، بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کا صدقہ ہے، اور یہی رحمت وعصمت انبیاء کرام علیہم السلام کی کفیل ہے۔

بہر حال! وہ وقت آپہنچا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت و پاکبازی اور طہارت وصداقت کا اپنے عزیزوں، دوستوں اور اہل عقیدت نے نہیں بلکہ ایک اجنبی ملک اور اجنبی قوم کے مخالف افراد نے علیٰ رؤس الاشہاد گواہی دے کر اس کی صداقت و پاکدامنی پر مہر لگادی۔

عزیز مصر پہلے کہہ چکے تھا:

﴿ یُوۡسُفُ اَعۡرِضۡ عَنۡ ہٰذَا ﴾ اور اپنی بیوی کو مجرم گردانتے ہوئے اسے استغفار کا حکم دے چکا تھا، اب شاہی دربار میں تمام عورتیں جن کی تعداد چالیس بتائی گئی ہے ایک زبان ہو کر کہہ رہی ہیں:

﴿مَا عَلِمۡنَا عَلَیۡہِ مِنۡ سُوۡٓءٍ ﴾ اور اصلی مجرم عزیز کی بیوی تھی، حقیقتِ حال آشکارا کر کے شاہی دربار میں اقرار کرتی ہے کہ:

﴿ الۡـٰٔنَ حَصۡحَصَ الۡحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدۡتُّہٗ عَنۡ نَّفۡسِہٖ وَ اِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴾ کہ یوسف علیہ السلام بے گناہ اور سچے ہیں، اصل مجرم میں ہی ہوں۔

بادشاہ مصر پر جب حقیقتِ حال منکشف ہوگئی تو اس کے دل میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت وجلالت قدر کا سکہ بیٹھ گیا، ساقی کا جس عقیدت کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی عقل و دانش کا ذکر اور خواب کی بہترین تعبیر اور عصمت نفس و پاکدامنی کا یہ انکشاف اور پوری جماعتِ نسواں کی گواہی بادشاہ کو اس عظیم ہستی کا عاشق بنادیا، اور وہ طالب دیدار ہوئے۔

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

وَقَالَ الۡمَلِکُ ائۡتُوۡنِیۡ بِہٖۤ اَسۡتَخۡلِصۡہُ لِنَفۡسِیۡ ۚ فَلَمَّا کَلَّمَہٗ قَالَ اِنَّکَ الۡیَوۡمَ لَدَیۡنَا مَکِیۡنٌ
اَمِیۡنٌ ﴿۵۴﴾ قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۵﴾ وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ
فِی الۡاَرۡضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنۡہَا حَیۡثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیۡبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ
الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۵۶﴾ وَ لَاَجۡرُ الۡاٰخِرَۃِ خَیۡرٌ لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۵۷﴾

ترجمہ: اور بادشاہ نے کہا کہ اس شخص کو میرے پاس لاؤ، میں اسے خالص اپنے لئے رکھوں گا، پھر جب ان سے بات کی تو کہا: بیشک آج تم ہمارے پاس باعزت ہو، معتبر آدمی ہو﴿۵۴﴾ یوسف نے کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں

پر مقرر کردو، میں ان کی حفاظت کرنے والا ہوں، جاننے والا ہوں۵۵ اور ہم نے اسی طرح یوسف کو زمین میں با اختیار بنا دیا، اس میں جہاں چاہے رہے، ہم جسے چاہیں اپنی رحمت پہنچا دیں، اور ہم اچھے کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۵۶ اور البتہ آخرت کا ثواب ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو ایمان لائے اور تقوٰی اختیار کرتے رہے۵۷

معارف ومنازل

یوسف علیہ السلام پر انعاماتِ الٰہی کی بارش:

قرآن حکیم کا فیصلہ: ﴿اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا﴾ [الشرح:٦] (بیشک سختی کے ساتھ آسانی ہے) یہ آفاقی فیصلہ ہے، جو کہ تمام جہانوں کے لئے ہے، جس شخصیت سے اس کے اپنے بھائی بے بہرہ رہے بالآخر اسے ایک اندھیرے کنویں میں ڈال دیا، اس سے اس کنویں نے یہ فائدہ حاصل کیا کہ اس کا پانی میٹھا ہو گیا جبکہ پہلے تلخ تھا، اور اس کا پانی بہت زیادہ ہو گیا، اور ہزار سال سے زائد عرصہ تک چلتا رہا، اب صبر واستقلال کی نیرنگیوں نے رنگ لایا، بھائیوں کا مبغوض انسان پورے مصر کے مرد وزن کا محبوب ترین انسان بن گیا، جس پر بادشاہ فرعون عزیز مصر اور فریفتہ چالیس عورتوں اور ان کے خاندانوں والے ایمان لائے، مورخین کہتے ہیں کہ ریان بن ولید پورے امور سلطنت آپ علیہ السلام کے سپرد کر کے خود گوشہ نشینی اختیار کر کے آپ علیہ السلام کے کمالات اور امورِ انتظامیہ کا مطالعہ کرتے رہے۔

بہر حال! یوسف علیہ السلام اب باین دلبری ورعنائی، باین شان وشوکت، باین عصمت وپاکبازی اور باین عقل ودانش زندان سے رخصت ہو کر بادشاہ مصر کے دربار میں تشریف لائے، بات چیت ہوئی تو بادشاہ جس کی قسمت بیدار تھی آپ علیہ السلام کی حکیمانہ وبےمثال گفتگو سے حیران رہ گئے، اور اتنے خوش ہوئے جس کی مثال نہ ہو کہ اب تک جس کی راستبازی، امانتداری اور وفاء عہد کا یہ کچھ تجربہ کیا تھا وہ عقل ودانش اور حکمت وفطانت میں بھی اپنی نظیر آپ ہیں، اور مسرت کے ساتھ کہنے لگا:

﴿اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ﴾ بلاشبہ آج کے دن آپ علیہ السلام ہماری نگاہوں میں بڑے صاحب اقتدار اور امانتدار ہیں۔ پھر ان سے دریافت کیا کہ میرے خواب میں جس قحط سالی کا ذکر ہے اس کے متعلق مجھ کو کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں؟ حضرت یوسف علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ﴾ یوسف علیہ السلام نے کہا: اپنی مملکت کے

خزانوں پر آپ مجھے مختار کیجئے، میں حفاظت کر سکتا ہوں، اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ سب کچھ کسی آدمی کسی دانشور یا حکیم سے نہیں سیکھا، جب اللہ تعالیٰ نے خرقِ عادت غیروں کے ملک کا بادشاہ بنانے کا فیصلہ فرمایا تو انہیں رموزِ سلطنت، تدبیر ملوکیت اور سیاست دولت ومملکت سب کچھ سکھا دیا اور بتا دیا، چنانچہ انگشتری اپنے ہاتھ سے اتار کر ان کے ہاتھ میں ڈال دی، اور بادشاہی علامت کا کنگن انہیں پہنا دیا، اور جواہرات کا طوق ان کے گلے میں ڈال دیا، اور یہ بھی کہا کہ ساری مملکت مصر میں آپ کے حکم کے خلاف کوئی نہ ہاتھ اٹھائے گا نہ پاؤں۔

کہتے ہیں کہ بادشاہ نے اپنے وزراء، امراء، عمائدین، رؤسا کی میٹنگ بلا کر انہیں خوب سمجھایا اور اس فیصلے پر انہیں اعتماد میں لے کر راضی بھی کیا جسے ان کے احباب ودوستوں نے سراہا، اور اطمینان کا اظہار کیا، چونکہ یہ سب کچھ مالکِ حقیقی کے حکم ومنظوری سے ہونے والا تھا، اور عالم بالا سے اس کی منظوری ہو چکی تھی تو کسی کی کیا مجال کہ وہ منحرف ہو یا منظور نہ کرے؟ کیونکہ تکوینی امور میں انسانوں کا اختیار سلب ہو جاتا ہے۔

اللہ اللہ! خدائے تعالیٰ کی قدرت اور اس کے عطاء وکرم کی یہ کیسی نرالی بوالعجبی ہے کہ کل جس ہستی کو مصر کی متمدن قوم، بدوی، صحرائی اور غلام سمجھتی تھی، اور تاجر اس کی خریداری پر بولیاں لگاتے تھے، اس کو ایک بڑے سردار (عزیز مصر) کے محل کا مختار اور اس کی نگاہوں میں محترم ومعزز اور امین وفطین بنایا، اور پھر قید خانہ کی تاریکیوں سے نکالا تو مملکت مصر اور قوم قبط کا مختار وحاکم بنا دیا، اور اس مرتبہ پر پہنچا دیا کہ اسبابِ دنیوی کے ماتحت جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ یہ قادر مطلق، شہنشاہ حقیقی جل شانہ کی کارفرمائی کا معجزانہ مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ کل جو کنعان میں گلہ بانی کر رہا تھا وہ آج وقت کی سب سے بڑی متمدن قوم کا مالک ومختار بن کر جہاں بانی کر رہا ہے۔

یہ سچ ہے کہ جس کو وہاں قبولیت کا شرف حاصل ہو گیا اس کے لئے راہ کی تمام تر دشواریاں ہیچ ہیں، اور حالات کی نامساعدت کی کوئی ادنیٰ حیثیت بھی نہیں رہتی، اور راستے کی تمام دشواریاں کافور ہو جاتی ہیں، اور خاردار کانٹے پھول بن کر استقبال کرتی ہیں۔ کہتے ہیں تو سچ کہتے ہیں:

اے بندہ بمن بیا وخود را یلہ کن ☆ پس اگر شاہ جہانت نکنم گلہ کن

اسی لئے حق تعالیٰ قادر مطلق ہے، "عزیز مصر" کے کاروبار کا مختار بنا کر یوسف علیہ السلام کے لئے یہ فرمایا تھا کہ ہم نے اس کو "تمكين في الأرض" عطا کر دی، اور اب جبکہ اس آغاز کی یہ انتہاء نمود میں آ گئی تو پھر وہی ارشاد قند مکرر

کے طور پر ارشاد فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۝ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾ یعنی اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف علیہ السلام کے قدم جما دیئے، جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے، ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیضیاب کردیتے ہیں، اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور بدعملیوں سے بچتے رہے ان کے لئے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے۔

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لئے دو جگہ "تمكين في الأرض" (زمین کا مالک بنا دینا) کی بشارت سنائی گئی ہے، اور دونوں مقام پر تعبیر کا نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق صاحب ترجمان القرآن حضرت ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا اور فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی کے دو انقلاب انگیز نقطے تھے: ایک وہ جب غلام ہو کر بکے (فروخت ہوئے) اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے معزز ہوئے کہ اس کے علاقے کے مختار ہو گئے۔

دوسرا یہ کہ قید خانہ سے نکلے اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ حکمرانی کی مسند اجلال پر جلوہ آرا نظر آئے۔ پس جب پہلے انقلاب تک سرگزشت پہنچی تھی تو آیت (۲۱) میں حکمت الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر توجہ دلائی تھی کہ:

﴿كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ﴾ اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا تو اسی طرح آیت (۵۶) میں فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ﴾ وہاں چونکہ معاملہ مصر کی ابتداء ہوئی تھی، اور ابھی حضرت یوسف علیہ السلام کو حکمرانی کی دانش سیکھنی باقی تھی اس لئے فرمایا:

﴿وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ﴾ یہاں چونکہ تکمیل کار کے بعد اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا تھا اس لئے فرمایا:

﴿لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ یہ اس لئے ہوا کہ ہمارا قانون ہے نیک عمل کا بیج کبھی ضائع نہیں ہوتا، ضروری ہے کہ پھل لائے۔ [ترجمان القرآن: جلد ۲]

بعض مفسرین نے یہاں یہ شبہ کیا ہے کہ کسی عہدہ کی طلبی پر حدیث شریف میں ممانعت آئی ہے، اور کسی کافر

بادشاہ سے عہدہ طلب کرنا بھی ممنوع ہے۔

جواب: یہ ممانعت ہماری شریعت میں ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کی شریعت میں یہ ممانعت نہیں تھی۔ اور اصل جواب یہ ہے کہ ممانعت عوام کے لئے ہے، کیونکہ وہ عدل وانصاف اور حقوق ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے، بخلاف انبیاء کرام علیہم السلام کہ عہدہ کی طلب ہو یا قبول کرنا ہو وہ امر الٰہی کے بغیر نہیں کرتے، اور جب امر الٰہی سے طلب یا قبولیت ہوتی ہے تو اداءِ حقوق میں کبھی کسی بھی قسم کی کمزوری واقع نہیں ہوتی، یہی واضح فرق ہے۔ اسے یاد رکھا جائے، تھوڑی تفصیل آنے والی ہے، اِن شاءَ اللہ تعالٰی

وَجَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۝۵۸ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِیْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِیْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّیْۤ اُوْفِی الْكَیْلَ وَاَنَا خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ۝۵۹ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِیْ بِهٖ فَلَا كَیْلَ لَكُمْ عِنْدِیْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ۝۶۰ قَالُوْا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ اَبَاهُ وَاِنَّا لَفٰعِلُوْنَ۝۶۱ وَقَالَ لِفِتْیٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَعْرِفُوْنَهَاۤ اِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۝۶۲ فَلَمَّا رَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَبِیْهِمْ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَیْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۶۳ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَیْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِیْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۝۶۴

ترجمہ: اور یوسف کے بھائی آئے سو وہ ان کے پاس اندر چلے گئے، سو یوسف نے انہیں پہچان لیا، اور وہ انہیں نہیں پہچان رہے تھے ۵۸ اور جب یوسف نے ان کا سامان تیار کر دیا تو فرمایا کہ تمہارا جو باپ شریک بھائی ہے اسے میرے پاس لے آنا، کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ میں پورا ناپ کر دیتا ہوں؟ اور میں سب سے زیادہ مہمان نوازی کرنے والا ہوں ۵۹ سو اگر تم اس بھائی کو میرے پاس نہ لائے تو تمہارے لئے میرے پاس کوئی غلہ نہیں ہے جو میں تمہیں ناپ کر دوں، اور میرے پاس مت آنا ۶۰ بھائیوں نے کہا کہ ہم اس کے باپ سے اس کے بارے میں درخواست کریں گے، اور ہمیں یہ کام ضرور کرنا ہے ۶۱ اور یوسف نے اپنے خدمت گزاروں سے کہا کہ ان کی پونجی ان کے کجاوؤں میں رکھ دو تاکہ اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جائیں تو اسے پہچان لیں، شاید وہ پھر واپس آجائیں ۶۲ پھر جب وہ اپنے باپ کے پاس آئے تو کہنے لگے: اے ابا جان! ہمیں غلہ دینے کی ممانعت کی گئی ہے، سو آپ ہمارے

بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تا کہ ہم غلہ لاسکیں، اور بلاشبہ ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ﴿۶۳﴾ ان کے والد نے کہا: کیا اس پر تمہارا اعتبار کروں مگر جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی پر تمہارا اعتبار کر چکا ہوں؟ سو اللہ تعالیٰ سب سے بہتر نگہباں ہے، اور سب مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے ﴿۶۴﴾

معارف ومنازل

جب یوسف علیہ السلام مصر جیسے ایک متمدن ترقی یافتہ ملک کے حکمران مقرر ہوئے، اور تمام امراء، رؤساء، عمائدین اور وزراء نے آپ علیہ السلام کو بغیر کسی چون و چرا کے اپنا حاکم تسلیم کیا، اور بادشاہ نے تخت و تاج اور تمام شاہی اختیارات آپ علیہ السلام کے سپرد کئے تو آپ علیہ السلام نے سلطنت مصر کے خود مختار بادشاہ ہونے کے بعد خواب سے متعلق وہ تمام ضروری تدابیر شروع کیں جو چودہ سال کے اندر مفید ہوسکیں، اور رعایا قحط سالی کے ایام میں بھی بھوک اور پریشان حالی سے محفوظ رہ سکے۔ نیز آس پاس کے قریبی دیگر ملکوں کے لوگوں کے لئے بھی انتظام اور ہمدردی ہوسکے۔

چونکہ قرآن کریم نے واقعہ کے ان غیر ضروری حصوں کو بیان نہیں کیا اس لئے اختصاراً اس کو بیان کرنا فائدہ سے خالی نہیں۔ وہ یہ ہے جب یوسف علیہ السلام کی تاج پوشی ہوئی اس وقت آپ علیہ السلام تیس برس کے تھے، آپ علیہ السلام کی تاج پوشی پر عزیز مصر بڑے خوش ہوئے، کیونکہ یوسف علیہ السلام کے وہی محسن و مربی اور خریدار تھے۔ مختصر عرصے میں وہ فوت ہوئے اور اسلام پر مرے۔

سابق بادشاہ ریان بن ولید جو کہ مسلمان ہوئے تھے یہ بڑے دانشمند و عقلمند اور دور اندیش انسان تھے، اس عرصہ میں مصر کے بہت بڑے بڑے لوگ مسلمان ہوچکے تھے خصوصاً وہ ہاتھ کاٹنے والی عورتیں اور عزیز مصر کی بیوی زلیخا بھی، پس اس موقع پر سابق بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی خدمت عالیہ میں دست بستہ التجاء اور درخواست کی کہ آپ علیہ السلام زلیخا سے نکاح فرمائیں، حضرت یوسف علیہ السلام نے اسے منظور فرما کر حضرت زلیخا سے شادی کی، اور اسے باکرہ لڑکی پایا، اور ان سے ان کے دو بچے بھی پیدا ہوئے (افرائیم اور منشا)۔

شادی کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا سے فرمایا کہ کیا یہ صورت اس سے بہتر نہیں جو تم نے چاہی تھی؟ زلیخا نے اعتراف کیا، مگر اپنی مجبوری بھی بیان کی۔ روایات میں ہے کہ اب زلیخا کی نسبت حضرت یوسف علیہ السلام کو ان سے محبت زیادہ ہوگئی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے شکایت کے طور پر پوچھا بھی کہ تمہاری محبت پہلے سے کم

کیوں ہوگئی؟ عرض کیا کہ اب آپ کے طفیل اللہ تعالیٰ سے لَو لگ گئی ہے، اور سب سے دل بیگانہ ہو چکا ہے۔ تفصیل قرطبی اور مظہری میں ہے۔ بعض مفسرین اس شادی کے منکر ہیں، اور بعض نے اثبات ونفی میں کچھ نہیں کہا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن انتظام:

حضرت یوسف علیہ السلام نے: ﴿اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَآئِنِ الْأَرْضِ﴾ جو فرمایا تو اس سے ان کی غرض صرف یہ تھی کہ اِن کو پورے مصر میں اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرنے اور حق قائم کرنے اور عدل وانصاف پھیلانے کا موقع مل جائے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا نظام انجام دینے کی طاقت واختیار حاصل کرلیں، جس نظام کی خاطر انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں۔ انہوں نے بادشاہی کی محبت اور دنیا کی لالچ میں یہ مطالبہ نہیں کیا تھا، بلکہ یہ جانتے ہوئے کیا تھا کہ کوئی دوسرا شخص ان کے علاوہ ایسا نہیں ہے جو اس کٹھن کام کو انجام دے سکے، چنانچہ وہ بادشاہ اور پوری بادشاہی کونسل کی منظوری اور تفویض کے بعد بلا کسی تاخیر کے اس خواب کی تعبیر کے مقاصد میں لگ گئے، اور پورے ملک کا اور ملک کے تمام اطراف، شہروں، دیہاتوں، قصبوں اور بستیوں کا دورہ شروع کیا، اور آنے والے قحط کے لئے اور اس پر قابو پانے کے لئے تمام پیش بندیاں کرلیں۔

ایک دستور بنا کر ملک کے کاشتکار محنت کش زمینداروں کو سپرد کر کے اس کی نگرانی پر ایک کونسل بنا کر کام شروع کرالیا، اور پہلے سات سال کی آبادی وفراوانی کے زمانہ میں عوام کے لئے اتنی سہولتوں اور خوشحالیوں کا بندوبست کیا کہ پوری آبادی آپ علیہ السلام کی گرویدہ اور بہی خواہ ہوگئی، اور آئندہ سات سالہ قحط کے لئے کھانے خوراک اور جانوروں تک کے لئے چارہ اور گھاس کا وہ بے مثال ذخیرہ جمع ہوا کہ پوری آبادی کی بستیوں میں چیزوں کے انبار لگ گئے، اور سلیقہ سے گوداموں میں رکھے گئے۔

چنانچہ اس خوشحالی کے سات سال گزرنے کے بعد جب تباہ کن قحط کا زمانہ شروع ہوا، اور یہ قحط صرف مصر ہی میں نہ تھا بلکہ آس پاس کے ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آگئے تھے، شام، فلسطین، شرق، اردن، شمالی عرب سب جگہ خشک سالی کا دور دورہ تھا، ان حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پیغمبرانہ، دانشمندانہ انتظام کی بدولت صرف مصر ہی وہ ملک تھا جہاں قحط کے باوجود غلہ کی فراوانی اور افراط تھی، اس لئے ہمسایہ ممالک کے لوگ مجبور ہوئے کہ غلہ حاصل کرنے کے لئے مصر کی طرف رجوع کریں۔

یہی وہ موقع تھا جب فلسطین وکنعان سے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی غلہ خریدنے کے لئے مصر پہنچے،

یوسف علیہ السلام نے ضابطہ بندی کی تھی، اور بذات خود اس کی نگرانی فرماتے رہتے کہ باہر کے ملکوں کے لوگوں کو بھی انسانی ہمدردی کی بنیاد پر غلہ فراہم کیا جائے، تاکہ خلق خدا بھوک کی وجہ سے ضائع نہ ہو۔ یہ ایک قسم کی راشن بندی تھی، جس میں ہر شخص کو ایک اونٹ کا بار گندم مناسب قیمت پر دیا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں ضابطے مقرر کئے تھے۔

الغرض! جب قحط سالی کا زمانہ شروع ہوا تو مصر اور اس کے قرب وجوار علاقوں میں بھی قحط پڑا، اور کنعان میں خاندان یعقوب علیہ السلام بھی محفوظ نہ رہ سکا، جب حالات کنٹرول سے باہر ہو گئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ مصر کا بادشاہ سنا ہے کہ بہت اچھا غریب پرور انصاف والا ہے، اور اس نے اعلان کیا ہے کہ اس کے پاس غلہ بکثرت محفوظ ہے، لوگ آئیں اور غلہ حاصل کریں، لہٰذا تم بھی جاؤ غلہ لے کر آؤ، چنانچہ باپ کے حکم کے مطابق یہ کنعانی قافلہ مصر پہنچا، انہیں کیا معلوم کہ جس کو ہم نے کنویں میں ڈال کر معمولی رقم پر قافلہ والوں پر فروخت کیا تھا آج ہم اس کے دربار میں حاضر ہو کر اپنی بیکسی کا اظہار کر رہے ہیں۔

جب یہ (یوسف فروش) دربار یوسفی میں نہایت خستہ حالت میں پیش ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کو پہچان لیا، اور کیوں نہ پہچانتے رنگ، ڈھنگ، بول چال، لب ولہجہ، نقشہ وصورت اور ساری ادائیں یوسف علیہ السلام کی جانی پہچانی تھیں، البتہ وہ یوسف علیہ السلام کو نہ پہچان سکے، اور کس طرح پہچانتے؟ کل جو چھوٹا سا بچہ تھا آج تقریباً وہ چالیس سالہ تجربہ کار انسان ہے، رنگ وشکل وصورت سے اور بول چال سے کچھ شبہ بھی کرتے تو کس طرح؟ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ گمنام یوسف اور مصر کی بادشاہت اور تخت شاہی، یہ امکان سے بھی باہر ہے، مگر یہ واقعہ تھا، حقیقت تھی اور اپنے برگزیدہ صابر وشاکر بندہ سے رب العلمین سبحانہ وتعالیٰ کا وہ معاملہ تھا جو صفحۂ دنیا پر ثبت ہو کر رہا، وہ مالک الملک جس کو چاہے فقیر بنادے اور جس فقیر کو چاہے بادشاہ بنادے، جسے چاہے ذلت دے اور جسے چاہے عزت دے، سب چیزوں پر اس کی حکمرانی ہے، اور وہی کائنات کا واحد مالک ہے۔

بیرون ملک سے آنے والے تمام لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا حضرت یوسف علیہ السلام کا پیغمبرانہ اور کریمانہ دستور تھا، شاہی قصر کے ساتھ نہایت وسیع وعریض بڑا مہمان خانہ بنوایا تھا، جس میں باہر سے آنے والوں کو ٹھہراتے تھے، اور ہر طرح ان کی مہمان نوازی قیام وطعام کا شاہی خزانے سے انتظام ہوتا تھا، مہمان نوازی کا سلیقہ آپ علیہ السلام کو اپنے عظیم دادے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ورثہ میں ملا تھا، اور آپ علیہ السلام بنفس نفیس باہر کے لوگوں سے مل

کرانہیں غلہ کی منظوری دینے کے ساتھ ساتھ توحید باری تعالیٰ شانہ کا ضرور پیغام اور سبق دیتے تھے، انہی سے وہاں کے لوگوں کے حالات بتانے پر بھی معلومات حاصل کرتے تھے۔ جب آپ علیہ السلام کے بھائی آپ علیہ السلام کے پاس آئے تو ان کو تبلیغ بھی کی، اور وہاں کے حالات کا پوچھ کر جائزہ لیا اور اطمینان حاصل کیا، اور انہیں پورے اعزاز کے ساتھ رکھا، مہمان نوازی اور مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام نے اپنے اپنے حصے کا غلہ لینے کے بعد یوسف علیہ السلام سے درخواست کی کہ ان کے نابینا والد اور ہمارے چھوٹے بھائی کا حصہ بھی انہیں دیا جائے، اس پر آپ علیہ السلام نے استفسار فرمایا کہ تمہارا چھوٹا بھائی کیوں تمہارے ساتھ نہیں آیا؟ انہوں نے کہا کہ وہ ہمارا باپ شریک بھائی ہے، اس کا ایک بھائی جو اس کی ماں سے تھا وہ گم ہوگیا، آج تک پتہ نہ چلا کہ اس کا کیا ہوگیا، جس کے غم میں ہمارے والد رورو کر نابینا ہوگئے، ابھی اس کی کسی طرح جدائی پر باپ کو صبر نہیں آتا وہ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنے پر قناعت کرتے ہیں، اور وہ ہماری غیر موجودگی میں باپ کی خدمت اور دیکھ بال پر مامور ہے۔

چنانچہ یوسف علیہ السلام نے والد صاحب اور چھوٹے بھائی کا حصہ بھی ان کو دے دیا، تاہم آئندہ کے لئے یہ شرط عائد کہ کہ جب تم دوبارہ آؤ تو اپنے گیارہویں چھوٹے بھائی کو بھی ضرور ساتھ لاؤ، ورنہ سمجھا جائے گا کہ تم نے جھوٹ بول کر اس کا حصہ ناجائز طور پر وصول کرلیا ہے، اگر اسے نہیں لاؤ گے تو معلوم ہوگا کہ تم نے غلط بیانی کی ہے، تو ایسی صورت میں تمہیں بھی بطور جرمانہ کوئی راشن نہیں ملے گا، پھر تم میرے قریب بھی نہ آؤ، یہ بہت بڑی سخت شرط تھی، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُمْ مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ۝٥٩ فَإِنْ لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِي وَلَا تَقْرَبُونِ﴾ اور جب یوسف علیہ السلام نے ان کا سامان مہیا کردیا تو انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ آنا تو اپنے سوتیلے بھائی کو بھی ساتھ لانا، تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں غلہ پوری تول سے دیتا ہوں، اور باہر سے آنے والوں کے لئے بہتر مہمان نواز ہوں، لیکن اگر تم اس کو میرے پاس نہ لائے تو پھر یاد رکھو! نہ تو تمہارے لئے میرے پاس خرید و فروخت ہوگی، نہ تم میرے پاس جگہ پاؤ گے۔

برادرانِ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ ہم اپنے والد سے کہیں گے اور ہر طرح انہیں ترغیب دیں گے کہ وہ بنیامین کو

ہمارے ساتھ یہاں بھیجنے پر راضی ہو جائیں، پھر جب وہ چلنے لگے اور یوسف علیہ السلام سے رخصت ہونے آئے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے خدام اور نوکروں کو حکم دیا کہ خاموشی کے ساتھ ان کے کجاووں میں ان کی وہ پونجی بھی رکھ دو جو انہوں نے غلے کی قیمت کے لئے دی ہے، تاکہ جب گھر جا کر اس کو دیکھیں تو عجب نہیں کہ پھر دوبارہ واپس آئیں، کیونکہ دوبارہ آنے کے لئے ان کے پاس کوئی پیسہ نہ ہو تو آنا مشکل ہے، اور اپنی رقم دوبارہ اپنے پاس پا کر ان کی حوصلہ افزائی ہوگی، اور وہی رقم لے کر دوبارہ آ جائیں گے۔

اور برادران یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ خیال بھی آ سکتا ہے کہ اس بادشاہ نے ہمارے ساتھ بڑی فیاضی کا ثبوت دیا ہے، لہٰذا دوبارہ جا کر ان سے مزید مراعات حاصل کرنی چاہئیں۔ ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ میں ان ساری باتوں کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال! خدام نے برادران یوسف علیہ السلام کی رقم ان کے سامان میں رکھ دی، اور وہ لوگ اپنے وطن کو روانہ ہو گئے، جب وہ واپس کنعان پہنچے تو انہوں نے اپنی تمام سرگزشت اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنائی اور ان سے کہا کہ مصر کے بادشاہ نے صاف صاف ہم سے کہہ دیا ہے کہ اس وقت دوبارہ ہمارے ملک میں نہ آنا اور نہ کوئی غلہ کی خرید کی امید رکھنا جب تک کہ اپنے سوتیلے بھائی "بنیامین" کو ساتھ نہ لاؤ، اور اس کے لانے کی وجہ بھی بتادی کہ ہم نے اس کے حصے کی گندم جب طلب کی اور آپ کا بھی حصہ وصول کیا تو بادشاہ نے کہا کہ آئندہ جب تک اس کو ساتھ نہ لاؤ گے تو تمہیں کچھ نہیں ملے گا، لہٰذا ابا جان! ہم چاہتے ہیں کہ بھائی کو ہمارے ساتھ کر دیں، ہم ہر طرح اس کے محافظ اور نگہبان ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ کیا تم پر اسی طرح اعتماد کروں جس طرح اس کے بھائی یوسف کے معاملے میں کر چکا ہوں؟ اور تمہاری حفاظت ہی کیا؟ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے، اور اس سے بڑھ کر کوئی رحم کرنے والا نہیں ہے۔

❁ ❁ ❁

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ
هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ

ذٰلِكَ كَيۡلٌ يَّسِيۡرٌ ۝۶۵ قَالَ لَنۡ اُرۡسِلَهٗ مَعَكُمۡ حَتّٰى تُؤۡتُوۡنِ مَوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاۡتُنَّنِىۡ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ يُّحَاطَ بِكُمۡ‌ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوۡهُ مَوۡثِقَهُمۡ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوۡلُ وَكِيۡلٌ ۝۶۶

ترجمہ: اور جب انہوں نے اپنے سامان کو کھولا تو انہوں نے اپنی پونجی کو پایا کہ ان کی طرف واپس کردی گئی ہے، کہنے لگے کہ: ابا جی! اور ہمیں کیا چاہیے، یہ ہماری پونجی ہے ہماری طرف لوٹا دی گئی ہے، اور ہم اپنے گھر والوں کے لئے بوجھ لائیں گے، اور ہم اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے، اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لائیں گے، یہ غلہ تھوڑا سا ہے ۝۶۵ انہوں نے کہا کہ میں ہرگز اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا یہاں تک کہ تم مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مضبوط عہد نہ دیدو کہ تم اسے ضرور لے کر آؤ گے مگر یہ کہ تم کو گھیر لیا جائے، سو جب انہوں نے اپنے والد کو اپنا عہد دیدیا تو والد نے کہا کہ ہم جو بات کہہ رہے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ نگہبان ہے ۝۶۶

معارف ومنازل

برادرانِ یوسف علیہ السلام خود اپنے ہاتھ سے غلے کی قیمت ادا کر چکے تھے، مکمل لین دین کے بعد قافلہ کو روانگی کی اجازت ملی تھی، پھر ہر ایک بھائی کے کجاوہ میں علیحدہ اسی طرح قیمت کی واپسی ہر عقلمند کے لئے یہی رہنمائی کرتی ہے، کہ جس طرح بادشاہ مصر نے دورانِ قیام میں ہمارا اکرام وراعزاز کیا، اسی طرح یہ پونجی بھی اسی نے واپس کردی، اور منت واحسان سے بچانے کے لئے اس کا اظہار بھی مناسب نہ سمجھا۔ دراصل یہ پونجی انہیں دوبارہ لانے کا بہانہ یا تدبیر تھی۔ بہرحال حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ بنیامین کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''مؤمن ایک سوراخ سے دومرتبہ نہیں ڈسا جاتا''۔ [مشکوٰۃ]

حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو تو نہیں بھولے، وہ غم ابھی تک ان کے دل پر تازہ تھا جس کے نتیجے میں وہ نابینا ہو چکے۔ فرمایا: جب تک تم اللہ تعالیٰ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو، اور وہ یہ کہ جب تک ہم خود گھیر نہ لئے جائیں، اور ہر طرح مجبور نہ کر دیئے جائیں ہم ضرور ضرور اس کو آپ کے پاس صحیح وسلامت لوٹائیں گے۔ جب ان سب نے متفق ہو کر باپ کے سامنے اس کا پختہ عہد کیا، اور ہر طرح اطمینان دلایا تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اسباب ظاہری کی بنا پر ہے، ورنہ کیا تم اور کیا تمہاری حفاظت اور کیا ہمارا معاہدہ، ہم سب کو چاہئے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

ترجمہ: اور یعقوب نے کہا: اے میرے بیٹو! تم سب ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا، اور مختلف دروازوں سے داخل ہونا، اور میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو تم سے ذرا بھی ٹال نہیں سکتا، حکم صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا، اور چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کریں ﴿۶۷﴾ اور جب وہ اسی طرح داخل ہوئے جیسے ان کے والد نے انہیں حکم دیا تھا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ذرا بھی انہیں کوئی چیز بچانے والی نہ تھی مگر یعقوب کے دل میں ایک حاجت تھی جسے اس نے پورا کرلیا، اور بلاشبہ وہ علم والے تھے، اس وجہ سے کہ ہم نے انہیں سکھایا تھا، اور لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے ﴿۶۸﴾

معارف ومنازل

حضرت یعقوب علیہ السلام اور بیٹوں کے درمیان عہد و پیمان مکمل ہونے کے بعد برادرانِ یوسف علیہ السلام کا قافلہ دوبارہ کنعان سے مصر کو روانہ ہوا، اور اس مرتبہ بنیامین بھی ہمراہ ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام نے رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ دیکھو! سب ایک ہی دروازے سے مصر میں داخل نہ ہونا، بلکہ متفرق دروازوں سے شہر میں داخل ہونا، اور یہ بھی فرمایا کہ اس نصیحت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم اپنی تدابیر پر مغرور ہو کر بیٹھو، کیونکہ میں تمہیں کسی ایسی بات سے ہرگز نہیں بچا سکتا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونے والی ہو، فرمانروائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا، اور تمام بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے، اس لئے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف احتیاطی تدبیر کے طور پر ہے، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور یقین کے ساتھ اسباب ظاہری کو احتیاطی تدبیر کے لئے استعمال کرنا خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے۔

علماء تفسیر عام طور پر حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ عزیز مصر حضرت یوسف علیہ السلام نے چونکہ پہلی مرتبہ ان کا کافی اعزاز کیا تھا، اور یہ قافلہ خاص شان کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی دعوت پر مصر میں

داخل ہو رہا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری لوگ ان سے حسد کرنے لگیں، اور یہ ان کی تکلیف کا باعث بن جائیں۔

لیکن بعض مفسرین اور مؤرخین اس کی وجہ دوسری بتلاتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ تورات سے اس قدر ثابت ہو چکا ہے کہ پہلی مرتبہ برادرانِ یوسف علیہ السلام پر جاسوسی کا گمان کیا جا چکا تھا، اور اگرچہ یوسف علیہ السلام نے یہ الزام نہ لگایا ہو، لیکن مصریوں نے ضرور ان پر شبہ کیا تھا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں کی زبانی پوری تفصیل سن چکے تھے، لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اگر اس مرتبہ گیارہ نوجوان اس کروفر سے ایک ساتھ شہر میں داخل ہوں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عزیزِ مصر کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لئے جائیں، اس لئے نصیحت فرما دی کہ ایک جہتہ بنا کر شہر میں داخل نہ ہونا، جدا جدا دروازوں سے ایک مسافر کی طرح داخل ہونا۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ شانہ نے اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام چونکہ صاحب علم و بصیرت تھے، اور یہ دولتِ علم ہم نے ہی ان کو بخشی تھی، اس لئے انہوں نے بیٹوں سے یہ نصیحت کی بات کہہ دی جوان کے خیال میں آگئی تھی، ورنہ تو باپ کے حکم کی تعمیل کرنے کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت نے جو کچھ مقرر کر دیا تھا اس کے مقابلے میں ان کی یہ احتیاط کچھ بھی کام نہ آسکی، وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

﴿وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ ۗ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ مطلب یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو کچھ کہا اس کو بمقتضائے علم یہی کرنا چاہیے تھا، کیونکہ علم کی یہ دولت ہم نے ہی اس کو بخشی تھی، مگر یہ ضروری نہیں کہ احتیاطی تدابیر ہر جگہ کارآمد ہی ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کے برعکس مصلحت دیکھتی ہے تو پھر وہی ہو کر رہتا ہے، اور سب تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں جیسا کہ آنے والے واقعہ میں بنیامین کے ساتھ پیش آیا کہ وہ قافلہ سے روک لئے گئے، اور ایسی مصلحت کے زیرِ اثر روک لئے گئے کہ اس کا انجام تمام خاندان یعقوب علیہ السلام کے حق میں گرانقدر و بہتر ثابت ہوا۔

صورت یہ پیش آئی کہ جب برادرانِ یوسف علیہ السلام کنعان سے روانہ ہوئے تو راستے میں "بنیامین" کو تنگ کرنا شروع کر دیا، کبھی ان کو باپ کی محبت و عشق کا طعنہ دیتے، اور کبھی اس بات پر حسد کرتے کہ عزیزِ مصر نے خصوصیت کے ساتھ اس کو کیوں بلایا ہے۔ "بنیامین" یہ سب کچھ سنتے اور خاموش رہتے، جب یہ سب منزل مقصود پر پہنچے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو اپنا تمام ماجرا اور اس پر جو گزرا تھا سارا سنا دیا، اور انہیں تنہائی میں بتایا کہ میں تمہارا

حقیقی بھائی یوسف علیہ السلام ہوں، اور پھر تسلی و تشفی کی کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں، ان کی ناروا بدسلوکیوں کا دور ختم ہوا، اب یہ تم کو کسی قسم کی ایذا نہیں پہنچا سکیں گے، لہٰذا میرے ساتھ رہو، اور دیکھو کہ کس تدبیر سے تم کو یہاں بسائیں گے، اور انہیں رخصت کریں گے۔

قرآن کریم کے قارئین خوب اندازہ لگائیں کہ نبوت کا مقام کتنا ارفع و عالیشان اور بلند ہوتا ہے، ان بھائیوں نے ظلم و بے رحمی کا وہ کونسا شوشہ ہے جسے چھوڑا ہو، انہوں نے حد کر دی، ایسا ظلم شاید انسانیت کی تاریخ میں نہ ہو، آج بادشاہ مصر کے وہ ہاتھ میں ہیں، اگر وہ انہیں ہمیشہ کے لئے فنا کر دے تو ہے کوئی اس سے پوچھنے والا؟ مگر یہ صرف بادشاہ نہیں بلکہ نبوت و پیغمبری سے بھی سرشار و سرفراز ہیں، اور ان کی مہربانیوں کا تذکرہ عنقریب آنے والا ہے۔

……❁……❁……❁……

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّيْٓ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِيْ رَحْلِ اَخِيْهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾ قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

ترجمہ: سو جب وہ یوسف پر داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے بھائی کو اپنے پاس ٹھکانہ دیا، اس سے کہا کہ میں بے شک تیرا بھائی ہوں، لہٰذا تو اس کا غم نہ کر جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں ﴿۶۹﴾ پھر جب انہیں سامان دے کر تیار کر دیا تو ایک پانی پینے کا برتن اپنے بھائی کے کجاوہ میں رکھوا دیا، پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا کہ اے قافلہ والو! بلاشبہ تم چور ہو ﴿۷۰﴾ وہ کہنے لگے اور ان کی طرف آگے بڑھے کہ تم کس چیز کو گم پا رہے ہو؟ ﴿۷۱﴾ انہوں نے کہا کہ ہمیں بادشاہ کا پیمانہ نہیں مل رہا ہے، اور جو شخص اسے لے کر آئے اس کے لئے ایک اونٹ کا بوجھ ہے، اور میں اس کا ذمہ دار ہوں ﴿۷۲﴾ وہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی قسم آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ہم لوگ اس لئے نہیں آئے کہ زمین میں فساد کریں، اور نہ ہم چور ہیں ﴿۷۳﴾ وہ کہنے لگے کہ پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے؟ ﴿۷۴﴾ کہنے لگے کہ اس کی سزا یہی ہے کہ جس کے کجاوہ میں یہ پیمانہ پایا جائے تو خود اس کی ذات ہی اس کا بدلہ ہے، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیا کرتے

ہیں⑮

معارف ومنازل

جب یہ گیارہ بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے جن میں ان کے حقیقی بھائی بنیامین بھی تھے، پس بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے بنیامین کو پیش کیا اور کہا کہ بادشاہ سلامت اب آپ کی شرط پوری ہوگئی جو آپ نے کہا تھا کہ اپنے سوتیلے بھائی کے بغیر نہ آنا، جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حقیقی بھائی کو دیکھا تو خوش ہوئے، مگر بھائی انہیں شناخت نہ کر سکے۔

مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ یوسف نے علیہ السلام ہر دو دو آدمیوں کو ایک ایک کمرے میں رکھنے کا حکم دیا، دس بھائی پانچ کمروں میں ٹھہر گئے، گیارہویں بھائی بنیامین کو الگ اپنے پاس ٹھہرالیا، اس طرح یہ سب شاہی مہمان خانہ میں شاہانہ انداز میں ٹھہرے، مگر وہ حقیقت حال سے مستقل بے خبر رہے، اور وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ سب کچھ باپ کی دعاء بھی ہے، اور بادشاہ کریم النفس رحمدل مہمان نواز ہے۔ ادھر یوسف علیہ السلام نے بھائی سے اپنا تعارف کر کے انہیں ہر طرح مطمئن کردیا، اور انہیں بھائیوں کے بے رحمانہ سلوک پر صبر کرنے اور درگزر کرنے کی تلقین فرمائی، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا اکرم فرمایا، ہمیں اور تمہیں زندگی میں جمع فرمایا۔

پھر اپنے خدام کو حکم دیا کہ ان مہمانوں کا غلہ اور دیگر سامان تیار کر کے ان کی روانگی کا انتظام کرلو، لیکن چپکے سے پانی پینے کا شاہی برتن جو بہت قیمتی اور چاندی کا تھا اسے بینامین کے کجاوہ کے خورجی میں ڈال کر چھپاؤ، یہ کام ایک خادم نے انجام دیا تھا، باقی خدام کو اس راز کا علم نہ تھا۔

جب یہ کام مکمل ہوگیا اور قافلہ روانہ ہونے لگا، بعضوں نے کہا کہ قافلہ ایک آدھ میل سفر بھی طے کر چکا تھا کہ عین اس وقت خدام نے اس پیالہ کو جب نہیں پایا تو انہیں بڑی حیرانی ہوئی اور بادشاہ کی طرف سے باز پرس کا بھی ڈر دامن گیر ہوا، لہٰذا ان خدام میں سے ایک شخص نے بلند آواز سے پکار کر کہا کہ اے قافلے والو! تم تو چور ہو۔ یہ سنتے ہی برادرانِ یوسف علیہ السلام حیران رہ گئے، انہیں اپنی جماعت کے کسی فرد کے بارے میں بھی چوری کرنے کا گمان نہ تھا، تو وہ کہنے لگے کہ آپ لوگوں کی کیا چیز گم ہے؟ جس کے بارے میں تم ہمیں چور کہتے ہو؟ ان لوگوں نے جواب میں کہا کہ ہمیں بادشاہ کا پیمانہ نہیں مل رہا ہے، جس کے ذریعہ غلہ ناپا جاتا ہے، اور جو شخص اس پیمانے کو لے کر آئے ہم اسے ایک

اونٹ کا بوجھ مزید غلہ دیں گے جو بطور انعام ہوگا۔

جس شخص نے گمشدگی کا اعلان کیا تھا اس نے یہ بھی کہا کہ یہ جھوٹا وعدہ نہیں ہے، جو بھی شخص یہ پیمانہ لے کر آئے گا اسے واقعی انعام دیا جائے گا، اور میں اس کا ضامن اور ذمہ دار ہوں۔ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ بھلا ہم اور چوری؟ آپ لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم لوگ شریف اور امانتدار ہیں، اور ہم لوگ فساد کرنے والے اور غیر مہذب لوگ نہیں، ہم چوری سے خود ہی نفرت کرنے والے لوگ ہیں، نہ ہم پہلے سے چور ہیں نہ ابھی چوری کی ہے۔ بادشاہ کے خدام نے کہا کہ اگر تلاش اور تفتیش کے بعد تم لوگ اپنی بات میں جھوٹے ثابت ہوئے اور تمہارے سامان سے ہمارا گمشدہ پیمانہ برآمد ہوگیا تو بتاؤ اس کے چرانے والے کی سزا کیا ہوگی؟

برادرانِ یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے کجاوہ سے وہ پیمانہ برآمد ہوگا اسی شخص کو اس پیمانہ کے بدلہ میں رکھ لیا جائے، یعنی اسے غلام بنالیا جائے، اور ساتھ ہی:

﴿كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ کہہ کر یہ بھی بتادیا کہ ہمارے دین اور شریعت میں چور کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے (کہ چور کو غلام بنا کر رکھ لیا جائے)۔ دراصل یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں چور کی سزا یہ تھی کہ وہ مالک کا ایک سال تک غلام بن کر اس کی خدمت کرتا تھا، تو برادرانِ یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی شریعت کا حکم یہاں بھی بیان کیا۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

ترجمہ: پھر یوسف نے اپنے بھائی کے تھیلے کی تلاشی لینے سے پہلے دوسرے بھائیوں کے تھیلوں کی تلاشی لینے سے ابتدا کی، پھر اس پیمانہ کو اپنے بھائی کے تھیلے سے برآمد کرلیا، ہم نے یوسف کو اسی طرح تدبیر بتادی، بادشاہ کے قانون میں اپنے بھائی کو لے نہیں سکتے تھے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے، ہم جسے چاہیں درجات کے اعتبار سے بلند کرتے ہیں، اور ہر جاننے والے سے اوپر زیادہ جاننے والا ہے ﴿۷۶﴾

معارف ومنازل

جب طے شدہ معاملے کی روشنی میں حضرت یوسف علیہ السلام کے حکم پر اس کے کارندوں نے قافلہ والوں کے

کجاوے اور سامانوں کی تلاشی شروع کردی، تو سب سے پہلے برادران یوسف علیہ السلام کے تھیلوں کی تلاشی شروع کردی، بنیامین کے کجاوے کی تلاشی کسی حکمت کے تحت مؤخر کردی، جب ایک ایک بھائی کی تلاشی ہوتی رہی اور سارے مطمئن رہے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ہم نے کوئی ایسی غلطی نہیں کی ہے جس سے ہمیں ندامت اور شرمندگی ہو، یہاں تک کہ جب دس کے دس بھائیوں کی تلاشی مکمل ہوگئی، اور پیمانہ کسی کے سامان سے برآمد نہیں ہوا تو آخر الامر جب بنیامین کے کجاوے کی تلاشی شروع ہوئی جسے سارے بھائی اور خدمت گار دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ان کے سامان سے پیمانہ برآمد ہوا، جسے برادران یوسف علیہ السلام اپنی آنکھوں سے دیکھ کر نہایت پریشان اور حد سے زیادہ رنجیدہ ہوگئے کہ یہ کیا ہوا، اور کیسے ہوا؟

یہ تدبیر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بتادی، جس کے ذریعہ وہ اپنے بھائی کو اپنے پاس روک سکتے تھے، جس کی تائید ان کے برادران نے بھی کی تھی، اور اپنے باپ کی شریعت کا حکم ظاہر کیا تھا، ورنہ بادشاہ مصر کے قانون اور آئین کی رو سے ایسا وہ ہرگز نہیں کر سکتے تھے کہ چوری کرنے والے کو غلام بنالیا جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ درجات بلند فرمائے، انہیں تعبیر رؤیا کے علاوہ بہت سے علوم عطا فرمائے تھے، انہی علوم میں سے ایک تدبیر یہ بھی تھی جو ان کے اپنے بھائی کو روکنے کے لئے ان کے دل میں ڈالی۔

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾ مطلب یہ ہے کہ بڑے سے بڑے عالم کے مقابلے میں کوئی ایسا ضرور ہے جو اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہے، جیسے خضر علیہ السلام بمقابلہ موسیٰ علیہ السلام اور جسے ساری مخلوقات سے زیادہ علم ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہے جس کو سب سے زیادہ علم ہے۔

فائدہ:

حضرت یوسف علیہ السلام بڑے جلیل القدر پیغمبر ہیں، وہ کسی بھی انتقامی کاروائی کرنے اور بھائیوں کو پریشان کرنے اور انہیں کسی چوری میں متہم کرنے وغیرہ اقدامات سے بری اور پاک ہیں، یہ جو کچھ ہوا اور اس پر وہاں کے لوگ خاص کر خدام اور کارندے شامل تھے، اور قافلہ والوں کو جو سبکی اور شرمندگی پیش آئی یہ یوسف علیہ السلام کی طرف سے نہیں تھی، ان سب امور کا فیصلہ اوپر سے ہو چکا تھا، اور یہ سب بامر الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے مظاہر تھے، جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء و امتحان کی تکمیل ہو رہی تھی۔ اس بات کا اشارہ خود قرآن حکیم کی آیت میں

ہے:

﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ﴾ یعنی ہم نے اسی طرح تدبیر تیار کی یوسف علیہ السلام کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کی، اور یہ معاملہ آئندہ کے لئے بمنزلہ مقدمہ کے بھی ہے، جس کے ذریعہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب کی تعبیر کی تکمیل ہونے والی ہے، جیسا کہ یہ مسئلہ آئندہ آنے والا ہے: ﴿وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ﴾۔ دیکھئے اس آیت میں واضح طور پر حیلہ وتدبیر کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ یہ سب کام جبکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئے تو ان کو نامناسب کہنے کے کوئی معنی نہیں رہتے، اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے حضرت موسیٰ وحضرت خضر علیہما السلام کے واقعہ میں کشتی توڑنا، بچہ کو قتل کرنا، منہدم دیوار کو تعمیر کرنا، جو بظاہر گناہ تھے، اسی لئے موسیٰ علیہ السلام ناراض ہوگئے، مگر خضر علیہ السلام یہ سب کام اللہ تعالیٰ کے امر اور حکم کے ساتھ انجام دیتے تھے، اس لئے کہ تکوینی طور پر انہیں ایسا کرنے کا حکم ملا تھا، تو یہاں بھی وہی حکمت پوشیدہ تھی۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: برادرانِ یوسف کہنے لگے کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کا بھائی بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے، سو یوسف نے اس بات کو اپنے دل میں چھپالیا، اور اس کو ظاہر نہیں کیا، کہا کہ تم زیادہ برے ہو، اور اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو ﴿۷۷﴾ وہ کہنے لگے کہ اے عزیز! اس کے جو والد ہیں وہ بہت زیادہ بوڑھے ہیں، سو آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو رکھ لیجئے، بلا شبہ ہم آپ کو اچھا برتاؤ کرنے والوں میں سے دیکھ رہے ہیں ﴿۷۸﴾ یوسف نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ دے کہ جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا کسی دوسرے کو پکڑ لیں، اگر ایسا کریں تو بلا شبہ ہم ظلم کرنے والے ہو جائیں گے ﴿۷۹﴾

معارف ومنازل

جب بنیامین کے کجاوہ سے پیالہ برآمد ہو گیا تو بھائیوں کو سخت خفت اور ندامت ہوئی، تو ندامت مٹانے کی

خاطر کہنے لگے کہ اگر اس نے چوری کی ہے تو کون سے تعجب کی بات ہے، اس کا بھائی بھی اس سے پہلے چوری کر چکا ہے (اس بھائی سے حضرت یوسف علیہ السلام مراد ہیں)۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان لوگوں کی بات سن تو لی جس میں ان کی ذات پر حملہ تھا، لیکن ان کی بات کا جو جواب دینا تھا اسے زبان پر نہ لائے، البتہ اپنے دل ہی میں کہا کہ تم اسے اور اس کے بھائی کو چور بتا رہے ہو، حالانکہ تم خود چوری کے درجے سے اور بھی زیادہ بُرے ہو، ہم دونوں بھائیوں نے تو چوری کی ہی نہیں، لیکن تم نے اتنا بڑا برا کام کیا کہ آدمی ہی غائب کر دیا، اور چند درہم پر کنویں میں ڈال دینے کے بعد قافلہ والوں پر غلاموں کی طرح فروخت کر دیا، تمہارا اپنا دامن کتنا گندہ اور ناپاک ہے، جس کا تمہیں احساس تک نہیں، یہ بات زبان سے نہیں دل ہی میں کہی، اور علانیہ طور پر فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے جو کچھ تم بیان کرتے ہو، اور ابھی تک نہیں جانتے ہو کہ ہمارا آخری انجام کیا ہوگا؟

حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف ان کے بھائیوں نے جو چوری کی نسبت کی یہ محض حسد وعناد کا آخری حربہ تھا، جو ان کے دلوں میں ابھی تک چھپا ہوا تھا، جس کا انہوں نے اظہار کیا اور اطمینان حاصل کیا۔

البتہ صاحب روح المعانیؒ نے اس بارے میں پانچ قول نقل کئے ہیں، اور صاحب مظہریؒ نے دو قول نقل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام صغرسنی میں دسترخوان سے کھانا لے کر چھپا لیتے تھے، پھر اُسے فقراء کو دیتے تھے، اسی کو حاسدوں نے چوری بنالیا اور طعنہ دیا۔ ممکن ہے کوئی اور واقعہ ہوا ہو، یہ سب اسرائیلی روایات ہیں، جن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، کسی نے پٹکے کا اور کسی نے کسی مرغی کا تذکرہ کیا ہے، جن کی کوئی سند نہیں۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چوری کا کوئی قصہ تھا ہی نہیں، ان لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں ایسی بات بالکل جھوٹ ہی کہی تھی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت یوسف علیہ السلام نے انہیں جو جواب دیا اور:

﴿اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا﴾ فرمایا: یہ سب دل ہی دل میں تھا، لیکن برادران یوسف علیہ السلام نے پہلے ہی اپنے والد سے دغا کیا تھا اور شرمندہ تھے، اور ان کے ایک محبوب بیٹے کو گم کر چکے تھے، اور اب یہ دوسرا واقعہ پیش آیا، اور بنیامین روک لیا گیا، وہ حیران وپریشان تھے کہ اس مرتبہ والد کو کیا جواب دیں؟ تب عزیز مصر کی خدمت میں عرض گزار ہوئے کہ یہ جو ہمارا سوتیلا بھائی جو چوری کی وجہ سے پکڑا گیا یہ اس کے بوڑھے باپ کے لئے بہت زیادہ مصیبت کی بات

ہوگی، ان کو اس بیٹے سے بہت ہی محبت اور موانست ہے، جب یہ بیٹا صحیح سلامت بوڑھے باپ کے پاس نہیں پہنچے گا تو باپ کی حالت نہایت دگرگوں ہو جائے گی، لہٰذا آپ براہ کرم اپنی ذرہ نوازی سے اس کی جگہ ہم میں سے کسی بھی ایک کو اس کی جگہ رکھ لیجئے، ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ احسان کرنے والوں میں سے ہیں، لہٰذا ہماری تجویز قبول کیجئے اور ہمارے عمر رسیدہ بوڑھے باپ پر رحم فرمائیے، کیونکہ ہم کسی صورت میں بغیر اس بھائی کے اپنے باپ کے سامنے جانے سے نہایت شرمندہ ہو جائیں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ معاذ اللہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اصل مجرم کو تو چھوڑ دیا جائے اور خانہ پری کر کے کسی دوسرے بے گناہ کو اس کے بدلے سزا دی جائے، ایسے کرنے والے لوگ ظالم ہی ہوں گے جس کے لئے ہم کیسے تیار رہیں گے؟ ہم تو انصاف والے لوگ ہیں، صرف اس کو پکڑیں گے جس سے ہمارا مال برآمد ہوا ہے، لہٰذا تمہاری غلط اور بے انصافی پر مبنی تجویز کو ہم مسترد کرتے ہیں۔

❀ ❀ ❀

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِرْجِعُوْۤا اِلٰۤى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَاۤ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْۤ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ: پھر جب یوسف سے ناامید ہو گئے تو وہاں سے علیحدہ ہو کر آپس میں مشورہ کرنے لگے، ان میں جو سب سے بڑا تھا اس نے کہا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ تعالیٰ کی قسم لے کر پکا وعدہ لیا تھا؟ اور اس سے پہلے تم یوسف کے بارے میں قصور کر چکے ہو سو اب میں اس سرزمین سے ہرگز نہیں نکلوں گا جب تک میرا باپ مجھے اجازت نہ دے، یا اللہ تعالیٰ میرے لئے فیصلہ نہ فرما دے، اور وہ فیصلہ دینے والوں میں سب سے اچھا فیصلہ دینے والا ہے ﴿۸۰﴾ تم لوگ اپنے والد کے پاس چلے جاؤ اور ان سے کہو: اے ابا جان! بیشک آپ کے بیٹے نے چوری کر لی، اور ہم اسی بات کی گواہی دے رہے ہیں جس کا ہمیں علم ہے، اور ہم غیب کی باتوں کے حافظ نہیں تھے ﴿۸۱﴾ اور آپ اس بستی والوں سے پوچھ لیجئے جس میں ہم تھے، اور اس قافلے سے پوچھ لیجئے جن میں ہم شامل ہو کر آئے ہیں، اور بلاشبہ ہم سچ

کہہ رہے ہیں۸۷

معارف ومنازل

برادران یوسف علیہ السلام کا آپس میں مشورہ:

حضرت یوسف علیہ السلام کے جواب سے جب یہ لوگ ناامید ہوگئے کہ وہ کسی طرح بنیامین کو چھوڑ کر ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ قبول نہیں کرے گا تو وہاں سے ہٹ کر آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اب کیا کریں؟ ان میں سے جو بڑا بھائی تھا جس کا نام کسی نے یہودا کسی نے روبیل اور کسی نے شمعون بتایا ہے، اس نے باقی بھائیوں سے خطاب کر کے کہا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ جب اپنے والد سے رخصت ہو رہے تھے تو انہوں نے ہم سب سے مضبوط قسم لے لی، اور فرمایا کہ تم بنیامین کو ضرور واپس لے کر آؤ گے، اب معاملہ یہ پیش آیا جس کا کوئی حل ہمارے پاس نہیں، اور اس سے پہلے تم یوسف علیہ السلام کے بارے میں قصور کر چکے ہو، اب والد صاحب کے پاس کس منہ سے جائیں گے؟ وہ پہلے سے غمزدہ اور پریشاں ہیں، اب (یک نہ شد دو شد) یہ دوسرا غم اس پر ڈال کر ہم تو شرم کے مارے زمین میں زندہ ڈوب جائیں گے، لہٰذا میں یہاں ہی رہوں گا، یہاں سے ہرگز نہیں نکلوں گا جب تک وہ مجھے نہ بلائیں اور آنے کی اجازت نہ دیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ فرمادے، عزیز مصر کے دل میں رحم وکرم ڈال دے، اور وہ بھائی کو میرے ساتھ چلنے کی اجازت دے، بیشک وہ ارحم الراحمین سب سے اچھا فیصلہ دینے والا ہے۔

پھر بڑے بھائی نے انہیں یہ مشورہ دیدیا کہ مجھے یہیں چھوڑ دو اور تم سب واپس والد گرامی کے پاس چلے جاؤ، اور انہیں صورت حال سے آگاہ کرو، چونکہ ہم پہلے سے ان کے ہاں اپنا اعتماد کھو چکے ہیں، وہ کسی صورت تمہارے کہنے پر پہلے کی طرح یقین نہیں کریں گے، صرف جان خلاصی کے طور پر اصل صورت حال انہیں بتادو کہ آپ کے بیٹے نے چوری کرلی، ہم موقع پر حاضر تھے کہ اس کے کجاوے سے شاہی پیمانہ برآمد ہوا جس کے ہم چشم دید گواہ ہیں، وہاں کے لوگ بھی گواہ ہیں، اور ہمارے قافلے میں شامل علاقے کے لوگ بھی چشم دید گواہ ہیں، آپ اگر ہماری گواہی پر اعتماد نہیں کرتے تو ان دوسرے لوگوں سے بالواسطہ اور بلاواسطہ استفسار کر سکتے ہیں، وہ سب آپ کو معلومات فراہم کریں گے، وغیرہ۔

﴿وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو قسم کھا کر اس کی حفاظت کا وعدہ کر گئے تھے وہ

ہماری قدرت اور اختیار تک محدود تھا، ہمیں کیا معلوم تھا کہ چوری کا واقعہ پیش آ جائے گا، اور پھر ایسی صورت حال بن جائے گی کہ ہم بھائی کو واپس لانے سے عاجز ہو جائیں گے۔

بعض مفسرین نے یہ مطلب بتایا کہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ ہماری موجودگی میں چوری کا مال اس کے سامان سے برآمد ہوا تھا، اس کے علاوہ ہمیں کسی غیب کا پتہ نہیں کہ اس نے قصداً چوری کی یا کسی نے بدخواہی کے طور پر اس کے سامان میں پیمانہ رکھ دیا۔ واللہ اعلم

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ
الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۸۳﴾ وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ
كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾ قَالَ
اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ
يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ: یعقوب نے کہا: بلکہ تمہارے نفسوں نے تمہیں ایک بات سمجھا دی ہے، سو میں صبر جمیل کو ہی اختیار کروں گا، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس لے آئے گا، بلا شبہ وہ علم والا ہے، حکمت والا ہے ﴿۸۳﴾ اور ان کی طرف سے رخ پھیر لیا اور کہا کہ یوسف پر افسوس ہے، اور غم کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں، سو وہ گھٹتے رہتے تھے ﴿۸۴﴾ بیٹوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! آپ تو برابر یوسف کو یاد کرتے رہیں گے یہاں تک کہ گھل جائیں یا ہلاک ہونے والوں میں سے ہو جائیں ﴿۸۵﴾ یعقوب نے کہا کہ میں اپنے رنج اور غم کی اللہ تعالیٰ ہی سے شکایت کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے وہ علم عطا ہوا ہے جو تم نہیں جانتے ﴿۸۶﴾ اے میرے بیٹو! تم جاؤ اور یوسف کو اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں ﴿۸۷﴾

معارف ومسائل

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے جب سارا ماجرا سنایا، اور بنیامین کی چوری اور پکڑے جانے کا واقعہ

انہیں بتایا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو یقین نہ آیا، انہوں نے وہی الفاظ دہرا دیئے جو حضرت یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے موقع پر فرمائے تھے یعنی: ﴿بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ﴾ کیونکہ وہ اگر چہ بنیامین کے معامل میں سچے تھے مگر جب کوئی شخص ایک مرتبہ جھوٹا ثابت ہوجائے تو اس کا اعتبار آئندہ نہیں رہتا اگر چہ وہ سچ بولے، تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ بنیامین نے چوری کی ہو اور وہ وہاں گرفتا ہوا ہو، میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ تمہارے نفسوں نے اپنے پاس سے بات بنالی، اور اسے ایسا غائب کر دیا جس طرح اس کے بھائی یوسف علیہ السلام کو غائب کر دیا، یہ واقعہ اسی پرانے واقعہ کی کڑی معلوم ہوتی ہے، میرے لئے سوائے صبر جمیل کے دوسرا راستہ کوئی نہیں، اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟

البتہ میرے دل کی یہی ایک تمنا ہے کہ ضرور ایک دن ایسا آئے گا کہ یوسف علیہ السلام اور بنیامین اور تیسرا بھائی جو مصر میں رہ گیا تمہارے ساتھ نہیں آیا ان تینوں کو اللہ تعالیٰ مجھ سے ملا دے گا، اللہ تعالیٰ کو پوری حالت کا علم ہے، اور میری پریشانیوں میں اس کی بہت ساری حکمتیں ہیں، یہ کہہ کر بیٹوں سے منہ پھیر لیا اور کہنے لگے کہ یوسف علیہ السلام کی جدائی پر صدمہ اور افسوس ہے۔

اس طرح روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہوگئیں اور کمر کبڑی ہوگئی، ضعف بہت ہی بڑھ گیا، اور شدت غم سے روز روز گھٹتے گئے۔ بیٹوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم! یوسف علیہ السلام کی وفات پر چالیس سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا، آپ پھر بھی برابر اسے یاد کرتے ہیں یہاں تک کہ گھل کر رہ جائیں گے، برف کی طرح پگھل کر فنا ہوجائیں گے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہیں میرے رونے سے کیا بحث ہے؟ میں نے صبر جمیل اختیار کر کے یہی فیصلہ کیا ہے کہ ہرگز جزع فزع اور مخلوق کے سامنے اپنے درد اور دکھ کا اظہار نہیں کروں گا، اور میں:

﴿إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ﴾ کا پابند ہوں کہ اپنی بے بسی اور بیکسی صرف اس کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ حدیث شریف میں روایت ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اکثر صبح کی نماز میں سورۂ یوسف کی تلاوت کرتے تھے، اور جب آیت: ﴿إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي﴾ پر پہنچتے تھے تو بے خودی میں اتنے زور سے چیخ کر روتے تھے کہ آپ رضی اللہ عنہ کے رونے کی آواز آخری صفوں تک پہنچ جاتی۔ [بخاري]

حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ میرے والد یعقوب علیہ السلام کے غم و پریشانی کا میرے بارے میں کیا حال ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا

کہ ان کو تمہاری جدائی کا اس قدر غم ہے کہ اگر ستر مردوں یا ستر عورتوں کے غم کو اکٹھا کیا جائے جن کا کوئی آدمی گم ہو گیا ہو تو ان کے غم کے برابر ہوگا، یعنی یعقوب علیہ السلام کا غم ستر آدمیوں کے غم کے ساتھ برابر ہے۔[تفسیر کبیر]

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جو خواب دیکھا تھا کہ مجھے گیارہ ستارے چاند اور سورج سجدہ کر رہے ہیں اس کی تعبیر ابھی پوری نہیں ہوئی، اور وہ جانتے تھے کہ ایسا ہو کر رہے گا، اور یہ ضروری ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام دنیا میں موجود ہیں، البتہ مجھے ان کی موجودگی کے مقام کا علم نہیں، مگر امید یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا انتظام ضرور فرمائے گا، مجھے یقین ہے کہ یوسف علیہ السلام کو نہ موت آئی ہے، نہ ان کی ملاقات سے پہلے مجھے دنیا سے جانا ہے، ہمیں سب کو ایک دن جمع ہونا ہی ہے، اور ہم سب نے اس کے قدموں پر سجدہ کرنا ہی ہے جو کہ اٹل اور پختہ ہے۔

مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ ممکن ہے کہ تمام ابتلاء وامتحانوں کی تکمیل کے بعد انہیں الہام یا بذریعہ وحی معلوم کیا گیا ہو تب انہوں نے بیٹوں سے فرمایا کہ چلے جاؤ یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی کی تلاش شروع کرو، اور اللہ تعالیٰ سے اور اس کی رحمتوں سے ناامید نہ ہو جاؤ۔

❀ ❀ ❀

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا
الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ
وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾ قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ
عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ
عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

ترجمہ: سو جب یہ لوگ یوسف پر داخل ہوئے تو کہنے لگے کہ اے عزیز! ہمارے اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے، اور ہم یہ ایسی پونجی لائے ہیں جو نکمی ہے، سو آپ ہمیں پورا غلہ دید یجئے، اور ہم پر صدقہ کر دیجئے، بیشک اللہ تعالیٰ صدقہ کرنے والوں کو اس کی جزا دیتا ہے ﴿۸۸﴾ یوسف نے کہا: کیا تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جبکہ تم جاہل تھے؟ ﴿۸۹﴾ کہنے لگے: کیا واقعی آپ یوسف ہیں؟ یوسف نے کہا: میں یوسف ہوں اور یہ میرا

بھائی ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا، بلا شبہ بات یہ ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتا ﴿۹۰﴾ کہنے لگے: اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے تجھے ہم پر فضیلت دیدی، اور بلا شبہ ہم خطا کرنے والوں میں سے تھے ﴿۹۱﴾ یوسف نے کہا: آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تعالیٰ شانہ تمہاری مغفرت فرمائے، اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے ﴿۹۲﴾

معارف ومنازل

قدرتِ الٰہی کے کمالات اور اس کی نیرنگیوں کے عجائبات کہ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے ایک بیگناہ بچہ اپنے بے رحم اور بھیڑیا صفت بھائیوں کے سامنے رو رو کر ہاتھ باندھتا رہتا ہے، اور انہیں غیور وجبار خدا کا واسطہ بھی دیتا ہے کہ مجھ پر رحم کرو، میں تمہارا بھائی ہوں، تم مجھے ہلاک نہ کرو، مگر وہ کبر وغرور میں مست اور بھیڑیوں سے کہیں زیادہ درندے اور بے رحم نہ خدا کو نہ اپنے باپ کو اور نہ ہی اپنے دینی اقدار کو خیال میں لاتے ہیں، نہ انسانیت کا کوئی خیال ان کے سینوں میں ابھر کر سامنے آتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس اپنے چھوٹے معصوم بھائی کو ایک تنگ وتاریک گمنام کنویں میں گرا دیتے ہیں (یہ سچ ہے کہ مارنے والوں سے بچانے والا طاقتور ہے، اور جسے قدرت رکھے اسے کون چکھے) تو ربّ ذوالجلال عزّ شانہ اسے تمام پستیوں سے نکالتا ہے، دین ودنیا دونوں کی عظمتوں اور بلندیوں پر بٹھا کر پھر ان بے رحم بھائیوں اور ناعاقبت اندیشوں کو اس کے دروازے اور دربار پر کھڑا کرتا ہے، وہ سونے چاندی جواہرات کے بارہ فٹ اونچے بلند تخت پر بیٹھا ہوا ہے، اور یہ دس کے دس زمین پر کھڑے آمنے سامنے ہاتھ باندھ کر اس سے صدقہ وخیرات کا عاجزانہ فقیرانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر مطالبہ کر رہے ہیں، بھیک مانگ رہے ہیں۔

خوب عبرت سیکھو! اور کہو: ﴿اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [آل عمران: ۲۶] (اے اللہ! اے اقتدار کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے اقتدار بخشتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے عزّت بخشتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے رسوا کر دیتا ہے، تمام تر بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

آیت کریمہ کی تفسیر صوفیاء کرام کی نظر میں:

دنیا ایک ہولناک پر خطر کنواں ہے، احکامِ شرعیہ کی پابندی زندان کی مانند ہے، مسلمان بمنزلہ قیدی کے

ہے، "اَلدُّنیا سِجنُ الْمُؤْمِنِ وَ جَنَّۃُ الْکَافِرِ"۔ اس کنویں اور سجن سے نکلنے کا اصلی ذریعہ قرآن حکیم ہے جو کہ مسلمان کے لئے ذریعہ نجات اور اس کے حق میں برزخ اور قیامت میں گواہی دینے والا ہے، اور مسلمان کا خریدار (عزیز مصر کی طرح) حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ ہے جیسے ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ [التوبة: ۱۱۱] (بیشک اللہ نے خرید لیا ہے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال کہ ان کے لیے جنت ہے)۔

جب مسلمان حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح صبر، تقویٰ، استقامت اور عفت و پاکدامنی کے ساتھ یہ سارے مراحل طے کرے گا تو اس کے لئے جنت اور جنت کے درجات ہوں گے جو کہ ایک عظیم بادشاہت اور حکمرانی ہے۔ ﴿وَاِذَا رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّمُلْكًا كَبِیْرًا﴾ [الدھر: ۲۰] (اور جب تم وہ جگہ دیکھو گے تو تمہیں نعمتوں کا ایک جہاں اور ایک بڑی سلطنت نظر آئے گی)۔

کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے پاس ایک محتاج آدمی غلہ لینے کے لئے آیا، آپ علیہ السلام نے اس کو ایک گزارہ مقدار میں غلہ دینے کی منظوری دیدی، وہ کہنے لگا: بادشاہ صاحب! میں آپ سے نزدیک ہو کر ایک راز کی بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں، فرمایا: اچھا آؤ بتاؤ! وہ جب بہت نزدیک آیا تو کہنے لگا: بادشاہ سلامت! میں وہ شیر خوار بچہ ہوں جس نے شیر خوارگی میں آپ علیہ السلام کے لئے عصمت و پاکدامنی کی گواہی دی، یوسف علیہ السلام تخت سے نیچے اتر کر اس کے ساتھ بغل گیر ہوئے اور اسے اپنے ساتھ تخت پر بٹھا دیا اور اسے دو سو من غلہ اور ایک سو دینار بھی دیدیئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے یوسف! جس شخص نے آپ کے حق میں ایک گواہی دی آپ اس پر اتنا خوش ہوئے کہ اسے دو سو من اناج اور ایک سو دینار دیدیئے، اور جو شخص صبح وشام میری توحید کی گواہی دیتا ہے اور میرے نبی کی رسالت کی گواہی دیتا ہے میں اس پر کتنا خوش ہوتا ہوں۔ [الزھر الفاتح]

اسی کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ [القمر: ۵۵] (جن لوگوں نے تقویٰ کی روش اپنا رکھی ہے وہ باغات اور نہروں میں ہوں گے۔ ایک سچی عزت والی نشست میں۔ اس بادشاہ کے پاس جس کے قبضے میں سارا اقتدار ہے)۔

پرہیزگار اپنی سچائی کی بدولت اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے وعدوں کے موافق ایک پسندیدہ مقام میں ہوں گے، جہاں اس شہنشاہ مطلق کا قرب حاصل ہوگا۔ رَبَّنَا ارْزُقْنَا قُرْبَکَ وَلَا تُبَاعِدْنَا عَنْ رَحْمَتِکَ۔ آمین

﴿فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا﴾ آیات مذکورہ میں یوسف علیہ السلام اوران کے بھائیوں کا باقی قصہ مذکور ہوا کہ ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کو یہ حکم دیا کہ جاؤ یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی کو تلاش کرو، تو انہوں نے تیسری مرتبہ مصر کا سفر شروع کیا۔

کنعان سے ڈھائی سو میل کے فاصلے پر مصر ہے، بنیامین اور بڑے بھائی پہلے سے مصر میں موجود تھے، ان کا حال تو معلوم ہے، اصل تلاش حضرت یوسف علیہ السلام کی زیر غور ہے۔ یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے ابتلاء و امتحان کا معاملہ تقریباً ختم ہونے پر پہنچ چکا تھا، اور بذریعہ الہام یا وحی حضرت یعقوب علیہ السلام کو معلوم ہو چکا تھا، اس لئے چالیس سال کے سکوت اور صبر جمیل کے بعد اچانک انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی تلاش کا حکم دیدیا، اور ربّ العزّت سبحانہ جب کسی کام کے انجام دینے کا فیصلہ فرماتے ہیں تو پہلے اس کے اسباب کو پیدا فرمالیتے ہیں، اب یوسف علیہ السلام کے معلوم ہونے کا جب زمانہ آپہنچا تو اسباب ظاہر ہوگئے، ایک طرف سے تلاش دوسری طرف غلہ کی ضرورت، تیسرا سبب یہ کہ بھائی اس دفعہ فقیرانہ بیکسی کے ساتھ اپنے پورے خاندان اہل وعیال کی مسکنت اور پریشانیوں کا ایک ہمدرد، مہرباں اور احسان کرنے والے پیغمبر بادشاہ کے سامنے تڑپ کر نہایت انکساری کے ساتھ اپنی ضرورت اور حاجت پیش کریں گے، تو وہ ماضی کو بھلا کر کانپ جائیں گے۔

چنانچہ وہ اس مرتبہ آئے تو ان کا حال قابلِ دید تھا، وہ دبے ہوئے تھے، اور ایسے لباس میں آئے تھے کہ انہیں دیکھ کر دل پارہ پارہ ہوجاتا تھا، وہ آتے ہی بجائے بھائی کے لئے سفارش اور رہائی کے مطالبہ کے اپنے خاندانی اور گھریلو معاشی بحرانوں کا نہایت مؤدبانہ سائلانہ مسکنت وانکساری کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے حضرت یوسف صدیق علیہ السلام کے سامنے اس طرح گویا ہوئے:

اے عزیز مصر! ہمارے خاندان کی معاش نہایت ناگفتہ بہ اور ناقابلِ برداشت ہے، ہمیں بہت سے معاشی بحرانوں کا سامنا ہے، ہم پورے خاندان والے بھوک اور تکالیف و پریشانیوں کی زد میں ہیں، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں، بمجبوری گھریلو ناکارہ سامان لے کر آئے ہیں (اونٹ کے پشم، مشکیزہ، کچھ پشم کے تنے ہوئے دھاگے، اور کچھ ناکارہ کھوٹے دراہم) آپ اپنے کریمانہ اخلاق اور ذاتی شرافت اور لطف وکرم سے ہمیں ان ناکارہ سامان کے بدلے اور کچھ احسان مندی کے تحت بغیر عوض صدقہ وخیرات دے کر اس اضطراری حالت میں ہماری دستگیری فرمائیں، ہمیں امید ہے کہ ربّ العلمین جل شانہ آپ کے احسانوں کا آپ کو بڑا اجر وثواب عنایت فرمائے گا۔ فقط

یہ منظر قابلِ دید تھا، زمین پر قطار میں کھڑے سارے بھائی نہایت انکساری کے ساتھ اپنی درد بھری داستان سنا رہے ہیں، سامنے اونچے جواہرات کے تخت پر عزیز مصر جو کہ محض بادشاہ نہیں بلکہ اولوالعزم پیغمبر بھی ہیں جلوہ افروز ہیں، اور نہایت غور سے ان کی معروضات سن رہے ہیں، انہوں نے زبانی منت وسماجت کے بعد عرض کیا کہ عزیز مصر صاحب! ہمارے بوڑھے والد صاحب نے آپ کے نام ایک خط بھیجا ہے اگر اجازت ہو تو آپ کے حوالہ ہی کرلیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے تخت کے بارہ زینے (درج) تھے، وہ تین چار درجہ نیچے اتر کر ان کے ہاتھ سے خط وصول کرتے ہیں، پھر اوپر چڑھ کر کرسی پر پہلے کی طرح بیٹھ کر خط کو پڑھتے ہیں، خط کا موضوع اور عبارت یہ ہے:

مِنْ جَانِبِ يَعْقُوْبَ صَفِيِّ اللّٰهِ بْنِ اسْحٰقَ ذَبِيْحِ اللّٰهِ ابْنِ ابْرَاهِيْمَ خَلِيْلِ اللّٰهِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ۔

بخدمت عزیز مصر! امابعد: ہمارا پورا خاندان بلاؤں اور آزمائشوں میں معروف ہے، میرے دادا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا نمرود کی آگ سے امتحان لیا گیا، پھر میرے والد اسحٰق علیہ السلام کا شدید امتحان لیا گیا، پھر میرے ایک لڑکے کے ذریعہ میرا امتحان لیا گیا جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب تھا، یہاں تک کہ اس کی مفارقت میں میری بینائی جاتی رہی، اس کے بعد اس کا ایک چھوٹا بھائی مجھ غمزدہ کی تسلی کا سامان تھا جس کو آپ نے چوری کے الزام میں گرفتار کرلیا، اور میں بتلاتا ہوں کہ ہم اولاد انبیاء کرام علیہم السلام ہیں، نہ ہم نے کبھی چوری کی ہے نہ ہماری اولاد میں کوئی چور پیدا ہوا۔ والسلام

[قرطبي، مظهري بروایة ابن عباس رضي الله عنه]

عزیز مصر خط کو پڑھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں سے رحمت وشفقت کے آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح پے در پے ٹپک کر گر رہے ہیں۔ اول تو بھائیوں کی مسکنت وعجز وانکساری نے ان کے خون میں تڑپ اور قلب مبارک پر زخم پیدا کیا ہوا تھا، دوئم حضرت والد گرامی کے درد وار مانوں سے بھرے ہوئے خط نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا، سوئم ابتلاء وآزمائشوں کا مرحلہ من جانب حق تعالیٰ رؤف رحیم اپنے اختتام کو پہنچا ہوا تھا (ہوسکتا ہے فرشتہ وحی حضرت جبریل علیہ السلام بھی اس موقع پر موجود ہو)۔

سیدنا یوسف علیہ السلام خط پڑھتے ہوئے روتے رہے، اور جو صیغہ راز فیاض ازل جل شانہ نے چالیس برس سے چھپانے کا حکم دیا ہوا تھا اس سے نقاب اٹھا کر اسے ظاہر کرنے کا حکم صادر فرمایا، تب حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو خطاب کرکے ارشاد فرمایا:

﴿هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ﴾ کیا تم کو یہ بھی یاد ہے کہ تم نے یوسف

اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا برتاؤ کیا تھا جبکہ تم جاہل تھے؟ یعنی ایسا بے رحمی اور غلط کام جاہلوں کا ہوتا ہے کہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کرنے سے جاہل ہوتے ہیں۔

برادرانِ یوسف علیہ السلام نے جب یہ سنا تو چکرا گئے کہ عزیز مصر کو یوسف علیہ السلام سے کیا واسطہ؟ پھر ادھر بھی دھیان گیا کہ یوسف علیہ السلام نے جو بچپن میں خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر یہی تھی کہ ان کو کوئی بلند مرتبہ حاصل ہوگا کہ ہم سب کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا، کہیں یہ عزیز مصر خود یوسف ہی نہ ہوں، پھر مزید شکل وصورت حسن وجمال پر جب غور سے دیکھا تو حیران رہ گئے اور نہایت مخمصہ کے عالم میں ڈوب کر استفہام سے پوچھا:

﴿ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ﴾ کیا سچ مچ تم ہی یوسف ہو؟ تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! میں ہی یوسف ہوں، اور یہ بنیامین میرا حقیقی بھائی ہے، بنیامین اس وقت متصل ایک کمرے میں موجود تھے، بھائی کا ذکر اس لئے فرمایا تا کہ مکمل وضاحت ہو جائے اور انہیں بتادیا کہ جن دو بھائیوں کی تلاش کے لئے تم جو نکلے ہو وہ دونوں تمہارے سامنے موجود ہیں، پھر فرمایا:

﴿قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۖ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے، کامیابی کی کلید تقویٰ اور صبر ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا، ہم دونوں بچھڑے ہوئے بھائی اکٹھے ہو گئے، ہماری غربت عزت وشرف میں بدل گئی، اور تکلیف راحت میں بدل گئی، اب برادرانِ یوسف علیہ السلام کی حالت اور کیفیت دیدنی تھی، وہ اتنے شرمندہ ہو گئے کہ ان کے چہروں کا رنگ فق ہو گیا، اور پسینہ پسینہ ہو کر اتنے نادم اور ملامت ہوئے کہ بجز جرم وخطاء کے اعتراف اور معافی مانگنے کے ان کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا، اور مجبور ہو کر انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے فضل وکمال اور صبر وتقویٰ کا برملا بیک زبان اقرار کرنا ہی پڑا:

﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے تجھے ہم پر فضیلت دیدی، اور بلاشبہ ہم خطا کرنے والوں میں سے تھے۔

ع چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

کہنے لگے: خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم سب پر بے انتہا برتری عطا فرمائی، آپ جیت گئے اور ہم ہار گئے، آپ احسان کے سایہ میں اور ہم خطاؤں کی وادی میں بھٹکتے پھرے، ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم خطا کار، مجرم اور گناہگار ہیں، اور ہم اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کہتے ہیں کہ آپ ہمیں معاف کرتے ہوئے درگزر فرمائیں، انہوں نے

اپنی پیغمبرانہ شان کے مطابق فرمایا:

﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴾ میں تم سے تمہارے مظالم کا تو انتقام کیا لیتا بلکہ تمہیں ملامت بھی نہیں کرتا، یہ عفو ودرگزر میری طرف سے ہے، مزید اپنے پروردگار سے بھی تمہاری معافی کا خواستگار رہوں گا کہ وہ تمہاری مغفرت فرمائے، وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا ہے، اور سب مہربانوں سے بہت بڑا مہربان ہے۔

سورت کے شروع میں اس واقعہ کو "احسن القصص" فرما کر واضح کیا کہ کائنات میں ربّ العزّت کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا، اور ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کتنے بڑے جری اور حوصلہ مند ہوتے ہیں، اور اپنی ذات کے لئے کبھی انتقامی جذبہ نہیں رکھتے ہیں۔

قریش مکہ نے ۱۳ سال تک سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ستایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے اور گرائے، صحابیات رضی اللہ عنہن تک کو معاف نہیں کیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ پہنچے تو انہوں نے وہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب جاری رکھا، کئی معرکے ہوئے، حدیبیہ کے میدان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بغیر ادائیگی عمرہ کے مدینہ منورہ واپس کیا، ۸ ھجری میں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح فرمایا تو سارے قریش پریشانی میں ڈوب گئے، بعضوں کے دماغ کام چھوڑ گئے، ایک "ہو" کا عالم تھا، سب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مسلح فاتح لشکر کے سامنے جھکے ہوئے زمین پر مٹی کو ہاتھوں سے تہہ وبالا کرتے ہوئے اپنی تباہی کے منتظر تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرما کر کہا کہ آج میں تم سب کو وہی کہتا ہوں جس طرح میرے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا: ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ اے اہل مکہ! میرا اعلان سنو "اَنْتُمُ الطُّلَقَاء"۔ آج تم سب معاف ہو، تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو، تمہیں غلام نہیں بنایا جائے گا، تمہارے اموال غنیمت میں شمار نہیں ہوں گے۔

یہ ہے انبیاء کرام علیہم السلام کا کردار اور ان کی پاکیزہ سیرت ورواداری کا مظاہرہ۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو معافی دیدی تو سوچا کہ قحط سالی مزید چند سال بدستور جاری رہے گی، اور خاندان یعقوب علیہ السلام مسلسل فاقہ کشی میں مبتلا رہے گا، حضرت یعقوب علیہ السلام کا خاندان چھوٹے بڑے ستر افراد پر مشتمل تھا، ان کی عورتوں کو "صدیقات" کا درجہ حاصل تھا، ان کے ساتھ والد مکرم ومحترم کی زیارت وملاقات کا بے قراری کے ساتھ جذبہ بھی موجزن تھا، حضرت یوسف علیہ السلام پورے خاندان کو مصر منتقل کرنے کے خواہاں تھے،

بلکہ فیصلہ بھی کر چکے تھے، دوسو اونٹوں اور پچاس کے قریب مردوزن خدمت گاروں کو تیار کر کے بھائیوں کے ساتھ روانہ فرمایا کہ جلدی کرو جاکر میرے خاندان کو میرے پاس لاؤ، اور خود پیچھے سے دارالحکومت سے دس میل کے فاصلے پر دیہات میں ان کی رہائش اور قیام کے انتظامات میں لگ گئے۔ تو فرمایا:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۳﴾
وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾ قَالُوْا تَاللّٰهِ
اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴿۹۵﴾ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا
ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾

ترجمہ: میرا یہ کرتہ لے جاؤ سو اسے میرے والد کے چہرے پر ڈال دو وہ بینا ہو جائیں گے، اور میرے پاس اپنے سارے گھر والوں کو لے آؤ ﴿۹۳﴾ اور جب قافلہ روانہ ہو گیا تو ان کے والد نے کہا کہ اگر تم یہ نہ کہو کہ میں بہکی ہوئی باتیں کرتا ہوں تو میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں ﴿۹۴﴾ وہ لوگ کہنے لگے: اللہ تعالیٰ کی قسم! آپ اپنی پرانی غلطی میں ہیں ﴿۹۵﴾ پھر جب خوشخبری لانے والا آپہنچا تو اس نے وہ کرتہ ان کے چہرے پر ڈال دیا لہٰذا وہ پھر سے آنکھوں والے ہو گئے، انہوں نے کہا: میں نے نہیں کہا تھا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ﴿۹۶﴾ ان کے بیٹے کہنے لگے کہ اے اباجی! ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لئے دعا کیجئے، بلاشبہ ہم خطا کرنے والے ہیں ﴿۹۷﴾ انہوں نے جواب دیا کہ میں عنقریب اپنے ربّ سے تمہاری مغفرت کے لئے دعا کروں گا، بیشک وہ غفور ہے رحیم ہے ﴿۹۸﴾

معارف ومنازل

اب جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کو والد صاحب کی ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا، اور حالات کے لحاظ سے مناسب یہ سمجھا کہ والد صاحب ہی مع خاندان کے یہاں میرے پاس تشریف لائیں، مگر انہیں معلوم تھا کہ والد صاحب میری مفارقت کے صدمے میں بینائی سے معذور ہیں اس لئے ان کے علاج کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنا کرتہ بھائیوں کے حوالہ کر کے فرمایا:

﴿اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا﴾ تم میرا یہ کرتہ لے جاؤ اور میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بینائی عود کر آئے گی۔ یہ آپ علیہ السلام کا معجزہ تھا، یا بذریعہ وحی آپ کو بتایا گیا تھا کہ آپ کے کرتے میں آپ کے والد کے لئے پیغام شفا ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب آپ کے بھائی یہودا نے آپ علیہ السلام کی قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دی تو باِذنِ اللہ تعالیٰ وہ فوراً تندرست ہو گئے، اور ان کی بینائی پہلے کی طرح لوٹ کر آئی۔

امام مجاہد اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا ہے کہ اس کرتے کی خصوصیت تھی، کیونکہ یہ عام کپڑوں کی طرح نہ تھا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے جنت سے اس وقت لایا گیا تھا، جب ان کو برہنہ کر کے نمرود نے آگ میں ڈال دیا تھا، پھر یہ جنتی لباس ہر وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس رہا، اور ان کی وفات کے بعد حضرت اسحٰق علیہ السلام کے پاس محفوظ رہا، ان کی وفات کے بعد پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس رہا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کو سمیٹ کر ایک نلکی (غالباً چاندی کی ڈبیہ) میں بند کر کے تبرک کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے گلے میں ڈالا تھا تا کہ نظر بد وغیرہ سے محفوظ رہے۔

برادران یوسف علیہ السلام نے جب ان کا کرتہ والد کو دھوکہ دینے کے لئے اتار کر انہیں برہنہ کر کے کنویں میں ڈال دیا تو جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور گلے میں پڑی ہوئی نلکی کھول کر اس سے یہ کرتہ برآمد کر لیا، اور یوسف علیہ السلام کو پہنا دیا اور یہ ہمیشہ ان کے پاس محفوظ چلا آیا۔ اس وقت جبرئل علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو یہی مشورہ دیا کہ یہ جنتی لباس ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اسے کسی نابینا کے چہرے پر ڈالا جائے تو اس کی بینائی عود کر آئے گی، لہٰذا آپ علیہ السلام اسے اپنے والد کے پاس بھیج دیں اور وہ اسے چہرے پر ڈال کر بینائی حاصل کریں گے۔

اور حضرت مجدد الف ثانیؒ قدس سرہ کی تحقیق یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کا بے مثال حسن و جمال اور ان کا وجود مسعود خود جنت ہی کی ایک اعلیٰ چیز تھا، اس لئے ان کے جسم اطہر سے مس کرنے اور متصل ہونے والے ہر کرتے میں یہ خاصیت ہو سکتی ہے۔ [مظهري]

﴿وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ اور تم سب بھائی اپنے سب اہل وعیال کو میرے پاس مصر لے آؤ۔ اصل مقصد والد صاحب کو یہاں لانے کا تھا، اس کو ادب کے خلاف سمجھا، ان کا نام نہیں لیا، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی بینائی جب عود کر آئے گی تو وہ بغیر بلانے کے خود تشریف لائیں گے۔

﴿وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾ جب قافلہ مصر کے شہر سے باہر نکلا ہی تھا تو یعقوب علیہ السلام نے کنعان میں اپنے پاس والوں سے کہا کہ اگر تم مجھے فرسودہ بے سمجھ نہ کہو تو تمہیں ابھی میں خبر دیدوں کہ مجھے یوسف علیہ السلام کی خوشبو آ رہی ہے۔

مصر کے دار الحکومت رعمیس سے کنعان تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق آٹھ دن کی مسافت کا راستہ ہے، اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اسی (۸۰) فرسخ یعنی تقریباً دو سو پچاس میل کا فاصلہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اتنے دور فاصلہ سے قمیص کے ذریعہ حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو حضرت یعقوب علیہ السلام کے دماغ تک پہنچادی، اور یہ معجزہ ہی تھا، معجزہ چونکہ نبی کے اختیار میں نہیں ہوتا، اسی طرح کرامت کہ وہ ولی کے اختیار میں نہیں۔

عجائبات قدرت میں غور کرو کہ جس کنویں میں بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو گرایا ہے وہ کنعان سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ہے، اور یہی قمیص جنت والی حضرت یوسف علیہ السلام کے گلے میں ہے، مگر اس کی خوشبو حضرت یعقوب علیہ السلام کے دماغ تک نہیں پہنچتی ہے اور اب ڈھائی سو میل کے فاصلے پر وہ خوشبو حضرت یعقوب علیہ السلام کو محسوس ہو رہی ہے۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب فرمایا:

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند ☆ کہ اے روشن گہر پیر خردمند
زمصرش بوئے پیراہن شمیدی ☆ چرادر چاہ کنعانش ندیدی
بگفت احوال ما برق جہانست ☆ دمے پیدا و دیگر دم نہانست
گہے بر طارم اعلیٰ نشینم ☆ گہے بر پشت پائے خود ندیدم

ایک شخص نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا کہ اے عقلمندی و روشنی کے جوہر! مصر کی مسافت سے دوری کے باوجود آپ نے یوسف علیہ السلام کی خوشبو سونگھ لی، اور کنعان کے کنویں سے نزدیکی کے باوجود تم نے کچھ نہیں دیکھا، اس کی وجہ کیا ہے؟ جواب ارشاد فرمایا کہ ہمارے احوال گرج چمک جیسے ہیں، کبھی دور کبھی نزدیک اور کبھی ظاہر و کبھی پوشیدہ، ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے، ہم کبھی اونچے مقامات کی بلندی پر سیر کرتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کے سامنے پڑی ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھتے ہیں۔

یہ ہے انبیاء کرام علیہم السلام کا مقام کہ وہ عالم الغیب اور مختار کل نہیں ہوتے، چالیس سال تک روتے رہے، آنکھیں ضائع ہو گئیں، مگر یوسف علیہ السلام کی موت و حیات کا انہیں پتہ تک نہیں چلا۔ پس جو لوگ پیغمبروں اور بزرگوں کو

عالم الغیب مانتے ہیں وہ اپنے ایمان کی خیر منائیں۔ دنیا کے تمام غوث وقطب، ابدالوں اور سارے لوگوں سے ایک نبی افضل ہوتا ہے، اور نبی کا یہ مقام ہے کہ اسے اپنے محبوب بیٹے کا پتہ بھی نہیں ہے فرمایا:

﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ﴾ حاضرینِ مجلس نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بات سن کر کہا کہ خدا کی قسم! آپ اپنے پرانے خیال میں مبتلا ہیں کہ چالیس سال بعد یوسف علیہ السلام کی خوشبو محسوس کر رہے ہیں۔

﴿فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا﴾ پھر جب خوشخبری دینے والا یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچا تو اس نے وہ کرتہ یعقوب علیہ السلام کے چہرے پر ڈال دیا پس پلٹ کر وہ دیکھنے والے ہو گئے، اور ان کی بینائی لوٹ آئی، آنکھیں روشن ہو گئیں، پھر بیٹے نے خوشخبری بھی سنائی کہ جس بیٹے کے غم وفراق میں آپ چالیس سال تک روتے رہے ہیں وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ مملکت مصر کا تاجدار بادشاہ ہے، اور یہ اسی کا کرتہ ہے جس کی بدولت آپ کی بینائی لوٹ آئی ہے۔

تفسیری روایات میں ہے کہ جب خوشخبری دینے والے نے بشارت سنائی کہ آپ کا بیٹا بحمدہٖ تعالیٰ مملکت مصر کا تاجدار بادشاہ ہے تو یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: بادشاہت میں کیا رکھا ہے مجھے تو یہ بتاؤ کہ وہ کس دین پر ہے؟ تو اس نے عرض کیا: دین اسلام، ملّت ابراہیمی پر ہے، تو یعقوب علیہ السلام نے کہا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اب نعمت مکمل ہو گئی، اور ساری پریشانیاں دور ہو گئیں۔ اس موقع پر یعقوب علیہ السلام نے حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

﴿قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، میرا دل نہیں مانتا تھا کہ یوسف علیہ السلام ہلاک ہو چکا ہے، اس کے بچپن کا خواب بھی میرے پیش نظر تھا اور قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب پورا ہونے والا ہے اسی لئے میں نے تمہیں کہا کہ جاؤ یوسف علیہ السلام کو تلاش کرو، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اب میرا خیال درست ثابت ہوا ہے کہ یوسف علیہ السلام نہ صرف زندہ ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسے حکومت بھی عطا کی ہے۔

روایات میں ہے کہ یہ خوشخبری سنانے والا "یہودا" تھا، اور یوسف علیہ السلام کا خون آلود کرتہ باپ کو پیش کرنے والا بھی یہی تھا، اب اسی نے یہ کام انجام دیا کہ شاید میرے گناہ کی تلافی ہو۔

﴿قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ﴾ برادران یوسف علیہ السلام کے لئے یہ وقت بہت کٹھن تھا، وہ اتنے شرمندہ تھے کہ باپ کے سامنے سر جھکائے ہوئے شرم وندامت سے بے حس و بے حرکت معلوم ہوتے

تھے، کہنے لگے: اے ابا جان! آپ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہمارے گناہوں کے لئے مغفرت کی دعا فرمایئے، کیونکہ اب یہ تو ظاہر ہی ہو چکا کہ ہم سخت مجرم اور خطا کار اور قصور وار ہیں، ہم ندامت سے اور شرمندگی سے آپ کی طرف سر اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

﴿سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّىۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ﴾ عنقریب میں اپنے ربّ سے تمہارے لئے مغفرت کی دعا کروں گا، بلاشبہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

مفسرین حضرات کہتے ہیں کہ برادران یوسف علیہ السلام نے مصر میں اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام سے بھی مغفرت کی دعا کی استدعا کی تھی، اور کنعان جا کر اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے بھی یہی درخواست کی، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے تو اسی وقت ان کی بات منظور کر لی اور: ﴿يَغۡفِرُ اللّٰهُ لَكُمۡ﴾ کہہ دیا، مگر یعقوب علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ: ﴿سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ﴾ کہہ کر صرف امید دلائی، اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ پھر حسب ذیل یہ تین جواب دیتے ہیں:

(۱) برادران یوسف علیہ السلام کی ان تمام خطا کاریوں کا معاملہ براہ راست حضرت یوسف علیہ السلام سے تعلق رکھتا تھا، اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے بالواسطہ تھا، اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام نے اخلاق کریمانہ کی راہ سے اسی وقت بلا تاخیر ان کا اطمینان کر دیا، مگر یعقوب علیہ السلام نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملے کا تعلق یوسف علیہ السلام سے ہے، اور ظلم انہی پر ہوا ہے اس لئے ان کی مرضی بھی معلوم کر لینا ضروری ہے، اس لیے اس طرح جواب دیا کہ توقع وامید تک بات رہے، اور ساتھ میں اپنی طبیعت کا رجحان بھی ظاہر کر دیا کہ ان کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ان بدترین اور سنگین خطا کاریوں کو معاف کر دے۔

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نوجوان تھے اس لئے ان کے کریمانہ وصف میں حزم واحتیاط کے بجائے عفو و درگزر کا پہلو غالب تھا، انہوں نے فوراً معاف کر دیا، مگر حضرت یعقوب علیہ السلام تجربہ کار، دور اندیش، محتاط اور پھر باپ تھے، انہیں اپنی اولاد کا سب کچھ اچھا برا معلوم تھا، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ بیٹوں کا امتحان کریں کہ ان کی یہ پشیمانی اور ندامت کا اظہار محض وقتی اور ہنگامی ہے اور صرف دفع الوقتی کے لئے ہے، یا اب ان کی طبیعت میں حقیقی ندامت و شرمساری کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے، اور یہ لوگ واقعی اپنی خطا پر صداقت سے نادم ہیں، اس لئے ان کو بالکل مایوس بھی نہیں کیا، اور رجحان طبیعت کا اظہار کرتے ہوئے صرف توقع اور امید تک ہی معاملہ کو چھوڑ دیا۔

(۳) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات کے آخری وقت میں دعاء قبول ہوتی ہے اس لئے ﴿سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ﴾ فرمایا، اور دعاء کو سحر کے لئے مؤخر کیا۔ [درمنثور] بہر حال جو بھی توجیہہ ہو سب اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۰۰﴾ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ: پھر جب یہ لوگ یوسف کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے والدین کو اپنے پاس ٹھکانہ دیا، اور کہا کہ مصر میں ان شاء اللہ امن وامان کے ساتھ داخل ہو جایئے ﴿۹۹﴾ اور یوسف نے اپنے ماں باپ کو تخت کے اوپر بٹھایا، اور وہ سارے ان کے سامنے سجدے میں گر گئے، اور یوسف نے کہا کہ اے ابا جان! یہ میرے خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے ربّ نے اس کو سچا کر دیا، اور میرے ساتھ احسان فرمایا، جبکہ مجھے جیل سے نکالا، اور آپ لوگوں کو دیہاتی علاقے سے لے آیا، اس کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال دیا تھا، بیشک میرا ربّ جو چاہتا ہے اس کی لطیف تدبیر فرماتا ہے، بیشک وہ جاننے والا ہے، اور حکمت والا ہے ﴿۱۰۰﴾ اے میرے ربّ! آپ نے مجھے سلطنت کا حصہ عطا فرمایا اور مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی اے آسمانوں اور زمین کے پیدا فرمانے والے! آپ ہی دنیا اور آخرت میں میرے کارساز ہیں، مجھے اس حالت میں موت دینا کہ میں فرمانبردار ہوں، اور مجھے نیک بندوں میں شامل فرمایئے ﴿۱۰۱﴾

معارف ومنازل

بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے جب کنعان پہنچے تو والد صاحب سے عرض کیا کہ

ابھی یہاں رہنے میں قحط کی وجہ سے ہمارا مستقبل بہت تاریک اور پریشان کن ہے، لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کے فرمان پر یہاں سے ہجرت کرنے میں ہمارے پورے خاندان کا فائدہ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دوسو اونٹ بمع خدام اور سامان کے انہیں دے کر روانہ کیا تھا، چنانچہ انہوں نے مکمل تیاری کر لی اور کنعان سے مصر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت صحیح روایات کے مطابق پورے خاندان کے چھوٹے بڑے مرد عورت ستر (۷۰) افراد تھے، اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر ایک سوتیس (۱۳۰) سال تھی، جبکہ وہ سترہ (۱۷) سال بڑے آرام وسکون کے ساتھ مصر میں رہ کر ایک سوسینتالیس (۱۴۷) سال کی عمر میں مصر میں وفات پا گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کی وصیت کے مطابق انہیں مصر سے لاکر کنعان میں دفن کر دیا۔

جس روز ان کی میت کنعان پہنچی تو ان کے بڑے بھائی حضرت عیص کا بھی وہاں انتقال ہو چکا تھا، چنانچہ دونوں بھائیوں کی تدفین ایک جگہ عمل میں آئی، وہ دونوں جڑواں بھائی تھے، ولادت اور موت نیز تدفین سب میں برابر رہے، اور عمر میں بھی، آج بھی ان کا مزار موجود ہے۔

الغرض! جب ان کا قافلہ مصر کے قریب پہنچا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے چار ہزار سے زائد لوگوں کے ساتھ ایک وسیع میدان میں ان کا استقبال کیا، اس پورے میدان کو چند روز پہلے سے خوب شان وشوکت کے ساتھ سجایا گیا تھا، اور خیمے لگائے گئے تھے، اس استقبالیہ مجلس میں مصر کے بڑے بڑے لوگ اور عمائدین بھی شامل تھے، اور ایک جشن کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

جس شاہی خیمہ میں یوسف علیہ السلام قیام پذیر تھے اپنے والدین کو اسی میں اپنے پاس ٹھہرایا، ایک رات دن کے بعد یہ قافلہ دار الحکومت رعمیس کی طرف روانہ ہوا، جب شہر میں بڑے تزک واحتشام کے ساتھ داخل ہونے لگے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ﴾ کہ آپ لوگ مصر میں ان شاء اللہ امن وخوشحالی کے ساتھ رہیں، تمہیں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی، چنانچہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ان کے قیام وطعام ورہائش کا جو انتظام کیا گیا تھا اسی کے مطابق انہیں ٹھہرایا گیا، اور جس تخت شاہی پر خود جلوہ افروز ہوتے تھے اس پر اپنے والدین کو بٹھایا جس سے ان کی رفعت شان کو ظاہر کرنا مقصود تھا۔ اس وقت شکرانہ کے طور پر والدین اور گیارہ بھائی سب یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدے میں جھک گئے، یہ سجدہ بطور تعظیم کے تھا جو سابقہ امتوں میں مشروع تھا، اور

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چلتا رہا جسے امام الانبیاء سرور عالم ﷺ نے ہمیشہ کے لئے حرام قرار دیا، اب سجدہ خواہ عبادت کے لئے ہو یا تعظیم کے لئے جس میں کچھ کمر یا سر جھکانے کے ساتھ ہو غیر اللہ کے لئے شرک اور حرام ہی ہوگا، جس سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا فرض ہے۔ سورۂ بقرہ رکوع (۴) کے تحت تفصیل گزر چکی ہے۔

جب یوسف علیہ السلام نے بچپن میں خواب دیکھا تھا کہ چاند اور سورج اور گیارہ ستاروں نے مجھے سجدہ کیا اب اس کی تعبیر پوری ہوگئی تو وہ کہنے لگے:

﴿يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا﴾ اے ابا جان! یہ میرے خواب کی تعبیر ظاہر ہوگئی، میں نے جو خواب دیکھا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کی تعبیر سچی اور پوری فرمائی۔

﴿وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ﴾ میں مفسرین حضرات کے دو قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ ان کی والدہ زندہ تھی، اور یہی راجح قول ہے۔ بعض نے کہا کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا، یہ ان کی خالہ اور سوتیلی ماں تھی، جسے مجازاً والدہ کہا گیا۔ وَالْاَوَّلُ اَصَحُّ۔

﴿وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ﴾ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ربّ العزّت جل شانہ نے مجھ پر احسان فرمایا کہ مجھے جیل سے رہا فرمایا، اور تمام ملک مصر میں مجھے قبولیت سے نوازا، بادشاہت عطا فرمائی جو کہ تمہارے یہاں آنے کا سب سے بڑا ذریعہ وسبب بنا، اور دیہات سے یہاں آئے اور یہاں رہائش پزیر ہوئے، اس میں کنویں سے نکلنے والی نعمت کا تذکرہ شاید اس لئے ذکر نہ کیا کہ مزید بھائیوں کے لئے خفت وشرمندگی کا باعث نہ ہو۔ البتہ یہ ضرور کہا:

﴿مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ﴾ کہ یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا جبکہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان بگاڑ اور فساد کی آگ بھڑکائی۔

﴿اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی لطیف تدبیر کر دیتا ہے، اور بیشک وہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ آگے خطاب ہے:

﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ﴾ اے میرے ربّ! آپ نے مجھے سلطنت کا ایک حصہ عطا فرمایا، اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم نصیب فرمایا۔

اسلام پر مرنے اور صالحین میں شامل ہونے کی دعاء:

﴿فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾

زمین وآسمان کے پیدا فرمانے والے! آپ ہی دنیا وآخرت میں میرے کارساز ہیں، مجھے اس حالت میں موت دیجئے کہ میں فرمانبردار رہوں، اور مجھے نیک بندوں میں شامل فرما دیجئے۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں خاتمہ بالخیر کے لئے ہمیشہ یہی دعا پڑھا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب کو پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ [تفسیر کبیر]

ایک شبہ:

مال واولاد کو اللہ تعالیٰ نے فتنہ بتا دیا، یہ حکم صرف اس امت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سب کے لئے ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مال اور اولاد کی محبت وشغف سے بندے کا دل اللہ تعالیٰ اور اس کی محبت سے خالی ہو جاتا ہے، اور دونوں محبتیں بیک وقت دل میں نہیں سما سکتیں، پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کا اولاد کی محبت میں اس قدر بے انتہا مشغول ہونے کا ضرور کوئی خاص داعیہ اور سبب ہوگا تو وہ کیا ہے؟

جواب: حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں اس شبہ کو ذکر کر کے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک خاص تحقیق نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بلاشبہ دنیا اور متاع دنیا اسی طرح اولاد کی محبت مذموم ہے، قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص اس پر شاہد ہیں، مگر دنیا میں جو چیزیں آخرت سے متعلق ہیں ان کی محبت درحقیقت آخرت ہی کے سامان اور اس کی محبت میں داخل ہیں، حضرت یوسف علیہ السلام کے کمالات صرف حسن صورت ہی نہیں بلکہ پیغمبرانہ عفت، عصمت اور حسن سیرت بھی ہیں، اس مجموعہ کی وجہ سے ان کی محبت کسی دنیاوی سامان کی محبت نہ تھی، بلکہ درحقیقت آخرت ہی کی محبت تھی۔ [مظهري]

چنانچہ اس پر دلیل یہ بات ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام مصر پہنچے تو یوسف علیہ السلام سے ابتدائی ملاقات ہوئی اس موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام نے باپ سے دریافت کیا: اباجی! آپ بے صبری میں چالیس سال تک روتے رہے، اور آپ کی بینائی بھی جاتی رہی اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا آپ کو یقین نہیں تھا کہ اگر ہماری ملاقات اس دنیا میں نہ بھی ہوسکی تو آخرت میں ضرور ہو جائے گی، تو پھر اس قدر گریہ وزاری کی کیا ضرورت تھی؟ حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا کہ میرے لئے تشویش کی بات یہ تھی کہ آپ کم عمری میں بچھڑ گئے تھے، اور پتہ نہیں آپ کا دین سلامت رہا ہوگا یا

نہیں، اگر خدانخواستہ آپ کا ایمان سلب ہو جاتا تو پھر قیامت کی ملاقات بھی ممکن نہ رہتی، کیونکہ وہاں مؤمن اور کافر الگ الگ ہوں گے، اتنا عرصہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی بھی نہ بتایا تھا کہ آپ زندہ سلامت اور نعمت ایمان کے ساتھ سرشار ہیں، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو کبھی گریہ نہ کرتا، دراصل مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کس دین پر ہیں، یہ سب باتیں پردۂ غیب میں تھیں، جن کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے تو میری تشویش ایک فطری اور دینی امر پر مبنی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین سے سعادت کی موت مانگنا اور عباد اللہ الصالحین کی جماعت میں شمولیت کی درخواست کرنا یہ بہت پسندیدہ عمل ہے، اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت اور محبوب طریقہ بھی ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے شوق واشتیاق کے عالم میں فرمایا تھا: "اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى"۔ اے میرے پروردگار! مجھے رفیق اعلیٰ میں بلا لیجئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کر کے کہا: ﴿وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ [النمل:۱۹] (اے میرے پروردگار! مجھے اپنی رحمت سے نیک بندوں میں شامل فرمایئے) حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ دنیا کی تکلیفوں سے گھبرا کر بے صبری کے عالم میں موت کی دعا نہ کرو موت کی تمنا نہ کرو۔ [مشکوٰۃ]

پس معلوم ہوا کہ یہ ممانعت اسی چیز کے ساتھ مخصوص ہے، تو اگر کسی مؤمن کو دینی لحاظ سے فتنوں اور سخت خطرناک تباہیوں میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو، اور ایمان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو بہتر ہے کہ انسان اپنے ایمان کے تحفظ کے پیش نظر موت کی دعا کرے، یا اللہ تعالیٰ جل شانہ سے ملاقات کے شوق واشتیاق میں موت کی تمنا ہو تو یہ درست ہے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہت اور ہزاروں نعمتوں اور بے شمار راحتوں کے ہوتے ہوئے محض اشتیاقِ الٰہی کی بنا پر موت کی دعاء کرلی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی مصر آمد کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے پورے چالیس سال تک بادشاہت کی، اور ایک سو بیس (۱۲۰) سال کی عمر میں وفات پاگئے، اور موت سے پہلے وصیت فرمائی کہ مجھے دریائے نیل کے پاس دفنایا جائے۔ اور جب بنی اسرائیل کے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر مصر سے کنعان روانہ ہوں گے تو میرے تابوت کو ساتھ لے جا کر کنعان میں میرے والد اور دادا حضرت اسحاق علیہما السلام کے پہلو میں دفن کر لیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر پانچ سو (۵۰۰) سال بعد مصر سے روانہ ہو گئے تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا تابوت قبر سے نکال کر ساتھ لے گئے اور "نابلس" میں دفن کرلیا۔ اللھم صل وسلم وبارک علی نبینا وسیدنا

محمد و علی جمیع الانبیاء والمرسلین۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْــَٔـلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کی طرف وحی کے ذریعہ بھیجتے ہیں، اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہیں تھے جب انہوں نے اپنے کام کا پختہ ارادہ کرلیا تھا اور وہ تدبیر کررہے تھے ﴿۱۰۲﴾ اور اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اگرچہ آپ حرص کریں ﴿۱۰۳﴾ اور آپ اس پر ان سے کسی عوض کا سوال نہیں کرتے، یہ تو جہاں والوں کے لئے نصیحت ہے ﴿۱۰۴﴾

معارف ومنازل

قرآن کریم خالص وحی الٰہی ہے، یہ آپ ﷺ کی نبوت پر محکم دلیل ہے:۔

یہ تو ہر دوست اور ہر دشمن کو معلوم ہے کہ سرور عالم ﷺ خالص اُمّی تھے، آپ ﷺ کسی سے کچھ بھی پڑھے ہوئے نہیں تھے، آپ ﷺ نے کسی سے پڑھا، نہ کسی پڑھنے والے کی صحبت ورفاقت میں رہے، اور نہ کسی ایسے شخص کی صحبت میں رہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ طولانی جامع قصہ آپ کو بتاتا اور سناتا۔ یہ احسن القصص تفصیل ووضاحت کے ساتھ عجیب وغریب حیران کن انداز میں بیان کرنا یہ آپ ﷺ کی نبوت ورسالت کی واضح دلیل ہے، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ ﷺ کو یہ قصہ بتایا، اور آپ ﷺ نے لوگوں کو سنایا۔

متعصب یہودیوں نے جب آپ ﷺ سے یہ قصہ سنا جسے وہ اپنے آباء واجداد سے سنتے آئے تھے تو انہیں آپ ﷺ کی تصدیق کرنا اور اسلام قبول کرنا لازم تھا، لیکن انہوں نے پھر بھی تعصب کی بنیاد پر اسلام قبول نہیں کیا، سوائے چند لوگوں کے کہ جن کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کی قسمت جاگ اٹھی تھی جنہوں نے اسلام قبول کیا، جیسے سورۂ یوسف کے شروع میں بیان ہوا تھا۔

صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے کفار مکہ سے کہا کہ تم محمد (ﷺ) سے دریافت کرو کہ وہ کیا سبب تھا جس کی وجہ سے بنی اسرائیل اپنے وطن کو چھوڑ کر مصر میں آباد ہوگئے تھے؟ تو قریش نے آپ ﷺ سے

سوال کیا، اس پر سورۂ یوسف نازل ہوئی۔

یہودی اپنے خیال میں بہت دور کی کوڑی اٹھا کر لائے تھے، اور انہوں نے سمجھا تھا کہ آپ ﷺ کی طرف سے اس کا جواب نہ مل سکے گا، اور قریش مکہ بھی چاہتے تھے کہ آپ ﷺ کو کسی طرح پریشان کریں، لیکن جب جواب مل گیا تو دونوں فریق شرمندہ ہوئے اور وہیں رہے جہاں پہلے تھے، یعنی اسلام قبول نہیں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ غیب کی خبریں ہم آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ بتاتے ہیں جب یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپس میں مل کر یہ طے کیا کہ ان کو کنویں میں ڈال دیں، اور وہ طرح طرح کی ناروا تدبیریں سوچ رہے تھے اس وقت آپ ﷺ وہاں موجود نہیں تھے۔ یہ بات یہودیوں کو معلوم تھی اور انہوں نے قریش مکہ کو بھی سمجھا دی تھی، پھر یہ بات جب انہیں معلوم ہوئی تو ششدر رہ گئے اور کہنے لگے کہ یہ بات آپ ﷺ کو کس نے بتادی تو ظاہر ہے کہ وحی کے ذریعہ اس بات کا علم ہوا، لہٰذا سوال کرنے والوں (قریش مکہ) اور سوال کی تلقین کرنے والوں (یہود) دونوں پر لازم ہوا کہ آپ ﷺ کی تصدیق کریں اور آپ ﷺ پر ایمان لائیں۔

آپ ﷺ کا دل چاہتا تھا اور آپ ﷺ حریص بھی تھے کہ یہ لوگ ایمان لائیں، آپ ﷺ کو امید تھی کہ یہود اور قریش یہ قصہ سن کر اسلام لائیں گے، لیکن انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا، حالانکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بتادیں تو اسلام قبول کرلیں گے۔ [روح المعاني]

صرف یہ نہیں، بلکہ ان بدبختوں نے بہت سے معجزات کا معائنہ کرنے کے باوجود ایمان قبول نہیں کیا، کیا معجزہ شق القمر کوئی معمولی چیز ہے جسے دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کے باوجود مسلمان نہیں ہوئے؟

اس واقعہ کے سننے کے باوجود جب وہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تو آپ ﷺ کو رنج ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے رنج کو دور کرنے کے لئے فرمایا: اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں اگرچہ آپ اس بارے میں حرص کریں، لہٰذا آپ ان سے قطع امید فرمالیں اور پریشان نہ ہوں۔

﴿وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ﴾ آپ ان سے اس پر کسی معاوضے کا سوال نہیں کرتے، کیونکہ آپ انہیں سب کچھ دینے کی پیشکش ہی کرچکے ہوتے ہیں چاہیے کہ یہ آپ کی قدر کرتے، مگر وہ آپ سے دور بھاگ کر اپنا مستقبل خراب کررہے ہیں۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ یہ جہاں والوں کے لئے خالص نصیحت ہی ہے، اگر یہ لوگ آپ ﷺ کی

بات اور قرآن کو نہیں مانتے تو نقصان ان ہی کا ہے، آپ ﷺ کا کوئی نقصان نہیں، ﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ [الغاشیة:۲۲] (آپ ان پر مسلط نہیں ہیں) لہٰذا پریشان نہ ہوں۔

فائدہ:

اخبارِ غیب، اور علمِ غیب میں فرق:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ﴾ یہی مضمون سورۂ آل عمران آیت (۴۴) میں بیان ہوا، پھر سورۂ ہود کی آیت (۴۹) میں ذکر ہوا، اللہ تعالیٰ بہت سی غیبی خبروں پر بذریعہ وحی انبیاء کرام علیہم السلام کو مطلع فرمادیتے ہیں خصوصاً سید المرسلین ﷺ کو، کتبِ حدیث میں اس کی تفصیلات بہت ہی نمایاں ہیں، عوام الناس اور بعض سرسری علم رکھنے والے لوگ اسی کو علمِ غیب سمجھتے ہیں، اور آپ ﷺ کو عالم الغیب کہتے ہیں جو بڑی غلطی اور ناسمجھی ہے۔

مگر قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں اعلان فرمایا: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل:۶۵] (آپ فرمایئے کہ آسمانوں اور زمینوں میں کوئی غیب جاننے والا نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے) یہ علمِ غیب وحدت اور خالقیت کی طرح اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصہ ہے، اس میں کسی پیغمبر یا کسی فرشتہ کو شریک سمجھنا ان کو اللہ تعالیٰ کے برابر بنانے کے مترادف ہے اور عیسائیوں کا عمل ہے جو رسول کو خدا کا بیٹا اور خدائی کا شریک قرار دیتے ہیں، پس بذریعہ وحی انبیاء علیہم السلام کو جو غیب کی خبر بتائی جاتی ہے اس کو قرآن کی اصطلاح میں اخبار بالغیب کہا جاتا ہے، نہ کہ علمِ غیب جو کہ ذاتی ہے اور خاصۂ خدائی ہے، تو واسطہ اور بلا واسطہ کا خوب فرق سمجھنا ضروری ہے۔

.... ❁ ...... ❁ ...... ❁ ....

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ
مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ: اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں جن پر یہ لوگ گزرتے ہیں، اور وہ ان سے اعراض کئے ہوئے ہیں ﴿۱۰۵﴾ اور ان میں سے اکثر لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے مگر اس حال میں کہ وہ شرک کرنے والے ہیں ﴿۱۰۶﴾ کیا یہ لوگ اس بات سے مطمئن ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی کوئی ایسی آفت آپڑے جو

ان کو گھیر لے یا ان پر اچانک قیامت آجائے اور ان کو خبر بھی نہ ہو؟ (۱۰۷)

معارف ومنازل

"کَاَیِّنْ" یہ لفظ اصل میں "کَاَیٍّ" تھا، قرآنی املاء میں تنوین کو بصورت نون لکھا گیا، یہ لفظ ہمیشہ خبری صورت میں مستعمل ہے، مبہم کثیر تعداد پر دلالت کرتا ہے، ابہام کو دور کرنے کے لئے اس کے بعد بطور تمیز کوئی لفظ مذکور ضرور ہوتا ہے، عموماً ممیز لفظ "مِن" کے ساتھ آتا ہے، اس آیت میں "کَاَیٍّ" سے کثیر تعداد کو ظاہر کیا، لیکن کس کی؟ یہ بات مبہم تھی، جب اس کے بعد "مِنْ آیَۃٍ" آیا تو ابہام دور ہو گیا اور معلوم ہو گیا کہ کثیر تعداد آیتوں کی تھی۔ "کَاَیٍّ" کا کلمہ پورے قرآن کریم میں سات مقامات پر مذکور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات میں بہت سی آیاتِ تکوینیہ تخلیق فرمائیں تا کہ لوگ انہیں دیکھ کر اس کی وحدانیت اور ہمہ گر قدرت کاملہ پر ایمان لائیں، بہت سی زمینی آیات، بہت سی آسمانی آیات اور انفسی اور ذاتی آیات، اگر انسان صرف اپنے وجود میں غور وفکر کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی رسائی باری تعالیٰ عزّ مجدہ تک نہ ہو، تو یہود اور مشرکین کا حال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ: جن لوگوں کو توحید سے اور آپ ﷺ کی رسالت اور قرآن کی حقانیت سے بغض وعناد کی وجہ سے انکار ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے بہت سی تکوینی نشانیاں دیکھتے ہیں، لیکن ایمان نہیں لاتے، آسمانوں میں بکثرت نشانیاں ہیں، ستارے، چاند، سورج اور خود آسمانوں کا اپنا بلند وبالا وجود بھی ایک عظیم نشانی اور درس عبرت ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کی تخلیق کا شاہکار ہے، اور دوست ودشمن سب ہی اس کو تسلیم کرتے ہیں، اسی طرح زمین اور اس پر لاکھوں موجودات اور بلند وبالا فلک بوس کوہ وجبال اور ان میں موجود بے شمار معدنیات یہ سب اس کی عظمت ووحدانیت کے دلائل ونشانی ہیں، یہ لوگ ان سب نشانیوں کو دیکھتے ہیں اور سفر وحضر میں یہ چیزیں ان کے سامنے نمایاں ہوتی نظر آتی ہیں، مگر یہ عقل کے اندھے آنکھیں بند کر کے گزر جاتے ہیں، جب انہیں توحید کی دعوت دی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم خدا کو مانتے ہیں، مگر ہزاروں بتوں کو شریک تسلیم کرنے کے ساتھ یہ لوگ قیامت کے تو ویسے ہی منکر ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کچھ بھی خوف محسوس نہیں کرتے، اور بڑے اطمینان سے زندگی گزار رہے ہیں۔

فرمایا: کیا انہیں اس بات کا طمینان ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نہ آئے گا؟ اور کیا اچانک قیامت نہیں آسکتی؟ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسا عذاب آسکتا ہے جو انہیں ہر طرف سے گھیر لے، یا اچانک قیامت آجائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔ دوسرے مقام پر اسی بارے میں فرمایا: ﴿اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَكَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ﴾ [النحل:۴۵] (تو کیا وہ لوگ جو برے برے منصوبے بنا رہے ہیں اس بات سے بالکل بے خوف ہو گئے ہیں کہ اللہ انہیں زمین میں دھنسا دے، یا ان پر عذاب ایسی جگہ سے آپڑے کہ انہیں احساس تک نہ ہو)۔

بالفرض اگر کسی حکمتِ الٰہی کے تحت یہ لوگ کسی دنیوی عذاب سے بچ جائیں مگر قیامت کے ابدی عذاب سے ہرگز نہیں بچ سکتے، پس انہیں کوئی نجات نہیں مل سکتی۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں، میں بصیرت پر ہوں، اور وہ لوگ بھی جنہوں نے میرا اتباع کیا، اور اللہ تعالیٰ پاک ہے، اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں ﴿۱۰۸﴾

معارف ومنازل

یعنی میرا راستہ یہی خالص توحید کا راستہ ہے، میں تمام کائنات کا ہادی برحق رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْن ہوں اور پورے عالم کو دعوت دیتا ہوں کہ سب خیالات و اوہام کو چھوڑ کر ایک حقیقی پروردگار کی طرف آئیں، اور صرف اس کے حضور جھک کر سر تسلیم خم کریں، اس کی خالص توحید اس کی صفات و کمالات اور اس کے احکام کی صحیح معرفت صحیح راستے سے جو کتاب اللہ کا راستہ ہے حاصل کریں، میں اور میرے تمام ساتھی اس سیدھے راستے پر حجت و برہان اور بصیرت و وجدان کی روشنی میں چل رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کی ظلمتوں کو مٹانے کے لئے مجھے ایک نور دیا ہے جس سے میرے ہمراہیوں کے دل و دماغ روشن ہو گئے ہیں، یہاں نور وہدایت اور برہان وبصیرت کی تابانی ہے، نہ کسی کی اندھی تقلید ہے، نہ کجروی ہے، خالص توحید ویقین کا دور دورہ ہے، ظاہر وباطن کی روشنی کا عزم واستقامت ہے عبودیت محضہ کی لذت جو ایک

جھلک اپنے اندر محسوس کرے گا تو پکار اٹھے گا:

﴿سُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ﴾ اللہ پاک ہے، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰى ؕ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے سب آدمی ہی تھے جو مختلف بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے، ہم ان کی طرف وحی بھیجتے تھے، کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے؟ سو وہ دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے پہلے گزرے؟ اور البتہ آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، کیا تم سمجھ نہیں رکھتے ﴿۱۰۹﴾

معارف ومنازل

مشرکین مکہ اور دوسرے کفار کے سامنے جب سرور عالم ﷺ نے اپنی دعوت پیش کی اور فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اور تمہیں خالص توحید کا سبق پڑھانے آیا ہوں، تمہیں جہنم کے راستے اور شرک سے بچا کر جنت کا راستہ بتانے آیا ہوں، تو ان لوگوں نے طرح طرح کے اعتراضات اور بے تکے مطالبات اور مختلف حیلے بہانے بنا کر پیش کئے، جن کی تفصیل سورۂ انعام میں گزر چکی ہے۔ انہی میں سے ایک یہ کہ آپ تو ہمارے جیسے آدمی ہیں، رسول کوئی فرشتہ ہونا چاہیے، کہنے لگے: ﴿قَالُوۡۤا اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا﴾ [یس: ۱۵] (تم ہماری طرح کے انسان ہو)۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب دیا کہ ہم نے جتنے رسول پہلے بھیجے ہیں وہ سب انسان ہی تھے جو مختلف بستیوں کے رہنے والے تھے، یہ سارے رسول اپنی اپنی قوموں کی طرف بھیجے گئے اور ان کی زبان بولتے رہے، اور انہیں حق کی دعوت دیتے رہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی حکمت رکھی ہے، وہ یہ کہ ہم جنس ہی ہم جنس کو صحیح ہدایت دے سکتا ہے، قولاً بھی اور فعلاً بھی، یعنی زبان سے بھی بتا سکتا ہے اور فعلاً عمل کر کے بھی دکھا سکتا ہے، اور یہ دونوں کام فرشتوں کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان میں انسانی مزاج اور طبیعت نہیں ہے۔

اس کے علاوہ انسانوں میں وہ ہمت وجرأت کہاں کہ وہ فرشتوں کو دیکھ سکیں، فرشتہ اگر بشکلِ فرشتہ نمودار ہو تو

اس کے دیکھنے کی جرأت نہ ہو، اور یہ سارے بیہوش ہو کر مر جائیں، اور اگر بشکل انسان ہو تو پھر وہی بہانے اور ضد وعناد شروع ہو۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی کی خاطر فرمایا کہ آپ سے پہلے جو رسول آئے وہ سب انسان ہی تھے، ان کی قوموں نے انہیں اسی طرح بے تکے جوابات دیئے، یہ کافروں کا ہر زمانہ میں ہر رسول کے ساتھ یہی دستور رہا ہے، لہٰذا آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں، آپ صبر جمیل اختیار کریں، اور گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت پر عمل کریں، آپ کا مستقبل درخشاں اور روشن رہے گا، اور آپ کے مخالفین اپنی موت آپ فناء ہو کر مر جائیں گے۔

﴿اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے تاکہ اپنے سے پہلے لوگوں اور نافرمانوں کا انجام دیکھ لیتے کہ وہ لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب کی وجہ سے گوناگوں عذابوں میں مبتلا ہو گئے، ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، لہٰذا ان کے لئے بھی اسی طرح کی تباہی کا فیصلہ ہوگا۔

﴿وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا﴾ جو لوگ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں کفر و شرک سے بچتے ہیں گناہوں سے دور رہتے ہیں، فرائض واجبات کا اہتمام کرتے ہیں ان کے لئے دار آخرت میں بڑی بڑی نعمتیں ہیں، اور دار آخرت ہر اعتبار سے خیر ہی خیر ہے، جبکہ دار دنیا ہر اعتبار سے کمتر اور کمزور و فانی ہے۔

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا تم سمجھ نہیں رکھتے کہ کمزور اور فانی دنیا کو آخرت اور ہمیشگی کے جہاں پر ترجیح دیتے ہو یہ سراسر نادانوں کا کام اور طریقہ ہے، عقلمند لوگ پوری دنیا کو عاقبت و آخرت کے لمحہ پر قربان کرتے ہیں۔

...... ❁ ...... ❁ ...... ❁ ......

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ
نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: یہاں تک کہ جب رسول ناامید ہو گئے اور انہیں یہ گمان ہو گیا کہ ہماری فہم نے غلطی کی تو ہماری مدد ان کے پاس آگئی، پھر ہم نے جس کو چاہا اسے نجات دیدی، اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا ﴿۱۱۰﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

اگر عذاب آنے میں تاخیر ہو رہی ہے، اور باوجود کفر کے تم کو مہلت دی جا رہی ہے تو اس پر دھوکہ نہ کھاؤ، کیونکہ امم سابقہ کو تو اتنی طویل مہلتیں ملتی رہیں اور اصلاح کا اتنا موقع دیا گیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام مایوس ہونے لگے کہ شاید عذاب جلدی نہ آئے گا، اور ان کی قوم کے کافروں نے یقین کرلیا کہ ان پیغمبروں علیہم السلام سے عذاب کے وعدے میں جھوٹ بولا گیا، اور عذاب آنے والا نہیں، آخر کار ہماری مدد آپہونچی، پھر ہم نے جس کو چاہا اسے بچالیا، اور جب ہمارا عذاب آئے پیچھے مجرموں سے واپس نہیں کیا جاتا۔

یعنی مہلت پر دھوکہ نہ کھاؤ، پہلی امتوں کو اس قدر مہلتیں ملتی رہیں یہاں تک کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کے ایمان لانے کی کوئی امید نہ رہی، ادھر کافروں نے اس کا یقین کرلیا کہ عذاب کا وعدہ محض ایک ڈھونگ تھا، تو عین اس وقت کہ جب پیغمبر گھبرا گھبرا کر کہہ رہے تھے: ﴿مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ﴾[البقرة:۲۱۴] (اللہ کی مدد کب آئے گی؟) تو ہماری مدد آپہونچی، پھر ہم نے جس کو چاہا بچالیا یعنی مسلمانوں کو نجات دیدی اور مجرموں پر عذاب آیا جو نہیں ٹل سکتا۔

یاد رہے کہ آثار واسباب کی وجہ سے اگر کبھی تھوڑی سی مایوسی ہو وہ مذموم نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ شانہ کی رحمتوں سے مایوسی مذموم ہے۔

فائدہ:

آیت کریمہ کے جو معنی ومطلب ہم نے عرض کیے وہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شان کے مطابق بھی ہیں، اور بے داغ وبے غبار بھی ہیں جس سے ہر قسم کے شکوک وشبہات بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائیں گے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آیت کریمہ کا یہ حصہ بڑا غور طلب ہے۔ رسولوں علیہم السلام کے مایوس ہونے کا مطلب کیا ہے؟ ظَنُّوْٓا کا فاعل کون ہیں؟ اَنَّهُمْ کا مرجع کون ہے؟ قَدْ كُذِبُوْا کا نائب فاعل کون ہے؟

پہلی بات کا جواب تو یہ ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی اپنی قوموں کو توحید کی دعوت دی اس کی صداقت پر دلائل وبراہین پیش کئے، اور طرح طرح کے معجزات بھی دکھائے، اور دعوت وارشاد کا یہ سلسلہ سال دو سال تک نہیں بلکہ عرصۂ دراز تک جاری رہا، تب بھی ان کے دل میں ایمان کی شمع فروزاں نہیں ہوئی تو انبیاء کرام علیہم السلام ان کے ایمان سے مایوس ہوگئے۔ ﴿حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ﴾ یہاں تک کہ رسول علیہم السلام مایوس ہوگئے۔

﴿ظَنُّوْٓا﴾ کا فاعل بعض مفسرین نے انبیاء کرام علیہم السلام کو بنایا ہے، اور اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ انبیاء کرام

علیہم السلام نے یہ ظن کیا کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی نصرت اور کفار پر عذاب نازل کرنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ ایفا نہیں کیا گیا، لیکن اس طرح کا ظن انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف منسوب کرنا درست نہ تھا، اس لئے انہوں نے ظن کے معنی میں تاویل کی، اور کہا کہ اس سے مراد محض وہم وخیال ہے جس پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوتا، اور کبھی یہ کہا کہ اس ظن کی وجہ ان کا اجتہاد تھا، وغیرہ۔

لیکن صاف بات یہ ہے کہ ﴿ظَنُّوْٓا﴾ کا فاعل کفار ہے، یہ گمان کیا کہ یہ رسول جو ہمیں ہر روز عذاب کے نزول سے ڈراتے تھے وہ عذاب کہاں ہے؟ ہم نے تو ان کی دعوت کو ٹھکرانے میں اور انہیں اذیت پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی، اور اگر وہ عذاب آنا ہوتا تو اب تک آ گیا ہوتا، عذاب کا نہ آنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے ہم سے غلط بیانی سے کام لیا ہے، یا جس نے ان سے وعدہ کیا کہ میں ان پر عذاب اتاروں گا اس نے وعدہ خلافی کی ہے۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے طویل بحث کے بعد آخر کار اسی قول کو ترجیح دی ہے، فرماتے ہیں: ''وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الْاَوْفَقَ بِتَعْظِيْمِ الرُّسُلِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ بَلْ اَبْعَدَ عَنِ الْحَزْمِ حَوْلَ حِمَى مَالَا يَلِيْقُ بِهِمُ الْقَوْلُ بِنِسْبَةِ الظَّنِّ اِلٰى غَيْرِهِمْ''۔ یعنی انبیاء کرام علیہم السلام کی تعظیم اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ظن کی نسبت انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف نہ کی جائے، بلکہ غیروں کی طرف کی جائے۔

اب اگر معنی یہ کیا جائے کہ کفار نے یہ خیال کیا کہ ان سے غلط بیانی کی گئی ہے تو اس صورت میں ''اَنَّهُمْ'' کا مرجع اور كُذِبُوْا کا نائب فاعل کفار ہی ہوں گے، اور معنی یہ ہوں گے کہ کفار نے گمان کیا کہ ہمارے ساتھ عذاب کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ جھوٹ بولا گیا تھا کہ عذاب آئے گا۔ اور اگر یہ معنی کیا جائے کہ کفار نے یہ گمان کیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے نزول عذاب کا جو وعدہ کیا گیا ہے اس کی خلاف ورزی کی گئی ہے، اور وہ جھٹلائے گئے ہیں یعنی وہ پورا نہیں کیا گیا تو اس وقت ''اَنَّهُمْ'' کا مرجع اور كُذِبُوْا کا نائب فاعل انبیاء کرام علیہم السلام ہوں گے، مگر اس صورت میں ظَنُّوْٓا کی نسبت جب کفار کی طرف ہے تو انبیاء کرام علیہم السلام کی توقیر وتعظیم پر عیب نہیں آئے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ مفسرین حضرات نے دونوں تفسیروں کو نقل فرمایا، اور ان کی توثیق کی، البتہ پہلی تفسیر کو اکثر نے راجح قرار دیا۔ واللہ اعلم

لَقَدۡ كَانَ فِىۡ قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٌ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ‌ؕ مَا كَانَ حَدِيۡثًا يُّفۡتَرٰى وَلٰـكِنۡ تَصۡدِيۡقَ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَتَفۡصِيۡلَ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

ترجمہ: البتہ ان کے قصوں میں عقل والوں کے لئے عبرت ہے، یہ قرآن ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تراشی ہوئی ہو، بلکہ اس سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئی ہیں یہ کتاب ان کی تصدیق کرنے والی ہے، اور ہر چیز کی تفصیل کرنے والی ہے، اور ہدایت ہے، اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۱۱۱﴾

معارف ومنازل

تذکیر بأیَّام اللہ میں جہاں انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی قوموں کے واقعات بیان ہوتے ہیں وہاں یہ واقعات عقلمندوں کے لئے سراسر درس عبرت بھی ہیں جنہیں محض اس لئے قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ انہیں پڑھ کر لوگ نصیحت حاصل کریں، اور اپنی سمت قبلہ درست کرلیں قِصَصُ الْاَوَّلِیْنَ مَوَاعِظُ لِلْاٰخِرِیْنَ۔ اگلے لوگوں کے قصوں میں پچھلے لوگوں کے لئے وعظ ونصیحت اور عبرت کے اسباق ہوتے ہیں، خصوصاً سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ جس میں عبرت وموعظت کے بے شمار خزانے چھپے ہوئے ہیں، اسی بناء پر یہ احسن القصص ہے۔

یہ سورۂ یوسف علیہ السلام کی آخری آیت ہے، اس میں پانچ باتوں کا ذکر ہے:

① اول یہ کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی قوموں کے قصوں میں عقل والوں کے لئے عبرت ہے۔ ② دوسری یہ کہ قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ نازل شدہ کتاب ہے، یہ کوئی اختراعی اور تراشی ہوئی کتاب نہیں جسے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے بنایا ہو۔ ③ تیسری بات یہ کہ قرآن مجید تمام گزشتہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کنندہ ہے۔ ④ چوتھی یہ کہ اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے، اور تمام احکام کی جامع ہے۔ ⑤ پانچویں یہ کہ یہ کتاب ہدایت بھی ہے اور کتاب رحمت بھی ہے مؤمنوں کے لئے۔

فائدہ:

﴿تَفۡصِيۡلَ كُلِّ شَىۡءٍ﴾ قرآن مجید میں ہر شئی کی تفصیل موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم میں ہر وہ چیز بیان کی گئی ہے جس کی دینی لحاظ سے لوگوں کو حاجت ہو۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وَتَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ مِنْ تحلیل وَتحریمٍ ومَحبوبٍ وَمکرُوہٍ وَغیرِ ذٰلِکَ مِنَ الاَمرِ بالطَّاعَاتِ وَالواجباتِ

وَالْمُسْتَحِبَاتِ وَالنَّهِي عَنِ الْمُحَرَّمَاتِ وَغیرہ وغیرہ۔ [ابن کثیر]

کُلِّ شَیْءٍ سے حلال، حرام، محبوب ومکروہ اور امر بالطاعات اور واجبات ومستحبات اور محرمات سے نہی اور مکروہات سے کنارہ کشی کرنا وغیرہ مراد ہے، رہا معاملہ امور دنیاوی کا ان کے متعلق قرآن کریم کوئی بھی تفصیل نہیں دیتا کہ تم روٹی اس طرح پکاؤ، مکان ایسا تعمیر کرو، اور فلاں صنعت کو ایسے چلاؤ، صابن وبسکٹ ایسے بناؤ، کیونکہ یہ چیزیں قرآنِ حکیم کے موضوع سے خارج ہیں، قرآن کریم کا موضوع تکمیل انسانیت اور احکام الٰہی ہی کا بیان ہے نہ اور کچھ۔

لفظِ کُلّ:

لفظِ ''کُل'' پورے قرآن مجید میں (۳۵۷) مرتبہ مذکور ہے۔ ''کُل'' دو طرح کا ہوتا ہے: مجموعی اور افرادی۔ کُل افرادی ہمیشہ نکرہ مفرد کی طرف مضاف ہوتا ہے، جس کا ترجمہ ہوتا ہے ہر ایک، جیسے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [الأنفال:۷۵] (بیشک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے) اور ﴿عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [البقرة:۲۰] (ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے)۔

کُل مجموعی معرف باللام کی طرف مضاف ہوتا ہے، یا اس ضمیر کی طرف مضاف ہوتا ہے جو معرف باللام کی طرف راجع ہوتی ہے، اس وقت وہ مجموعہ افراد پر دلالت کرتا ہے اور ترجمہ ہوتا ہے ''سب'' جیسے: ﴿فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ﴾ [الحجر:۳۰] (سب فرشتوں نے سجدہ کیا) اور جیسے: ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [التوبة:۳۳] (تاکہ سب مذہبوں پر اس کو غالب کردے)۔

یاد رہے کہ لفظ کُل ہمیشہ استغراق اور عموم کے لئے نہیں ہوتا، بعض اور چند معانی اور افراد کے لئے بھی ہوتا ہے، جیسے: ﴿وَاُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [النمل:۲۳] (اور مجھے ہر چیز دی گئی ہے)۔ ﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ [البقرة:۲۶۰] (پھر ان میں سے رکھ دیں ہر پہاڑ پر ایک حصہ)۔ ﴿يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [القصص:۵۷] (ہر قسم کے پھل اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں)۔ ﴿وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا﴾ [الكهف:۸۴] (اور ہم نے اسے ہر چیز کا ذریعہ دیا تھا)۔ ﴿تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ﴾ [الأحقاف:۲۵] (ہر چیز کو تہس نہس کر ڈالتی ہے)۔ ﴿تَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ﴾ [یوسف:۱۱۱] (ہر چیز کی تفصیل) وغیرہ۔ پس قرائن اور سیاق وسباق سے کُل استغراقی اور جزئی کا بخوبی تعین ہوگا۔ کُل کا مضاف ہونا ضروری ہے، اگر مضاف الیہ مذکور نہ ہو تو محذوف مانا جائے گا۔

سُورَۃُ الرَّعۡد

مدنیۃٌ آیاتہا ۴۳ رکوعاتہا ۶

سورۂ رعد مدنی ہے، اس میں تینتالیس (۴۳) آیتیں، اور چھ (۶) رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الرعد ہے، رعد بادل کی گرج کو کہا جاتا ہے۔

سورت کا نام آیت "۱۳" سے ماخوذ ہے: ﴿وَیُسَبِّحُ الرَّعۡدُ بِحَمۡدِہٖ﴾

نزول:

یہ سورت بدنی ہے، یہ ترتیب تلاوت میں تیرہویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں "۹۶" نمبر پر ہے، اس سورت کا نزول سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد ہے، بعض علماء نے اسے مکی سورت کہا ہے۔

تعداد آیات، وحروف، وکلمات:

یہ سورت ۶ رکوع، ۴۳ آیات، اور ۸۶۲ کلمات، اور ۳۶۱۴ حروف پر مشتمل ہے۔

ربط:

سورۂ یوسف کے آخر میں توحید ورسالت اور صداقت قرآن کا بیان تھا، اس سورت کے شروع ہی سے ان ہی چیزوں کا بیان ہے۔ اسی طرح دونوں سورتوں کی ابتداء میں اسرارُ القرآن یعنی حروف مقطعات کا ذکر ہے، اور اسی کے ساتھ صداقت قرآن کا بھی دونوں جگہ تذکرہ ہے۔

☆☆☆

مختصر موضوع

سورت کا آغاز اس بات سے ہوا ہے کہ قرآن کریم کلامِ الٰہی ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی عظمت و کبریائی، اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کو ایسی روشن اور نا قابلِ انکار تکوینی آیات سے ثابت کیا گیا ہے جن کا انکار فقط وہی بدنصیب کر سکتا ہے جس نے عقل وفہم کا فطری چراغ بجھا دیا ہو۔ سر پر آسمان ہے جس کی رفعت و بلندی اور بے نظیر وسعت کا اندازہ لگایا ہی نہیں جاسکتا، پھر اس میں آفتاب عالمتاب ومہتاب اپنے انوار و برکات سے ہر طرف پورے عالم بر و بحر پر ضوٗ افشاں ہے، اور نیچے کرۂ ارضی زمین کو اس انداز و نزاکتوں کے ساتھ بچھایا گیا ہے کہ کہیں اس سے چشمے ابل رہے ہیں، کہیں میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے دریا بہہ رہے ہیں، کہیں بلند وبالا مختلف رنگ کے پہاڑوں کا سلسلہ ہے، جن کی برف پوش چوٹیاں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں، اور جن کی عریض وطویل وادیاں قدرت کی رنگینیوں کی دل کشا روح پرور جلوہ گاہیں ہیں۔

کہیں طرح طرح کے پھلدار سایہ دار مختلف قد وقامت کے درخت قطار در قطار استقبال کے لئے کھڑے ہیں، جب بادِ صبا کا ان پر گزر ہوتا ہے تو جھوم کر ایسا دلفریب وخوشنما منظر پیش کرتے ہیں گویا وہ اپنے خالق ومالک کے حضور رکوع وسجدہ کی تیاری کر رہے ہیں، کہیں سرسبز وشاداب کھیت لہلہاتے، خوبصورت باریک ونرم آوازوں کے ساتھ نغمہ خوانی کر رہے ہیں۔ یہ سب باتیں اس سورت کے موضوعات ہیں۔

زمین ایک ہے، پانی ایک ہے لیکن اس ایک زمین سے (انسانوں اور جانوروں کی طرح) جو پھل پھول اگتے ہیں، وہ اپنے رنگ وبو میں اور اپنے ذائقہ اور تاثیر میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، یہ اختلاف وبوقلمونی اور تنوع کہاں سے آگیا؟ یہ کس کی حیرت انگیز کار پردازی ہے؟ ان خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کا تقسیم کرنے والا کون ہے؟ تو لامحالہ ان کا ایک ہی جواب ہے کہ وہ ربّ العٰلمین اَرحم الراحمین ہی کی ذات عالیہ ہے۔ پس کیا کوئی قلب سلیم اس ذات پاک کا انکار کر سکتا ہے؟

جس کی قدرتِ کاملہ حکمت بالغہ کی جلوہ طرازیاں چاروں طرف محوِ خرام ناز ہیں، وہ دل پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو اور وہ عقل گم گشتہ وتباہ ہو، وہ آنکھیں نابینا اور سیاہ ہوں، وہ شخص مردہ اور فنا ہو جو ان جلوہ طرازیوں سے نا آشنا اور بیگانہ ہو۔ آمین ثم آمین۔ مزید تفصیل آنے والی ہے۔ اِن شاءاللہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الٓمّٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ ؕ وَالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَـقُّ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۱
اَللّٰهُ الَّذِىۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ
كُلٌّ يَّجۡرِىۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ يُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّكُمۡ تُوۡقِنُوۡنَ ۲

ترجمہ: الٓمّٓرٰ یہ کتاب کی آیتیں ہیں، اور آپ کے ربّ کی طرف سے جو کچھ آپ کی طرف اتارا گیا حق ہے، لیکن بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے ۱ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے بلند فرمادیا تم آسمانوں کو دیکھ رہے ہو، پھر وہ عرش پر مستوی ہوا، اور اس نے چاند اور سورج کو مسخر فرمادیا، ہر ایک مدّت مقررہ کے مطابق چلتا ہے، وہ کاموں کی تدبیر فرماتا ہے، نشانیوں کو واضح طور پر بیان فرماتا ہے تاکہ تم اپنے ربّ کی ملاقات کا یقین کرلو ۲

معارف ومنازل

الٓمّٓرٰ یہ حروف مقطعات میں سے ہیں، ان کے معانی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں، پوری تفصیل سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے وہاں دیکھی جائے۔ فرمایا:

﴿تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ﴾ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمائیں، اور جو کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو، اور جس کو اللہ تعالیٰ نازل فرمائے اس کے حق ہونے میں کسی کو کیا شبہ ہوسکتا ہے؟ لیکن پھر بھی بہت سے بدنصیب لوگ ایسے ہیں جو اس برحق سچی کتاب پر ایمان لانے کے لئے تیار نہیں۔

قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت اور اس کے بے نظیر اعجاز بیان کے سامنے تو انہیں دم مارنے کی ہمت نہ تھی، لیکن قرآنی دعوت کے تین بنیادی اصولوں سے انہیں ضد وعناد کی وجہ سے اتنا شدید اختلاف تھا کہ وہ کسی قیمت پر ان کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے:

(۱) توحید باری تعالیٰ (۲) روز قیامت (۳) وحی ورسالت۔

یہ بات ان کی ناقص سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی کہ ایک خدا اس وسیع وعریض کائنات کے بے شمار اور ان گنت مسائل سے کیسے عہدہ برآ ہوسکتا ہے، وہ تعجب وحیرانی کے عالم میں کہتے: ﴿اَجَعَلَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ اِنَّ هٰذَا

لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾ [ص:۵] (کیا بہت سارے معبودوں کو ایک ہی سمجھ لیا؟ یہ تو بڑی عجیب چیز ہے)۔ دوسرے یہ کہ قرآن حکیم کا کہنا کہ مرنے کے بعد پھر دوبارہ تمہیں زندہ کیا جائے گا، اور قیامت کے روز تمہیں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہونا ہوگا، تو وہ اس کو بھی عقل و دانش کے خلاف یقین کرتے ہوئے، اس کا شدومد سے انکار کرتے تھے۔ تیسرے وہ یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ ہماری طرح کا کوئی انسان ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ جس پر آسمانی وحی کا نزول ہو؟ اور وہ خدا کی طرف سے مبعوث پیغمبر ہو؟ اور یہ کتاب جو ہمارے سامنے پڑھی جارہی ہے یہ واقعی خدا کی کتاب ہو؟ وغیرہ۔

یہ تین شبہات ان کے دلوں میں ایسے جڑ پکڑ چکے تھے کہ ان کی موجودگی میں آفتاب سے زیادہ روشن اور واضح دلائل کے سامنے بھی وہ سر جھکانے کو تیار نہ تھے، چنانچہ اس سورت میں انہی تین شبہات کو پرزور طریقہ سے دور کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل بیان کئے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی حقیقت کی فہم اور سمجھ تو انسان کے بس میں نہیں، لیکن اس کی مقدس صفات کے آئینوں میں اس کی عظمت و کبریائی کے جلوے دیکھے جاسکتے ہیں۔

ذرا اس نیلگوں اور بلند و بالا آسمان کی طرف تو دیکھو، کیا تم اس کی بلندی کا اندازہ لگا سکتے ہو؟ کیا اس کی وسعت و فراخی کا تمہاری نگاہیں احاطہ کرسکتی ہیں؟ کیا اس کو اتنی بلندی پر تھامنے کے لئے کوئی ستون تمہیں دکھائی دے رہا ہے؟ تم تو ایک چھوٹے سے کمرے کی اگر چھت ڈالنا چاہو تو پہلے دیواریں اور ستون بناتے ہو، پھر شہتیر رکھتے ہو، اس پر درجنوں کڑیاں بچھاتے ہو تب جاکر ایک چھت بنتی ہے، اور وہ بھی ایسی کہ کچھ مدت گزرنے کے بعد اس میں درجنوں شگاف پڑنے شروع ہوجاتے ہیں، اس پر بھی تمہیں اپنے فن اور ذہانت پر انجنیئرنگ اور تعلیم پر ناز ہے۔

ذرا ربّ العزّت کی قدرت کو اور اس کی خوبیوں کو دیکھو کہ اس نے ایک نہیں بلکہ سات آسمانوں کو ستونوں اور سہاروں کے بغیر کھڑا کردیا ہے، پھر اس کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ اسے بنے ہوئے لاکھوں کروڑوں سال گزر گئے اور اس میں لچک تک پیدا نہیں ہوئی۔

دوسرے مقام پر تمہیں دعوت دی جارہی ہے کہ ذرا تم آنکھیں کھولو، اور خوب غور سے دیکھو: ﴿أَفَلَمْ يَنظُرُوٓا۟ إِلَى ٱلسَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَـٰهَا وَزَيَّنَّـٰهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ﴾ [ق:۶] (یعنی آنکھیں کھول کر ذرا اوپر آسمان کو دیکھ لو، نہ بظاہر کوئی ستون نظر آتا ہے نہ کھمبا نظر آتا ہے، اتنا بڑا عظیم الشان جسم کیسا مضبوط و مستحکم کھڑا ہے

اور رات کو جب اس پر ستاروں کی قندیل اور جھاڑ فانوس جگمگاتے ہیں تو کس قدر پر رونق اور خوبصورت نظر آتا ہے، پھر لطف یہ ہے کہ ہزاروں لاکھوں برس گزر گئے، نہ اس چھت میں کہیں سوراخ ہوا نہ کوئی کنگرہ گرا، نہ پلاسٹر ٹوٹا، نہ رنگ خراب ہوا، آخر کونسا ہاتھ ہے جس نے یہ مخلوق بنائی، اور بنا کر اس کی ایسی حفاظت کی؟

تَرَوْنَهَا کی ضمیر کا مرجع سَمٰوٰتٍ بھی ہوسکتا ہے، اور عَمَدٍ بھی۔ پہلی صورت میں آیت کا ترجمہ وہ ہوگا جو درج ہے، یعنی جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر ستونوں کے جیسے تم انہیں دیکھ رہے ہو۔

دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جس نے بلند کیا آسمانوں کو ان ستونوں کے بغیر جنہیں تم دیکھ سکو، یعنی آسمانوں کو تو ستونوں پر قائم کیا گیا ہے، لیکن ایسے نہیں جو تمہیں نظر آسکیں، یعنی حقیقت میں ان کے ستون ہیں، اور وہ قدرت ربانی اور امر الٰہی ہے جس کی وجہ سے وہ اتنی بلندی میں قائم ہیں یہ ستون حسی نہیں معنوی ہیں۔ [کبیر]

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ﴾ یہ کتاب یعنی قرآن کریم کی آیات ہیں۔

﴿وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ﴾ اور آپ کے ربّ جل جلالہ کی طرف سے جو آپ کی طرف نازل کیا گیا وہ حق ہے، اور اس کی حقانیت کسی انسان کے ماننے پر موقوف نہیں، جو مانے گا نجات پائے گا، اور جو نہیں مانے گا وہ خوار و ذلیل اور ابدی سزا کا حقدار ہوگا۔

﴿وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ اللہ تعالیٰ شانہ وہ پاک ذات ہے جس نے آسمانوں کو بلندی پر بغیر ستون کے بنا دیا، اور یہ آسمان تمہاری نظروں کے سامنے ہیں جنہیں تم دیکھتے رہتے ہو۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ پھر اس نے عرش پر استواء فرمایا۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی صفات و افعال کے متعلق ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نصوص قرآن و حدیث میں جو الفاظ حق تعالیٰ کی صفات کے بیان کرنے کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں ان میں اکثر وہ ہیں جن کا مخلوق کی صفات پر بھی استعمال ہوا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کو حی، سمیع، بصیر، متکلم کہا گیا ہے، اور انسان پر بھی یہ الفاظ اطلاق کئے گئے ہیں، تو ان دونوں مواقع میں استعمال کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے، کسی مخلوق کو سمیع و بصیر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں۔

اب اس میں دو چیزیں ہوئیں: ایک وہ آلہ جسے آنکھ کہتے ہیں جو دیکھنے کا مبدأ اور ذریعہ بنتا ہے، دوسرا اس کا نتیجہ غرض و غایت (دیکھنا) یعنی وہ خاص علم جو رؤیت بصری سے حاصل ہو۔ مخلوق کو جب بصیر کہا تو یہ مبدأ اور نہایت

دونوں چیزیں معتبر ہوئیں، اور دونوں کی کیفیات ہم نے معلوم کرلیں، لیکن یہی لفظ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے استعمال کیا گیا تو یقیناً وہ مبادی اور کیفیاتِ جسمانیہ مراد نہیں ہوسکتیں جومخلوق کے خواص میں سے ہیں، اور جن سے خداوند قدوس قطعاً منزہ ہے۔

البتہ یہ اعتقاد رکھنا ہوگا کہ ابصار "دیکھنے" کا مبدأ اس کی ذات اقدس میں موجود ہے، اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رؤیت بصری سے حاصل ہوسکتا ہے، اس کو بدرجۂ کمال حاصل ہے، آگے یہ کہ وہ مبدأ کیسا ہے؟ اور دیکھنے کی کیا کیفیت ہے؟ تو بجز اس بات کے کہ اس کا دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾[الشوریٰ:۱۱] (اس کی مثل کوئی چیز نہیں، وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے)۔

نہ صرف سمع و بصر بلکہ اس کی تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ صفت باعتبار اپنے اصل مبدأ و غایت کے ثابت ہے، مگر اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی، اور نہ شرائعِ سماویہ نے اس کا مکلف بنایا ہے کہ آدمی اس طرح کے ماوراء عقل حقائق میں غور و خوض کر کے پریشان ہو، اس کا کچھ خلاصہ سورۂ مائدہ میں بیان ہوا آیت: ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللهِ مَغْلُوْلَةٌ﴾[المائدۃ:۶۴] (اور یہودیوں نے کہا کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں) کے تحت، "استواء علی العرش" کو بھی اسی قاعدہ سے سمجھ لو۔

"عرش" کے معنی تخت اور بلند مقام کے ہیں جیسے: ﴿وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ﴾[یوسف:۱۰۰] (اور اپنے ماں باپ کو تخت پر بلند کیا) یا سورۂ نمل کی آیت: ﴿وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ﴾[النمل:۲۳] (اور اس کے لیے ایک بڑا تخت ہے)۔

"استواء" کا ترجمہ اکثر محققین نے "استقرار و تمکن" سے کیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ﴾ [ہود:۴۴] (اور کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی)۔ گویا یہ لفظ تخت حکومت پر اسی طرح قابض ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ اور گوشہ حیطۂ نفوذ و اقتدار سے باہر نہ رہے، اور نہ قبضہ و تسلط میں کسی قسم کی مزاحمت اور گڑبڑ پائی جائے، سب کام اور انتظام برابر ہو۔

اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبدأ اور ظاہری صورت ہوتی ہے، اور ایک حقیقت یا غرض و غایت، یعنی ملک پر پورا تسلط و اقتدار اور نفوذ و تصرف کی قدرت حاصل ہونا، حق تعالیٰ کے "استواء علی العرش" میں یہ حقیقت اور غرض و غایت بدرجۂ کمال موجود ہے، یعنی آسمان و زمین کے کل علویات و سفلیات کو پیدا کرنے کے بعد

ان پر کامل قبضہ واقتدار اور ہر قسم کے مالکانہ وشہنشاہانہ تصرفات کا حق بے روک ٹوک اسی کو حاصل ہے جیسا کہ یہاں اور دوسری جگہ بھی: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ﴾ کے بعد ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ [یونس:۳] (پھر عرش پر ٹھہر گیا، کام کی تدبیر کرتا ہے) وغیرہ الفاظ سے اسی مضمون پر تنبیہ ہے۔

رہا ﴿اِسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ﴾ کا مبدأ اور ظاہری صورت اس کے متعلق وہی عقیدہ رکھنا چاہیے جو ہم "سمع وبصر" وغیرہ صفات کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ اس کی ایسی کوئی صورت نہیں ہوسکتی جس میں صفات مخلوقات اور صفات حدوث کا ذرا سا بھی شائبہ ہو، پھر استواء کیسا ہے؟

اس کا جواب بھی وہی ہے:۔

اے برتر از خیال وقیاس گمان وہم ☆ وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم

دفتر تمام گشت وبپایاں رسید وعمر ☆ ماہچنان در اول وصف تو ماندہ ایم

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ [الشوری:۱۱] (اس کی مثل کوئی چیز نہیں، وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے)۔ [تفسیر عثمانی]

خلاصہ:

سلف صالحین کا تو مسلک یہ ہے کہ وہ ایسی آیات کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں، اور ان میں قیل وقال سے گریز کرتے ہیں، کیونکہ تمام متشابہات کا یہی حکم ہے، اور لوگوں کے ایمان وانقیاد کا اسی میں امتحان ہے، یہ بہت بڑا وسیع میدان ہے، اس میں عقل کے گھوڑے دوڑانے سے بجز نقصان کے کچھ نہیں، پس یہاں ہتھیار ڈال کر سوائے تسلیم ورضا کے کوئی چارہ نہیں۔ جیسا کہ مروی ہے: ایک شخص نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا، آپؒ نے تھوڑے سے توقف کے بعد فرمایا کہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر استواء فرمایا، لیکن اس کی کیفیت کیا تھی؟ یہ ہمارے فہم وسمجھ سے بالاتر ہے، لیکن اس پر ایمان واجب ہے، اور اس کے متعلق گفتگو بدعت ہے۔

علماء متاخرین نے اس کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ "استواء" کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھ گئے، کیونکہ وہ مکان اور جلوس سے پاک وبرتر ہے، وہ ہر جگہ حاضر وناظر موجود اور لامکان ہے، بلکہ اس کا مدعا اور مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات ارضی وسماوی کا انتظام اور باگ ڈور اس نے اپنے دست قدرت میں تھام لی، اور حکم وحکمرانی کو اپنے لئے مخصوص فرمالیا۔ "اَلْمُرَادُ مِنَ الْاِسْتِوَاءِ كَمَالُ قُدْرَتِهٖ فِيْ تَدْبِيْرِ الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ"۔ پھر

فرمایا:

﴿وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ اور چاند اور سورج کو مسخر فرمادیا، ان میں سے ہرایک وقت مقرر کے مطابق چلتا ہے۔ سورۂ اعراف میں فرمایا: ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأعراف:۵۴] (یقیناً تمہارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے سارے آسمان اور زمین چھ دن میں بنائے۔ پھر اس نے عرش پر استواء فرمایا۔ وہ دن کو رات کی چادر اڑھادیتا ہے، جو تیز رفتاری سے چلتی ہوئی اس کو آدبوچتی ہے۔ اور اس نے سورج اور چاند تارے پیدا کیے ہیں، جو سب اس کے حکم کے آگے رام ہیں۔ یادرکھو کہ پیدا کرنا اور حکم دینا سب اسی کا کام ہے۔ بڑی برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)۔

اسی طرح سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ﴾ [یونس:۳] (بیشک تمہارا پروردگار اللہ ہے جس نے سارے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر اس نے عرش پر اس طرح استواء فرمایا کہ وہ ہر چیز کا انتظام کرتا ہے)۔

اسی طرح سورۂ ابراہیم میں فرمایا: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآىِٕبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ [ابراهيم:۳۳] (اور تمہاری خاطر سورج اور چاند کو اس طرح کام پر لگایا کہ وہ مسلسل سفر میں ہیں، اور تمہاری خاطر رات اور دن کو بھی کام پر لگایا)۔

سورۂ یٰس میں فرمایا: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝۳۸ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝۳۹﴾ [یس:] (اور سوج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جارہا ہے۔ یہ سب اس ذات کا مقرر کیا ہوا نظام ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کا علم بھی کامل ہے۔ اور چاند ہے ہم نے اس کی منزلیں ناپ تول کر مقرر کردی ہیں، یہاں تک کہ وہ جب لوٹ کر آتا ہے تو کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح ہو کر رہ جاتا ہے)۔

اسی طرح سورۂ سجدہ میں فرمایا: ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ﴾ [السجدة:۵] (اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان ساری چیزوں کو چھ دن

میں پیدا کیا، پھر اس نے عرش پر استواء فرمایا۔اس کے سوا نہ تمہارا کوئی رکھوالا ہے، نہ کوئی سفارشی، کیا پھر بھی تم کسی نصیحت پر دھیان نہیں دیتے ؟ وہ آسمان سے لے کر زمین تک ہر کام کا انتظام خود کرتا ہے)۔

سورہ طٰہٰ میں فرمایا: ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ:۵] (وہ بڑی رحمت والا عرش پر استواء فرمائے ہوئے ہے)۔

سورۂ فرقان میں فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا﴾ [الفرقان:۵۹] (پھر اس نے عرش پر استواء فرمایا، وہ رحمن ہے اس لیے اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھو)۔

اور سورۂ حدید میں فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاۗءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ [الحدید:۴] (وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر استواء فرمایا، وہ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتی ہے، اور جو اس سے نکلتی ہے، اور وہ اس چیز کو جو آسمان سے اترتی ہے، اور جو اس میں چڑھتی ہے، اور تم جہاں کہیں ہو وہ تمہارے ساتھ ہے، اور جو کام بھی تم کرتے ہو اللہ اس کی دیکھتا ہے)۔"وغیر ذلک من الآیات والتذکیرات ، استواء علی العرش"۔ سات مقامات پر مذکور ہوا، باقی مضامین کا کوئی احاطہ ہی نہیں جس میں قدرت وتخلیق اور عجائبات قدرت کا بیان ہے۔ واللہ اعلم

قرآن حکیم تمہیں غفلت کی نیند سے بیدار کر کے ربّ العزّت کی توحید وعظمت کی ایک انوکھی اور نرالی شان بیان کرنے کے ساتھ یہ دعوت دے رہا ہے کہ دیکھو عام لوگ کائنات کے حسن وجمال کو دیکھتے ہیں اور دنگ رہ جاتے ہیں، مختلف اشیاء کے حیران کن اثرات پر آگاہ ہوتے ہیں اور فرط مسرت سے جھوم اٹھتے ہیں، اس جہاں کی وسعتیں اور فراخیاں، بلندیاں، اور پستیاں چشم ہوش کو خیرہ کر دیتی ہیں، لیکن ان کی رسائی اس حسن وجمال کے خالق اور ان اثرات کے پیدا کرنے والے تک نہیں ہوتی، ان کی نگاہیں ان حجابات میں اٹک کر رہ جاتی ہیں۔

ہاں! معرفتِ الٰہی کی سعادت سے فقط ان باہمت اور بلند حوصلہ لوگوں کو سرفراز کیا جاتا ہے جو مؤمن ومتقی اور پرہیزگار ہوتے ہیں جو کہ ایمان بالغیب کی سعادت سے مالا مال ہوتے ہیں، اور قرآن حکیم کو سینوں سے لگا کر اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جانی ومالی ہر قسم کی قربانیوں پر ہمہ تن تیار ہوتے ہیں، جو کہ تمام حجابات کو تار تار کرتے ہوئے

آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، اور جمالِ حقیقی کی دید ومعرفت سے اپنے دیدۂ عقل ودل کو روشن کر دیتے ہیں۔

ہمارے جدید علوم کے طلبہ اور ماہرین اور سائنسدانوں کو مظاہر فطرت کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس عالم رنگ وبو میں جو زیبائی ورعنائی جو قوت وتاثیر جو نزاکت وخوبصورتی اور جو خوبی و کمال جہاں کہیں جس روپ میں انہیں دکھائی دے رہا ہے وہ کسی کائناتی حادثہ سے معرض وجود میں نہیں آیا، بلکہ قادر و توانا علیم وحکیم اور مالک وحاکم پروردگار نے اسے پیدا فرمایا ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو مسلمان سائنس دان کو دنیا بھر کے دوسرے سائنس دانوں سے جدا کرتا ہے۔

اس طرح ان کا ہر قدم جو منزل کی طرف اٹھے گا اور ان کی کامیابی ادھوری اور نا تمام نہیں، بلکہ مکمل ہوگی، ان کی ترقی انسانیت کے لئے تباہ کن نہیں بلکہ فلاح انسانیت کی ضامن ہوگی، آنے والی باتیں اسی مقصد کی خاطر بیان ہوں گی جسے آپ قدرت کا کرشمہ سمجھ کر سبق تازہ کریں۔

قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات کمال کے اثبات کے لئے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ دنیا بھر کے دانشوروں، عقلمندوں، فلسفیوں اور اہل علم کے طرز استدلال سے جدا ہے، قوت وتاثیر میں بھی اور وضاحت وبیان میں بھی۔ یہاں ہمیں مغلق اور پیچیدہ فنی اصطلاحات کا نشان نہیں ملتا، یہاں دل میں اتر جانے والی صاف صاف باتیں ہوتی ہیں جن سے عالم بھی اور ان پڑھ بھی اپنی اپنی استعداد کے مطابق یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

یہاں بھی قدرتِ الٰہی کی چند نشانیاں بیان کر کے ان میں غور وفکر کی دعوت دی جا رہی ہے، کونسی آنکھ ہے جو صبح کے وقت مشرق کے افق سے سورج کو ابھرتے ہوئے نہیں دیکھتی؟ جو ابھرتا ہے تو سارا جہاں جگمگا اٹھتا ہے، زندگی کی حرارت اور بیداری کی لہر ہر شے کے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے، پھر وہ اپنی منفرد راہ سے گزرتے ہوئے جب آسمان کے عین وسط میں پہنچتا ہے تو اپنے معبود ومالک کے عرش کے نیچے سجدہ شکر بجا لاتا ہے، اور آگے بڑھنے کی اجازت مانگتا ہے جو اسے مل جاتی ہے۔ [بخاري]

وہاں سے روانہ ہو کر شام کے وقت مغربی افق میں ڈوب جاتا ہے، کونسی آنکھ ہے جس نے رات کے وقت چاند کو اپنی کرنیں بکھیرتے ہوئے نہیں دیکھا؟ کبھی بڑھتے ہوئے اور کبھی گھٹتے ہوئے، کبھی لڑکپن میں، کبھی جوانی میں اور کبھی بڑھاپے میں۔ یہ سورج اور چاند آج سے نہیں لاکھوں سال سے مصروف عمل اور گردش میں ہیں، اور اپنے

افلاک میں تیرتے ہوئے رواں دواں ہیں، ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ [یس: ۴۰] (سب مدار میں تیر رہے ہیں)۔

پھر تسخیر کا یہ عالم ہے کہ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ ان دونوں نے اپنے طلوع وغروب کے اوقات میں کوئی تبدیلی کی ہو، موسم کے لحاظ سے جو جو وقت روزانہ کے حساب سے مقرر ہوتا ہے کبھی اس میں تقدیم وتاخیر نہیں ہوتی، اور اس کے لئے جو راستے مقرر ہوتے ہیں بال برابر اس میں انحراف نہیں ہوتا، یہی واضح ثبوت ہے اور یقیناً ہے کہ یہ سارا نظام ایک واحد لاشریک خالق ومالک سمیع وبصیر ربّ کے حکم سے چل رہا ہے، اور بس۔

اسی لئے ارشاد ہوا کہ آسمانوں کی تخلیق اور ان میں موجود سورج، چاند اور کواکب وسیارات کے مربوط ومستحکم نظام کو اپنی نگاہوں سے دیکھو، اور اس کی قدرتِ کاملہ اور حکمت بالغہ کے کمالات پر ایمان لاؤ، اور آفتاب عالمتاب جو کہ تیرہ (۱۳) لاکھ گنا زمین سے بڑا ہے، اور یہاں سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ اس کو بھی دیکھو، اور مہتاب عالم (چاند) کا بھی ملاحظہ کرو، یہ بھی غور کرو کہ اسے ضیاء وروشنی کس نے عطا کی ہے؟ سورج کی کرنوں کی تاثیر الگ ہے، چاند کی الگ، ستاروں کی الگ، ان کے راستے الگ، منزلیں الگ، طلوع وغروب کے اوقات الگ۔

چاند زمین سے قریب ترین سیارہ ہے، وہ زمین کے گرد گردش کرتا ہے، اور اپنی گردش کے فلک کو ستائیس دن سات گھنٹوں اور پینتالیس منٹوں میں طے کرتا ہے، لیکن اسے اس جگہ پر پہنچنے کے لئے جہاں وہ سورج سے روشنی حاصل کر سکے، مزید ایک دو دن لگتے ہیں، اس لئے نیا چاند (۳۰) (۲۹) دن کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ ماہرین فلکیات نے چاند کے لئے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں، اور ہر منزل کو اس کے ستاروں کے مجموعہ سے موسوم کیا ہے جہاں وہ ہر رات پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ علماء عرب نے اس کی منازل کے مندرجہ ذیل نام مقرر کئے ہیں:

السرطان، البطين، الثريا، الدبران، النفعه، النقه، الذراع، النشره، الطرف، الجبهة، الزبرة، الصرفه، العواء، السماک الاعزل، الغفرة، الزباني، الاكليل، القلب، الشولة، النعائم، البلدة، سعد الذابح، سعد بلع، سعد السعود، سعد الاخبية، فرغ الدلو، المقدم، الفرغ الموخر، بطن الحوت۔

پھر انہیں بارہ برجوں میں تقسیم کیا ہے جو کہ مشہور ہیں جن کے نام یہ ہیں:

حمل، ثور، جوزاء، سرطان، أسد، سنبله، ميزان، عقرب، قوس، جدي، دلو، حوت۔

اس طرح ہر برج ڈھائی منزلوں پر مشتمل ہوگا، جب تک چاند ان منزلوں میں ہوتا ہے وہ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے۔ پھر اگر مہینہ انتیس کا ہو تو ایک رات، اور اگر تیس کا ہو تو دو رات نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے، اور پھر از

سرنو اول سے گردش شروع کردیتا ہے۔ ﴿ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ [الأنعام:۹۶] (یہ سب کچھ اس ذات کی منصوبہ بندی ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، علم بھی کامل ہے)۔ ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ [البقرة:۱۶۳] (نہیں ہے معبود سوائے اس کے)۔

اب خود ہی بتاؤ جس کے حکم سے یہ سب کچھ مرور اور زمانہ عرصہ دراز سے نظام جاری ہے اس کے علم اس کی قدرت میں شک کرنے کی گنجائش نہیں ہے، وہ لوگ جو سورج چاند اور دیگر اجرام فلکی کی پوجا کرتے ہیں انہیں بھی بتا دیا کہ وہ خدا نہیں، محکوم اور فرمانبردار ہیں، تمہاری طرح کی مخلوق ہیں، وہ اپنے مالک کے حکم کے سامنے سرافگندہ غلام ہیں، اور اسی کے حکم پر مسخر ہیں۔

التسخیر تسخیر کے معنی ہیں: جبر وقہر کے ساتھ کسی چیز کو کسی کام میں لگا دینا، چنانچہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسخیر کے ساتھ اپنی ڈیوٹی میں مصروف ہے، مجال نہیں سوائے انسان کے کوئی اور مخلوق اپنے فرائض میں غفلت یا سستی کرے، جانوروں تک سب مسخر ہیں، کبھی کسی انحراف ونافرمانی کا ارتکاب نہیں کرتے۔

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ ہر کام کی تشریعی اور تکوینی دونوں طریقوں سے تدبیر کرتا ہے، اور آیاتِ تکوینیہ جیسے نظام کائنات اور تشریعیہ جیسے احکامِ شریعت سب کی تفصیل و تشریح بیان کرتا ہے۔ وحی جلی اور وحی خفی دونوں کے ذریعے سے تاکہ ان کے دیکھنے اور ان پر ایمان لانے اور عمل کرنے سے تم لوگ اپنے ربّ کی ملاقات کا یقین کرلو، اور صراط مستقیم پر چلنے کی تیاری کرو، اور جنت وسعادتوں کے حقدار و مستحق بنو۔

.... ❁ ....

وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا
زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۳ وَفِي الْاَرْضِ
قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَاۗءٍ
وَّاحِدٍ ۣ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰي بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۴

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلا دیا، اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا فرمادیں، اور ہر قسم کے

پھلوں سے دو دو قسمیں پیدا فرمائیں، وہ رات کو دن پر ڈھانپ دیتا ہے، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو فکر کرتے ہیں ۞ اور زمین میں ٹکڑے ہیں جو آپس میں پڑوسی ہیں، اور انگوروں کے باغ ہیں، اور کھیتیاں ہیں، اور کھجور کے درخت ہیں جن میں بعض کی جڑ بعض سے ملی ہوئی ہیں، اور بعض ملی ہوئی نہیں ہیں، انہیں ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے، اور ہم ایک کو دوسرے پر فضیلت دیتے ہیں، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو سمجھ سے کام لیتے ہیں ۞

معارف ومنازل

عظیم نعمتوں، تکوینی آیات بینات، اور دلائل توحید کا تذکرہ جاری ہے۔ علویات کے بعد سفلیات اور زمینی نعمتوں کا ذکر ہو رہا ہے، فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے تمہاری منفعت اور ان گنت مقاصد کے لئے زمین کو پھیلا دیا، اور اس پر بڑے بڑے فلک بوس پہاڑ پیدا فرما دیئے۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ﴾ [لقمان:۱۰] (اللہ تعالیٰ نے زمین پر بڑے بھاری بوجھل پہاڑوں کو ڈال دیا تاکہ زمین تمہارے ساتھ اضطرابی حرکت نہ کرے) اس میں پہاڑوں کے پیدا فرمانے اور ان کو بوجھل بنانے اور زمین پر جما دینے کی من جملہ دیگر بہت سی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بیان فرمائی۔

﴿وَاَنْهٰرًا﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے زمین میں نہریں پیدا فرمائیں۔

یہ بے شمار نہریں جو کہ زمین کے دور دراز مختلف حصوں میں دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں جن سے انسانی معیشت مستحکم اور خوشحال رہتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم اور پائیدار نعمتیں ہیں۔ آیت کریمہ میں زمین کے پھیلاؤ کا ذکر ہے، یہ اس کی کروی شکل کی ہرگز منافی نہیں، کیونکہ زمین بہت بڑی ہے، اور اس کی سطح بہت زیادہ ہے، اور گول چیز جب بڑی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ الگ الگ ایک پھیلی ہوئی چیز یعنی پھیلی ہوئی سطح ہی نظر آتا ہے۔

﴿وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ﴾ یعنی پھر اس زمین سے طرح طرح کے پھل پیدا کئے، اور ہر ایک سے دو دو قسم کے پیدا کئے، چھوٹے بڑے، سرخ سفید، زرد کالے، کھٹے میٹھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ زوجین سے مراد صرف دو نہ ہوں بلکہ متعدد انواع واقسام مراد ہوں، جن کی تعداد کم از کم دو ہوتی ہو، اس لئے زوجین

اثنین سے تعبیر کر دیا گیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ زوجین سے مراد نر و مادہ ہوں، کیونکہ قرآن پاک نے اس راز سے پہلے ہی پردہ اٹھا دیا تھا کہ نر و مادہ کا وجود صرف جاندار مخلوق میں ہی نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نباتات کی افزائش نسل کے لئے یہی طریقہ مقرر کیا ہوا ہے۔ سورہ یٰسٓ میں ارشاد ہے: ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡۢبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ﴾ [یس: ۳۶] (پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کئے ہیں، اس پیداوار کے بھی جو زمین اگاتی ہے، اور خود انسانوں کے بھی، اور ان چیزوں کے بھی جنہیں یہ لوگ جانتے تک نہیں ہیں)۔

تو درختوں، پودوں، جڑی بوٹیوں کے شگوفے ان کی مادہ تک پہنچیں تو کیونکر؟ انسان سارے کام چھوڑ کر اگر یہی ایک کام کرنے لگے تو پھر بھی وہ اس کا لاکھواں حصہ انجام نہیں دے سکتا، یہ چیز انسان کی طاقت سے ماوراء تھی، اس لئے قدرت نے اپنی کرم گستری سے اس کا خود ہی اہتمام فرمادیا، انسان کو خبر تک ہی نہیں ہوتی، اور اس کے باغوں میں، کھیتوں میں، چراگاہوں میں اور جنگلوں میں اور نہ معلوم اور کہاں کہاں ہوائیں چپکے سے عمل تلقیح (جفتی نر مادہ) کو انجام دے رہی ہوتی ہیں جن کے باعث درختوں کی ٹہنیاں رنگ برنگ، خوش ذائقہ پھلوں سے لدی ہوئی ہیں، اور جھوم جھوم کر اپنے واحد لاشریک خالق کے حضور آداب بندگی بجالا رہی ہیں۔

کھیتوں کے پودوں پر خوشوں کے تاج سجائے جا رہے ہیں، اور ان کو دانوں کے موتیوں سے آراستہ کیا جا رہا ہے، اور وہ جھک جھک کر اپنے خالق کی ربوبیت اور کبریائی کے گیت گا رہے ہیں، اور اپنے ربّ کے حضور سجدہ کر رہے ہیں، ایک ہی حضرت انسان ہے جو سجدہ کرنے سے گریزاں ہے، اور آداب بندگی سے غافل اور بے خبر نظر آتا ہے۔

﴿یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّهَارَ﴾ اللہ تعالیٰ رات کی تاریکی اور سیاہ چادر سے دن کو ڈھانپ لیتا ہے، یعنی دن کی روشنی کے بعد رات کو لے آتا ہے جس سے دن کی روشنی ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرے مقام پر قدرے تفصیل ہے کہ رات کی تاریکی کے بعد دن کی روشنی لے آتا ہے، یہ سلسلہ بدستور اس کے حکم و امر کے ساتھ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ﴾ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو قدرت کے مظاہر اور مناظر میں فکر کرتے ہیں، یہ جو کچھ باتیں بیان کی گئیں ان میں جگر و دماغ والے فکر کریں، اور سوچیں کہ مذکورہ بالا چیزوں کی تخلیق اور ان کی ایجاد و بقاء اور ان کی تسخیر اور ترتیب بغیر کسی متصرف کے خود بخود نہیں ہے، اگر غور و فکر صحیح اور غیر متعصبانہ ہو تو ان کی تخلیق و تدبیر اور تسخیر اور ترتیب کا راز بخوبی معلوم ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ شانہ کی توحید و کمالات تک

بلاشک وشبہ رسائی ہوجائے گی۔

﴿وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ اس آیت کریمہ میں زمین کی پیداوار کا تذکرہ ہے، فرمایا: چشم خرد کھولو، عقل کی راہنمائی میں سوچو، یہ تمہاری زمین ہے جس پر صبح وشام گھوم گھوم کر سیاحت کرتے ہو، اس کو تم مختلف مقاصد کے لئے مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر چکے ہو، یاد رکھو یہ تمہارے لئے تو ہے مگر ملکیت تمہاری نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہے، اس کی کرم نوازی کو دیکھو کہ محض غیر آباد رکھ کر اسے تمہارے حوالہ نہ کیا بلکہ سرسبز وشاداب گل گلزار بنا کر تمہیں عطا فرمایا، کہیں مکان تعمیر کرتے ہو، کہیں انگوروں کے باغات لگاتے ہو، کہیں طرح طرح کے درخت لگاتے ہو، کہیں اناج وغیرہ اگاتے ہو، کہیں کھجوروں کے درخت لگاتے ہو۔

الغرض لاکھوں قسم کے درخت اور پودے لگا کر طرح طرح کے پھل پھول میوے حاصل کرتے ہو، پھر ایک ہی پانی سے کھیتوں سبزیوں اور باغات کو سیراب کرتے ہو، زمین بھی ایک، پانی بھی ایک، موسم بھی ایک، آب وہوا بھی ایک، ان پر شمس وقمر اور ستاروں کی پڑنے والی روشنی بھی ایک، لیکن دیکھو ہر جگہ رب العزت کی قدرت کے نرالے اور حیران کن کرشمے مختلف ہیں، کوئی اعلیٰ، کوئی ادنیٰ، کہیں سرخی، کہیں زردی، کسی کی پیداوار ادنیٰ، کسی کی اوسط، کسی کی اعلیٰ، کوئی ادنیٰ اور ردی، کہیں تلخی، کہیں مٹھاس، کوئی ترش، کوئی ذائقہ دار، کوئی بے ذائقہ، ایک نہیں، دو نہیں، ہزاروں نہیں، لاکھوں قسم کے پھل رنگ برنگ صاف ستھرے اور بے شمار نمونے، کیا یہ ہمارے قادر مطلق ہونے کے ناقابل تردید دلائل نہیں؟ یہ صناعی، یہ رنگ سازی ہماری نہیں تو کس کی ہے؟

اگر دور جانے کی ہمت نہیں تو اپنے وجود اور نوع بشر کو ذرا غور سے ملاحظہ کرو کہ تم سب ایک ہی نطفہ کی پیداوار ہو، تمہارے اندر ظاہری وباطنی تفاوت کیا ہے اور کتنا ہے؟ تمہارے اندر کیا دو آدمی شکل وصورت اور استعداد کے لحاظ سے ایک جیسے ہیں؟ ہرگز نہیں، تو پھر بتاؤ یہ کاریگری یہ رنگسازی یہ صناعی کس کی ہے؟ اگر ہماری قدرت کا دخل نہ ہوتا تو طبعی اسباب کی ایک رنگی کے باعث نتائج میں بھی یک رنگی اور یکسانیت ہوتی، کیا ان حقائق میں کبھی کوئی تمہاری مرضی اور خواہش کا دخل ہے؟ ہرگز نہیں، اور کبھی نہیں ہوگا، اگر عقل وخرد سے کام لو تو تمہیں معلوم ہوجائے کہ یہ سب ہماری قدرت کے منہ بولتے براہین ہیں۔

صِنْوَان صنو کی جمع ہے جیسے قِنْوَان (خوشے) قنو کی جمع ہے، اس کے تثنیہ کا نون مکسور ہوتا ہے، اور بغیر

تنوین کے ہوتا ہے، اور جمع کے نون پر ہر حرکت مع تنوین کے آتی ہے، ایک جڑ سے دو تنے برآمد ہوں تو اسے صنو کہتے ہیں، سرور عالم ﷺ نے اپنے بزرگوار چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: آدمی کا چچا اس کے باپ کا صنو ہوتا ہے۔ غَيْرُ صِنْوَانٍ الگ الگ ہوتے ہیں، جڑیں جدا جدا ہوتی ہیں۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ بلاشبہ ان مذکورہ باتوں میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں، عقل والے غور کریں گے تو انہیں ان چیزوں کے دیکھنے سے خالق و مالک کی پہچان حاصل ہوتی ہے، اور جو لوگ غور وفکر نہیں کرتے وہ عقلمندوں میں شمار ہی نہیں۔

فائدہ اور خلاصہ:

بلند آسمانوں کے مقابل پست زمین کا ذکر کیا۔ آسمان کے ساتھ چاند سورج کا بیان ہوا تھا کہ ہر ایک کی رفتار الگ ہے، اور ہر ایک کا کام جداگانہ ہے، ایک کی گرم و تیز شعائیں جو کام کرتی ہیں دوسرے کی ٹھنڈی اور دھیمی چاندنی سے وہ بن نہیں پڑتا، اسی طرح یہاں زمین کے مختلف احوال اور اس سے تعلق رکھنے والی مختلف چیزوں کا ذکر فرمایا۔

کہیں بلند و بالا پہاڑ کھڑے ہیں، کہیں دریا رواں ہیں، کہیں میوے اور پھلوں کا راج ہے، جو میوے اور پھل پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی شکل و صورت رنگ، مزے، خواص، چھوٹے بڑے بلکہ نر و مادہ کا اختلاف ہے، اور ہواؤں کے ذریعہ ان کی تخم ریزی وغیرہ کا نظام چل رہا ہے۔ کبھی زمین دن کے اجالے سے روشن ہو جاتی ہے، کبھی رات کا سیاہ نقاب منہ پر ڈال لیتی ہے۔

پھر طرفہ تماشا یہ ہے کہ چند قطعات زمین جو ایک دوسرے سے متصل ہیں ایک پانی سے سیراب ہوتے ہیں، ایک سورج کی شعاعیں برابر سب کو پہنچتی ہیں، ایک ہی ہوا سب پر برابر چلتی ہے، اس کے باوجود اس قدر مختلف پھل پھول لاتے ہیں اور باہم پیداوار کی کمی زیادتی کا اتنا فرق بھی ہوتا ہے جو دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ غور وفکر کرنے والے ان نشانیوں کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ایک ہی ابر رحمت کی آبیاری، یا ایک ہی آفتاب ہدایت کی موجودگی میں انسانوں کے مادی و روحانی احوال کا اختلاف بھی کچھ مستبعد و مستنکر نہیں ہے، اور یہ کہ لامحدود قدرت کا کوئی زبردست ہاتھ آسمان سے زمین تک تمام مخلوق کے نظام ترکیبی کو اپنے قبضہ میں لئے ہوئے ہے، جس نے ہر چیز کی استعداد کے موافق اس کے دائرۂ عمل و اثر کی بہت مضبوط حد بندی کر رکھی ہے۔

پھر ایسے لامتناہی قدرت و اختیار رکھنے والے خداوند قدوس کو کیا مشکل ہے کہ ہم کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ

کردے؟ اور اس عالم کے مخلوط عناصر کی کیمیاوی کو تحلیل کر کے ہر خیر وشر کو اس کے مستقر میں پہنچادے۔

قرآن کریم نے وضاحت سے بیان فرمایا کہ بعض پھلوں کو بعض دوسرے پھلوں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے، حالانکہ زمین ایک ہی ہے، اور پانی بھی ایک، موسم بھی ایک، ایک سورج اور چاند کی روشنی بھی ایک، اسی طرح بنی آدم کا حال بھی یہی ہے کہ بعض لوگ اپنے کفر وشرک کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت برے اور ناپاک ہیں، پھر جو لوگ مسلمان ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر نہیں ہیں، ان میں مقبول بندے بھی ہیں اور مبغوض ومردود بھی، سب ایک جیسے نہیں۔

……۞……۞……۞……

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝٥
وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ
لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٦ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝٧

ترجمہ: اور اگر آپ کو تعجب ہو تو ان کا یہ قول لائق تعجب ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا نئے سرے سے پیدا ہو جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے، اور یہ لوگ دوزخ والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے ۝٥ اور یہ لوگ عافیت سے پہلے آپ سے مصیبت کے جلدی آنے کا تقاضا کرتے ہیں، اور حالانکہ ان سے پہلے عذاب کے واقعات گزر چکے ہیں، اور بلاشبہ آپ کا ربّ لوگوں کے ظلم کے باوجود انہیں بخش دینے والا ہے، اور یہ بات یقینی ہے کہ آپ کا ربّ سخت عذاب والا ہے ۝٦ اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں: ان پر ان کے ربّ کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں کی گئی؟ آپ صرف ڈرانے والے ہیں، اور ہر قوم کے لئے ہدایت دینے والے ہوتے چلے آئے ہیں ۝٧

☆☆☆

معارف ومنازل

یہاں سے منکرینِ توحید ورسالت کے لئے تنبیہ بھی ہے، اور ان کی حماقت وبے سمجھی کی نشاندہی بھی ہے۔فرمایا:

﴿وَاِنْ تَعْجَبْ﴾ اگر آپ تعجب کریں اس بات پر کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی توحید بعث بعد الموت محاسبہ اعمال وغیرہ پر ایمان کیوں نہیں لاتے۔

﴿فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ﴾ توان کی یہ بات زیادہ تعجب انگیز اور حیران کن ہے جو کہتے ہیں:

﴿ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا﴾ کیا جب ہم مرکر بوسیدہ مٹی ہوجائیں گے ہمارے اجسام ذرات بن کر خاک میں مل جائیں گے:

﴿ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾ تو کیا ہم نئے سرے سے دوبارہ پیدا ہوجائیں گے؟ کفار کی یہ منطق سورۂ الٓمّٓ سجدۃ میں اس طرح بیان ہوئی ہے: ﴿ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾[السجدة:۱۰] (جب ہمارے اجزاء زمین میں مٹی کے ساتھ مخلوط ہوجائیں گے تو کیا ہم پھر سے دوبارہ پیدا ہوجائیں گے؟) سورۃ النازعات میں کفار کا مقولہ یہ بیان ہوا ہے: ﴿ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً﴾ [النازعات:۱۱] (کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہوجائیں گے تو پھر دوبارہ کیسے زندہ ہوجائیں گے؟)۔

کیونکہ بعث بعد الموت کے تصور سے ان کے دماغ خالی تھے، اور وہ کسی قیمت پر وقوعِ قیامت کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔اسی پر اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ ان کا انکار نہایت تعجب انگیز اور افسوسناک ہے، جب اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کائنات کو بغیر مادے بغیر نمونے اور کسی آلے کے محض اپنے حکم اور امر سے پیدا فرمایا تو انسان جیسی چھوٹی سی چیز کو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے کونسی مشکل بات ہے؟ وہ تو انسان کو پہلے بھی پیدا کرچکا ہے، تو اب دوبارہ اسے پیدا کرنا کونسا مشکل ہے؟ بلکہ دوبارہ پیدا کرنا اور بھی آسان ہے، لہٰذا انہیں تعجب کرنے کا کوئی حق نہیں۔

کفار کی دوسری تعجب انگیز بات یہ تھی کہ وہ کہا کرتے تھے: ﴿اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ﴾[ص:۵] (یعنی کیا تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف ایک معبود کو مانا جائے؟ اور صرف اس ایک کی عبادت کی جائے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہوگی) ہمارے آباء واجداد نے ہر کام کے لئے علیحدہ علیحدہ معبود مقرر کئے تھے جو اپنے دائرہ اختیار میں مشکل کشائی اور حاجت روائی انجام دیتے تھے، تو بھلا اتنے سارے بڑے کام صرف ایک معبود کیسے

انجام دے سکتا ہے؟ یہ تو ناممکن بات ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے یہ تمام مفروضے اور گمراہانہ مزعومات کو تار تار کر کے باطل فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ﴾ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، اس کی وحدانیت اور قدرتوں کے منکر ہو گئے، اس کی ہمہ گیر صفات اور خاص کر تخلیق کا انکار کر بیٹھے کہ ہمیں وہ دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا﴾ [النحل:۳۸] (یعنی ہمارا وعدہ بالکل برحق ہے، اور ہم ضرور ایسا کریں گے) تمہارے نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، اور تم جیسوں کو زندہ کر کے نشان عبرت بنائیں گے۔ وہ یہ ہے:

﴿وَأُولَٰئِكَ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ﴾ قیامت کے دن ان کی لمبی گردنوں میں طوق ڈالیں گے اور انہیں کھینچ کر جہنم کے حوالے کریں گے، جس کفر و شرک کو انہوں نے سینے سے لگایا تھا یہی ان کی گردنوں کا طوق ہوگا۔ سورۂ یٰس میں فرمایا: ﴿إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُم مُّقْمَحُونَ﴾ [یٰس:۸] (ان کے گلے میں طوق ہوں گے جن کی وجہ سے ان کی گردنیں اوپر کو اٹھی ہوں گی، اور ان کے ہاتھ پاؤں میں اور کھینچنے کے لئے لمبی لمبی زنجیریں ہوں گی)۔ سورۃ الحاقہ میں فرمایا: ﴿ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا﴾ [الحاقۃ:۳۲] (ستر ستر گز کی زنجیریں ڈال کر ان کو ڈانٹ کے ساتھ جہنم میں پھینک دیں گے)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ کفار کے مقعد میں زنجیر ڈالیں گے اور ناک کے سوراخ سے نکالیں گے، اسی طرح بے زکوٰۃ بخیلوں کے لئے بھی طوق کا عذاب ہوگا، ﴿سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ﴾ [آل عمران:۱۸۰] (جس مال کے ساتھ بخل کرتے تھے اس کو ان کے گلے کا طوق بنایا جائے گا) بخل کی وجہ سے ان کے گلے میں ذلت کا طوق ڈالا جائے گا وہ سانپ بن کر خداوند تعالیٰ کے دشمن بخیل کو ڈسے گا۔

سرور عالم سخیوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سخی اللہ تعالیٰ کا دوست ہے، اور بخیل اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ عبادت گزار بخیل سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک فاسق سخی بہتر ہے، کیونکہ وہ فقراء و مساکین کی دلجوئی کر رہا ہے۔ [مشکوۃ] فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ یہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے، ان کی خلاصی کی کوئی صورت نہیں، ان کی سزا دائمی و ابدی ہے۔

﴿وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ﴾ یہ مشرکین وکفار کی دوسری بدبختی اورخرابی کا ذکر ہے، یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برائی اور تباہی کو بھلائی سے پہلے چاہتے ہیں، بھلائی تو ایمان قبول کرنے اور نیکی اختیار کرنے سے آتی ہے، مگر انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا، وہ اپنے کفر وشرک پر جمے ہوئے ہیں جس کا نتیجہ عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں، بلکہ اپنی زبان سے بھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، کبھی وہ خداوند تعالیٰ سے براہ راست بھی عذاب کا مطالبہ کر چکے ہیں، انہوں نے کہا کہ: ﴿اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَالْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾[الأنفال: ۳۲] (اے اللہ تعالیٰ! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دین برحق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسادے، یا کوئی اور دردناک عذاب نازل کردے)۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿اَوْ تُسْقِطَ السَّمَاۗءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا﴾[الإسراء: ۹۲] (یا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی گرادے، جیسا تم گمان کررہے ہو) ہم تو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ لوگ بڑے ناداں اور بے وقوف ہیں جو اپنے منہ سے عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ ہمارا عذاب جب آئے گا تو گزشتہ امتوں کی طرح انہیں بلا تأمل تباہ کرکے رکھ دے گا۔

﴿وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ﴾ اوراس سے پہلے اس قسم کی سزاؤں کی مثالیں گزر چکی ہیں جنہیں دیکھ کر یا سن کر چاہیے کہ یہ لوگ عبرت حاصل کریں اور توبہ کرلیں، مگر یہ بدقسمت کسی طرح تیار نہیں اور الٹا سزاؤں کا مطالبہ بھی کررہے ہیں جو کہ ان کی نادانی ہے۔

﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰي ظُلْمِهِمْ ۚ وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ بیشک تیرا پروردگار البتہ بخشش کرنے والا ہے، باوجود ان کے ظلم وبے انصافی کے اس کی بخشش کی پہلی صورت یہ ہے کہ وہ مجرموں کو ڈھیل دیتا ہے، جلدی سزا نہیں دیتا تاکہ وہ توبہ کرلیں، یا بصورت دیگر خوب عذاب کا مستحق بنیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عذاب دینے سے کوئی مانع موجود ہو، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ﴾[الأنفال: ۳۳] یعنی آپ کا وجود مسعود جب ان میں موجود ہوگا تو اللہ تعالیٰ آپ کی وجہ سے عذاب کو روک دے گا یا مؤخر فرمائے گا۔ یہ بھی ایک قسم کی بخشش ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا سخت ہے، نہ وہ کسی کو معاف کرے گا اور نہ آنے کے بعد اسے کوئی ٹال دے گا، جیسے سورۂ حجر میں فرمایا: ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّىْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَالْعَذَابُ الْاَلِيْمُ﴾[الحجر:

۴۹] (میرے بندوں کو خبردار کرو کہ میں بخشش کرنے والا بڑا مہربان ہوں، اور میرا عذاب بھی بڑا دردناک ہے)۔

یہ دونوں صفات جو ایک ساتھ ذکر ہوئیں ان کی روشنی میں لوگوں کو چاہیے کہ اپنے اعتقاد اور اعمال کو درست رکھیں تا کہ انہیں مغفرت و بخشش کا انعام حاصل ہو جائے، اور کفر و معاصی و دیگر برائیوں سے اجتناب کریں تا کہ تباہ کن عذاب سے ہمیشہ کے لئے بچ جائیں، اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر عذاب ہی عذاب ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ پہلے جملے میں مغفرت کی بشارت اور وعدہ ہے، دوسرے جملے میں عذاب الیم کی وعید ہے، تو حق یہ ہے کہ نیکیوں کے ذریعہ مغفرت و بخشش کا طلبگار رہنا چاہیے، اور گناہوں کے ارتکاب سے بچ کر اور خوف رکھتے ہوئے عذاب الیم سے بچنے کا اہتمام کیا جائے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَ الرَّجَاءِ"۔ یعنی انسان کا ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے، یعنی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف بھی ہو اور اس کی بخشش کی امید بھی ہو۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ اس آیت کے اترنے پر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ کا معاف فرمانا اور درگزر فرمانا نہ ہوتا تو کسی کی زندگی کا لطف باقی نہ رہتا، اور اگر اس کا ڈرانا اور سزا دینا نہ ہوتا تو ہر شخص بے پرواہی سے ظلم و زیادتی میں مشغول ہو جاتا۔ ابن عساکر میں ہے کہ حسن بن عثمان ابوحسان رمادی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا (زہے سعادت!) دیکھا کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ جل شانہ کے سامنے کھڑے اپنے ایک امتی کی شفاعت کر رہے ہیں جس پر فرمانِ باری تعالیٰ جاری ہوا کہ کیا تجھے اتنا کافی نہیں کہ میں نے سورۂ رعد میں تجھ پر آیت: ﴿وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ﴾ نازل فرمائی ہے؟ ابوحسان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی، یعنی خواب ختم ہوا اور میں بیدار رہا۔ [تفسیر ابن کثیر]

﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ مشرکین مکہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتاری جاتی اس پیغمبر پر کوئی نشانی اس کے ربّ کی طرف سے؟ اس نشانی سے وہ نشانی مراد ہے جو کافر خود اپنے منہ سے طلب کرتے تھے، یعنی فرمائشی معجزہ، ورنہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بے شمار نشانیاں ظاہر فرمائی ہیں مگر چونکہ ان کا مقصد ایمان لانا نہیں تھا، محض ضد و عناد کی بنیاد پر یہ سب کچھ کہتے رہتے تھے، انہوں نے شق القمر کا معجزہ خود طلب کیا مگر جب یہ معجزہ ظاہر ہو گیا تو کہنے لگے: ﴿سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ﴾ [القمر: ۲] (یہ تو چلتا ہوا جادو ہے)۔

دراصل یہ سرکش لوگ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو اس کی حقانیت کے دلائل سے سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے، وہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک سے سبق لینے کے لئے بھی تیار نہ تھے، اُن زبردست اخلاقی، اسلامی انقلاب سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے کے لئے تیار نہ تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتزکیہ کے اثر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں رونما ہو رہا تھا، وہ ان معقول دلائل پر بھی غور کرنے کے لئے تیار نہ تھے جو ان کے مشرکانہ مذہب اور ان کے اوہام جاہلیت کی غلطیاں واضح کرنے کے لئے قرآن کریم میں پیش کئے جا رہے تھے، ان سب چیزوں کو چھوڑ کر وہ چاہتے تھے کہ انہیں کوئی کرشمہ دکھایا جائے جس کے معیار پر وہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جانچ سکیں۔

بلکہ بنیادی بات یہ ہے کہ وہ فی الواقع سوائے وقت ضائع کرنے کے اور کچھ نہیں چاہتے تھے، اور اپنی سرکشی وجہالت کو حرف آخر سمجھتے تھے، اور خداوند تعالیٰ سے غیر مہذب مطالبوں پر التجاء کر کے کہتے رہتے: ﴿رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ [ص:۱۶] (خدایا! ہمارا حساب تو ابھی کر دے قیامت پر نہ اٹھا رکھ) یہاں وہ قیامت کا نام صرف استہزاء لیتے رہتے تھے۔ ﴿خَتَمَ اللهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [البقرۃ:۷] (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے) والا معاملہ تھا، بس۔

﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ یہ ان کے مطالبے کا مختصر جواب ہے جو براہ راست انہیں دینے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! آپ اس فکر میں نہ پڑیں کہ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے آخر کونسا کرشمہ دکھایا جائے، تمہارا کام ہر ایک کافر کو مطمئن کر دینا نہیں ہے، تمہارا کام تو صرف یہ ہے کہ خواب غفلت میں سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کر دو، اور ان کو غلط عقائد واعمال کے برے انجام سے خبردار کر دو، یہ خدمت ہم نے ہر زمانے میں ہر قوم میں ایک نہ ایک ہادی مقرر کر کے لی ہے، اب تم سے بھی یہی خدمت لے رہے ہیں، اس کے بعد جس کا جی چاہے آنکھیں کھولے اور جس کا جی چاہے غفلت میں پڑا رہے۔

یہ مختصر جواب دے کر اللہ تعالیٰ ان کے مطالبے کی طرف سے رخ پھیر لیتا ہے، اور ان کو تنبیہ کرتا ہے کہ تم کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہو جہاں کسی چوپٹ راجہ کا راج ہو، تمہارا واسطہ ایک ایسے واحد لاشریک خالق ومالک رب سے ہے جو تم میں سے ایک ایک شخص کو اس وقت سے جانتا ہے جبکہ تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بن رہے تھے، اور زندگی بھر تمہاری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھتا ہے، اس کے ہاں تمہاری قسمتوں کا فیصلہ خالصتاً عدل کے ساتھ تمہارے اوصاف اور اعمال کے لحاظ سے ہوتا ہے، اور زمین وآسمان میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس مالک حقیقی کے فیصلوں

پراثرانداز ہوسکے، لہٰذا آپ ان لوگوں کی باتوں سے دلگیر نہ ہوں، ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف: ۳۵] (آپ الوالعزم انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح صبر کیجئے) اور ان کے لئے عذاب آنے کی جلدی نہ کریں۔ ان دنیا والے لوگوں نے کبھی کسی نبی کی دعوت پر لبیک نہیں کہا، اور نہ ان کی دعوت کا استقبال کیا، کچھ لوگ تو مسلمان ہوئے اور اکثریت نے تکذیب کی۔

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ سنت اللہ یہی رہی ہے کہ تمام قوموں کی ہدایت کے لئے ہادی برحق ہر زمانے میں آتے رہے ہیں، چنانچہ ابھی ہمارے اس دور میں بلکہ زمانہ بعثت سے آج تک مسلسل اس امت کی رہنمائی کے لئے ہر زمانہ اور ہر علاقہ میں مبلغین، ناصحین، ائمہ دین، علماء اسلام کی اتنی کثرت رہی ہے جس کی مثال نہیں۔ یہ سب ختم نبوت کی برکت اور فیض کا منہ بولتا ثبوت ہے، اور صرف اس خیر امت کا طغرۂ امتیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا ناصر ومددگار ہو۔ آمین

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ
بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ
وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ
يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا
بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝

ترجمہ: اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کسی عورت کو حمل ہوتا ہے، اور جو کچھ رحم میں کمی اور بیشی ہوتی ہے، اور ہر چیز اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک خاص مقدار کے ساتھ ہے ۝ وہ پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کا جاننے والا ہے، بڑا ہے، برتر ہے ۝ تم میں سے جو کوئی شخص کوئی بات آہستہ سے کہے، اور جو شخص پکار کر کہے، اور جو شخص رات میں چھپا ہوا ہو، اور جو شخص دن میں چلتا پھرتا ہو یہ سب برابر ہیں ۝ ہر ایک کے لئے آگے پیچھے سے آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ فرمائے تو اسے کوئی واپس کرنے والا نہیں، اور ان لوگوں کے لئے اس

کے سوا کوئی مددگار نہیں ⑪

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ عزّوجل نے اپنی صفات جلیلہ میں سے عظیم الشان صفت "علم محیط" کو بیان فرمایا ہے۔ مطلب ان آیات کا یہ ہے کہ تمام کائنات اور اس میں ظاہر و پوشیدہ چیزوں (علیٰ ہٰذا القیاس) ہر قسم کے انسانی، حیوانی اور دیگر تمام مخلوقات اور ان کے ذرات پر اللہ تعالیٰ شانہ کا علم حاوی اور محیط ہے، اس کے دائرۂ علم محیط سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى﴾ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو کچھ اٹھاتی ہے ہر مادہ، مادہ سے مراد عورت بھی ہوسکتی ہے، اور ہر جانور کی مادہ بھی جس کے رحم میں بچہ ہو۔ عورت کے رحم کے بچے کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نافرمان اور کافر انسان کو تنبیہ کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب تجھے بچپن سے جب تم اپنی ماں کے پیٹ میں بن رہے تھے جانتا ہے تو اب کیوں تم اپنے خالق کو بڑے ہونے کے بعد نہیں پہچانتے ہو؟ ویسے تو عورت کا پیٹ تو کیا، ساتوں زمینوں، ساتوں سمندروں کی تہہ میں رینگنے والی چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کو دیکھتا بھی ہے، اور ان کے پاؤں کی آواز سنتا بھی ہے۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ﴾ [لقمان: ۳۴] (وہ جانتا ہے جو ماں کے پیٹ میں ہے) کہ وہ کیا ہے، اور اس کا انجام کیا ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کی تمام تفصیلات نہ تو اس کے والدین کو معلوم ہوتی ہیں، نہ کسی دوسرے شخص کو، بلکہ محض یہ نہیں بلکہ ازل سے ابد تک پوری دنیاوی زندگی اور زندگی کے ادوار، پھر موت اور برزخ، آگے یومِ حساب کے بعد جنت و دوزخ تک کے حالات واقعات، یہ سب ابھی سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

موجودہ سائنس کی ترقی کی وجہ سے ڈاکٹر آلات کے ذریعے اتنا ضرور بتا سکتے ہیں کہ بچہ لڑکا ہے یا لڑکی ہے، آگے انہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب پیدا ہوگا، مردہ یا زندہ، کتنی عمر پائے گا، کیا رزق پائے گا، نیک ہوگا یا برا، جنتی ہے یا دوزخی، شادی کرے گا یا نہیں، تندرست رہے گا یا بیمار، کہاں اور کب مرے گا، موت کے اسباب کیا ہوں گے، وغیرہ۔ یہ سارے امور اللہ تعالیٰ کے علم کی معلومات ہیں جن سے سارے انسان نابلد اور بے علم ہیں۔

﴿وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ﴾ رحم مادر کی کمی بیشی، سکڑنے اور پھیلنے کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ بسا اوقات پیٹ

میں ایک قسم کا پانی جمع ہوتا ہے، کبھی ایک قسم کی ہوا اور باد ہوتی ہے، کبھی کوئی گولہ ہوتا ہے، کبھی دوران حمل حیض کا خون جاری ہوتا ہے جس سے بچہ یا تو ضائع ہوتا ہے یا نہایت کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا اور پیدا کرتا ہے۔

﴿وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر چیز کی ایک خاص مقدار مقرر ہے۔ اس عام معنی میں یہ بھی داخل ہے کہ بچہ کتنے دن شکم مادر میں رہے گا، بعض بچوں کی پیدائش سات مہینے گزرنے پر، بعضوں کی آٹھ، اکثر کی نو ماہ پر، جبکہ کچھ کی دس، گیارہ، بارہ مہینوں پر، اسی طرح اس عموم میں پوری زندگی کے حالات ولمحات سب داخل ہیں۔

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ﴾ اللہ تعالیٰ تمام پوشیدہ اور تمام ظاہر چیزوں کو جانتا ہے، یہاں تک کہ دلوں کے بھید اور ارادے، خواہ زمانہ حال کے ساتھ متعلق ہوں یا مستقبل کے ساتھ، وہ سب جانتا بھی ہے، اور دیکھتا بھی ہے۔ شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

بر و علم یک ذرہ پوشیدہ نیست ☆ کہ پیدا و پنہان بہ نزدش یکیست

آج سے چند سال پہلے بنگلہ دیش میں ایک خاتون کے پیٹ سے بارہ بچے پیدا ہوئے، اور مملکت مصر میں ایک عورت کے پیٹ سے بارہ بچے پیدا ہوئے، اور اسی طرح مملکت مصر میں ہی ایک عورت کے پیٹ سے سات بچے پیدا ہوئے، اور کسی دوسرے ملک میں پانچ بچوں کی پیدائش ایک ساتھ ہوئی تھی۔ ﴿فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۴] (برکت والا ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے)۔

﴿الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ﴾ وہ بہت بڑی بے انتہا عظیم ہستی ہے، نہ کوئی اس کی عظمت و کبریائی کا اندازہ لگا سکتا ہے اور نہ کوئی اس کی قدرت وعلم محیط کا احاطہ کر سکتا ہے۔ یہ متناہی انسان اپنی متناہی عقل وسوچ کے ساتھ اس ذات پاک کی لامتناہی صفات وافعال کا احاطہ ہرگز نہیں کر سکتا۔

﴿سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ﴾ جو کوئی تم میں سے پوشیدہ بات کرتا ہے ظاہراً یا تنہائی میں یا کسی مجمع میں یا زبان سے یا دل میں اللہ تعالیٰ کے لئے سب برابر ہے، وہ ﴿عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ [الملک: ۱۳] (سینے کی باتوں کو جانتا ہے)، ہے، اسے ہر ہر ذرہ کا علم حاصل ہے۔ رات کے وقت، تاریکی میں، پھر تنہائی میں جو چھپ کر بولتے ہیں یا چھپ کر کام کرتے ہیں یا ﴿سَارِبٌ

بِالنَّهَارِ﴾ دن کی روشنی میں چلنے پھرنے، اٹھنے، بیٹھنے، تنہائی یا مجمع میں جو کچھ کرتے ہیں، اس کے لئے سب برابر ہے، وہ انہیں جانتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ہے، وہ سات سمندروں کی تہہ میں ہر ذرہ سے باخبر ہے، درختوں اور جڑی بوٹیوں کے پتے بارش کے قطرات پہاڑوں کے وزن اور کائنات کے کُل ذرے، ریت کے ذرے ان کی مقدار اور حساب سب اسے معلوم ہیں۔ ''اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَایَنْبَغِیْ لِعَظْمَتِکَ وَلِجَلَالِ وَجْھِکَ وَعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ''۔

فرشتے بندوں کی حفاظت کرتے ہیں:

﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ ہر شخص کے لئے اللہ تعالیٰ کے حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو آگے پیچھے (اور دائیں بائیں بھی) آنے والے گھومنے والے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہر شخص کی حفاظت کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ﴾ [الطارق: ۴] (کوئی جان ایسی نہیں جس کی کوئی نگرانی کرنے والا موجود نہ ہو)۔ اسی طرح: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً﴾ [الأنعام: ۶۱] (وہی اپنے بندوں پر مکمل اقتدار رکھتا ہے، اور تمہارے لیے نگہبان بھیجتا ہے)۔ پھر فرمایا: ﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝﴾ [الانفطار] (حالانکہ تم پر کچھ نگراں مقرر ہیں۔ وہ معزز لکھنے والے)۔

سورۂ ق میں فرمایا: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ [ق: ۱۸] (کوئی لفظ انسان کی زبان سے نکلا نہیں پاتا مگر اس پر ایک نگراں مقرر ہوتا ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی حفاظت کے لئے فرشتے مقرر فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک ضعیف روایت ابویعلیٰ نے روایت کی ہے کہ ہر انسان کی حفاظت پر تین سو فرشتے مقرر ہیں۔ تفسیر عزیزی نے سورۂ انفطار میں ایک سو ساٹھ کی روایت نقل کی ہے۔ اکثر مفسرین نے دس (۱۰) اور اٹھارہ کی دونوں روایات نقل کی ہیں۔

بہر حال! فرشتوں کی تعداد کچھ بھی ہو یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے اور قرآن وحدیث میں بکثرت اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ کمامرّ

یہ حفاظت کرنے والے فرشتے باری باری سے آتے رہتے ہیں، آگے، پیچھے، دائیں جانب اور بائیں طرف محض بدنی اور مالی حفاظت نہیں کرتے بلکہ اعمال کی حفاظت کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ البتہ جب قضاء وقدر کے

مطابق کوئی تکلیف پہنچنے کا موقع آجاتا ہے تو ایسے وقت میں فرشتے علیحدہ ہو جاتے ہیں، پس وہ تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اگر یہ محافظ فرشتے نہ ہوتے تو انسانوں کی زندگی ناکارہ اور تلخ ہو جاتی، اور شیاطین اور جنات انہیں بوٹی بوٹی کر کے ان کے ٹکڑے کرتے اور ہلاک کرتے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ بلا شبہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے۔ یہ قانون افراد کے متعلق نہیں، یہ اقوام کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی امن اور عافیت و سلامتی والی حالت کو مصائب و آفات سے نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود ہی تبدیلی نہ لے آئیں، بداعمالی اختیار کر کے وہ عذاب اور مصیبت کے مستحق نہ ہو جائیں، جب لوگ اپنے اچھے حالات کو سرکشی اور نافرمانی سے بدل دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی عافیت کو مصائب اور آفات و بلیات سے بدل دیتا ہے، اور ایسے موقع پر فرشتوں کا جو پہرہ ہے وہ بھی اٹھالیا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا قہر اور عذاب آجاتا ہے۔

اس آیت کریمہ کا وہی مضمون ہے جو کہ سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْیَةً کَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً یَّاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ﴾ [النحل: ۱۱۲] (اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے جو بڑی پر امن اور مطمئن تھی اس کا رزق اس کو ہر جگہ سے بڑی فراوانی کے ساتھ پہنچ رہا تھا، پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری شروع کر دی، تو اللہ نے اس کے کرتوت کی وجہ سے ان کو یہ مزہ چکھایا کہ بھوک اور خوف ان کا پہننا اور اوڑھنا بن گیا)۔ پھر فرمایا:

﴿وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ﴾ اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف یا عذاب دینا چاہے تو اسے کوئی واپس کرنے والا نہیں، اور ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست حمایتی اور مددگار نہیں ہوتا، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی قوم پر کسی عذاب کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو اسے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا، اور نہ کوئی کسی کی حمایت کر سکے گا۔

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾
وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ۚ وَیُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ
فَیُصِیْبُ بِهَا مَنْ یَّشَآءُ وَهُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِیْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے جس سے تمہیں ڈر لگتا ہے، اور امید بندھتی ہے، اور وہ بھاری بادلوں کو پیدا فرماتا ہے ⑫ اور رعد اس کی تسبیح کے ساتھ اس کی تعریف بیان کرتا ہے، اور فرشتے بھی اس کے خوف سے اور وہ بجلیاں بھیجتا ہے، پھر جسے چاہے پہنچا دیتا ہے، اور حال یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، اور وہ سخت قوت والا ہے ⑬

معارف ومنازل

رعد کیا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے کہ ایک یہودی عالم نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اے ابو القاسم! ہمیں یہ بتایئے کہ "رعد" کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ رعد ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مامور ہے، اس کے پاس پھاڑنے والی چیزیں ہیں جو آگ کی بنی ہوئی ہیں، وہ ان کے ذریعہ بادلوں کو ہانکتا ہے، اللہ تعالیٰ جہاں چاہتا ہے وہاں لے جاتا ہے۔ پھر اس نے عرض کیا کہ یہ آواز کیا ہے جو سننے میں آتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بادلوں کو جھڑکنے کی آواز ہے، رعد انہیں جھڑکتا ہے یہاں کے بادلوں کو وہاں لے جاتا ہے جہاں لے جانے کا حکم ہوتا ہے۔ [رواه الترمذي وقال حديث حسن صحيح غريب]

فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو تم کو برق یعنی تیز رفتار، تیز روشنی والی بجلی دکھلاتا ہے۔

﴿خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ خوف اور امید کے لئے، یعنی اس میں قدرت نے دو متضاد صفات پیدا کر کے تمہارے لئے عبرت کا سامان مہیا کیا، کچھ لوگ اس کے نقصانات اور خطرناک آواز سے ڈرتے ہیں، اور کچھ لوگ اسے بارانِ رحمت کا پیش خیمہ سمجھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ بارش ہوگی۔ فصلیں، میوے، پھل، پھول اگیں گے، آبادی ہوگی، قحط سالی کا خاتمہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اس بجلی کی چمک میں دو متضاد صفات ہیں، قرآن حکیم کی بھی یہی مثال ہے، فرمایا: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الإسراء: ۸۲] (اور ہم قرآن میں سے وہ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور ظالموں کے لیے نقصان ہی بڑھاتا ہے)۔ فرمایا:

﴿وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾ اور پیدا کرتا ہے اور اٹھاتا ہے بادل جو بڑے بوجھل ہوتے ہیں،

کروڑوں ٹنوں پانی سے لدے ہوئے، بھرے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ زمین پر آب پاشی کرتے ہوئے صحراؤں، جنگلوں، میدانوں کو سیراب کرتے ہیں، جس سے ساری خلقت تمام انسانوں اور حیوانات رزق وروزی حاصل کرتے ہیں، ساری خلقت اور غیر آباد زمین کے قطعے گلزار ارم کی طرح چمکتے دمکتے سیراب اور زندہ ہوجاتے ہیں۔

یہی چیز بعینہٖ آسمانی وحی کی مثال ہے کہ اس سے کفر وشرک اور معاصی کا خاتمہ ہوجاتا ہے، اور مردہ قلوب معرفت الٰہی کے انوار سے زندہ ہوجاتے ہیں، اور توحید کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ تو فرمایا:

﴿وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ﴾ اور فرشتہ جس کا نام رعد ہے اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان کرتا ہے، اور اس کی عظمت وکبریائی کا نعرہ بلند کرتا ہے، اور دوسرے فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے خوف سے بول اٹھتے ہیں اور تسبیح وتحمید کا ترانہ بلند کرتے ہیں۔ یہ مثال ہے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے فرمانبرداروں اور اتباع کرنے والوں کی اور قیامت تک آنے والے علماء راسخین اور ائمہ ہدایت ومبلغین کی۔ کثر اللہ سعیھم۔ آمین

﴿وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ﴾ اور اللہ تعالیٰ بجلیاں بھیجتا ہے، یعنی کڑک جب کسی کو نقصان پہنچانا مطلوب ہوتا ہے تو اس پر بجلی بھیجی جاتی ہے، چنانچہ بجلی اسے جلا کر بھسم کردیتی ہے۔ یہ مثال ہے منکرین توحید اور منکرین رسالت و منکرین قرآن کی جنہیں اللہ تعالیٰ نے صواعق محرقہ بجلیوں سے ختم کیا۔ قبیلہ غطفان کا ایک سردار عامر بن طفیل اپنے چچازاد بھائی اربد بن ربیعہ کے ساتھ اس نیت سے مدینہ طیبہ آیا کہ ہم کسی بہانے سے باتوں باتوں میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کرکے انہیں شہید کردیں، جب وہ مدینہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔ کہنے لگا: یا رسول اللہ! تھوڑی دیر کے لئے آپ ہمارے ساتھ میدان میں نکلیں، ہم نے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ عامر لعین نے اربد خبیث کو سمجھایا تھا کہ میں اسے باتوں میں مصروف رکھوں گا تم پیچھے سے حملہ کرکے ان کو تلوار سے شہید کرلو۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عامر نے باتوں میں مشغول رکھا تو اربد بن ربیعہ نے پیچھے سے تلوار لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کرلیا تو فوراً آسمان سے ایک شعلہ دار بجلی نے آکر اس کے سر کو گردن سے الگ کردیا، اور اسے جلا کر ختم وبھسم کرکے رکھ دیا۔ عامر بھاگ کھڑا ہوا اور چل دیا، راستے میں وہ بھی ہلاک ہوگیا۔ [مظھري، ابن کثیر]

اسی طرح ایک یہودی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں آکر کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ تانبے کا ہے یا موتی کا یا

یاقوت کا؟ ابھی اس کا سوال پورا نہ ہوا تھا کہ اس پر آسمان سے بجلی گری اور وہ تباہ ہوگیا۔اور یہ آیت نازل ہوئی۔ [ابن کثیر]

امام نسائی اور بزار رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی کو دور جاہلیت کے کسی بڑے آدمی کے پاس دعوت ایمان دینے کے لئے بھیجا، اس مشرک نے کہا: جس رب کی طرف تو مجھے بلا رہا ہے وہ کس چیز کا ہے؟ لوہے کا ہے، تانبے کا ہے، چاندی کا ہے، سونے کا ہے؟ صحابی رضی اللہ عنہ نے واپس آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جواب سنا دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسری بار اور تیسری بار اس کو بھیجا، اور وہ مشرک اسی طرح جواب دیتا رہا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس پر آسمانی بجلی گرادی جس سے وہ جل کر راکھ ہوگیا، اور یہ آیت نازل ہوئی۔ [ابن کثیر، مظهري، وغيره]

بہرحال! اس طرح کے واقعات کتب تفسیر میں بکثرت مذکور ہیں۔

﴿وَهُمۡ يُجَادِلُونَ فِي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ شَدِيۡدُ الۡمِحَالِ﴾ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں، طرح طرح کی غلط باتیں کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ ابھی بیان ہوا، حالانکہ وہ ذات پاک قوت اور گرفت والا ہے، وہ اگر چاہے تو ایسے بدکار مجرموں کو لمحوں میں نیست و نابود کردے، مگر حکمت کے تحت انہیں ڈھیل دیتا ہے تاکہ گرفت کا بہانہ مضبوط ہو۔

لَهٗ دَعۡوَةُ الۡحَقِّ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ لَا يَسۡتَجِيۡبُوۡنَ لَهُمۡ بِشَىۡءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيۡهِ اِلَى الۡمَآءِ لِيَبۡلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الۡكٰفِرِيۡنَ اِلَّا فِىۡ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾ وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّظِلٰلُهُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ۩ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے، اور جو لوگ اس کے علاوہ دوسروں کو پکارتے ہیں، وہ ذرا بھی ان کی درخواست کو منظور نہیں کرتے، مگر جیسے کوئی شخص پانی کی طرف اپنی ہتھیلیاں پھیلائے ہوئے ہوتا کہ پانی اس تک پہنچ جائے، حالانکہ وہ اس تک پہنچنے والا نہیں، اور کافروں کی پکار بس ضائع ہے ﴿۱۴﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں، اور جو زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے اور ان کے سائے بھی صبح اور شام کے اوقات

میں ⑮

معارف ومنازل

جس طرح غیر اللہ کی عبادت حرام اور شرک ہے، اسی طرح مافوق الاسباب چیزوں میں غیر اللہ کا پکارنا اور ان سے مدد مانگنا بھی حرام اور شرک ہے۔ پس خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور اس کو حاجات ومشکلات میں پکارنا صحیح اور برحق ہے، اور ایسا کرنا خالص توحید ہے، جبکہ غیر اللہ کی عبادت اور پکار دونوں حرام اور باطل ہیں، اور ایسا کرنا صریح شرک اور کفر ہے۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دیگر مخلوقات کو پکارتے اور ان کی عبادت کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہتھیلیاں پھیلائے ہوئے ہو اور پانی کو بلا رہا ہو کہ وہ اس کے ہاتھ اور منہ تک پہنچ جائے، حالانکہ پانی اس کے منہ تک پہنچنے والا نہیں ہے، کیونکہ پانی بے جان اور بے سمجھ وغافل ہے، وہ پکارنے والے کی آواز سننے اور اسے دیکھنے اور اس کی مقصد برآری سے سراسر عاجز ہے۔ اسی طرح ان کے معبود بھی پانی کی طرح بے جان، بے حس، اور بے خبر ہیں جن میں کسی قسم کا شعور نہیں ہے، وہ نہ سنتے ہیں، نہ استطاعت رکھتے ہیں، نہ کسی نفع ونقصان پر قدرت رکھتے ہیں، پس ان کا پکارنا باطل و بے مقصد اور ضائع ہے اور گمراہی ونادانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

سورۂ اعراف میں فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ﴾ [الأعراف: ۱۹۲] (اور اللہ تعالیٰ کے سوا تم جن معبودوں کو پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کرسکتے اور نہ وہ اپنی مدد کرسکتے ہیں)۔

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اور جو آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرتے ہیں، ان سجدہ کرنے والوں میں خوشی سے سجدہ کرنے والے بھی ہیں اور مجبوری سے بھی، اور ان کے سائے بھی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں، اور یہ سجدے صبح وشام کے اوقات میں یعنی ہمیشہ ہر وقت ہوتے ہیں۔

﴿يَسْجُدُ﴾ کے معنی بعض حضرات نے معروف سجدہ لیا ہے، پس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین میں جو فرشتے ہیں اور مومنین ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرتے ہیں، فرشتے، مؤمنین، انسان اور مؤمن، جنات یہ سب خوشی سے سجدہ کرتے ہیں، اور جو لوگ منکرین ہیں اور منافقین ہیں وہ جہاد وتلوار کے خوف سے یا ماحول

کے دباؤ سے سجدہ کرتے ہیں، اس کو مجبوری کے سجدہ سے تعبیر فرمایا۔

اور بعض حضرات نے ﴿یَسۡجُدُ﴾ سے انقیاد اور تابعداری مراد لی ہے، ان حضرات کے نزدیک آیت کے معنی یہ ہیں کہ آسمانوں اور زمین میں جو مخلوق ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے لئے سرخم کئے ہوئے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادے کے مطابق چلتے ہیں، ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اور ان میں ایسے بھی ہیں جو مجبور ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور تکوینی طور پر تو سبھی اس کی قضاء اور قدر کے تابع ہیں، اور ان چیزوں کے جو سائے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں، صبح وشام جو بھی سایہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ کے موافق ہی چلتا ہے اور گھٹتا بڑھتا ہے۔

اس کو سورۂ فرقان میں یوں فرمایا: ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوۡ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَیۡہِ دَلِیۡلًا ۔ ثُمَّ قَبَضۡنٰہُ اِلَیۡنَا قَبۡضًا یَّسِیۡرًا﴾[الفرقان:۴۶] (کیا تو نے نہیں دیکھا تیرے ربّ نے سایہ کو کیونکر پھیلایا ہے؟ اور اگر وہ چاہتا تو اس کو ایک حالت پر ٹھہرایا ہوا رکھتا، پھر ہم نے آفتاب کو اس پر علامت مقرر کیا، پھر ہم نے اس کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا)۔

﴿وَظِلٰلُهُمۡ﴾ ان کے سائے بھی سجدہ کرتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ شانہ کے فرمانبردار ہیں جس طرح وہ چاہتا ہے انہیں گھٹاتا اور بڑھاتا ہے، صبح وشام ان کی زیادتی اور کمی کا مظاہرہ زیادہ ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے علیٰ سبیل عموم المجاز اس کا معنی لیا ہے کہ سجدہ کرنے والے جب سجدہ کرتے ہیں تو دھوپ یا روشنی میں ان کا سایہ بھی ان کے تابع ہو کر سجدہ کرتا ہے، یعنی سائے کی پشت دیکھنے میں آجاتی ہے۔

بعض حضرات نے یہ فرمایا کہ خوشی کا سجدہ ان لوگوں کا ہے جن پر سجدہ کرنا شاق نہیں گزرتا، یعنی شوق ورغبت سے سجدہ کرتے ہیں، اور زبردستی کا سجدہ ان لوگوں کا ہے جو سجدہ تو کرتے ہیں لیکن سجدہ کرنا ان کی طبیعتوں پر شاق گزرتا ہے، یعنی بے رغبتی کے ساتھ سجدہ کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ ان چودہ مقامات میں سے ایک ہے جن کو پڑھنے سے تالی اور سامع دونوں پر سجدہ لازم آتا ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سجدہ واجب ہے، جبکہ دیگر ائمہ حضرات سجدہ تلاوت کو سنت کا درجہ دیتے ہیں۔

قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ قُلِ اللّٰہُ ؕ قُلۡ اَفَاتَّخَذۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ

نَفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلۡ هَلۡ یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ۙ۬ اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ ۬ۚ اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوۡا كَخَلۡقِهٖ فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَیۡهِمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیۡءٍ وَّهُوَ الۡوَاحِدُ الۡقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: آپ سوال کیجئے کہ آسمانوں کا اور زمینوں کا ربّ کون ہے؟ آپ جواب دے دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہے، آپ سوال کیجئے: کیا تم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے مددگار تجویز کر رکھے ہیں؟ جو اپنی جانوں کے لئے نفع اور ضرر کے مالک نہیں ہیں؟ آپ سوال کیجئے: کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا اندھیریاں اور روشنی برابر ہو سکتی ہیں؟ کیا یہ بات ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے شریک تجویز کئے ہیں جنہوں نے کوئی چیز پیدا کی ہو؟ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے ان پر مخلوق میں اشتباہ پیدا ہو گیا ہو، آپ فرما دیجئے: اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا فرمانے والا ہے، اور وہ تنہا ہے غالب ہے ﴿۱۶﴾

معارف ومنازل

مشرکین ہزاروں کفر وشرک کے باوجود اللہ تعالیٰ کے منکر نہ تھے، وہ مصیبتوں اور کشتیوں کی سواری میں تمام غیر اللہ سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے تھے، اور جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ آسمانوں اور زمینوں کا خالق کون ہے؟ تو بلا تامل جواب دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے وجود اور خالقیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ ہاں! ان کا شرک یہ تھا کہ وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے اور تصرف وتدبیر امور میں غیر اللہ یعنی بتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک مانتے تھے، اور غیر اللہ کی عبادت کو قرب الٰہی کا ذریعہ مانتے تھے۔

البتہ کبھی بغض وعناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار بھی کرتے تھے، اسی سلسلے میں فرمایا:

﴿قُلۡ مَنۡ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ آپ مشرکین سے سوال کیجئے کہ بتاؤ آسمانوں اور زمینوں کا ربّ کون ہے؟ پھر آپ خود ہی جواب دیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے، وہ لوگ جہالت یا عناد کی وجہ سے جواب نہ دیں تو آپ انہیں بتا دیں اور سمجھا دیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ زجر وتوبیخ اور سرزنش کے طور پر ان سے سوال فرمائیں کہ یہ جو تم نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے اولیاء بنا رکھے ہیں، اور یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ یہ ہماری مدد اور نصرت کرنے والے ہیں یہ تو اپنی جانوں تک کے لئے کسی نفع اور ضرر کے مالک نہیں ہیں، نہ کوئی نفع اپنی طرف لا سکتے ہیں اور نہ اپنے سے کوئی ضرر رفع کر سکتے ہیں، جبکہ ان کا اپنی جان کے لئے یہ حال ہے جسے تم جانتے بھی ہو تو تمہیں کیا نفع دے سکتے ہیں۔

بینا اور نابینا اور نور اور اندھیرے برابر نہیں:

﴿قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ﴾ آپ ان عقل کے اندھوں سے سوال کیجئے: کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ نابینا سے مشرک مراد ہے جو اس ذات پاک کی عظیم قدرتوں سے اندھا اور بے خبر ہے، نہ اس کی وحدت کو مانتا ہے نہ اس کی عبادت کرتا ہے، اور بینا سے مسلمان مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کو دیکھ کر اس کی توحید کا اقرار کرتا ہے، اور خالص اس کی عبادت کرتا ہے، تو جس طرح بینا اور نابینا برابر نہیں ہو سکتے اسی طرح مؤمن اور کافر بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ عدم مساوات بدیہی امر ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿اَمۡ هَلۡ تَسۡتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوۡرُ﴾ کیا اندھیریاں اور روشنی برابر ہو سکتی ہیں؟ اندھیریوں سے کفر کی تمام اقسام وانواع مراد ہیں، اسی وجہ سے جمع کا صیغہ لایا گیا، اور نور سے ایمان وتوحید اور ایمان کی شاخیں یعنی حسنات اور اعمال صالحہ مراد ہیں، یعنی حق جو کہ اس میں تعدد نہیں۔ مطلب یہ کہ ظلمت ونور یعنی حق اور باطل برابر نہیں ہو سکتے، اسی طرح ایمان کا نتیجہ جنت ہے، اور کفر کا جہنم ہے، یہ دونوں بھی برابر نہیں ہو سکتے۔ سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿اَوَمَنۡ كَانَ مَيۡتًا فَاَحۡيَيۡنٰهُ وَجَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا يَّمۡشِيۡ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا﴾ [الأنعام: ۱۲۲] (جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا، اور اس کے لئے ایسا نور مقرر کر دیا جس کے ذریعہ وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، کیا یہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیریوں میں ہے اور ان سے نکلنے والا نہیں؟)۔

﴿اَمۡ جَعَلُوۡا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوۡا كَخَلۡقِهٖ فَتَشَابَهَ الۡخَلۡقُ عَلَيۡهِمۡ﴾ کیا یہ ایسی بات ہے کہ ان لوگوں نے جنہیں اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیا ہے انہوں نے کچھ مخلوق پیدا کی ہے، پھر انہیں مخلوق میں اشتباہ ہو گیا ہو؟ کہ یہ مخلوق تو اللہ تعالیٰ کی ہے اور یہ مخلوق شرکا کی ہے، اس اشتباہ اور التباس کی وجہ سے وہ غیر اللہ کی عبادت کرنے لگے۔

یہ سب استفہام انکاری کے طور پر ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے، سب کو صرف اسی نے وجود بخشا ہے، اس کو سب ہی مانتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا مستحق ہے، اگر کسی اور نے بھی کوئی مخلوق پیدا کی ہوتی تو اشتباہ ہونے کا موقع ہوتا کہ اس نے بھی بعض چیزوں کی تخلیق کی ہے، لہٰذا یہ بھی مستحق عبادت ہونا چاہیے (العیاذ باللہ)۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نے کچھ پیدا کیا ہی نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سوا انہوں نے جو معبود تجویز کئے ہیں وہ کسی چیز کی پیدائش پر قادر ہی نہیں، اگر سب مل کر ایک مکھی مچھر پیدا کرنا چاہیں تو پیدا نہیں

کر سکتے، مکھی پیدا کرنا تو کیا اگر مکھی ان پر بیٹھ جائے تو اسے ہٹا نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کئی درجہ مکھی سے بھی کمزور ہیں، مکھی کا شمار زندوں میں ہے اور یہ سارے بے جان ہیں۔

﴿قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ آپ فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا وہی سب کا معبود ہے، اور وہی خالقیت اور الوہیت اور ربوبیت میں منفرد و اکیلا ہے، اور حقیقی واحد اور حقیقی متصرف و غالب ہے، ساری مخلوق مغلوب اور مقہور ہے، پس مقہور و مغلوب اور وہ بھی مردہ اور بے جان خلاق وقہار جل شانہ کا شریک کیسے بن سکتا ہے؟ آگے ربّ العزت سبحانہ کے عظیم کمالات اور تخلیقی صفات کا بیان ہے۔

......❁......❁......❁......

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ
فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ
فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿١٧﴾
لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ؕ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٨﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر نالے اپنی مقدار کے موافق بہنے لگے، پھر بہتے ہوئے پانی نے اپنے اوپر جھاگ کو اٹھایا جو پانی پر بلند ہے، اور جن چیزوں کو آگ میں ڈال کر اوپر سے جلاتے ہیں تاکہ کوئی زیور دوسری نفع کی چیز حاصل کریں، اس میں بھی اس طرح کی جھاگ ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے، سو جو جھاگ ہے وہ تو بے فائدہ ہو کر چلا جاتا ہے، اور جو لوگوں کو نفع دیتا ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسی ہی مثالیں بیان فرماتا ہے﴿١٧﴾ جن لوگوں نے اپنے ربّ کی اطاعت کی ان کے لئے جنت ہے، اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی اگر ان کے لئے وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اس جیسا اور بھی ہو تو وہ اس سب کو اپنی جان کے بدلہ دے دیں گے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے برا حساب ہے، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ رہنے کی بری جگہ ہے﴿١٨﴾

معارف ومنازل

یہ دو آیتیں ہیں: پہلی آیت میں حق اور باطل کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ پہلی مثال تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش برساتا ہے، یہ بارش کا پانی وادیوں اور نالیوں میں چلا جاتا ہے جو تیز پانی چلتا ہے تو خس وخاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے، پانی پر بہت سا کوڑا کرکٹ اور جھاگ جمع ہو جاتا ہے جو پھولا ہوا نظر آتا ہے، اور پانی کے اوپر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتا ہے، پھر تو کوڑا کرکٹ یوں ہی بلا فائدہ رہ جاتا ہے، اور ادھر ادھر کہیں مختلف جگہوں میں رہ جاتا ہے، اور صاف پانی کوڑے کے نیچے سے بہہ کر کسی حوض یا بند میں جمع ہوتا ہے، یا زرعی زمین کو آباد کر کے کارآمد ہوتا ہے، مگر اوپر کا بے مقصد کوڑا کرکٹ ختم ہو کر تباہ ہو جاتا ہے۔

یہی مثال ہے باطل کی جو اگر غالب اور اوپر نظر آئے تو آئے مگر اس کی بقاء نہیں ہوتی، تو اصل چیز پانی ہے، (حق کی مثال) جو وہ باقی رہ گیا اور فائدہ مند رہا اور بے مقصد خس وخاشاک ضائع ہو گیا۔

دوسری مثال یہ بیان فرمائی کہ لوگ زیور وغیرہ بنانے کے لئے سونے اور چاندی وغیرہ کو تیز آگ پر کوٹائی میں رکھ کر پگھلاتے ہیں، تو فائدہ مند خالص مال سے کچرے اور جھاگ جو بے قیمت ہے اس کو علیحدہ کر کے پھینک دیتے ہیں۔ پہلی مثال میں پانی نافع ہے، اور خس وخاشاک بے کار چیز ہے۔ دوسری مثال میں سونا چاندی وغیرہ نافع ہیں، اور اوپر کا میل کچیل بے کار ہے۔

اسی طرح نافع مال ایمان کی مثال ہے جو کہ کارآمد وفائدہ مند ہے، اور کفر مثال ہے اس میل وکچیل ناکارہ خس وخاشاک کی جس کا انجام سوائے بے یقینی اور دوزخ کے کچھ نہیں۔ پھر یہ کفر دنیا میں اگرچہ پھلا پھولا اوپر ترقی یافتہ نظر آتا ہے مگر میدانِ محشر میں اتنا برا اور بے حیثیت وبے قیمت ہو گا جس کی سوائے جہنم کے کوئی پذیرائی نہیں ہو گی، اور نہ اس کا کوئی وزن ہو گا۔

دوسری آیت میں اہل ایمان جنہوں نے اصل نافع چیز یعنی پانی، سونا اور چاندی کو اختیار کیا کا بیان ہے، اس کے ساتھ اہل کفر جنہوں نے غیر نافع خس وخاشاک اور جھاگ کو اختیار کیا، ان کی ناکامی کا بیان ہے۔ فرمایا:

﴿اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دعوت حق ﴿لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ﴾ کو قبول کر کے ایمان لائے، اور شریعت حقہ جو کہ ہر حال میں نافع وسود مند ہے اس کو قبول کیا ان کے لئے بہت بڑا نفع مند ثواب ہے، یعنی جنت ہے، اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول نہ کیا اور ایمان نہ لائے دنیا کے خس وخاشاک پر جمے رہے، وہ

لوگ سخت مصیبت میں ہوں گے، اور سخت حساب کے بعد ابدی دوزخ میں ڈالے جائیں گے جو کہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ یہ لوگ جب عذاب وحساب میں گرفتار ہو جائیں گے تو اپنی جان کا بدلہ دینے کے لئے رضامند ہوں گے، وہاں کوئی مال ان کے پاس نہ ہوگا۔ لیکن اگر بالفرض پوری زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب ان کے پاس ہو اور اسی قدر اور بھی ہو تو ان سب کو دے کر جان چھڑانے پر راضی ہوں گے۔ یہ مضمون پارۂ چہارم کے شروع سے متصل پہلے گزر چکا، وہاں دیکھا جائے۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝١٩ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝٢٠ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝٢١ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝٢٢

ترجمہ: جو شخص یہ جانتا ہے کہ جو کچھ آپ کے ربّ کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے۔ کیا یہ شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو اندھا ہو؟ نصیحت تو وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں ۝١٩ جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرتے ہیں، اور عہد کو نہیں توڑتے ۝٢٠ اور جو اس چیز کو جوڑے رکھتے ہیں جس کے جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، اور اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں، اور برے حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں ۝٢١ اور جنہوں نے اپنے ربّ کی رضا حاصل کرنے کے لئے صبر کیا، اور نمازوں کو قائم کیا، اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے پوشیدہ طور پر اور ظاہری طریقے پر خرچ کیا، اور حسن سلوک کے ذریعہ بدسلوکی کو دفع کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت کا اچھا انجام ہے ۝٢٢

معارف ومنازل

صلہ رحمی اور ایفائے عہد کی فضیلت وبرتری کا بیان:

یہ متعدد آیات ہیں، جو متعدد احکام ومسائل پر مشتمل ہیں۔ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو اس بات کا علم ہو کہ جو کچھ آپ پر آپ کے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا وہ حق ہے کیا اس بات کا جاننے والا اندھے آدمی کے برابر ہو سکتا ہے جو علم کے اعتبار سے اندھا ہے؟ اور آپ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اسے حق نہیں جانتا یا جانتے ہوئے

ضد وعناد کی وجہ سے نہیں مانتا۔ یہ جاننے والا بینا ہے، اور نہ جاننے والا اور نہ ماننے والا نابینا ہے، کیا بینا اور نابینا برابر ہو سکتے ہیں؟ ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ بس عقل والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔ دراصل عقل کا رخ اگر قدرت کے کمالات وحی الٰہی کی برکات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات اور معجزات یا ائمہ دین وعلماء کرام کے مواعظ و تعلیمات کی طرف نیک نیتی اور طلب حق وہدایت کی خاطر موڑ دیا گیا تو ہدایت کے تمام راستے کھل جائیں گے، اور خود عقل بھی اپنا روشن وصحیح مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اور عقل مجرد کے احاطہ سے نکل کر عقل سلیم بن جائے گی۔ لیکن یہی عقل اگر ہدایت وحکمت کی بجائے اپنا رخ فلسفہ وریاضی سائنس اور ٹیکنالوجی، دنیا اور اس کی مرغوبات وایجادات کی طرف موڑ دے، اور وحی الٰہی کی برکات سے محروم رہے تو محض یہ نہیں کہ وہ عقل سقیم بن جائے گی، بلکہ دنیا وآخرت دونوں کی سعادت کھو بیٹھے گی۔

آج کے عقلاء، سائنسدان اور دانشور دنیا میں بہت ترقی کر کے نہایت عروج پر پہنچے، مگر اپنے خالق ومالک کی معرفت سے محروم ہوئے۔ دراصل یتیم وہ نہیں جس کے والدین کا سایہ ان کے سر سے اٹھ چکا ہو، بلکہ یتیم وہ ہے جس پر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اور وحی الٰہی کا سایہ نہ ہو۔ اب عقلمندوں کی صفات کا بیان ہو رہا ہے:

﴿الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ﴾ کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرتے ہیں، اور عہد کو توڑتے نہیں، یہ پہلی اور دوسری صفات ہیں عقلمندوں کی جو بیان ہوئیں کہ انہوں نے روز ازل وادی نعمان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کیا تھا کہ ہم بطیب خاطر خوشی خوشی سے آپ کے احکام پر عمل کرتے رہیں گے، آپ کی فرمانبرداری کریں گے، اور اوامر ونواہی کی پابندی کریں گے وغیرہ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت ورہنمائی یاددہانی کی خاطر ہر زمانہ اور ہر علاقے میں انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے انہیں ہدایات دیں، ان کی رہنمائی فرمائی، ازلی عہد وپیمان کی یاددہانی کرادی، اور ان پر مکمل اتمام حجت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

پس عقلمندوں نے نصیحت قبول کرلی، اور عقل کے اندھوں نے اعراض کیا۔ سورۂ نحل میں بھی اسی کا تذکرہ فرمایا: ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ﴾ [النحل:۹۱] (اور جب تم نے عہد کیا تو اسے پورا کرو)۔ عقلمندوں کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی:

﴿وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ عقلمند وہ لوگ ہیں جو اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو

جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، یعنی صلہ رحمی کرنا اور اہل ایمان سے دوستی کرنا ایمانی تقاضوں کی روشنی میں لوگوں سے معاملات کرنا، حقوق اللہ وحقوق العباد کا پورا پورا تحفظ کرنا وغیرہ۔ یہ مضمون سورۂ نساء کے پہلے رکوع میں مکمل بیان ہوا۔ اولوالالباب کی چوتھی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ﴾ وہ اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں۔ اور پانچویں صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَيَخَافُونَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ﴾ کہ یہ لوگ برے حساب سے ڈرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا کمال ایمان کی نشانی ہے، اور قیامت کے حساب سے خوف میں رہنے سے ایک فائدہ یہ ہے کہ ایمان میں جلا یعنی چمک پیدا ہوتی ہے، اور گناہوں سے بچنے کی ہمت اور توفیق نصیب ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان تازہ اور پختہ رہتا ہے۔ تیسرے یہ کہ حساب کے خوف کی وجہ سے نیک عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں ارشاد ہے: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ﴾ [الرحمن:۴۶] (اور جو اپنے ربّ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو باغ ہیں)۔

قیامت کا حساب سخت بھی ہوتا ہے اور آسان بھی، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کا حساب آسان ہوتا ہے، اور بہت ڈرنے والوں کا تو یہ عالم ہوگا کہ وہ بغیر حساب کے سیدھا جنت میں جائیں گے، یہ لوگ چار ارب نوے کروڑ کی تعداد میں ہوں گے۔ [علوم القرآن]

﴿وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ﴾ عقلمندوں کی چھٹی صفت کا بیان ہورہا ہے، یعنی وہ لوگ جنہوں نے صبر کیا اپنے ربّ کی خوشنودی طلب کرنے کے لئے۔ یہاں صبر کے تینوں مراتب اور اقسام مراد ہیں، یعنی طاعتوں پر صبر کرنا، مصیبتوں پر صبر کرنا اور معاصی ومحرمات سے صبر کرکے اجتناب کرنا۔ یعنی اعتماد علی اللہ کے ساتھ جزع فزع سے پرہیز کرنا، یہ اگرچہ بہت سخت اور مشکل ہے مگر متقی اور خاشعین کے لئے آسان ہے۔ اس لئے مقید فرمایا کہ: ﴿وَجْهَ رَبِّهِمْ﴾ اور ظاہر ہے کہ سخت سے سخت کام جب اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہوگا وہ آسان ہوگا، اور توفیق الٰہی ہمراہ ہوگی۔ عقلمندوں کی ساتویں صفت یہ ہے:

﴿وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ﴾ وہ لوگ ہیں جو پابندی اور شرائط وآداب کی رعایت کے ساتھ اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں جس میں نمازوں کے تمام حقوق وحدود کا لحاظ رکھتے ہیں۔ عقلمندوں کی آٹھویں صفت کا بیان ہے:

﴿وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ﴾ اور جو کچھ مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ ہماری رضا میں خرچ کرتے

ہیں۔اس جملہ کے عموم میں فرض زکوٰۃ،نفلی خیرات اور ہر قسم کے صدقات سب داخل ہیں، حتیٰ کہ بیوی بچوں اور اہل و عیال کے نفقات سب اس میں داخل ہیں۔فرمایا: ﴿وَفِيٓ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّاۤىِٕلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ﴾ [الذاریات: ۱۹] (اور ان کے مالوں میں حق ہے مانگنے والے اور محروم کے لیے)۔

﴿سِرًّا وَّعَلَانِيَةً﴾ یعنی پوشیدہ اور کھلم کھلا، یہ قید صرف ﴿مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ﴾ کے ساتھ ہے۔ظاہری صدقات میں افضلیت یہ ہے تاکہ دوسرے لوگوں کے لئے ترغیب ہو، اور کبھی پوشیدہ چھپا کر دینا افضل ہے تاکہ ریاء اور نام ونمود کا شائبہ نہ ہو۔بہر حال! حسب ضرورت ومواقع دونوں طریقوں پر دینے کا حکم ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہوگی تو لوگوں کے سامنے عمل کرنا (نماز پڑھنا صدقہ کرنا وغیرہ) کچھ مضر نہ ہوگا۔اللہ ربّ العزت ہر شخص کے ارادہ اور نیت سے اچھی طرح باخبر ہے۔پھر اولوالالباب کی نویں صفت کا بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَّيَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ﴾ کہ یہ لوگ حسن سلوک کے ذریعہ بدسلوکی کو دفع کرتے ہیں۔دراصل یہ صفت ہمارے پروردگار جل شانہ کی ہے۔حضرت ابن عباس، ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم نے روایت کی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی آدم کے ناداں لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مانتے ہیں اس کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولدیت کا عقیدہ رکھتے ہیں، اس کی عبادت سے منکر ہیں، طرح طرح سے اس کی نافرمانی کرتے ہیں، ان تمام برائیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں، حسن سلوک کا معاملہ فرماتے ہیں، انہیں رزق دیتے ہیں، مال واولاد عطا کرتے ہیں، اور عافیت وتندرستی وغیرہ بے شمار نعمتیں عنایت کرتے ہیں۔[متفق علیہ]

پھر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے تَخَلَّقُوۡا بِاَخۡلَاقِ اللّٰهِ کے پیش نظر ان عالی صفات کو سیکھا، اور ان پر کار بند رہے، اور اپنی اپنی امتوں کو ان پر عمل کرنے کی تلقین ورہنمائی کی، یہاں تک کہ اولوالالباب نے انہیں اپنایا، اور اُن پر عامل رہے۔پس یہ اولوالالباب کی نویں صفت بن گئی۔جس کا خلاصہ اور مختصر تشریح یہ ہے کہ دنیا میں جب انسان آیا ہے تو اس کا اچھے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے، اور برے لوگوں سے بھی جن لوگوں کو اخلاق حسنہ نہیں سکھائے گئے، اور جن کے مزاج میں کمینہ پن اور گناہگاری اور ایذارسانی ہوتی ہے، ان سے اہل خیر کو اور شریف النفس حسن اخلاق والوں کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں، کسی نے کوئی تکلیف پہنچائی اس کا بدلہ لینا بس اسی قدر جائز ہے جتنی اس نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے، اگر بدلہ لینے میں کوئی ذرہ برابر زیادتی کی تو بداخلاقی اور ظلم شمار ہوگا، لیکن سرے

سے بدلہ نہ لینا معاف کرنا درگزر کرنا (بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود) اور اس سے آگے بڑھ کر بھلائی سے پیش آنا اور حسن سلوک کا معاملہ کرنا یہ بہت بڑی فضیلت اور جوانمردی کی بات ہے۔

سورۂ شوریٰ میں فرمایا: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الشوری: ۴۰] (اور برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی ہے، اور جس نے معاف کر دیا اور اصلاح سے کام لیا تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے، بیشک اللہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا)۔ نیز فرمایا: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ [الشوری: ۴۳] (اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے یہ البتہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے)۔

سورۂ حٰم السجدہ میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ﴾ [حٰم السجدۃ: ۳۴] (اور نیکی اور برائی برابر نہیں ہوتیں، آپ نیک برتاؤ سے ٹال دیجئے پھر یکایک آپ میں اور جس شخص میں دشمنی اور عداوت ہو وہ تمہارا دوست اور چاہنے والا بن جائے)۔ سید کائنات رحمۃ للعٰلمین صاحب خُلق عظیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی پر عمل فرماتے تھے، درگزر فرماتے تھے، معاف فرماتے تھے، بدسلوکیوں کا بدلہ خوش اخلاقیوں سے دیتے تھے، محض معافی نہیں دشمنوں کے ساتھ بھی احسان فرماتے تھے، برائیوں کے بدلے انہیں مال عطا کرتے تھے۔

جب مکہ معظمہ فتح فرمایا تو وہاں کے رہنے والوں سے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ کی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جان نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کو شہید کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کعبۃ اللہ کے عمرہ سے منع کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بڑے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے ان کا مثلہ کیا تھا ان کا پیٹ چاک کر کے جگر و دل اور ان کے گردوں کو نکال کر کافروں کی عورتوں نے چبا چبا کر ان کی بے حرمتی کی تھی، جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ مکرمہ سے نکال کر ہجرت پر مجبور کیا تھا، آج وہ سارے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے منتظر کانپ رہے تھے کہ پتہ نہیں ہمارا انجام کیا ہوگا۔ وہ سارے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فوج کی تلواروں، نیزوں کے نیچے لرزہ براندام تھے، اس منظر کو دیکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی عام معافی کا اعلان فرماتے ہوئے کہا: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔ آج تم پر کوئی گرفت نہیں جاؤ تم آزاد ہو۔ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ۱۰۷] (اور ہم نے آپ کو مخلوقات کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے)۔ یہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اللہ

پاک سبحانہ وتعالیٰ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لطف وکرم اور ذرہ نوازی کا کوئی تقابل نہیں۔

یا رب تو کریمے وحبیب تو کریم ☆ صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: یا اللہ! آپ کے بندوں میں آپ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا جو شخص قدرت رکھتے ہوئے معاف کردے۔ [بھیقي شعب الإيمان، مشكوٰة]

یعنی جو شخص انتقام وبدلہ لینے پر قدرت رکھتا ہے اس کے باوجود وہ محض رضائے الٰہی سبحانہ کے پیش نظر معاف کرلیتا ہے قیامت کے روز جب اسے اعزاز ملے گا تو انتقام لینے والے افسوس کریں گے۔

اولوالالباب کی صفات حمیدہ بیان کرنے کے قدرداں پروردگار جل شانہ نے ان کے لئے انعام کا اعلان فرما کر انہیں بہت بڑی خوشخبری سنائی، یہ انعام اس کی اپنی شان کے مطابق ہے۔ فرمایا:

﴿أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ ان لوگوں کے لئے آخرت میں اچھا انجام اور بہتر گھر ہے۔ جس کی وضاحت یہ فرمائی، جو آنے والی آیت میں ہے۔

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِهِمۡ وَاَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّیّٰتِهِمۡ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ یَدۡخُلُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾ سَلٰمٌ عَلَیۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَی الدَّارِ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، اور ان کے باپ دادوں اور بیویوں اور اولاد میں جو لائق ہوں گے وہ بھی ان میں داخل ہوں گے، اور ان پر ہر دروازے سے فرشتے داخل ہوں گے ﴿۲۳﴾ جو یوں کہیں گے کہ تم نے جو صبر کیا اس کے بدلے تم پر سلام ہو، سو اس جہاں میں اچھا انجام ہے ﴿۲۴﴾

معارف ومنازل

ان اولوالالباب خوش قسمتوں کے اعمال کا یہ نتیجہ ہوگا، اور انجام کی خوبی اس طرح ظاہر ہوگی کہ یہ لوگ ایسے پر رونق باغیچوں میں رہیں گے جن میں ہر طرح کی خوشی کے ساتھ کوئی غم نہ ہوگا، اور لطف یہ کہ وہ جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔ آمین

نیز یہ بھی فرمایا کہ نہ صرف یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے بلکہ ان کے باپ دادوں میں اور ان کی بیویوں میں اور ان کی اولاد میں جو بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے اپنے بڑوں اور چھوٹوں اور بیویوں کو جنت میں دیکھ کر ان کی خوشی دوبالا ہوگی، اور فرحت وسکون کا وہ منظر ہوگا جس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، جنت کی خوشیوں کی ویسے بھی حد وانتہاء نہیں، لیکن جنتی مؤمن جب اپنے عزیز وقریبوں کو جنت میں پائے تو سونے پر سہاگا یہ خوشی قابلِ دید ہوگی۔ (اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے آمین)۔

بعض مفسرین نے آیت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے نیک بندوں کو جنت میں جو مقام اور مرتبہ حاصل ہوگا، اللہ تعالیٰ سبحانہ وہی درجہ ان پر شفقت فرماتے ہوئے ان کے متعلقین کو بھی عطا فرمادے گا جس کا آیت میں ذکر ہے۔ روح المعانی میں لکھا ہے کہ ﴿آبَاۗىِٕهِمْ﴾ کے عموم میں امہات یعنی مائیں بھی داخل ہیں۔ وهو الحق۔

﴿وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ﴾ فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے، اور انہیں یوں خطاب کریں گے:

﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ کہ تم لوگوں نے دنیا میں جو صبر کیا اس کے عوض تم ہر دکھ پریشانی اور ہر تکلیف سے محفوظ رہو گے، اور ہمیشہ تمہارے لئے سلامتی ہی سلامتی ہے۔ یہاں تک اہل ایمان کا تذکرہ رہا، اب ان کے مقابل دوسرے لوگوں کا بیان ہے:

وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ
يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْۗءُ الدَّارِ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ
يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝

ترجمہ: اور جو لوگ مضبوط عہد کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے عہد کو توڑتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں، اور زمین میں فساد کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے لعنت ہے اور آخرت میں بدحالی ہے ۝ اور اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ فرمادیتا ہے، اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے، اور وہ لوگ دنیاوی زندگی پر اترا رہے ہیں، حالانکہ دنیاوالی زندگی آخرت کے مقابلہ میں بس ایک ذراسی کام

آنے والی چیز ہے۞

معارف ومنازل

نقض عہد کرنے والوں کی بدحالی کا تذکرہ:

یہاں سے ان نافرمان لوگوں کی بدحالی اور تباہی کا بیان ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا، پھر اس پر قائم نہ رہے، عہد کو توڑ کر بدعہدی اختیار کی، اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا تھا انہیں مسلسل توڑتے رہتے ہیں، اور کفر وشرک ودیگر معاصی کا ارتکاب کرتے ہوئے زمین میں فساد کرتے رہتے ہیں، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے دور اور ملعون ہوئے، ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے، اور آخرت میں ان کے لئے بدحالی اور تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں، جیسا کہ پہلے گروہ کے لئے اچھے انجام کا فیصلہ ہو چکا اس کے برعکس یہ گروہ برے انجام سے دوچار رہیں گے، اور بدحال ہوں گے۔

دنیاوی سامان پر غرہ ہونا بیوقوفی ہے:

آخری آیت میں فرمایا: ﴿اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ﴾ اور اللہ تعالیٰ رزق کو کشادہ فرماتا ہے جس کے لئے چاہے، اور تنگ کرتا ہے جس کے لئے چاہے۔

دنیا میں رزق کی فراوانی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندہ ہونے کی دلیل نہیں، اور رزق کی تنگی اس بات کی دلیل نہیں کہ جس کا رزق تنگ ہو وہ اللہ تعالیٰ کا مقبول بندہ نہ ہو۔ لہٰذا کافر لوگ وسعت رزق سے دھوکہ نہ کھائیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ اگر ہم سے راضی نہ ہوتا تو زیادہ مال ہمیں کیوں دے دیتا، اور مؤمن اس سے پریشان نہ ہوں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے کم مال کیوں دیا زیادہ کیوں نہیں دیتا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ہم سے راضی نہیں۔

﴿وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ اور کافر دنیا کی خوشحال زندگی پر خوش ہو رہے ہیں اور غرہ ہو رہے ہیں، اور اسی پر فریفتہ ہیں، اسی وجہ سے وہ ایمان نہیں لاتے اور آخرت کی فکر نہیں کرتے۔

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ﴾ بس دنیا والی زندگی آخرت کے مقابلے میں ذرا سی چیز ہے، یعنی ناکارہ ہے۔ پس ابدی خوشحالیوں کی اخروی زندگی پر چار روزہ فانی دنیاوی زندگی پر قناعت کرنا یعنی مٹی کو سونے پر ترجیح دینا سراسر بیوقوفی ہے، جس کا انجام بڑا خطرناک اور ابدی شقاوت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سورۂ آل عمران

میں اس کو متاع الغرور سے تعبیر فرمایا۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۝ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ۝

ترجمہ: اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ ان پر کوئی نشانی ان کے ربّ کی طرف سے کیوں نازل نہیں کی گئی؟ آپ فرما دیجئے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہے، اور جو اس کی طرف رجوع کرے اسے اپنی طرف راہ دکھاتا ہے ۝ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں خبردار! اللہ تعالیٰ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے ۝ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے خوشحالی ہے اور اچھا ٹھکانا ہے ۝ اسی طرح ہم نے آپ کو ایسی امت میں بھیجا جس سے پہلے بہت سی امتیں گزر چکی ہیں تاکہ آپ انہیں وہ چیز پڑھ کر سنائیں جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے، اور وہ رحمٰن کے منکر ہو رہے ہیں، آپ فرما دیجئے: وہ میرا ربّ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اس پر بھروسہ کیا، اور اسی کی طرف میرا رجوع ہوتا ہے ۝

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ کے ذکر سے قلوب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے:

پہلی آیت کریمہ کی تشریح کے لئے اسی سورۂ رعد کے پہلے رکوع کی آخری آیت کی تفسیر دیکھی جائے۔ پھر فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف ہدایت دیتا ہے، جب مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا ہی نہیں چاہتے تو انہیں ہدایت کس طرح حاصل ہو؟ ہدایت کے لئے اِنابت اِلی اللہ اور طلب شرط ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ﴾ جو لوگ ایمان لاتے ہیں تو مطمئن ہوتے ہیں ان کے

دل ذکر الٰہی سے۔ انسان ایک طرف سے نفس و شیطان کے نرغے میں لاچار و مجبور ہے، دوسری طرف سے معاشرہ اور ماحول کا بھی قیدی ہے، پھر اس طرح کے نامساعد اور پریشان کن حالات وواقعات میں گھرا ہوا رہتا ہے کہ امن و سکون غارت ہو کر ایک اضطرابی کیفیت کا شکار ہو جاتا ہے، پھر وہ مختلف ذرائع سے اطمینان و سکون کا متلاشی رہتا ہے۔

مگر اسے کسی قیمت پر سکون نصیب نہیں ہوتا، جبکہ سارے ذرائع واسباب سے محرومی کے بعد اسے ایک باطنی نور روشنی کی کرن ہاتھ لگتی ہے، چنانچہ وہ اس میں تھوڑا سا وقفہ لگا کر مطمئن ہو جاتا ہے، اور سارے اسباب سے کٹ کر جب آخرت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو سکون واطمینان اس کا استقبال کرتا ہے۔ یہی ہے ذکر اللہ جس کا مطلب مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ: "إعراض عن الدنيا إقبال على الآخرة"۔

یہی وہ نور ہے جس سے دنیا کے اندھیرے بھاگ جاتے ہیں، تمام اوہام سارے شکوک وشبہات یکسر ختم ہو جاتے ہیں۔ امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ ہر سال رمضان المبارک میں قرآن حکیم کی تفسیر پڑھاتے تھے، جس میں جید علماء کرام آپ سے استفادہ کرتے تھے، حضرت پورے قرآن حکیم کا خلاصہ یہی بتاتے تھے کہ: "اللہ تعالیٰ سے جوڑ اور دنیا سے توڑ"۔ اس عقیدہ وعمل سے باقاعدہ وہ اطمینان وسکون اور مستقل راحت وقرار نصیب ہوگا جس کے مقابلے میں دنیوی تخت وتاج کی کوئی حیثیت نہیں، کیونکہ یہ ایک غذا ہے جس سے روح کو تقویت حاصل ہوتی ہے، اس غذا سے قلب وقالب ایک جلاء سے ہمکنار ہو جاتے ہیں، اور قلب وقالب میں نیکی کی مضمر صلاحیتیں نشو ونما پاتی ہیں، اور اسی سے انسان میں وہ عظیم جلال اور قوت نمودار ہوتی ہے جس سے شیطان پر لرزہ طاری ہوتا ہے، اور اس کے سارے غلط منصوبے خاک میں مل جاتے ہیں۔

دنیا کی ساری نعمتوں میں سے اطمینان قلب سب سے عظیم نعمت ہے، دولت، عزت، اقتدار، مال واولاد، قوم وراج کی کثرت کے باوجود روح کو سکون اور دل کو چین نصیب نہیں ہوتا، صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی وہ آب حیات ہے کہ جس سے مانوس ہونے والا اور اس کو سینے سے لگانے والا کوئی گھبراہٹ اور خلجان محسوس نہیں کرتا، وہ تختۂ دار پر بھی مطمئن نظر آتا ہے، وہ آتش کدۂ نمرود میں بھی مسکراتا ہے، وہ مصائب وآلام اور پریشانیوں میں ایسا مطمئن وخوش نظر آتا ہے جیسے مچھلی سمندر میں۔

لہٰذا ایسے امن وسکون کے لئے اور اسے حاصل کرنے کے لئے چاہیے کہ کسی تارک دنیا ہستی کے قدموں کی خاک بن کر اس کی صحبت کے فیوض وبرکات پر نثار ہوں۔ واللہ اعلم

ع ہر ہوسنا کے غداند جام وسندان باختن

فائدہ:

عام طور پر ذکرِ الٰہی کی دو قسمیں بیان ہوتی ہیں: (۱) ذکر قلبی۔(۲) ذکر لسانی۔

قسم اول کی فضیلت زیادہ ہے۔ میرے نزدیک ایک تیسری قسم بھی ہے جس کا نام ہے: ذکر عملی، جو کہ بہت ہی بلند واعلیٰ ہے۔ وہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام اعمال وکردار وگفتار اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق ہوں، کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ عمل بھی شریعتِ الٰہی اور سنت کے خلاف نہ ہو، مگر ان تمام امور میں یہ شرط ہے کہ قلب وقالب محبت دنیا سے مکمل فارغ اور خالی ہو۔

ابھی یہ بات گزری کہ دنیا کی زندگی اور مال ومنال کی حیثیت "متاع" کی ہے۔ امام اصمعی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ متاع کیا ہے؟ فرمایا: بے قیمت چیز جیسے کوڑا کرکٹ، پھر انہوں نے یہ حدیث پیش کی کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "مَرَّ بِجَدْيٍ أَسَكَّ مَيِّتٍ" یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایک میدان سے گزرے، گرمی کا زمانہ تھا، بکری کا چھوٹے کانوں والا بچہ وہاں مردار پڑا ہوا تھا، جس کی بدبو سے لوگ ناک پر ہاتھ یا کپڑا رکھ کر گزر گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: تم میں سے کون ہے جو بکری کے اس مردہ بچے کو ایک درہم میں خریدے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ ایک مردار حقیر مرا ہوا جانور ہے، ہم درہم تو کیا اسے مفت لینے پر بھی تیار نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ کے نزدیک پوری دنیا کی قیمت اس مردار بکری کے بچے سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ [ترمذي]

دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا کی قیمت وقدر ومنزلت مچھر کے پر کے بھی برابر ہوتی تو وہ کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا، دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر سے بھی حقیر اور بے قیمت ہے۔ [رواه الترمذي وابن ماجة والحاكم وأبو نعيم الضياء في مختارة]

پس یاد رکھنا چاہیے کہ اعلیٰ تخم اگر ناکارہ زمین میں ڈالا جائے تو فائدہ کچھ نہیں ہوگا، اور بیج ضائع ہو جائے گا، اسی طرح ذکرِ الٰہی بمنزلہ تخم کے ہے، اس کی زمین اور مرکز دل ہے، اگر دل صاف ہو اور حقیر وگندی دنیا کی محبت سے پاک ہو تو اذکار کا فائدہ اور فیوض وبرکات کے آثار فوراً معلوم ہوں گے، اور مشاہدہ میں آئیں گے۔ اگر دل میں گند اور دنیاوی خیالات جمے ہوئے ہوں تو زبانی اذکار کے فوائد معلوم ہوں گے نہ برکات وآثار۔ اگر کنویں میں چوہا گر

جائے، گل سڑ جائے، تو کنویں کے تمام پانی کو چوہے سمیت نکالنا ضروری ہے، تب جا کر کنواں پاک ہوگا۔

آج حال یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں سینکڑوں دنیاوی چوہے گھوم پھر رہے ہیں، ہمیں ان کے نکالنے اور دل صاف کرنے کا احساس تک نہیں، اندر باطن جب گندا ہوگا تو زبانی ذکر اور اذکار کا ثواب تو ملے گا، مگر وہ فوائد حاصل نہیں ہوں گے جن کی ہمیں توقع اور امید ہے، لہٰذا طہارت قلب کا اہتمام ضروری ہوا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ذکرِ الٰہی جس سے مردہ دل زندہ ہوجاتے ہیں اور ذکر لسانی جس سے زبان میں صداقت حاصل ہوجاتی ہے، اور ذکر عملی جو کہ تقویٰ کا سرچشمہ اور بنیاد ہے، ان تینوں کا اہتمام اور باقاعدہ پابندی کے ساتھ التزام ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں سب سے اولیت تلاوتِ قرآن پاک کو حاصل ہے، پھر کلمہ طیبہ کا ورد ہو، کثرت استغفار اور کثرت درود شریف بھی ہو، اس کے بعد دوسرے اذکار جو حصن حصین اور دیگر کتابوں میں درج ہیں۔ اللہ الموفق

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کئے ان کے لئے خوشخبری ہے اور اچھا ٹھکانہ ہے۔ اعمال صالحہ میں وہ سارے اعمال آگئے جنہیں شریعت نے لازم قرار دیا ہے، عباداتِ بدنیہ، عباداتِ مالیہ، اور مرکب منہما۔ اسی طرح دیگر حقوق اللہ و حقوق العباد سب مراد ہیں۔

طوبیٰ کے بہت سے معانی ہیں: مثلاً خوشخبری، پاکیزگی، اور یہ ایک بہت بڑے جنتی درخت کا بھی نام ہے جس کا سایہ تمام جنتوں اور تمام جنتیوں پر چھایا ہوگا۔ بعض تفسیری روایات میں ہے کہ اس کا تنا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جنتی گھر میں ہوگا، اور اس کی شاخیں تمام بہشتوں میں سارے اہل ایمان پر سایہ فگن ہوں گی۔ یہ درخت عجیب و غریب قدرت کا ایک انعام ہوگا، اس جہاں میں ایسی چیزوں کا راز معلوم نہیں ہوتا، جب مؤمن اگلے جہاں میں پہنچیں گے تو سب پردے اٹھ جائیں گے، اور پوشیدہ راز معلوم ہوکر مشاہدہ میں آجائیں گے۔

آگے کفار کی شرارتوں اور من مانیوں کے جوابات میں فرمایا:

﴿كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ﴾ اسی طرح ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا ہے اس آخری امت میں، اسی طرح پہلی امتوں کی طرف بھی انسانوں میں سے ہی رسول بنا کر بھیجے گئے۔ نہ نبوت کوئی نئی چیز ہے، اور نہ ہی امتیں نئی ہیں، اور نہ ہی اقوام عالم کی سرکشی اور تکذیب رُسل کوئی نئی بات ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ ہے:

﴿لِّتَتْلُوَاْ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ﴾ تا کہ آپ پڑھ کر سنا دیں ان کو وہ چیز جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے۔ یہ سلسلہ صرف آپ کا مخصوص مشغلہ نہیں، بلکہ سارے انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی اسی طریقہ تبلیغ وتعلیم کو اپنایا تھا۔ پھر جس طرح آپ پر لوگ ایمان نہیں لاتے اور تکذیب کرتے ہیں، نئے نئے فرمائشی معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں، یہی سب کچھ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ بھی ہوا، لہٰذا آپ دلگیر و پریشان نہ ہوں: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ [الأحقاف:۳۵] (صبر کریں، جیسے عزیمت والے رسولوں نے صبر کیا)۔ یہ مضمون بار بار تسلی کے لئے قرآن کریم میں بیان ہوتا رہا ہے، مقصد صرف تسلی ہی ہے۔

﴿وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ﴾ کہ وہ رحمٰن جل جلالہ کا انکار کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکت بھی دنیا کے لئے رحمت ہے، اور قرآن حکیم بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے۔ ان لوگوں کو یہ چاہیے تھا کہ وہ رحمٰن جل شانہ کی ان دونوں عظیم رحمتوں کا شکر ادا کریں اور ایمان لائیں تا کہ انہیں بھی آخرت میں رحمتوں کا استحقاق حاصل ہو جائے، مگر یہ بد بخت بجائے شکر کے ناشکری کر کے رحمٰن جل شانہ کی رحمتوں سے محروم ہو گئے۔ یہاں صفت رحمٰن کے ذکر کرنے کا یہی راز ہے جو ہم نے بیان کیا۔ واللہ اعلم

﴿قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ﴾ آپ فرما دیجئے کہ وہ میرا ربّ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے صرف اسی پر بھروسہ کیا، اور اسی کی طرف میرا رجوع کرنا ہے، اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو میرا کوئی نقصان نہ ہوگا۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۭ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ۭ اَفَلَمْ
يَايْــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ
بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ۧ۳۱

ترجمہ: اور اگر قرآن ایسا ہوتا جس کی وجہ سے پہاڑ چلا دئے جاتے، یا اس کے ذریعہ زمین کے ٹکڑے کر دیئے جاتے، یا اس کے ذریعہ مردوں سے بات کرا دی جاتی، تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں، بلکہ تمام امور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں، کیا اہل ایمان نا امید نہیں ہوئے؟ حالانکہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال بد کی وجہ سے انہیں برابر کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی،

یا ان کے مکانوں کے قریب مصیبت نازل ہوجائے گی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ آجائے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتا ﴿۳۱﴾

معارف ومسائل

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے ایک سوال پر نازل ہوئی۔ وہ یہ کہ عبداللہ بن امیہ اور ابوجہل ایک دن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے کہ اگر آپ کی خوشی اس بات میں ہے کہ ہم آپ کا اتباع کرلیں تو اس قرآن کے ذریعہ مکہ کے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہٹا کر کہیں اور منتقل کیجئے تاکہ مکہ کی سرزمین کشادہ ہوجائے، اور مکہ کی سرزمین پھٹ جائے، اور اس میں نہریں اور چشمے جاری ہوجائیں تاکہ ہم اس میں درخت لگائیں اور باغ بنائیں اور سبزی اگائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا ہے کہ داؤد علیہ السلام کے لئے پہاڑ مسخر کئے گئے تھے، اور سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا مسخر کردی گئی تھی، لہٰذا ہمارے لئے بھی ہوا کی تسخیر ہوجائے، ہم تجارت کے لئے ملک شام جاتے ہیں، تجارت کرکے واپس آتے ہیں، اس آنے جانے میں کئی ماہ خرچ ہوجاتے ہیں، اگر ہوا ہمارے لئے مسخر ہوجائے تو دن کے دن چلے جائیں اور واپس ہوجائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمانا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے، لہٰذا آپ اپنے پردادا کو زندہ کریں، یا اور جس کو مناسب سمجھیں زندہ فرمالیں، ہم ان سے آپ کے بارے میں دریافت کریں گے کہ آپ کا دین حق ہے یا باطل؟ آپ کی حیثیت حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم نہیں ہے، آپ اپنے ربّ سے سوال کریں کہ ان چیزوں کو ظاہر فرمائے، اور ہمارے مطالبات پورے کریں۔ اگر یہ چیزیں وجود میں آجائیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی، اور فرمایا کہ ان کی فرمائش کے مطابق معجزہ ظاہر ہوجائے بھی تو یہ لوگ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے، ان کی یہ سب باتیں عناد کے طور پر ہیں، یہ ہرگز ایمان لانے والے نہیں، جیسا کہ سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ [الأنعام:١١١] (اگر ہم ان کی طرف فرشتے اتار دیں اور ان سے مردے بات کرلیں اور جمع کردیں ان پر ہر چیز ان کے آمنے سامنے تب بھی وہ ایسے نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں

مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے)۔

﴿وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا﴾ کی جزا مفسرین کرام نے محذوف بتائی ہے، وہ یہ: ''كَفَرُوْا بِالرَّحْمٰنِ وَلَمْ يُؤْمِنُوْا'' ہے، یعنی اگر ان کی فرمائش کے مطابق معجزے ظاہر کر دیئے جائیں تب بھی یہ کفر اختیار کرتے رہیں گے، اور ایمان نہیں لائیں گے۔

﴿بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا﴾ بلکہ تمام امور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں، یعنی ان کے مطالبات کو پورا کرنا یا نہ کرنا سب اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، وہ اپنی حکمت کے مطابق جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، وہ کسی مطالبے کو پورا کرنے کا پابند نہیں ہے کہ لوگ جو بھی مطالبہ کریں وہ انہیں پورا کر لیں۔

﴿اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ صاحب معالم التنزیل لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب مشرکین کے مطالبات سنے کہ فلاں فلاں معجزہ ظاہر ہو جائے تو انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ یہ معجزات اگر ظاہر ہو جاتے تو اچھا ہوتا، تاکہ یہ لوگ اسلام قبول کر لیتے۔ ان کے جواب میں فرمایا: کیا اہل ایمان ان کی ضد و عناد کو دیکھ کر ان لوگوں کے ایمان لانے سے ناامید نہیں ہوئے؟ اگر ناامید ہو جاتے تو ایسی آرزو نہ کرتے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں يَايْـَٔسُ کے معنی یقینی بات کے ہیں، اور اس طرح جملے کا مفہوم یہ ہوگا کہ کیا اہل ایمان کے لئے یہ یقینی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ چاہے تو سب کو ہدایت دیدے؟ مگر وہ ایسا نہیں کرے گا، لہٰذا اہل ایمان کو مشرکین سے ایمان کی توقع نہیں رکھنی چاہیے، پس کلام اس طرح ہوگا: ''اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا عَنْ اِيْمَانِهِمْ عَالِمِيْنَ مُسْتَيْقِنِيْنَ اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ''۔

اور جن لوگوں نے کفر کیا، برابر ان کے اعمال بد کی وجہ سے کوئی نہ کوئی مصیبت پہنچتی رہے گی، یا ان کے مکانوں کے قریب مصیبت نازل ہو جائے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اہل مکہ شدید قحط میں مبتلا ہوئے، پھر غزوۂ بدر میں ان کے بڑے بڑے چیدہ چیدہ سردار مقتول ہوئے، اور ستر افراد مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی بنا لئے گئے، ان کی شان و شوکت مکمل تباہ ہو گئی، لہٰذا فرمایا کہ ان پر اس طرح کے مصائب آتے رہیں گے، اگر خاص ان پر نہ آئے تو ان کے قرب وجوار بستیوں میں مصیبتیں آتی رہیں گی تاکہ عبرت حاصل ہو، اور وہ اپنے انجام کے متعلق فکر کریں، یہاں تک فرمایا:

﴿حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ﴾ اس سے فتح مکہ مراد ہے، یا ان کی طبعی موت یا روز قیامت، اور بیک وقت تینوں معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی مصیبتوں کا سلسلہ برابر جاری رہے گا، فتح مکہ تک اور برزخ کے اندر بھی اور روز قیامت بھی، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ
كَانَ عِقَابِ ﴿۳۲﴾ اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۚ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ قُلْ
سَمُّوْهُمْ ؕ اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ؕ بَلْ زُيِّنَ
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾
لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: اور بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں بلاشبہ ان کا مذاق بنایا گیا، پھر میں نے ان لوگوں کو مہلت دی جنہوں نے کفر کیا، پھر میں نے ان کو پکڑ لیا، سو میرا عذاب دینا کیسا تھا؟ ﴿۳۲﴾ سو جو ذات ہر شخص کے اعمال پر مطلع ہو کیا اس کے برابر وہ ہو سکتا ہے جس کی یہ صفت نہ ہو؟ اور لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے شریک تجویز کر لئے، آپ فرما دیجئے کہ تم ان کے نام لو، کیا تم اللہ تعالیٰ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جسے وہ زمین میں نہیں جانتا؟ یا محض ظاہری لفظ کے اعتبار سے بلکہ کافروں کے لئے ان کا مکر مزین کر دیا گیا، اور وہ لوگ راستے سے روک دیئے گئے، اور اللہ تعالیٰ جسے گمراہ کرے سوا سے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ﴿۳۳﴾ ان کے لئے دنیا والی زندگی میں عذاب ہے، اور البتہ آخرت کا عذاب بہت زیادہ سخت ہے، اور انہیں کوئی اللہ تعالیٰ سے بچانے والا نہیں ہے ﴿۳۴﴾

معارف ومنازل

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تسلی ہو رہی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب فرما کر کہا جا رہا ہے کہ آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے گئے، جس طرح کفار و مشرکین نے آپ کا مذاق بنایا اسی طرح تمام سابقہ رسولوں علیہم السلام کا بھی مذاق بنایا گیا۔ نبوت کے مزاج میں یہ امر مخفی رہا ہے کہ کفار و مشرکین بہر صورت اس کی مخالفت کریں گے، اور دین الٰہی کے

انوار و برکات کے عطر و خوشبو سے بہرہ یاب ہونے کی استعداد ان لوگوں کے سڑے ہوئے اور ناکارہ دماغوں میں کہاں ہوتی ہے؟ ان کی قسمت میں تصدیق کی بجائے تکذیب کا مادہ بھر دیا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، آپ سے پہلے جو رسول آئے ان کی قوموں نے ان کے ساتھ استہزاء تکذیب و مذاق بنانے کا وہی طریقہ اختیار کیا جو یہ لوگ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان رسولوں علیہم السلام نے صبر کیا، آپ بھی صبر کریں، ان لوگوں نے جب تکذیب کی اور رسولوں علیہم السلام کا مذاق بنایا تو میں نے عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کی، بلکہ ان کو مہلت دی، اس مہلت سے وہ اور زیادہ گمراہ ہوئے، اور بغاوت تیز کر دی، پھر میں نے ان کی گرفت کر لی، اور مضبوط پکڑ کے ساتھ ان پر عذاب مسلط کیا۔

اب تم خود خیال کر لو کہ میرا عذاب کیسا تھا؟ جب عذاب آیا تو ان کے بچنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اور بھاگنے کا کوئی حیلہ نہ تھا، اور نہ تدبیر تھی، اسی طرح آپ کے مکذبین کا حال ہوگا، آپ انتظار کریں، پھر فرمایا:

﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ﴾ کیا جو ذات ہر شخص کے اعمال پر مطلع ہو؟ یہ استفہام انکاری ہے، اور مبتدا کی خبر محذوف ہے۔ كَمَنْ لَيْسَ كَذٰلِكَ؟ [روح المعاني]

مطلب یہ ہے کہ جو ذات علیم اور خبیر ہے جسے سب کے اعمال اور افعال و احوال کا علم ہے کیا اس کے برابر تمہارے اندھے، بہرے، اور بے جان معبود ہو سکتے ہیں؟ جنہیں تمہارا تو کیا، انہیں اپنے حال کا پتہ نہیں۔ جب تمہارے بے جان و بے حرکت معبودوں کا یہ حال ہے تو وہ نفع و ضرر کے مالک کیسے ہو سکتے ہیں؟ پھر انہیں خالق و مالک علیم و خبیر ربّ کا شریک بنانا کہاں کا انصاف اور دانشمندی ہے؟ اگر تم محض ایک لمحہ ضد و عناد چھوڑ کر سوچو تو تمہیں اپنی حماقت و جہالت بآسانی معلوم ہو۔

﴿قُلْ سَمُّوْهُمْ﴾ یعنی جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا لیا ہے ان کا ذرا نام تو لو، اور بتاؤ وہ کون ہیں؟ اور ان کی حیثیت کیا ہے؟ ان کے کسی کارنامے کی نشاندہی تو کرو۔ یہ کلمہ ان کے شرکاء کی تحقیر و بے حیثیت ہونے کے لئے ارشاد ہو رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے معبود اتنے حقیر ہیں کہ قابل ذکر ہی نہیں۔

﴿اَمْ تُنَبِّـُٔوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ﴾ کیا تم اللہ تعالیٰ کو وہ بات بتا رہے ہو جس کو وہ زمین میں نہیں جانتا؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ساری مخلوق کا علم ہے، تم زمین میں ہو، اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ بھی زمین میں ہیں، اللہ تعالیٰ کے علم میں تو اس کا کوئی بھی شریک نہیں ہے، اور اس کے علاوہ کوئی عبادت

کے لائق نہیں، اب جب تم شرک کر رہے ہو اور غیر اللہ کو معبود بنا رہے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اللہ تعالیٰ کو یہ بتا رہے ہو کہ آپ عزوجل تعالیٰ کے لئے شریک بھی ہیں، آپ کو ان کا پتہ نہیں، ہم آپ عزوجل تعالیٰ کو بتا رہے ہیں (العیاذ باللہ) اس میں مشرکین کی جہالت اور ضلالت کو واضح فرمایا ہے۔

﴿اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ﴾ یعنی تم جن معبودوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دے رہے ہو، اس بارے میں تمہارے پاس کوئی حقیقت ہے، یا یوں ہی فقط ظاہری الفاظ میں ان کو شریک ٹھہراتے ہو؟ غیر اللہ کے معبود ہونے کی کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے، صرف باتیں ہی باتیں ہیں، اور دعوے ہی دعوے ہیں، اور یہ سب کچھ زبانی بکواسات وخرافات ہیں۔ معبود بنانے کے لئے تو بہت بڑی تحقیق کی ضرورت ہے، یوں زبانی باتوں سے کسی کا معبود ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔

﴿بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ﴾ بلکہ کافروں کے لئے ان کا مکر مزین کر دیا گیا، اور راہِ حق سے روک دیئے گئے، شیطان نے ان کے شرک وگمراہی کو نہایت خوبصورت بنا کر ان کے سامنے پیش کیا جس میں وہ آگے بڑھتے چلے گئے، اور راہ حق سے دور ہوتے گئے۔ ابلیس کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ نیکیوں کو گھٹا کر اور شرک ومعاصی کو بڑھا کر خوبصورت لیبل لگا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے، اور انہیں خوب دوزخ کا راستہ دکھا کر گمراہ کرتا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ جسے گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔

﴿لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ﴾ ان کے لئے دنیا والی زندگی میں کمزور عذاب ہے، البتہ آخرت کا عذاب بہت بڑا بھی ہے اور سخت بھی۔

﴿وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ﴾ اس میں کافروں کو تنبیہ ہے کہ دنیا میں تمہارے لئے طرح طرح کے عذاب ہیں، اور صرف یہ نہیں کہ تم آئندہ بچ جاؤ گے، بلکہ آخرت کا عذاب جو تمہارے لئے مقرر ہے، وہ نہایت دردناک اور سخت ہے۔ تمہیں کیا بچائیں گے، وہ تو خود تمہارے ساتھ اس عذاب میں مبتلا ہوں گے، وہاں کے عذاب سے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی بچانے والا نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے بچانے والی فرصت کو تم نے ضائع کیا ہوا ہے۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ

عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۖ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ
اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ
بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ
بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: جس جنت کا وعدہ کیا گیا متقین کے لئے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان کے پھل اور ان کا سایہ دائمی ہوگا، یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، اور کافروں کا انجام دوزخ ہے ﴿۳۵﴾ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی وجہ سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا، اور گروہوں میں بعض ایسے ہیں جو اس کے بعض حصے کا انکار کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے: مجھے تو بس یہ حکم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں، اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤں، میں اسی کی طرف بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے ﴿۳۶﴾ اور اسی طرح ہم نے اس کو اس طور پر نازل کیا کہ عربی زبان میں خاص حکم ہے، اور اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آ گیا، اگر آپ نے ان کی خواہش کا اتباع کیا تو کوئی ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں آپ کی مدد کرنے والا اور بچانے والا ہو ﴿۳۷﴾

معارف ومنازل

نافرمانوں کے بعد ایک مختصر جھلک فرمانبرداروں کا بیان فرما کر واضح فرمایا کہ مجھ سے قرب وبعد کا سبب صرف یہ ہے کہ میرے بندوں میں جو لوگ میرے فرمانبردار ہیں وہی درحقیقت میرے بندے ہیں جنہیں ابدی راحتیں نصیب ہوں گی، اور جو لوگ نافرماں ہیں وہ مجھ سے دور رہیں گے، وہ عباد الشیطان کہلائیں گے۔ فرمایا:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ جس جنت کا اہل تقویٰ سے وعدہ کیا گیا۔ اہل تقویٰ وہ ہیں جو کہ شرک وکفر اور معاصی سے بچتے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ وہ ابدی راحتوں والی جنت میں ہوں گے جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

﴿اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا﴾ اس کے پھل ہمیشہ رہیں گے جن کا موسم کے ساتھ تعلق نہیں ہوگا، اور اس کا سایہ بھی ہمیشہ ہوگا، یعنی جنت میں جو پھل ملیں گے، برابر ملتے رہیں گے اور ہمیشہ ملیں گے اور سایہ بھی ہمیشہ رہے گا وہ سایہ

ایسا ہوگا جو طلوع وغروب سے وابستہ نہ ہوگا، جیسے صبح کے وقت طلوع شمس سے پہلے ہوتا ہے۔سورۂ نساء میں فرمایا: ﴿وَّنُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِيۡلًا﴾ [النساء: ۵۷] (اور ہم انہیں گھنی چھاؤں میں داخل کریں گے)۔سورۂ دہر میں فرمایا: ﴿وَدَانِيَةً عَلَيۡهِمۡ ظِلٰلُهَا﴾ [الدھر: ۱۴] (ایسی حالت میں کہ ان باغوں کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے)۔ سورۃ المرسلات میں فرمایا: ﴿اِنَّ الۡمُتَّقِيۡنَ فِىۡ ظِلٰلٍ وَّعُيُوۡنٍ﴾ [المرسلات: ۴۱] (بیشک پرہیزگار لوگ سایوں اور چشموں میں ہوں گے) وہاں جنت میں نہ سورج ہوگا اور نہ چاند وہاں کی روشنی کا انتظام تجلی ربانی سے ہے اور سایہ عرش عظیم کا ہوگا۔

سورۂ واقعہ میں فرمایا: ﴿فِىۡ سِدۡرٍ مَّخۡضُوۡدٍ۞ وَّطَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ۞ وَّظِلٍّ مَّمۡدُوۡدٍ۞﴾ [الواقعة] (کانٹوں سے پاک بیریوں میں۔ اوپر تلے لدے ہوئے کیلئے کے درختوں میں۔ اور دور تک پھیلے ہوئے سائے میں)۔یعنی نہ دھوپ ہوگی نہ گرمی سردی، نہ اندھیرا ہوگا، بلکہ صبح کے بعد اور طلوع شمس سے پہلے جیسا درمیانی وقت ہوتا ہے ایسا معتدل سایہ ہوگا۔فرمایا: یہ انجام ہے ان لوگوں کا جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، اور کافروں کا انجام دوزخ ہے۔

﴿وَالَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَفۡرَحُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ﴾ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس چیز سے خوش ہوتے ہیں جو آپ کی طرف کتاب نازل کی گئی۔اس سے عام یہود و نصاریٰ مراد نہیں جیسا کہ معلوم ہے، بلکہ وہ خاص طبقہ مراد ہے جنہوں نے اسلام قبول کیا جیسے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء۔ان میں وہ چالیس اشخاص بھی ہیں جو نصاریٰ نجران میں سے تھے، اور آٹھ یمن کے نصرانی تھے، اور بتیس حبشہ کے نصرانی تھے۔ وغیرھم۔[روح المعاني]

﴿وَمِنَ الۡاَحۡزَابِ مَنۡ يُّنۡكِرُ بَعۡضَهٗ﴾ اور اہل کتاب کے بعض گروہ وہ ہیں جو قرآن کے بعض حصہ کے منکر ہو رہے ہیں، اس سے اہل کتاب کے معاندین مراد ہیں جو قرآن کریم کی ان چیزوں کو مان لیتے تھے جنہیں اپنے موافق سمجھتے تھے جیسے سورۂ یوسف میں ذکر ہوا، اور ان چیزوں کے منکر ہو جاتے تھے جو ان کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ہوتی تھیں۔

﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشۡرِكَ بِهٖ﴾ آپ فرما دیجئے کہ مجھے تو صرف یہ حکم ہوا ہے کہ میں صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کروں، یہ میرا دین ہے تم راضی رہو یا نہ رہو، میں اللہ تعالیٰ کی توحید پر اور اللہ تعالیٰ کی عبادت پر قائم ہوں۔

﴿اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ﴾ میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف بلاتا ہوں لوگوں کو توحید واخلاص کی دعوت دیتا ہوں، اور مجھے صرف اس کی طرف لوٹنا ہے، اور وہی مجھے میرے اعمال کا بہتر بدلہ دینے والا ہے۔

﴿وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا﴾ اور اسی طرح اتارا ہم نے یہ کلام حکیم عربی زبان میں ۔ متصل آنے والی سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہے:﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾[ابراھیم:۴] (اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی تا کہ ان کو سمجھائیں)۔ تفصیل وہاں آئے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

یعنی جیسے بیشتر دوسری آسمانی کتابیں پیغمبروں علیہم السلام پر اتاری گئیں، اسی طرح یہ قرآن حکیم اتارا گیا جو عظیم الشان معارف وحکم پر مشتمل اور حق وباطل کا آخری فیصلہ کرنے والا ہے۔ پھر جس طرح ہر پیغمبر کو اسی زبان میں کتاب دی گئی جو اس کی قومی زبان تھی ایسے ہی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رسول عربی کو عربی میں قرآن دیا گیا۔ بلاشبہ قرآن حکیم جیسی معجز وجامع کتاب ایسی ہی زبان میں نازل ہونی چاہیے تھی جو نہایت بلیغ، وسیع، جامع، منضبط، واضح، پرمغز، اور پر شوکت ہونے کی وجہ سے "اُم الالسنہ" اور "ملکۃ اللغات" کہلانے کی مستحق ہے، بلکہ اہل جنت کی زبان بھی ہے۔

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ﴾ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی اتباع کی تو کوئی ایسا نہیں جو آپ کی مدد کرنے والا اور بچانے والا ہو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں، یعنی کسی کے انکار وناخوشی کی ذرہ بھر پرواہ نہ کرو، حق تعالیٰ نے جو علم عظیم اور کتاب حکیم تم کو دی ہے اس کی پیروی کرتے رہو، اگر بالفرض آپ ان لوگوں کی خواہشات کی طرف جھک گئے تو اس کے وبال سے کون بچا سکتا ہے۔

یہ خطاب ہر طالب حق کو ہے، اور اگر سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سامنے رکھ کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے، جیسا کہ پہلے اس کی متعدد مواضع میں نظائر گزر چکیں۔ [تفسیر عثمانی]

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ
اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ښ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝ وَ

اِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۞

ترجمہ: اور یقیناً ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے، اور ہم نے ان کو بیویاں دیں، اور ذریت بھی، اور کسی رسول کو یہ قدرت نہیں حاصل کہ اپنی طرف سے کوئی آیت لے آئے، اِلَّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہو ہر زمانے کے لئے لکھے ہوئے احکام ہیں ۳۸ اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے جو چاہتا ہے، اور ثابت رکھتا ہے جو چاہتا ہے، اور اس کے پاس اصل کتاب ہے ۳۹ اور اگر ہم آپ کو بعض وہ وعدے دکھا دیں جو وعدے ہم ان سے کر رہے ہیں، یا ہم آپ کو اٹھالیں تو بس آپ کے ذمہ پہنچا دینا ہے، اور ہمارے ذمہ حساب لینا ہے ۴۰

معارف ومنازل

پیغمبروں علیہم السلام کیلئے بیویاں اور اولاد ہوتی تھیں:

روح المعانی ودیگر تفسیروں میں لکھا ہے کہ یہودیوں نے آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض کیا کہ ان کی تو بہت سی بیویاں ہیں، جو شخص پیغمبر ہو اسے نبوت کے کاموں سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ بہت سی بیویاں رکھے؟ اور پھر اتنی بیویاں رکھنا بادشاہوں اور قومی سرداروں اور دنیا پرستوں کی شان ہے، اور اتنی بیویوں کے ضروری حقوق بھی ہیں جنہیں پورا کرنا کسی کے بس میں نہیں، وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے جواب میں تو ان سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آپ سے پہلے ہم نے دنیا میں رسول بھیجے ہیں، اور ان کو ہم نے بہت سی بیویاں دی تھیں، اور بیویاں ہی نہیں ان کی اولاد بھی تھی، بیویوں کا زیادہ ہونا اور صاحب اولاد ہونا یہ چیز نہ نبوت کے خلاف ہے، نہ کارہائے نبوت سے معارض ہے۔ یہودیوں کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے بارے میں علم تھا کہ ان کی بہت سی بیویاں تھیں۔ تفسیر خازن میں حضرت داؤد علیہ السلام کی بیویوں کی تعداد ایک سو لکھی گئی ہے، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں کی تعداد تین سو لکھی گئی ہے، اور ان کے علاوہ باندیوں کی تعداد سات سو لکھی ہے، حالانکہ یہودی ان کے بارے میں نبی ہونے کا عقیدہ بھی رکھتے تھے، پھر بھی انہوں نے بطور عناد اعتراض کیا، اور کثرت ازواج کو مرتبہ نبوت کے خلاف کہا۔

اس سے مشرکین کو بھی دین اسلام سے روکنا مقصود تھا، اور خود اپنے لئے کفر پر جمے رہنے کا بھی ایک بہانہ تلاش کرلیا۔ قرآن مجید نے اس انداز سے ان کا جواب دے دیا کہ آئندہ جو بھی کوئی شخص ایسا جاہلانہ اعتراض کرے

اپنے اعتراض کا مسکت جواب پالے۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے قول سے بھی تعلیم دینی تھی اور عمل سے بھی، اس لئے انسانوں کی طرف انسانوں کو نبی بنا کر بھیجا گیا تاکہ وہ اپنے قول وعمل کے ذریعہ لوگوں کو تعلیم دیں، اور ان کی اصلاح و تزکیہ کریں۔ نکاح کرنا ہر انسان کی ضرورت کی چیز ہے، اور یہ نسل انسانی کی بقاء اور ترقی کا ذریعہ ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنتوں اور مخصوص اعمال میں چار چیزوں کی بڑی اہمیت ہے:

(۱) نکاح (۲) حیا (۳) خوشبو کا استعمال (۴) مسواک۔ جب نکاح ہوگا تو اولاد بھی ہوگی، بیویوں کے حقوق کو پورا کرنا، اور اولاد کی تربیت کرنا، یہ سب باتیں قولاً، عملاً، فعلاً کرنے اور بتانے اور سمجھانے سے متعلق ہیں۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اگر مجرد غیر شادی شدہ ہوتے تو ان کی امتیں ازدواجی زندگی کے طریقے کس طرح سیکھتیں؟ یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ ہو کر امتوں کے لئے مشکلات پیدا کرتا۔ پھر سرور عالم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو آخری رسول ہیں، وہ سارے انسانوں کے نبی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہیں، خانگی حالات اور عورتوں کے مسائل جاننے کی امت مسلمہ کو نہایت ضرورت تھی، جبکہ ان مسائل کو امت کی عورتوں تک پہنچانے کے لئے ایک دو بیویوں کے ذریعہ ہرگز ممکن نہیں، تو کثرت ازواج کا فائدہ یہی لازمی ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے ذریعہ ازدواجی مسائل کی تبلیغ نہایت اہتمام کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہی وجہ ہے کہ کتب حدیث میں ان کی روایات بکثرت موجود ہیں۔

اور یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ دلائل اور معجزات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی صداقت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رسول برحق ہونا ثابت و معلوم ہوگیا تو اس پر (کثرت ازواج کا) اعتراض بے معنیٰ ہے، کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کسی ایسی چیز کا ارتکاب کبھی نہیں کر سکتے جس کی اللہ تعالیٰ نے انہیں اجازت نہ دی ہو۔

﴿وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اور کسی رسول کو یہ قدرت حاصل نہیں کہ کوئی آیت و معجزہ لے آئے، اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہو۔ اس میں لفظ "آیت" کے بارے میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ اس سے معجزہ مراد ہے، اور مطلب یہ ہے کہ طرح طرح کے معجزات کی جو معاندین فرمائشیں کرتے ہیں ان معجزات کا اظہار کرنا نبی کی قدرت اور دسترس میں نہیں ہے۔ ہاں! جہاں اللہ تعالیٰ کا اذن ہو تو معجزہ ظاہر ہوسکتا ہے معجزہ کی تخلیق اور اظہار اسی کے قبضے میں ہے، اگر کسی نبی سے لوگوں نے فرمائشی معجزہ طلب کیا اور وہ پیش نہ کرسکا تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ

اللہ تعالیٰ کا نبی نہیں، جو دلائل پیش کئے جا چکے اور وہ دیگر معجزات جو ظاہر ہو چکے ان کے ہوتے ہوئے فرمائشی معجزات طلب کرنا محض ضد اور عناد تھا ایمان لانا مقصود ہرگز نہ تھا، اور اللہ تعالیٰ کے نبی کی تصدیق نہ کرنا یہ کفر ہے، کوئی نبی بے دلیل اور بے معجزہ نہیں گزرا، اور لوگوں کے فرمائشی معجزات کے اظہار کا اللہ تعالیٰ پابند نہیں۔

بعض مفسرین نے لفظ "آیت" سے احکام مراد لئے ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ یہ جو کہتے ہو کہ احکام میں نسخ کیوں ہوا؟ پہلی امتوں کے جو احکام تھے وہ پورے کے پورے اس امت کے لئے باقی کیوں نہیں رکھے گئے؟ یا اس امت کے لئے جو احکام جاری کئے گئے تھے ان کو بعد میں کیوں منسوخ کیا گیا؟ اور ان کی جگہ دوسرا حکم کیوں آیا؟ یہ جاہلانہ اعتراض ہے، اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی اپنے پاس سے کوئی حکم نہیں لا سکتا، اور اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصلحت کے موافق احکام جاری فرما دیتا ہے، پھر حکمت کے موافق منسوخ فرما دیتا ہے، نبی کو کوئی اختیار نہیں کہ اپنے پاس سے بدل دے یا منسوخ کر دے۔

مخالفین جو یہ چاہتے ہیں کہ نبی ہماری مرضی کے مطابق معجزہ لائے یا حکم لائے یہ سفاہت اور ضلالت ہے، اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے، اس کو کسی کے ایمان لانے نہ لانے کی کوئی پرواہ نہیں اور نہ ہی ضرورت۔ ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ﴾ [الأنعام:۹۱] (اور انہوں نے اللہ کی صحیح قدر نہیں پہچانی)۔ ان عقل کے اندھوں نے اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اندازہ نہیں لگایا، اور خود کو بھی نہیں پہچانا کہ ہماری حیثیت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر سے بھی کم ہے، اس کے باوجود وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہر بے جا فرمائش کو پوری فرمائے۔

یہ ان کی بھول ہے، ربّ العزّت سبحانہ وہ ذات عالی صفات ہے کہ اولوالعزم جلیل القدر پیغمبر کی بے جا خواہش کو بھی پورا کرنے کا پابند نہیں، فرمایا: ﴿یٰنُوۡحُ اِنَّهٗ لَیۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیۡرُ صَالِحٍ ۫ فَلَا تَسۡـَٔلۡنِ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنِّیۡۤ اَعِظُكَ اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِیۡنَ﴾ [ھود:۴۹] (اے نوح! یقیناً وہ تمہارے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ناپاک عمل کا پلندہ ہے، لہٰذا مجھ سے ایسی چیز نہ مانگو جس کی تمہیں خبر نہیں، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادانوں میں شامل نہ ہو)۔

ہاں! وہ الگ بات ہے کہ وہ رحمٰن و رحیم بڑا ہے، وہ اگر چاہے تو اپنے ایک ادنیٰ مسلمان بندے کی الحاح و زاری کو قبولیت کے عظیم شرف سے نوازے، اس کی رحمتِ کاملہ ساری رات بندوں کے دروازوں پر دستک دیتی ہے کہ ہے کوئی مانگنے والا، میں اسے ہر چیز دینے کے لئے تیار آمادہ ہوں، صبح تک یہ پیش کش مسلسل جاری رہتی ہے۔

سبحان اللہ

﴿لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ﴾ ہر زمانے کے لئے لکھے ہوئے احکام ہیں، یعنی گزشتہ امتوں کو جو احکام دیئے گئے وہ بھی اس زمانہ کے لحاظ سے حکمت کے مطابق تھے، اور ان کے احوال کے مناسب تھے، اور اب جو اس آخری امت کو احکام دیئے جا رہے ہیں یہ بھی حکمت کے مطابق ہیں، اور ان کے حالات کے مناسب ہیں۔

اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اسی کے مطابق محو و اثبات فرماتا ہے:

فرمایا: ﴿یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَیُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَہٗٓ اُمُّ الْکِتٰبِ﴾ اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے جو چاہتا ہے، اور ثابت رکھتا ہے جو چاہتا ہے، اور اس کے پاس اصل کتاب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جن احکام کو چاہتا ہے منسوخ فرما دیتا ہے، اور جن احکام کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے، منسوخ نہیں فرماتا۔ یہ مضمون ﴿لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ﴾ کی ایک تفسیر کے موافق ہے۔

صاحب معالم التنزیل اور مظہری و ابن کثیر نے حضرت سعید بن جبیر اور حضرت قتادہؒ سے بھی یہ تفسیر نقل کی ہے۔ اور صاحب روح المعانی نے حضرت عکرمہؒ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ توبہ کی وجہ سے بندوں کے تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے، اور ان کے بدلے نیکیاں لکھ دیتا ہے، یعنی محو گناہوں کا اور اثبات نیکیوں کا اور حضرت ابن عباسؓ اور ضحاکؒ سے نقل کیا ہے کہ جو فرشتے بنی آدم کے اعمال لکھنے پر مامور ہیں وہ تو حسبِ حکم ہر قول اور ہر فعل کو لکھتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ شانہ نیکیوں اور برائیوں کو ثابت رکھتا ہے، اور جو اعمال نیکی یا برائی کے دائرہ میں نہیں آتے انہیں مٹا دیتا ہے۔

پھر حضرت حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ اس سے بنی آدم کی آجال یعنی زندگی کے اوقات مقررہ مراد ہیں، شب قدر میں ان لوگوں کی اجل دیوان اموات میں لکھ دی جاتی ہے جنہیں آئندہ سال کے اندر موت آنی ہے، اور زندوں کے دیوان سے ان کا نام مٹا دیا جاتا ہے۔ صاحب روح المعانی نے دیگر اقوال بھی نقل کئے ہیں جن کا آیت کے سیاق سے جوڑ نہیں بنتا۔ ان میں سے بعض ضعیف روایات پر بھی مبنی ہیں، اس لئے ہم نے انہیں ذکر نہیں کیا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ قدرتِ کاملہ کے موافق جس حکم کو چاہے منسوخ کرے، جسے چاہے باقی رکھے، جس قوم کو چاہے مٹا دے جسے چاہے اس کی جگہ جما دے، جن اسباب کی تاثیر چاہے بدل ڈالے جن کی چاہے نہ بدلے، جو وعدہ چاہے شرائط کی موجودگی میں ظاہر کرے جو چاہے شرائط کے نہ پائے جانے پر موقوف

کردے۔غرض ہر قسم کی تبدیل وتغییر، محواثبات نسخ واحکام اسی کے ہاتھ میں ہے۔قضاء وقدر کے تمام دفاتر اسی کے قبضے میں ہیں، اورسب تفصیلات ودفاتر کی جڑ جسے "ام الکتاب" کہنا چاہیے اسی کے پاس ہے۔یعنی "علم ازلی محیط" جو ہر قسم کے تبدل وتغیر سے قطعاً منزہ ومبرٰی اور لوح محفوظ کا ماخذ ہے۔

شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضح القرآن میں لکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر چیز اسباب سے ہے، بعضے اسباب ظاہر ہیں بعضے اسباب چھپے ہوئے ہیں، ہر سبب کی تاثیر کا ایک طبعی اندازہ ہے، جب اللہ تعالیٰ چاہے اس کی تاثیر اندازہ سے کم یا زیادہ کردے، جب چاہے ویسی ہی رکھے، آدمی کبھی کنکر سے مرتا ہے اور کبھی گولی سے بچتا ہے، اور ایک اندازہ ہر چیز کا اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے جو ہرگز نہیں بدلتا۔اندازے کو تقدیر کہتے ہیں۔یہ دو تقدیریں ہوئیں: ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی، جو تقدیر بدلتی ہے اس کو معلق، اور جو نہیں بدلتی اس کو مبرم کہتے ہیں۔[تفسير عثماني]

﴿وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ اور اس کے پاس اصل کتاب ہے۔یعنی لوح محفوظ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے تمام امور کلیات وجزئیات، انفرادی، اجتماعی، تکوینی، تشریعی، ازلی، ابدی، تقدیر معلق اور مبرم سب اس میں درج ہیں۔وہ سب کو جامع ہے، اس کتاب تک کسی پیغمبر اور کسی فرشتے کی پہنچ نہیں ہے، صرف مالک کائنات عز شانہ کا اس پر کنٹرول ہے۔

﴿وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ﴾ اگر ہم آپ کو بعض وہ وعدے دکھادیں جو وعدے ہم ان سے کررہے ہیں، یا ہم آپ کو اٹھالیں تو بس آپ کے ذمہ پہنچادینا ہے، اور ہمارے ذمہ حساب لینا ہے۔علماء تفسیر نے لکھا ہے کہ اس آیت کریمہ میں دو چیزوں کا ذکر ہے: اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں مشرکین پر عذاب کا آجانا، دوئم عذاب کے آنے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنیا سے اٹھالیا جانا۔

مطلب یہ ہے کہ عذاب کے جو وعدے ان سے کئے گئے ہیں ہم کو تو اختیار ہے کہ ان میں سے بعض آپ کے سامنے پورا کردیں، یا آپ کی وفات کے بعد ظاہر کریں۔نہ آپ کو ان کے ظہور کی فکر میں پڑنا چاہیے، اور نہ تاخیر و امہال دیکھ کر ان لوگوں کو بےفکر ہونا چاہیے۔اللہ تعالیٰ کے لئے ہر چیز آسان ہے، اور اس کے علم میں ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے، جس کے پہنچنے پر وہ ضرور واقع ہوکر رہے گی۔آپ اپنا فرض تبلیغ ادا کرتے رہیے، تکذیب کرنے والوں کا حساب ہم خود کردیں گے، نہ انہیں دنیا کے حساب سے خلاصی ہوگی، اور نہ آخرت کے حساب سے نجات ہوگی۔آپ مطمئن رہیے۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ نَنۡقُصُهَا مِنۡ اَطۡرَافِهَا ؕ وَاللّٰهُ یَحۡكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكۡمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِیۡعُ
الۡحِسَابِ ﴿۴۱﴾ وَقَدۡ مَكَرَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَلِلّٰهِ الۡمَكۡرُ جَمِیۡعًا ؕ یَعۡلَمُ مَا تَكۡسِبُ كُلُّ نَفۡسٍ ؕ
وَسَیَعۡلَمُ الۡكُفّٰرُ لِمَنۡ عُقۡبَی الدَّارِ ﴿۴۲﴾ وَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لَسۡتَ مُرۡسَلًا ؕ قُلۡ كَفٰی بِاللّٰهِ
شَهِیۡدًۢا بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَكُمۡ ۙ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ الۡكِتٰبِ ﴿۴۳﴾

ترجمہ: کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو اس کے اطراف سے کم کرتے چلے آرہے ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے، اس کے حکم کو کوئی ہٹانے والا نہیں، اور وہ جلد حساب لینے والا ہے ﴿۴۱﴾ اور جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے مکر کیا، سو اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اصل تدبیر، ہر شخص جو عمل کرتا ہے اسے وہ جانتا ہے، اور کافر عنقریب جان لیں گے کہ بعد میں آنے والے گھر کا اچھا انجام کس کے لئے ہے ﴿۴۲﴾ اور جنہوں نے کفر کیا انہوں نے کہا کہ تم پیغمبر نہیں ہو، آپ فرما دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے، اور وہ لوگ کافی ہیں جن کے پاس کتاب کا علم ہے ﴿۴۳﴾

معارف ومنازل

﴿اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا نَاۡتِی الۡاَرۡضَ﴾ کیا مشرکین نے نہیں دیکھا کہ ہم ان کی زمین کو جہاں ان کا اقتدار و عملداری ہے اس کے اطراف سے کم کرتے چلے آرہے ہیں؟ روز روز اسلام پھیل رہا ہے، قبائل اسلام میں داخل ہورہے ہیں، اور ان کی زمین پر اہل ایمان کا قبضہ ہو رہا ہے، اور قبائل کے جو لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں ان کا علاقہ مسلمانوں کی عملداری میں داخل ہو جاتا ہے۔ جو لوگ مجبور اور مظلوم تھے انہیں زمین کا اقتدار ملتا جا رہا ہے، اور ظالم اقتدار سے آہستہ آہستہ محروم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ یعنی اسلام آئے دن بڑھ رہا ہے، اور وہ لوگ اور ان کا اقتدار گھٹ رہا ہے۔ یہ ان کے لئے تازیانہ عبرت ہے، چاہیے کہ وہ اسلام قبول کر کے دونوں جہاں کی ذلت اور رسوائی سے بچ جائیں، ورنہ وہ نہ ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم اور بعض دیگر حضرات سے آیت کریمہ کی یہی تفسیر منقول ہے۔ اور کچھ لوگوں نے یہ مطلب لیا ہے کہ ہم زمین کے اطراف کو ویران اور اس کے رہنے والی گزشتہ

امتوں اور نافرمانوں کو ہلاک کرتے رہے ہیں، مشرکین مکہ کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ انہیں اس بات کا کیسے اطمینان ہو گیا کہ ان کے ساتھ ایسا نہ ہو گا؟ [معالم التنزیل] درحقیقت دونوں توجیہ صحیح ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ﴾ اور اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے، اس کے حکم کو کوئی ہٹانے والا نہیں۔ پوری دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی حق تعالیٰ شانہ کا کوئی جزوی یا کلّی حکم یا عذاب آیا ہے نہ کوئی اس کو ہٹا سکا ہے، نہ مداخلت کر سکا ہے۔ تمام کائنات کا پورا نظام اسی ذات واحد لاشریک کے ہاتھ میں ہے، کسی کی کیا مجال کہ وہ پر مار سکے؟ البتہ اگر وہ ایسا اقدام کرے تو وہ قادر وتوانا ہے جیسے کہ قوم یونس کے اوپر آنے والے عذاب کو ان کی توبہ اور ایمان لانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم اور رحمت سے ہٹا دیا۔

﴿وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ وہ جلد حساب لینے والا ہے۔

﴿وَقَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا﴾ اور جو لوگ پہلے کافر تھے انہوں نے ہر طرح کا مکر کیا، انہوں نے پیغمبروں علیہم السلام اور ان پر ایمان لانے والے مسلمانوں کو بہت ستایا، ان کے خلاف ناروا تدبیریں کیں، پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیروں کو ناکام بنا کر الٹا انہیں قربانی کا بکرا بنا کر نیست ونابود فرمایا۔

﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ الٹا ان کے مکر ان کے گلے پڑ گئے۔ قدرت کا یہ قانون اٹل بھی ہے، اور قیامت تک کے لئے بھی ہے کہ مکر باز آخر کار اپنے مکر کا ہدف بنے گا، ہلاک اور خوار وذلیل ہو جائے گا۔

﴿يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ﴾ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے عمل کو جانتا ہے، ان اعمال میں دشمنانِ دین کی مکاریاں اور بھونڈی تدبیریں بھی شامل ہیں، جن کی اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ اس مضمون کی تفصیل آنے والی سورۂ ابراہیم کے آخر میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

﴿وَسَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ اور عنقریب کفار جان لیں گے کہ آنے والے گھر کا اچھا انجام کس کے لئے ہے۔ یہ لوگ جب آخرت میں مؤمنوں کا انجام خیر اور کامیابی دیکھیں گے، اور خود ابدی عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ اچھا انجام کس کا ہوا؟

سرور عالم ﷺ کی رسالت پر خود اللہ تعالیٰ گواہ ہے:

﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا﴾ اور کافر کہتے ہیں کہ آپ پیغمبر نہیں ہیں۔

﴿قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ﴾ آپ فرما دیجئے: میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہونے کے

لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔

﴿وَ مَنۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ الۡکِتٰبِ﴾ اور وہ لوگ بھی گواہی کے لئے کافی ہیں جن کے پاس کتاب ہے، تم اگر نہ مانو تو تمہارے انکار سے میری نبوت پر کوئی فرق نہیں پڑتا، جس رب العٰلمین نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے وہ میری نبوت پر گواہ ہے، اور اصل گواہی اسی کی ہے، لہٰذا مجھے تمہارے انکار کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ نیز اہل کتاب کے علماء کی گواہی بھی میرے لئے کافی ہے جو اپنی کتابوں میں میری نبوت کی پیشین گوئی پڑھتے آئے ہیں، اور ان کے جذبہ انصاف نے انہیں مؤمن بنا دیا، انہوں نے میری تصدیق کی اور مجھ پر ایمان لے آئے۔

مطلب یہ ہے کہ اہل علم کی گواہی پر جاہلوں کے انکار کی کوئی حیثیت نہیں، اور حق تعالیٰ شانہ خالق و مالک کی گواہی کے بعد مخلوقات کا انکار مردود اور بے حیثیت ہے۔

سورۃ الرعد کی تفسیر الحمد للہ اپنے اختتام کو پہنچی۔

سُورَةُ اِبْرَاهِيمَ

مکیۃ آیاتھا ۵۲ رکوعاتھا ۷

سورۂ ابراہیم مکی ہے، اس میں باون (۵۲) آیتیں، اور سات (۷) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ ابراہیم ہے، یہ نام اس سورت کی آیت (۳۵) میں موجود ہے، اسی سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، ترتیبِ تلاوت میں یہ چودھویں سورت ہے، اور ترتیبِ نزول میں (۷۲) نمبر پر ہے، اس کا نزول سورۂ نوح کے بعد ہے۔

تعدادِ کلمات وحروف:

اس سورت کی آیات (۵۲)، رکوع (۷) ہیں، یہ (۸۴۵) کلمات، اور (۳۶۰۱) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

(۱) گزشتہ سورت کی طرح اس سورت میں بھی تینوں بنیادی مضامین توحید، رسالت، اور قیامت کا ذکر ہے۔

(۲) دونوں سورتوں کے آخر میں مشرکین کے مکر اور حیلوں کا بیان ہے۔

(۳) گزشتہ سورت میں نزولِ قرآن کا ذکر ہے، جبکہ اس سورت میں دلائل اور فوائد نزول قرآن کا بیان ہے

مثلاً: ﴿لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ [ابراھیم: ۱] (تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے روشنی کی

طرف نکالیں)۔

(۴) گزشتہ سورت میں قرآن کی عربیت کا ذکر تھا، اس میں بھی اسی کا بیان ہے۔

(۵) گزشتہ سورت میں تکوینی امور کا تذکرہ تھا، اس سورت میں بھی انہی کا بیان ہے۔

اسی طرح دونوں سورتوں میں فرمائشی معجزات کا تذکرہ بھی ہے، اور جوابات بھی۔

مختصر موضوع:

قرآن مجید کی حقانیت وصداقت اور نزول قرآن کے فوائد و برکات کا بیان ہے، حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی صداقت کا بیان، اسی طرح مختصراً و اجمالاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بیان، شجرۂ طیبہ، اسلام کے محاسن، اور شجر خبیثہ (کفر کے مفاسد) کا بیان، تذکیراتِ ثلاثہ کا بیان، اور ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانیوں اور آپ علیہ السلام کی ادعیہ ماثورہ کا تذکرہ، معاندین ومنکرین کی خباثتوں اور ان کے نتائج کا تذکرہ، کفار کے مکر وحیلوں اور ناکامیوں کا تذکرہ، اور ابلیس علیہ اللعنۃ کی ناپاک خیانتوں کے تذکرے کے ساتھ مسلمانوں کے اچھے اور کفار کے برے نتائج کا تذکرہ وبیان وغیرہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَيۡكَ لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ۙ بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ
اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ﴿۱﴾ اللّٰهِ الَّذِىۡ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَوَيۡلٌ
لِّلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِيۡدِ ۙ﴿۲﴾ الَّذِيۡنَ يَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا عَلَى الۡاٰخِرَةِ وَ
يَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَيَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا ؕ اُولٰٓئِكَ فِىۡ ضَلٰلٍ ۢ بَعِيۡدٍ ﴿۳﴾

ترجمہ: الٓرٰ۔ یہ کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی تاکہ لوگوں کو ان کے پروردگار کے حکم سے اندھیروں سے نور کی طرف نکالیں جو زبردست ہے خوبیوں والا ہے ① وہ اللہ تعالیٰ ہے جس کے لئے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے، اور کافروں کے لئے ہلاکت یعنی سخت عذاب ہے ② جو دنیاوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں، اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں، یہ لوگ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں ③

معارف ومنازل

حروف مقطعات پر تفصیلی کلام گزر چکا، وہاں دیکھا جائے۔ سورۂ رعد اور سورۂ ابراہیم دونوں کے شروعات حروف مقطعات، عظمت قرآن مجید، اور فرائض نبوت کے بیان کے ساتھ ہیں۔ قرآن مجید کی صداقت وحقانیت اور نبوت کی صداقت وحقانیت لازم وملزوم ہیں۔ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ یہاں ایک طرف سے قرآن مجید اور نبوت کی صداقت کا بیان ہے، دوسری طرف فرائضِ نبوت اور نزول قرآن کے فوائد وبرکات کا تذکرہ ہے کہ یہ عظیم الشان کتاب جس جلیل القدر رفیع الذکر ہستی پر اتری ہے، اس کے مقاصد یہ ہیں کہ یہ کتاب تمام روحانی بیماریوں کی مکمل علاج ہے۔

حضرت اقدس شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ "فیوض الحرمین" میں فرماتے ہیں کہ جب میں قرآن کریم کی کسی آیت کے متعلق مراقبہ کرتا ہوں تو مجھے اس کے نیچے حقائق ومعارف کے لامتناہی سمندر نظر آتے ہیں۔ یہ بات قابلِ تسلیم ہے، کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ کا نفس قدسی خود معارف کا سمندر ہی تو ہے۔

یہاں کتاب خبر ہے، مبتداء محذوف (ھذا) ہے۔ کتاب کا نکرہ ہونا اس کی عظمت کی نشانی ہے۔ ترجمہ یہ ہوگا یہ عظیم الشان کتاب جسے ہم نے آپ ﷺ کی طرف نازل کیا ہے، اس کی غرض وغایت یہ ہے:

﴿لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ تاکہ آپ ﷺ ان لوگوں کو جنہیں صدیوں سے روشنی کی کرن نظر نہیں آئی، اور جن کی عقل کا چراغ بجھ چکا ہے اور مسلسل اندھیریوں میں بھٹک رہے ہیں، آپ ﷺ انہیں اندھیریوں سے نکال کر ایمان ویقین کی روشنی تک لے آئیں۔ یہ کتاب روشن صحیفہ رحمت ہے، ہدایت کا نیر تابان ہے، جس کے مقدر میں غروب ہونا نہیں، آپ ﷺ صدیوں سے بھٹکنے والے انسانوں کو ظلمات سے یعنی شرک وکفر، نفاق، جہالت، اور جملہ معاصیوں اور ہر قسم کی برائیوں سے نکال کر ایمان، یقین، اخلاص، طہارت، نیکی، اور اطاعت کی روشنی کی طرف لے آئیں۔ ﴿هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ [الأعراف: ۲۰۳] (یہ تمہارے ربّ کی طرف سے بصیرت ہے)۔

روح، قلب، نظر، عقل، اور دل ودماغ کو ہر قسم کی اندھیریوں سے نکال کر حیوانیت وبہیمیت کی خباثتوں سے نکال کر انسانیت کے اعلیٰ مناصب واقدار تک پہنچا کر قربِ الٰہی اور سعادتِ دارین کا راستہ دکھاتی ہے۔ اسی سورت کی پانچویں آیت میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾

[ابراھیم: ۵] (اور اس میں شک نہیں کہ ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں (جن کی تعداد نو ہے) دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں)۔ قرآن کریم میں یہ آیت جس میں ظلمات سے نکال کر روشنی کی طرف لانے کا بیان ہے کُل سات مقامات پر مذکور ہے۔ بعض مقامات پر اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ بعض مقامات پر قرآن کریم کی طرف ہے۔ اور بعض مقامات پر سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے۔ مطلب و مراد ایک ہی ہے جیسا کہ معلوم ہے: ﴿بِاِذۡنِ رَبِّهِمۡ﴾ یہ ان کے پروردگار کے حکم سے ہے، یہ کسی نبی و پیغمبر، یا کسی دینی پیشوا کا ذاتی فعل نہیں۔

ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے:

یہ جو فرمایا کہ تم ان کو اپنے ربّ کے اذن یا اس کی توفیق سے اللہ تعالیٰ کے راستے پر لاؤ، تو اس میں دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی مبلغ خواہ نبی کیوں نہ ہو وہ راہ راست پیش کر دینے سے زیادہ کچھ نہیں ہے، اس کا انحصار سراسر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے اذن پر ہے، اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے تو وہ ہدایت پا سکتا ہے، ورنہ پیغمبر جیسا کامل مبلغ اپنی پوری محنت کے باوجود بھی اس کو ہدایت نہیں بخش سکتا۔

رہی اللہ تعالیٰ کی توفیق، تو اس کا قانون بالکل الگ ہے، جسے قرآن کریم میں مختلف مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی توفیق اسی کو ملتی ہے جو خود ہدایت کا طالب ہو، ضد و ہٹ دھرمی، اور تعصب سے پاک ہو، اپنے نفس کا بندہ اور خواہشات کا غلام نہ ہو، وہ کھلی آنکھوں سے دیکھے، کھلے کانوں سے سنے، صاف دماغ سے سوچے سمجھے، اور معقول بات کو بے لاگ طریقہ سے تسلیم کرے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات و حالات جو قرآن کریم اور حدیث کی مستند روایات کی روشنی میں ہمارے سامنے ہیں کہ جلیل القدر و اولوالعزم پیغمبروں علیہم السلام نے اپنے باپ، بیٹے، بیوی، چچا، اور دیگر رشتہ داروں پر بڑی بڑی محنتیں کیں، اور انہیں اسلامی رشتے میں منسلک کرنا چاہا، لیکن ان کو مسلمان نہ بنا سکے، اور اسلامی رشتے میں منسلک نہ کر سکے۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام اپنے والد آزر کو اور سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چچوں کو ہدایت نہ دے سکے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں یہ اعلان فرمایا: ﴿اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ﴾ [القصص: ۵۶] (آپ ہدایت نہیں دے سکتے جسے آپ پسند کریں، مگر اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہے)۔ پھر نور کا مصداق بتایا:

﴿اِلٰى صِرَاطِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ﴾ کہ آپ جو لوگوں اندھیروں سے نور کی طرف نکالتے ہیں، یہ نور عزیز حمید

یعنی اس ذات پاک کا راستہ ہے جو زبردست غالب ہے، اور مستحق ستائش اور حمد وثناء کا حقدار ہے، اس کے سوا کوئی مستحق حمد وستائش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفات ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ بھی ہے کہ غالب ومحمود اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلنے والا انسان گمراہ نہیں ہوتا، اور نامراد بھی نہیں ہوتا۔ پھر اس کی مالکیت کا بیان فرمایا:

﴿اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور کچھ زمین میں ہے وہ سب اس کی ملکیت ہے، وہی ان سب چیزوں کا مالک ہے اور خالق ومتصرف بھی ہے، تو جو کوئی اس کی خالقیت ومالکیت اور تصرف کا منکر ہوگا، وہ منحرف اور باغی شمار ہوگا۔ اس کے لئے یہ سخت وعید ہے۔

﴿وَوَیْلٌ لِّلْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدِ﴾ اور کافروں کے لئے ہلاکت اور عذاب شدید ہے، اب ایسے کافروں کی صفات رزیلہ کا بیان ہے:

﴿ الَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَةِ ﴾ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا والی زندگی کو پسند کرتے ہیں، اور آخرت کے مقابلہ میں اسے ترجیح دیتے ہیں، ان کا دنیا سے محبت کرنا اور آخرت کو نظر انداز کرنا اور کفر پر جمے رہنا یہ ان کی شقاوت کا باعث بنا ہوا ہے۔ ان کی دوسری صفت یہ ہے:

﴿وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں، نہ خود ایمان لاتے ہیں نہ دوسروں کو ایمان لانے دیتے ہیں۔ ان کی تیسری صفت یہ بیان فرمائی:

﴿وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کجی تلاش کرتے ہیں، عیب نکالتے ہیں، اور طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں، یہ حرکتیں اس لئے کرتے ہیں کہ وہ:

﴿اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ﴾ کہ یہ لوگ دور کی گمراہی میں ہیں، راہ حق کا ضد وعناد کے ساتھ انکار کر کے ہدایت سے بہت دور جاچکے ہیں، کبھی غلط فہمی کی وجہ سے جو گمراہی ہوتی ہے وہ نزدیکی کی گمراہی کہلاتی ہے، اس کے دور ہونے کے امکانات ہیں، مگر دور کی گمراہی ضد وعناد کی وجہ سے لاعلاج ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِیُبَیِّنَ لَهُمْ ؕ فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

ترجمہ: اور ہم نے جتنے بھی پیغمبر بھیجے وہ اپنی ہی قوم کی زبان بولنے والے تھے تا کہ وہ اپنی قوم کے لئے

بیان کریں، پھر اللہ تعالیٰ شانہ جسے چاہے گمراہ کرے اور جسے چاہے ہدایت دے، اور وہ غالب ہے حکمت والا ہے۞

معارف ومنازل

اس آیت میں ایک بہت اہم بنیادی بات بیان فرمائی، اور وہ یہ کہ ہم نے جتنے بھی رسول بھیجے ہیں وہ سب اپنی اپنی قوموں کی زبان میں ان سے بات کرتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے ان کی بیوی حضرت حوا علیہا السلام بھی تشریف لائیں، اور ان دونوں سے اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی بھاری تعداد میں مرد اور عورت پیدا فرمائے: ﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً﴾ [النساء: ۱] (اور ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتوں کو پھیلایا)۔

حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد بڑھتی رہی اور پھیلتی رہی، قبیلے بنتے رہے، مختلف زبانیں پیدا ہوتی چلی گئیں، یہ زبانوں اور شکل وصورتوں کا مختلف ہونا اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں۔ سورۂ روم میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ﴾ [الروم: ۲۲] (اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں کا اور زمین کا پیدا فرمانا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا، بے شک ان میں جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں)۔ اس وقت دنیا کی مردم شماری کی آبادی ساڑھے چھ ارب انسانوں پر مشتمل ہے، اور بارہ ہزار سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں، سب سے زیادہ زبانیں ہندوستان میں بولی جاتی ہیں جن کی تعداد چار سو تک ہے۔ واللہ اعلم

تمام کائنات علویات ہوں یا سفلیات، مادی اور فانی بے بقاء ہیں پھر ان کی پیدائش اصلی اور مقصودی نہیں، یہ صرف انسانوں کے فائدے کے لئے ہیں، اصلی مقصودی اور بنیادی سرمایہ ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ کی توحید و وحدانیت ہے، ساری کائنات کی تخلیق اسی نعمت عظمیٰ کے لئے ہے، اور اسی نعمت نامی گرامی کا نام ایمان باللہ ہے، تمام کائنات اس کی خادم ہے، اور یہ مخدوم اور یہ نعمت اللہ جل شانہ کی محبوب ترین پسندیدہ نعمت ہے، اسی کی آبیاری اور تحفظ وبقاء اور نشوونما کے لئے برگزیدہ جلیل القدر عظیم المرتبت انبیاء ورسل علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے، اور انہیں اس کی خدمت کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے۔

تو انبیاء کرام علیہم السلام کی قدر ومنزلت اسی توحید کی خاطر تمام مخلوقات سے زیادہ ہے، پھر جو لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں ان کا مقام بھی اسی توحید کے طفیل دیگر مخلوقات سے اونچا ہوتا ہے، جنہیں قرآن کریم

﴿خَيْرُ الْبَرِيَّةِ﴾ [البينة:٧] (مخلوق میں سے بہترین) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور جو لوگ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کو قبول نہیں کرتے اور توحید کی نعمت سے انحراف کرتے ہیں، قرآن کریم انہیں ﴿شَرُّ الْبَرِيَّةِ﴾ [البينة:٦] (مخلوق میں سے بدترین) کے نام سے یاد کرتا ہے، یہاں تک کہ ایک مؤمن موحد اللہ رب العزت سبحانہ کے نزدیک پورے جہاں کے کفار سے افضل قرار پاتا ہے۔ اربوں کفار ایک طرف، ایک ادنیٰ موحد مسلمان کے مقابلہ میں مچھر کے پَر کے برابر نہیں ہو سکتے۔

پس خوش قسمت اور کامیاب انسان وہ شخص ہے جس کا رشتہ خداوند قدوس کے ساتھ توحید کی برکت سے قائم ہے، یہ اتنی بڑی گرانقدر نعمت ہے کہ مشت خاک کو کائنات کے خالق و مالک کے ساتھ ملاتی ہے۔ زہے سعادت!

تو اللہ تعالیٰ سبحانہ عزّ مجدہٗ نے نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی جاری فرمایا، ہدایت دینے کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام اور رُسل عظام علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے مبعوث فرما کر اپنی مخلوقات پر بڑا احسان فرمایا کہ انہیں ان کا ہم زبان بنا دیا، اور لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا اور باری تعالیٰ سبحانہ کے احکام بیان کرنا، اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے سپرد فرمایا، تو ظاہر ہے کہ ہر پیغمبر کو وہی زبان بولنا ضروری ہوا جو زبان ان کے مخاطبین کی تھی، جس میں کسی ترجمان کی ضرورت بھی نہیں، اسی کو فرمایا:

﴿لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ تا کہ ہر پیغمبر اپنی امت کو اسی زبان میں توحید و ایمان کی بات سمجھائے جو اس کی امت اور نبی کی مشترکہ زبان ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہی ثابت ہوگا کہ پیغمبر اپنے مافی الضمیر کو بخوشی و بآسانی ادا فرمائے گا، اور لوگ باوجود اَن پڑھ و ناخواندہ ہونے کے پوری بات سمجھ پائیں گے، اور کسی بھی بات کے سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کریں گے، جس سے بخوبی افہام و تفہیم کا حق بھی ادا ہو جائے گا، اور بعثت انبیاء کرام علیہم السلام کا مقصد بھی پورا ہوگا۔

قوم سے یہ مراد ہے کہ نبی جس قوم کی طرف مبعوث ہوا۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ لسان قوم سے مراد ہے قوم کی بولی، اگر قوم کی زبان عربی ہوئی تو پیغمبر کی زبان بھی عربی ہوئی اور عربی ہی میں اس کو پیغام دیکر بھیجا گیا، اسی طرح سریانی کو سریانی زبان میں اور عبرانی کو عبرانی زبان میں، وغیرہ۔ [مظهري]

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام اقوام عالم کے لئے ہے:

سید الانبیاء خاتم الرسل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت انس و جن اور تا قیامت تمام اقوام عالم کے لئے

ہے، آپ ﷺ سے پہلے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے وہ کسی خاص قوم اور خاص علاقے کی طرف مبعوث ہوتے تھے، تمام انسانوں کی طرف ان کی بعثت نہیں ہوتی تھی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً"۔ [بخاري]

آپ ﷺ کی بعثت قیامت تک آنے والی تمام اقوام اور انسانوں کے لئے ہے، تمام جنات کے لئے تمام زبانوں کے لئے اور پورے عالم کے لئے ہے۔ چونکہ آپ ﷺ کے اولین مخاطبین اہل عرب ہی تھے اس لئے آپ ﷺ بھی اپنی قوم کی زبان میں خطاب فرماتے تھے، اور قرآن مجید بھی عربی زبان میں نازل ہوا، پھر عربی زبان جو کہ اُم الالسنہ ہے اس کی فصاحت وبلاغت اور لطافت ایسی ہے جو دوسری کسی زبان کی نہیں ہے، اور یہ فیصلہ حق بجانب اور مبنی برحقیقت ہے کہ جنت میں یہی جنتیوں کی زبان ہے۔

یہ زبان تمام زبانوں کی سردار ہے، اس کی خوبیوں کو گنا نہیں جاسکتا، پھر حضور پرنور سرور عالم ﷺ اور قرآن عظیم الشان کی نسبت نے اسے چار چاند لگا کر اس کی عظمت کو بے انتہاء بلند کیا۔ اب اس زبان نے ہم مسلمانوں کے ایمان کا جز بن کر ہمیں تمام اقوام عالم کی زبانوں سے مستغنی کردیا ہے۔ اسی میں قرآن، اور اسی میں احادیث واحکام ہیں، اسی میں اذان واقامت، اور اسی میں حج وعمرہ کا تلبیہ ہے، اسی میں نماز، اسی میں تسبیحات اور ذکر واذکار ہیں، اسی میں ادعیہ ماثورہ، اسی میں خطبہ جمعہ، خطبہ حج، وخطبہ عیدین، وغیرہ ہیں۔ یہ وہ حقائقِ حقہ وصادقہ ہیں جنہیں کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اور تمام دنیا کی نسبتیں اور عظمتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

اس کے الفاظ بھی دلکش، روح پرور اور بڑے لذیذ وسنجیدہ ہیں، اور لغات بھی گرانقدر ہیں۔ انگریزی زبان جس کو زور وزبردستی دنیا پر مسلط کیا گیا ہے عربی کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ البتہ فارسی زبان کو کچھ مختصر معمولی مناسبت عربی کے ساتھ حاصل ہے، اسی لئے خالق کائنات جل شانہ نے محمد عربی ﷺ کو ختم نبوت کا عالی منصب عنایت فرما کر پوری کائنات کا نبی بنایا، اور ساری خلقت کو قرآن عربی کا تابع بنادیا، اور پوری امت کی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک ہی جامع زبان میں آخری کتاب قرآن حکیم کا عربی زبان میں نازل ہونا ضروری ہوا۔

یہ کتاب اپنی لطافت، فصاحت وبلاغت اور معجزہ ہونے کے اعتبار سے عربی زبان ہونے کی وجہ سے مرکزی حیثیت حاصل کرچکی ہے۔ اگر ہر علاقے کے رہنے والوں کی زبان میں الگ کتاب اللہ ہوتی تو پوری امت کی مرکزیت اور وحدت کی صورت نہ بنتی، اور امت کا شیرازہ منتشر ہوکر ہزاروں اختلافات جنم لیتے۔

پھر جیسا کہ قرآن حکیم کے معانی ومطالب کا جاننا اور سمجھنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا مطلوب ہے، اسی طرح اس کے الفاظ کا یاد رکھنا، پڑھنا، پڑھانا، تلاوت کرنا بھی مطلوب ہے۔ یہی عربی زبان کی خصوصیت ہے کہ قرآن حکیم کے دنیا میں لاکھوں حافظ موجود ہیں، اگر دوسری کسی زبان میں قرآن کا نزول ہوتا تو اس کا حفظ اہل لسان کے لئے مشکل ہوتا، پھر دوسروں کا کیا کہنا۔ پھر ڈیڑھ ہزار سالہ عرصہ میں کوئی ایک نقطہ زیر وزبر کی کمی بیشی کا نہ ہونا یہ اسی زبان کا طغرہ امتیاز ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اسے یاد کر لیتے ہیں، جبکہ وہ اپنی مادری زبان کی کسی چھوٹی کتاب کے یاد کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ پھر قرأت سبعہ میں ادائیگی اور حروف کے مخارج صفات کی رعایت رکھنا اور پڑھنا یہ تمام عربی زبان کی خصوصیات ومزایا ہیں۔ وغیر ذلک من الخصائص۔

مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کی بعثت اس کی قوم کی زبان کے اعتبار سے ہے کہ اس نے قوم کو اسی زبان سے خطاب کیا جو ان کی مادری زبان تھی، باقی یہ بات کہ نبی کا قومی قبیلہ سے ہونا یہ ضروری نہیں، کیونکہ حضرت لوط علیہ السلام اپنی قوم کے قبیلے کے فرد نہیں تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ وحی کے متعلق نہیں، اگرچہ قیاس یہی چاہتا ہے کہ وحی کا نزول بھی اس قومی زبان میں ہو جو پیغمبر اور اس کی قوم کی قومی زبان ہے، مگر علماء کرام نے اس سلسلے میں یہ کہا ہے، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ پیغمبروں پر وحی تو صرف عربی میں نازل کی گئی، پھر ہر پیغمبر نے وحی کا ترجمہ اپنی قوم کی زبان میں کر دیا، سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا کہ قیامت کے دن سریانی زبان ہوگی، اور جنت میں جو لوگ جائیں گے وہ عربی میں کلام کریں گے۔ [مظهري]

ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے بواسطہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو عربی زبان میں وحی کی جاتی تھی، پھر جبریل علیہ السلام ہر نبی کے پاس اس کی قوم کی زبان میں وحی لے کر آتے تھے۔ [مظهري]

﴿فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ پس گمراہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، یعنی ایمان کی توفیق نہیں دیتا، اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، جب کوئی ہدایت طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت کی توفیق دے دیتا ہے، پس وہ ہدایت حاصل کرتا ہے۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ وہی غالب ہے، اس کی مشیت پر کوئی غالب نہیں جس کو ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، اور جس کو گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، اور وہی حکمت والا ہے اپنی حکمت ومصلحت

کے تحت ہدایت اور گمراہی کا فیصلہ کرتا ہے۔اور اس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں۔﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾[آل عمران:۸] (اے ہمارے ربّ! تو نے ہمیں جو ہدایت عطا فرمائی ہے اس کے بعد ہمارے دلوں میں ٹیڑھ پیدا نہ ہونے دے، اور خاص اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما۔ بیشک تیری اور صرف تیری ذات وہ ہے جو بے انتہا بخشش کی خوگر ہے)۔آمین

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ⑤ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ⑥

ترجمہ: اور اس میں شک نہیں کہ ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ، اور انہیں ایامِ الٰہیہ یاد دلاؤ، بیشک اس میں ہر ایسے شخص کے لئے نشانیاں ہیں جو خوب صبر کرنے والا ہے، خوب شکر کرنے والا ہے⑤ اور جبکہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ تم پر جو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں ان کو یاد کرو، جبکہ اس نے تمہیں آلِ فرعون سے نجات دی، وہ تمہیں بری طرح تکلیف پہنچاتے تھے، اور تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے لئے بڑا امتحان تھا⑥

معارف ومنازل

حضرت یوسف علیہ السلام کے بلانے پر حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے پورے خاندان کے ساتھ مصر پہنچے تھے، اس وقت ان کے خاندان کے افراد ستر (۷۰) افراد سے زائد نہ تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد یہ لوگ وہاں مصر میں رہے، مصر کا اقتدار دوبارہ قبطیوں کے پاس رہا۔ چونکہ بنی اسرائیلی لوگ باہر سے آ کر مصر میں آباد ہو گئے تھے، وہ مستقل مصر کے باشندے نہیں تھے، ان کی تہذیب، ثقافت اور مذہب مصریوں سے الگ تھا، اس لئے مصریوں نے ان کو اجنبیت کی پاداش میں بہت بری طرح رگڑا، چار سو (۴۰۰) سال سے زائد مدت تک انہیں غلام بنا رکھا، اور

ان کے مردوں اور عورتوں سے خدمت لیتے رہے۔ یہ بیچارے مصریوں کے ظلم وستم کی چکی میں پستے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، آپ علیہ السلام کی بعثت بنی اسرائیل اور قبطیوں دونوں کے لئے ہوئی، اس وقت بنی اسرائیلی چھ لاکھ کے لگ بھگ تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر راتوں رات مصر سے فلسطین روانہ ہوگئے، پیچھے سے فرعون ستر لاکھ کے لشکرِ جرار کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکلا کہ انہیں گرفتار کر کے واپس مصر لوٹا دے، اللہ تعالیٰ کی رحمت نے انہیں بسلامت بحر قلزم سے پار کر کے پیچھے سے اسی دریا میں فرعون کو بمع لشکر غرق کر دیا۔ تفصیل کئی بار گزر چکی ہے۔

اس غلامی کے دوران فرعون انہیں طرح طرح کے عذاب دیتا رہا، سب سے بڑا ظلم ان پر یہ ہوا کہ ان کے بیٹوں کو پیدائش کے ساتھ قتل کرواتا تھا، اور بچیوں کو اپنی باندی بنا کر زندہ رکھتا تھا، اس اثنا میں نوے (۹۰) ہزار کے قریب بچوں کو فرعونیوں نے ماؤں کے سامنے ذبح کیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام فلسطین پہنچے تو قوم نے مسلسل نافرمانی شروع کی، اس دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات جیسی کتاب کے نزول سے نوازا گیا۔ جس کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ﴾ یہاں لفظ آیات جو مذکور ہے اس سے مراد توریت شریف بھی ہوسکتی ہے کہ اس کے نازل کرنے کا مقصد ہی حق کی روشنی پھیلانا تھا، اور آیات کے دوسرے معنی معجزات کے بھی آتے ہیں۔ جیسے سورۂ اسراء میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسٰی تِسۡعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ﴾ [الاسراء:۱۰۱] (یقیناً ہم نے موسیٰ کو نو واضح نشانیاں دیں)۔ اس کی دو تفسیریں سورۂ اعراف میں بیان ہوئیں، اور آئندہ سورۂ اسراء میں بھی بیان ہوں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ایک نکتہ:

یہاں موسیٰ علیہ السلام سے کہا جا رہا ہے کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نور روشنی کی طرف نکالو، جبکہ اسی سورت کی پہلی آیت میں حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوا کہ: ﴿لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ﴾ وہاں لفظ "النّاس" مذکور ہوا۔ اس میں اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت مخصوص قوم بنی اسرائیل کے لئے تھی، اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تمام لوگوں اور قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لئے ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَاَرۡسَلۡنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوۡلًا﴾ [النساء: ۷۹] (اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے)۔ اسی طرح: ﴿قُلۡ یٰۤاَیُّهَا

النَّاسُ اِنِّيۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَا﴾[الأعراف:۱۵۸] (کہہ دیں: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں)۔﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ﴾[سباء:۲۸] (ہم نے آپ کو نہیں بھیجا ہے مگر تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا)۔

﴿وَذَكِّرۡهُمۡ بِاَيّٰٮمِ اللّٰهِ﴾ اپنی قوم کو اَیَّامِ اللہ یاد دلاؤ، لفظ اَیَّامِ اللہ دو معنی کے لئے بولا جاتا ہے، اور یہاں دونوں مراد ہوسکتے ہیں: اول وہ خاص ایام جن میں کوئی جنگ یا انقلاب یا خاص بڑا واقعہ پیش آیا ہے جیسے بعثت کا واقعہ، غزوۂ بدر، اُحد، اَحزاب، فتح مکہ وغیرہ۔ یا پچھلی امتوں پر عذاب نازل ہونے کے واقعات جن میں بڑی بڑی قومیں تباہ و برباد ہوگئیں۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ یہ واقعات عجیبہ سن کر عبرت حاصل کریں، اور اپنے اعمال کی اصلاح کے درپے ہوں۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات، احسانات اور نعمتیں انہیں یاد دلائیں تاکہ شکر کریں، کیونکہ شریف انسان کو جب محسن کے انعامات کی یاددہانی کرائی جائے تو وہ بیوفائی اور نافرمانی سے شرماتا ہے۔ ایام اللہ سے مراد حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ یہ لیتے ہیں کہ دنیا میں قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں، اس جہانِ رنگ و بو میں کیسے کیسے اچھے اور برے لوگ آئے، اور کیسے گئے ختم ہوگئے، کیا کیا اچھے برے نقوش و آثار چھوڑ گئے، انہیں یاد کر کے عبرت حاصل کریں۔

﴿اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوۡرٍ﴾ ایمان کے دو ہی بڑے بڑے ستون ہیں۔ قدم قدم پر صبر و شکر کرنا، جو شخص انہیں اپنائے گا کبھی خوار نہیں ہوگا۔ دراصل یہ دونوں صبر و شکر انبیاء کرام علیہم السلام کی صفات حمیدہ ہیں۔ دیکھیئے بنی اسرائیلیوں کے عظیم پیغمبر یوسف صدیق علیہ السلام تاریخی بے مثال صبر کے نتیجے میں کہاں سے کہاں پہنچے، اور سیدنا داؤد، سیدنا سلیمان علیہما السلام نبوت و بادشاہت کے وہ روشن چراغ تھے، جنہوں نے صبر و شکر کی بدولت اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے درجات حاصل کئے، اور خصوصی مقامات پر فائز ہوئے۔

شجرہ طیبہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا:

وہ مبارک شجرہ طیبہ جس نے درخت طوبیٰ کی طرح وہ مقامِ عالی حاصل کیا جو اوّلین و آخرین میں شاید کسی نے پایا ہو، بیوہ ہو کر صبر کیا، مالدار ہو کر شکر کیا، نتیجہ میں بہت بڑا مقام حاصل کیا کہ کبر سنی کے باوجود دونوں جہاں کے سردار کی زوجیت اور رفاقت دارین پائی، آپ رضی اللہ عنہا سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام بچوں

کی ماں بن گئیں۔ نبوت پر سب سے پہلے ایمان لائیں، شروع کے ناگفتہ بہ حالات اور بے شمار تکالیف کے دور میں بے مثال خدمات انجام دیں، ہمدردیوں کا ریکارڈ قائم کر کے دنیا ہی میں جنت کی خوشخبریاں حاصل کیں، جب تک زندہ رہیں تو آپ ﷺ کی مونس وغمخوار رہیں، اپنا پورا سرمایہ آپ ﷺ کے قدموں پر ڈال کر تاریخی کارنامہ انجام دیا۔

آپ ﷺ کی موجودگی میں سرورِ کونین ﷺ کو کسی دوسری رفیقہ حیات کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، جب آپ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو اس سال کا نام عام الحزن رکھا گیا۔ کفار نے جو طنز وطعنہ دیا تھا اور کہا تھا کہ محمد (ﷺ) کی نسل ختم ہوگئی وہ ابتر ہو گئے، جبکہ آپ ﷺ کو ایک طرف سے ربّ العزّت نے روحانی اولادوں کے ذریعہ کامیاب بنا دیا۔ دوسری طرف انہی صابرہ وشاکرہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی سب سے چھوٹی بیٹی فاطمۃ الزہرہ اُلبتول رضی اللہ عنہا کے ذریعہ آپ ﷺ کی نسل کو قائم فرمایا۔ اس پر سرورِ عالم ﷺ نے فخریہ اور تحدیث نعمت کے طور پر بیان فرمایا۔

طبرانی، حاکم، بیہقی، نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ، اور طبرانی نے حضرت ابن عباس اور مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہم کی روایت سے بیان کیا ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن میرے نسب اور رشتۂ زوجیت کے علاوہ ہر نسب اور رشتہ زوجیت ٹوٹ جائے گا۔ حافظ ابن عساکر نے صحیح سند سے اسی حدیث کو انہی الفاظ کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا، فرمایا: ہر نسب اور رشتۂ زوجیت علاوہ میرے نسب اور رشتہ زوجیت کے منقطع ہو جائے گا۔ [مظهري، سورة رعد]

مطلب یہ ہے کہ صبر وشکر دونوں کا شمار ایمان کے بڑے ستونوں میں ہے، اگر مسلمان ان دونوں پر کاربند رہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہر طرف سے کامیابی اس کے قدموں پر نچھاور نہ ہو، اور سعادت اسے حاصل نہ ہو۔

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جو تم پر انعام فرمایا اسے یاد کرو، یعنی فرمانبردار بن کر ان نعمتوں کا شکرادا کرو کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری کمزوری کے باوجود فرعون جیسے طاقتور ظالم وجابر سخت گیر دشمن سے نجات دی۔

فرعون اور اس کے متعلقین اور اس کے بھائی چارہ کے لوگ اور سپاہی تمہارے اوپر مسلط تھے، وہ تمہارے

بیٹوں کو پیدا ہوتے ہی ماؤں کی گود میں بیدردی سے ذبح کرتے تھے، اور لڑکیوں کو اپنی خدمت کے لئے زندہ رہنے دیتے تھے، اور تم سے شب وروز زبردستی بیگاری خدمت لیتے تھے۔ یہ سب کچھ قوم کو معلوم تھا، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یاددہانی کرائی تاکہ یہ لوگ شکرگزار بنیں اور اطاعت پر آمادہ ہوجائیں۔

﴿وَفِيْ ذٰلِكُمْ﴾ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ سب کچھ تمہارے ربّ کی طرف سے تمہارا امتحان تھا۔

﴿بَلَاۗءٌ﴾ سے مراد آزمائش اور امتحان ہے، اب تمہیں چاہیے کہ تم بیک زبان وارادہ شکر کرو۔ اب شکر کا بیان ہورہا ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ⑦
وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ⑧

ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جب تمہارے ربّ نے تم کو مطلع فرمادیا کہ اگر تم شکر کروگے تو تم کو اور زیادہ دوں گا، اور اگر تم ناشکری کروگے تو بلاشبہ میرا عذاب سخت ہے ⑦ اور موسیٰ نے کہا کہ اگر تم اور وہ سب لوگ جو زمین میں ہیں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے، مستحق حمد وثنا اور ستودہ صفات ہے ⑧

معارف ومنازل

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ﴾ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقولہ ہے، جس میں انہوں نے اپنی قوم سے کہا ہے۔ لیکن اکثر مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام بندوں کے لئے اعلان عام ہے، اور قانونی ضابطہ ہے، اور اطلاع عام ہے، گویا فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے صبر وشکر سے بے نیاز ہے، اس میں سراسر تمہارا فائدہ اور منفعت ہے، اگر تم شکر کروگے تو تم زیادہ پاؤگے، اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے تمہارے شکر کا پھل تمہیں ہر حال میں ملے گا، اور زیادہ ملے گا، اگر تم شکر نہیں کروگے تو سب کچھ کھوبیٹھوگے، اللہ تعالیٰ کی رضا سے بھی محروم رہوگے اور زیادتی بجائے خود اصل نعمت سلب ہوکر عذاب شدید میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ مول لوگے، کیونکہ منعمِ حقیقی کی نعمتوں کا شکر فرض ہے، اور ناشکری سراسر حرام ہے، اور حرام کا مرتکب مجرم ہے، اور جرم کی سزا شدید ہے، جوکہ سلب نعمت ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مؤمن کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کا حسب استطاعت شکر گزار ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ صبر نصف ایمان ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن کا ہر حال خیر ہی خیر بھلائی ہی بھلائی ہے، اور یہ بات سوائے مؤمن کے اور کسی کو نصیب نہیں، کیونکہ مؤمن کو اگر کوئی راحت ونعمت یا عزت ملتی ہے تو وہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوتا ہے جو اس کے لئے دین ودنیا میں خیر اور بھلائی کا سامان ہوجاتا ہے (دنیا میں تو حسب وعدہ الٰہی نعمت میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور نعمت قائم رہتی ہے، اور آخرت میں اس کے شکر کا بڑا اجر عظیم اس کو ملتا ہے)۔

اور مؤمن کو اگر کوئی تکلیف یا مصیبت پیش آجائے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے، اس کے صبر کی وجہ سے وہ مصیبت بھی اس کے لئے نعمت وراحت کا سامان ہوجاتی ہے۔ دنیا میں اس طرح کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے، قرآن کریم نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [البقرة: ۱۵۳] (بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ اور اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ ہو، انجام کار اس کی مصیبت راحت میں تبدیل ہوجاتی ہے، اور آخرت میں اس طرح کہ صبر کا اجر عظیم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حساب ہے، جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ۱۰] (صبر کرنے والوں کو ان کا ثواب بے حساب دیا جائے گا)۔ [مسلم ومسند أحمد]

خلاصہ یہ ہے کہ مؤمن کا کوئی حال برا نہیں ہوتا، اچھا ہی اچھا ہے، وہ گرنے میں بھی ابھرتا ہے، اور بگڑنے میں بھی بنتا ہے، ہر کام میں نفع پاتا ہے۔

نہ شوخی چل سکی باد صبا کی ☆ بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی

ایمان بہت بڑی دولت ہے، سارا جہاں ایک مؤمن کے ایمان کی قیمت نہیں بن سکتا۔ آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ ایمان ہر مصیبت وتکلیف کو راحت ونعمت کے ساتھ تبدیل کر لیتا ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: میں آپ کے بعد ایک ایسی امت کو پیدا کرنے والا ہوں کہ اگر ان کی دلی مراد پوری ہو اور کام حسب منشا ہوجائے تو وہ شکر ادا کریں گے، اور اگر ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ناگوار اور ناپسندیدہ صورت حال پیش آجائے تو وہ اس کو ذریعہ ثواب سمجھ کر صبر کریں گے، اور یہ دانشمندی وبردباری ان کی اپنی ذاتی عقل وحلم کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہم ان کو اپنے علم وحلم کا ایک حصہ عطا کردیں گے۔

[مظهري بحواله شعب الإيمان للبيهقي]

صبر کی اقسام اور درجات:

صبر کی مختلف اقسام ہیں، یا یوں کہیے کہ ان اشیاء کی نسبت کے لحاظ سے جن کی جانب "صبر" کو منسوب کیا جاتا ہے وہ مختلف ناموں سے منسوب وموسوم ہیں۔

پس اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہشات کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "عفت" ہے۔ اور اگر مصائب پر صبر ہے تو اس کو "صبر" ہی کہتے ہیں، اور اس کی ضد کا نام "جزع فزع" ہے۔ اور اگر ثروت ودولت کی بہتات کی حالت میں صبر ہے تو اس کا نام "ضبطِ نفس" ہے، اور اس کی ضد کو "بطر" کہتے ہیں، یعنی غرور دکھاوا۔ اور اگر میدان جنگ اور اسی قسم کے مہلک حالات پر صبر ہے تو اس کو "شجاعت" کہتے ہیں، اور اس کی ضد کا نام "جبن" و بزدلی ہے۔ اور اگر غیظ و غضب کے حالات پر صبر ہے تو اس کو "حلم" کہتے ہیں اور اس کی ضد کو "تذمر" کہتے ہیں، یعنی بے قابو ہونا۔ اور اگر حوادثات زمانہ پر صبر ہے تو اس کا نام "وسعت صدر" ہے یعنی کشادہ دلی، حوصلہ مندی، اور اس کی مخالف صفت کو "ضجر" کہتے ہیں یعنی تنگ دلی۔ اگر دوسروں کے پوشیدہ رازوں پر صبر ہے تو اس کو "کتمان سر" یعنی پردہ پوشی کہتے ہیں، اور اس کی ضد "ہتک" ہے۔ اور اگر معیشت وقدر کفاف پر صبر ہے تو اس کو "قناعت" کہتے ہیں، اور اگر ہر قسم کی عیش پرستی کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "زہد" ہے۔

سبحان اللہ! صبر کے تمام مدارج پر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام فائز رہے، گویا کہ ان کی زندگی صبر ہی سے تعبیر ہے۔ ان کے بعد ان کے متبعین اور علماء وصلحا، اور زہاد نے اس میدان میں تاریخی نقوش رقم کئے۔ کیوں نہیں، جو لوگ دنیا کو طلاق دے چکے، اور پروردگار جل شانہ کی غلامی کا طوق اپنے گلوں کی زینت بنا چکے، ایک لمحہ خداوند قدوس سے غافل نہیں ہوئے "دست بکار دل بیار" کی زندگی گزاری، وہ ہمارے لئے ہر میدان میں قابلِ تقلید رہے۔

اللہ تعالیٰ شانہ کی محبت جب قلب ودماغ کا حصہ بن جاتی ہے تو سڑی ہوئی مٹی کی پیداوار کا عروج عرش تک پرواز کرتا ہے، اور حظیرۃ القدس کا ممبر بن جاتا ہے، اور نورانی فرشتوں سے اس کی پرواز گزر کر ایک مقام تک پہنچتی ہے، جہاں عرش عظیم کی تجلی اعظم اس کو اپنے لپیٹ میں لے لیتی ہے، پس وہ قرب باری تعالیٰ میں پہنچ کر جو خواہش کرتا ہے اس کی اجابت میں دیر نہیں لگتی ہے۔

☆☆☆

حکایت:

ایک شخص ملا طاہر لاہوری تھے، حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے صاحبزادگان حضرت محمد سعید اور حضرت محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہما دونوں کے معلم تھے۔ حضرت مجدد قدس سرہٗ نے بنظر کشف ملاحظہ فرمایا کہ ملا طاہر کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے: "ملا طاہر شقی"۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ذکر اپنے لڑکوں سے کر دیا، صاحبزادگان تو ملا طاہر کے شاگرد تھے ہی، اس لئے انہوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس شقاوت کو مٹا کر سعادت سے بدل دے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: میں نے لوح محفوظ میں لکھا دیکھا ہے کہ یہ "قضاء مبرم" ہے جس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ لڑکوں نے دعاء کرنے کے لئے اصرار کیا، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مجھے یاد آیا کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ نے فرمایا تھا کہ میری دعا سے قضاء مبرم بھی بدل جاتی ہے، اس لئے میں دعا کرتا ہوں اور بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہوں: اے اللہ ربّ العٰلمین! تیری رحمت وسیع ہے، تیرا فضل کسی ایک پر ختم نہیں ہو جاتا، میں تجھ سے امید کرتا ہوں اور تیرے ہمہ گیر فضل سے درخواست کرتا ہوں کہ میری دعا قبول فرمالے اور ملا طاہر کی پیشانی سے شقاوت کی تحریر مٹا کر اس کی جگہ سعادت کے نقوش ثبت کر دے، جیسے تو نے میرے آقا (حضرت جیلانی رحمۃ اللہ علیہ) کی دعا قبول فرمائی تھی۔ پھر حضرت مجدد قدس سرہٗ کا بیان ہے کہ اس دعاء کے بعد وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ گویا میری نظر کے سامنے لفظ شقی ملا طاہر کی پیشانی سے مٹا کر اس کی جگہ لفظ "سعید" لکھ دیا گیا، اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کے لئے یہ بات دشوار نہیں۔ ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ [الرعد:۳۹] (اللہ مٹا دیتا ہے جو چاہے، اور برقرار رکھتا ہے، اور اس کے پاس اصل کتاب ہے)۔ [مظهري]

اسی آیت مذکورہ کے تحت مولانا رومی کا شعر:

کار پاکان را قیاس از خود مگیر ☆ گرچہ در ظاہر نوشتن شیر و شیر

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ☆ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(اقبال)

شکر کی حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی نافرمانی اور خلاف شرع اور حرام و ناجائز کاموں میں خرچ نہ کرے، اور زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اور اپنے روزمرہ تمام افعال واعمال کو بھی اللہ تعالیٰ کے حکموں اور اس کی مرضی کے مطابق بنائے۔

﴿وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْۤا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اگر تم سب اور تمہارے علاوہ جتنے لوگ زمین پر آباد ہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ شانہ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے لگیں، یا توحید چھوڑ کر شرک وکفر اور نافرمانی کرنے لگیں، تو خوب یاد رکھو کہ اس میں غنی وحمید پروردگار کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ وہ تو طاعات وعبادات اور شکر وناشکری اور بندوں کی ہر قسم کی حمد وثناء وغیرہ سے لاپرواہ اور بے نیاز ہے، نہ کسی کی طاعت میں اس کا فائدہ ہے، نہ کسی کی معصیت میں اس کا نقصان ہے۔ سارے ملائکہ اور جنات اسی طرح تمام کائنات کے انسان اگر رات دن اس کی فرمانبرداری اور عبادت میں لگ جائیں اسے ایک آدھ ذرہ کا بھی فائدہ نہ ہوگا، اگر تمام مخلوقات کفر وسرکشی اختیار کریں اسے کسی قسم کا نصف ذرہ نقصان نہیں ہوگا، وہ بے نیاز اور حمید اور محمود ہے۔

.......❁......❁......❁......

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرَدُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ فِيْۤ اَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوْۤا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَاۤ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَمَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ۭ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيْتُمُوْنَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝

ترجمہ: کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے؟ یعنی نوح کی قوم اور عاد اور ثمود، اور ان لوگوں کی خبر جو ان کے بعد تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے، سو ان لوگوں نے اپنے ہاتھ ان کے منہ میں دے دیئے اور کہا کہ بے شک تم جو چیز لے کر بھیجے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے، اور بلاشبہ جس چیز کی طرف تم لوگ ہمیں بلاتے ہو ہم اس کی طرف سے شک میں ہیں جو تردد میں

ڈالنے والا ہے ⑨ ان کے رسولوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک ہے؟ جو آسمانوں کو وجود عطاء فرمادے، اور مقررہ مدت تک تمہیں ڈھیل دیدے، ان لوگوں نے جواب دیا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو، ہمارے باپ دادا جس کی عبادت کرتے تھے تم ہمیں اس سے روکتے ہو، سوتم ہمارے پاس کوئی کھلی ہوئی دلیل لے آو ⑩ ان کے رسولوں نے ان سے کہا کہ ہم تمہارے ہی جیسے آدمی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان فرماتا ہے، اور ہمارے بس کی بات نہیں کہ ہم تمہارے سامنے کوئی معجزہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر لاسکیں، اور ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے ⑪ اور ہمیں کیا ہوا کہ ہم اللہ تعالی پر بھروسہ نہ کریں؟ حالانکہ اس نے ہمیں ہماری راہیں دکھائی ہیں، اور ہم تمہاری ایذاؤں پر ضرور بالضرور صبر کریں گے، اور اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے بھروسہ کرنے والوں کو ⑫

معارف ومسائل

قرآن حکیم اپنی جامعیت اور اعجاز کی بنیاد پر معاندین کی سرکشی اور ہٹ دھرمی کا بار بار اس لئے ذکر کرتا ہے تاکہ قیامت تک آنے والوں کے لئے عبرت ہو۔ قریش مکہ کا کفروشرک مثالی تھا، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کائنات کا خالق صرف حق تعالیٰ شانہ ہے، اور جو خالق ومالک ہوگا عبادت کا لائق ومستحق وہی ہوگا، مگر اس کے باوجود وہ اپنے کفروشرک سے باز نہیں آتے تھے۔

جب ان کے سامنے واضح طور پر حق پیش کیا جاتا تھا تو الٹے اُلٹے بے ڈھنگ جواب دیتے تھے، اس طرح وہ حق سے مزید دور ہوتے چلے جاتے تھے، ان کے قلوب پر مہر لگ چکی تھی۔ ان آیات میں اول تو یہ فرمایا کہ تم سے پہلے جو سرکش قومیں گزری ہیں مثلاً قوم نوح علیہ السلام اور قوم عاد اور قوم ثمود اور ان کے بعد جو بہت سی قومیں آئیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، کیا ان اقوام کے احوال تمہیں معلوم نہیں ہیں، وہ تم سے کہیں زیادہ طاقتور، مالدار، ہنر مند تھیں، انہیں تمہاری طرح کی سرکشیوں اور کفروشرک کی پاداش میں صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے ہٹادیا گیا۔

آج کرۂ زمین پر ان کے مکانات اور زندگی کے عجیب وغریب آثار تمہارے سفروں میں تمہیں نظر آتے ہیں، جن کی بستیاں کھنڈرات کی صورت میں تمہیں نظر آتی ہیں، اگر تمہارے پاس ذرہ برابر عقل ہو تو تم اپنے مستقبل کو سہارا دے کر ان کی تباہی سے عبرت حاصل کرو۔

ان ہلاک شدہ اقوام کی وہی حرکتیں تھیں جو تمہاری حرکتیں ہیں، وہ بھی تمہاری طرح کافر ومشرک تھے، انبیاء کرام علیہم السلام کو جھٹلاتے تھے، اور کہتے تھے کہ تم جو کچھ کہتے اور ہمیں سناتے ہو ہم ہرگز تمہاری بات نہیں مانتے، ہمیں تمہاری نبوت پر اور تمہاری باتوں میں شک ہے، اور شک بھی معمولی نہیں، ہمیں تردد میں ڈال رکھا ہے، اور جس ایک معبود کی جو ہمیں دعوت دیتے ہو، وہ بھی ہماری نظروں میں (العیاذ باللہ) مشکوک ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام جب انہیں توحید کی دعوت دیتے تو وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کرتے، یا اظہار حیرت کے لئے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیتے، ان دونوں صورتوں میں ﴿أَفْوَاهِهِمْ﴾ کی ضمیر کا مرجع کفار ہوں گے۔ اور اگر اس کا مرجع رسولوں علیہم السلام کو بنایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ انہیں وعظ کہنے لگتے تو یہ بے ادب آگے بڑھ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتے، اور انہیں بولنے کی بھی اجازت نہ دیتے۔ بعد والا جملہ ان کے اس بیباکانہ طرز عمل کی تائید کرتا ہے۔

پھر جب وہ توحید سے منکر ہو کر ہر طرح کی باتوں کو ٹھکراتے تو انبیاء کرام علیہم السلام فرماتے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک کرتے ہو؟ جو آسمانوں کا اور زمینوں کا پیدا فرمانے والا ہے، اس کی اتنی بڑی نشانیاں آسمان وزمین تمہارے سامنے ہیں، جبکہ تم خود اقرار کرتے ہو کہ ان کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، لہٰذا اس کی توحید کے قائل ہو جاؤ، اس پر ایمان لاؤ، اور اس کی عبادت کرو، ہم اس کے برحق پیغمبر ہیں، دعوت دینے والا وہی ہے، ہم اس کے حکموں کو تم تک پہنچانے والے ہیں، اگر تم اسی پر ایمان لاؤ گے تو وہ تمہارے گناہ معاف فرمائے گا، اور مقررہ وقت تک (جو اس کے علم میں ہے) تمہیں ڈھیل دے گا۔

مشرکین کی بے سروپا کٹ حجتی اور بہانے:

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی یہ باتیں سن کر ان کی قومیں جب دلیل سے لاجواب ہو گئیں تو کٹ حجتی اور "لیت ولعل" پر اتر آئیں، اور کہنے لگیں کہ ہم کیسے مان لیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے رسول ہو، تم تو ہمارے ہی جیسے آدمی ہو، بشر ہو، ہم نے جو معبود بنا رکھے ہیں اس میں ہم اپنے باپ دادوں کی اقتدا اور پیروی کرتے ہیں، اور ان کی راہ پر چلتے ہیں، اور ان کے طریقہ کو ہم اپنے خیال میں صحیح سمجھتے ہیں، اب تم ہمیں باپ دادوں کے راستے سے روکتے ہو، لہٰذا کوئی واضح کھلی ہوئی نشانی اور معجزہ دکھاؤ تاکہ ہم اسے دیکھ کر تمہاری بات پر غور کریں، اور باپ دادوں کا طریقہ چھوڑ دیں۔

ان کے جواب میں انبیاء کرام علیہم السلام نے فرمایا کہ بلاشبہ ہم تمہارے ہی جیسے انسان ہیں، لیکن انسان ہونا نبی

ہونے کے منافی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ شانہ جسے چاہے نبوت سے سرفراز فرمادیتا ہے، اور اپنے اس احسان کے لئے منتخب فرمالیتا ہے، وہ اپنے کرم سے انسانوں میں سے ہی نبی بھیجتا ہے، لہٰذا انسانوں ہی کے لئے ہم نبی مبعوث ہوئے تو اس میں اشکال کی کوئی بات نہیں، تو کیا سارے انسان ایک جیسے ہیں؟ ہرگز نہیں، تم ہماری ظاہری بشریت سے فریب مت کھاؤ، اور شان نبوت کو پہچانو۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ان لوگوں کے شکوک وشبہات کو بیان کر کے اپنے حکیمانہ انداز میں ان کا جواب دیا ہے:

گفت اینک مابشر ایشان بشر ☆ ماو ایشان بستۂ خوابیم وخور

یعنی کفار نے کہا ہم بھی انسان ہیں اور انبیاء کرام علیہم السلام بھی انسان ہیں، ہم بھی سوتے ہیں اور کھاتے ہیں وہ بھی اسی طرح، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نبی ہم جیسے انسان ہوں؟

این ندانستند ایشان ازعمیٰ ☆ ہست فرق درمیان بے انتہا

ان اندھوں نے یہ نہ جانا کہ ان کے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان تو بے انتہا فرق ہے۔

ہر دو یک گل خورد زنبور وخل ☆ زان یکے شدنیش زان دیگر عسل

یعنی ویسے تو زنبور اور شہد کی مکھی ایک پھول سے ہی خوراک حاصل کرتی ہیں، لیکن وہاں ڈنک نمودار ہوتا ہے، اور یہاں شہد۔

ہر دو گوں آہو گیاہ خوردند آب ☆ زین یکے سرگین شدوزان مشک ناب

دونوں قسم کے ہرن ایک ہی گھاس کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں، لیکن ایک سے صرف لید نکلتی ہے، اور دوسرے سے خالص کستوری۔

ایں خورد گردد پلیدی زین جدا ☆ واں خورد گردد ہماں نور خدا

کافر کوئی چیز کھاتا ہے تو اس سے نجاست نکلتی ہے، اور پیغمبر کھاتا ہے تو وہ نور خدا بنتا ہے، پس ان باتوں سے ظاہر ہوا کہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے، ہر چیز کی خصوصیت الگ، تو سارے انسان کیونکر ایک جیسے ہوں گے، ہرگز نہیں۔

چونکہ کفار ومشرکین نے محض بہانہ بنا کر معجزہ طلب کیا تھا، جبکہ ایمان لانے کا اُن کا کوئی ارادہ نہ تھا، انہوں نے اس سے پہلے اہم معجزات دیکھ کر بھی ایمان قبول نہیں کیا، کیا شق القمر کا معجزہ کوئی معمولی تھا؟ جسے وہ دیکھ کر بھی منکر ہوگئے تھے، اس لئے ارشاد ہوا کہ معجزہ کا اظہار ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں

ہے، اور وہ ہرگز اس کا پابند نہیں کہ جب بھی کوئی معجزہ طلب کرے تو اس کی بات مانی جائے، اور معجزہ کا ظہور ہو، ہم اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں، اور یہی مؤمنوں کا سرمایہ ہے، یہ انبیاء کرام علیہم السلام نے کہا۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کرم فرما کر ہمیں ہدایت دی، اور زندگی کے جو طریقے اسے محبوب ہیں ان سب پر ہماری رہنمائی فرمائی، اب تم لوگ جی بھر کر ہمیں ایذا دیدیں، اور ہم صبر ہی کرتے رہیں گے، کبھی بھی صبر کا دامن چھوڑ کر گھبرانے والے نہیں، ہمارا کام ہے صبر کرنا اور تمہاری تکلیفوں کو بطیب خاطر برداشت کرنا، اور اپنے ربّ پر بھروسہ و اعتماد کرنا۔ بلا شبہ بھروسہ کرنے والے اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں، اور چاہیے کہ بھروسہ کرتے رہیں، یقیناً ہمارا مستقبل روشن رہے گا، اور تمہارا تاریک، تم خنجر آزماؤ اور ہم جگر آزمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اربوں کھربوں صلوٰۃ و سلام انبیاء کرام علیہم السلام پر ہوں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ
فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ
هِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ
عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ
وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ضرور بالضرور ہم تمہیں اپنی زمین سے نکال دیں گے، یا یہ بات ہو کہ تم ہمارے دین میں واپس ہو جاؤ، سو ان کے ربّ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہم ضرور بالضرور ظالموں کو ہلاک کر دیں گے ﴿۱۳﴾ اور ان کے بعد تمہیں اس زمین میں آباد رکھیں گے، یہ اس شخص کے لئے ہے جو میرے حضور کھڑے ہونے سے خائف ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو ﴿۱۴﴾ اور کافروں نے فیصلہ چاہا، اور ہر سرکش ضدی نامراد ہوا ﴿۱۵﴾ اس کے آگے دوزخ ہے، اور اسے ایسا پانی پلایا جائے گا جو پیپ کا ہوگا ﴿۱۶﴾ وہ اسے گھونٹ گھونٹ پیئے گا، اور گلے سے بآسانی نہ اتارے گا، اور ہر جگہ سے اس پر موت کی آمد ہوگی، اور وہ نہیں مرے گا اور اس کے سامنے سخت عذاب ہوگا ﴿۱۷﴾

معارف ومنازل

اور کافروں نے اپنے پیغمبروں علیہم السلام سے کہا: ہم تم کو اپنی بستی اور شہر سے ضرور نکال باہر کر دیں گے، یا تم کو

ہمارے مذہب میں ضرور لوٹ کر آنا ہوگا، یعنی اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارے مذہب میں آنا ہوگا۔ لوٹ کر آنے سے مراد ہے اپنا مذہب تبلیغ ودعوت کا سلسلہ چھوڑ دو، جیسے نبوت سے پہلے ہمیں کوئی دعوت نہیں دی، ہمیں کچھ نہ کہا، اب بھی اسی طرح ہمیں کچھ نہ کہا کرو، کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کفر پر کبھی نہیں رہے، وہ پیدائشی طور پر مسلمان ہی تھے، اس لئے لوٹنے سے مراد دوبارہ کفر اختیار کرنا نہیں ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ مخاطب سب مؤمن ہوں اور پیغمبر بھی، اور ان پر ایمان لانے کے لئے ان کے رفقاء بھی جو پیغمبر پر ایمان لانے سے پہلے مشرکین کے مذہب کفر پر تھے، یہاں بطور تغلیب خطاب ہو، کیونکہ یہ چیز واضح ہے کہ پیغمبر کبھی کافر نہیں رہا۔ البتہ ان کے متبعین کفر پر ضرور رہے، تو خطاب میں تغلیب ہے، مراد متبعین ہیں نہ کہ پیغمبر، تو مطلب یہ ہوا کہ تم مؤمن لوگ دوبارہ اپنے سابق کفر کو اختیار کرو۔

﴿فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ﴿۱۳﴾ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ﴾ پس پیغمبروں علیہم السلام کے ربّ نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کر دیں گے، اور کافروں کی بستی اور ان کے گھروں اور شہر میں تم کو اور مؤمنوں کو بسائیں گے، یعنی ان کے ہلاک کرنے کے بعد۔ اب عام قانون الٰہی کا اعلان ہو رہا ہے، فرمایا:

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ﴾ میری یہ رحمت وعنایت ہر اس شخص کے لئے ہوگی جو قیامت کے دن میرے سامنے کھڑے ہونے کا خوف رکھتا ہو، یعنی وہ ایمان والے جنہیں حساب وکتاب کا خوف ہے وہ یقین کرتے ہیں کہ قیامت کا دن ضرور آئے گا، اور وہاں حاضر ہونا پڑے گا، اور نیکی بدی کا حساب ہوگا، اور مجھے اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر حساب دینا ہوگا۔ یہ وعدہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہے جو اللہ تعالیٰ کی وعیدوں سے ڈرتے رہے جس کے نتیجے میں گناہوں سے بچتے رہے اور نیکیوں کا ذخیرہ جمع کرتے رہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ [الأنبياء: ۱۰۵] (اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے)۔

یہاں ارض سے مراد جنت بھی ہے، اور دنیا کی زمین بھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اس کا وارث بنائیں گے، یہ وعدہ ایسے عباد اللہ کے ساتھ ہے جن کا دامن پاک ہو، اور معاصی کے ارتکاب سے مکمل کنارہ کش ہوں، مطلق مؤمنوں کے ساتھ یہ وعدہ نہیں جو ایمان کے ساتھ معاصی سے لت پت ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت ومدد ہمیشہ متقین صالحین کو پہنچتی ہے، نہ ہر کسی کو۔

﴿وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ﴾ اس میں مفسرین حضرات نے دو وجہ لکھی ہیں: اول یہ کہ ﴿وَاسْتَفْتَحُوْا﴾ کی ضمیر متصل جو کہ فاعل ہے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف راجع ہے، اور مطلب یہ ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی قوموں کے ایمان لانے سے مایوس ہوگئے تو ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی، اور اس کی نصرت کی درخواست کی، اور فیصلہ چاہا۔ یہ معنی بھی سیاق کلام کے موافق ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ﴾ [الأعراف:۸۹] (اے ہمارے ربّ! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دیجئے، اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ﴿وَاسْتَفْتَحُوْا﴾ کی ضمیر امتوں کی طرف راجع ہو، اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قوموں کو دعوت دیتے رہے، اور انہیں سمجھاتے رہے، اور وہ بدستور انکار پر مصر رہے تو شدہ شدہ وہ وقت آگیا کہ ان کی قوموں نے جان خلاصی کی نیت سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں عرض کی کہ اے ربّ! ہمارے اور ان (انبیاء کرام علیہم السلام) کے درمیان فیصلہ فرمادے کہ یہ لوگ ہمیں جو وعید سناتے ہیں کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب آجائے گا، اور تم ہلاک ہوجاؤ گے، تو ہمارے انکار پر اگر واقعی عذاب آجائے گا اور ہم ہلاک ہوجائیں گے تو ہمارے انکار پر اگر واقعی عذاب آسکتا ہے تو ضرور آجائے۔

نوح علیہ السلام کی قوم نے بھی اسی طرح کہا تھا: ﴿فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [ھود:۳۲] (اگر تم سچے ہو تو لے آؤ وہ (عذاب) جس کی دھمکی ہمیں دے رہے ہو)۔

اور شعیب علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: ﴿فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [الشعراء:۱۸۷] (اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرادو)۔

اور قریش مکہ نے کہا تھا: ﴿رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ﴾ [ص:۱۶] (اے ہمارے پروردگار! ہمارا حصہ ہمیں روزِ حساب سے پہلے ہی جلدی دیدے)۔

اور یہ بھی کہا تھا: ﴿اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ [الأنفال:۳۲] (یا اللہ! اگر یہ وہی حق ہے جو تیری طرف سے آیا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسادے، یا ہم پر کوئی اور تکلیف دہ عذاب ڈال دے)۔ دراصل جس طرح وہ انبیاء کرام علیہم السلام کی

دعوت پر یقین نہیں رکھتے تھے، اسی طرح وہ عذاب پر بھی یقین نہیں رکھتے تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ عذاب کچھ بھی نہیں، انبیاء کرام علیہم السلام محض اپنی بات منوانے کی خاطر ہمیں ڈراتے ہیں، اور عذاب کی دھمکی دیتے ہیں، عذاب کچھ بھی نہیں، محض دھمکی ہے۔ اور اگر عذاب کا واقعی یقین ہوتا تو وہ کبھی اپنے منہ سے اس کی طلب کی جرأت نہ کرتے۔

اور یہ ان کا تمسخر و مذاق ہی ہوتا تھا، کبھی وہ قیامت کا مطالبہ کرتے تھے، کبھی معجزات و آیات کا، اور کبھی عذاب کا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس عذاب کو مذاق میں طلب کرتے تھے اس نے سچ مچ آگھیرا، اور ان کی پوری تباہی ہوئی، اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہوگا جو کہ سخت بھی ہے اور ابدی بھی۔ وہاں جب بے رحم پیاس کا ان پر حملہ ہوگا تو پانی طلب کریں گے، جب وہ پانی انہیں ملے گا تو سراسر پیپ کا ہوگا، پینے کو تو دل نہ چاہے گا لیکن بامر مجبوری انہیں پینا پڑے گا، یہ پیپ کا پانی دوزخیوں کے جسم سے نکل کر بہتا ہوگا، کافر مشکل سے اسے گھونٹ گھونٹ کر پیئے گا۔

﴿يَتَجَرَّعُهٗ﴾ گھونٹ گھونٹ کر پیئے گا۔

﴿وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهٗ﴾ آسانی کے ساتھ حلق سے نہیں اتار سکے گا، گلے میں اٹک جائے گا، نگل نہیں سکے گا، اور اتار نہ سکے گا، لیکن مجبوری سے اسے پینا ہی پڑے گا۔

یہ ماء صدید کیا ہے، اور کیسا ہے؟

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَتَجَرَّعُهٗ﴾ کے بارے میں فرمایا کہ ماء صدید (پیپ کا پانی) جب دوزخی کے منہ کے قریب کیا جائے گا تو وہ اس سے نفرت کرے گا، پھر اور قریب کیا جائے گا تو اس کے چہرہ کو بھون ڈالے گا، اور اس کے سر کی کھال گر پڑے گی، پھر جب اسے پیئے گا تو انتڑیاں کاٹ ڈالے گا، اور پاخانے کے مقام سے نکل جائے گا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذیل کی آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ﴾ [محمد صلی اللہ علیہ وسلم: ۱۵] (ان کو گرم پانی پلایا جائے گا، پس ان کی انتڑیوں کو کاٹ ڈالے گا)۔ دوسری سورۂ کہف کی آیت: ﴿وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا﴾ [الكهف: ۲۹] (اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد کا جواب ایسے پانی سے دیا جائے گا جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا، چہروں کو بھون کر رکھ دے گا، کیسا بدترین پانی اور کیسی بری آرام گاہ!)۔ [ترمذي، مشكوٰة: ۵۰۳]

فرمایا: ﴿وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ﴾ اس کے پاس ہر جگہ سے یعنی ہر طرف سے

موت اور تباہی آئے گی، یعنی طرح طرح کے عذابوں کا ہجوم ہوگا، جتنی بھی سخت تکلیف پہنچ جائے وہ یہ سمجھے گا کہ اب مرا، اب مرا، لیکن پھر بھی وہ مرے گا نہیں۔ موت وہاں کہاں ہوگی، موت دوزخ میں کہاں سے آئے گی، موت تو پہلے ذبح ہو چکی ہے۔ سورۂ طٰہٰ اور سورۂ اعلیٰ میں فرمایا: ﴿لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى﴾ [طٰه:۷۴۔ الأعلیٰ:۱۳] (یعنی وہاں نہ مرے گا کہ جان خلاصی پائے، نہ زندہ رہے گا کہ سکون پائے)۔ ایک ناقابلِ برداشت کشمکش میں مبتلا رہے گا، اور ابدی ودائمی تباہی کا شکار رہے گا۔ فرمایا:

﴿وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ﴾ اور اس کے آگے سخت عذاب ہے، جتنا بھی عذاب ہوگا آگے بڑھتا ہی رہے گا، نہ ختم ہوگا، اور نہ ہلکا ہوگا۔ فرمایا: ﴿زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ﴾ [النحل:۸۸] (ہم ان کا عذاب بڑھائیں گے عذاب کے اوپر)۔ دوسرے مقام پر ہے: ﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا﴾ [النبأ:۳۰] (چکھو عذاب ہم نہیں زیادہ کریں گے تمہارے لئے مگر عذاب بالائے عذاب)۔

دعاء:

اے ہمارے رحیم وکریم ربّ! اپنے فضل وکرم سے ہمارے ایمانوں کی حفاظت فرما، خاتمہ بالخیر کی سعادت عطا فرما، جہنم سے آزادی عطاء فرما۔ آمین

...... ❁ ...... ❁ ...... ❁ ......

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ
مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ⑱ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ⑲ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ⑳ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا
فَقَالَ الضُّعَفٰۗؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ
مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ ㉑

ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے ربّ کے ساتھ کفر کیا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے راکھ، اُسے تیز آندھی کے دن میں تیز ہوا اڑا کر لے جائے، جو کچھ انہوں نے کمایا اس میں سے ذرا سے حصہ پر بھی وہ قادر نہیں ہوں گے، یہ ہے دور کی گمراہی ⑱ اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کیساتھ

پیدا فرمایا، اگر وہ چاہے تو تمہیں ختم کردے، اور نئی مخلوق پیدا فرمادے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ⑲ اور وہ سب اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے، سو ضعیف لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو بڑے بنے ہوتے تھے کہ بلاشبہ ہم تمہارے تابع تھے، سو کیا تم ہم سے اللہ تعالیٰ کا عذاب کچھ بھی ہٹا سکتے ہو؟ ⑳ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں راہ بتاتا تو ہم تمہیں بھی راہ بتادیتے، ہم سب کے حق میں برابر ہے کہ ہم بے چینی کا اظہار کریں یا صبر کریں، ہمارے چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں ㉑

معارف ومنازل

کافروں کے سارے اعمال رائیگاں ہیں:

ایمان تمام اعمالِ خیر کی قبولیت کا پیغام ہے، جبکہ عدم ایمان اعمال کے باطل ہونے کا ذریعہ ہے، کافر ہزاروں اعمال خیر انجام دے اور نیکی سمجھ کر اعمال صالحہ بجالائے اسے اس کے اعمال کا بدلہ صرف دنیا میں ملے گا، صحت تندرستی، کثرت مال اور عزّت کی شکل میں، جبکہ وہ آخرت میں اپنے اعمالِ خیر کے ثواب اور بدلہ سے محروم رہے گا، اس کے اعمال خیر کا پورا ذخیرہ رائیگاں اور باطل ہوگا، جبکہ مؤمن کے اعمال کا ذرہ برابر بھی ضائع نہ ہوگا، وہ اپنے کار خیر کے ثواب سمیٹتا رہے گا، اور جنتوں کا مستحق قرار پائے گا۔

ان آیات میں اسی کا بیان ہے کہ جو اعمال کفار انجام دیں گے اور نیکی سمجھ کر اچھے عمل کریں گے، ہسپتال بنائیں یا تعلیمی ادارے، یا مسافر خانہ، یا پانی کا سبیل، یا عام رفاعی کام اور صلہ رحمی انجام دیں گے، یا مجبور و پریشان حال لوگوں کی امداد کریں گے وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا: ان کے یہ سارے اعمال آخرت میں بے حیثیت ہوں گے، اور ثواب و بدلہ سے سراسر محروم ہی رہیں گے، ان کی مثالیں ایسی ہے جیسے کوئی راکھ پڑی ہوئی ہو جسے خوب تیز آندھی نے اڑا کر ادھر ادھر منتشر کیا ہو۔ ﴿هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ [الفرقان: ۲۳] (بکھرا ہوا گرد وغبار)۔ گرد وغبار ہو کر تیز رفتار آندھی کی زد میں آکر تتر بتر ہو چکی ہو۔

نظروں کے سامنے جو اس کا ذرا سا وجود تھا وہ بھی نہ رہا، اسی طرح کافروں کے اعمال کا نہ بدلہ، نہ ثواب، نہ اہمیت، نہ عذاب سے چھٹکارا۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ یہ سائل کے اس سوال کا جواب ہے کہ کافروں کا یہ حال کیوں ہوگا جو گزشتہ آیت میں مذکور ہوا، جبکہ انہوں نے دنیا میں کچھ نیک اعمال بھی کئے تھے؟ اس کا جواب دیدیا

کہ ان کے ان اعمال کی قیامت کے دن کوئی حیثیت نہ ہوگی، ان کا یہ سمجھنا کہ ان اعمال کی قیامت کے دن کوئی حیثیت نہ ہوگی، یا ان کا یہ سمجھنا کہ ان اعمال پر ہمیں کچھ ملے گا یا ان اعمال کی وجہ سے ہم ہدایت پر ہیں، یہ ضلال بعید اور دور کی گمراہی ہے۔ سورۂ فرقان میں فرمایا: ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ [الفرقان: ٢٣] (اور ہم ان کے ان کاموں کی طرف جو کہ وہ کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو ایسا کر دیں گے جیسے بکھرے ہوئے پریشاں غبار)۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کیساتھ یعنی حکمت کے موافق پیدا فرمایا؟ آسمانوں میں زمینوں میں اور جو کچھ ان میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے اور اسی کی مشیت سے ہے۔

﴿اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝١٩ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ﴾ اگر وہ چاہے تو کافروں کے اعمال کی طرح تمہیں معدوم کر دے، اور نئی مخلوق پیدا فرمادے، جیسے کہ مؤمن کے آدھی کھجور کے صدقہ کو نئی شکل دے کر پہاڑوں کے برابر ثواب عنایت فرمانے کا وعدہ ہے۔ [بخاري]

اور یہ اللہ تعالیٰ پر ذرا بھی مشکل نہیں ہے، ﴿اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [فصلت: ٣٩] (بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ ۭ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ﴾ یہاں سے قیامت کے ہولناک منظر کے متعلق فرمایا کہ قیامت کے دن چھوٹے بڑے، مرد وعورت، حاکم ومحکوم، امیر وغریب، سب قبروں سے نکل کر ایک میدان میں ظاہر ہوں گے۔ اس وقت مشرکین کے سامنے جب عذاب آئے گا تو آپس میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے اور پہچانیں گے، اس وقت ان کے چھوٹے لوگ جو دنیا میں کمزور تھے، اپنے بڑوں، سرداروں اور لیڈروں کے پیچھے چلتے تھے، اور ان کے تابع تھے، اور ان کی بات ماننے کی وجہ سے رسولوں علیہم السلام کی دعوت کو رد کر دیتے تھے، وہ اپنے سرغنوں، قائدوں، لیڈروں، اور سرداروں سے کہیں گے کہ ہم دنیا میں تمہارے تابع تھے، تم جو کہتے تھے ہم اسے مانتے تھے اور تمہارے کہنے کے مطابق عمل کرتے تھے، ہم نے تمہاری بات مانی اور اپنے خالق ومالک کے رسولوں علیہم السلام کی باتوں کا انکار کیا، اگر تم ہمیں مجبور نہ کرتے تو ہم

ایمان لا چکے ہوتے، تو اب بتاؤ کیا تم ہم سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوئی حصہ ہٹا سکتے ہو؟

وہ جواب دیں گے کہ ہم تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے، اگر عذاب سے چھوٹنے کا کوئی راستہ اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتا تو ہم تمہیں بھی بتا دیتے، اب تو ہمارے لئے اور تمہارے لئے عذاب ہی عذاب ہے، اور اب تم اور ہم یہاں پریشانی ظاہر کریں، یا صبر کریں بہر حال نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سورۂ مؤمن میں فرمایا: ﴿اِنَّا كُلٌّ فِيْهَاۤ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ﴾ [غافر:۴۸] (بلاشبہ اب ہم سب کو اسی عذاب میں رہنا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے درمیان فیصلہ فرما دیا)۔

سورۂ بقرہ رکوع (۲۰) میں ہے کہ متبوعین اپنے اتباع سے بیزاری ظاہر کر دیں گے، اور سورۂ اعراف رکوع (۴) میں گزر چکا ہے کہ اہل دوزخ ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ سورۂ سبا رکوع (۴) میں بھی بڑوں اور چھوٹوں کا مکالمہ مذکور ہے، اسی طرح متصل آنے والی آیت میں شیطانی مکالمہ بھی آنے والا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۭ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۭ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾ وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۭ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: اور جب فیصلے ہو چکیں گے تو شیطان کہے گا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے سچے وعدے کئے، اور میں نے تم سے وعدے کئے وہ وعدے میں نے تم سے خلاف کئے تھے، اور میرا تم پر اس سے زیادہ کچھ زور نہ تھا کہ میں نے تم کو دعوت دی سو تم نے میری بات مانی، لہٰذا تم مجھے ملامت نہ کرو، اور اپنی جانوں کو ملامت کرو، نہ میں تمہارا مدد گار ہوں، نہ تم میرے مدد گار ہو، میں تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں کہ اس سے پہلے تم نے مجھے شریک بنایا۔ جو ظالمین ہیں بلاشبہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۲۲﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ لوگ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اپنے ربّ کے حکم سے ہمیشہ ان میں داخل رہیں گے، ان

کا تحیہ ملاقات کے وقت سلام ہوگا۲۳

معارف ومنازل

شیطان کا اپنے اچھے دوستوں سے بیزاری:

مرے تھے جن کے لئے وہ لگے وضو کرنے ☆ میری نماز جنازہ پڑھائی غیروں نے

شیطان پر ایمان، حیا، غیرت، سوچ وسمجھ قربان کرنے والوں کی عجیب وغریب پریشانی۔ یہ منظر کتنا پرفریب اوردل گداز ہوگا جب ابلیس لعین اپنے جان نثاروں کو بے یارومددگار چھوڑ کران سے براءت کا اعلان کرے گا۔فرمایا یعنی حساب وکتاب کے بعد جب جنتیوں کے جنت میں اور دوزخیوں کے دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہوچکا ہوگا، اس وقت کفار دوزخ میں جا کر یا داخل ہونے سے پہلے ابلیس لعین کو الزام دیں گے کہ مردود! تونے دنیا میں ہماری راہ ماری، ہمیں گمراہ کیا، اوراس مصیبت میں گرفتار کرایا، اب کوئی تدبیر مثلاً سفارش وغیرہ کا انتظام کرو، اورہمیں کسی تدبیر سے بچاؤ تاکہ عذاب الٰہی سے رہائی ملے۔

تب ابلیس ان کے سامنے "لیکچر" دے گا، اور خوب اپنی براءت کا اعلان کرے گا، اپنی صفائی پیش کرکے انہیں ملامت کرکے بیوقوف وناداں ثابت کرے گا۔جس کا حاصل یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ نے صادق القول پیغمبروں علیہم السلام کے توسط سے ثواب وعقاب اور جنت ودوزخ کے متعلق سچے وعدے کئے تھے، جن کی سچائی دنیا میں براہین ودلائل سے ثابت تھی، اورآج مشاہدے سے ظاہر ہے، اور میں نے اس کے بالمقابل جھوٹی، منگھڑت باتیں پیش کیں، اورجھوٹے وعدے کیے، جن کا جھوٹ ہونا وہاں بھی ادنیٰ فکر وتامل سے معلوم ہوسکتا تھا، اور یہاں تو آنکھوں کے سامنے ہے، میرے پاس نہ حجت وبرہان کی قوت تھی، نہ ایسی طاقت کا مالک تھا کہ زبردستی تم کو ایک جھوٹی بات کے ماننے پر مجبور کردیتا۔

بلاشبہ میں نے بدی کی تحریک چلائی اورتم کو اپنے مشن کی طرف بلایا، تم بے سوچے سمجھے جھپٹ کر خوشی سے میرے پاس آئے، اور میں نے اغوا کیا تھا، توتم ایسے اندھے کیوں بن گئے کہ نہ دلیل سنی، نہ دعوے کو پرکھا، آنکھیں بند کرکے میرے پیچھے ہولئے۔

انصاف یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ تم اپنے نفسوں کو ملامت کرو، میرا جرم اغوا بجائے خود رہا، لیکن مجھے مجرم گردان

کرتم کیسے بری ہو سکتے ہو؟ آج تم کو مدد دینا تو درکنار خود تم سے مدد لینا بھی ممکن نہیں، ہم اور تم دونوں اپنے اپنے جرم کے موافق سزا میں پکڑے ہوئے ہیں، کوئی ایک دوسرے کی فریاد کو نہیں پہنچ سکتا، تم نے اپنی حماقت سے دنیا میں مجھ کو خدائی کا شریک ٹھہرایا (یعنی بعض تو براہ راست شیطان کی عبادت کرنے لگے، اور بہتوں نے اس کی باتوں کو ایسی طرح مانا اور اس کے احکام کے سامنے اس طرح سر تسلیم و انقیاد خم کیا جو خدائی احکام کے آگے کرنا چاہیے تھا)۔

بہر حال! اپنے جہل و بغاوت سے جو شرک تم نے کیا تھا اس وقت میں اس سے منکر اور بیزار ہوں۔

یا ﴿بِمَآ اَشۡرَکۡتُمُوۡنِ﴾ میں بائے سببیت ہو پھر، مطلب یہ ہوگا کہ تم نے مجھ کو خدائی کا رتبہ دیا، اس سبب سے میں بھی کافر بنا، اگر میری بات کوئی نہ پوچھتا، نہ مانتا تو میں کفر و سرکشی کے اس درجہ میں کہاں پہنچتا، اب ہر ایک ظالم اور مشرک کو اپنے کئے کی سزا دردناک عذاب کی صورت میں بھگتنا چاہیے، شور مچانے اور الزام دینے سے کچھ حاصل نہیں۔

گزشتہ آیت میں ضعفاء و متکبرین (عوام اور لیڈروں) کی گفتگو نقل کی گئی تھی، اسی کی مناسبت سے یہاں دوزخیوں کے "مہالیڈر ابلیس لعین" کی تقریر نقل فرمائی۔ چونکہ عوام کا الزام اور ان کی استدعاء دونوں جگہ یکساں تھی شاید اسی لئے شیطان کی گفتگو کے وقت اس کا ذکر ضروری نہیں معلوم ہوا۔ [تفسیر عثمانی]

اللہ تعالیٰ شانہ کا کتنا بڑا فضل ہے کہ اس نے اسی دنیا میں بتا دیا، اور اپنے بندوں کو خبردار کر کے ہوشیار کر دیا کہ قیامت کے دن شیطان ایسی باتیں کرے گا۔ اس پر ہر عقلمند انسان کو فکر کرنی چاہیے کہ میں کس راہ پر ہوں، اگر کفر و شرک و معاصی میں مبتلا ہے تو غور کرے کہ مجھے اس راہ پر کس نے لگایا؟ تو صاف ظاہر ہے کہ برائی میں مبتلا ہونا شیطان ہی کی سازش ہے، یا شیطان کے گماشتوں، سرداروں، لیڈروں نے لگایا ہے، جن کا کرتا دھرتا شیطان ہی کے توسط سے ہے۔ اور یہ قابلِ توجہ ہے کہ قیامت کے دن شیطان اور اس کے گماشتے کام نہیں آئیں گے۔

لہٰذا نجات صرف اسی میں ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات اور ارشادات و ہدایات کو سینے سے لگا کر نجات کی فکر کرنی چاہیے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ☆ وگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

﴿وَاُدۡخِلَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ؕ تَحِیَّتُہُمۡ فِیۡہَا سَلٰمٌ﴾ جو لوگ شیطانی چالوں سے دور رہے اور ایمان لائے اور نیک اعمال کئے، ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے ربّ کے حکم سے ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں جاری

ہوں گی، اور صرف داخلہ ہی نہیں ہوگا، خلود و دوام بھی ہوگا، وہ ہمیشہ ہمیشہ ان باغوں میں رہیں گے، اور جب آپس میں ملاقات کریں گے تو ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دیں گے، دوسری طرف سے رحمت کے فرشتے بار بار انہیں سلامتی و خوشی کا پیغام بھی دیں گے۔ سورۂ یونس میں ارشاد ہے: ﴿تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلٰمٌ وَّاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [یونس: ۱۰] (ان کا تحیہ سلام ہوگا اور ان کا آخری دعویٰ یہ ہوگا: ساری تعریف اللہ کے لیے ہے، جو مخلوقات کا پالنے والا ہے)۔ دیگر متعدد سورتوں میں بھی یہی سلام اور تحیہ کا بکثرت ذکر و تذکرہ ہے۔ رَزَقَنَا اللّٰهُ وَجَمِيْعَ الْمُؤْمِنِيْنَ، آمین

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ
اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ
خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ڐ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی؟ وہ مثال کلمہ طیبہ کی ہے جو شجرہ طیبہ کی طرح سے ہے، اس کی جڑ مضبوط ہے، اور اس کی شاخیں بلندی میں ہیں ﴿۲۴﴾ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۲۵﴾ اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایسی ہے جیسے خبیث درخت ہو جسے زمین کے اوپر سے اکھاڑ دیا گیا ہو، اس کے لئے ثبات نہیں ہے ﴿۲۶﴾ جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ انہیں دنیا والی زندگی میں اور آخرت میں پختہ بات کے ساتھ مضبوط رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے ﴿۲۷﴾

معارف و منازل

کلمہ طیبہ سے مراد ایمان ہے، اور کلمہ خبیثہ سے مراد کفر ہے۔ جتنے اعمالِ صالحہ ہیں فرائض سے لے کر مستحبات تک، یہ سب کلمہ طیبہ (ایمان) کی پسندیدہ اور مبارک شاخیں ہیں، بڑی چھوٹی، سب کی سب۔ پھر اسی طرح تمام معاصی چھوٹی بڑی کفر و شرک کی شاخیں ہیں، حرام سے لے کر مکروہات تک۔

یہاں اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور کفر کی حقیقت کو ایک نہایت بلیغ مثالی سے واضح فرمایا، اور دونوں کو متضاد درختوں یعنی پاکیزہ اور ناپاک درخت سے تشبیہ دیدی کہ ایمان ایک پاکیزہ مضبوط ومحکم بلند وبالا درخت کی مانند ہے (جیسے کھجور کا درخت) اور پاکیزہ وبلند وبالا عمدہ درخت کی یہ صفات ہوتی ہیں کہ جڑیں بہت زیادہ گہری ہوتی ہیں، کوئی تند وتیز آندھی بھی اسے اکھیڑ نہیں سکتی، اس کی شاخیں بلندی کے ساتھ خوب پھیلی ہوئی اور اونچی ہوتی ہیں، اسی طرح اس کا سایہ دور تک پھیلا ہوا، اور خوب گھنا ہوتا ہے، اور اس پر پھل بھی بکثرت لگتا ہے، اور اس کا پھل مقدار میں زیادہ اور ذائقہ میں لذیذ ہوتا ہے۔

فرمایا: ایمان بھی ان تمام صفات اور خوبیوں سے متصف ہوتا ہے جو ایک پاکیزہ درخت کے خواص ہیں، اس کی جڑیں دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتی ہیں، مصائب وآلام کا کوئی طوفان اس کو اکھیڑنا تو درکنار ہلا بھی نہیں سکتا۔ اسلام سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی ہمشیرہ فاطمہ کو لہولہان کر کے مارا تھا، کیا اس ظلم وتشدد سے ان کا شجرا اکھڑ گیا تھا؟ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی والدہ سمیہ رضی اللہ عنہا کو ابوجہل نے برچیاں مار مار کر بیہوش کیا، جب ہوش میں آئیں تو اللہ اللہ کہنا شروع کیا، یہاں تک کہ دو اونٹوں کے ساتھ ان کے ایک ایک پاؤں باندھ کر پورے جسم کو دو حصوں میں کٹوا دیا گیا، تو کیا شجر ایمان میں کوئی جنبش آئی؟ اس قسم کے واقعات سے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ فرمایا:

﴿فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ﴾ اس شجر مبارک کی شاخیں اتنی بلند ہیں کہ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی ہیں۔

﴿إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾ اس پاکیزہ درخت کلمہ طیبہ کے پھلوں اور ثمرات (اعمالِ صالحہ) کی منڈی دنیاوی پھلوں کی طرح زمین میں نہیں، بلکہ اس کی منڈی اور مقام عروج ساتوں آسمانوں سے اوپر اعلیٰ علیین میں ہے، جہاں مسلمانوں کی ارواح کا مستقر ہے، اور اس میں کیا شک ہے مؤمن کے کردار، حسنات اور اعمالِ طیبہ اور اخلاقِ حسنہ حمیدہ اور اس کے جذبہ للّٰہیت واخلاص کی رفعتوں کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے؟ اور اس درخت کا جو پھل ہے اس کی شان ہی نرالی ہے، دوسرے درختوں پر سال میں ایک بار پھل لگتا ہے، اور وہ کبھی غبار آلود کیڑوں کے ساتھ، کبھی سڑا ہوا، کبھی آفت زدہ، کبھی کم، کبھی زیادہ، کبھی پکتا ہے، کبھی کچا زمین پر گر جاتا ہے، کبھی ترش، کبھی کڑوا، اور کبھی ناکارہ، لیکن شجر ایمان کا کیا کہنا، ہر سال، بارہ مہینے اس کی فلک بوس شاخیں میٹھے اور لذیذ پھلوں سے لدی ہوئی جھومتی رہتی ہیں، ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آتا کہ اس کی شاخیں ثمر سے خالی ہوں۔

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں پابند ☆ بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ (اقبالؔ)

رات ڈھلتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے بندے اشک سحر گاہی سے وضو کر کے دست بستہ اپنے ربّ کے حضور کھڑے ہو جاتے ہیں، دست بستہ عجز وانکساری کے ساتھ نغمۂ توحید پیش کرتے ہیں، صبح ہوتی ہے تو مسجدیں سجدہ کرنے والوں سے بھر جاتی ہیں، ہر سانس کے ساتھ "اللہ ھو" کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، ان کی اداؤں کے لکھنے والے اور انہیں جنتی ریشمی رومالوں میں لپیٹ کر اوپر لے جانے والے نورانی فرشتے بھی حاضر ہو جاتے ہیں، اور تھوڑی دیر کے لئے ملاحظہ کر کے دیکھتے ہیں، کبھی ذکر کا غلغلہ ہے، کبھی مراقبہ وفکر کی خاموشی، کبھی تسبیح وتہلیل، کبھی حمد وثناء اور کبھی ترتیل قرآن اور کبھی صاحب قرآن پر صلوٰۃ وسلام۔

اور جب ایسی بابرکت وبامقصد زندگی گزار کر مؤمن قبر کی سنسان ووحشت ناک وادی میں خیمہ زن ہوتا ہے تو نزولِ رحمت کا سلسلہ یہاں بھی جاری رہتا ہے، اور ٹوٹنے نہیں پاتا۔ جس کی تفصیل آئندہ سطور میں آنے والی ہے۔

شجر ایمان کے برعکس کفر ایک بے بنیاد، خبیث درخت کی مانند ہے، جس کی جڑیں ہوتی ہی نہیں، تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا، اسے اکھاڑ کر زمین بوس کر دیا، (جیسے حنظل یعنی اندرائن کا درخت)۔ ایسے درخت کی شاخیں کہاں ہوں گی اور پھل کہاں؟ اگر پھل لگ بھی جائے تو بدبودار، نہایت بے رونق، اور حد سے زیادہ تلخ، جسے انسان تو کیا گدھے، گائے، اونٹ، بھی حقیر وتلخ جانتے ہوئے منہ تک نہ لگائیں۔

اسی نقطے کے پیش نظر قرآن کریم نے نہ اس کی شاخوں کا تذکرہ کیا، نہ اس کے پھل کا، نہ اور کسی امکانی فائدہ کا، گویا یہ خبیث درخت ہر فائدے سے خالی ہے، اور نہایت ناکارہ ہے، نہ اس کے لئے کوئی قرار ہے، نہ ثبات۔ اسی مناسبت سے یہ زقوم اور تھوہڑ کے مطابق جہنمیوں کا کھانا اور ان کی خوراک ہے۔ العیاذ باللہ۔ بلکہ مجازاً اسے درخت کہا گیا۔ دراصل یہ درخت نہیں، بیل بوٹی ہے۔

شجر مبارک کے ہمہ گیر فوائد کا بیان:

﴿یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ﴾ یعنی جو لوگ اخلاص ویقین سے کلمہ شہادت پڑھتے ہیں یعنی شجرہ طیبہ کی تنظیم کا ممبر بنتے ہیں، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ انہیں ہر مقام پر ثبات وقرار اور استقامت بخشتا ہے، دنیا میں ان کو دولت ایمان سے محروم کرنے کے لئے ہزاروں فتنے برپا کئے جاتے ہیں، اور بڑی بڑی آزمائشوں سے انہیں گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق وتائید سے ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی۔

اسی طرح برزخ قبر اور حشر میں جو مشکل مرحلے پیش آئیں گے، رحمت وتوفیق ایزدی اس وقت بھی ان کی

دستگیری کرے گی، اور وہ ہر میدان میں توحید اور اتباعِ سنت کے طفیل کامیاب وشادماں رہیں گے۔ سوال قبر کے متعلق جو حدیث صحاح ستہ میں مذکور ہے وہ یہ ہے:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "المسلم إذا سئل في القبر يشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، فذلك قول الله عز وجل": ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ﴾۔ یعنی قبر میں جب ایک مسلمان سے اس کے ربّ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اور اس کے دین کے متعلق سوال کیا جائے گا، تو وہ جواب میں کہے گا: "أشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله"۔ اور یہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا: ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب میت کو دفن کر کے فارغ ہوتے تو اس کے قریب کھڑے ہو جاتے، اور سب کو فرماتے: اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو، اور اس کے لئے ثابت قدمی کی دعا مانگو، کیونکہ اب اس سے پوچھا جا رہا ہے۔ [أبو داؤد]

بہر حال! مؤمن کو اللہ تعالیٰ شانہ قبر میں بھی اور جان کندنی کے وقت بھی تلقین فرماتے ہیں، اور حسن خاتمہ نصیب فرماتے ہیں، کیوں نہیں، کیا ہم نے اپنی زیرکی وسوچ کے ساتھ ایمان کی دولت حاصل کی ہے؟ ہرگز نہیں، یہ نعمتِ عظیمہ اسی ذات کا عطیہ اور بخشش ہے، اور وہ اتنا مہربان اور شفقت والا ہے کہ جب وہ کسی کو ایمان کی دولت عطا فرماتا ہے، تو ہرگز اس سے اس نعمت کو نہیں چھین لیتا، بلکہ اس کی حفاظت بھی فرماتے ہیں، ہمیں یہی امید ہے کہ ہمارا ربّ ہمارے ایمانوں کا خوب تحفظ فرمائے گا، اور اسی پر ہمارا خاتمہ فرما کر قبر کے سوالات کے جوابات تلقین فرمائے گا، جیسے خود فرمایا: ﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ﴾۔

ثابت قدمی کو اپنی طرف نسبت اور منسوب کر کے اتنا کرم فرمایا کہ جس کی حد واندازہ نہ ہو۔ حضرت اعمش سلیمان بن مہران رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ کلمہ شہادت تین مرتبہ پڑھ کر کہتے تھے: "أَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ هٰذِهِ الشَّهَادَةَ وَهِيَ لِيْ عِنْدَ اللّٰهِ وَدِيْعَةٌ"۔ میں اپنے ایمان کے اقرار کو اللہ تعالیٰ کے پاس بطور امانت ودیعت رکھتا ہوں، قیامت کے دن اور مرتے وقت وہ میری امانت کو میرے سپرد فرمائے گا، کیونکہ وہ ذات پاک ہر قسم کی حفاظت پر قادر ہے، اور خیانت سے منزہ اور مکمل پاک ہے، چاہیے کہ ہر مسلمان یہی عمل اپنائے۔ [ابن کثیر] فرمایا:

﴿وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ﴾ یہاں ظالمین سے مراد مشرکین ہیں، جو شجرۂ خبیثہ

کے ممبر ہیں۔مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے شجرۂ طیبہ کو جان بوجھ کر مسترد کیا، اور شجرۂ خبیثہ کو اختیار کیا تو وہ گمراہ ہو گئے، جس کے نتیجے میں وہ قبر کے سوالات کے جوابات دینے سے گمراہ ہو کر محروم رہیں گے۔تینوں سوالوں کے جواب میں ہائے ہائے لَا اَدْرِي کہیں گے، جس کے بعد جہنم کے عذاب اور تنگی وتاریکی قبر کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔[أبو داؤد]

عذاب قبر برحق ہے، اوراس سے انکار مکابرہ ہے:

امام ابن کثیر، امام قرطبی، امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہم اور دیگر بہت سے مشائخ نے چالیس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے عمدہ اور معتبر اسانید کے ساتھ اسی مضمون (عذاب قبر) کی حدیثیں نقل کی ہیں، اور یہ احادیث ستر کے قریب ہیں۔ اسی طرح دس کے قریب آیات قرآنیہ سے بھی عذاب قبر کا ثبوت موجود ہے۔پس اس سے انکار صرف ملاحدہ اور بے دین لوگ کر سکتے ہیں یا کر رہے ہیں، تو کوئی فرق نہیں پڑے گا، ایسے ضعیف العقیدہ لوگ دیگر بہت سے احکام کے بھی منکر ہیں۔اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت دے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝۲۸ جَهَنَّمَ ۚ
يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝۲۹ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ قُلْ
تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ۝۳۰ قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ
يُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۝۳۱

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا، اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر یعنی جہنم میں اتار دیا؟ ۲۸ وہ اس میں داخل ہوں گے، اور وہ رہنے کی بری جگہ ہے ۲۹ اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے مقابل قرار دیدئے تا کہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے گمراہ کر دیں، آپ فرما دیجئے کہ تم مزے کی زندگی گزار لو، پھر بلا شبہ تمہیں دوزخ کی طرف لوٹ کر چلا جانا ہے ۳۰ آپ میرے بندوں سے فرما دیجئے جو ایمان لائے کہ نماز قائم کریں، اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے پوشیدہ طریقے پر اور ظاہر طریقے پر خرچ کریں، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی، اور نہ کوئی دوستی ہوگی ۳۱

معارف ومنازل

نعمتوں کی ناشکری تباہ کن ہوتی ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی نعمت سے مراد حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے رحمت ونعمت بنا کر مبعوث فرمایا، مگر مشرکین مکہ نے ناشکری کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر دانی نہیں کی۔ [بخاري]

مطلب یہ ہے کہ ﴿الَّذِيْنَ﴾ سے مشرکین مکہ مراد ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کے ساتھ امن وامان اور خوشحالی کے ساتھ ٹھہرایا، پھر انہی کی نسل اور انہی کی زبان میں سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کو نازل فرما کر ان کی ہدایت وسعادت کا بہتر سے بہتر انتظام فرمایا تاکہ وہ اس پر ایمان لا کر دائمی سعادت حاصل کریں۔ مگر ان بدقسمتوں نے ایسا نہیں کیا، اور سعادت ونعمت کے بدلے شقاوت اور جہنم خرید کر کے اپنی پوری قوم کو تباہی میں داخل کر دیا۔ اب بجائے ایمان اور جنت کے وہ دوزخ کے ایندھن بنیں گے جو کہ رہنے کے اعتبار سے بہت بری جگہ ہے۔ دراصل یہ سب کچھ بڑے سرداروں اور سرغنوں نے انجام دیا۔ جس کی تفصیل گزر چکی۔

پھر محض یہ نہیں بلکہ وہ آگے بڑھ کر:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾ کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے انداد یعنی برابر کے شریک تجویز کر لئے، عبادت میں، اطاعت وتصرف میں، کمزور اور بے جان پتھروں سے بنے ہوئے بتوں کو اللہ تعالیٰ کا ساجھی اور شریک بنالیا، اور ان میں الوہیت کی صفات کا عقیدہ رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود گمراہ ہوئے اور دیگر بہت سوں کو گمراہ کیا، اور راہ حق سے انہیں ہٹا دیا۔ پھر ان کی سزا بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ﴾ آپ فرما دیجئے کہ تم اس دنیا میں خوب عیش وعشرت کرو، خوب کھاؤ پیو، لہو، چند روزہ زندگی کے عوض آخرت سے غافل رہو، نفع اٹھاؤ، مگر ٹھکانا تمہارا جہنم اور اس کی آگ ہی ہے، وہاں تمہارا قرار ہوگا۔

کفار ومشرکین کی ترہیب کے بعد اہل ایمان کے متعلق ترغیب کا بیان فرمایا:

﴿قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ

﴿يَّأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ﴾ آپ میرے نیک بندوں سے فرمایئے جو ایمان لائے کہ وہ نماز قائم کریں اور جو کچھ مال اللہ تعالیٰ نے انہیں دیا ہوا ہے اس میں سے کچھ اس کی راہ میں خرچ کریں، کبھی پوشیدہ طور پر اور کبھی ظاہری طریقے پر، ابھی دنیاوی زندگی میں قیامت سے پہلے ہر طرح کے اعمال صالحہ بجالاؤ، جبکہ قیامت کے روز نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی، نہ دوستی ویاری ہوگی، نہ شفاعت وسفارش، نہ فدیہ وبدلہ۔ اس دار الاسباب دنیا میں ہر قسم کے ذرائع سے منافع کمانا آسان بھی ہے اور ممکن بھی ہے، لوگ اربوں، کھربوں کی تجارت کرتے ہیں، اسی طرح رشتے ناطے اور یاری دوستی کے ذرائع سے بہت سے کام انجام پاتے ہیں، منت وسماجت اور سفارشوں کے ذریعہ ہزاروں مشکلات پر قابو پاتے ہیں۔ مگر آخرت میں یہ سارے اسباب وذرائع منقطع ہوجائیں گے، وہاں صرف ایمان اور اعمالِ صالحہ کا راج ہوگا اور کچھ نہ ہوگا۔ اس لئے ایمان کے ذکر کے ساتھ اس کے تقاضوں کا تذکرہ فرمایا سب سے اہم اور بنیادی عمل اقامت صلوٰۃ اور، دوسرے نمبر پر انفاق فی سبیل اللہ جو کہ کسی مصلحت کے تحت کبھی ظاہراً ہوگا تاکہ عام لوگوں کے لئے باعث ترغیب ہو، اور کبھی مصلحت کے تحت پوشیدہ ہوگا تاکہ نام ونمود اور ریاکاری کا شبہ نہ ہو۔ دونوں طرح صحیح ہیں۔

قیامت کی سختی صرف کافروں کے لئے ہوگی:

قرآن حکیم نے بار بار قیامت کی سختی پر تنبیہ کی ہے، اور ہر بار یہی کہتا رہا ہے کہ یہ ہولناک سختی صرف کافروں کے لئے ہے مسلمانوں کے لئے نہیں، مسلمانوں میں بہت سے وہ لوگ بھی ہیں جن پر حساب وکتاب بھی معاف ہوگا، وہ بلا روک ٹوک جنت میں جائیں گے، یعنی (چار ارب نوے کروڑ) لوگ۔ اور سات قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو عرش الٰہی کے سایہ میں آرام کررہے ہوں گے۔ ان کے علاوہ دیگر موحدین پر بھی وہ دن سخت نہ ہوگا، ان کے لئے طرح طرح کی سہولتیں بشارتیں ہوں گی۔ مراتب اعمال کے تقاضوں کے مطابق فرمایا: ﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝﴾ [الزخرف] (اس دن تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقی لوگوں کے۔ اے میرے بندو! آج تم پر نہ کوئی خوف طاری ہوگا، اور نہ تم غمگین ہوں گے۔ جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے تھے اور فرنبردار رہے تھے)۔

مؤمنین موحدین ہر طبقہ کے لوگ آپس میں ملا کریں گے، اور بعض بعض کے لئے شفاعت وسفارش بھی کریں گے جن کی شفاعت بھی قبول کی جائے گی، جیسا کہ حدیث میں ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ
رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَ
سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ
مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا فرمایا، اور آسمان سے پانی اتارا، پھر اس کے ذریعہ پھلوں سے تمہارے لئے رزق نکالا، اور تمہارے لئے کشتی کو مسخر فرمادیا تا کہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے، اور اس نے نہروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ﴿۳۲﴾ اور تمہارے لئے سورج اور چاند کو مسخر فرمادیا، وہ برابر حرکت میں ہیں، اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو مسخر فرمادیا ﴿۳۳﴾ اور تم نے اس سے جو کچھ مانگا تم کو اس سب میں سے عطا فرمادیا، اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہیں کر سکتے، بلاشبہ انسان بڑا بے انصاف بڑا ہی ناشکرا ہے ﴿۳۴﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں کا بیان، اور انسان کی ناشکری کا تذکرہ:

اس سے قبل کی آیات میں فرمایا تھا کہ تم اس دن سے پہلے نیک اعمال کا ذخیرہ جمع کر لو جو تمہیں قیامت کے دن کام آئے گا، ورنہ کف افسوس ملتے رہو گے، اس دن کوئی خرید وفروخت نہیں ہوگی تا کہ کوئی دوڑ کر جائے، اور جس عمل کی اس کو ضرورت پڑے کسی شخص سے خرید کر لائے، اس دن کوئی بھائی چارہ، کوئی دوست نہیں، یہاں تک کہ والدین، بیوی، اولاد، اور جگری دوست بھی کام نہیں آئیں گے۔

اب ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے نادر اور بیش قیمت کرشموں پر غور وفکر کی دعوت دی ہے، ان کے ذکر کے ساتھ ساتھ مناسب اور بہت سے مقامات پر "لکم یعنی تمہارے لئے" کا تکرار کتنا معنی خیز ہے، گویا بتایا جارہا ہے کہ تم ہی مقصودِ کائنات ہو، باقی سب کچھ تمہاری بقاء اور نشوونما کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تخلیق ہوا۔ یہ آسمان اور زمین، چاند وسورج، جو تمہاری نظروں سے کہیں پوشیدہ نہیں جنہیں ہر وقت تم دیکھتے اور ملاحظہ

کرتے ہو، یہ دریا اور سمندر اور گردش لیل ونہار، یہ سردی گرمی، سب تمہارے خدمت گزار ہیں، اور تمام اوقات تمہاری خدمت کی بجا آوری میں برابر مصروف ہیں، مجال نہیں کہ وہ تمہیں نظر انداز کریں۔ تم سوتے ہو، آرام کرتے ہو وہ تمہاری نگہبانی کر رہے ہیں اور ڈیوٹی دے رہے ہیں، وہ کبھی نہ آرام کرتے ہیں اور نہ تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں، نہ سستی کرتے ہیں۔

اے بنی آدم! تم مخدوم کی طرح ہو، اور یہ سارے خدمتگار خدمت بجالا رہے ہیں، اے انسان! تو بھی اپنے دل سے پوچھ کہ تجھے کیوں اور کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا؟ اور اس بڑے کارخانہ ہستی کا مخدوم کیونکر بنایا گیا؟ ہوا بھی تیرے لئے ہے، یہ مرصع آسمانی چھت اور کھربوں ستارے بھی تیرے لئے، یہ بارش و پانی، یہ لہلہاتے گلزار وارم بھی تیرے لئے ہیں، یہ کوہ وجبال، یہ سبزہ و باغات بھی تیرے لئے، یہ پرندے اور حیوانات ہزاروں قسم کے سب تیرے لئے، یہ گھنے بادل اور رعد و چمک یہ سب تیرے لئے۔

پھر لطف یہ کہ یہ برگزیدہ ومعصوم انبیاء کرام علیہم السلام کی آمد و بعثت یہ بھی تیرے لئے، غرض یہ کہ علوی و سفلی پوری کائنات سب تیرے لئے ہے۔ ذرا غور کرو! تم کون ہو؟ اور کس مرض کا علاج ہو؟ اور کس مقصد کے لئے ہو؟ ذرا خود کو بھی دیکھو! اور اپنی حیثیت پر غور کرو، اور اپنی اصل بنیاد اور تخلیق پر غور وفکر کرو۔ کیا تجھے اس لئے پیدا کیا گیا کہ خودسری اختیار کرو؟ شتر بے مہار بن کر مخلوقات چاند وسورج، اور ستاروں کی پرستش کرو؟ درختوں، قبروں اور مزارات پر جھکو؟ اپنے ہاتھ سے پتھروں کو تراش کر ان کا سجدہ کرو؟ اور جو مخلوقات تمہارے خدمتگار، نوکر چاکر ہیں، تم ان کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر انہیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھو؟ جو نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ بول سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ کسی نفع کے مالک ہو سکتے ہیں، نہ کسی نقصان کے مالک ہو سکتے ہیں، بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی ست۔

اے انسان! اب آؤ اپنے مقام ومنزلت پر غور کرو کہ تمہارے خالق و مالک تمہارے بارے میں کیا فیصلہ فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ [الإسراء: ۷۰] (بیشک ہم نے عزت دی ہے آدم کی اولاد کو، اور سواری دی ان کو جنگل اور دریا میں، اور روزی دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے، اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا)۔ ہم نے بڑائی دے کر اب تو یہ سب سے افضل و بہتر ہوا۔

یہ ہے تیری شان جو کہ بہت بلند ہے، یہ ہے تیرا مقام جو بہت اونچا ہے، یہ سب کچھ تیرے لئے ہے، اور تو

اپنے خالق و مالک کے لئے ہے، اسی کی بارگاہ صمدیت میں سربسجود ہونا تجھے زیب دیتا ہے، تجھے چاہیے تھا کہ اس کے ہر فرمان پر قربانی پیش کرتا اور اس کے حکموں پر جان نثار کرتا، اور جان و مال تن دھن من کی قربانی دے کر بندگی و اخلاص کا حق ادا کرتا، اور ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ﴾ [التین:۵] (پھر ہم اسے پستی والوں میں سب سے زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں) میں گرنے سے اپنی حفاظت کرتا۔

مطلب اور خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے تمہاری خاطر آسمان اور زمین پیدا کیے، جس پر انسانی وجود کی ابتدا اور بقا موقوف ہے، پھر آسمان سے ہر وقت پانی اتارا جس کے ذریعہ ہر قسم کے ثمرات و پھل پیدا کیے تاکہ وہ تمہارا رزق و روزی بنے، اس میں ہر قسم کی ضروریات خواہ خوراک سے متعلق ہوں یا لباس سے متعلق ہوں، سب آگئیں، یہاں تک کہ رہنے سہنے کے مکان بھی اس میں داخل ہوئے، کیونکہ لفظِ رزق ان سب کو شامل ہے، پس انسان کی فضیلت و برتری سب پر ثابت ہوگئی۔

پھر فرمایا کہ جہاز اور کشتیوں کو تمہارے کام میں لگا دیا، سمندر میں چلتے ہیں لاکھوں ٹن سامان ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہنچاتے ہیں، لکڑی، لوہے، پیتل اور دیگر اشیاء سے بڑے بڑے جہاز پہاڑوں جیسے تم بنا کر سمندر میں چلاتے ہو، یہ سب اللہ تعالیٰ کی تسخیر کے ساتھ ہیں، یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا فرمائیں، اور تمہارے ہاتھوں اور دماغ میں ایجاد اور صناعت کی قوت رکھ کر تمہاری رہنمائی کی، ورنہ تم تو اپنے وجود تک کے مالک بھی نہیں ہو۔ خوب سمجھ لو، یہ کس کی ایجاد ہے، اور کس کی عطا ہے؟

پھر فرمایا: یہ آفتاب عالمتاب، سورج اور چاند، جو بغیر کسی ٹیکنالوجی اور انجن کے اور بغیر کسی ایندھن اور تیل کے کتنی بلندیوں پر بغیر کسی موسمی اور فنی خرابی کے لگاتار ایک تکوینی نظام کے تحت مسخر ہیں، اور بڑے سلجھے ہوئے طریقے سے رواں دواں ہیں۔ ذرا غور کرو کہ اس بڑے عالمگیر نظام کا اصلی موجد کون ہے؟ جس کے حکم سے یہ محیر العقول نظام چل رہا ہے، مجال نہیں کہ اس میں کوئی پس و پیش یا شکست و ریخت ہو، یہ سب تمہارے پروردگار کی تسخیر اور اسی کی حکمرانی ہے: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ۔

پھر رات اور دن کے نظام اور ان کے فوائد و منافع اور متضاد مقاصد کو دیکھو، اور خوب غور کرو، اگر ہمیشہ دن ہوتا یا ہمیشہ رات ہوتی تو تمہاری زندگی اجیرن بن جاتی اور تمام اقدار اور زندگی کی خوشحالیاں درہم برہم ہو جاتیں، مگر وہ واحد، قدوس، حکیم و خبیر، نے ایک ایسا نظام تسخیری مرتب فرمایا، جس پر تمہاری بقاء کے آثار روشن اور کارگر ہوئے: ﴿وَ

﴿اِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ [البقرۃ: ١٦٣] (اور تمہارا معبود ایک ہی ہے، کوئی معبود نہیں سوائے اس کے)۔

پھر اجمالاً دوسری نعمتوں کا ذکر فرمایا:

﴿وَاٰتٰـكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ﴾ اور جو کچھ تم نے اللہ تعالیٰ سے مانگا اس سب میں سے تمہیں عطا فرما دیا۔ اگر چہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور عطا کسی مانگنے پر موقوف نہیں، ہم نے تو اپنا وجود بھی نہیں مانگا تھا، اس نے اپنے فضل و کرم سے ہر وہ کچھ عطا کیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو، یہی مثال جنت اور اس کی نعمتوں کی ہے کہ وہ بن مانگے وہی کچھ عطا فرماتے ہیں جو کسی کے وہم و خیال سے بالاتر ہوں۔ ؎

ما نبودیم و تقاضا ہم نبود ☆ لطف تو نا گفتہ ما می شنود

اسی طرح آسمان و زمین، چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، سمندر وغیرہ عظیم نعمتوں کے پیدا کرنے کی دعا کسی نے نہیں مانگی، یہ سب کچھ بن مانگے مالک نے عطا کئے۔ البتہ مانگنے پر وہ سب کچھ عطا فرماتے ہیں، بشرطیکہ وہ چیز انسان کے حق میں مفید بھی ہو، اور اسی طرح اس کے علم و حکمت میں جو چیز سائل کے لئے اس کے اقرباء اور عوام کے لئے یا پورے عالم کے لئے، اگر نقصان دہ یا غیر مفید ہو وہ شفقتاً اور رحمۃً وہ چیز عطا نہیں کرتے، اس کی جگہ کسی آنے والی مصیبت کو دور کرتے ہیں، یا اس کی جگہ کوئی دوسری مفید چیز عطا فرماتے ہیں، یا ذخیرہ بنا کر آخرت میں عطا فرماتے ہیں۔ [الحدیث]

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرو تو شمار نہیں کر سکتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تمام کائنات کی تخلیق انسان کے لئے ہے جس کے ہر ہر ذرے میں کسی نہ کسی طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کا نفع اور کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور پوشیدہ ہے، اب ان تمام نعمتوں اور امکانی منفعتوں کو ہر انسان کیسے اور کس طرح شمار کر سکتا ہے، اگر سارے انسان ملکر شمار کرنا چاہیں تب بھی یہ ممکن نہیں، یہ بیچارہ انسان اپنے حسن و جمال کے بالوں کو اور اپنے سانس کی نزاکتوں کو اور اپنے بدن کے مساموں کو جن سے پسینہ آتا ہے آج تک شمار نہیں کر سکا ہے، اور آئندہ بھی نہیں کر سکے گا، تو کیسے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو حساب کرے گا؟ بس شاکر و مؤمن انسان صرف اتنا کہے کہ میں آپ کی بے شمار نعمتوں اور عنایتوں کا شکر گزار ہوں اور رہوں گا۔ واللہ اعلم

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ﴾ بیشک انسان بہت ظلم کرنے والا، بڑا ناشکرا ہے۔ یہ دونوں صیغے مبالغہ کے لئے ہیں، انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتا ہے، سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے، اسی طرح چاند اور

ستاروں سے بھی رات کی ٹھنڈک اور تاریکی سے بھی، اسی طرح ہوا سے، پانی سے، پہاڑوں سے، اور ما کولات و مشروبات سے۔ غرض ہر چیز سے پھر شکر بھی نہیں کرتا، اور ان نعمتوں کو غلط بلا موقع خرچ کرتا ہے، تو ظالم بھی بنا، یہی حال دیگر تمام نعمتوں کا ہے۔ اس لئے یہ ظلوم بھی اور جہول و جبار اور کفار بھی ہے۔

پھر ناشکر و ظالم انسان کے حالات کے بیان کے بعد، ایک عظیم ہستی جو کہ ہر میدان میں صابر و شاکر رہا، اور عدل و انصاف کا عظیم پیکر رہا، سید الموحدین، رئیس الشاکرین، امام الصابرین، سیدنا ابراہیم الخلیل علیہ السلام کا ذکر خیر فرمایا:

❁ ❁ ❁

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهِيۡمُ رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجۡنُبۡنِىۡ وَبَنِىَّ اَنۡ نَّـعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ؕ‏ ﴿۳۵﴾ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضۡلَلۡنَ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ‌ ۚ فَمَنۡ تَبِعَنِىۡ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡ‌ ۚ وَمَنۡ عَصَانِىۡ فَاِنَّكَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ‏ ﴿۳۶﴾ رَبَّنَاۤ اِنِّىۡۤ اَسۡكَنۡتُ مِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ بِوَادٍ غَيۡرِ ذِىۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَيۡتِكَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهۡوِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ وَارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡكُرُوۡنَ‏ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے ربّ! اس شہر کو امن و امان والا بنا دیجئے، اور مجھے اور میرے فرزندوں کو اس سے دور رکھیئے کہ ہم بتوں کو پوجیں ﴿۳۵﴾ اے میرے ربّ! بلاشبہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا، سو جو شخص میری پیروی کرے بلاشبہ وہ مجھ سے ہے، اور جو شخص میری نافرمانی کرے تو بلاشبہ آپ بخشنے والے ہیں مہربان ہیں ﴿۳۶﴾ اے ہمارے ربّ! میں نے اپنی اولاد کو آپ کے محترم گھر کے نزدیک ایسی وادی میں ٹھہرایا ہے جو کھیتی والی نہیں ہے، اے ہمارے ربّ! تاکہ وہ نماز قائم کریں، سو آپ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دیجئے، اور انہیں پھلوں میں سے روزی عطا فرمایئے تاکہ شکر ادا کریں ﴿۳۷﴾

معارف و منازل

سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کے متعلق تفصیلی واقعات کا وہاں مطالعہ کیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی حضرت سارہ رضی اللہ عنہا بے اولاد تھیں، جب ان کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ رقابت اور ناچاقی میں مزید اضافہ کیا، اور انہیں بہت پریشان کیا، اس مرحلے میں براق پر سوار کر کے شام فلسطین سے

بلد الحرام مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ماں بیٹے کے اس سفر سے آنے والے وقت کے لئے اور کعبۃ اللہ کی تعمیر، آب زمزم، مناسک حج اور قربانی کی ادائیگی وغیرہ کے لئے اس کو سبب اور ذریعہ بنانے کا فیصلہ فرمالیا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ اطلاع بھی فرما چکے تھے۔

تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بخوشی یہ سب کچھ منظور کیا، اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور ان کے نومولود شیر خوار بچے کو مکہ مکرمہ لے آئے، اور جبل صفاء کے دامن میں ایک بیری کے درخت کے نیچے چھوڑ گئے۔ کچھ کھجور، ایک چھوٹے مشکیزہ میں پانی ان کے سپرد کر کے روانہ ہو گئے، اور پہاڑی پر جب پہنچے تو ہاتھ اٹھا کر دعا کی اے میرے ربّ! اس شہر کو (اس وقت شہر تو کیا کعبہ شریف بھی موجود نہ تھا) امن وامان والا بنادیں، اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے محفوظ رکھیں، ان بتوں کے ذریعہ بہت سے لوگ گمراہ ہو چکے ہیں، میں ان لوگوں سے بیزار ہوں، جو شخص میرا اتباع کرے توحید کی راہ پر چلے وہ میرا ہے، اور جو شخص میری نافرمانی کرے، توحید اختیار نہ کرے وہ میرا نہیں ہے، آپ اسے ہدایت دے کر مغفرت کے راستے پر ڈال سکتے ہیں، اور اس پر رحم فرما سکتے ہیں۔

ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی عرض کیا کہ میں آپ کے معظم گھر (کعبہ شریف) کے قریب اس وادی (میدان) میں اپنی بعض اولاد کو چھوڑ رہا ہوں، یہ میدان کھیتی والا نہیں ہے، آپ کے حکم کی تعمیل میں یہاں بسا رہا ہوں، آپ میری اس ذریت کو اور اس کی نسل کو ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کی توفیق دیجئے، میں انہیں یہاں اس لئے چھوڑ رہا ہوں کہ نماز قائم کریں (نماز ایمان کے بعد اسلام کا سب سے بڑا رکن ہے اس لئے دعا میں اس کا خصوصی ذکر فرمایا، اس میں دیگر اعمال صالحہ کی دعا بھی آگئی)۔ میری نسل کے یہ لوگ خود بھی دین پر چلنے والے بنیں اور دوسروں کے لئے بھی مقتدا بن جائیں، اور دنیا کے لوگوں کے دل ان کی طرف پھیر دیں، (مائل کریں) تاکہ ان سے ایمان اور اعمالِ صالحہ سیکھ سکیں (یہ تو ان کی دینی زندگی کے لئے دعا کی)۔

اور ان کی دنیاوی زندگی اور خوراک وغذا کے لئے یوں دعا کی کہ اے ہمارے ربّ! انہیں پھل عطا فرمایئے تاکہ یہ شکر گزار ہوں، گو یہ جگہ ایسی ہے جہاں چٹیل میدان ہے، نہ کھیتی ہے نہ سبزہ اور نہ ہی پینے کا پانی، ہر طرف سنسان ہے، لیکن آپ اپنی قدرت کاملہ سے ان کو پھل نصیب فرمائیں۔ ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جنہیں ان کی والدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مکہ معظمہ میں چھوڑ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کی نسل کو کہاں سے کہاں تک پہنچایا، سردار دو جہاں، سید الاولین والآخرین، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی کی نسل سے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابراہیمی بھی ہیں،

"ہاں! اسی کا حکم ہے"۔ یہ سنتے ہی رک گئیں اور کیفیت بدل گئی، اور گھبراہٹ ختم ہوگئی، کہنے لگیں: إذًا لا يضيعنا۔ اب اللہ تعالیٰ ہمیں بے یار و مددگار ہرگز نہیں چھوڑیں گے، ضائع نہیں کریں گے، خدا حافظ آپ جاسکتے ہیں۔ وہاں سے لوٹ کر اطمینان کا سانس لے کر اپنے بچے کے پاس آئیں، اور اعتماد علی اللہ کے سایہ میں درخت کے نیچے رہنے لگیں۔

القصہ۔ عبرت اور سبق سیکھنے والے اس پیکر صدق و ایمان عورت کے اعتماد اور توکل علی اللہ کے جذبہ سے سبق سیکھیں، اور یاد کریں جس نے توکّل ایمانی کا ایک ایسا بے مثال نمونہ پیش کیا جس کو کوئی بھی پیش نہیں کرسکتا، اس پر غور کرنے کے بعد صورت حال معلوم ہوسکتی ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ۭ وَمَا يَخْفٰى عَلَي اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ
وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَي الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ
رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَ
تَقَبَّلْ دُعَاۗءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝

ترجمہ: اے ہمارے ربّ! بلا شبہ آپ وہ سب کچھ جانتے ہیں جو ہم چھپاتے ہیں، اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں، اور زمین میں اور آسمان میں اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے ۝ سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمایا، بلا شبہ میرا ربّ دعا کا سننے والا ہے ۝ اے میرے ربّ! مجھے نماز کا قائم کرنے والا رکھیئے، اور میری اولاد میں سے بھی ۝ اے ہمارے ربّ! اور میری دعا قبول فرمائیے، اے ہمارے ربّ! میری مغفرت فرمائیے، اور میرے والدین کی اور مؤمنین کی جس دن حساب قائم ہوگا ۝

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مزید دعاؤں کا تذکرہ ہے:

﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل کا قول ہے کہ ﴿مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ﴾ سے مراد ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑنے کا غم جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

مطلب یہ ہے اے ہمارے ربّ! آپ جانتے ہیں جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ہم ظاہر کرتے ہیں، آپ ہماری نیتوں، ارادوں، قلبی احوال اور تمام اعمال سے باخبر ہیں، زمین میں اور آسمان میں غرض پوری کائنات کی چیزوں اور ذرات سے آپ باخبر ہیں، کوئی ادنیٰ اور باریک چیز بھی آپ سے پوشیدہ نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے یوں کہا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے اور ضعیفی میں اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام دونوں بیٹے عطا فرمائے۔ اور یہ بھی عرض کیا کہ بیشک میرا ربّ دعا قبول فرمانے والا ہے۔

سورۂ صافات میں ان کی دعاء مذکور ہے: ﴿رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝١٠٠ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝١٠١﴾ [الصافات:] (میرے پروردگار! مجھے ایک ایسا بیٹا دیدے جو نیک لوگوں میں سے ہو۔ چنانچہ ہم نے انہیں ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی)۔ اب اسی دعا کی قبولیت کا شکر ادا کر رہے ہیں، پھر یوں دعا کی:

﴿رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ﴾ اے میرے ربّ! مجھے نماز قائم کرنے والا رکھ، اور میری ذریت میں سے بھی نماز قائم کرنے والے بنایئے۔ اے ہمارے ربّ! ہماری دعا کو قبول فرمایئے، پھر اپنے لئے اور اپنے والدین کے لئے، اور تمام مؤمنین کے لئے مغفرت کی دعا کی، جس دن حساب قائم ہو۔

صاحب مظہری فرماتے ہیں کہ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والدین مؤمن تھے، اور آزر ان کا چچا ہے، والد نہیں، وغیرہ۔ یا یہ کہا جائے جیسے سورۂ توبہ میں بیان ہوا: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ﴾ [التوبۃ: ۱۱۴] (اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت طلب کرنا اسی وعدے کی وجہ سے تھا جو ان کے ساتھ کیا تھا)۔ تفصیل وہاں دیکھیں۔

لہٰذا یہ دعا بیزار ہونے سے پہلے کی ہے، جب والد کی موت علی الکفر کا علم نہ ہوا تھا اور مسلمان ہونے کی انہیں امید بندھی ہوئی تھی، آیت بالا میں والدہ کے لئے بھی دعاء مغفرت کرنے کا تذکرہ ہے، اگر وہ ایمان لے آئی تھیں تو کوئی اشکال نہیں، اور اگر وہ ایمان نہیں لائی تھیں تو ان کے بارے میں بھی وہی بات کہی جائے گی جو والد کے بارے میں عرض کی گئی۔ واللہ اعلم

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۝٤٢

مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۝٤٣ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ

يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نُجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ
الرُّسُلَ ۗ أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِنْ زَوَالٍ ﴿٤٤﴾ وَسَكَنْتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِينَ
ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ ﴿٤٥﴾ وَقَدْ مَكَرُوا مَكْرَهُمْ
وَعِنْدَ اللَّهِ مَكْرُهُمْ ۗ وَإِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُولَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿٤٦﴾ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ مُخْلِفَ وَعْدِهِ
رُسُلَهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿٤٧﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کو ان کاموں سے بے خبر مت سمجھیے جو ظالم لوگ کرتے ہیں، بات یہی ہے کہ وہ انہیں ایسے دن کے لئے مہلت دیتا ہے جس میں آنکھیں اوپر کو اٹھی رہ جائیں گی ﴿۴۲﴾ یہ لوگ دوڑ رہے ہوں گے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے، ان کی نظر ان کی طرف واپس نہ لوٹے گی اور ان کے دل ہوا ہوں گے ﴿۴۳﴾ اور آپ لوگوں کو اس دن سے ڈرائیے جس دن ان کے پاس عذاب آئے گا سو جن لوگوں نے ظلم کیا وہ یوں کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! تھوڑی سی مدت کے لئے ہمیں مہلت دیجیے، ہم آپ کے بلاوے کو قبول کریں گے، اور رسولوں کا اتباع کریں گے، کیا تم نے اس سے پہلے قسم نہ کھائی کہ ہمیں کہیں جانا ہی نہیں؟ ﴿۴۴﴾ حالانکہ تم ان لوگوں کے رہنے کی جگہوں میں رہتے تھے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور یہ بات تم پر ظاہر ہوگئی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا معاملہ کیا، اور ہم نے تمہارے لئے مثالیں بیان کیں ﴿۴۵﴾ اور ان لوگوں نے اپنا مکر کیا، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کا مکر ہے، اور واقعی ان کا مکر ایسا تھا کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں ﴿۴۶﴾ سو اے مخاطب! تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ خیال نہ کر کہ وہ وعدہ خلافی کرنے والا ہے اپنے پیغمبروں سے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ غلبہ والا ہے، بدلہ لینے والا ہے ﴿۴۷﴾

معارف ومنازل

مشرکین شور مچاتے تھے کہ ہمارا مذہب برحق ہے، اگر ہم حق پر نہ ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کے مطابق ہم پر عذاب آجاتا، اور کبھی وہ خود عذاب کا مطالبہ بھی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عذاب کے آنے میں تمہارا کفر مانع نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت مانع ہے، کیونکہ مکذّبین کے لئے اللہ تعالیٰ نے امہال کا ضابطہ بھی رکھا ہوا ہے، اور پیغمبر کا وجود مسعود بھی عذاب کے آنے میں رکاوٹ ہے۔

ہاں! جب قیامت کا دن آئے گا تب ہر شخص کو پتہ چلے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کے عذاب دینے اور اعمال بد سے

غافل نہ تھے، بلکہ اپنی حکمت کے تحت عذاب مؤخر فرمایا تھا، اور قیامت کے دن عذاب آنے پر ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی، یعنی اوپر اٹھی رہیں گی، خیرہ ہوجائیں گی، حرکت نہ کرسکیں گی۔ سورۂ اعراف میں فرمایا: ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾[الأعراف: ۱۸۲] (ہم ان کو ڈھیل دیں گے جہاں سے ان کو پتہ بھی نہ چلے)۔ اللہ تعالیٰ کا استدراج مبنی برحق اور حکمت کے موافق ہے۔ فرمایا:

﴿مُهْطِعِيْنَ﴾ وہ دوڑنے والے ہوں گے۔

﴿مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ﴾ اپنے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے، یہ اونٹ کے ساتھ تشبیہ ہے، اونٹ جب تیز بھاگتا ہے تو اپنے سر کو اوپر اٹھا کر بھاگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حواس باختہ ہو کر بھاگیں گے، نیچے دیکھنے کی ہمت نہ ہوگی۔

﴿لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ﴾ ان کی نگاہیں ان کی طرف واپس نہیں پلٹیں گی، یعنی اوپر ہی لگی رہیں گی، اور نیچے کی طرف نہیں آسکیں گی۔

﴿وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ﴾ دہشت کے مارے ان کے دل اڑے جارہے ہوں گے، یعنی بدحواسی کے عالم میں برداشت اور صبر سے خالی ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی آنکھیں، سر، دماغ اور قلوب سب پر ناقابلِ برداشت عذاب کا نزول ہوگا۔ لہٰذا مواخذے میں کچھ دیر لگنے کی وجہ سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بس یہی دنیا کی زندگی ہے یا یہ سمجھے کہ ہم برحق ہیں، اس لئے عذاب نہیں آیا، یہ سب غلط ثابت ہوا، پس عذاب آگیا، دنیا میں ڈھیل رہی، عقبیٰ میں کوئی ڈھیل نہیں۔

﴿وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ﴾ آپ لوگوں کو اس دن سے ڈرائیں کہ جس دن ان کے پاس عذاب آجائے گا اس وقت یہ لوگ حیلے بہانے کریں گے اور کہیں گے:

﴿فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ﴾ یہ ظالم کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی دیر کے لئے مہلت دے کر دنیا میں واپس بھیج دے۔

﴿نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ﴾ اب ہم وہ پرانے طرز پر نہیں رہیں گے، بلکہ ہم تیری دعوت بسروچشم قبول کریں گے، اور آپ کے رسولوں علیہم السلام کا اتباع کریں گے۔ سورۂ منافقون میں بھی اسی طرز کا بہانہ مذکور ہے۔ ﴿فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾[المنافقون: ۱۰] (پس وہ کہے

گا: اے میرے ربّ! مجھے تھوڑی دیر کے لیے اور مہلت کیوں نہ دے دی کہ میں خوب صدقہ کرتا، اور نیک لوگوں میں شامل ہو جاتا)۔ پھر جواب ملے گا: ﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا﴾ [المنافقون:۱۱] (ہرگز اللہ تعالیٰ مہلت نہیں دیتا کسی نفس کو جب اس کا وقت پورا ہو جائے)۔

سورۂ الٓمٓ سجدۃ میں ہے: ﴿رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا﴾ [السجدۃ:۱۲] (اے اللہ تعالیٰ! ہم نے سب کچھ دیکھ لیا اور سن لیا اب ہمیں واپس بھیج دے، ہم نیک اعمال کریں گے)۔

جواب: ﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ﴾ [فاطر:۳۷] (کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی تھی جس میں اگر کوئی نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو حاصل کر لیتا، اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا تھا)۔ یہ جواب دوزخیوں کو دیا جائے گا، یعنی ہم نے تم کو عقل دی، اور لمبی عمر بھی دی، انبیاء کرام علیہم السلام کو سمجھانے کے لئے بھیجا، گردوپیش تباہ شدہ اقوام کے مساکن اور بستیاں تمہیں دکھا دیں اور ان کی تباہی کے اسباب اور عوامل تمہیں بتا دیئے، غرض یہ کہ سمجھانے کے سارے وسائل مہیا کئے، کیا اس کے بعد بھی کوئی عذر باقی رہا؟ اب عذاب چکھو، کسی مدد کی توقع نہ رکھو۔ اللہ تعالیٰ کا جواب:

﴿اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ﴾ کیا تم اس سے پہلے دنیا میں غرور میں تھے، دنیاوی زندگی کو اپنی آخری منزل سمجھتے تھے، اور آخرت کا مذاق اڑاتے تھے، اور دنیوی زندگی اور اقتدار کو ناقابلِ تسخیر و لازوال کہتے تھے، اور ڈرانے والوں پر طعن و تشنیع کرتے تھے، اور: ﴿وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ﴾ [الشعراء:۱۳۸] (اور ہمیں عذاب نہیں ہوگا) کہتے رہتے تھے، اور ﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ﴾ [النحل:۳۸] (اور وہ اپنی مضبوط قسمیں کھاتے تھے کہ جو مر جائے اللہ اسے نہیں اٹھائے گا)۔

یہ ہے تمہاری وہ پختہ قسم کہ ہر حال میں ہماری جیت ہے، ہم پر کوئی زوال نہیں آئے گا۔ فرمایا:

﴿وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ﴾ کیا تمہارے لئے یہ باعث عبرت نہیں کہ تم لوگ جن بستیوں میں رہائش پذیر تھے، اور جن گھروں میں رہتے تھے، تمہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کی بستیاں ہیں، اور ان لوگوں کے گھر ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو جھٹلایا اور اپنی جانوں پر ظلم کیا اور تمہیں یہ بھی معلوم تھا کہ جو لوگ ان بستیوں میں کروفر اور خوشحالیوں کے ساتھ رہتے تھے، اور ان گھروں میں بستے تھے کفر و سرکشی کی وجہ سے ان پر استیصالی عذاب آیا، اور صفحۂ ہستی سے انہیں مٹا کر رکھ دیا گیا، تم ان سے عبرت نہیں

سیکھتے ہو، یہ لوگ عاد و ثمود وغیرہ، وہ لوگ تمدن وتہذیب، صنعت و بہادری، مال و سرمایہ کے اعتبار سے تم سے کئی گنا زیادہ طاقتور تھے، آج ان کا نام ونشان نہیں ہے سوائے مکانوں کے شکستہ کھنڈرات کے۔

﴿وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ﴾ ہم نے تباہ شدہ اقوام کی تباہی کو تمہارے سامنے بطور مثال پیش کر دیا ہے، اگر تم نے عبرت نہ سیکھی تو تمہارا حشر بھی ان کی طرح ہوگا، مختلف نہ ہوگا۔

﴿وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ﴾ ان کی تمام تدبیروں کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس تھا، اور ان کا توڑ اور انہیں ناکارہ کرنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

﴿وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ﴾ ان کی خفیہ تدبیریں اتنی بڑی حیران کن تھیں کہ ان کی وجہ سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے سرک جائیں، مبالغہ ہے، یعنی ان کفار ومعاندین کے مکر اتنے گہرے اور خطرناک ہوتے تھے کہ قریب تھا کہ ان سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔ یا معنی ہوگا کہ عزم وہمت کے کوہ واستقلال کے پہاڑ (حضرات انبیاء کرام علیہم السلام) اگر اللہ تعالیٰ کی نصرت ومدد اور نگرانی نہ ہوتی ان کے پائے استقلال میں بھی جنبش آجائے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے: ﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا﴾ [الإسراء: ۷۴] (اور اگر ہم نے تمہیں ثابت قدم نہ بنایا ہوتا تو تم بھی ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے)۔ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ انبیاء معصومین علیہم السلام کے آپ سردار ہیں، جن کی عصمت کی حفاظت حق تعالیٰ اپنے فضل خصوصی سے کرتا ہے، تو ان چالاک شریروں کے مکروفریب بازیوں سے بہت ہی معمولی تھوڑا سا ادھر جھکنے کے قریب ہوجاتے۔ مگر انبیاء کرام علیہم السلام کی عصمت کا تکفل ان کا پروردگار کر چکا ہے، تو ایسا نہ ہوا۔

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ﴾ سو اے انسان! تو اللہ تعالیٰ شانہ کے بارے میں ہرگز یہ خیال نہ کر کہ اس نے اپنے رسولوں علیہم السلام سے فتح ونصرت کا جو وعدہ کیا ہوا ہے وہ اس کی وعدہ خلافی کرتا ہے، یا کرے گا، آپ کے ربّ کا یہ پختہ اور پکا وعدہ ہے: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [غافر: ۵۱] (یقیناً ہم اپنے پیغمبروں اور ایمان لانے والوں کی دنیوی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں، اور اس دن بھی کریں گے جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے)۔

یہ پختہ وعدہ جس طرح رسولوں علیہم السلام کے ساتھ ہے، اسی طرح ان کے متبعین عام مؤمنوں کے ساتھ بھی ہے،

اور ہر قسم کے عجز و ناتوانی سے بھی منزہ اور پاک ہے، جب چاہے نصرت فرمائے، اور جب چاہے دشمنوں کے مکر و فریب پر غلبہ پائے، اور ان کی تدبیروں کو ناکام بنائے، جب چاہے مشرکین کو عذاب دیدے، جب چاہے انہیں ڈھیل دیدے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿٤٨﴾ وَتَرَى
الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِ ﴿٤٩﴾ سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ
النَّارُ ﴿٥٠﴾ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٥١﴾ هٰذَا بَلٰغٌ
لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٥٢﴾

ترجمہ: جس روز زمین دوسری زمین سے بدل جائیگی، اور آسمان بھی بدل جائیں گے، اور سب لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے ظاہر ہو جائیں گے جو واحد قہار ہے ﴿۴۸﴾ اور اے مخاطب! تو اس دن مجرموں کو اس حال میں دیکھے گا کہ وہ باہم آپس میں بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہوں گے ﴿۴۹﴾ اور ان کے کرتے قطران کے ہوں گے، اور ان کے چہروں کو آگ نے ڈھانک رکھا ہوگا ﴿۵۰﴾ تاکہ اللہ تعالیٰ ہر جان کو اس کے کئے ہوئے اعمال کی سزا دے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے ﴿۵۱﴾ یہ پہنچا دینا ہے لوگوں کو، اور تاکہ وہ اس کے ذریعہ ڈرائے جائیں، اور تاکہ وہ جان لیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے، اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں ﴿۵۲﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں قیامت کی سختیوں اور ہولناکیوں کا تذکرہ ہورہا ہے۔ فرمایا:

﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ کہ قیامت کے روز یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی، اور آسمان بھی بدل جائیں گے۔ بدلنے کا کیا مطلب ہے؟ ان کی ذات بدل دی جائے گی، یا صفات بدل دی جائیں گی۔ اس کے بارے میں صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ تبدیلی کی دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں، اور آیت کریمہ کسی ایک معنی کے لئے نص صریح نہیں ہے، پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ زمین اس طرح بدل

دی جائے گی کہ کچھ بڑھا دی جائے، کچھ کمی کر دی جائے گی، اس کے ٹیلے اور پہاڑ اور نشیب وفراز اور درخت اور اس میں جو کچھ بھی ہے سب ختم ہو جائے گا، اور زمین کو چمڑے کی طرح پھیلا دیا جائے گا جو بالکل ہموار اور برابر ہو جائے گی، اور اس میں کوئی نشیب وفراز، بلندی وپستی نظر نہ آئے گی۔

اور آسمانوں کو اس طرح بدل دیا جائے گا کہ چاند، سورج اور ستارے سب ختم ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو فرمایا ہے یہ قرآن کریم کی آیات اور بعض احادیث صحیحہ مرفوعہ کے موافق ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا﴾ [طٰہٰ: ١٠٧] (اور لوگ آپ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں، سو آپ فرما دیجئے کہ میرا ربّ ان کو بالکل اڑا دے گا، پھر زمین کو ایک ہموار میدان کر دے گا کہ جس میں تو نہ ناہمواری دیکھے گا اور نہ کوئی بلندی دیکھے گا)۔

اور سورۂ زمر میں فرمایا: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [الزمر: ٦٧] (اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنی چاہیے تھی، حالانکہ ساری زمین اس کی مٹھی میں ہو گی، قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں، وہ پاک ہے اور برتر ہے ان کے شرک سے)۔

اور سورۂ انبیاء میں فرمایا: ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ﴾ [الأنبياء: ١٠٤] (وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے جس روز ہم آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے مضمونوں کا کاغذ لپیٹ لیا جاتا ہے، ہم نے جس طرح شروع میں پیدا کیا اسی طرح لوٹا دیں گے)۔

اور سورۂ حاقہ میں فرمایا: ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ۝۱۴ فَيَوْمَىِٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ۝۱۵ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَىِٕذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ۝۱۶﴾ [الحاقة] (پھر جب صور میں یکبارگی پھونک ماری جائے گی، اور زمین اور پہاڑ اٹھا لئے جائیں گے، پھر دونوں ایک دفعہ میں ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے، تو اس روز وہ ہونے والی چیز ہو پڑے گی، اور آسمان پھٹ جائے گا، اور وہ اس روز بالکل بودا ہو گا)۔

اور سورۂ معارج میں فرمایا: ﴿يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ۝۸ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ۝۹﴾ [المعارج] (جس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا، اور پہاڑ رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے)۔

اور سورۂ تکویر میں فرمایا: ﴿وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ﴾ [التکویر: ١١] (اور جب آسمان کھل جائے گا)۔

اور سورۃ الانشقاق میں فرمایا: ﴿اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝۱ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝۲﴾ [الانشقاق] (جب آسمان پھٹ جائے گا، اور اپنے ربّ کا حکم سن لے گا، اور وہ اسی لائق ہے، اور زمین کھینچ کر بڑھا دی جائے گی، اور اپنے ربّ کا حکم سن لے گی)۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ سفید زمین پر جمع ہو جائیں گے، اس کے سفید رنگ میں کچھ مٹیالے رنگ کی ملاوٹ ہوگی، اور وہ میدے کی روٹی کی طرح ہوگی، اس میں کسی کی کوئی نشانی نہ ہوگی۔ [بخاري] حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن زمین ایک روٹی بنی ہوئی ہوگی، جبار جل شانہ اسے اپنے دست قدرت سے اس طرح الٹ پلٹ فرمائے گا جس طرح تم اپنی روٹی کو سفر میں الٹ پلٹ کرتے ہو، یہ زمین اہل جنت کو کھانے کے لئے ابتدائی مہمانی کے طور پر پیش کی جائے گی۔ [بخاري]

تاکہ وہ زمین کے سارے مزے مجموعی طور پر چکھ لیں، اور اس کے بعد جنت کے مزے چکھیں تو لطف دوبالا ہوگا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے سرور عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے ﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ﴾ فرمایا ہے (جس سے آسمان اور زمین کا بدل جانا معلوم ہوتا ہے) اس کے بارے میں ارشاد فرمائیے کہ اس روز لوگ کہاں ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس روز لوگ پل صراط پر ہوں گے۔ [مشکوۃ]

وضاحت:

یہ متعدد آیات کریمہ اور احادیث شریفہ ہیں ان میں تبدیل صفت کا ذکر ہے، البتہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے (جو سب سے آخر میں نقل کی گئی ہے) زمین کی ذات تبدیل ہونے کی طرف اشارہ مل رہا ہے، مرقات شرح مشکوۃ میں اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے: **والظاهر من التبديل تغيير الذات كما يدل عليه السوال والجواب حيث قالت فاين يكون الناس يومئذ قال على الصراط۔** [مرقات]

صاحب روح المعانی نے ابن الانباریؒ کا قول نقل فرمایا ہے کہ آسمان کی تبدیلی بار بار ہوگی، کبھی اس کو لپیٹا جائے گا اور کبھی تلچھٹ کی طرح اور کبھی ﴿وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ [الرحمن: ۳۷] (لال چمڑے کی طرح سرخ گلاب) ہو جائے گا۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ زمین کی تبدیلی اس طرح ہوگی کہ وہ سفید زمین ہوگی گویا کہ چاندی سے ڈھالی گئی ہے، اس میں کسی کا خون نہ بہایا گیا ہوگا، اور اس پر کوئی گناہ نہ کیا گیا ہوگا۔ پھر بعض حضرات سے یوں نقل کیا گیا ہے کہ اولاً صفت بدل دی جائے گی جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، پھر اس کی ذات بدل دی جائے گی، اور یہ ذات کا بدلنا اس کے بعد ہوگا جب وہ اپنی خبریں بتا چکی ہوگی۔ (جس کا ذکر سورۃ الزلزال میں ہے)۔ اس کے بعد صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: "وَلَا مَانِعَ مِنْ اَنْ یَکُوْنَ هُنَا تَبْدِیْلَاتٌ عَلٰی اَنْحَاءٍ شَتّٰی"۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ کہ لوگ اللہ تعالیٰ واحد قہار کے لئے ظاہر ہو جائیں گے، یعنی قبروں سے نکل کر محشور اور مجتمع ہو جائیں گے تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فیصلہ فرمائے۔ اللہ تعالیٰ واحد تنہا ہے، اور قہار ہے، جو فیصلہ صادر فرمائے کوئی اس کے فیصلے کو ٹال نہیں سکتا، وہ غالب و قہار بھی ہے، اور جبار بھی ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُو۔

پھر مجرمین کی بدحالی کا تذکرہ فرمایا کہ اے مخاطب! تو اس دن مجرمین کو اس حال میں دیکھے گا کہ وہ باہم آپس میں بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہوں گے، یعنی اپنے عقائد کفریہ کے اعتبار سے مختلف قسموں میں بٹے ہوئے ہوں گے، ایک ایک قسم کے لوگوں کو ملا کر بیڑیوں میں جکڑ دیا جائے گا، دنیا میں کفر میں شریک تھے اور ایک دوسرے کے مددگار رہتے تھے، اب وہاں سزا میں ساتھی ہوں گے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: "وَالْمُرَادُ قَرْنُ بَعْضِهِمْ مَعَ بَعْضٍ وَضَمُّ کُلٍّ لِمُشَارِکِهٖ فِیْ کُفْرِهٖ وَعَمَلِهٖ"۔ مجرمین کی مزید بدحالی کا بیان:

﴿سَرَابِیْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ﴾ عرب میں ایک درخت ہوتا تھا جس کا سیال مادہ (شیرہ) نکال کر اور پکا کر کھجلی والے خارش زدہ اونٹوں کے جسم پر ملتے تھے، جس کی تیزی کی وجہ سے کھجلی جل جاتی تھی جیسے کہ اسی مقصد کے لئے سیال گندھک بھی کارآمد ہے، یہ قطران بارود کی طرح آگ کو جلدی پکڑتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مجرموں کے جسموں پر قطران بدبودار ملا جائے گا جو ان کے جسموں پر کرتے کی طرح لیپ ہو جائے گا تا کہ دوزخ کی آگ پیٹرول کی طرح اسے فوراً جلا ڈالے، جیسے دنیا میں ڈانبر یعنی تارکول کی بھی یہی خاصیت ہے۔

علامہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قطران پگھلے ہوئے تانبے کو کہتے ہیں، اور دوزخیوں کے لباس تانبے کے ہوں گے۔ امام راغب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ [مفردات]

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میت پر چیخ و پکار سے نوحہ کرنے والی عورت اگر اپنی موت سے پہلے توبہ نہ کرے گی تو قیامت کے دن اس کو اس حال میں کھڑا کیا جائے گا کہ اس پر ایک کرتہ قطران کا ہوگا اور ایک کرتہ کھجلی کا ہوگا، یعنی اس کے جسم پر خارش پیدا کی جائے گی، اور اوپر سے قطران لپیٹ دیا جائے گا تاکہ اس سے اور زیادہ سوزش اور جلن ہو۔[مسلم]

﴿وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ﴾ اور ان کے چہروں کو آگ نے ڈھانپ رکھا ہوگا۔ آگ تو سارے ہی جسم کو جلائے گی، لیکن چہروں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے فرمایا کہ چہرہ اشرف الاعضاء ہے، اور حواس ظاہرہ سب اس میں مجتمع ہیں۔ جیسے سورۂ ہمزہ میں فرمایا: ﴿تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ﴾ [الھمزۃ:۷] (جو دلوں تک جا چڑھے گی) اس میں دلوں کا ذکر بھی خصوصیت کے ساتھ اسی مقصد کے لئے ہے، کیونکہ قلب حواس باطنہ کا سردار ہے۔

﴿لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ مجرمین کے ساتھ مذکورہ معاملہ فرمائے گا تاکہ ہر انسان کو اس کے کئے کا بدلہ دیدے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔

﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾ یہ قرآن لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا پیغام ہے۔

﴿وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ﴾ تاکہ لوگوں کو اس کے ذریعہ ڈرایا جائے۔

﴿وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ اور تاکہ وہ جان لیں کہ معبود حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

﴿وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت وتوحید کے ساتھ ابدی سعادت ونجات حاصل کریں۔

خلاصہ کلام:

آسمان وزمین کی تبدیلی کے بارے میں دو قول ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ اس تبدیلی سے مراد تبدیلی صفات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین وآسمان اصل میں یہی رہیں گے، مگر ان کی حالت وکیفیت اور صفت تبدیل کردی جائے گی، مثلاً زمین کے ٹیلے اور پہاڑ، نیز نشیب وفراز یعنی بلندی وپستی، جو اس وقت موجود ومشاہدہ ہے سب برابر کرکے زمین کو ایک چمڑے کی طرح ہموار کیا جائے گا۔ جیسے فرمایا: ﴿لَا

تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا﴾ [طٰهٰ: ۱۰۷] (جس میں تو نہ ناہمواری دیکھے گا، اور نہ کوئی بلندی دیکھے گا)۔

رب العزت عزّ سبحانہ ان سب کو ذرا سی دیر میں کوٹ پیس کر ریت کے ذرات کی طرح ہوا میں اڑا کر زمین کو صاف اور ہموار کر دیں گے، جس میں کوئی اونچ نیچ باقی نہیں چھوڑیں گے، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ زمین و آسمان کی ذات میں تبدیلی لائی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ موجودہ آسمان اور زمین کو بدل دیا جائے گا، ان کی جگہ دوسرا آسمان اور زمین پیدا کیا جائے گا، اور وہ نئی زمین چاندی کی طرح سفید ہوگی، اور اس پر کسی کے خون کا قطرہ نہ گرا ہوگا، اور نہ اس پر اللہ تعالیٰ شانہ کی نافرمانی نہیں کی گئی ہوگی۔ یہ دوسرا قول حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں اقوال میں تطبیق یوں دی کہ تبدیلی کئی بار ہوگی، ایک نفخہ اولی کے وقت، اس وقت تبدیلی صفات میں ہوگی اور زمین کو بالکل ہموار کر دیا جائے گا وغیرہ۔

دوسری تبدیلی نفخہ اُولیٰ اور نفخہ ثانیہ کے درمیان ہوگی، اس وقت نئی زمین اور آسمان کو از سرِ نو پیدا کیا جائے گا۔ البتہ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ دوسری تبدیلی اس وقت ہوگی جب لوگ پل صراط پر ہوں گے۔ کما في حديث عائشة رضي الله عنها۔ والعلم عند الله اللطيف الخبير